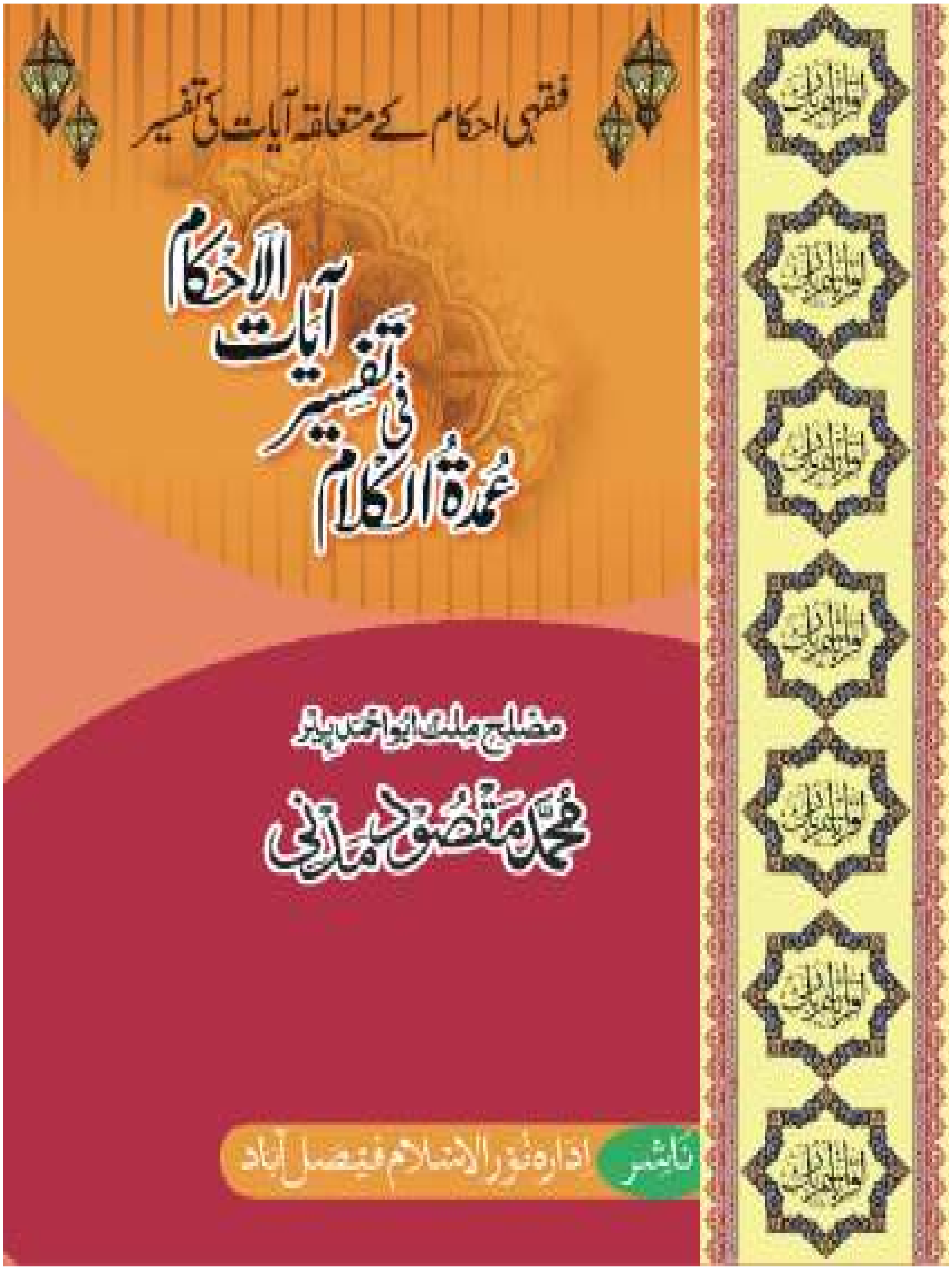
فقہی احکام کے متعلقہ آیات کی تفسیر
عمدۃ الکلام فی تفسیر آیات الاحکام
مصلح ملت ابو احمد پیر
محمد مقصود مدنی
ناشر
ادارہ نور الاسلام فیصل آباد

عُمدۃُ الکلام فی تفسِیر آیات الاحکام

سلسلہ اشاعت: 64
تاریخ اشاعت: 06 جنوری 2021ء
ہدیہ: =/1600

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں:۔

نام کتاب: عُمدۃُ الکلام فی تفسِیر آیات الاحکام
مصنف: محمد مقصود مدنی
کمپوزنگ: ”ماہوزا“ کمپیوٹر کمپوزنگ، فیصل آباد
تزئین: علی حسن زیدی
پروف: صاحبزادہ محمد حبیب رضا مدنی
حافظ غلام مرتضیٰ عطاری مدنی
سرورق: چشتی ڈیزائنگ
بائنڈنگ: محمد احسان سیالوی
ناشر: ادارہ نور الاسلام، فیصل آباد
اہتمام: ماہوزا اہلِ قلم کا اشاعتی ادارہ

درودِ مدنی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی سَیِّدِنَا
وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَاٰبَائِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِکَ یَاۤ اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ ۝

فہرست

تقریظ (مفتی محمد قاسم رضا)	09
تقریظ (عون محمد سعیدی)	13
مقدمہ	14
1)۔ انسان کے منافع کے بیان میں	17
2)۔ ملائکہ اور ان کی حقیقت	18
3)۔ غیر اللہ کو سجدہ کرنا کیسا	25
4)۔ حج کے فرضیت اور حج کی اقسام	26
5)۔ حج کے احکام	41
6)۔ حج کا مہینہ	47
7)۔ حج کے ارکان کے بارے میں	50
8)۔ شراب کی سزا اور احکام	51
9)۔ یتیم اور اس کے مال کے بارے میں	61
10)۔ مشرکین کے ساتھ نکاح ناجائز ہونے کے بیان میں	66
11)۔ حیض کے بیان میں	69
12)۔ ایلاء کے بیان میں	74
13)۔ مُدّتِ رضاعت کے بیان میں	77
14)۔ غیر مدخولہ اور اس کے حق مہر کی وضاحت	79

15)۔ عدّت کے بیان میں	84
16)۔ آیاتِ محکمات اور متشابہات کے بیان میں	87
17)۔ اتباعِ رسول کے احکام	94
18)۔ نذر تحنیک اور عقیقے کے بارے میں وضاحت	100
19)۔ انبیاءٔ کرام کے مراتب	111
20)۔ شکر کا بیان	146
21)۔ سُود کے بارے میں	149
22)۔ یتیم کا مال ادا کرنے کا حکم میں	151
23)۔ یتیم کے مال کے متعلق احکام	157
24)۔ حق مہر کی وضاحت	164
25)۔ تقسیم وراثت	166
26)۔ وراثت کے بیان میں	168
27)۔ کلالہ کے بیان میں	174
28)۔ صبر کا معنی اور اس کے فضائل	178
29)۔ روضہ رسول پر حاضری	183
30)۔ اِسلام میں سلام کے احکام اور آداب	185
31)۔ قتل اور قصاص کے احکام	190
32)۔ شکاری جانوروں کے بارے میں حکم	211
33)۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نورانیت کے بارے میں	227
34)۔ قسم کا کفّارہ	235
35)۔ سمندر کے شکار کے بیان میں	243
36)۔ گھٹیا اور خبیث چیزوں کے بارے میں	250
37)۔ صحابہؓ کرام کا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلقاً سوال کرنے کے حوالے سے حُکمِ خُداندی	253

38)۔ بحیرہ، وسیلہ اور بتوں کے نام پالے جانے والے جانوروں کے بارے میں	260
39)۔ وصیت اور اس کے احکام	264
40)۔ مقامِ میزان کیا ہے؟	278
41)۔ زمین کو مستقر بنانے کے بیان میں	285
42)۔ سجدہ کا لغوی اور اصطلاحی معانی اور اس کی وضاحت	290
43)۔ ذبیحہ کے بیان میں	298
44)۔ عشر اور اُس کے جمع کے احکام	300
45)۔ مالِ غنیمت کے بیان میں	305
46)۔ فاتحہ خلف الامام کی بحث	309
47)۔ سجدہ تلاوت کتنے ہیں اور اُن کے احکامات	317
48)۔ مشرکین کا مسجدِ حرم میں داخلہ منع ہے	323
49)۔ زکوٰۃ کے مصارف کی تفصیل	326
50)۔ مسجدِ ضرار	343
51)۔ تبرکات کی اہمیت	345
52)۔ جانوروں کی حلّت وحرمت کا بیان	348
53)۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں	354
54)۔ اھلالذکر کون؟	364
55)۔ سبع مثانی کسے کہتے ہیں	390
56)۔ صدقہ کن پہ خرچ کریں	391
57)۔ اسراف وتبزیر ومیانہ روی کا بیان	394
58)۔ عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	401
59)۔ زنا کی تعریف اور اس کی سزا کے بیان میں	415
60)۔ حدِّ قذف کی وضاحت کے بارے میں	443

61)۔ گھروں میں جانے کے آداب	448
62)۔ بغیر رہائش والے گھروں میں جانے کے آداب	451
63)۔ گھروں میں جانے کے آداب اوراوقات	452
64)۔ اولیاء کی طاقت	454
65)۔ شکر کا بیان	461
66)۔ شِرک کا بیان اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک	464
67)۔ ذکرِ اللہ کب	478
68)۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاہد (گواہ) ہیں	480
69)۔ حیض کے بیان میں	486
70)۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ کے بیان میں	489
71)۔ اللہ کی زمین کی نعمتیں	508
72)۔ کوثر کی وضاحت	511
73)۔ نمازوں سے غلفت کے بیان میں	519
74)۔ زمانے سے مراد	521
75)۔ مال جمع کرنے اور زیاراتِ قبور کے بیان میں	527
76)۔ رفعت ذکرِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	534

****

تقریظ

شیخ الحدیث والتفسیر،
حضرت علامہ مفتی محمد قاسم رضا دینار، المدنی

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید
الانبیاء والمرسلین۔ اما بعد۔۔

تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔۔ اس کتاب میں انسانیت کے متعلق ہر طرح کی رہنمائی کے سنہرے اصول موجود ہیں۔ چنانچہ ہر شئے کا تفصیلی بیان قرآن کے دامن میں موجود ہے۔ اِرشاد فرمایا گیا ہے:

وَتَفۡصِيلَ كُلِّ شَيۡءٍ.(یوسف، 12 : 111)

اور (قرآن) ہر شئے کی تفصیل ہے۔

ایک اور مقام پر اِرشاد ہے:

مَّا فَرَّطۡنَا فِي الۡكِتَابِ مِن شَيۡءٍ.(الانعام، 6 : 38)

ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جسے صراحۃً یا کنایۃً بیان نہ کر دیا ہو)۔

چونکہ اَزل سے ابد تک جملہ حقائق اور مَا كَانَ وَمَا يَكُوۡن کے جمیع علوم قرآنِ مجید میں موجود ہیں اس لئے اِس حقیقت کو اِس انداز سے بیان کیا گیا ہے:

وَلَا رَطۡبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍO(الانعام، 6 : 59)

اور نہ کوئی تر چیز ہے اور نہ کوئی خشک چیز مگر روشن کتاب میں (سب کچھ لکھ دیا گیا ہے)۔

اِس آیتِ کریمہ میں دو لفظ رَطۡبٍ اور یَابِسٍ اِستعمال ہوئے ہیں۔ رطب کا معنی تر ہے اور یابس کا خشک۔ یہ آیت قرآنی اِیجاز اور فصاحت و بلاغت کی دلیلِ اَتم ہے کیونکہ کائناتِ ارض وسماء کا کوئی وُجود اور کوئی ذرّہ ایسا نہیں جو خشکی اور تری کی دونوں حالتوں سے خارِج ہو۔ بحر و بر، شجر و حجر، زمین و آسمان، جمادات و نباتات، جن و انس، خاکی ذرّات اور آبی قطرات، حیوانات اور

دیگر مخلوقات الغرض عالمِ پست و بالا کی جس شے کا بھی تصوّر کر لیجئے وہ یا تو خشک ہوگی یا تر یا دونوں حالتوں کا مرکب ہوگی۔ قرآن نے صرف دو لفظ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِستعمال کر کے درحقیقت ساری کائنات کے ایک ایک ذرّے کا بیان کر دیا کہ اُس کا علم قرآن میں موجود ہے۔

ایک اور مقام پر اِرشاد فرمایا گیا ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلاًO (بنی اِسرائیل، 17: 12)

اور ہم نے (قرآن میں) ہر چیز کو پوری تفصیل سے واضح کر دیا ہے۔

علامہ ابنِ برہان اِسی کی تائید میں فرماتے ہیں:

ما من شيء فهو في القرآن أو فيه أصله. (الاتقان، 2: 126)

کائنات کی کوئی شئے ایسی نہیں جس کا ذِکر یا اُس کی اصل قرآن سے ثابت نہ ہو۔

گویا قرآن میں یا تو ہر چیز کا ذکر صراحت کے ساتھ ملے گا یا اُس کی اصل ضرور موجود ہوگی۔ یہ بات لوگوں کی اپنی اپنی اِستعداد و صلاحیت، فہم و بصیرت اور قوتِ اِستنباط و اِستخراج کے پیشِ نظر کہی گئی ہے کیونکہ ہر کوئی ہر شئے کی تفصیل قرآن سے اَخذ کرنے کی اِستعداد نہیں رکھتا۔

اگر قدرت کی طرف سے کسی کو نورِ بصیرت حاصل ہو، اِنشراحِ صدر ہو چکا ہو، حجابات اُٹھ چکے ہوں اور ربِّ ذُوالجلال نے اُس کے سینے کو قرآنی معارف کا اَہل بنا دیا ہو تو اُسے ہر شئے کا تفصیلی بیان بھی نظر آتا ہے۔

اِسی موقع پر اِمام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصلاً ذِکر کا معنی یہ ہے:

ما من شيء إلا يمكن إستخراجه من القرآن لمن فهّمه الله. (الاتقان، 2: 126)

کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا اِستخراج و اِستنباط آپ قرآن سے نہ کر سکیں لیکن یہ علوم و معارف اُسی پر آشکار ہوتے ہیں جسے ربِّ ذُوالجلال خصوصی فہم سے بہرہ وَر فرما دیں۔

محقق بن سراقہ 'کتاب الاعجاز' میں جامعیتِ قرآن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

ما من شيء في العالم إلا وهو في كتاب الله. (الاتقان، 2: 126)

کائنات میں کوئی شئے اَیسی نہیں جس کا ذِکر قرآن میں موجود نہ ہو۔

اِس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شئے قرآن میں مذکور نہ ہو تو وہ کائنات میں موجود نہیں ہو سکتی، گویا قرآن میں کسی چیز کا مذکور نہ ہونا کائنات میں اُس کے موجود نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اُس میں کسی چیز کے ذِکر یا عدمِ ذِکر کو کائنات میں اُس کے وُجود و عدم کی دلیل تصوّر کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جامعیتِ قرآن کی نسبت یہ دعویٰ کیا:

سلوني عمّا شِئتم، أخبركم عنه في كتابِ الله. (الاتقان، 2: 126)

جس چیز کی نسبت چاہو مجھ سے پوچھ لو، میں تمہیں اُس کا جواب قرآن سے دوں گا۔

آپ نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی اپنی کتاب 'الام' میں نقل فرمایا ہے:

ما بلغنی حدیث عن رسول اللہ علی وجھه إلا وجدت مصداقه فی کتاب اللہ.(الاتقان، 2:126)

آج تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث مجھے ایسی نہیں ملی جس کا واضح مصداق میں نے قرآن مجید میں نہ پایا ہو۔

تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات ومطالب اور علوم ومعارف کی جامع بھی یہی کتاب ہے۔امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے چار کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے، جن میں کائنات کے تمام علوم و معارف بیان کردیئے۔پھر اُن تمام علوم کو چار کتابوں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) میں جمع کردیا۔پھر اُن میں سے پہلی تین کتابوں کے تمام معارف کو قرآنِ حکیم میں جمع فرمایا اور یوں یہ قرآن ایسی جامع کتاب قرار پائی کی ابنِ ابی الفضل المرسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

جمع القرآن علوم الأوّلین و الآخرین بحیث لم یحط بھا علما حقیقة إلا المتکلم، ثم رسول اللہ صلی اللہ علیه وآله وسلم.(الاتقان، 2:126)

اِس قرآن نے اوّل سے آخر تک، اِبتداء سے اِنتہا تک کائنات کے تمام علوم ومعارف کو اپنے اندر اِس طرح جمع کرلیا ہے کہ فی الحقیقت خدا اور اُس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اُن علوم کا اِحاطہ نہ کوئی آج تک کرسکا اور نہ کرسکے گا۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اِس سلسلے میں مروِی ہے:

مَن أراد العلم فعلیه بالقرآن، فإنّ فیه خیر الأولین و الآخرین.(الاتقان، 2:126)

جوشخص علم حاصل کرنا چاہے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا دامن تھام لے کیونکہ اِسی قرآن میں ہی اوّل سے آخر تک سارا علم موجود ہے۔

ویسے تو سارا قرآن ہی معجزہ اور جمیع علوم کا سمندر ہے۔لیکن قرآن کریم میں فقہی احکام کے متعلق آیات طیبہ بھی ہماری ہر معاملہ میں رہنمائی کرتیں ہیں۔۔۔مختلف علماء نے اپنے اپنے زمانے میں قرآن کی تفسیر پر کتب لکھی ہیں۔لیکن صرف احکام کے متعلق آیات کی تفسیر پر باقاعدہ الگ سے کتاب بمشکل ملے گی۔۔۔یہ کام پیر طریقت رہبر شریعت ابواحمد محمد مقصود مدنی زید شرفہ نے احسن طریقے سے کیا۔۔۔

قبلہ پیر صاحب نے دیگر مختلف موضوعات پر بھی کتب تصنیف کی ہیں جن میں آئینہ سُنتِ مصطفیٰ ﷺ، عظمتِ دُرود شریف، عظمتِ صحابہ، عظمتِ اہلِ بیت، شہزادی کونین، عظمتِ مولائے کائنات شامل ہیں جبکہ مذکورہ کتاب اپنی مثال آپ ہے۔۔۔

اس کتاب کو بندہ ناچیز نے پڑھا ہے الحمدللہ پیر صاحب نے خوب لگن کیساتھ مختلف کتبِ تفاسیر کی فقہی ابحاث کو ایک جگہ موتیوں کی لڑی کی طرح پرو دیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قبلہ پیر صاحب کو مزید دینِ متین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت پیر صاحب کی اس محنت کو اپنے بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین!

مفتی محمد قاسم رضا

مدرس ادارہ نور الاسلام، فیصل آباد

تقـریظ

حضرت علامہ، پروفیسر **عون محمد** سعیدی مصطفوی

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اہلسنت)، بہاولپور

مبلغ اسلام حضرت ابواحمد پیر محمد مقصود مدنی مدظلہ نے قرآن کریم کی وہ معروف آیات احکام لئے کہ جن کا عصر حاضر کے پیش آمادہ مسائل سے بہت زیادہ تعلق ہے متعدد کتب تفاسیر سے استفادہ کرتے ہوئے ان تفاسیر کو جمع کر کے اس کا نام عمدۃ الکلام فی تفسیر آیات الاحکام رکھا ہے۔

یقیناً یہ ایک عمدہ کاوش ہے جس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے اس طرح کی فقہی کاوش بہت کم مصنفین کے حصے میں آئی ہے حالانکہ عوام کو انہی چیزوں کی بہت اشد ضرورت ہوتی ہے۔

یہ ایک صدقہ ہے جس کا فائدہ بہت زیادہ اور اجر دیرپا ہے قبلہ مدنی صاحب نے اپنی کتاب میں متعلقہ آیات کے متعلق علماء اسلام کی منتخب تحقیقات کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے جس سے قاری کو ضروری نکات تک رسائی میں آسانی رہے گی۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی حضرت قبلہ مدنی صاحب کی اس کتاب سے استفادہ کو عام فرمائے اور اسے ان کے لئے نجات آخرت کا سبب بنائے۔آمین!

عون محمد سعیدی، مصطفوی

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین

امابعد!

امت مسلمہ کے لئے شریعت کے دلائل میں سے سب سے بڑی دلیل قرآن مجید برہان رشید ہے یہ رسول اللہ ﷺ کا وہ زندہ و جاوید معجزہ ہے جو اپنے اندر علوم ظاہریہ و باطنیہ کا سمندر لئے ہوئے ہے۔

قرآن اپنی جامعیت پر فرماتا ہے

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ

(سورۃ الانعام: آیت 59)

اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں

اس آیت کریمہ میں اللہ رب العزت کائنات کے اندر موجود خشکی اور تری سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں کا تذکرہ و علم قرآن میں موجود ہونے کا اعلان فرمارہا ہے

اسلام چونکہ ایک عالمگیر اور تاقیامت تک کا دین قیم ہے اس لئے شریعت مطاہرہ کے دلائل بھی قیامت تک رونما ہونے والے مسائل کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ہدایت انسانی کے پورے علوم پھیلا دیئے ہیں، یہ کتاب خدا کی آخری کتاب ہے اور اس میں ہر انسانی ضرورت کا حل موجود ہے۔

"وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ"۔ (النحل:۸۹)

ترجمہ: اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے ہدایت اور رحمت ہے اور ماننے والوں کے لیے خوشخبری ہے۔

ہر چیز کے کھلے بیان کا مطلب یہ ہے کہ اس میں تمام علوم ہدایت، اصول دین اور فلاح دارین سے متعلق ضروری امور کا نہایت مکمل اور واضح بیان ہے، یہاں کتاب اللہ، اسوۂ رسول اور اطاعت رسول کی راہ سے تمام ہدایات نبویہ کو بھی شامل ہے اور اس عموم سے احادیث میں کتاب اللہ کی مرکزی حیثیت اسی طرح مذکور ہے: حضرت جابر بن عبداللہ الانصاری (۷۴ھ) کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

"وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابُ اللهِ"۔ (مسلم، بَاب حَجَّةِ النَّبِيِّ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،

(حدیث نمبر:۲۱۳۷،شاملہ،موقع ال إسلام)

ترجمہ:اور میں تم میں وہ چیز چھوڑے جارہاہوں کہ اگر تم نے اسے تھام لیا تو تم کبھی گمراہ نہ ہوگے وہ چیز کتاب اللہ ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"كِتَابُ اللّٰهِ فِيهِ نَبَأُ مَا كَانَ قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ وَهُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ مَنْ تَرَكَهُ مِنْ جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ وَمَنْ ابْتَغَى الْهُدَى فِي غَيْرِهِ أَضَلَّهُ اللّٰهُ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِينُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيمُ هُوَ الَّذِي لَا تَزِيغُ بِهِ الْأَهْوَاءُ وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَلَى كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ"۔

(ترمذی،بَاب مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الْقُرْآنِ،حدیث نمبر:۲۸۳۱،شاملہ،موقع ال إسلام)

ترجمہ: قرآن کریم میں پہلی داستانیں بھی ہیں اور آئندہ کی خبریں بھی ہیں اور حال کے احکام بھی ہیں، یہ فیصلہ کن چیز ہے، مذاق کی چیز نہیں، جو متکبر اسے ترک کرے گا اللہ اسے توڑے گا اور جو اس کے سوا کسی اور چیز میں ہدایت ڈھونڈے اللہ اسے راہ سے بھٹکا دیں گے، قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے؛ یہی ذکر حکیم اور یہی صراط مستقیم ہے، اس کے ساتھ طبائع کجروی میں نہیں جاتیں اور زبانیں ملتبس نہیں ہوتیں، علماء کو اس سے سیری نہیں ہوتی اور بار بار مراجعت سے یہ پرانا نہیں ہوتا اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔

حضرت زید بن ارقم (۶۷ھ) بھی روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إني تارك فيكم كتاب الله هو حبل الله من اتبعه كان على الهدى ومن تركه كان على الضلالة"۔ (صحیح ابن حبان،باب ذكر إثبات الهدى

(لمن اتبع،حدیث نمبر ۱۲۳،شاملہ)

ترجمہ: میں تم میں کتاب اللہ چھوڑے جارہاہوں، وہ اللہ کی رسی ہے جو اس کی پیروی کرے گا ہدایت پر ہوگا اور جو اسے چھوڑے گا گمراہی پر رہے گا۔

قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت اور یہ روایات بتارہی ہیں کہ قرآن کریم نہایت جامع اور مکمل کتاب ہے اور اس میں ہر انسانی ضرورت کا پورا پورا حل موجود ہے۔

ویسے تو سارا قرآن علوم کا مرکز ہے جیسے کہ حبر اُمّت سیدنا عبداللہ بن عباس کا قول ہے جو کہ امام سیوطی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الاتقان فی علوم القرآن لسیوطی میں نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے

آپ فرماتے ہیں:

کہ اگر میرے اونٹ کی رسی (نکیل) بھی گم ہو جائے تو میں اُس کو بھی کتاب اللہ میں پالوں (تلاش) کرلوں

اب یہ فرمان قرآن کے علوم کو آشکار کرتا ہے قرآن پاک کے اندر متعدد ایسی آیات موجود ہیں جن کا تعلق سابقہ انبیاء وسابقہ ادیان کے ساتھ ہے اور بے شمار آیات ایسی ہیں جن میں یوم آخرت اور اس کے احوال عذاب وثواب جنت اور اس کے احوال دوزخ

اوراس کی ہولناکیاں بیان کی گئی ہیں ۔

اس کے ساتھ ساتھ عبرت تنبیہات توجہات وحکمت پر مشتمل احکام الٰہی بھی موجود ہیں ۔

ان سارے موضوعات کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کا ایک حصہ جومخصوص آیات پر مشتمل ہے جن کا تعلق فقہی مسائل واحکام اوران کی تفصیلات اورتوضیحات پر مبنی ہے

ان آیات میں قرآن کریم جو دلائل شریعہ میں سرفہرست ہے وضوتا غسل ،تیمم ،حیض ونفاس کے مسائل ،بدنی عبادات ،نماز روزہ ،حج وعمرہ ،مالی عبادات ،صدقات و واجبہ ،نافلہ ،حقوق العباد ،بنیادی ومعاشرتی معاملات مثلا نکاح ،طلاق ،خلہ ،حق مہر ،از دوجی تعلقات ،عدت ،رجوع ،وغیرہ کے مسائل کو واضح کرتا ہے

دیگر معاشرتی مسائل وحق وراثت سے لیکر دیون ووصیت قصاص حدود اللہ جیسے احکام میں ہماری مکمل رہنمائی کرتا ہے ۔

بحمداللہ تعالی فقیر نے ان مخصوص آیات کہ جن میں فقہی مباحث اورفقہی احکامات کی رہنمائی موجود ہے ان آیات کو مختلف تفاسیر ومختلف فقہی مذاہب کے دلائل کی روشنی جمع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے ہم نے اپنی طرف سے مفسرین وفقہی مذاہب کے دلائل کو ایک جگہ ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اس میں اگر باتقاضہ بشریت کوئی کمی رہ گئی ہوتو اللہ اپنے محبوب صلی اللہ وعلیہ والہ وسلم کے صدقے معاف فرمائے اور بندہ ناچیز کی اس سعی کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر میرے اورمیرے جملہ اہل خانہ کے لئے ذریعہ نجات بنائے ۔(آمین)

محمد مقصود مدنی

انسان کے منافع کے بیان میں

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزۡقًا لَّکُمۡ ۚ فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰہِ اَنۡدَادًا وَّ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾

سورۃ البقرۃ: آیت 22

''جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتار کر اس سے پھل پیدا کر کے تمہیں روزی دی، خبردار باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مقرر نہ کرو''۔

قول باری ہے: الذی جعل لکم الارض فراشاً (وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا) یعنی تمہارے لیے قرار اور ٹھکانا بنایا اور صرف فراش کا لفظ علی الاطلاق ذکر کیا جائے تو یہ زمین کو شامل نہیں ہوگا، بلکہ زمین کو فرش کا نام اسی لفظ کے ساتھ مقید کر کے دیا جاتا ہے۔ جس طرح یہ قول باری ہے: والجبال اوتاداً (اور پہاڑوں کو میخیں) اوتاد یعنی میخوں کے اسم کا اطلاق پہاڑوں کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح قول باری ہے: والشمس سراجاً (اور سورج کو چراغ) اسی بنا پر فقہاء نے کہا ہے کہ جو شخص فرش اور بچھونے پر نہ سونے کی قسم کھالے اور پھر زمین پر سو جائے تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص چراغ تلے نہ بیٹھنے کی قسم کھا کر دھوپ میں بیٹھ جائے تو وہ حانث قرار نہیں پائے گا اس لیے کہ قسموں کو ان اسماء پر محمول کیا جاتا ہے جو معتاد و متعارف ہوں۔

عرف کے اندر فراش اور سراج کے الفاظ کا اطلاق زمین اور سورج پر نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اللہ سبحانہ نے اپنے منکر کو کافر کا نام دیا ہے۔ اسی طرح زارع یعنی کاشتکار کو نیز غرق، آہن شخص کو کافر کہا جاتا ہے۔ کافر کا یہ اسم علی الاطلاق مذکورہ بالا دونوں افراد کو شامل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کا کفر کرنے والے کو شامل ہوتا ہے۔ ایسے مطلق اور مقید اسماء کی مثالیں بہت زیادہ ہیں اور بہت سے احکام میں ان کا اعتبار واجب ہوتا ہے، یعنی عرف اور عادت کے اندر جو لفظ مطلق ہو اسے اس کے اطلاق پر رکھا جائے اور جو عقیدہ ہو اسے اس کی تقیید پر برقرار رہنے دیا جائے۔ کسی لفظ کو اس کے اصل مقام سے آگے نہ لے جایا جائے۔

زیر بحث آیت میں اللہ کی وحدانیت پر نیز ایسے صانع اور قادر مطلق پر دلالت موجود ہے جس کے مشابہ کوئی چیز نہیں اور جسے کوئی چیز عاجز اور درماندہ نہیں کر سکتی۔ یہ دلالت آسمانوں کی بلندی، ستونوں کے بغیر ان کے قیام اور مرور ایام کے باوجود ان کے دوام کی شکل میں موجود ہے۔ زمانہ ہائے دراز گزر جانے کے باوجود آسمان اپنی جگہ قائم ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل پیدا نہیں ہوا، قول باری ہے: وجعلنا السمآء سقفاً محفوظاً (اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت کی شکل دے دی) اسی طرح زمین کا ثبات اور کسی سہارے کے بغیر اس کا قیام توحید باری اور خالق کائنات کی قدرت کے عظیم ترین دلائل میں سے ہیں جن سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کوئی چیز اللہ کو عاجز

نہیں کرسکتی ۔زمین وآسمان کے اس کارخانے میں ہمارے لیے اس کی ذات سے آگاہ ہونے،اس کی ذات پر ان سے استدلال کرنے اوراس کی نعمتوں کی یاد دہانی کے تمام اسباب موجود ہیں ۔

قول باری: فاخرجبہ من الثمرات رزقا لکم (اوراس کے ذریعے سے ہرطرح کی پیداوارنکال کرتمہارے لیے رزق پہنچایا) اس قول باری: ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں) نیز: وسخرلکم ما فی السموت وما فی الارض (اورآسمانوں اورزمین میں جو کچھ ہے اس نے اسے تمہارے لیے مسخر کردیا) نیز: قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لبعادہ والطیبات من الرزق صاے محمد، ان سے کہوکہ کس نے اللہ کی اس زینت کوحرام کردیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اورکس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کردیں) کی نظیر ہے ۔ان تمام آیات سے اس بارے میں استدلال کیا جاتا ہے کہ اشیاء کی اصل اباحت ہے اوران میں سے کوئی چیز صرف اس وقت حرام ہوگی جب اس کے متعلق حرمت کی دلیل قائم ہوجائے گی ۔

ملائکہ اوران کی حقیقت

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً‌ ؕ قَالُوۡٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ‌ؕ قَالَ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝٣٠

(سورۃالبقرۃ: آیت30)

''اور جب تیرے رب نے فرشتوں (۱) سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں (۲) نے کہا کہ ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے ہم تیری تسبیح اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں ۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے''۔

ملائکہ کی حقیقت‘ان کی خصوصیت اوران کے فرائض منصبی کا بیان:

علامہ بیضاوی (رح) لکھتے ہیں:

"ملائکۃ" کالفظ "ملاک" کی جمع ہے‘یہ "الوکۃ" سے بنا ہے‘جس کا معنی رسالت (پیغام پہنچانا) ہے کیونکہ ملائکہ اللہ تعالیٰ اورلوگوں کے درمیان واسطہ ہیں‘ان میں سے بعض حقیقۃ رسول ہیں‘ مثلا جو فرشتے خود ان کے لیے رسول ہیں‘ان کی حقیقت میں عقلاء کا اختلاف ہے اوراس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ جوہر ہیں جو قائم بذاتہ ہے‘اکثر مسلمانوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہ اجسام لطیفہ ہیں جو مختلف شکلوں میں متشکل ہونے پر قادر ہیں‘ کیونکہ انبیاء کرام (علیہ السلام) ان کو اسی طرح دیکھتے تھے‘ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہیں جو ہروقت اللہ تعالیٰ کی

معرفت میں مستغرق رہتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "یسبحون الیل والنہار لا یفترون (الانبیاء: ٢٠)

ترجمہ: وہ رات اور دن اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں ہیں

ان فرشتوں کو علیین اور ملائکہ مقربین کہا جاتا ہے' اور دوسری قسم وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی سرمو مخالفت یا نافرمانی نہیں کرتے' قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون" (التحریم: ٦)

ترجمہ: وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے

ان فرشتوں کو "المدبرات امرا" کہا جاتا ہے' ان میں سے بعض فرشتے آسمانوں کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں اور بعض زمین کے تکوینی نظام کی تدبیر کرتے ہیں۔

(انوار التنزیل (درسی) ص ٥٩' مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

محمد رشید رضا لکھتے ہیں:

سلف صالحین نے فرشتوں کے متعلق یہ کہا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان کے وجود کی اور ان کے بعض کاموں کی خبر دی ہے جس پر ہمیں ایمان لانا واجب ہے اور یہ ایمان لانا ان کی حقیقت کے جاننے پر موقوف نہیں ہے' اس لیے ہم ان کی حقیقت کا علم اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔ جب شریعت میں یہ وارد ہے کہ فرشتوں کے پر ہیں تو ہم اس پر ایمان لاتے ہیں لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ان پروں کی کیفیت کا علم نہیں ہے' اور جب شریعت میں یہ وارد ہے کہ فرشتے سمندروں اور سبزہ زاروں پر مقرر کیے گئے ہیں تو ہم اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس کائنات میں اس عالم محسوس سے زیادہ لطیف ایک اور عالم ہے اور اس عالم میں فرشتے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں اور عقل کے نزدیک یہ جائز ہے اور وحی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ (المنار ج ١ ص ٢٥٤' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

فرشتے جو محیر العقول کارنامے انجام دیتے ہیں اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں آسمان زمین پہنچ جاتے ہیں اور آسمانوں کی خبریں زمین تک پہنچاتے ہیں سائنس کی ترقی اور کمپیوٹر کے اس دور میں اس کا سمجھنا آسان ہوگیا' جب خلائی سیاروں اور برقی لہروں کے ذریعہ ایک برا اعظم سے دوسرے بعید بر اعظم تک ایک آن میں آواز اور تصویر پہنچ سکتی ہے اور چاند سے زمین پر ٹیلی فون سے گفتگو ہو سکتی ہے تو فرشتوں کے تصرفات اور نظام عالم میں ان کی تدبیروں کا واقع ہونا اب بعید از فہم نہیں رہا۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

کبھی فرشتے ایسے فرشتے ایسے بدنوں میں ظاہر ہوتے ہیں جن کو ہر خاص اور عام دیکھ لیتا ہے در آں حالیکہ وہ اپنی اصل صورت پر بھی قائم رہتے ہیں' حتی کہ کہا گیا ہے کہ جب حضرت جبرائیل (علیہ السلام) حضرت دحیہ کلبی (رض) کی صورت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تو اسی وقت سدرۃ المنتہیٰ میں بھی موجود ہوتے تھے اور کامل ولی اللہ بھی اسی طرح بیک وقت کئی جگہ موجود ہوتا ہے اور ہر چند کہ یہ چیز بظاہر عقل سے بعید ہے' لیکن میرا اس پر ایمان ہے۔

(روح المعانی ج ١ ص ٢١٩' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

حسب ذیل آیات میں فرشتوں کی بعض خصوصیات اور افعال کو بیان کیا گیا ہے۔

(آیت) "۔ اللہ یصطفی من الملئکۃ رسلا ومن الناس۔ (الحج: ۷۵)

ترجمہ: اللہ ہی فرشتوں اور انسانوں میں سے رسولوں کو چن لیتا ہے۔

(آیت) " والنزعت غرقاً والنشطت نشطاً والسبحت سبحاً فالسبقت سبقاً فالمدبرت امراً (النازعات: ۵۔۱)

ترجمہ: ان فرشتوں کی قسم جونہایت سختی سے (کافر کی جان) کھینچتے ہیں اور جو بہت نرمی سے (مومن کی جان کی گرہ) کھولتے ہیں اور جو (زمین وآسمان میں) سرعت سے تیرتے پھرتے ہیں اور جو (احکام الٰہیہ کی اطاعت میں) پوری قوت سے آگے بڑھتے ہیں اور جو (امور تکوینیہ اور نظام عالم کی) تدبیر کرتے ہیں

(آیت) "فالمقسمت امرا "۔ (الذاریات: ۴)

ترجمہ: اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو کام تقسیم کرنے والے ہیں

(آیت) " ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون (حم السجدۃ: ۳۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے' پھر وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہے' ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کرو' اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا

(آیت) "ورسلنا لدیھم یکتبون (الزخرف: ۸۰)

ترجمہ: اور ہمارے فرشتے ان کے پاس لکھ رہے ہیں:

(آیت) "وان علیکم لحفظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون (الانفطار؛ ۱۲۔۱۰)

ترجمہ اور بیشک ضرور تم پر نگہبان (مقرر) ہیں معزز فرشتے لکھنے والے وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو

خلیفہ کی تعریف اور اس کی اقسام:

خلیفہ نائب یا قائم مقام کو کہتے ہیں' جب اصل شخص خود کارحکومت انجام نہ دے سکے تو اس کا خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے' مثلاً اصل شخص کہیں چلا جائے تو عارضی طور پر اس کی جگہ کام کرنے کے لیے خلیفہ مقرر کرتے ہیں یا اصل شخص فوت ہو جائے تو اس کی جگہ خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کہیں جانے یا فوت ہونے سے پاک ہے تو پھر اس کو خلیفہ کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خلیفہ کی ضرورت نہ تھی بلکہ بندوں کو ضرورت تھی کیونکہ انسان اپنی مادی کثافت اور عدم قرب کے حجابات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے براہ راست فیض حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اس سے احکام وصول نہیں کر سکتا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور انسانوں کے درمیان ایک خلیفہ بنایا اور اس کا نام نبی اور رسول رکھا' اور انبیاء (علیھم السلام) کو ایسی صلاحیت اور استعداد اعطا فرمائی کہ وہ فرشتوں کے واسطے سے یا بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے احکام حاصل کر سکیں۔ عام انبیاء اور مرسلین کی طرف فرشتے بھیجے جاتے ہیں اور مقربین سے اللہ تعالیٰ خود بھی کلام فرماتا ہے' جیسے

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے میقات میں کلام فرمایا اور ہمارے نبی حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شب معراج کلام فرمایا۔

خلفیہ کا ایک معنی یہ ہے: جو اللہ تعالیٰ کا نائب ہو اور اس کا خلیفہ ہو اور اللہ سے احکام حاصل کر کے بندوں تک پہنچائے یہ معنی نبی اور رسول کے مترادف ہے' خلیفہ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ جو نبی اور رسول کا نائب اور اس کا خلیفہ ہو اور نبی کی بیان کی ہوئی شریعت کو لوگوں پر نافذ کرے اور منہاج نبوت پر حکومت چلائے' قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم، (النور: ۵۵)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے نیک عمل کیے' ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمالیا ہے کہ وہ ان کو ضرور بہ ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا' جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔

اس آیت میں خلیفہ کا یہی دوسرا معنی مراد ہے' اس معنی میں خلیفہ کے تقرر میں اہل سنت اور اہل تشیع کا اختلاف ہے' شیعہ علماء کے نزدیک خلیفہ کے تقرر کے لیے نبی اور رسول کی نص صریح ضروری ہے' جب کہ اہل سنت کے نزدیک نص' اہل اجتہاد کے اجماع اور ارباب حل وعقد کے انتخاب سے خلیفہ کا تقرر کرنا جائز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خلیفۃ اللہ صرف اللہ کا نبی ہوتا ہے اور خلیفۃ رسول لوگوں کے مقرر کرنے سے مقرر ہوتا ہے۔

آیت مذکورہ میں خلیفہ کے مصداق کا بیان:

اس آیت میں خلیفہ سے مراد حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں' یا حضرت آدم اور ان کی اولاد مراد ہیں' کیونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) اللہ کے خلیفہ تھے اور ان کے بعد آنے والی ان کی اولاد لغوی معنی کے اعتبار سے ان کی خلیفہ تھی یعنی بعد میں آنے والے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب کے لیے چار الفاظ استعمال فرمائے ہیں' اس آیت میں خلیفہ فرمایا اور اس کے بعد اسی آیت میں اس کو آدم فرمایا:

(آیت) "وعلم ادم الاسمآء کلھا"۔ (البقرہ: ۳۰)

ترجمہ: اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔

اس کو بشر سے تعبیر فرمایا:

(آیت) "انی خالق بشرا من طین" (ص: ۷۱)

ترجمہ: (جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا:) میں مٹی سے بشر بنانے والا ہوں

اس کو انسان بھی فرمایا:

(آیت) "ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون"۔ (الحجر: ۲۶)

ترجمہ: اور بیشک ہم نے انسان کو بجنے والی سیاہ مٹی سے پیدا کیا۔

اللہ کے نائب ہونے کے اعتبار سے آپ کو خلیفہ فرمایا' گندمی رنگ کی وجہ سے آدم فرمایا' جسم کی ظاہری وضع' چہرے مہرے اور کھال کی ساخت کے اعتبار سے بشر فرمایا اور حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے انسان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف مشورہ کی نسبت کا شرعی حکم:

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے جو فرمایا تھا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں' یہ فرشتوں سے مشورہ نہیں تھا' کیونکہ مشورہ کا معنی ہے: کسی شخص کا دوسرے شخص کی طرف رجوع کر کے ایک رائے کو حاصل کرنا۔

(علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی' متوفی ۵۰۲ھ' المفردات ص ۲۷۰' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

اور اللہ تعالیٰ اپنے کام میں کسی کی رائے حاصل کرنے سے پاک اور بری ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنی تخلیق کی پیشگی خبر دی تھی تاکہ فرشتے اس خبر پر اپنی رائے کا اظہار کریں اور اللہ تعالیٰ ان کی رائے کے متعلق اپنا حکم اور اپنی نعمتوں کو بیان فرمائے' اس لیے علامہ بیضاوی کا اس آیت کو مشورہ کی تعلیم پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرشتوں نے کہا: کیا آپ ایسے شخص کو نائب بنائیں گے جو زمین میں فساد اور خون ریزی کرے گا؟ حالانکہ ہم آپ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور آپ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں' فرمایا: بیشک میں ان چیزوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے۔ (البقرہ: ۳۰)

حضرت آدم (علیہ السلام) کے خلیفہ بنانے پر فرشتوں کے سوال کرنے کا محمل:

اگر حضرت آدم (علیہ السلام) کے متعلق فرشتوں نے یہ کہا تھا کہ وہ فساد اور خون ریزی کریں گے تو اس کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) اپنی اولاد کی اصل اور منشاء ہیں اور اولاد آدم میں سے بعض لوگ فتنۂ فساد اور خون ریزی کریں گے اس لیے فرشتوں نے ان کی طرف ان کاموں کا اسناد کر دیا اور اگر فرشتوں نے حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد کے متعلق یہ کہا تھا تو پھر تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں' کیونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے بعض فساق نے بہرحال یہ کام کئے۔

فرشتوں کا یہ قول اللہ تعالیٰ کی اس خبر یا اطلاع پر اعتراض یا انکار اور بنو آدم کی غیبت نہیں ہے کیونکہ فرشتے معصوم ہیں بلکہ یہ اس پر اظہار تعجب ہے کہ زمین کی آبادکاری اور اصلاح کے لیے فسادیوں اور خون ریزوں کو خلیفہ بنایا جائے گا یا فرشتوں جیسے اطاعت گزاروں کو چھوڑ کر نافرمانوں کو خلیفہ بنایا جائے گا! یا فرشتے اس سوال کے ذریعہ اس حکمت کو جاننا چاہتے تھے جس کی بناء پر ان مفسدوں کے فساد سے صرف نظر کر کے ان کو خلیفہ بنایا جائے گا' جیسے استاذ کی تقریر پر متعلم کو کوئی شبہ پیدا ہو تو وہ اس شبہ کے ازالہ کے لیے استاذ سے سوال کرتا ہے' اس لیے فرشتوں کا یہ سوال اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر انکار ہے نہ بنو آدم کی غیبت اور عیب جوئی ہے' فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "بل عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون" (الانبیاء: ۲۶-۲۷)

ترجمہ: بلکہ وہ (فرشتے) عزت والے بندے ہیں کسی بات میں اس سے سبقت نہیں کرتے اور وہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں

باقی رہا یہ کہ فرشتوں کو کیسے علم ہوا کہ بعض بنو آدم فساد اور خون ریزی کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس

سے مطلع فرمایا تھا' یا انھوں نے لوح محفوظ میں صرف اتنا مطالعہ کرلیا تھا کہ بنو آدم فساد کریں گے اور بنو آدم کے شرف اور فضیلت کے مطالعہ سے ان کو روک دیا گیا تھا' کیونکہ وہ اس کا بھی مطالعہ کرلیتے تو پھر ان کو کوئی شبہ نہ رہتا' یا ان کی عقول میں یہ مرتکز تھا کہ معصوم ہونا صرف ان کا خاصہ ہے'اس لیے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کے سوا باقی مخلوق گناہ کرے گی یا اس لیے کہ اس سے پہلے زمین پر جن فساد کر چکے تھے تو انھوں نے انسان کو بھی جنوں پر قیاس کیا۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کو خلیفہ بنانے کی وجہ اور فرشتوں کے شبہ کا ازالہ:

فرشتوں نے جو کہا: ہم تیری تسبیح' حمد اور تقدیس کرتے ہیں اس سے خود ستائی' خود نمائی' عجب اور تفاخر مقصود نہیں تھا بلکہ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ جس کو خلیفہ بنایا گیا ہے اس میں تین قوتیں ہیں' قوت شہوانیہ' قوت غضبیہ اور قوت عقلیہ' پہلی دو قوتوں کے لحاظ سے وہ فتنہ اور فساد کرے گا اور ان دو قوتوں کے اعتبار سے تو اس کو پیدا ہی نہیں کرنا چاہیے چہ جائیکہ اس کو خلیفہ بنایا جائے اور رہی قوت عقلیہ تو وہ فرشتوں کو بھی حاصل ہے اور ان کو اس لیے ترجیح ہے کہ ان میں شہوت اور غضب نہیں ہے جو فتنہ اور فساد کی موجب ہو تو پھر راجح کو چھوڑ کر مرجوع کو خلیفہ بنانے کی کیا حکمت ہے؟ اور اس میں حکمت یہ تھی کہ شہوت کو جب اعتدال میں رکھا جائے تو وہ قابل تعریف صفت ہے جس کو عفت کہتے ہیں اور غضب کو جب اعتدال میں رکھا جائے تو وہ بھی قابل ستائش وصف ہے اور اس کو شجاعت کہتے ہیں اور جب ان دو قابل تعریف وصفوں کے ساتھ قوت عقلیہ بھی ہو تو ان قوتوں کا حامل اس سے یقیناً افضل ہے جو صرف قوت عقلیہ حامل ہو' اور اسی کی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے قول میں اجمالی اشارہ فرمایا: بیشک میں ان چیزوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے' اور اگر یہ سوال ہو کہ بنو آدم میں نیک اور صالح افراد کم ہیں اور شریری اور فاسق زیادہ ہیں' اس وجہ سے بنو آدم کو پیدا نھیں کرنا چاہیے تھا' تو اس کا جواب یہ ہے کہ نیک اور صالح افراد میں خیر کثیر ہے۔اور فاسق اور فاجر افراد اگرچہ زیادہ ہیں لیکن نیک اور صالح افراد کی خیر کی عظمت اور شرف کے مقابلہ میں ان کا شر قلیل ہے اور شر قلیل کی وجہ سے خیر کثیر کو ترک نہیں کیا جاتا' اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ جن میں خیر غالب ہے ان کو پیدا کیا جائے پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر حضرت آدم (علیہ السلام) کی فضیلت علمی بیان کی اور یہ ظاہر فرمایا کہ خلیفہ بننے کے اہل حضرت آدم ہی ہیں نہ کہ فرشتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے پھر ان چیزوں کو فرشتوں پر پیش کرکے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ (البقرہ:۳۱)

آدم کی لفظی تحقیق اور حضرت آدم (علیہ السلام) کی تخلیق کے مراحل:

محی الدین درویش لکھتے ہیں:

آدم اسم علم ہے اور عجمی ہے جیسے آذر' عاجبر اور عاذر ہے' اور یہ علمت اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے' اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ یہ "ادمۃ" (گندم گوں رنگ) سے مشتق ہے یا "ادیم الارض" (زمین کی سطح) سے مشتق ہے' ان کا قول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اشتقاق عربی زبان کا خاصہ ہے' عجمی لفظ کا مادہ اشتقاق عربی الفاظ کیسے ہو سکتے ہیں۔

(اعراب القرآن و بیانہ' ج۱ ص ۸۰' مطبوعہ دار ابن کثیر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی (رح) لکھتے ہیں:

امام فریابی (رح)، امام ابن سعد، امام ابن جریر (رح)، امام ابن ابی حاتم (رح)، امام حاکم (رح) اور امام بیہقی (رح) نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو آدم اس لیے کہا گیا ہے، کہ ان کو ادیم ارض (زمین کی سطح) سے بنایا گیا ہے، سرخ، سفید اور سیاہ مٹی سے، اسی طرح لوگوں کے رنگ مختلف ہیں، سرخ، سفید، اور سیاہ، پاک اور نجس۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۴۹، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

امام عبد بن حمید (رح) نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو ادیم ارض سے پیدا کیا، سرخ، سفید اور سیاہ مٹی سے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۴۹، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

امام ابن سعد (رح)، امام ابویعلی (رح)، امام ابن مردویہ (رح)، اور امام بیہقی (رح) نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کو کیچڑ (گیلی مٹی) کر دیا، پھر اس کو چھوڑ دیا، حتی کہ سیاہ گارا ہوگئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے آدم کا پتلا بنایا اور ان کی صورت بنائی، پھر اس کو چھوڑ دیا، حتی کہ وہ خشک ہو کر بجنے والی مٹی کی طرح ہوگیا، ابلیس اس پتلے کے پاس سے گزر کر کہتا تھا کہ یہ کسی امر عظیم کے لیے بنایا گیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس پتلے میں اپنی پسندیدہ روح پھونک دی، اس روح کا اثر سب سے پہلے ان کی آنکھوں اور نتھنوں میں ظاہر ہوا، ان کو چھینک آئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو الحمد للہ کہنے کا القاء کیا، انھوں نے الحمد للہ کہا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یرحمک اللہ، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! اس جماعت کے پاس جاؤ اور ان سے بات کرو، دیکھو یہ کیا کہتے ہیں، حضرت آدم ان (فرشتوں) کے پاس گئے اور کہا: السلام علیکم، انھوں نے کہا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ" پھر حضرت آدم (علیہ السلام) اللہ کے پاس گئے اللہ نے فرمایا: انھوں نے کیا کہا؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو خوب علم ہے، حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا: اے رب! میں نے ان کو سلام کیا، انھوں نے کہا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! یہ تمہارا اور تمہاری اولاد کے سلام کرنے کا طریقہ ہے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۴۸، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

امام احمد (رح)، امام بخاری (رح)، اور امام مسلم (رح)، حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو ان کا طول ساٹھ ذراع (تیس انگریزی گز) تھا اور فرمایا: جاؤ فرشتوں کی اس جماعت کو سلام کرو، اور سنو وہ کیا جواب دیتے ہیں اور یہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا، حضرت آدم (علیہ السلام) نے جا کر کہا: السلام علیکم، فرشتوں نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ انھوں نے رحمۃ اللہ کا لفظ زیادہ کہا، سو جو شخص بھی آدم کی صورت پر جنت میں داخل ہوگا اس کا طول ساٹھ ذراع ہوگا، پھر یہ طول بہ تدریج کم ہوتا رہا حتی کہ اب اتنا طول رہ گیا۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۴۸، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

حضرت آدم (علیہ السلام) کو تمام اسماء کی تعلیم کا بیان:

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) نے ان چیزوں کے نام اللہ تعالیٰ کی تعلیم دینے کی وجہ سے بتائے اگر فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا دیئے جاتے تو وہ بھی ان چیزوں کے نام بتا دیتے، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ

السلام) کا خمیر مختلف اجزاء اور متضاد قوتوں کو ملا کر بنایا تھا اس وجہ سے وہ معقولات، محسوسات، متخیلات اور موہومات کے ادراک کی صلاحیت رکھتے تھے اور فرشتوں میں یہ صلاحیت نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو اشیاء کے حقائق، خواص، اسماء، علوم کے قواعد اور مختلف صنعتوں کے قوانین تعلیم فرمائے، پھر فرشتوں کو عاجز کرنے اور اہلیت خلافت سے ان کے عجز کو ظاہر کرنے کے لیے ان کو حکم دیا کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ، اگر تم اس دعوی میں سچے ہو کہ معصوم ہونے کی وجہ سے صرف تم خلافت کے اہل ہو، ہر چند کہ فرشتوں نے صراحۃ یہ دعوی نہیں کیا تھا لیکن ان کے کلام سے یہ دعوی مترشح ہوتا تھا۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنا کیسا

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡٓا اِلَّآ اِبۡلِيۡسَؕ اَبٰى وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ۝۳۴

غ

''اور یاد کرو جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو پس سجدہ کیا اُنہوں نے سوائے ابلیس کے اُس نے انکار کیا اور تکبّر کیا اور وہ انکار کرنے والوں میں سے ہو گیا''۔

قول باری ہے: **واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لاٰدم فسجدوا** (اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا) شعبہ نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ ریز ہو کر دراصل فرشتوں نے اللہ کی اطاعت کی تھی۔ اللہ ہی نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو مسجود ملائکہ ہونے کا اعزاز بخشا تھا معمر نے قتادہ سے قول باری: وخروا لہ سجداً (اور اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے) کی تفسیر میں روایت کی ہے کہ برادران یوسف (علیہ السلام) کی تحیت یعنی سلام کرنے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔

اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی امتناع نہیں ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو فرشتوں کا سجدہ دراصل اللہ کی عبادت اور حضرت آدم (علیہ السلام) کے لیے اعزاز اور ان کے حق میں تحیت کی صورت تھی۔ یہی بات برادران یوسف (علیہ السلام) کی سجدہ ریزی کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے لیے عبادت جائز نہیں اور اعزاز وتحیت اس شخص کے لیے جائز ہے جو ایک گونہ تعظیم کا مستحق قرار پائے۔ اس سلسلے میں بعض حضرات کا قول ہے کہ فرشتوں نے سجدہ تو اللہ کو کیا تھا اور حضرت آدم (علیہ السلام) ان کے لیے بمنزلہ قبلہ تھے، لیکن یہ ایک کھوکھلی توجیہہ ہے کیونکہ ایسی صورت میں حضرت آدم (علیہ السلام) کے کسی مزیت وفضیلت کا کوئی پہلو نہیں ہو گا جبکہ زیر بحث آیت کا ظاہر اس امر کا مقتضی ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کی تعظیم وتکریم ہوئی تھی۔ اس بنا پر سجدہ کو اس کے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے گا جس طرح حمد کے ظاہر لفظ کو اس صورت میں اس کے حقیقی معنوں پر محمول کیا جاتا ہے جب یہ لفظ حمد کے ظاہر لفظ کو اس صورت میں اس کے حقیقی معنوں پر محمول کیا جاتا ہے جب یہ لفظ حمد کے مستحق کے لیے واقع ہو اسے مجازی معنوں پر معمول نہیں کیا جائے گا جس طرح یہ فقرہ کہا جائے کہ ''اخلاق فلان محمودۃ'' (فلاح کے اخلاق محمود، یعنی قابل ستائش ہیں) یا ''اخلاق فلان مذمومۃ'' (فلاں کے اخلاق قابل مذمت ہیں) اس لیے کہ لفظ کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اسے اس کی حقیقت اور اس کے باب پر مجہول کیا جائے۔ سجدے کا حکم حضرت آدم (علیہ السلام) کے

لیے اعزاز کے طور پر تھا، اس پر ابلیس کا وہ قول دلالت کرتا ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ان الفاظ میں کیا ہے: اسجد لمن خلقت طیناً ہ قال ارائیتك هذا الذی کرمت علی (کیا میں اس کو سجدہ کروں جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے۔ پھر وہ بولا: "دیکھ تو سہی کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی) ابلیس نے یہاں پر بتادیا کہ سجدہ کرنے سے اس کا باز رہنا اس بنا پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر آدم (علیہ السلام) کی تفضیل اور ان کے اعزاز کا اظہار کردیا تھا۔

اگر سجدے کا حکم اس بنا پر ہوتا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے والوں کے لیے بس قبلہ بنادیا گیا تھا اور اس میں ان کے اعزاز کی کوئی بات نہ ہوتی تو پھر اس صورت میں ابلیس کو ان سے اس فضیلت پر حسد کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی جس طرح کعبہ شریف کو قبلہ بنادیا گیا ہے اور اس میں کعبہ سے حسد کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دراصل حضرت آدم (علیہ السلام) کی شریعت میں مخلوق کو سجدہ کرنا جائز تھا اور عین ممکن ہے کہ یہی صورت حضرت یوسف (علیہ السلام) کے زمانے تک باقی رہی ہو کہ جو شخص کسی قسم کی تعظیم کا مستحق ہو اس کے اعزاز اور عظمت کا اظہار کرنے کے لیے لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہوں جس طرح ہمارے زمانے میں اس مقصد کے لیے مصافحہ اور معانقہ کرنے، نیز ہاتھوں کو بوسہ دینے کا رواج ہے۔

ہاتھوں کو بوسہ دینے کی اباحت کے سلسلے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کئی روایات منقول ہیں۔ اس بارے میں کراہت بھی مروی ہے، البتہ ہماری شریعت میں غیر اللہ کو اعزاز اور تحیت کے طور پر سجدہ کرنا منسوخ ہو گیا ہے۔ اس منسوخی کی دلیل حضرت عائشہ، حضرت جابر اور انس سے مروی حدیث ہے جس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "کسی بشر کو کسی بشر کے سامنے سجدہ ریز ہونا چاہیے۔ اگر کسی بشر کے لیے کسی بشر کو سجدہ کرنا درست ہوتا تو میں بیوی پر اس کے شوہر کے حق کی عظمت کی بنا پر اسے اپنے شوہر کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا۔

(یہ الفاظ حضرت انس (رض) کی روایت کردہ حدیث کے ہیں۔)

حج کے فرضیت اور حج کی اقسام

وَأَتِمُّواْ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلاَ تَحْلِقُواْ رُؤُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضاً أَوْ بِهِ أَذًى مِّن رَّأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِكَ لِمَن لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُواْ اللّهَ وَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

''حج اور عمرے کو اللہ تعالیٰ کے لیے پورا کرو(۱) ہاں اگر تم روک لیے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالو(۲) اور سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے(۳) البتہ تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (جس کی وجہ سے سر منڈا لے) تو اس پر فدیہ ہے خواہ روزے رکھ لے خواہ صدقہ دے دے، خواہ قربانی کرے(٤) پس جب تم امن کی حالت میں ہو جاؤ تو جو شخص عمرے سے لے کر حج تک تمتع کرے پس اسے جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالے جسے طاقت نہ ہو تو وہ تین روزے حج کے دنوں میں رکھ لے اور سات واپسی پر(٥) یہ پورے دس ہو گئے یہ حکم ان کے لیے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں لوگو! اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

فرضیت حج کی تاریخ اور حج کی اقسام:

علامہ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ آیت ٦ ہجری میں نازل ہوئی۔

(علامہ کمال الدین بن ھمام متوفی ٨٦١ھ فتح القدیر ج ٢ ص ٢٢٥ ،مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ فرضیت حج کی تاریخ میں اختلاف ہے،٥ ہجری، ٦ ہجری اور ٩ ہجری۔ ٨ ہجری فتح مکہ کے سال میں حضرت عتاب بن اسید نے مسلمانوں کو حج کرایا، ٩ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق (رض) اور دس ہجری میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حج کرایا۔

(مرقات ج ٥ ص ٢٦٣ ،مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ١٣٩٠ھ)

حج کی تین قسمیں ہیں:

(۱) حج افراد:

جس میں صرف مناسک حج ادا کیے جائیں اور اس سے پہلے عمرہ نہ کیا جائے، یہ صرف مکہ مکرمہ میں رہنے والوں کے لیے ہے۔

(۲) حج تمتع:

میقات سے عمرہ کا احرام باندھ لیا جائے اور عمرہ کرنے کے بعد سر کے بال کٹوا کر یا منڈوا کر حلال ہو جائے اور پھر آٹھ تاریخ کو حج کا احرام باندھ لے، اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد حلال ہو جائے۔

(۳) حج قران:

میقات سے احرام باندھ لیا جائے اور عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام کو برقرار رکھا جائے، پھر اسی احرام کے ساتھ حج کرے اور مناسک حج ادا کرنے کے بعد سر کے بال کٹوا کر یا منڈوا کر احرام کھول دے، حج قران میں زیادہ مشقت ہے اور اس کا اجر

بھی بہت زیادہ ہے‘ اکثر روایات کے مطابق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو حج کیا تھا وہ حج قران تھا‘ حج تمتع یہ دونوں مکہ مکرمہ سے باہر کے رہنے کے لیے ہیں۔

احرام میں ممنوع کام:

مرد کے احرام کے لیے دو پاک صاف‘ نئی دھلی ہوئی چادریں ہوں‘ ایک چادر‘ تہبند کی طرح باندھ لے اور دوسری چادر اوپر اوڑھ لے‘ سر کھلا رکھے اور عورت سلے ہوئے کپڑے پہنے‘ سر اور پورا جسم ڈھانپ کر رکھے صرف چہرہ کھلا رکھے احرام میں حسب ذیل پابندیاں ہیں۔

(۱) محرم جماع کرنے سے یا اپنی بیوی سے جماع کا ذکر کرنے سے احتراز کرے گا‘ اپنی بیوی کو شہوت سے نہیں چھوئے گا نہ بوسہ دے گا۔

(۲) کسی قسم کا کوئی گناہ کرے گا۔

(۳) کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرے گا۔

(٤) خشکی کے جانوروں کو شکار نہیں کرے گا‘ نہ ان کی طرف اشارہ کرے گا‘ نہ ان کی طرف رہنمائی کرے گا (٥) قصدا یا بلا قصد خوشبو نہیں لگائے گا (خوشبو کا سونگھنا مکروہ ہے‘ خوشبو دار صابن سے نہانا یا شیمپو استعمال کرنا جائز نہیں) اگر خوشبو دار چیز پکی ہوئی تھی تو حرج نہیں‘ اگر کچی ہو اور دوسری چیز سے مخلوط ہو اور خوشبو مغلوب ہو تو جائز ہے اگر غالب ہو تو جائز نہیں‘ اگر بعینہ خوشبو دار چیز کھائی تو اس پر دم ہے۔

(٦) ناخن نہ کاٹے۔

(۷) چہرے کو نہیں ڈھانپے گا‘ چہرہ کا بعض حصہ مثلاً منہ یا ٹھوڑی کو ہتھیلی سے نہیں ڈھانپے گا۔

(۸) سر کو نہیں ڈھانپے گا۔

(۹) ڈاڑھی نہیں کاٹے گا‘ سر میں تیل نہیں ڈالے گا نہ بالوں میں خضاب لگائے گا‘ نہ ہاتھوں پر مہندی لگائے گا۔

(۱۰) سر کے بال یا بدن کے بال نہیں منڈائے گا۔

(۱۱) سلے ہوئے کپڑے نہیں پہنے گا۔

(۱۲) عمامہ یا ٹوپی نہیں پہنے گا۔

(۱۳) چمڑے کے موزے نہیں پہنے گا البتہ اگر ان کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ دیا جائے کہ پنڈلیاں اور ٹخنے کھلے رہیں تو جائز ہے (ایسی چپل پہن سکتا ہے جس سے وسط قدم چھپا ہوا ہو اور ٹخنے کھلے ہوئے ہوں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ موزوں کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کر پہن سکتا ہے) جرابیں پہننا جائز نہیں کیونکہ ان سے ٹخنے چھپ جاتے ہیں۔

(١٤) جس کپڑے کو ایسی چیز سے رنگا گیا ہو جس سے رنگنے کے بعد خوشبو آئے مثلاً زعفران اور ورس وغیرہ اس کو نہ پہنے۔

(١٥) مکہ مکرمہ کے کسی درخت کو نہ کاٹے۔

احرام میں جائز کام:

محرم حمام میں داخل ہوسکتا ہے‘ کسی مکان اور محمل کے سائے کو حاصل کرسکتا ہے۔(مثلاً چھتری استعمال کرسکتا ہے) لیکن کوئی چیز اس کے چہرہ یا سر کو مس نہ کرے‘ پیسے رکھنے کے لیے ھمیان کمر میں باندھ سکتا ہے (احرام کی چادر پر چمڑے کی پٹی باندھ لی جاتی ہے جس میں پیسے رکھنے کے لیے بٹوہ ہوتا ہے وہ بھی اسی حکم میں ہے) منطقہ (کمر باندھنے کی پیٹی) بھی باندھ سکتا ہے‘ بغیر خوشبو کا سرمہ لگا سکتا ہے‘ ختنہ کرا سکتا ہے‘ فصد لگوا سکتا ہے‘ ڈاڑھ نکلوا سکتا ہے ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑوا سکتا ہے‘ سر یا کمر کو کھجا سکتا ہے لیکن اس احتیاط سے کہ بال نہ اکھڑیں‘ اگر تین بال اکھڑ جائیں تو ایک مٹھی طعام صدقہ کردے۔احرام باندھنے سے پہلے غسل کرنا اور بدن پر خوشبو لگانا جائز ہے خواہ بعد میں خوشبو آتی رہے۔

احرام میں مستحب کام:

محرم بہ کثرت تلبیہ پڑھے: ”لبيك اللهم لبيك، لبيك لاشريك لك لبيك ان الحمد والنعمة لك والملك لا شريك لك“۔(صحیح بخاری ج۱ ص۲۱۰) جب نماز پڑھے یا جب کسی بلندی پر چڑھے یا کسی وادی سے اترے‘ یا سواروں سے ملے‘ یا سحری کا وقت ہو تو تلبیہ پڑھے۔جب مکہ میں داخل ہو تو پہلے مسجد حرام میں باب السلام سے داخل ہو اور جب کعبہ کو دیکھے تو تین بار تکبیر اور کلمہ طیبہ پڑھے‘ کعبہ پر پہلی نظر پڑتے ہی دعا کرے‘ اس وقت کی دعا مقبول ہوتی ہے اور یہ دعا بھی کرے: اے اللہ! ہمارے دلوں میں کعبہ کی محبت‘ اس کی تعظیم اور اس کی ہیبت کو زیادہ کر۔

عمرہ کرنے کا طریقہ:

غیر مکی میقات سے عمرہ کا احرام باندھے‘ پاکستان کے رہنے والے ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں اس لیے وہ اپنے گھر میں غسل کرکے احرام باندھ لیں‘ اور ایئر پورٹ کے لاؤنج میں دو رکعت نماز پڑھ کر عمرہ کی نیت کرلیں: اے اللہ! میں عمرہ کے لیے حاضر ہوں‘ اس کو میرے لیے آسان کردے اور میری طرف سے قبول فرما‘ پھر راستہ میں بہ کثرت تلبیہ پڑھے: ”لبیک اللھم لبیک‘ لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لا شریک لک“۔مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ ادا کرے یعنی بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کرے‘ اس طواف میں اضطباع کرے (احرام کی اوپر والی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے کے اوپر ڈال دے) پہلے تین چکروں میں رمل کرے (کندھے ہلا ہلا کر دوڑتے ہوئے طواف کرے) جب بھی حجر اسود کے سامنے سے گزرے تو اگر ممکن ہو تو اس کو بوسہ دے‘ جب رکن یمانی کے پاس سے گزرے تو اس کو بھی چھو کر اس کی تعظیم کرے‘ اس کو بوسہ دینے میں فقہاء احناف کے دو قول ہیں‘ ایک قول منع کا ہے اور ایک جواز کا‘ اگر اس کی تعظیم نہ کرسکے تو پھر اس کے قائم مقام ہاتھ سے اشارہ کرنا مشروع نہیں ہے۔حجر اسود کی تعظیم کے ساتھ طواف کو ختم کرے‘ پھر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت طواف پڑھے۔اس کے بعد سعی کے سات چکر لگائے سعی صفا سے شروع کرے اور مروہ پر ختم کرے‘ صفا پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کرکے ”اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد“۔پڑھے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صلوۃ پڑھے‘ پھر دونوں ہاتھ بلند کرکے دعا کرے‘ پھر مروہ کی طرف روانہ ہو‘ راستہ میں دو سبز نشانوں کے درمیان سے دوڑتا ہوا گزرے‘ طواف اور سعی کے دوران اس کو جو دعائیں اور اذکار یاد ہوں ان کو خضوع اور خشوع کے ساتھ پڑھتا رہے۔

صفا اور مروہ میں طواف مکمل کرنے کے بعد محرم سر کے بال کٹوالے یا منڈوالے' اب اس کا عمرہ مکمل ہوگیا اور وہ احرام کی پابندیوں سے آزاد ہوگیا لیکن پھر بھی کوئی گناہ نہ کرے' فحش باتیں نہ کرے اور کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے' آٹھ ذوالحجہ تک حسب استطاعت عمرے کرتا رہے اور مسجد حرام میں زیادہ سے زیادہ طواف کرتا رہے' عمرہ اور طواف میں طواف کی زیادہ فضیلت ہے' مسجد حرام میں کم از کم ایک بار قرآن مجید ختم کرنا چاہیے۔

حج کرنے کا طریقہ:

حج کرنے والا آٹھ ذوالحجہ کو صبح کی نماز مسجد حرام میں ادا کرے' حج کی نیت سے غسل کر کے احرام باندھے' دو رکعت نماز پڑھے اور یہ دعا کرے: اے اللہ! میں حج کا ارادہ کرتا ہوں تو اس کو میرے لیے آسان کردے اور قبول فرما' اور فجر کی نماز کے بعد مکہ سے منی کے لیے روانہ ہو جائے اور ظہر کی نماز وہاں پہنچ کر پڑھے' حج کی سعی کو طواف پر مقدم کرنا جائز ہے' اس لیے آسانی اس میں ہے کہ سات ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ لے اور حج کی سعی کرلے اور آٹھ تاریخ کی فجر کی نماز کے بعد منی روانہ ہو جائے' اور بقیہ نمازیں منی میں ادا کرے اور طلوع فجر کے بعد منی سے عرفات کے لیے روانہ ہو' اگر امام کے ساتھ نماز پڑھے تو ظہر کے وقت میں ظہر اور عصر دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھے' ورنہ ہر نماز اپنے وقت میں پڑھے' اس کے بعد جبل رحمت کے قریب جا کر قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو اور بلند آواز سے گڑگڑا کر دعا مانگے اور زندگی کے تمام گناہوں سے توبہ کرے' تاہم کھڑا ہونا شرط یا واجب نہیں ہے' اگر بیٹھ کر دعا کی پھر بھی جائز ہے۔ اس جگہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وقوف فرمایا تھا' یہ جگہ میدان عرفات کے وسط میں ہے' اگر یہاں موقع نہ ملے تو وادی عرنہ کے سوا تمام میدان عرفات موقف ہے' میدان عرفات میں جس جگہ بھی کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر دعا کرلی' حج ہو جائے گا' غروب آفتاب تک میدان عرفات میں رہنا واجب ہے' غروب آفتاب کے بعد میدان عرفات سے مزدلفہ کے لیے روانہ ہو' راستہ میں "۔اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد "۔ پڑھتا رہے۔ پیدل جانا مستحب ہے' مزدلفہ میں مغرب کی نماز عشاء کے وقت میں پڑھے' مغرب میں ادا کی نیت کرے اور اس کی سنتوں کو ترک کردے' اس رات کو جاگ کر عبادت کرنا لیلۃ القدر میں جاگنے سے افضل ہے' اسی رات میں رمی کے لیے ستر اسی کنکریاں چن لے' طلوع فجر کے بعد صبح کی نماز منہ اندھیرے پڑھے' اس کے بعد وقوف کرے (کھڑے ہو کر دعا کرے) وقوف کا وقت طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک ہے' خواہ اس وقت چل رہا ہو وقوف ہو جائے گا ("۔اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد "۔) پڑھے' تلبیہ پڑھے' درود شریف پڑھے اور دعا کرے' اور جب خوب روشنی پھیل جائے تو منی کے لیے روانہ ہو اور جمرہ عقبہ کو رمی کرے' پانچ ہاتھ کے فاصلہ سے سات کنکریاں مارے' ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہے' رمی کے بعد قربانی کرے' پھر سر کے بال منڈوالے یا کٹوائے' منڈوانا افضل ہے' اگر بال کٹوائے تو ایک پورے کے برابر کٹوائے' چوتھائی سر کے بال کٹوانا واجب ہے اور پورے سر کے بالوں کو کٹوانا مستحب ہے' سر منڈوانے کے بعد وہ حلال ہوگیا اور بیوی سے جماع کے علاوہ اس پر ہر چیز حلال ہوگئی' پھر ایام نحر کے تین دنوں میں سے کسی ایک دن مکہ جا کر طواف زیارت کرلے اگر پہلے سعی کر چکا ہے تو اس طواف میں رمل نہیں کرے گا' اور اگر پہلے سعی نہیں کی تو پہلے تین چکروں میں رمل کرے گا اور سات چکر پورے کرے' دو رکعت نماز طواف پڑھے گا اور اس کے بعد سعی کرے گا' طواف زیارت کے بعد اس پر بیوی بھی حلال ہو جائے گی۔ اگر اس نے طواف زیارت کو قربانی کے تین دنوں

کے بعد کیا تو یہ فعل مکروہ تحریمی ہے اور اس پر دم لازم آئے گا (طواف زیارت کا وقت ساری عمر ہے) وقوف عرفات اور طواف زیارت کرنے کے بعد حج کے فرائض ادا ہو گئے، وقوف مزدلفہ حج کی سعی اور رمی جمرات واجب ہیں، ان میں سے کسی ایک کے بھی ترک سے دم لازم آئے گا، دس ذوالحجہ کو طواف زیارت کرنے کے بعد منیٰ لوٹ آئے اور رات وہاں گزارے، اور گیارہ تاریخ کو زوال کے بعد تینوں جمرات پر رمی کرے اور ہر جمرہ پر سات سات کنکریاں مارے، پھر بارہ تاریخ کو اسی طرح کنکریاں مارے۔ دس تاریخ کو رمی کا وقت فجر سے غروب تک ہے اور گیارہ اور بارہ تاریخ کو زوال سے لے کر غروب تک ہے، تیرہ تاریخ کو طلوع فجر سے پہلے منیٰ سے مکہ روانہ ہو سکتا ہے اور اگر تیرہ تاریخ کی فجر کو پالیا تو پھر اس دن کی رمی کرنی ہوگی۔ جب مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے کا ارادہ کرے تو الوداعی طواف کرے، اس کو طواف صدر کہتے ہیں، یہ طواف واجب ہے، افتتاحی طواف کو طواف قدوم کہتے ہیں، یہ مستحب ہے، طواف زیارت فرض ہے اور طواف صدر یا طواف وداع واجب ہے۔ طواف وداع کرنے کے بعد حج کے تمام ارکان اور واجبات ادا ہو گئے اور حج مکمل ہو گیا، اس کے بعد مدینہ منورہ کا سفر کرے اور وہاں آٹھ یا نو دن کے قیام میں کوشش کرے کہ تمام نمازیں مسجد نبوی میں ادا کرے۔

مسجد نبوی میں نمازوں کا اجر و ثواب:

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے میری مسجد میں چالیس نمازیں پڑھیں اور اس کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی اس کے لیے جہنم سے برأت اور عذاب سے نجات لکھ دی جائے گی اور وہ نفاق سے بری ہو جائے گا۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۱۸۸، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

حافظ منذری نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح ہیں اور اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح ہیں اور اس حدیث کو امام طبرانی نے "اوسط" میں روایت کیا ہے۔

(الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۱۵، مطبوعہ دارالحدیث، قاہرہ، ۱۴۰۷ھ)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کی روای ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۸، مطبوعہ دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ)

حضرت ابو درداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ایک لاکھ نمازوں کا اجر ہے اور میری مسجد میں نماز پڑھنے کا ایک ہزار نمازوں کا اجر ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا پانچ سو نمازوں کا اجر ہے۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے "معجم کبیر" میں روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ۴ ص ۸، مطبوعہ دارالکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ)

حافظ المنذری لکھتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر ایک شخص اپنے گھر میں نماز پڑھ لے تو اس کو ایک نماز کا اجر ملتا ہے اور اگر محلہ کی مسجد میں نماز پڑھے تو پچیس نمازوں کا اجر ملتا ہے اور اگر جامع مسجد میں نماز پڑھے تو پانچ سو نمازوں کا اجر ملتا ہے

اور میری مسجد میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اجر ملتا ہے اور مسجد اقصی میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا اجر ملتا ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نمازوں کا اجر ملتا ہے اس حدیث کو ائمہ ستہ میں صرف امام ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۲۱۵، مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ)

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ ثواب میں اضافہ مسجد حرام کے ساتھ نہیں ہے بلکہ پورے حرم مکہ میں کسی جگہ بھی نماز پڑھی جائے تو اتنا ہی ثواب ہوگا۔

(ردالمحتار ج ۲ ص ۱۸۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا طریقہ:

علامہ شَرنُبلالی لکھتے ہیں:

جو شخص نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کا قصد رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ آپ پر درود شریف پڑھے، کیونکہ آپ خود بھی درود شریف کو سنتے ہیں اور فرشتے بھی آپ کے پاس درود شریف پہنچاتے ہیں، جب زائر مدینہ منورہ کی دیواروں کو دیکھے تو درود شریف پڑھ کر یہ کہے:

اے اللہ! یہ تیرے نبی کا حرم ہے اور تیری وحی کے نازل ہونے کی جگہ ہے، تو مجھے یہاں حاضر ہونے کی نعمت عطا فرما اور یہاں کی حاضری کو میرے لیے جہنم سے نجات کا ذریعہ بنادے اور مجھے قیامت کے دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے بہرہ مند فرما اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے غسل کرے، اچھا لباس زیب تن کرے، خوشبو لگائے، پھر انتہائی تواضع اور انکسار کے ساتھ آپ کے روضہ کی طرف روانہ ہو اور درود شریف پڑھتا ہو اور اپنی مغفرت کی دعائیں مانگتا ہوا چلتا رہے اور یہ پڑھے: "بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا اللھم اغفرلی ذنوبی وافتح لی ابواب رحمتک" پھر مسجد شریف میں داخل ہو اور دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے، آپ کی قبر شریف اور منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، اس جگہ دو رکعت بہ طور شکر پڑھے، پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قبر شریف سے چار ہاتھ کے فاصلہ پر ادب سے کھڑا ہو، آپ کے مواجہ شریف (سر اور چہرہ) کی طرف منہ اور کعبہ کی طرف پیٹھ کرے اور یوں سلام عرض کرے: "السلام علیک یاسیدی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، السلام علیك یا نبی الله، السلام علیك یا حبیب الله، السلام علیك یا نبی الرحمة، السلام علیك یا شفیع الامة، السلام علیك یا سید المرسلین، السلام علیك یا خاتم النبیین، السلام علیك یا مزمل، السلام علیك یا مدثر، السلام علیك وعلی اصولك الطیبین، واهل بیتك الطاهرین"، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ نے فریضہ رسالت کو ادا کر دیا اور امانت کو پہنچا دیا اور امت کی خیر خواہی کی اور واضح دلائل بیان کیے اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کیا، اور دین کو قائم کیا حتی کہ آپ رفیق اعلی سے واصل کی خیر خواہی کی اور واضح دلائل بیان کیے اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کیا، اور دین کو قائم کیا حتی کہ آپ رفیق اعلی سے واصل ہو گئے۔ اللہ تعالی آپ پر صلوۃ وسلام نازل فرمائے، جس جگہ آپ اپنے جسد اطہر کے ساتھ تشریف فرما ہیں وہ جگہ تمام جگہوں سے افضل جگہ ہے، اللہ تعالی آپ پر اور اس جگہ پر ہمیشہ اتنی بار صلوۃ وسلام نازل فرمائے جس کا عدد اللہ ہی کے علم میں ہے، یارسول اللہ! یارسول اللہ! ہم آپ کے حرم مقدس اور آپ

کی عظیم بارگاہ میں حاضر ہیں، ہم دور دراز کے علاقوں سے آپ کے حضور میں آپ کی شفاعت کی امید سے آئے ہیں، آپ ہمارے رب کے حضور ہماری شفاعت فرمائیں، گناہوں کے بوجھ سے ہماری کمر ٹوٹ رہی ہے، آپ ہی ایسے شفاعت کرنے والے جن سے شفاعت کبریٰ، مقام محمود اور وسیلہ کا وعدہ کیا گیا ہے اور اللہ نے فرمایا:

(آیت) " ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جآءوك فاستغفروا الله واستغفرلھم الرسول لوجدوا الله توابا رحیما "۔۔ (النساء: ۶۴)

ترجمہ: اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم کر گزریں، تو آپ کے پاس آئیں اور اللہ سے مغفرت طلب کریں اور رسول بھی ان کی شفاعت کریں، تو یہ بیشک اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت رحم کرنے والا پائیں گے۔

اور بیشک ہم اپنی جانوں پر ظلم کرکے آپ کے پاس آئے ہیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں، سو آپ ہمارے لیے اپنے رب سے شفاعت کیجئے اور اللہ سے دعا کیجئے کہ آپ کی سنت پر خاتمہ فرمائے اور آپ کے دین میں ہمیں قیامت کے دن اٹھائے اور ہمیں آپ کے حوض کوثر پر وارد کرے اور بغیر کسی شرمندگی اور رسوائی کے ہمیں آب کوثر پلائے یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شفاعت فرمائیے یارسول اللہ! شفاعت فرمائیے، یارسول اللہ، شفاعت فرمائیے (تین بار ہے) اے اللہ! ہماری مغفرت فرما، اور جو ہم سے پہلے فوت ہوگئے ہیں ان کی مغفرت فرما اور مسلمانوں کے خلاف ہمارے دلوں میں کینہ نہ رکھ، اے رب! تو رؤف رحیم ہے، پھر جن لوگوں نے آپ کو سلام پہنچانے کی درخواست کی تھی، ان کا سلام پیش کرے اور کہے: یارسول اللہ! فلاں فلاں کی طرف سے آپ کو سلام ہو، یارسول اللہ! وہ آپ سے شفاعت کے طلب گار ہیں، ان کی شفاعت فرمائیے پھر درود شریف پڑھ کر جو چاہے دعا کرے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق (رض) کے سر کے بالمقابل کھڑا ہو اور کہے: السلام علیك یا خلیفة رسول الله (صلی الله علیه وآله وسلم)، السلام علیك یا صاحب رسول الله (صلی الله علیه وآله وسلم) انیسه فی الغار ورفیقه فی الاسفار وامینه فی الاسرار " اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین جزاء عطا فرمائے، آپ نے بہترین نیابت کی، اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے طریقہ پر قائم رہے، اور آپ کے طریقہ کے مطابق کار خلافت انجام دیئے، آپ نے مرتدین اور مبتدعین سے قتال کیا اور اسلام کے قلعہ کو مضبوط کیا، آپ بہترین امام تھے، آپ تادم حیات دین کی خدمت کرتے رہے، آپ اللہ سبحانہ سے دعا کریں کہ وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ آپ کی محبت رکھے اور قیامت کے دن ہمیں آپ کی جماعت میں اٹھائے اور ہماری زیارت کو قبول فرمائے، السلام علیک ورحمۃ اللہ۔

اس کے بعد حضرت عمر فاروق (رض) کے سر کے بالمقابل کھڑا ہو اور یوں سلام عرض کرے۔ " السلام علیك یا امیر المومنین، السلام علیك یا مظھر الاسلام، السلام علیك یا مکسر الاصنام " اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے بہترین جزاء عطا فرمائے، آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی نصرت فرمائی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد بڑے بڑے شہروں کو فتح کیا۔ یتیموں کی کفالت کی اور صلہ رحمی کی، اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وزیرو! رفیقو! مشیرو! اور دین قائم کرنے میں آپ کی معاونت کرنے والو! اور آپ کے بعد مسلمانوں کی بہتری کیلیے کارہائے نمایاں کرنے والو! آپ دونوں پر سلام ہو، اللہ آپ کو ہماری طرف سے تمام مسلمانوں کی طرف بہترین جزاء عطا فرمائے، ہم آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ رسول اللہ (صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے درخواست کریں کہ حضور ہماری شفاعت فرمائیں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائیں کہ وہ ہماری اس حج اور زیارت کو قبول فرمائے' ہمیں آپ کے دین پر زندہ رکھے اور اسی پر ہمارا خاتمہ فرمائے اور آپ کی جماعت میں ہمارا حشر فرمائے' پھر اپنے لیے دعا کرے' اپنے والدین کے لیے دعا کرے اور جنہوں نے دعا کی درخواست کی تھی ان کے لیے دعا کرے' پھر تمام مسلمانوں کے لیے دعا کرے' پھر دوبارہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مواجہہ شریف میں جا کر کھڑا ہو' اس طرح سلام پیش کرے اور آپ سے شفاعت کی درخواست کرے اور اسی طرح دعا کرے۔

حضرت ابولبابہ (رض) کے ستون کے پاس نماز پڑھے' اور دیگر متبرک مقامات پر نمازیں پڑھے' بقیع شریف میں جائے شہداء احد کی قبروں پر جائے حضرت سیدنا امیر حمزہ (رض) کی قبر پر فاتحہ پڑھے' حضرت عثمان (رض) حضور کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم (رض)' ازواج مطہرات اور دیگر شہداء کی قبروں پر حاضر ہو اور تمام مزارات پر آیۃ الکرسی پڑھے' گیارہ بار سورۃ اخلاص پڑھے اور اگر یاد ہو تو سورۃ یسین پڑھے۔ وہاں دو رکعت نماز پڑھنے کا اجر عمرہ کے برابر ہے۔

(سنن کبری ج ۵ ص ۲۴۸)

مسجد قبلتین' مساجد سبع اور تمام مشاہد کی زیارت کرے۔

(مراقی الفلاح ص ۴۵۱۔ ۴۴۸' ملخصا' مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ مصر' ۱۳۵۶ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے پورا کرو۔ (البقرہ: ۱۹۶)

اس کا معنی یہ ہے کہ حج اور عمرہ کے تمام شرائط' فرائض اور واجبات کو ادا کرو' کہ یہ کامل ہوں ناقص نہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو اگر تم کو (حج یا عمرہ سے) روک دیا جائے تو جو قربانی تم کو آسانی سے حاصل ہو وہ بھیج دو اور جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈواؤ۔ (البقرہ: ۱۹۶)

یعنی اپنے احرام پر برقرار رہو اور حلال نہ ہو۔

احصار (حج یا عمرہ کے سفر میں پیش آنے والی رکاوٹ) کی تعریف میں مذاہب ائمہ:

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اگر دشمن سفر حج پر نہ جانے دے اور راستہ میں کسی جگہ روک لے تو یہ احصار ہے' اب محرم حرم میں قربانی بھیج دے اور جب قربانی ذبح ہو جائے گی تو وہ حلال ہو جائے گا' امام ابوحنیفہ کے نزدیک راستہ میں دشمن کے روکنے کے علاوہ راستہ میں بیمار ہو جانا اور سفر کے قابل نہ رہنا بھی احصار ہے اور لغت میں احصار اسی کو کہتے ہیں اور احادیث بھی اس کی موید ہیں' علماء مذاہب کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

اگر دشمن حج یا عمرہ کے لیے جانے نہ دے تو یہ احصار (روک دینا) حضرت ابن عباس (رض)' حضرت ابن عمر' اور حضرت انس بن مالک کا یہی قول ہے اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۲۵۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ ابن عربی مالکی لکھتے ہیں:

احصار دشمن کو منع کرنے اور روکنے کے ساتھ خاص ہے' حضرت ابن عباس' حضرت ابن عمر اور حضرت انس بن مالک کا یہی

قول ہے اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے' لیکن اکثر علماء لغت کی رائے یہ ہے کہ "احصر" کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کو مرض عارض ہو اور وہ اس کو کسی جگہ جانے سے روک دے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

احصار صرف دشمن کے روکنے سے ہوتا ہے مریض کو محصر نہیں کہتے حضرت ابن عمر' حضرت ابن عباس اور حضرت انس کا یہی قول ہے' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا یہی مذہب ہے' لیکن ابن قتیبہ نے یہ کہا ہے کہ جب مرض یا دشمن سفر کرنے سے روک دیں تو یہ احصار ہے۔

(زاد المیسر ج ۱ ص ۲۰۴' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابوبکر جصاص حنفی لکھتے ہیں:

کسائی' ابوعبیدہ اور اکثر اہل لغت نے یہ کہا ہے کہ مرض اور زاد راہ گم ہو جانے کی وجہ سے جو سفر جاری نہ رہ سکے اس کو احصار کہتے ہیں' اور اگر دشمن سفر نہ کرنے دے تو اس کو حصر کہتے ہیں' حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ اس میں دشمن اور مرض برابر ہیں۔ ایک دم (ھدی کے قربانی کا جانور) بھیج کر محرم حلال ہو جائے گا جب کہ اس جانور کو حرم میں ذبح کر دیا جائے' امام ابوحنیفہ' امام ابو یوسف' امام محمد' امام زفر اور ثوری کا یہی مذہب' علامہ جصاص کہتے ہیں کہ جب لغت سے ثابت ہو گیا کہ احصار کا معنی مرض کا روکنا ہے تو اس آیت کا حقیقی معنی یہی ہے کہ جب کوئی مرض تم کو حج یا عمرہ سے روک دے اور دشمن کا روکنا اس میں حکماً داخل ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲٦۸' مطبوعہ سہیل اکیڈمی' لاہور' ۱۴۰۰ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف پر ائمہ لغت کی تصریحات:

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ائمہ لغت میں سے ابن قتیبہ' ابوعبیدہ اور کسائی نے یہ کہا ہے کہ سفر میں مرض کا لاحق ہونا احصار ہے' اسی سلسلہ میں مشہور امام لغت فراء لکھتے ہیں:

جو شخص سفر میں خوف یا مرض کے لاحق ہونے کی وجہ سے حج یا عمرہ کو پورا نہ کر سکے اس کے لیے عرب احصار کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

(معانی القرآن ج ۱ ص ۱۱۷' مطبوعہ بیروت)

علامہ حماد جوہری لکھتے ہیں:

ابن السکیت نے کہا: جب کسی شخص کو مرض سفر سے روک دے تو کہتے ہیں "حصرہ المرض" اخفش نے کہا: جب کسی شخص کو مرض روک دے تو کہتے ہیں: "احصرنی مرضی"۔

(الصحاح ج ۲ ص ٦۳۲' مطبوعہ دار العلم بیروت' ۱۴۰۴ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف پر احادیث سے استدلال:

احادیث میں تصریح ہے کہ جب کوئی شخص مرض لاحق ہونے کی وجہ سے حج یا عمرہ کا سفر جاری نہ رکھ سکے تو اگلے سال اس کی

قضاء کرے۔ امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت حجاج بن عمرو انصاری کہتے ہیں کہ جس شخص کی ہڈی ٹوٹ گئی یا ٹانگ ٹوٹ گئی تو وہ حلال ہوگیا اور اس پر اگلے سال حج ہے ایک اور سند سے روایت ہے: یا وہ بیمار ہوگیا۔

(سنن ابو داؤد ج۱ ص ۲۵۷، مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان لاہور ۱۴۰۰ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی۔ ۱ (امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، جامع ترمذی ص ۱۵۶ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

امام ابن ماجہ۔ ۲ (امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ، سنن ابن ماجہ ص ۲۲۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اور امام ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ۳ (امام ابوبکر احمد بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ، المصنف ج ۱۔ ٤ ص ۱۳۹۔ ۱۳۸، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۰٦ھ)

امام بخاری لکھتے ہیں:

عطاء نے کہا: ہر وہ چیز جو حج کرنے سے روک دے وہ احصار ہے۔

(صحیح بخاری ج۱ ص ۲۴۳، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: جس شخص کو کوئی عذر حج کرنے سے روک دے یا اس کے سوا اور کوئی چیز مانع ہو تو وہ حلال ہو جائے اور رجوع نہ کرے اور جس وقت وہ محصر ہو تو اگر اس کے پاس قربانی ہو اور وہ اس کو حرم میں بھیجنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہیں ذبح کر دے، اور اگر وہ اس کو حرم میں بھیجنے کی استطاعت رکھتا ہو تو جب تک وہ قربانی حرم میں ذبح نہیں ہوگی وہ حلال نہیں ہوگا۔

(صحیح بخاری ج۱ ص ۲۴۴۔ ۲۴۳ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں عذر کے لفظ سے استدلال ہے جو عام ہے اور دشمن کے منع کرنے اور بیمار پڑنے دونوں کو شامل ہے۔

امام ابوحنیفہ کے موقف پر آثار صحابہ سے استدلال:

امام ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن الزبیر (رض) فرماتے ہیں: جس شخص نے حج کا احرام باندھا، پھر وہ بیمار ہوگیا یا کوئی اور رکاوٹ پیش آگئی تو وہ وہاں ٹھہرا رہے حتیٰ کہ ایام حج گزر جائیں، پھر عمرہ عمرہ کر کے لوٹ آئے اور اگلے سال حج کرے۔

(المصنف ج ۱۔ ٤ ص ۱۴۱، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۰٦ھ)

عبدالرحمن بن یزید بیان کرتے ہیں کہ ہم عمرہ کرنے گئے جب ہم ذات السقوف میں پہنچے تو ہمارے ایک ساتھی کو (سانپ یا) بچھو نے ڈس لیا، ہم راستہ میں بیٹھ گئے تاکہ اس کا شرعی حکم معلوم کریں، ناگاہ ایک قافلہ میں حضرت ابن مسعود آپہنچے ہم نے بتایا کہ ہمارا ساتھی ڈسا گیا ہے، حضرت ابن مسعود نے فرمایا: اس کی طرف سے ایک قربانی حرم میں بھیجو اور ایک دن مقرر کرلو، جب وہ ھدی حرم میں ذبح کر دی جائے تو یہ حلال ہو جائے گا۔

(المصنف ج ۱۔ ٤ ص ١٤١، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ١٤٠٦ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف پر اقوال تابعین سے استدلال:

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مجاہد بیان کرتے ہیں: جس شخص کو حج یا عمرہ کے سفر میں کوئی رکاوٹ درپیش ہو خواہ مرض ہو یا دشمن وہ احصار ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ١٢٤، مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت، ١٤٠٩ھ)

عطاء نے کہا: ہر وہ چیز جو سفر سے روک دے وہ احصار ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ١٢٤، مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت، ١٤٠٩ھ)

قتادہ نے کہا: جب کوئی شخص مرض یا دشمن کی وجہ سے سفر جاری نہ رکھ سکے تو وہ حرم میں ایک قربانی بھیج دے اور جب وہ قربانی ذبح ہو جائے گی تو وہ حلال ہو جائے گا۔

(جامع البیان ج ۲ ص ١٢٤، مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت، ١٤٠٩ھ)

ابراہیم نخعی نے کہا: مرض ہو یا ہڈی ٹوٹ جائے یا دشمن نہ جانے دے، یہ سب احصار ہیں۔

(جامع البیان ج ۲ ص ١٢٤، مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت، ١٤٠٩ھ)

امام ابوحنیفہ کے موقف کی ہمہ گیری اور معقولیت:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارشاد آثار صحابہ اور اقوال تابعین، ائمہ لغت کی تصریحات ان سب سے امام ابوحنیفہ کا مسلک ثابت ہے کہ احصار دشمن کے روکنے اور مرض کے خارج ہونے دونوں کو شامل ہے اور اس میں یسر اور سہولت ہے، اسلام ہر مسئلہ کا حکم پیش کرتا ہے ائمہ ثلاثہ کے موقف پر یہ اشکال ہوگا کہ جو شخص حج یا عمرہ کے سفر میں کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے تو اس کے لیے اسلام میں کیا حل ہے؟ ہر چند کہ اب ہوائی جہاز کے ذریعہ بیشتر حجاج کرام حج اور عمرہ کا سفر کرتے ہیں لیکن پھر بھی بہت سے علاقوں سے لوگ سڑک کے ذریعہ سفر کرتے ہیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ٦ ہجری میں اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ منورہ سے سے مکہ مکرمہ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تھے جب آپ مقام حدیبیہ پر پہنچے تو کفار نے آپ کو مکہ جانے سے روک دیا۔ امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر کے دو بیٹے سالم اور عبیداللہ بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں حجاج نے حضرت ابن الزبیر پر مکہ میں حملہ کیا ہوا تھا، ان دنوں میں حضرت ابن عمر نے حج کا ارادہ کیا، ان کے بیٹوں نے منع کیا کہ اس سال آپ حج نہ کریں، ہمیں خدشہ ہے کہ آپ کو بیت اللہ جانے سے روک دیا جائے گا، حضرت ابن عمر (رض) نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے آپ کے اور بیت اللہ کے درمیان کفار حائل ہو گئے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی قربانی کی اونٹنی کو نحر کیا اور اپنا سر مونڈ لیا اور میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ لازم کر لیا ہے، میں انشاء اللہ روانہ ہوں گا، اگر کوئی رکاوٹ نہ ہوئی تو میں عمرہ کروں گا اور اگر کوئی رکاوٹ پیش آئی تو میں طرح کروں گا جس طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کیا تھا پھر انھوں نے عمرہ کا احرام باندھا، پھر کچھ دور چل کر کہا:

احصار میں عمرہ اور حج دونوں برابر ہیں' میں عمرہ کے ساتھ حج کی نیت کرتا ہوں' پھر یوم نحر کو قربانی کر کے وہ حلال ہو گئے۔
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۳ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

ہر چند کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جو احصار پیش آیا تھا' وہ دشمن کی وجہ سے تھا لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مرض کی وجہ سے رکاوٹ کو بھی یہ حل بیان فرمایا ہے اس لیے دلائل شرعیہ کی قوت' یسر' ہمہ گیری اور معقولیت کے اعتبار سے ائمہ ثلاثہ کے موقف کی بہ نسبت امام ابوحنیفہ (رح) کا مسلک راجح ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو اگر تم کو (حج یا عمرہ سے) روک دیا جائے تو جو قربانی تم کو آسانی سے حاصل ہو وہ بھیج دو' اور جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک اپنے سروں کو نہ منڈواؤ۔ (البقرہ: ۱۹۶)

محصر کے لیے قربانی کی جگہ کے تعین میں امام ابوحنیفہ کا مسلک:

امام ابوحنیفہ کے جو شخص راستہ میں مرض یا دشمن کی وجہ سے رک جائے وہ کسی اور شخص کے ہاتھ قربانی (اونٹ' گائے یا بکری) یا اس کی قیمت بھی دے اور ایک دن مقرر کرے کہ فلاں دن اس قربانی کو حرم میں ذبح کیا جائے گا اور اس دن وہ اپنا احرام کھول دے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس وقت تک سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے اور قربانی کی جگہ حرم ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جس جگہ کسی شخص کو رک جانا پڑے وہیں قربانی کر کے احرام کھول دے' کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حدیبیہ میں رک جانا پڑا تھا اور آپ نے حدیبیہ میں ہی قربانی کی' اور امام بخاری نے لکھا ہے کہ حدیبیہ حرم سے خارج ہے۔
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۴' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

علامہ بدر الدین عینی اس دلیل کے جواب میں فرماتے ہیں کہ حدیبیہ کا بعض حصہ حرم سے خارج ہے اور بعض حصہ حرم میں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حدیبیہ کے جس حصہ میں رکے تھے وہ حرم میں تھا' اس کی دلیل یہ ہے کہ امام ابن ابی شیبہ نے ابو عمیس سے روایت کیا ہے کہ عطاء نے کہا ہے کہ حدیبیہ کے دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قیام حرم میں تھا۔
(عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۱۴۹' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر ۱۳۴۸ھ)

علامہ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جس جگہ روک دیا گیا تھا آپ نے وہیں قربانی کی تھی وہ جگہ حدیبیہ کی ایک طرف تھی جس کا نام الربی ہے اور یہ اسفل مکہ میں ہے اور وہ حرم ہے' زہری سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اونٹ کو حرم میں نحر کیا تھا' واقدی نے کہا: حدیبیہ مکہ سے نو میل کے فاصلہ پر طرف حرم میں ہے۔
(البحر المحیط ج ۲ ص ۲۵۷' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۱۲ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حتیٰ کہ قربانی اپنے محل میں پہنچ جائے۔ (البقرہ: ۱۹۶)

محصر کے لیے قربانی کی جگہ کے تعین میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب:

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں:

محل کے متعلق دو قول ہیں ایک یہ کہ اس سے مراد حرم ہے حضرت ابن مسعود، حسن بصری، عطاء طاؤس، مجاہد، ابن سیرین، ثوری اور امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جس جگہ محرم کو رکاوٹ پیش آئی وہ اس جگہ قربانی کا جانور ذبح کر کے احرام کھول دے، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا یہی مذہب ہے۔

(زاد المیسر ج ۱ ص ۲۰۵، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ ماوردی شافعی۔ ۱ (علامہ ابوالحسن علی بن حبیب شافعی ماوردی بصری متوفی ۴۵۰ھ النکت والعیون ج ۱ ص ۲۵۵، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

اور علامہ ابن العربی۔ ۲ (علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن العربی مالکی متوفی ۵۴۳ھ (احکام القرآن ج ۱ ص ۱۷۶، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۸ھ) مالکی نے بھی یہی لکھا ہے۔

قوت دلائل کے اعتبار سے ابوحنیفہ کا مسلک راجح ہے اور یسر اور سہولت کے اعتبار سے ائمہ ثلاثہ کا مسلک راجح ہے کیونکہ بیمار یا دشمن میں گھرے ہوئے آدمی کے لیے اس وقت تک انتظار کرنا جب تک قربانی حرم میں ذبح ہو بہت مشکل اور دشوار ہوگا اس کے برعکس موضع احصار میں قربانی کر کے احرام کھول دینے میں اس کے لیے بہت آسانی ہے جب کہ اس طریقہ کو محصر کی آسانی ہی کے لیے مشروع کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو وہ اس کے بدلہ میں روزے رکھے یا کچھ صدقہ دے یا قربانی کرے۔ (البقرہ: ۱۹۶)

ضرورت کی وجہ سے منیٰ میں پہنچنے سے پہلے سر منڈانے کی رخصت:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

عبداللہ بن معقل بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت کعب بن عجرہ (رض) کے پاس مسجد کوفہ میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے ان سے روزہ کے فدیہ کے متعلق سوال کیا انھوں نے کہا: مجھے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے جایا گیا در آں حالیکہ میرے منہ پر جوئیں ٹپک رہی تھیں آپ نے فرمایا: میں تم پر کیسی مصیبت دیکھ رہا ہوں، کیا تمہارے پاس (قربانی کیلیے) ایک بکری نہیں ہے؟ میں نے کہا: نہیں، آپ نے فرمایا: تین دن کے روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، ہر مسکین کو نصف صاع (دو کلو گرام) طعام (گندم) دو، اور اپنا سر منڈا دو یہ آیت خاص میرے متعلق نازل ہوئی ہے لیکن تمہارے لیے بھی عام ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۲، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

ملا جیون حنفی لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص مریض ہو اور اس کو فوراً سر منڈانے کی حاجت ہو، یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو مثلاً کوئی زخم ہو یا جوئیں ہوں، تو پھر اس کے لیے منیٰ پہنچنے اور قربانی کرنے تک سر منڈانے کو موقوف کرنا ضروری نہیں ہے، البتہ سر منڈانے کے بعد اس پر فدیہ دینا واجب ہوگا، قربانی کرے، تین دن کے روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے قربانی کو حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے اور روزہ رکھنا یا مسکینوں کو کھانا کھلانا حرم میں ضروری نہیں ہے۔

(تفسیرات احمدیہ ص ۸۸، مطبوعہ مطبع کریمی، بمبئی)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جب تم حالت امن میں ہو تو جو شخص حج کے ساتھ عمرہ ملائے تو وہ ایک قربانی کرے جس کو وہ آسانی کے ساتھ کر سکے' اور جو قربانی نہ کر سکے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات روزے جب تم لوٹ آؤ' یہ کامل دس (روزے) ہیں یہ (حج تمتع کا) حکم اس شخص کے لیے جس کے اہل وعیال مسجد حرام (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے نہ ہوں۔ (البقرہ: ١٩٦)

حج تمتع کا بیان:

اس آیت کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ اس آیت میں زمانہ امن میں حج تمتع کا بیان فرمایا ہے' دوسری تفسیر یہ ہے کہ اے مسلمانو! اگر تم سفر حج میں روک دیئے جاؤ تو تم کو جو قربانی سہولت سے حاصل ہو وہ قربانی کر کے احرام کھول دو' اور جب تم سے دشمن کا خوف جاتا رہے یا مرض دور ہو جائے اور تم حج کے ساتھ عمرہ ملاؤ تو ایک قربانی کرو جس کو آسانی کے ساتھ کر سکو۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں تمتع کیا اور قرآن (اس کے موافق) نازل ہو چکا تھا' پھر ایک شخص نے اپنی رائے سے جو چاہا کہا۔

(صحیح بخاری ج ١ ص ٢١٣' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٨١ ھ)

اس قول میں حضرت عمر اور حضرت عثمان (رض) کی طرف تعریض ہے جو تمتع کرنے سے تنزیہا منع کرتے تھے اکابر علماء صحابہ نے ان کی مخالفت کی اور اس کا انکار کیا اور حق ان ہی کے ساتھ ہے۔

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) سے حج تمتع کے متعلق سوال کیا گیا انھوں نے فرمایا: مہاجرین اور انصار اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج اور ہم نے حجۃ الوداع میں احرام باندھا' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جن لوگوں نے قربانی کے جانوروں کے گلے میں ہار ڈال دیا ہے۔ ا (کیونکہ قربانی کے گلے میں ہار ڈالنے سے حج کی نیت ہو گئی اور جنہوں نے ہار نہیں ڈالا تھا ان کی نیت نہیں ہوئی تھی' ان کو آپ نے عمرہ کرنے کی نیت کا حکم دیا) ان کے سوا باقی لوگ حج کے احرام میں عمرہ کی نیت کر لیں' سو ہم نے بیت اللہ کا طواف کیا' صفا اور مروہ میں سعی کی' اور (احرام کھول کر) اپنی اپنی ازواج سے مقاربت کی اور سلے ہوئے کپڑے پہن لیے' اور جن لوگوں نے اپنی قربانی کے جانوروں میں قلادہ (ہار) ڈال دیا تھا وہ (عمرہ کرنے کے بعد بھی) بہ دستور اپنے احرام پر برقرار رہے' کیونکہ جب تک ان کی قربانی اپنی جگہ پر ذبح نہ ہو جاتی وہ احرام نہیں کھول سکتے تھے' پھر آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم آٹھ ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ لیں' سو جب ہم عرفات اور مزدلفہ کے وقوف سے فارغ ہو گئے تو ہم نے بیت اللہ میں آ کر طواف (زیارت) کیا' اور صفا اور مروہ میں سعی کی تو ہمارا حج مکمل ہو گیا اور ہم پر ایک قربانی لازم تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: (آیت) "فما استیسر من الھدی"۔ (البقرہ: ١٩٦) اور ایک بکری کی قربانی کافی ہے" سو ان لوگوں نے ایک سال میں حج اور عمرہ کی دو عبادتیں جمع کر لیں' اس حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اور یہ اس کے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت ہے اور اس تمتع کو مکہ والوں کے سوا باقی تمام مسلمانوں کے لیے مشروع فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (آیت) "ذلک لمن لم یکن اھلہ حاضری المسجد الحرام"۔ (البقرہ: ١٩٦) اور حج کے جن مہینوں کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے وہ شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں' سو جو شخص ان مہینوں میں تمتع کرے اس پر قربانی لازم ہے یا روزے

(صحیح بخاری ج ١ ص ٢١٤۔ ٢١٣' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ١٣٨١ ھ)

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو حج کیا وہ حج قران تھا اور یہی سب سے افضل حج ہے۔

حج کے احکام

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۖ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حج کے دوران) اپنے رب کا فضل (روزی) تلاش کرنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ (البقرہ: ۱۹۸)

* حج کے دوران روزی کمانے کا جواز *

جب اللہ تعالیٰ نے ایام حج میں جدال (بحث اور تکرار) کرنے سے منع کیا تو یہ وہم پیدا ہوا کہ شاید ایام حج میں تجارت بھی ممنوع ہو کیونکہ اس میں قیمت پر بحث ہوتی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ عکاظ، مجنہ ' اور ذوالمجاز زمانہ جاہلیت کے بازار تھے، جب اسلام آیا تو مسلمانوں نے ان بازاروں میں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا تو یہ آیت نازل ہوئی کہ (زمانہ حج میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۷۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے بھی روایت کیا ہے۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۲۴۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

اس آیت سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ ایام حج میں تجارت کرنا، محنت مزدوری اور ہر جائز طریقہ سے کسب معاش کرنا جائز ہے اور اس سے حج کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

امام عبدالرزاق، امام سعید بن منصور، امام ابن ابی شیبہ، امام عبد بن حمید، امام ابوداؤد، امام ابن جریر، امام ابن المنذر، امام ابن ابی حاتم، امام حاکم اور امام بیہقی روایت کرتے ہیں: ابوامامہ تیمی نے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے سوال کیا: ہم لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں کیا ہمارے لیے حج کا اجر وثواب ہوگا؟ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: کیا تم لوگ بیت اللہ کا طواف نہیں کرتے؟ اور کیا تم اپنے سروں کو نہیں مونڈتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں حضرت ابن عمر (رض) نے کہا: ایک شخص نے آکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہی سوال کیا جو تم نے مجھ سے کیا ہے، آپ نے اس کو کوئی جواب نہیں، حضرت ابن عمر نے کہا: ایک شخص نے آکر رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہی سوال گیا جو تم نے مجھ سے کیا ہے' آپ نے اسکو کوئی جواب نہیں دیا حتی کہ جبرائیل (علیہ السلام) یہ آیت لے کر نازل ہوئے کہ (زمانہ حج میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(درمنثور'ج۱ص ۲۲۲'مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

اگر حج کے دوران ضمناً تجارت یا محنت مزدوری ہو جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر کوئی شخص بالقصد ایام حج میں تجارت کیلیے یا مزدوری کے لیے جائے اور ضمناً حج کرلے تو یہ اخلاص کے منافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب تم عرفات سے (مزدلفہ میں) آؤ تو مشعر حرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور جس طرح اس نے تم کو ہدایت دی ہے اس طرح اس کا ذکر کرو۔ (البقرہ:۱۹۸)

مشعر حرام کا بیان:

امام ابن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عرفات کو عرفات اس لیے کہتے ہیں کہ حضرت جبرائیل نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو مناسک کی تعلیم دی اور بار بار کہتے: "عرفت عرفت" (آپ نے جان لیا' آپ نے جان لیا) تو اس جگہ کا نام میدان عرفات پڑ گیا۔

(جامع البیان ج ۲ ص' ۱٦۷ مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

مشعر حرام کی تفسیر میں امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نے لوگوں کو مزدلفہ میں ایک پہاڑ کے پاس جمع ہوتے ہوئے دیکھا تو آپ نے کہا: اے لوگو! تمام مزدلفہ مشعر حرام ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص' ۱٦۷ مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

سدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے مشعر حرام کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: دو پہاڑوں کے درمیان جو جگہ ہے وہ مشعر حرام ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص' ۱٦۷ مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے مشعر حرام کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے اس کو اپنے ساتھ لے جا کر دکھایا کہ عرفات کے بعد جہاں سے مزدلفہ کی ابتداء ہوتی ہے وہاں سے لے کر حرم تک مزدلفہ کی ساری وادی مشعر حرام ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص' ۱٦۸ مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کیا جائے اور اپنے گناہوں پر معافی طلب کی جائے۔

قیام منیٰ کی مدت کا بیان:

ملا جیون حنفی لکھتے ہیں:

جو شخص ایام منی میں سے صرف دس اور گیارہ تاریخ کو منی میں فقد دو دن ٹھہرا اور اس نے دو دن رمی کی اور تیسرے دن رمی نہیں کی اس پر کوئی حرج نہیں ہے، اور جس نے تاخیر کی اور تیسرے دن بھی رمی کی اس پر بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ صاحب "ہدایہ" نے یہ ذکر کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ وہ طلوع فجر سے پہلے چوتھے دن بغیر رمی کے مکہ روانہ ہو جائے اور اگر چوتھے دن کی فجر منی میں طلوع ہوگئی تو وہ رمی کے بغیر مکہ روانہ نہیں ہوسکتا اور افضل یہ ہے کہ وہ چوتھے دن بھی منی میں ٹھہرے اور چوتھے دن کی رمی کر کے مکہ مکرمہ روانہ ہو کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسی طرح کیا تھا اور اگر اس نے چوتھے دن زوال سے پہلے رمی کر لی تو یہ بھی امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے کیونکہ جب وہ رمی کو ترک کر سکتا ہے تو اس کو وقت سے پہلے بھی کر سکتا ہے۔ یہ قرآن کریم میں مسائل حج کا آخری عنوان ہے۔

(تفسیرات احمدیہ ص ۹۹۔ ۹۸، مطبوعہ مطبع کریمی، بمبی)

حجاج کرام کے اجر و ثواب اور ان سے مصافحہ کرنے کے متعلق احادیث و آثار:

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن ابی شیبہ، شعبی سے روایت کرتے ہیں انھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ مناسک حج اس لیے بنائے ہیں تاکہ بنو آدم کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیں۔ امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں روایت کیا ہے کہ حسن بصری ؒ سے پوچھا گیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ حج کرنے والا بخش دیا جاتا ہے، انھوں نے کہا: بشرطیکہ وہ ان گناہوں کو ترک کر دے جن کو پہلے کرتا تھا۔

امام اصبہانی نے "ترغیب" میں روایت کیا ہے کہ ابراہیم نے کہا کہ حجاج کے گناہوں میں آلودہ ہونے سے پہلے مصافحہ کرلو۔

امام اصبہانی نے روایت کیا ہے کہ حسن بصری سے پوچھا گیا کہ حج مبرور کی کیا تعریف ہے؟ انھوں نے کہا: وہ حج کرنے کے بعد دنیا سے مستغنی ہو اور آخرت میں راغب ہو۔

امام حاکم نے تصحیح حدیث کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم حج پورا کرلو تو جلد گھر کی طرف روانہ ہو اس سے زیادہ اجر ملے گا۔

امام مالک، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حج یا عمرہ سے لوٹنے کے بعد کسی بلند جگہ کھڑے ہو کر تین مرتبہ تکبیر پڑھتے پھر یہ دعا کرتے: "لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ وھو علی کل شی قدیر ائبون تائبون، عابدون ساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ"۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۳۷، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

رسول اللہ ﷺ پر سلام عرض کرنے اور شفاعت طلب کرنے کے متعلق احادیث اور آثار:

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام ابن حبان نے "الضعفاء" میں امام ابن عدی نے "کامل" میں اور امام دارقطنی نے "العلل" میں حضرت ابن عمر (رض) سے

روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔

امام سعید بن منصور امام ابو یعلیٰ امام طبرانی، امام ابن عدی، امام بیہقی اور امام ابن عساکر نے حضرت ابن عمر (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے حج کیا اور میری وفات کے بعد میری قبر کی زیارت کی گویا اس نے میری حیات میں میری زیارت کی۔

(سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۴۶، المعجم الکبیر ج ۱۲، ص ۳۱۰، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲)

اماحکیم ترمذی، امام بزاز، امام ابن خزیمہ، امام بن عدی، امام دارقطنی اور امام بیہقی نے حضرت ابن عمر (رض) سے روایت کیا کہا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔

(کامل ابن عدی ج ۶ ص ۲۳۵، شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۰، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۲، کنز العمال رقم الحدیث: ۴۲۵۸۳)

امام طبرانی حضرت ابن عمر (رض) سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص بغیر کسی اور کام کے صرف میری زیارت کے لیے آیا مجھ پر واجب ہے کہ میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں۔

(المعجم الکبیر ج ۱۲ ص ۲۲۵)

امام طیالسی اور امام بیہقی نے حضرت ابن عمر (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی میں اس کی شفاعت کروں گا یا شہادت دوں گا اور جو شخص حرمین میں سے کسی ایک حرم میں فوت ہوگیا وہ قیامت کے دن امن والوں میں سے اٹھے گا۔

(سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۴۵، شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۶)

امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر پر آکر سلام عرض کرتے اور قبر کو چھوتے نہیں تھے، پھر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رض) کی قبر پر سلام عرض کرتے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ محمد بن منکدر نے کہا کہ میں نے حضرت جابر (رض) کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر کے پاس روتے ہوئے دیکھا انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری قبر اور منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۴۶، سنن کبریٰ ج ۵ ص ۲۴۶، کشف الاستار ج ۲ ص ۵۶، کنز العمال ج ۱۲ ص ۲۶۰)

امام ابن ابی الدنیا اور امام بیہقی نے منیب بن عبداللہ بن ابی امامہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے دیکھا حضرت انس بن مالک (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر پر آکر کھڑے ہوئے اور بڑی دیر تک ہاتھ بلند کیے رہے بلند کیے رہے حتیٰ کہ میں نے گمان کیا کہ وہ نماز کی نیت کر رہے ہیں، پھر سلام عرض کیا اور چلے گئے۔

(شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۱)

امام بیہقی، حاتم بن مروان سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کسی قاصد کو مدینہ میں بھیجتے تاکہ وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سلام عرض کرے۔

(شعب الایمان ج ۳ ص ۴۹۲۔۴۹۱)

امام بیہقی، ابوحرب ہلالی سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے حج کیا، جب وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مسجد کے دروازہ پر آیا تو اس نے اپنی اونٹنی کو وہاں باندھ دیا، پھر مسجد میں داخل ہوا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر کے پاس گیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چہرہ کے سامنے کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ پر میرے ماں اور باپ فدا ہوں، میں آپ کے پاس اپنے گناہوں اور خطاؤں کے بوجھ تلے دبا ہوا آیا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: (آیت) "ولو انہم اذ ظلموا انفسھم" ۔الایۃ" (النساء: ٦٤) "اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم کربیٹھیں تو آپ کے پاس آکر اللہ سے استغفار کریں، اور رسول اللہ بھی ان کی شفاعت کردیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائیں گے" اور میں گناہوں سے بوجھل ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں آپ اپنے رب کی حضور میری شفاعت کریں کہ وہ میرے گناہوں کو بخش دے اور آپ کی شفاعت کو قبول فرمائے۔

(شعب الایمان ج ٣ ص ٤٩٦۔ ٤٩٥) (الدر المنثور ج ١ ص ٢٣٨۔ ٢٣٧ ملتقطا مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ النجفی ایران)

حج کے مہینوں کے متعلق فقہاء امت کے نظریات:

حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عمر (رض)، عطاء طاؤس، مجاہد، زہری، ربیع اور امام مالک کے نزدیک شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ پورے کے پورے حج کے مہینے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رض)، حضرت عبداللہ بن الزبیر (رض) ابن سیرین، حسن، شعبی، نخعی، قتادہ، مکحول، سدی، امام ابوحنیفہ اور امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے دس دن حج کے مہینے ہیں۔

(البحر المحیط ج ٢ ص ٢٧٧ مطبوعہ دارالفکر، بیروت، ١٤١١ھ)

اور امام احمد بن حنبل کا بھی یہی نظریہ ہے۔

(زادالمیسر ج ١ ص ٢٠٩، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ١٤٠٧ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو شخص ان مہینوں میں (حج کرکے) حج کو لازم کرلے۔

(البقرہ: ١٩٧)

فرضیت حج کے سبب میں ائمہ مذاہب کے اقوال:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) نے فرمایا: حج کا احرام باندھ کر تلبیہ پڑھنے سے حج فرض ہوجاتا ہے، عطاء طاؤس اور صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے کہا: حج کی نیت سے تلبیہ پڑھنے سے حج فرض ہوجاتا ہے، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کے نزدیک حج کی نیت کے ساتھ احرام باندھ کر تلبیہ پڑھنے یا حج کی نیت سے احرام باندھ کر قربانی کے گلے میں قلادہ (ہار) ڈال کر اس کو روانہ کرنے سے حج فرض ہوجاتا ہے، یا حج کی نیت سے احرام باندھ کر اشعار کرنے سے حج فرض ہوجاتا ہے۔

امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک تلبیہ کے بغیر بھی حج کی نیت کے ساتھ احرام باندھنے سے حج فرض ہوجاتا ہے۔

(البحر المحیط ج ٢ ص ٢٧٩ مطبوعہ دارالفکر، بیروت، ١٤١١ھ)

امام احمد بن حنبل نے یہ تصریح کی ہے کہ حج کی نیت سے صرف احرام باندھنے سے حج فرض ہوجاتا ہے خواہ تلبیہ نہ

پڑھا جائے۔

(زاد المیسر ج۱ ص ۲۱۰ ٬ مطبوعہ مکتب اسلامی ٬ بیروت ٬ ۱۴۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: نہ عورتوں سے جماع کی باتیں ہوں٬ نہ گناہ اور نہ جھگڑا۔ (البقرہ: ۱۹۷)

ایام حج میں فحش باتیں٬ گناہ اور جھگڑا کرنے کی ممانعت:

حضرت ابن عباس (رض)٬ ابن جبیر٬ قتادہ٬ حسن٬ عکرمہ٬ مجاہد٬ زہری اور سدی نے بیان کیا کہ رفث سے مراد یہاں جماع ہے٬ اور حضرت ابن عمر (رض) اور طاؤس وغیرھم نے کہا: اس سے مراد عورتوں سے فحش کلام کرنا ہے۔ فسق سے مراد ہر قسم کے گناہ ہیں اور جدال سے مراد بحث مباحثہ میں غضب ناک ہونا ہے٬ یہ حضرت ابن مسعود٬ حضرت ابن عباس (رض) عطاء اور مجاہد کی رائے ہے٬ اور حضرت ابن عمر (رض) اور قتادہ نے کہا: اس سے مراد گالی دینا ہے۔ ابن زید اور امام مالک نے کہا: اس سے مراد اس بات میں اختلاف کرنا ہے کہ کون اپنے باپ دادا کے موقف میں کھڑا ہے٬ کیونکہ عرب کسی اور کے موقف میں وقوف کرتے٬ پھر اس میں اختلاف اور بحث کرتے٬ قاسم نے کہا: یا اس میں اختلاف کریں کہ حج آج ہے یا کل۔

(البحر المحیط ج۲ ص ۲۸۱۔ ۲۸۰ مطبوعہ دار الفکر٬ بیروت٬ ۱۴۱۱ھ)

فحش باتیں٬ فسق اور جھگڑا کرنا ہر وقت اور ہر جگہ ممنوع ہے لیکن یہ ممانعت اس وقت شدید ہے جب انسان بیت اللہ کی زیارت اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کیلیے دور دراز سے چل کر یہاں آئے٬ ویسے تو تمام سفر حج میں انسان ان برائیوں میں مجتنب رہے لیکن حج کا احرام باندھنے سے لے کر مناسک حج مکمل ہونے تک جو شخص ان برے کاموں سے بچا رہا اس کا حج٬ حج امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے اس بیت اللہ کا حج کیا اور فحش باتیں نہیں کہیں اور فسق نہیں کیا اور اپنے گناہوں سے اس دن کی طرح پاک ہو کر نکلے گا جس دن اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا

(زاد المیسر ج۲ ص ۲۶۱ ٬ مطبوعہ مکتب اسلامی ٬ بیروت ٬ ۱۴۰۷ھ)

ایام حج یا غیر ایام حج میں تم جو کام کرتے ہو خواہ نیک ہو یا بد ان سب کا اللہ تعالیٰ کو علم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور سفر خرچ تیار کرو اور بہترین سفر خرچ تقوی (سوال سے رکنا) ہے اور اے عقل والو! مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ (البقرہ: ۱۹۷)

حج کے لیے سفر خرچ تیار کرنے کا حکم:

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ اہل یمن حج کرتے تھے اور سفر تیار نہیں کرتے تھے٬ اور کہتے تھے کہ ہم توکل کرنے والے ہیں٬ جب وہ مکہ پہنچتے تو مانگنا شروع کر دیتے٬ تب یہ آیت نازل ہوئی کہ سفر خرچ تیار کرو٬ کیونکہ بہترین سفر خرچ سوال نہ کرنا ہے۔

(صحیح بخاری ج۱ ص ۲۰۶ ٬ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع٬ کراچی٬ ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے۔(سنن ابو داؤد ج۱ ص ۲۴۲، مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)
اس آیت کی یہ تفسیر بھی کی گئی ہے کہ دنیا سے آخرت کی طرف جو سفر ہے اس کے لیے سفر خرچ تیار کرو اور نیک اعمال کرو کیونکہ بہترین سفر خرچ تقوی اور خوف خدا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں معنی مراد ہوں راستہ میں اور قیام حرمین کے دوران کھانے پینے اور سواری کا انتظام کرکے چلو اور اعمال صالحہ کا زاد راہ تیار کرو اور عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اللہ ہی سے ڈرو۔

حج کا مہینہ

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٨٩﴾

لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے وقتوں اور حج کے موسم کے لیے ہے (احرام کی حالت میں) اور گھروں کے پیچھے سے تمہارا آنا کچھ نیکی نہیں، بلکہ نیکی والا وہ ہے جو متقی ہو اور گھروں میں تو دروازوں میں سے آیا کرو ف ۲ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ

(سورۃ البقرۃ: آیت 189)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ

(اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پہلے رات کے چاندوں کا حال پوچھتے ہیں)

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ معاذ بن جبل انصاری اور ثعلبہ بن غنم انصاری (رض) نے جناب رسول اللہ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ کیا بات ہے کہ ہلال اول تو باریک سا ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتے بڑھتے بالکل بھر جاتا ہے اور پورا ہو جاتا ہے اس کے بعد باریک ہونا شروع ہوتا ہے حتیٰ کہ ویسا ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ اول تھا ایک حالت پر نہیں رہتا اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی یہ روایت علامہ بغوی (رح) نے نقل کی ہے اور ابو نعیم اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں بطریق سدی صغیر ابن عباس (رض) سے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے بطریق عوفی حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کی ہے کہ لوگوں نے چاند کا حال جناب رسالت ماب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ صحابہ (رض) نے سوال کیا کہ یارسول اللہ یہ چاند کیوں پیدا کیا گیا ہے اسی پر یہ آیت نازل ہوئی:

قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ

(فرما دیجئے کہ یہ وقت ہے لوگوں کے (معاملات) کے لیے اور حج کے واسطے)

اگر چاند کے مختلف ہونے اور تغیر وتبدیل کی حکمت کا سوال ہو تو یہ جواب مطابق سوال کے ہوگیا حاصل جواب کا یہ ہوا کہ حکمت

اس تغیر وتبدل میں یہ ہے کہ لوگوں کے لیے ان کے معاملات دینی و دنیوی میں علامت ہو جائے کہ اس سے اپنے کاروبار کا وقت مقرر کرلیں ۔مثلاً حج کا وقت روزہ کا وقت اس سے معلوم ہوتا ہے اور اگر چاند کے حالات بدلنے کی علت کا سوال ہو تو اس وقت بظاہر جواب مطابق سوال کے نہیں بنتا لیکن نظر تحقیق سے دیکھا جائے تو نہایت عمدہ اور حکیمانہ جواب ہے گویا حاصل جواب کا یہ ہے کہ سائل کے حال کے لائق یہ ہے کہ چاند کے اختلاف حال کا فائدہ اور نفع دریافت کرنے علت کی تحقیق سے کچھ نفع نہیں اس میں اشتغال بے فائدہ ہے اس لیے لازم ہے کہ اس سے بچے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علوم غریبہ ۱؎ یعنی جن علوم سے دین کا کوئی فائدہ خاص نہیں ہے جیسے ہیئت اور نجوم وغیرہ میں عمر برباد کرنا جائز نہیں ۔مواقیت جمع میقات کی ہے میقات وقت سے اسم آلہ ہے اور مراد مواقیت سے اس مقام پر وہ ہے جس سے حج روزہ عدت قرض اور دیگر معاملات کی مدت اور وقت معلوم ہو۔

وَلَيۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُيُوۡتَ مِنۡ ظُهُوۡرِهَا

(اور نیکی یہ نہیں کہ تم آؤ گھروں میں ان کے پچھواڑے سے)

ابن کثیر اور ابن عامر اور حمزہ اور کسائی نے الفاظ ذیل میں یا کی وجہ سے حرف اوّل کو مکسور کر کے پڑھا ہے ۔البیوت العیون الشیوخ اور ابن عامر اور حمزہ اور کسائی جو جیوبھن کو اور حمزہ اور ابو بکر نے العیوب کو بھی کسرہ حرف اوّل سے پڑھا ہے اور دیگر قراء نے اپنی اصل کے موافق ضمہ سے پڑھا ہے امام بخاری (رح) نے حضرت براء بن عازب (رض) کی روایت سے لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب احرام باندھ لیتے تھے تو گھروں میں میں دروازوں سے نہ آتے تھے بلکہ پچھواڑے سے آیا کرتے تھے۔(اس کی وجہ انھوں نے یہ سوچی تھی کہ جن دروازوں سے آلودہ معاصی ونجاسات ہو کر جاتے آتے ہیں احرام کی حالت میں انہی دروازوں سے آنا جانا برا ہے)اس پر حق تعالیٰ نے آیہ کریمہ: و لیس البرّ بان تاتوا البیوت [الایۃ] نازل فرمائی اور ابن ابی حاتم اور حاکم نے حضرت جابر (رض) کی روایت بیان کی ہے حضرت جابر (رض) فرماتے ہیں کہ قریش خمس کہلاتے تھے انصار اور تمام عرب تو احرام کی حالت میں گھروں میں دروازوں سے نہ جاتے تھے اور قریش دروازوں سے آمد ورفت رکھتے تھے ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ جناب رسول اللہ بتان میں تھے جب آپ وہاں سے تشریف لانے لگے تو دروازہ سے نکلے حضور کے ساتھ قطبہ بن عامر انصاری بھی نکلے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ قطبہ ایک فاجر شخص ہے اور وہ بھی آپ کے ہمراہ دروازہ سے نکلا آپ نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے آپ کو جس طرح کرتے دیکھا اسی طرح میں نے بھی کیا۔حضور ﷺ نے فرمایا میں دین باطل سے الگ ہوں قطبہ نے عرض کیا جو آپ کا دین ہے وہی میرا بھی دین ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی ۔ابن جریر نے ابن عباس (رض) کی روایت سے بھی اس طرح نقل کیا ہے اور عبد بن حمید نے قیس بن جبیر سے بھی اس کو روایت کیا ہے لیکن عبد بن حمید کی سند میں بجائے قطبہ بن عامر کے رفاعہ بن تابوت ہے علامہ بغوی (رح) نے اس قصہ کو اس طرح ذکر کیا ہے کہ ایک روز جناب رسول اللہ ﷺ کسی انصار کے گھر تشریف لے گئے اور آپ کے پیچھے رفاعہ بھی گئے اور دروازہ سے اندر داخل ہوئے زہری نے اس کا شان نزول اس طرح بیان کیا ہے کہ چند انصاری جب عمرہ کا احرام باندھتے تھے تو اس کا التزام رکھتے تھے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان میں کوئی چیز (چھت وسائبان وغیرہ) حائل نہ ہو اور جب کوئی شخص اپنے گھر سے نکل کر عمرہ کا احرام باندھ لیتا تھا اور پھر اس کو گھر جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو دروازہ سے نہ جاتا تھا کیونکہ اگر دروازہ سے جائے گا تو چھت حائل ہو جائے گی اس لیے گھر میں جانے کی یہ تدبیر نکالی تھی کہ دیوار کو توڑ کر اندر جاتا تھا اور وہاں جا کر جو

کام ہوتا تھا گھر والوں سے کہہ کر چلا آتا تھا جب رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دنوں میں عمرہ کا احرام باندھا اور آپ حجرہ میں دروازہ سے اندر تشریف لے گئے اور آپ کے پیچھے ایک شخص انصاری بنی سلمہ میں سے بھی گیا اس سے آگے پھر وہی قصہ ہے جو اول حدیث میں گذر چکا ہے۔ ولیس البر کا ویسئلونک پر عطف ہے اس سے الگ نہیں ہے (اس لیے ربط کی ضرورت ہے) تو ان دونوں قصوں میں ربط کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کہ لوگوں نے شاید یہ دونوں باتیں ایک وقت میں ہی دریافت کی ہوں اور یا یوں کہو کہ جب اول انھوں نے چاند کا حال کہ جو ان کو کچھ نافع نہیں تھا اور نہ علم نبوی کے مناسب تھا دریافت کیا اور جو بات ان کے لیے نافع اور مفید تھی اور علم نبوت کے متعلق بھی تھی اس کا سوال نہ کیا اس لیے مناسب ہوا کہ اس کو بطور عطف کے ذکر کر دیا جائے گویا یہ فرمادیا کہ لائق یہ ہے کہ ایسی ایسی باتیں پوچھیں اور گھروں میں آنے جانے کے قصہ کو ما قبل سے مربوط ہونے کی ایک اور بھی وجہ لطیف ہے وہ یہ ہے کہ ممکنات کے حقائق کا بے سود سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے گھر میں پچھواڑے سے جانا اور دروازہ کو چھوڑ دینا کیونکہ علوم کے اندر مشغول ہونا ایسا ہے جیسے گھر میں داخل ہونا اور ظاہر ہے کہ گھر میں داخل ہونے اور گھر سے منتفع ہونے کے لیے دروازہ موضوع ہے اس طرح حقائق میں فکر کرنے اور مشغول ہونے کا موضوع لہٗ ان حقائق کے منافع اور پھر ان سے صانع کو دریافت کرنا ہے نہ مباحث ہیئت وغیرہ کو حاصل کرنے کی تکلیف اٹھانا ان سے تو کوئی دینی فائدہ وابستہ نہیں۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى

(بلکہ نیکی اس کی ہے جو پرہیزگاری کرے)

اس کے صحت حمل کی وجہ سے اور قرأت کا اختلاف رکوع لیس البر میں بیان ہو چکا اس لیے حاجت اعادہ کی نہیں۔

وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا

(اور آؤ گھروں میں ان کے دروازوں کی طرف سے)

یعنی گھروں میں احرام کی حالت میں ہمیشہ کی طرح دروازوں سے داخل ہو۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ

(اور ڈرو اللہ سے) یعنی جو اشیاء تم پر حرام کر دی گئیں ان سے بچو۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

(تاکہ نیکی سے فائز ہو)

واحدی نے بروایت ابوصالح حضرت ابن عباس (رض) کا قول بیان کیا ہے کہ جب کفار نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سال حدیبیہ میں بیت اللہ سے روک دیا اور پھر مشرکین نے اس پر صلح کی کہ سال آئندہ آپ پھر تشریف لائیں اور جب سال آئندہ ہوا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مع اصحاب کے عمرۃ القضاء کی تیاری کی اس وقت یہ خوف ہوا کہ شاید کفار بدعہدی کریں اور مثل سال سابق اللہ سے روک دیں اور قتال شروع کر دیں اور صحابہ بالا احرام میں قتال کو مکروہ جانتے تھے اس تردد اور پریشانی کو دفع کرنے کے لیے حق تعالیٰ نے آیت ذیل نازل فرمائی۔

حج کے ارکان کے بارے میں

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ

(پھر جب تم پورے کر چکو اپنے حج کے ارکان)

یعنی جب ارکان حج سے فارغ ہو جاؤ اور یہ فراغت جمرہ عقبہ کی رمی اور ذبح اور سر منڈانے اور طواف اور سعی کے بعد یوم نحر کو ہوتی ہے جاننا چاہیے کہ ارکان حج احرام اور وقوف عرفہ اور طواف زیارت تو بالاجماع ہیں اور امام شافعی نے فرمایا ہے کہ سعی اور سر منڈانا بھی ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

(تو یاد کرو اللہ کو) یعنی اللہ کی تحمید اور تکبیر اور ثنا بیان کرو۔

كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ

(مثل اپنے باپ دادے کے یاد کرنے کے)

اس کا قصہ یہ ہے کہ جاہلیت میں اہل عرب جب حج سے فارغ ہوتے تھے تو بیت اللہ کے پاس کھڑے ہو کر اپنے باپ دادا کے فضائل اور مفاخر بیان کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کا حکم فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کا اور سب کے باپ دادوں کا مولیٰ ہے اس کا ذکر کرنا چاہیے باپ دادوں نے ان کو پیدا نہیں کیا بلکہ سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

افرائیتم ما تمنون ا انتم تخلقونه ام نحن الخالقون

(بھلا دیکھو تو سہی جو عورتوں کے رحم میں ٹپکاتے ہو کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا فرمانے والے ہیں) ابن عباس اور عطاء نے فرمایا ہے کہ معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ کی ایسی یاد کرو جس طرح چھوٹے ننھے بچے اپنے باپ کو یاد کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر تو بہ نسبت باپوں کے ماؤں کا ذکر کرنا زیادہ زیبا تھا۔

اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا

(بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یاد ہو) اشد یا تو مجرور اور ذکر پر معطوف ہے اس وقت تقدیر عبارت کی یہ ہوگی: واذ کروا اللہ ذکرا کذکرکم اٰباء کم او کذکر اشد منه (یاد کرو اللہ کو مثل اپنے باپ دادوں کی یاد کے بلکہ مثل ایسی یاد کے جو پہلی یاد سے بڑھی ہوئی ہو) اور یا کذکرکم کا مضاف الیہ پر عطف ہے یا منصوب ہے اس تقدیر پر یا تا اباءکم پر عطف ہوگا اور ذکراً مصدر بمعنی مفعول

ہوگا اور یا تقدیر اس طرح ہوگی کونوا اشد ذکر اللہ منکم لاباء کم اس عبارت کا بھی حاصل وہی ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ

(پھر بعض آدمی کہتے ہیں) ان سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی طمع صف دنیا ہی پر منحصر ہے یعنی وہ مشرک جو حشر ونشر کے منکر ہیں۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا

(اے ہمارے پروردگار دیدے ہم کو دنیا ہی میں) اتنا کا مفعول ثانی بغرض تعمیم حذف کر دیا گیا مطلب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا ہی میں ہر شے دیدے مشرکین کی عادت تھی کہ حج میں دنیا ہی کو مانگتے تھے۔

وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ

اور نہیں ان کا آخرت میں کوئی حصہ

شراب کی سزا اور احکام

يَسۡــَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِؕ قُلۡ فِيۡهِمَآ اِثۡمٌ كَبِيۡرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثۡمُهُمَآ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَاؕ وَيَسۡــَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَـكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ۝٢١٩

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا مسئلہ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے (۱) اور لوگوں کو اس سے دنیاوی فائدہ بھی ہوتا ہے، لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ (۲) ہے، آپ سے بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں، تو آپ کہہ دیجئے حاجت سے زیادہ چیز (۳) اللہ تعالیٰ اس طرح سے اپنے احکام صاف صاف تمہارے لیے بیان فرما رہا ہے تا کہ تم سوچ سمجھ سکو''۔

يَسۡــَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡخَمۡرِ (اے محمد یہ لوگ تم سے شراب کی بابت دریافت کرتے ہیں) امام احمد نے ابو ہریرہ (رض) سے روایت کی ہے کہ حصور انور رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ منورہ میں تشریف لائے اس وقت مدینہ کے باشندے شراب پیتے اور جوا کھیلتے تھے ان دونوں کی بابت انھوں نے خود ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا تو اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: یسئلونك عن الخمر والمیسر وہ لوگ کہنے لگے کہ (اس آیت سے ہم پر (اس کی) حرمت ثابت نہیں ہوئی کیونکہ فقط اتنا فرمایا گیا ہے کہ فیھما اثم کبیر (یعنی ان دونوں میں بڑا گناہ ہے) اور یہ خیال کر کے شراب وہ برابر پیتے رہے ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ مہاجرین

میں سے ایک شخص نے نماز پڑھائی یعنی اپنے ساتھیوں کو مغرب کی نماز پڑھانے کھڑا ہوا تو وہ شراب کے نشہ میں تھا اسے قرأت میں متشابہ لگ گیا تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: یا ایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ (یعنی اے مسلمانو! نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب بھی نہ جایا کرو) اس کے بعد سورۃ مائدہ میں اس سے بھی زیادہ سختی کا حکم نازل ہوا کہ: یا ایھا الذین امنوا انما الخمر والمیسر سے فھل انتم منتھون تک تب سب نے کہا کہ اب ہم کبھی شراب نہ پئیں گے یہ حکم ہمیں کافی ہے آخر حدیث تک۔ بغوی (رح) فرماتے ہیں خلاصہ اس بیان کا یہ ہے کہ شراب کے بارے میں اللہ نے چار آیتیں نازل فرمائی ہیں اوّل تو مکہ میں یہ آیت نازل ہوئی: و من ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرًا و رزقا حسنا اس وقت سب مسلمان شراب پیتے تھے اور اس زمانہ میں وہ ان کے لیے حلال بھی تھی پھر جب عمر بن خطاب (رض) اور معاذ بن جبل (رض) اور چند انصاری آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ شراب اور جوئے کی بابت ہمیں کچھ فتویٰ دیجئے کیونکہ یہ دونوں عقل اور مال کو برباد کردینے والے ہیں تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: یسئلونك عن الخمر والمیسر [الایۃ] اس پر بعض لوگوں نے تو اللہ کے اثم کبیر فرمانے کی وجہ سے شراب کو چھوڑ دیا اور بعض و منافع للناس کو دلیل کو سمجھ کر پیتے رہے ایک روز عبدالرحمن بن عوف نے کچھ مہمانداری کی اور اس میں آنحضرت کے بہت سے صحابہ کو بھی بلایا اور اس دعوت میں شراب بھی پلائی شراب پی کر ان کو نشہ ہوا اور مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا اسی حالت میں انھوں نے ایک شخص کو نماز پڑھانے کے لیے آگے کردیا اس نے نشہ میں: قل یا ایھا الکافرون اعبد ما تعبدون پڑھا اور آخر سورۃ تک اسی طرح بلالا کے پڑھتا چلا گیا تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ: یا ایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ [الایۃ] پس (اس آیت سے) نماز کے وقتوں میں نشہ حرام کردیا گیا بعض لوگوں نے تو شراب کو بالکل چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ ایسی چیز میں کوئی خوبی نہیں ہے جو ہمیں نماز نہ پڑھنے دے اور بعض لوگ نماز کے وقتوں کے علاوہ اور وقتوں میں پیتے رہے کوئی عشاء کی نماز کے بعد پی لیتا تو صبح تک اس کا نشہ اتر جاتا اور کوئی صبح کی نماز کے بعد پی لیتا تو اس کا نشہ ظہر کے وقت تک اتر جاتا ایک روز عتبان بن مالک نے بہت سے آدمیوں کی دعوت کی اور چند مسلمانوں کو بھی بلایا ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بھی تھے اور عتبان نے ان کے لیے اونٹ کا سر پکوایا تھا ان لوگوں نے کھانا کھا کر شراب اس قدر پی کہ وہیں نشہ ہوگیا اور نشہ کی حالت میں بڑائیاں مارنے اور اشعار پڑھنے لگے۔ سعد نے وہیں ایک قصیدہ پڑھا جس میں انصار کی ہجو اور ان کی قوم کی بڑائی تھی۔ انصار میں سے ایک شخص نے اونٹ کا جبڑا لے کر سعد کے سر میں مارا جس سے سعد کا سر پھٹ گیا۔ سعد (رض) نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آکر اس انصاری کی شکایت کی (انصاری نے سارا قصہ بیان کیا) تب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ دعا کہ خداوندا ہمارے لیے شراب کا حکم صاف طور سے بیان فرمادے اس پر وہ آیت نازل ہوئی جو سورۃ مائدہ میں ہے۔ واللہ اعلم۔

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ خمر (کالفظ قرآن شریف میں آیا ہے) کیا چیز ہے؟ امام ابوحنیفہ کا قول یہ ہے کہ خمر انگور کے کچے شیرہ کو کہتے ہیں جس وقت اس میں نشہ ہوجائے اور جھاگوں سے اُبل جائے۔ صاحبین کے نزدیک جھاگوں سے ابلنے کی شرط نہیں ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد (رح) (تینوں) کا قول یہ ہے کہ جس شربت کا زیادہ پی لینا نشہ کرتا ہو وہی خمر ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ خمر خاص اسی کا نام ہے جس کو ہم نے ذکر کیا ہے اور یہی اہل لغت کے نزدیک مشہور ہے اور اسی وجہ سے

(خاص) اسی شربت میں اس کا استعمال مشہور ہوگیا ہے اس کے علاوہ اور نشہ کی چیزوں کے اور نام مشہور ہیں جیسے مثلث۔ طلاء۔ منصف۔ باذق۔ وغیرہ اور لغت میں قیاس نہیں چلا کرتا۔ جمہور کا یہ قول ہے کہ لغت میں خمر اس چیز کا نام ہے جو عقل کو خبط کر دے اور میرے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ خمر ایک ایسا لفظ ہے جو عام اور خاص کے درمیان میں مشترک ہے یا تو حقیقی طور پر اور یا عموم مجاز کے طریقہ سے اور اس میں وہ عام ہی معنی مراد ہیں۔

صاحب قاموس کہتے ہیں کہ خمر یا تو انگور کے اس شربت کا نام ہے جو نشہ کرتا ہو یا عام ہے اور عام ہونا زیادہ صحیح ہے ابن عمر (رض) فرماتے ہیں کہ جس وقت خمر حرام ہوئی ہے مدینہ میں یہ (انگوری شراب) بالکل نہ تھی یہ روایت بخاری نے نقل کی ہے اور انس کی حدیث کہ خمر حرام ہونے کے دن میں ساقی بنا ہوا تھا اور اس وقت کچے پکے چھواروں کی شراب کے سوا اور کوئی شراب نہ تھی یہ روایت متفق علیہ ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ میں کھڑا ہوا ابوطلحہ اور فلاں فلاں کو پلا رہا تھا اور بعض روایتوں میں یہ نام لیے ہیں کہ ابوعبیدہ بن جراح ابی بن کعب سہیل کو اتنے میں ایک آدمی نے آ کر کہا کہ خمر حرام ہوگئی ہے یہ سنتے ہی ان پینے والوں نے کہا اے انس (رض) یہ برتن اوندھا دو۔ اس خبر کے بعد نہ اس شخص سے پھر شراب کی بابت کچھ پوچھا اور نہ کسی سے اس کی تحقیق کی انس (رض) بھی کہتے ہیں کہ جس وقت خمر حرام ہوئی ہمارے ہاں انگوری شراب بہت کم ملتی تھی اور اکثر شراب کچے پکے چھواروں کی ہوتی تھی پس یہ آثار ہیں جو ہمارے بیان پر دلالت کرتے ہیں کہ خمر (کے لفظ) کا استعمال کبھی خاص معنی میں بھی کیا جاتا ہے لیکن آیت میں عام ہی معنی مراد ہیں اگرچہ مجازاً ہی ہوں اور اگر آیت میں خمر سے مراد وہ عام معنی نہ ہوں تو جواب سوال کے مطابق نہ ہوگا کیونکہ سوال تو اسی شراب کے بارے میں تھا جسے سوال کے وقت لوگ پیتے تھے حضرت عمر اور معاذ نے کہا تھا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہمیں اس خمر کی بابت فتویٰ دیجئے کیونکہ یہ عقل کو خراب کر دیتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر و یصد کم عن ذکر اللہ و عن الصلوٰۃ** اس میں شیرہ انگور کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ ان لوگوں میں انگور کے شیرہ کا استعمال بھی نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

اور اسی بارے میں حضرت عمر بن خطاب (رض) کی حدیث ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ خمر کی حرمت نازل ہوگئی ہے اور خمر ان پانچ چیزوں سے بنتی ہے انگور، کھجور، گیہوں، جو، شہد اور خمر اسی کو کہتے ہیں جو عقل کو خراب کر دے یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

امام احمد نے اپنی مسند میں ابن عمر (رض) سے انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کی ہے کہ گیہوں۔ جو۔ کھجور۔ کشمش۔ شہد ان سب چیزوں کی خمر ہوتی ہے اور اسی بارے میں نعمان بن بشیر (رض) سے بھی مرفوعاً اسی طرح مروی ہے اس کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور امام احمد نے ایک روایت نقل کی ہے اس کے آخر میں یہ ہے (آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا) کہ نشہ کرنے والی ہر چیز سے میں منع کرتا ہوں اور یہ بھی مروی ہے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور ہر نشہ کرنے والی چیز خمر ہے۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے اور حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ انگور۔ کھجور۔ شہد۔ جوار۔ ان سب چیزوں سے خمر بنتی ہے اور جو ان میں سے نشہ لائے وہی خمر ہے یہ روایت امام احمد نے نقل کی ہے جب یہ ثابت ہوگیا کہ خمر کا لفظ ان سب شربتوں کو شامل ہے جو کہ نشہ لاتے ہیں تو نص قرآن ہی سے یہ ثابت ہوگیا کہ نشہ کی چیز خواہ تھوڑی ہو یا بہت سب حرام اور

ناپاک ہے اس کے پینے (کھانے) والے کو شریعت کے موافق سزا دی جائے گی نہ اس کا بیچنا وغیرہ جائز ہے نہ اس کو تلف کر دینے والے پر اس کا تاوان لازم آتا ہے ہاں اس اختلاف ہونے کی وجہ سے یہ فرق وغیرہ جائز ہے نہ اس کو تلف کر دینے والے پر اس کا تاوان لازم آتا ہے ہاں اس اختلاف ہونے کی وجہ سے یہ فرق رہے گا کہ انگور کے کچے شیرہ کے علاوہ جو اور (گیہوں وغیرہ کی) شراب کو حلال سمجھے گا اسے کافر نہ کہا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ خمر کے سوا تین قسم کی شرابیں حرام ہوتی ہیں۔ایک ان میں سے طلا ہے یہ انگور کے شیرہ کی ہوتی ہے جس وقت اتنی پکائی جائے کہ تہائی حصہ سے کم جل جائے اور اگر نصف جل جائے تو اسے منصف کہتے ہیں یا اس سے کم جلے تو اسے باذق کہتے ہیں جس وقت خوب جوش آجائے اور جھاگ اٹھ کرابلنے لگے۔دوسری قسم سکر ہے یہ شراب کھجور کے شربت سے بنائی جاتی ہے جس وقت اس میں خوب جوش آجائے اور جھاگ اٹھ کرابلنے لگے تیسری قسم نقیع الزبیب یعنی کشمش کا شیرہ ہے یہ کشمش کے کچے شیرہ سے بنائی جاتی ہے جس وقت اس میں خوب جوش آکر ویسے جھاگ اٹھنے لگیں امام ابو یوسف جھاگ اٹھنے کی شرط نہیں لگاتے پس یہ سب شرابیں ناپاک ہیں ایک روایت میں نجاست خفیفہ ہیں اور دوسری میں نجاست غلیظہ ہیں ان میں سے تھوڑی سی شراب بھی ایسی حرام ہے جیسے پیشاب حرام ہوتا ہے کہ خمر ان دو درختوں سے بنائی جاتی ہے لیکن جب تک کہ نشہ نہ کرے اس کے پینے والے کو حد نہ لگائی جائے گی کیونکہ اس کی حرمت اجتہادی ظنی ہے اور حدود شبہ سے جاتی رہتی ہیں۔

اور امام ابوحنیفہ (رح) کے نزدیک ان کا بیچنا بھی جائز ہے اور ان کے تلف کر دینے والے سے تاوان بھی لیا جائے گا صاحبین (رح) اس کے مخالف ہیں اور مثلث انگوری اور کھجور اور کشمش کے شیرہ کو جس وقت تھوڑا سا جوش دے کر پی لیا جائے اگر چہ وہ غلیظ ہو جائے لیکن غالب گمان یہ ہو کہ اس سے نشہ نہ ہوگا تو یہ سب امام ابوحنیفہ (رح) اور امام ابو یوسف (رح) کے نزدیک حلال ہے۔ امام محمد (رح) اس کے مخالف ہیں یہ حکم اسی وقت ہے کہ جب کوئی ان کو طاقت آنے کی غرض سے پیے اور اگر اس سے لہو لعب ہی مقصود ہو تو یہ بالاتفاق حرام ہیں اور ان تینوں میں سے اتنی پی لینی جو نشہ لائے بالاتفاق حرام ہے اور اس کے پینے والے کو حد لگائی جائے گی۔امام ابوحنیفہ (رح) اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ جس وقت یہ تینوں شرابیں نشہ کریں تو ان کا فقط اخیر کا پیالہ حرام ہوتا ہے کیونکہ حقیقت میں وہی نشہ لانے والا ہے اور اس کے سوا اور شرابیں یعنی گیہوں، جو، جوار، شہد فقط بھنگ اور رماک کے دودھ وغیرہ سے جو بنائی جاتی ہیں امام ابوحنیفہ (رح) اور امام ابو یوسف (رح) کے نزدیک سب حلال ہیں اگر چہ نشہ کرتی ہوں ان کے پینے والے کے حد نہ لگائی جائے گی اور نہ ان کے نشہ میں طلاق دینے سے طلاق پڑے گی اور ایک روایت میں دونوں سے یہ بھی مروی ہے کہ اگر نشہ کرے گی تو حرام ہے اور اس کے پینے والے کے حد بھی لگائی جائے گی۔

ہدایہ میں ہے علما نے کہا ہے کہ صحیح مذہب یہی ہے کہ ان کے پینے والے کے حد لگائی جائے گی اور یہی مذہب امام محمد کا ہے کہ یہ شرابیں حرام ہیں اور ان کے پینے والے کے حد لگائی جائے گی اور نشہ کی حالت میں طلاق دینے سے طلاق بھی پڑ جائے گی جیسے کہ اور شرابوں کا حکم ہے لیکن تینوں کے نزدیک یہ ناپاک نہیں ہیں کیونکہ ان کی تھوڑی سی مقدار کو وہ حرام نہیں فرماتے۔فتاویٰ نسفی میں ہے کہ بھنگ پینا حرام ہے اور بھنگ باز کے طلاق دینے سے طلاق پڑ جاتی ہے اور جو اسے حلال سمجھے اسے قتل کر دیا جائے اور اس کے پینے والے کے ایسی ہی حد لگائی جائے گی جیسے شرابی کے لگائی جاتی ہے اور بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر نشہ کی چیز حرام ہے

اور اس پر بھی کہ ہر نشہ کی چیز خواہ تھوڑی ہو یا بہت ہو سب حرام ہے جابر (رض) روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی یمن سے آیا اس نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جوار کی شراب کو دریافت کیا (کہ حلال ہے یا نہیں) جس کو وہاں کے لوگ پیتے اور اسے موز کہتے تھے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا کہ اس سے نشہ ہوتا ہے عرض کیا ہاں فرمایا نشہ کی ہر چیز حرام ہے یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) فرماتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر نشہ کی چیز سے منع فرمایا ہے خواہ تھوڑی ہو یا بہت ہو یہ روایت نسائی ابن حبان بزار نے نقل کی ہے اور اس کے سب راوی صحیح ہیں حضرت جابر سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جو چیز بہت ہی نشہ لائے وہ تھوڑی سی بھی حرام ہے۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کر کے اسے صحیح کہا ہے ابو داؤد اور ابن ماجہ نے بھی اس کو نقل کیا ہے عائشہ صدیقہ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا کہ جس شراب کا ایک فرق (یعنی بہت سا) پینا نشہ لائے اس میں سے ایک چلو بھر بھی پینا حرام ہے۔ یہ روایت امام احمد نے نقل کی ہے اور ترمذی نے نقل کر کے اسے حسن کہا ہے ابو داؤد اور ابن حبان نے بھی اپنی اپنی صحیح میں اس کو نقل کیا ہے۔

ام سلمہ فرماتی ہیں کہ نشہ اور بے ہوش کرنے والی ہر چیز سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منع فرمایا ہے یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے دیلم حمیری کہتے ہیں میں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ حضور ہم سرد ملک کے رہنے والے ہیں اور وہاں بڑی مشقت کے کام کرتے ہیں اور ان کاموں کے کرنے کی طاقت آنے اور اس ملک کی سردی سے بچنے کی غرض سے اس گیہوں کی ہم شراب بنا لیتے ہیں حضور نے پوچھا کہ اس میں نشہ ہوتا ہے میں نے عرض کیا ہاں فرمایا اس سے پرہیز کرو میں نے کہا (حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگ اسے چھوڑنے کے نہیں فرمایا اگر نہ چھوڑیں تو تم ان سے جہاد کرنا۔ یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے ابو مالک اشعری سے روایت ہے انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے تھے کہ میری امت کے لوگ ضرور شراب خوری کریں گیں اور اس کا نام اور رکھ لیں گے یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے اسی بارے میں دارقطنی نے حضرت علی (رض) سے روایت کی ہے خوات بن جبیر سے اسی طرح مستدرک میں مروی ہے جو علما نبیذ کی اباحت کے قائل ہیں انھوں نے چند حدیثوں سے حجت کی ہے۔ منجملہ ان کے ایک حدیث ابن عباس (رض) کی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے شام کو کھجوریں بھگو دی جاتی تھیں اور صبح کو ان کا شربت آپ پی لیتے تھے اور پھر اس دن کی رات کو اور اگلے دن صبح کو اور شام کو اور پھر تیسرے دن صبح کو عصر تک اسی کو پیتے رہتے تھے اس کے بعد اگر کچھ شربت رہ جاتا تو یا تو خادم کو پلا دیتے اور یا پھینکوا دیتے تھے یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے وہ کہتے ہیں اگر یہ شربت حرام ہوتا تو آپ خادم کو نہ پلاتے اور اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چہ اس میں نشہ نہ ہوتا تھا لیکن چونکہ اس کا مزہ جاتا رہتا تھا اور اندیشہ تھا کہ عنقریب اس میں نشہ ہو جائے گا اس لیے آپ خادم کو دیدیتے تھے اور اگر اس میں نشہ ہونے پر آپ کو غالب گمان ہوتا تھا تو اسے آپ پھنکوا دیتے تھے لہٰذا اس سے حجت نہیں ہو سکتی اور اس مسئلہ پر کہ خمر کے سوا (اور شرابوں میں) فقط اخیر کا پیالہ حرام ہے نہ کہ تھوڑی بھی اس روایت سے حجت کی ہے جو ابن مسعود کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: کُلُّ مُسۡکِرٍ حَرَامٌ سے وہ شربت مراد ہے جو تمہیں نشہ کر دیتا ہو۔ یہ روایت دارقطنی نے نقل کی ہے ابن ہمام فرماتے ہیں یہ روایت ضعیف ہے۔

حجاج بن ارطاۃ اور عمار بن مطر اس میں راوی ہیں اور حقیقت میں یہ قول نخعی کا ہے اور ابن مبارک سے سند کے ساتھ ثابت ہے کہ کسی نے ابن مسعود کی اسی حدیث کو ان کے سامنے بیان کیا تو آپؓ نے فرمایا کہ یہ حدیث باطل ہے اور ان علماء نے ابن عباس

(رض) کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ خمر تو بعینہ حرام کر دی گئی باقی اور شربتوں میں نشہ حرام ہے۔ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ روایت مسلم نہیں ہے ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ابوسعید نے اسی طرح حدیث نقل کی ہے پھر کہا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے ابوسعید تک نہیں پہنچی۔ابن ہمام کہتے ہیں ہاں یہ حدیث بہت عمدہ سند سے ابن عباس (رض) تک ان لفظوں سے پہنچتی ہے کہ خمر کی ذات کو حرام کیا گیا ہے خواہ وہ تھوڑی ہو یا بہت اور ہر شراب جو نشہ لائے اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں کہ جو شراب نشہ لائے وہی حرام ہے ابن ہمام فرماتے ہیں کہ نشہ کا لفظ یہاں کہنا نصیحت ہے۔

میں کہتا ہوں ابن عباس (رض) کے قول کی مراد یہ ہے کہ نشہ کرنے والی ہر شراب حرام ہے خواہ تھوڑی ہو یا بہت ہو اور انھیں علماء نے ابومسعود انصاری کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے پیاس لگی تو کسی نے مشکیزہ میں سے نبیذ لا کر حضور کو دیا۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس پر بہت ناراض ہوئے اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ حرام ہے؟ فرمایا: نہیں لیکن زمزم کے پانی کا ایک ڈول میرے پاس لاؤ (اسی وقت پانی لایا گیا تو) پھر آپ نے اس میں پانی ملا کر طواف ہی کرتے ہوئے اسے پی لیا۔مطلب بن وداعہ سہمی سے بھی اس طرح مروی ہے اور اس کے آخر میں یہ ہے کہ جس وقت تمہیں زیادہ پیاس لگا کرے تو اسی طرح کر لیا کرو کسی نے ابن عمر سے اس نبیذ کی بات پوچھا جس میں حدت آ گئی ہو فرمایا کہ ایک جلسہ میں رسول اللہ بیٹھے ہوئے تھے آپ کو نبیذ کی کچھ بو معلوم ہوئی آپ نے کسی کو بھیج کر اسے اپنے پاس منگوا لیا اور ناک لگا کر اسے سونگھا تو اس میں حدت پائی گئی آپ نے اس میں پانی ملوا کر سے پی لیا پھر فرمایا کہ جب تمہاری نبیدوں میں حدت آ جایا کرے تو پانی سے اسے کم کر لیا کرو۔ابن عباس نے بھی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اسی طرح روایت کی ہے ان سب حدیثوں کو دارقطنی نے نقل کیا۔

ابومسعود انصاری سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نبیذ کی بابت دریافت کیا کہ حلال ہے یا حرام؟ فرمایا حلال ہے یہ روایت ابن جوزی نے نقل کی ہے سعید بن ذی القوہ فرماتے ہیں کہ ایک دہقانی نے حضرت عمر کے لوٹے میں سے نبیذ پی لی تو اسے نشہ ہو گیا۔حضرت نے اس کی حد میں اس کے درّے لگوا دیئے وہ بولا کہ میں نے تو آپ ہی کے برتنوں میں سے نبیذ پیا تھا فرمایا ہم تو فقط نشہ کی وجہ سے تیرے درّے لگواتے ہیں۔یہ روایت ابن جوزی نے نقل کی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابومسعود (رض) کی روایت کی بابت دارقطنی نے کہا ہے کہ وہ یحییٰ بن یمان سے مشہور ہے اور امام احمد بن حنبل نے یحییٰ بن یمان کو ضعیف راوی کہا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ یہ غلطیاں بہت کرتا ہے کسی نے ان سے پوچھا کہ اس روایت کو اور کسی نے بھی نقل کیا ہے فرمایا نہیں ہاں ایک ایسے راوی نے جو اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔امام نسائی فرماتے ہیں کہ اس کی حدیث حجت نہیں ہو سکتی۔ابوحاتم کا قول ہے کہ یہ مضطرب الحدیث ہے اور مطلب بن وداعہ کی حدیث محمد بن سائب کلبی کے طریقہ سے مشہور ہے اور محمد بن سائب کذاب ہے اعتبار کرنے کے لائق نہیں۔لیث سعدی سلیمان کا بھی یہی قول ہے۔نسائی اور دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث میں متروک ہے ابن حبان فرماتے ہیں کہ جھوٹ اس کے چہرہ سے معلوم ہوتا ہے اور ابن عمر (رض) کی حدیث کی سند میں عبدالملک بن نافع راوی ہے اور وہ مجہول ضعیف ہے اور صحیح حدیث ابن عمر سے فقط اتنی مرفوع ہے کہ ما اَسکَرَ کثیرہ فقلیلہ حرام (یعنی جو نشہ لائے وہ تھوڑی ہو یا بہت سب حرام ہے)

اور ابن عباس کی حدیث کا روایت کرنے والا فقط قاسم بن بہرام ہے ابن حبان فرماتے ہیں کہ اس سے کسی طرح حجت کرنی

جائز نہیں ہے اور ابو مسعود کی حدیث میں عبد العزیز بن ابان راوی ہے امام احمد فرماتے ہیں میں نے اس کو چھوڑ دیا ہے (یعنی میں اس کی حدیث نہیں لیتا) اور ابن نمیر فرماتے ہیں کہ یہ کذاب ہے اپنی طرف سے حدیث گھڑ لیتا ہے اور سعید بن نقوہ کی حدیث کی بابت ابو حاتم فرماتے ہیں کہ یہ سعید دجال کا بھی استاد ہے اور ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر سے اسی طرح روایت کی ہے مگر وہ روایت منقطع ہے ان سب کے علاوہ نبیذ میں کچھ اختلاف نہیں ہے کیونکہ اگر اس میں خوب جوش آ کر نشہ ہو گیا ہے تو وہ بالاتفاق حرام ہے خواہ تھوڑا ہو یا بہت ہو اور اگر نشہ نہیں ہوا تو وہ بالاتفاق حلال ہے لہٰذا ان حدیثوں کو خلاف کے بارے میں بالکل دخل نہیں ہے۔ واللہ اعلم

وَالْمَيْسِرِ (اور جوئے کی بابت) لفظ میسر مصدر ہے جیسے موعد جوئے کا یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس میں غیر کا مال آسانی سے لیا جاتا ہے۔ عطا طاؤس مجاہد تینوں کا قول یہ ہے کہ جس چیز میں جوا ہو وہ اس میسر کے حکم میں ہے یہاں تک کہ لڑکوں کا اخروٹ اور کوڑیوں سے کھیلنا بھی۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی (رض) سے روایت کی ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ شطرنج عجم کے لوگوں کا جوا ہے نرد اور شطرنج وغیرہ کے منع ہونے کے متعلق بریدہ سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ جو شخص نردشیر سے کھیلا گویا اس نے اپنا ہاتھ سور کے گوشت میں سان لیا۔

عبدان ابو موسیٰ ابن حزم نے حبہ بن مسلم سے مرسل روایت کی ہے کہ جو شخص شطرنج سے کھیلے وہ ملعون ہے اور اسے دیکھنے والا سور کا گوشت کھانے والے کے برابر ہوتا ہے ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ جو شخص نرد سے کھیلا اس نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نافرمانی کی یہ حدیث امام احمد اور ابو داؤد نے روایت کی ہے۔ ابو موسیٰ ہی سے روایت ہے کہ شطرنج سے سوائے گناہ گار کے اور کوئی نہیں کھیلتا اور ان ہی سے کسی نے شطرنج کی بابت پوچھا تھا فرمایا کہ یہ فعل باطل ہے اور باطل کو اللہ پاک پسند نہیں کرتا۔ یہ روایت بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہے۔ ابن عمر (رض) سے روایت ہے کہ شراب جوا کوبہ تینوں (۱) [اس کے معنی اگلی روایت میں ہیں۔ ۱۲] سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے منع فرمایا ہے۔ یہ روایت ابو داؤد نے نقل کی ہے ابن عباس (رض) سے بھی مرفوعاً اسی طرح مروی ہے بعض کا قول یہ ہے کہ کوبہ طبلہ کو کہتے ہیں یہ روایت بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کی ہے۔ ابو ہریرہ (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ایک شخص کو کبوتر کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر فرمایا کہ شیطان شیطان کے پیچھے جا رہا ہے یہ حدیث امام احمد ابو داؤد ابن ماجہ نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کی ہے اور تحقیقی بات یہ ہے کہ کھیلنا خواہ کسی چیز کے ساتھ ہو بالاتفاق حرام ہے اور وہ جو امام شافعی سے مروی ہے کہ آپ نے شطرنج سے کھیلنے کو مباح فرمایا ہے تو اس بارے میں صحیح یہ ہے کہ اس قول سے آپ ؒ نے رجوع کر لیا ہے مال برباد کرنا اور فضول خرچی کرنی خواہ کسی طرح ہو جیسے رشوت دینی جوا کھیلنا اور سود وغیرہ دینا یہ سب بالاتفاق حرام ہیں اللہ نے فرمایا ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ (یعنی فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہوتے ہیں) اور جوئے میں دونوں باتیں ہیں کھیلنا اور مال برباد کرنا اس لیے اس کی اور بھی زیادہ ممانعت ہوگئی یہ بالاتفاق کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے خواہ وہ جوا اس قسم کا ہو جو عرب کھیلتے ہیں اور یا اس کے سوا شطرنج اور نرد وغیرہ ہو۔

قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ (تم ان سے کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے) کیونکہ ان دونوں سے بڑے بڑے گناہ صادر ہوتے ہیں مثلاً آپس میں لڑائی جھگڑا کرنا اور گالم گلوچ ہونا علیٰ ہذا القیاس ان سے آپس میں بغض و عداوت وغیرہ پڑ جاتی ہے اور ذکر الٰہی اور نماز سے یہ روک دیتے ہیں حمزہ اور کسائی نے اثم کبیر ثائے مثلثہ سے پڑھا ہے جس سے قسم قسم کے گناہ مراد ہیں اور باقی قاریوں نے

کبیر باء موحدہ سے پڑھا ہے کیونکہ کبیر سے گناہ کبیرہ ہونا مراد ہے اور یہ دونوں فعل کبیرہ گناہوں میں سے ہیں معاذ (رض) کہتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا کہ شراب تم ہرگز نہ پینا کیونکہ تمام بے حیائیوں کی جڑ ہے یہ حدیث امام احمد نے نقل کی ہے ابو ہریرہ (رض) کہتے ہیں رسول اللہ فرماتے تھے کہ نہ تو زانی زنا کرتے وقت مومن رہتا ہے اور نہ چور چوری کرتے وقت مومن رہتا ہے اور نہ شرابی شراب پیتے وقت مومن رہتا ہے۔ آخر حدیث تک یہ حدیث بخاری (رح) نے روایت کی ہے۔ ابن عمرو (رض) کہتے ہیں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ شراب خوری سب بے حیائیوں کی جڑ ہے اور سب کبیرہ گناہوں سے بڑا گناہ ہے جس نے شراب پی لی اس نے نماز ترک کردی (یعنی اس کی نماز نہیں ہوتی) اور اس نے اپنی ماں خالہ پھوپھی سے زنا کیا یہ حدیث طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کی ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن خطاب (رض) سے روایت ہے کہ جس نے شراب پی لی اس کی نماز چالیس روز تک اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا اگر پھر اس نے توبہ کرلی تو اللہ اس کی خطا کو معاف کردیتا ہے اور تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور اگر چوتھی مرتبہ بھی پی لی تو پھر اس نے توبہ کرلی تو اللہ اس کی خطا کو معاف کردیتا ہے اور اگر پھر پی تو پھر چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی پھر اگر توبہ کرلی تو پھر خدا اس کو معاف کردیتا ہے اور تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور اگر چوتھی مرتبہ بھی پی لی تو پھر چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی اب اگر توبہ کرے واللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول نہیں کرتا اگر پھر اس نے توبہ کرلی تو اللہ اس کی خطا کو معاف کردیتا ہے اور اگر پھر پی خدا اسکو معاف کردیتا ہے اور تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے اور اگر چوتھی مرتبہ بھی پی لی تو پھر چالیس روز تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی اب اگر توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ بھی قبول نہیں کرتا اور قیامت کے پیپ وغیرہ کی نہر سے اس کو پلایا جائے گا۔ یہ حدیث نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے نقل کی ہے۔

ابن عمر (رض) کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ شراب سب برائیوں کی جڑ ہے جس نے شراب پی اس کی نماز چالیس روز تک مقبول نہیں ہوتی اگر وہ پی کر مرگیا تو جاہلیت کی موت مرا۔ یہ حدیث حسن سند کے ساتھ طبرانی نے نقل کی ہے ابن عمر (رض) ہی آنحضرت سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ والدین کا نافرمان اور جواری اور احسان جتانے والا اور ہمیشہ شراب پینے والا بہشت میں نہ جائے گا۔ یہ حدیث دارمی نے روایت کی ہے۔ ابن عمر (رض) ہی مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ تین آدمی ہیں جن پر اللہ نے بہشت حرام کردی ہے ہمیشہ شراب پینے والا والدین کا نافرمان۔ دیوث یہ حدیث امام احمد اور نسائی نے روایت کی ہے۔

ابو امامہ کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے لیے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے اور سب قسم کے باجوں اور بت اور صلیب اور رسوم جاہلیت کو نیست و نابود کردینے کا مجھے حکم دیا ہے اور اس خداوند عالم نے اپنی عزت کی قسم کھا کے فرمایا کہ میرا جو بندہ شراب کا ایک گھونٹ بھی پیئے گا تو اسی کے برابر ضرور میں اسے پیپ پلاؤں گا اور جو میرے خوف کی وجہ سے شراب کو چھوڑ دے گا تو قدس کے حوضوں سے میں ضرور اسے (شراب طہور وغیرہ) پلاؤں گا۔ یہ حدیث امام احمد (رح) نے روایت کی ہے۔

ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین آدمی ایسے ہی جو جنت میں نہ جائیں گے یعنی ہمیشہ شراب پینے والا بے رحم جادو کو حق سمجھنے والا یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے ابن عباس کہتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر

کوئی ہمیشہ کا شرابی مرگیا تو وہ بت پرستوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کیا جائے گا یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے بھی ابو ہریرہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ابوموسیٰ سے روایت ہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک شراب پینا اور اللہ کو چھوڑ کر اس ستون کی پرستش کرنا دونوں برابر ہیں یہ روایت نسائی نے نقل کی ہے۔

وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں) کیونکہ شراب میں پینے کے وقت مزہ آتا ہے فرحت ہوتی ہے کھانا جلدی ہضم ہوتا ہے بزدلوں میں بہادری آجاتی ہے مروت بڑھ جاتی ہے۔ طبیعت قوی ہوجاتی ہے اور بعض بیماریاں بھی جاتی رہتی ہیں اور جوئے میں بلامحنت اور مشقت کے مال ہاتھ آجاتا ہے۔

مسئلہ* اس پر سب (ائمہ) کا اتفاق ہے کہ اختیاری حالت میں شراب سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے ہاں مجبوری اور اضطراری حالت میں جائز ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے۔ الا ما اضطررتم الیہ اور فرمایا: فمن اضطر غیر باغٍ ولا عاد فلا اثم علیہ بس جس کے حلق میں لقمہ اٹک گیا اور سوائے شراب کے اور کوئی چیز نہ ملی تو امام ابوحنیفہ (رح)۔ امام شافعی امام احمد کے نزدیک لقمہ اتارنے کے لیے اسے شراب پی لینی جائز ہے اور امام مالک سے مشہور قول یہ ہے کہ جائز نہیں ہے اس میں ائمہ کا اختلاف ہے کہ شراب کا دوا میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ (رح) امام مالک امام احمد فرماتے ہیں کہ جائز نہیں ہے ایک صحیح قول امام شافعی کا بھی یہی ہے اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ (دوا میں) تھوڑی سی شراب استعمال کرلینا جائز ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ شراب کی تلچھٹ وغیرہ بھی پینی مکروہ ہے کیونکہ اس میں شراب کے اجزا ہوتے ہیں اور حرام چیز سے نفع اٹھانا بھی حرام ہے اور اسی واسطے اسے زخم پر لگانا اور جانوروں کے کیڑوں میں ڈالنا بھی جائز نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ دوا کے طور پر بچہ یا ذمی کو پلائے اور اگر پلادے تو اس کا وبال پلانے والے کے ذمہ رہتا ہے اور اسی طرح جانوروں کو بھی پلانی جائز نہیں ہے۔ وائل بن حجر کہتے ہیں ایک آدمی نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شراب کے استعمال کو پوچھا تو حضور نے اسے شراب سے منع کردیا وہ بولا کہ میں تو فقط دوا کے لیے بناتا ہوں فرمایا یہ دوا نہیں ہے بلکہ یقیناً بیماری پیدا کرنے والی ہے۔ یہ روایت مسلم نے نقل کی ہے۔ طارق بن سوید کہتے ہیں میں نے حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ہمارے ملک میں انگور ہوتے ہیں اور انھیں نچوڑ کر ہم شربت بنا لیتے ہیں فرمایا یہ نہیں چاہیے میں نے پھر پوچھا تو آپ نے پھر اسی طرح فرمادیا میں نے کہا کہ دوا کے طور پر بیماروں کو بھی ہم شراب پلا دیتے ہیں فرمایا اس میں شفا نہیں ہے بلکہ یہ یقیناً بیماری ہے۔ یہ حدیث امام احمد نے روایت کی ہے۔

ام سلمہ فرماتی ہیں میں نے ایک پیالہ نبیذ تیار کیا تھا پھر تھوڑی سی دیر میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے آئے اور اس وقت اس میں جوش آرہا تھا پوچھا یہ کیا ہے میں نے کہا میری بچی کو کچھ تکلیف ہے اس کے واسطے میں نے یہ دوا بنائی ہے۔ فرمایا ان چیزوں میں تمہارے لیے اللہ نے شفا نہیں رکھی جو اس نے تم پر حرام کردی ہیں۔ یہ روایت بیہقی اور ابن حبان نے نقل کی ہے ابن حبان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حرام چیزوں میں تمہارے لیے اللہ نے شفا نہیں رکھی یہی روایت ابن مسعود سے بخاری نے تعلیقاً روایت کی ہے۔

میں کہتا ہوں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس اشارہ کا کہ حرام چیزوں میں اللہ نے تمہارے لیے شفا نہیں رکھی یہ مطلب نہیں ہے کہ شفا ان میں پیدا ہی نہیں کی کیونکہ یہ تو نص آیت کے خلاف ہے اس کے علاوہ حرام ہونے سے خلقی اور جبلی فائدے نہیں

بدل جایا کرتے ۔لاَ تبدیل لخلق اللہ بلکہ مقصود اس سے یہ ہے کہ حرام چیز سے شفا حاصل کرنے کی تمہیں اجازت نہیں دی گئی اور کبھی حرام چیز کا دوا میں استعمال جائز ہونے پر حضرت انس کی حدیث سے حجت کی جاتی ہے وہ حدیث یہ ہے انس کہتے ہیں کہ عکل یا عرینہ کے خاندان کے چند آدمی مدینہ منورہ میں آئے اور مدینہ کی آب وہوا انھیں موافق نہ آئی تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں حکم دیا کہ اونٹوں کے گلّے کے ساتھ جنگل چلے جایا کریں اور ان کا دودھ موت پیتے رہیں وہ پینے لگے جب خوب تندرست ہو گئے تو چرواہے کو قتل کر دیا اور اونٹ لے کر اپنے وطن کا راستہ لیا آخر حدیث تک یہ حدیث بخاری ومسلم نے روایت کی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے کیونکہ ان عرینیوں کا قصہ سورۃ مائدہ کے نازل ہونے سے پہلے ہوا ہے۔ امام شافعی (رح) اس حدیث سے استدلال لاتے ہیں کہ جس جانور کا گوشت کھایا جائے اس کا پیشاب پاک ہے پس اس حدیث سے اس سے مسئلہ پر حجت کرنی جائز نہیں ہے کہ حرام چیز کے ساتھ دوا کرنی جائز ہے اس میں بھی اختلاف ہے کہ شراب کا سرکہ بنالینا جائز ہے یا نہیں امام ابوحنیفہ (رح) فرماتے ہیں جائز ہے اور سرکہ ہو کر وہ شراب پاک ہوجاتی ہے۔ امام مالک کا قول یہ ہے کہ مکروہ ہے لیکن سرکہ ہو کر پاک ہوجاتی ہے۔ امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں جائز نہیں ہے اور نہ سرکہ ہو کر پاک ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل ام سلمہ کی حدیث ہے کہ ان کے ہاں دودھ کی ایک بکری تھی پھر (ایک روز) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس بکری کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ تمہاری بکری کیا ہوئی ہم نے کہا مرگئی فرمایا کہ اس کی کھال کو اپنے کام میں کیوں نہیں لائیں ہم نے کہا یا رسول اللہ وہ مردہ تھی فرمایا دباغت سے وہ پاک ہوجاتی ہے جیسا کہ شراب سرکہ ہو کر پاک ہوجاتی ہے۔ یہ روایت دارقطنی نے نقل کی ہے دارقطنی کہتے ہیں کہ اس کو روایت کرنے والا فرح بن فضالہ اکیلا راوی ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ راوی سندوں کو الٹ پلٹ کر دیتا ہے اور واہی تباہی متون کے ساتھ صحیح سندیں لگا دیتا ہے لہٰذا اس کی روایت کو حجت بنانا جائز نہیں ہے اور انھوں نے بہت سی حدیثیں ایسی ذکر کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ تمہارے لیے عمدہ سرکہ شراب کا ہے اور کھال دباغت سے اس طرح پاک ہوجاتی ہے جیسے سرکہ ہونے سے شراب حلال ہوجاتی ہے یہ حدیث مشہور نہیں ہے۔

امام شافعی اور امام احمد کی دلیل حضرت انس کی یہ حدیث ہے کہ ابوطلحہ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان یتیموں کی بابت دریافت کیا جن کے ورثہ میں شراب آئی تھی حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اسے پھینک دو ابوطلحہ (رض) نے کہا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم اس کا سرکہ نہ بنالیں؟ فرمایا: نہیں۔

یہ حدیث مسلم نے روایت کی ہے اور یہ حدیث اور طریقوں سے بھی مروی ہے جن کو دارقطنی نے نقل کیا ہے اور بعض میں یہ ہے ابوطلحہ (رض) نے کہا کہ چند یتیم بچے جو میری پرورش میں ہیں میں نے ان کے لیے شراب خریدلی ہے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ وہ شراب پھینک دو اور اس کے مٹکوں کو توڑ دو۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین مرتبہ اسی طرح فرمایا۔ دوسری حدیث ابوسعید کی ہے وہ کہتے ہیں کہ جب شراب حرام ہوگئی تو ہم نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ ہمارے پاس ایک یتیم بچہ کی شراب ہے فرمایا اسے پھینک دو ہم نے پھینک دی۔

وَاِثۡمُهُمَاۤ اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا (اور ان کے فائدہ سے ان کا گناہ زیادہ ہے) صاحب معالم التنزیل کہتے ہیں ضحاک (اس کے یہ معنی) کہتے تھے کہ حرام ہونے کے بعد ان کا گناہ اس فائدے سے بڑا ہے جو حلال ہونے سے پہلے تھا اور بعض کا قول یہ ہے

کہ حرام ہونے سے پہلے ہی ان کے فائدے سے ان کا گناہ زیادہ تھا اور میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ حرام ہونے کے بعد ان کا گناہ ان کے فائدہ سے زیادہ بڑھ کر ہے کیونکہ گناہ کی مضرتیں آخرت میں ہوں گی اور اس کے فائدے دنیا میں حاصل ہو جاتے ہیں اور دنیا چند روزہ ہے اور آخرت بڑی سخت کٹھن ہے واللہ اعلم۔

یتیم اور اس کے مال کے بارے میں

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

''امور دینی اور دنیاوی کو۔ اور تجھ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں (۱) آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر خواہی بہتر ہے، تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا (۲) یقیناً اللہ تعالیٰ غلبہ والا اور حکمت والا ہے''۔

اس آیت میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر: (۱) ابو داؤد اور نسائی نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

(آیت) "ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی هی احسن"۔ (الانعام: ۱۵۲)

ترجمہ: اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔

اور

(آیت) "ان الذین یاکلون اموال الیتمی ظلما"۔ الآیہ (النساء: ۱۰)

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے۔

تو وہ آدمی جس کے پاس کوئی یتیم تھا اس نے اس کا کھانا اپنے کھانے سے اور اس کا مشروب اپنے مشروب سے الگ کر دیا، پس وہ اپنے کھانے میں سے جو کچھ بچا تا تھا وہ اسے اس کے لیے روک کر رکھ لیتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے کھا لیتا یا وہ فاسد اور خراب ہو جاتا۔ پس یہ چیز ان پر انتہائی شاق اور تکلیف دہ ثابت ہوئی، تو انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں اس کا ذکر کیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: (آیت) "ویسئلونك عن الیتمی، قل اصلاح لهم خیر "۔ الآیہ۔ پس انھوں نے ان کے کھانے پینے کو اپنے کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ملا دیا۔ یہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں۔ (۱) (سنن ابی داؤد، باب مخالفة الیتیم فی الطعام حدیث نمبر: ۲۴۸۷، ضیاء القرآن پبلی کیشنز) اور یہ آیت ماقبل کے ساتھ متصل ہے کیونکہ اموال کے ذکر کے ساتھ یتیموں

کے مالوں کی حفاظت کا امر مقترن ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس میں سائل حضرت عبداللہ بن رواحہ (رض) ہیں۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عرب اپنے کھانے پینے کی اشیاء میں یتیموں کے مالوں کو ملانے سے بدشگونی لیتے تھے۔ پس یہ آیت نازل ہوئی۔

مسئلہ نمبر: (۲) جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کی دیکھ بھال کے لیے خیر و بھلائی کے ارادہ سے ان کا مال اپنے مال میں ملانے کی اجازت عطا فرمادی ہے تو یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں تصرف کرنا جائز ہے اور بیع اور تقسیم وغیرہ میں وصی کا تصرف بھی جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ آیت مطلق ہے۔ جب ایک آدمی یتیم کا کفیل بن گیا اور اس نے اسے مخصوص کرلیا اور وہ اس کی زیر نگرانی رہنے لگا تو اس کے بارے اس کا عمل جائز ہوگا اگرچہ والی نے اسے اس پر مقدم نہ بھی کیا ہو کیونکہ آیت مطلق ہے اور کفالت ولایت عامہ ہے اور خلفاء میں سے کسی سے مروی نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے میں اپنے ہوتے ہوئے کسی کو یتیم پر مقدم کیا ہو۔ بلاشبہ وہ ان کے اپنے ہونے پر ہی اقتصار کرتے تھے (یعنی ان کی جملہ ذمہ داری خود ادا کرتے تھے)

مسئلہ نمبر: (۳) یتیم کا مال مضاربت اور تجارت کی غرض سے دینے کے بارے میں اور اس کا مال اپنے مال کے ساتھ ملانے کے بارے میں روایات تواتر کے ساتھ موجود ہیں۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ یتیم کے مال میں بیع و شرا کے اعتبار سے تصرف کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ خیر و بھلائی کا موجب ہو اور اسی طرح مضاربت وغیرہ کے لیے بھی دینا جائز ہے، ہم عنقریب تفصیل سے بیان کریں گے۔

البتہ قرض کے طور پر دینے میں اختلاف ہے۔ اشہب نے اس سے منع کیا ہے اور اسی منع پر اسے بھی قیاس کیا ہے کہ وہ ان کے لیے اپنی طرف سے کوئی شے بیچے یا کوئی خریدے۔

اور دوسروں نے کہا ہے: جب وہ قرض لے نفع کی خاص مقدار کے عوض جو کہ قرض کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو تو اسے دے دیا جائے گا، جیسا کہ وہ یتیم کے لیے پوری جانچ پڑتال کے ساتھ کوئی شے خریدے تو یہ یتیم کے لیے بہت زیادہ اچھا اور بہتر ہوگا۔

محمد بن عبدالحکم نے کہا ہے: آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ یتیم کے لیے قرض کے عوض (ادھار) بیع کرے اگر وہ اس میں بہتری اور نفع دیکھے۔

ابن کنانہ نے کہا ہے: اس کے لیے جائز ہے کہ یتیم کی شادی کے لیے اتنا مال خرچ کرے جو اس کی ضروریات اور پاکیزگی کے لیے مفید اور نفع بخش ہو اور اس کا نفع اس کے اپنے حال اور اس کے حال جس کے ساتھ وہ اس کی شادی کر رہا ہے، کے مطابق اور اس کے مال کی کثرت کی مقدار کے برابر ہو۔ مزید فرمایا: اسی طرح وہ اس کے ختنے وغیرہ میں اس کا مال خرچ کرسکتا ہے، اگر اسے یہ خوف ہو کہ اسے سلطان کے پاس پیش کرنے کا اہتمام کیا جائے گا اور وہ اسے بالقصد اس کا حکم دے گا اور ہر وہ عمل جو اس نے گہری نظر و فکر کے ساتھ کیا تو وہ جائز ہے اور جو اس نے بطور محاباۃ (کسی دوسرے شخص کی سہولت کو پیش نظر رکھنا) اور کوتاہ نظری کی بنا پر کیا تو وہ عمل جائز نہ ہوگا۔ آیت کا ظاہر اس پر دلیل ہے کہ یتیم کا ولی اسے دنیا اور آخرت کے امور کی تعلیم دے گا اور اس کے لیے ایسا معلم اجرت پر رکھے گا جو اسے کاروبار کی تعلیم دے گا۔ اور جب یتیم کو کوئی شے ہبہ کی جائے تو وصی کے لیے اس پر قبضہ کرنا جائز ہے کیونکہ اس میں اصلاح اور بھلائی ہے۔

مسئلہ نمبر: (٤) جن چیزوں کے لیے وصی اور کفیل یتیم کا مال خرچ کر سکتے ہیں ان کی دو حالتیں ہیں: ایک وہ حالت ہے جس پر گواہ بنانا ممکن ہوتا ہے اور اس میں بینہ کے بغیر اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا اور ایک وہ حالت ہے جس پر شاہد بنانا ممکن نہیں ہوتا، تو اس پر بغیر بینہ کے اس کا قول قبول ہوگا، پس جب کسی نے زمین خریدی اور وہ جس میں توثیق کی عادت جاری ہو تو بغیر بینہ کے اس میں اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: اسی وجہ سے ہمارے اصحاب نے ان کے درمیان یہ فرق بیان کیا ہے کہ یتیم وصی کے گھر میں ہو تو وہ اس پر خرچ کر سکتا ہے اور اسے اس کے نفقہ اور اس کے لباس وغیرہ مہیا کرنے پر شاہد بنانے کا پابند نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس کے لیے ہر وقت اس پر گواہ بنانا متعذر ہوگا جو اسے کھلائے اور اسے پہنائے، بلکہ جب اس نے یہ کہا: میں نے سال بھر کے لیے یہ خرچہ کیا ہے تو یہ اس سے قبول کر لیا جائے گا، اور اس کے درمیان کہ وہ اپنی ماں یا اپنی دایہ (پرورش کرنے والی) کے پاس ہو اور وصی یہ دعوی کر رہا ہو کہ وہ اس پر خرچہ کر رہا ہے یا وہ اس کی ماں یا دایہ کو نفقہ اور کسوۃ دیتا ہے تو بینہ کے بغیر ماں یا دایہ کے خلاف اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ اس کے لیے بطور مشاہرہ یا خاطر مدارت اس پر قبضہ کرتی رہی ہے۔

مسئلہ نمبر: (٥) علماء کا اس آدمی کے بارے میں اختلاف ہے جو اپنی زیر نگرانی یتیم بچی سے اپنا نکاح کر لیتا ہے کیا اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے زیر پرورش یتیم بچے یا بچی کے مال سے اپنے لیے خرید سکتا ہے؟

پس حضرت امام مالک (رح) نے فرمایا: کفالت اور حضانت کے سبب نکاح کی ولایت قرابت کی نسبت زیادہ قوی ہے، حتی کہ ان اعراب کے بارے میں کہا جو قحط کے دنوں میں اپنے بچوں کو دوسروں کے حوالے کر دیتے تھے: بیشک وہ انھیں ان کا نکاح کرنے کا اختیار دے دیتے تھے۔

اور رہا اس سے خریدنا تو حضرت امام مالک (رح) نے کہا: مشہور اقوال کے مطابق وہ اس سے خرید سکتا ہے اسی طرح حضرت امام اعظم ابوحنیفہ (رح) نے کہا ہے: اس کے لیے جائز ہے کہ وہ یتیم بچے کا مال مثلی قیمت سے زیادہ کے عوض اپنے لیے خرید لے، کیونکہ یہ اصلاح اور خیر ہے جس پر ظاہر قرآن دلالت کرتا ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: نکاح اور بیع میں ایسا کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ آیت میں تصرف کا ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے: (آیت) "اصلاح لھم خیر"۔ (ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے) اس میں اس کا ذکر نہیں جس کے لیے دیکھ بھال جائز ہوتی ہے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہ (رح) فرماتے ہیں: جب بھلائی کرنا بہتر ہے تو پھر اس کی شادی کرانا بھی جائز ہوگا اور یہ بھی جائز ہوگا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ اور امام شافعی شادی کرانے میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے سوائے اس جہت کے کہ اس سے حاجت دور ہو جاتی ہے اور بالغ ہونے سے پہلے کوئی حاجت نہیں۔

امام احمد بن حنبل (رح) وصی کے لیے شادی کرانے کو جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ بھلائی ہے اور امام شافعی (رح) فرماتے ہیں کہ دادا کے لیے جائز ہے کہ وہ بھی وصی کے ساتھ ساتھ شادی کرا دے اور باپ کے لیے بھی ایسے بچے کے حق میں (یہ اختیار ہے) جس کی ماں فوت ہو چکی ہو نہ کہ اس آیت کے حکم سے اور امام اعظم ابوحنیفہ (رح) قاضی کے لیے ظاہر قرآن کے مطابق یتیم کی شادی کرانے کو

جائز قرار دیتے ہیں، یہ سب مذاہب اسی آیت سے ظاہر ہوئے ہیں۔پس اگر تزویج کا اصلاح (اور نفع بخش ہونا) ثابت ہو جائے تو پھر آیت کا ظاہر اس کے جواز کا تقاضا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد (آیت) "ویسئلونک عن الیتمی" کا یہ معنی ہونا بھی جائز ہے کہ آپ سے یتیموں کے ذمہ دار، ان کی کفالت کرنے والے سوال کرتے ہیں اور یہ مجمل ہے اس سے معین کافل (کفالت کرنے والا) اور قیم (ذمہ دار) معلوم نہیں ہو سکتا اور جو اس میں اوصاف شرط ہوتے ہیں (وہ بھی معلوم نہیں ہو سکتے)

اور اگر کہا جائے: امام مالک (رح) نے جب آدمی کو اپنے یتیم سے مال خریدنے کی اجازت دے دی ہے تو اس سے تو ان کا تہمت اور ذرائع میں اصل کو ترک کرنا لازم آتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ لازم نہیں آتا۔ بلاشبہ یہ ان میں ذریعہ اور وسیلہ بن سکتا ہے جو ممنوع افعال سے ایسے ممنوع تک پہنچانے والے ہوں جن کے بارے میں نص بیان کر دی گئی ہو لیکن یہاں تو اللہ تعالیٰ نے مال باہم ملانے کی صورت میں اجازت عطا فرمادی ہے اور اس میں پرورش کرنے والوں کو ان کی امانتوں کے حوالے کر دیا ہے جیسا کہ فرمایا (آیت) "واللہ یعلم المفسد من المصلح"۔ اور ہر وہ امر جس کے بارے میں خوف ہو اللہ تعالیٰ نے مکلف کو اس کی امانت کے حوالے کر دیا ہے، اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ممنوع تک پہنچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے، لہٰذا اس سے منع کر دیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنی شرمگاہوں پر امین بنایا ہے، اگرچہ ان کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔

حضرت طاؤس سے جب یتیموں کے بارے میں کسی شے سے متعلق سوال کیا جاتا تو وہ یہ پڑھتے:

(آیت) "واللہ یعلم المفسد من المصلح"۔

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے بگاڑنے والے کو سنوارنے والے سے۔

ابن سیرین کے نزدیک یتیم کے مال کے بارے میں پسندیدہ عمل یہ تھا کہ وہ اس کے خیر خواہ لوگوں کو جمع کرے اور وہ اس کے بارے غور وفکر کریں جو اس کے لیے مفید اور بہتر ہو۔ اسے امام بخاری (رح) نے ذکر کیا ہے اور اس میں اس پر دلیل ہے کہ اپنے لیے یتیم کے مال سے خریدنا جائز ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ولی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس مال میں سے کوئی شے خریدے جو اس کے اپنے زیر نگرانی ہو، کیونکہ اس میں اسے تہمت لگ سکتی ہے مگر یہ کہ اس میں لوگوں کی ایک جماعت میں بیع سلطان کی جانب سے ہو (یعنی نیلام عام ہو)

محمد بن عبدالحکیم نے کہا ہے: وہ ترکہ میں سے نہیں خرید سکتا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ایسے آدمی کو وسیلہ بنائے جو اس میں سے اس کے لیے خریدے، بشرطیکہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اس کی طرف سے ہے۔

مسئلہ نمبر: (٦) قولہ تعالیٰ: (آیت) "وان تخالطوھم فاخوانکم"۔ یہ اختلاط اور میل جول دو ہم مثل چیزوں کے ملنے کی طرح ہے جیسا کہ کھجور کا کھجور کے ساتھ مل جانا وغیرہ۔

ابوعبید نے کہا ہے: یتیموں کو ساتھ ملانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے کسی کا مال ہو اور اس کے کفیل کے لیے یہ امر باعث مشقت ہو کہ وہ اپنے سے اس کا کھانا وغیرہ علیحدہ کرے۔ اور وہ اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ ملائے بغیر کوئی چارہ نہ پائے تو وہ یتیم کے مال سے اتنا لے لے جسے وہ غور وفکر کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کے لیے کافی ہوگا اور اسے اپنے اہل خانہ کے خرچہ کے ساتھ ملا لے اور اس میں کبھی کمی بیشی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اور یہ آیت ناسخہ اس میں رخصت کے لیے نازل ہوئی ہے۔ ابوعبید نے کہا ہے: میرے

نزدیک یہی اس کی اصل ہے جو دوران سفر دوست احباب کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جانب سے برابر برابر خرچہ نکالتے ہیں۔ حالانکہ کھانے کی قلت وکثرت میں وہ باہم متفاوت ہوتے ہیں اور ان میں سے جس کا کھانا کم ہو وہ اپنے ساتھی کے خلاف فضل (اضافی کھانے) کا دعوی نہیں کرتا۔ تو جب یتیموں کے مال میں یہ وسعت موجود ہے تو ان کے علاوہ میں بدرجہ اولی وسعت ہوگی۔ اگر اس طرح نہ ہو تو مجھے خوف ہے کہ لوگوں پر اس بارے میں امر انتہائی شدید اور شاق ہو جائے۔

مسئلہ نمبر: (۷) قولہ تعالیٰ: (آیت) "فاخوانکم "۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی فھم اخوانکم ہے۔ اور فا جواب شرط کے لیے ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: (آیت) "واللہ یعلم المفسد من المصلح "۔ یہ تحذیر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یتیموں کا مال خراب کرنے والے کو اسے سنوارنے والے سے خوب جانتا ہے، پس وہ ہر ایک کو اس کے سنوارنے اور اس کے بگاڑنے کے بدلے جزا دے گا۔

مسئلہ نمبر: (۸) قولہ تعالیٰ: (آیت) "ولو شآء اللہ لاعنتکم " حکم نے مقسم سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت بیان کی ہے (آیت) ولو شآء اللہ لاعنتکم" فرمایا: اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا امر کر دیتا کہ تم یتیموں کے مال کے سبب ہلاک ہونے تک پہنچ جاتے۔ اور کہا گیا ہے کہ (آیت) "لاعنتکم " کا معنی ہے لاھلککم (کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تمہیں ہلاک کر دیتا) یہ زجاج اور ابوعبید کا بیان ہے۔ اور قتبی نے کہا ہے: (معنی یہ ہے) کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ تم پر معاملہ تنگ اور سخت کر دیتا لیکن اس نے تم پر سہولت اور آسانی کے سوا کچھ نہیں چاہا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی وہ تمہیں ایسے امر کا مکلف اور پابند بنا دیتا جس کو ادا کرنا تم پر انتہائی شدید اور سخت ہوتا اور ان کا اختلاط تمہیں گناہ گار کر دیتا، جیسا کہ اس نے ان کے ساتھ کیا جو تم سے پہلے تھے، لیکن اس نے تم سے تخفیف کی ہے۔

اور العنت کا معنی مشقت ہے، "وقد عنت واعنتہ وغیرہ"۔ وہ مشقت میں پڑا اور غیر نے اسے مشقت میں ڈالا۔ اور جب ہڈی کو کوئی شے لگے اور وہ اسے توڑ دے تو ایسی جڑی ہوئی ہڈی کے لیے کہا جاتا ہے: قد اعنتہ، تحقیق اس نے اسے مشقت میں اور درد میں مبتلا کیا" فھو عنت ومغنت۔ اور عنتت الدابۃ تعنت عنتا: جب چوپائے کا پاؤں جڑنے کے بعد پھر ٹوٹ جائے اور اس کے لیے چلنا ممکن نہ ہو۔ اور" اکمہ عنوت " ایسا ٹیلہ جس پر چڑھنا انتہائی دشوار ہو۔ ابن الانباری نے کہا ہے: "العنت " کا اصل معنی تشدید (سختی) ہے جب عرب یہ کہتے ہیں: فلان یتعنت فلانا ویعنتہ" تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس پر انتہائی شدت اور سختی کرتا ہے اور اسے ایسے کام کا پابند بناتا ہے جسے کرنا اس پر انتہائی مشکل اور دشوار ہوتا ہے، پھر اسے ہلاکت کے معنی کی طرف منقول کیا گیا ہے۔ اور اصل معنی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔

قولِ باری تعالیٰ: (آیت) "ان اللہ عزیز " یعنی اس پر کوئی شے رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ (آیت) "حکیم " وہ اپنی مالکی میں اس کے مطابق تصرف کرتا ہے جو وہ ارادہ کرتا ہے اس پر کوئی پابندی اور رکاوٹ نہیں، وہ انتہائی عظمت وشان والا اور بزرگ وبرتر ہے۔

مشرکین کے ساتھ نکاح ناجائز ہونے کے بیان میں

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

’’اور شرک کرنے والی عورتوں سے تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں تم نکاح نہ کرو (۱) ایماندار لونڈی بھی شرک کرنے والی آزاد عورت سے بہتر ہے، گو تمہیں مشرکہ ہی اچھی لگتی ہو اور نہ شرک کرنے والے مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں، ایماندار غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے، گو مشرک تمہیں اچھا لگے، یہ لوگ جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے وہ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرما رہا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں‘‘۔

مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کے ساتھ مسلمانوں کے نکاح کا عدم جواز:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یتیم کے ساتھ مخالطت کا جواز بیان فرمایا تھا‘ جس کا تقاضا یہ تھا کہ یتیم کے مال کے ساتھ اپنا مال مخلوط کرنا بھی جائز ہے اور یتیم لڑکے یا یتیم لڑکی کے ساتھ اپنا یا اپنی اولاد کا نکاح کرنا بھی جائز ہے تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بعض مسائل بیان فرمائے کہ مشرک مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کا اور مشرک عورتوں کے ساتھ مسلمان مردوں کا نکاح جائز نہیں ہے‘ کیونکہ نکاح کی وجہ سے شوہر اور بیوی کے ساتھ جسمانی اور ذہنی قرب ہوتا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے عقائد‘ نظریات‘ افکار اور خیالات سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے یہ خدشہ ہے کہ مشرک شوہر کے عقائد سے بھی ہوسکتا تھا کہ مسلمان بیوی متاثر ہو یا مشرک عورت کے نظریات سے مسلمان شوہر متاثر ہو‘ اس لیے اسلام نے یہ راستہ ہی بند کر دیا‘ اگرچہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ مسلمان شوہر یا بیوی سے مشرک بیوی یا شوہر متاثر ہوجائے لیکن جب کوئی چیز نفع اور نقصان کے درمیان دائر ہو تو نقصان سے بچنے کو نفع کے حصول پر مقدم کیا جاتا ہے اس لیے اسلام نے مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مناکحت کا معاملہ کلیۃً منقطع کر دیا۔ یہاں شرک سے مراد کفر ہے‘ اس لیے ملحد‘ مجوسی‘ بت پرست اور کسی قسم کے بھی کافر سے نکاح جائز نہیں ہے مسلمان مرد کا نہ مسلمان کا عورت کا۔

حافظ جلال الدین سیوطی اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق لکھتے ہیں:

امام ابن ابی حاتم اور امام ابن المنذر نے مقاتل بن حیان سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو مرثد غنوی کے متعلق نازل ہوئی ہے' انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت طلب کی کہ وہ عناق نامی ایک مشرکہ عورت سے نکاح کرلیں جو نہایت ہوئی ہے' انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت طلب کی کہ وہ عناق نامی ایک مشرکہ عورت سے نکاح کرلیں جو نہایت حسین وجمیل عورت تھی اور حضرت ابو مرثد مسلمان ہو چکے تھے' انھوں نے کہا: یارسول اللہ! وہ عورت مجھے بہت اچھی لگتی ہے' تب یہ آیت نازل ہوئی: اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ الایۃ

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۵۶' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

اس آیت میں یہ بھی فرمایا ہے کہ آزاد مشرک کی بہ نسبت مسلمان غلام بہتر ہے' اور کسی آزاد مسلمان عورت کا نکاح مسلمان غلام سے کر دینا اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ اس کا نکاح آزاد مشرک سے کیا جائے حالانکہ غلام آزاد کا کفو نہیں ہے' سو غیر کفو میں نکاح کے جواز کے لیے یہ آیت صریح جزیہ ہے۔

مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کے باوجود اہل کتاب سے نکاح کے جواز کی توجیہ:

اسلام میں یہ جائز ہے کہ اہل کتاب عورتوں کے ساتھ مسلمان مرد نکاح کرلیں لیکن اہل کتاب مردوں کے ساتھ مسلمان عورتوں کا نکاح کرنا جائز نہیں ہے' قرآن مجید نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کے باوجود کتابیہ یعنی یہودی یا عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کی اجازت دی ہے۔

(آیت) "وطعام الذین اوتوالکتب حل لکم وطعامکم حل لھم والمحصنت من المؤمنت والمحصنت من الذین اوتو الکتب من قبلکم اذا اتیتموھن اجورھن محصنین غیر مصفحین ولا متخذی اخدان"۔ (المائدہ: ۵)

ترجمہ: اور اہل کتاب کا ذبیحہ تمہارے لیے حلال ہے' اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے اور (تمہاری) آزاد پاک دامن مسلمان عورتیں اور تم سے پہلے اہل کتاب کی آزاد پاک دامن عورتیں (تمہارے لیے حلال ہیں) جب کہ تم ان سے نکاح کر کے ان کا مہر ادا کرو' نہ ان سے ظاہراً بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو۔

اب یہ سوال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی تھی تو پھر کتابیہ سے نکاح کی اجازت کیوں دی جب کہ اہل کتاب یہودی اور عیسائی بھی مشرک ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصری المسیح ابن اللہ"۔ (التوبہ: ۳۰)

ترجمہ: اور یہود نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا: مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ یہود و نصاریٰ دونوں مشرک ہیں لیکن قرآن مجید کی اصطلاح ہے کہ اس نے بت پرستوں پر مشرکین کا اطلاق کیا ہے اور یہود و نصاریٰ پر اہل کتاب کا' قرآن مجید میں ہے؛

(آیت) "ما یود الذین کفروا من اھل الکتب ولا المشرکین"۔ (البقرہ: ۱۰۵)

ترجمہ: کافروں میں سے اہل کتاب اور مشرکین یہ پسند نہیں کرتے کہ۔۔۔

(آیت) " لم یکن الذین کفروا من اھل الکتب والمشرکین منفکین حتی تاتیھم البینة "۔۔ (البینة: ۱)

ترجمہ: کافر اہل کتاب اور مشرکین بغیر واضح دلیل کے اپنے دین کو چھوڑنے والے نہ تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ مشرک عورتوں میں اہل کتاب عورتیں بھی داخل تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں میں اہل کتاب عورتیں بھی داخل تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرکات کے عموم سے اہل کتاب عورتوں کو مستثنیٰ کرلیا' اور یہ اصطلاح میں عام مخصوص عنہ البعض ہے' حافظ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

امام ابن جریر' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس (رض) سے (آیت) " ولا تنکحوا المشرکت "۔ (البقرہ: ۲۲۱) کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے اہل کتاب کی عورتوں کو مستثنیٰ کرلیا ہے اور دلیل استثناء یہ آیت ہے:

(آیت) " والمحصنت من الذین اوتوا الکتب "۔ (المائدہ: ۵)

ترجمہ: اور اہل کتاب کی آزاد پاک دامن عورتیں (تمہارے لیے حلال ہیں) (الدرالمنثور' ج ۱ ص ۲۵۶' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

باقی رہی یہ بحث کہ خالص مشرک عورتوں اور اہل کتاب میں نکاح کے جواز کا فرق کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشرک نہ خدا کو مانتا ہے نہ کتاب کو نہ رسول اللہ کو نہ قیامت اور جزاء اور سزاء کو' نہ حلال اور حرام کا قائل ہوتا ہے' اس کے برعکس اہل کتاب ان تمام امور کو مانتے ہیں ان کے کفر کی صرف یہ وجہ ہے کہ انھوں نے غلو محبت میں اپنے اپنے رسول کو خدا اور خدا کا بیٹا کہہ دیا۔

دوسری بحث یہ ہے کہ مسلمان مردوں کا اہل کتاب عورتوں کے ساتھ نکاح جائز قرار دیا ہے اور مسلمان عورتوں کا اہل کتاب مردوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں کیا' اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عائلی اور گھریلو زندگی میں مرد حاکم ہوتا ہے اور اس کا گھر میں قبضہ اور اقتدار ہوتا ہے اور عورت فطرۃ منفعل مزاج اور گھر میں محکوم ہوتی ہے۔ اگر کسی یہودی یا عیسائی مرد کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح جائز ہوتا تو عین ممکن تھا کہ وہ مسلمان عورت اپنے کافر شوہر کے معتقدات اور خیالات سے متاثر ہوجاتی اور اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہوجاتی۔ اس کے برعکس جب شوہر مسلمان ہو اور بیوی یہودی یا عیسائی ہو تو چونکہ گھر میں حاکم اور مقتدر شوہر ہوتا ہے اس لیے گھر میں اسلامی ماحول اور لٹریچر فراہم ہوگا اور اس اہل کتاب عورت کو اسلام کو قریب سے دیکھنے پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا' اسلامی معاشرہ' اسلام کی تہذیب اور مسلمان خاندان سے میل جول اور ربط وضبط کی وجہ سے اس کے اسلام قبول کرنے کے بہت ذرائع میسر ہوں گے اور وہ جلد یا بہ دیر مسلمان ہوجائے گی اور اگر بالفرض وہ مسلمان نہ بھی ہو تو بچے بہر حال باپ کے دین کے تابع رہیں گے اور ظاہر ہے کہ یہ تمام مواقع دارالسلام میں ہی میسر ہوتے ہیں' اس لیے ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ دارالکفر میں اہل کتاب عورت کے ساتھ نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ وہاں کفر کا غلبہ ہوتا ہے اور جس حکمت کی وجہ سے اہل کتاب عورت کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے اس کے پورے ہونے کے مواقع وہاں میسر نہیں ہیں۔

حیض کے بیان میں

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۲۲۲

''آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے، حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو (۱) اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں ان کے قریب نہ جاؤ ہاں جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے (۲) اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے''۔

(سورۃ بقرہ آیت 222)

حیض کا حکم بیان کرنے کا شان نزول:

اس سے پہلی آیت میں نکاح کا ذکر کیا گیا تھا اور نکاح کے لوازم سے بیوی کے ساتھ جماع کرنا ہے' سو ان آیتوں میں بتایا ہے کہ کس حالت میں عورت کے ساتھ جماع کرنا ہے اور کس حالت میں نہیں کرنا اور چونکہ جماع کا مقصد حصول اولاد ہے' محض قضاء شہوت نہیں ہے' اس لیے فرمایا کہ جس جگہ سے حصول اولاد ہو وہاں تخم ریزی کرو' یعنی عمل معکوس نہ کرو' خواہ اس عمل (تخم ریزی) کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرو۔

حافظ جلال الدین سیوطی اس آیت کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

امام احمد' امام دارمی' امام مسلم' امام ابوداؤد' امام ترمذی' امام ابن ماجہ' امام ابویعلی' امام ابن المنذر' امام ابن ابی حاتم' امام ابن حبان اور امام بیہقی' حضرت انس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ یہود کے ہاں جب کسی عورت کو حیض آجاتا تو وہ اس کو گھر سے نکال دیتے' اس کے ساتھ کھاتے نہ پیتے نہ اس کے ساتھ گھروں میں رہتے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ان عورتوں کو گھروں میں رکھو اور عمل زوجیت کے سوا ان کے ساتھ سب کچھ کرو' جب یہود کو یہ خبر پہنچی تو انھوں نے کہا: یہ شخص ہر بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے' پھر حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباس بن بشر آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہود اس اس طرح کہہ رہے ہیں تو کیوں نہ ہم اپنی عورتوں سے جماع بھی کرلیں یہ سن کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ متغیر ہوگیا حتی کہ ہم نے یہ گمان کیا کہ آپ ان سے ناراض ہوگئے ہیں اس کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ہدیہ میں دودھ آیا تو آپ نے وہ دودھ ان دونوں کے لیے بھیجا اس سے ان دونوں نے یہ جانا کہ آپ ان سے ناراض نہیں ہوئے (الدر المنثور' ج ۱ ص ۲۵۸' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

اس سے معلوم ہوا کہ استاد یا ماں باپ' شاگرد یا اولاد کو اگر کسی بات پر ڈانٹیں تو بعد میں کسی طرح ان کی دل جوئی کرکے اس کی

تلافی بھی کریں۔

حائضہ سے مباشرت کرنے کی دینی اور دنیاوی خرابی:

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: حائضہ عورت سے جماع کے سوا باقی سب کچھ کرسکتے ہو۔

(سنن ابوداؤد ج۱ ص۲۹٤ 'مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور ۱٤۰۵ھ)

اس حدیث کی بناء پر ہمارے فقہاء نے یہ کہا ہے کہ شوہر ایام حیض میں اپنی بیوی سے جسمانی قرب اور جسمانی لذت حاصل کرسکتا ہے' البتہ ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنوں تک احتراز کرے' کیونکہ اگر اس میں بھی دست درازی کرے گا تو خطرہ ہے کہ وہ عمل زوجیت میں مبتلا ہو جائے گا۔

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے حائضہ عورت سے جماع کیا یا کسی عورت کی سرین میں دخول کیا یا کسی شخص نے کاہن کے قول کی تصدیق کی تو اس نے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل شدہ دین کے ساتھ کفر کیا۔

(سنن ابن ماجہ ص ٤٧ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

جدید میڈیکل سائنس سے بھی واضح ہو گیا کہ حائضہ عورت کے ساتھ مباشرت کرنے سے مرد کے عضو مخصوص میں سوزاک ہو جاتا ہے اور بعض اوقات مرد اور عورت دونوں بانجھ ہو جاتے ہیں۔

حیض کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ:

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

جو خون رحم سے وقت مخصوص میں وصف مخصوص کے ساتھ خارج ہو اس کو حیض کہتے ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفی لکھتے ہیں:

لغت میں حیض کا معنی ہے: سیلان (بہنا) جب کوئی وادی بہنے لگے تو کہتے ہیں: " حاض الوادی" اوقات مخصوص میں خون بہنے کی وجہ سے اس خون کو حیض کہتے ہیں اور اصطلاح شرع میں حیض اس صفت شرعیہ کو کہتے ہیں جو ان کاموں کے کرنے سے مانع ہو جن کے لیے حیض سے پاک ہونا شرط ہے' مثلاً نماز پڑھنا' قرآن مجید کو چھونا' روزہ رکھنا' مسجد میں داخل ہونا اور عمل زوجیت کرنا۔

علامہ حصکفی نے حیض کی یہ تعریف کی ہے: وہ خون جو بالغہ کے رحم سے بغیر وقت ولادت کے خارج ہو۔ رحم کی قید سے استحاضہ خارج ہو گیا' کیونکہ یہ خون ایک رگ سے خارج ہوتا ہے اور یہ افعال مذکورہ سے مانع نہیں ہے' رحم اس ظرف کو کہتے ہیں جس میں بچہ ہوتا ہے یعنی بچہ دانی' اور بغیر وقت ولادت کی قید سے نفاس خارج ہو گیا (نفاس بھی افعال مذکورہ سے مانع ہے) ولادت کے بعد عورت

کے رحم سے جو خون نکلتا ہے اس کو نفاس کہتے ہیں:

حیض کا سبب یہ ہے کہ حضرت حواء نے شجر ممنوع کھالیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو حیض میں مبتلا کر دیا' امام بخاری نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حیض کے متعلق فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں پر اس کو مقدر کر دیا ہے' حیض کا رکن یہ ہے کہ خون رحم سے نکل کر فرج داخل کے باہر آجائے' اگر وہ خون فرج داخل ہی میں رہے تو وہ حیض نہیں ہے۔

(المفردات ص' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ' ایران' ۱۳۴۲ھ)

ایام حیض کے تعین میں مذاہب ائمہ:

علامہ نووی شافعی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم مدت ایک دن اور رات ہے' اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے' اور عموماً حیض چھ یا سات دن ہوتا ہے' اور دو حیضوں کے درمیان کم از کم طہر (پاکیزگی کے ایام) کی مدت پندرہ دن ہے۔

(الدر المختار علی رد المختار ج۱ ص ۱۸۹ - ۱۸۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ دردمالکی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم مدت کی کوئی حد نہیں ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے۔

(روضہ الطالبین ج۱ ص ۲۴۸ - ۲۴۷ مبطوعہ مکتب اسلامی بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ مدت پندرہ دن ہے۔

(المغنی ج۱ ص ۱۸۹' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۴۰۵ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

حیض کی کم از کم تین دن اور تین راتیں ہیں اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے۔

(درمختار علی ھامش رد المختار ج۱ ص ۱۸۶ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت ۱۴۰۷ھ)

فقہاء احناف کی دلیل حسب ذیل احادیث ہیں:

امام دارقطنی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوامامہ باہلی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی کنواری اور شادی شدہ عورت کا حیض تین دن سے کم اور دس دن سے زیادہ نہیں ہوتا' دس دن کے بعد نکلنے والا خون استحاضہ ہے۔ حائضہ ایام حیض کے بعد کی نمازوں کی قضا کرے۔ حیض میں سرخی مائل سیاہ گاڑھا کون ہوتا ہے اور استحاضہ میں زرد رنگ کا پتلا خون ہوتا ہے۔

(سنن دارقطنی ج۱ ص' ۲۱۸ مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

امام دارقطنی نے ایک اور سند سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(سنن دارقطنی ج۱ ص' ۲۱۸ مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان)

حضرت واثلہ بن اسقع (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: حیض کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہوتا ہے۔

(سنن دارقطنی ج ۱ ص ۲۱۹ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

امام دارقطنی نے ان احادیث کی سند کو ضعیف کہا ہے لیکن تعداد اسانید کیوجہ سے یہ احادیث حسن لغیرہ ہوگئیں اور ان سے استدلال صحیح ہے نیز ان احادیث کی تقویت حسب ذیل آثار سے ہوتی ہے:

امام دارقطنی روایت کرتے ہیں:

معاویہ بن قرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس (رض) نے فرمایا: حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ وکیع نے کہا: حیض تین سے دس دن تک ہے اس کے علاوہ استحاضہ ہے۔

(سنن دارقطنی ج ۱ ص ۲۱۰ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

امام دارقطنی نے ایک اور سند سے بھی یہ اثر بیان کیا اور سفیان کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔

(سنن دارقطنی ج ۱ ص ۲۱۰ مطبوعہ نشر السنۃ ملتان)

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ متعدد اسانید کے ساتھ چھ صحابہ سے منقول ہے کہ حیض کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔

(ردالمختار ج ۱ ص ۱۸۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۷ھ)

علامہ ابن ھمام لکھتے ہیں:

امام ابن عدی نے "کامل" میں حضرت معاذ بن جبل (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تین دن سے کم حیض نہیں ہوتا اور دس دن سے زیادہ حیض نہیں ہوتا۔

(فتح القدیر ج ۱ ص ۱۴۳ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

امام ابن جوزی نے "علل متناھیہ" میں حضرت ابوسعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔

(العلل المتناھیہ مطبوعہ مکتبہ اثریہ فیصل آباد ۱۴۰۱ھ)

حیض، نفاس اور استحاضہ میں مبتلا خواتین کے مسائل:

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی لکھتے ہیں؛

(۱) حالت حیض میں طہارت (پاکیزگی) کے حصول کیلیے وضو کرنا منع ہے، صفائی کے لیے غسل کرنا جائز ہے جیسے دوران حج بدن صاف کرنے کے لیے غسل کرتے ہیں اسی طرح جن وضائف کے پڑھنے کی اس کی عادت ہو، مثلاً تکبیر تہلیل درود شریف ان کے لیے وضو کرنا جائز ہے، کیونکہ فقہاء نے کہا ہے کہ حائضہ کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے وقت وضو کر کے اتنی دیر جائے نماز پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھتی رہے جتنی دیر میں وہ نماز پڑھتی تھی تا کہ اس کی نماز کی عادت قائم رہے اس عمل سے اس کو بہترین نماز پڑھنے کا اجر ملے گا۔

(۲) حیض کی حالت میں نماز پڑھنا منع ہے خواہ کسی قسم کی نماز ہو یا سجدہ شکر ہو حالت حیض میں جو نمازیں ہوگئیں ان کی قضا نہیں ہے۔

(۳) حائضہ کا اعتکاف کرنا منع ہے اور اگر دوران اعتکاف اس کو حیض آگیا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔

(٤) حالت حیض میں طواف صدر (وداع) ممنوع ہے۔

(٥) حالت حیض میں طلاق دینا حرام ہے۔

(٦) حیض آنے سے لڑکی بالغہ ہو جاتی ہے۔

(۷) عدت پوری ہونے کا تعلق بھی حیض سے ہے آزاد عورت کی عدت تین حیض ہے اور باندی کی عدت دو حیض ہے۔

(۸) استبراء کا تعلق بھی حیض سے ہے جب مال غنیمت سے کوئی باندی ملے یا کسی باندی کو خریدے تو ایک حیض تک اس سے وطی نہ کرے ایک حیض گزر جانے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اس کے رحم میں استقرار نطفہ ہے یا نہیں۔

(۹) حیض منقطع ہونے کے بعد غسل کرنا واجب ہے۔

(۱۰) رمضان کے روزہ کے کفارہ اور قتل کے کفارے میں مسلسل روزے رکھے جاتے ہیں اگر ان روزوں کے درمیان حائضہ کو حیض آگیا تو اس کا تسلسل نہیں ٹوٹے گا۔

(۱۱) حائضہ عورت پر روزہ رکھنا منع ہے لیکن وہ ان فوت شدہ روزوں کی قضا کرے گی اس نے نفل روزہ شروع کیا اور پھر حیض آگیا تو اس کی قضا کرے گی۔

(۱۲) حائضہ عورت کا مسجد میں داخل ہونا منع ہے۔

(۱۳) حائضہ کے لیے کعبہ کا طواف کرنا منع ہے۔

(١٤) حائضہ کی ناف سے گھٹنے تک اس کے شوہر کا قریب ہونا منع ہے۔

(۱۵) تلاوت قرآن کے قصد سے قرآن پڑھنا منع ہے البتہ دعا کے قصد سے سورۃ فاتحہ یا کسی اور آیت کو پڑھنا یا تبرک کے قصد سے بسم اللہ پڑھنا جائز ہے۔

(١٦) قرآن مجید کو چھونا منع ہے خواہ وہ متصل یا منفصل غلاف میں ہو۔

(۱۷) اللہ کا ذکر کرنا، تسبیح کرنا، قبروں کی زیارت کرنا جائز ہے اسی طرح عیدگاہ میں جانا جائز ہے۔

(۱۸) ہاتھ دھونے اور کلی کرنے کے بعد کھانا پینا جائز ہے اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر جنبی کے لیے کھانا مکروہ ہے، حائضہ کے لیے مکروہ نہیں ہے۔

(۱۹) جب اکثر مدت پوری ہونے کے بعد حیض منقطع ہو (یعنی دس دن کے بعد) تو شوہر کا اس کے ساتھ بغیر اس کے غسل کے وطی کرنا جائز ہے اور غسل کے بعد وطی کرنا مستحب ہے۔

(۲۰) اگر کم مدت گزرنے کے بعد اس کا حیض منقطع ہوا تو حائضہ وضو کرے اور آخری وقت میں نماز پڑھ لے۔

(۲۱) اگر حائض کے ایام مقرر ہیں اور اس سے کم وقت میں حیض منقطع ہوگیا تو اس کے شوہر کے لیے اس سے مباشرت جائز نہیں ہے البتہ وہ احتیاط نماز پڑھے اور روزہ رکھے۔

(۲۲) اگر حیض کم مدت میں منقطع ہو گیا تو شوہر کا اس سے اس وقت تک وطی کرنا جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ غسل نہ کرے۔

(۲۳) اگر حیض منقطع ہونے کے بعد حائضہ نے نماز کا اتنا وقت پالیا جس میں تکبیر تحریمہ پڑھی جا سکتی ہے تو اس پر وہ نماز فرض ہو گئی اور اس کی قضا کرے گی۔

(۲٤) جو شخص حائضہ عورت سے حلال سمجھ کر مباشرت کرے گا وہ کافر ہو جائے گا۔

(۲۵) مدت حیض سے کم یا مدت حیض کے بعد آنے والا خون استحاضہ ہے' اس کا حکم اس طرح ہے جس طرح کسی معذور شخص کی ناک سے ہمیشہ خون جاری ہو تو اس سے نماز روزہ ساقط نہیں ہوتا' اسی طرح متحاضہ سے بھی نماز روزہ ساقط نہیں ہوتا۔ اس کی طہارت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نماز کے ایک وقت میں وضو کرے' یہ وضو اس پورے وقت میں شرعاً قائم رہے گا' بشرطیکہ کسی اور وجہ سے وضو نہ ٹوٹے وہ اس وضو سے پورے وقت میں تمام عبادتیں کر سکتی ہے اور وقت ختم ہونے کے بعد اسے دوسرے وقت کے لیے وضو کرنا ہوگا۔

(۲٦) ولادت کے بعد رحم سے جو خون نکلتا ہے اس کو نفاس کہتے ہیں۔ اس کے کم ہونے کی کوئی حد نہیں ہے اور اکثر نفاس کی حد چالیس دن ہے اور چالیس دن کے بعد جو خون آتا رہے وہ استحاضہ ہے' استحاضہ کے دوران وہ نمازیں پڑھے گی اور روزے رکھے گی اور معذور شخص کی طرح وضو کرے گی۔

(۲۷) نفاس کا خون نکلنے سے عدت پوری ہو جاتی ہے خواہ وہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات ہو۔

(۲۸) حیض اور نفاس میں مبتلا دونوں عورتیں ان ایام میں نماز نہیں پڑھیں گی اور ان پر ان ایام کی قضا نہیں ہے' البتہ ان ایام میں اگر رمضان کے روزے آ گئے تو روزے نہیں رکھیں گی بعد میں فوت شدہ روزوں کی قضا کریں گی۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۲۰۰۔ ۱۸۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت ۱٤۰۷ھ)

ایلاء کے بیان میں

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲٦﴾

''جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں کھائیں، ان کی چار مہینے کی مدت (۱) ہے
پھر اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا مہربان ہے''۔

(سورۃ البقرۃ: آیت 226)

ایلا کا معنی اور ایلاء کے بعد وقوع طلاق میں فقہاء احناف کا موقف:

ایلاء کا لغوی معنی ہے: قسم کھانا' اور اصطلاح شرع میں اس کا معنی ہے: مدت مخصوصہ تک اپنی منکوحہ سے جماع نہ کرنے کی قسم کھانا' اور زیادہ صحیح تعریف یہ ہے کہ اپنی منکوحہ سے چار مہینے تک جماع نہ کرنے کی قسم کھانا۔

علامہ مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

جب کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہے کہ اللہ کی قسم! میں تم سے مقاربت نہیں کروں گا' یا کہے: اللہ کی قسم! میں تم سے چار مہینے مقاربت نہیں کروں گا تو وہ ایلاء کرنے والا ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے: جولوگ اپنی عورتوں سے مباشرت نہ کرنے کی قسم کھالیتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے' اگر انھوں نے (اس مدت میں) رجوع کرلیا تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بڑا ہر دبار ہے' اور اگر انھوں نے طلاق ہی کا ارادہ کرلیا ہے تو بیشک اللہ خوب سننے والا بہت جاننے والا ہے۔

(البقرہ: ۲۲۷۔۲۲۶)

اگر اس نے چار مہینے کے اندر اپنی بیوی سے مباشرت کرلی تو اس کی قسم ٹوٹ جائے گی اور اس پر کفارہ لازم ہوگا اور ایلاء ساقط ہوجائے گا' اور اگر اس نے چار مہینے اپنی بیوی سے مقاربت نہیں کی تو اس کی بیوی پر از خود طلاق بائنہ واقع ہوجائے گی۔

امام شافعی نے کہا: کہ قاضی کے تفریق کرنے سے طلاق بائنہ واقع ہوگی جیسا کہ مقطوع الالہ اور نامرد کے مسئلہ میں قاضی کی تفریق سے طلاق بائنہ واقع ہوتی ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اس نے عورت کے حق کو اس سے سلب کرکے اس پر ظلم کیا ہے اس لیے شریعت نے اس کو یہ سزا دی ہے کہ اس مدت کے پوری ہونے پر نکاح کی نعمت اس سے زائل ہوجائے گی۔ حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت عبداللہ بن عباس' اور حضرت زید بن ثابت (رض) سے اسی طرح منقول ہے اور ان کی اقتداء کرنی ہمارے لیے کافی ہے اور اس لیے کہ زمانہ جاہلیت میں قسم کھاتے ہی فوراً طلاق واقع ہوجاتی تھی اور شریعت اسلامیہ نے وقوع طلاق کے لیے مدت پوری ہونے کی حد مقرر کردی۔

اگر اس نے چاہ ماہ تک مقاربت نہ کرنے کی قسم کھائی تھی تو چار ماہ کے بعد قسم ساقط ہوجائے گی اور اگر اس نے یہ قسم کھائی تھی کہ میں کبھی بھی اس سے مقاربت نہیں کروں گا تو چار ماہ بعد اس کی بیوی کو طلاق بائنہ ہوجائے گی اور قسم باقی رہے گی' پھر اگر اس نے اس سے دوبارہ نکاح کرلیا اور اس کے بعد مقاربت کرلی تو فبہا اور اسے اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دینا ہوگا' اور اگر اس نے پھر چار ماہ تک مقاربت نہیں کی تو اس کی بیوی پر دوبارہ طلاق بائنہ پڑ جائے گی اور اگر اس نے اس سے پھر تیسری بار نکاح کرلیا تو پھر اسی طرح ہوگا یعنی اگر اس نے مقاربت کرلی تو فبہا ورنہ چار ماہ بعد پھر اس کی بیوی پر طلاق بائنہ پڑ جائے گی اور اس کے بعد حلالہ شرعیہ کے بغیر وہ اس سے چوتھی بار نکاح نہیں کرسکتا اور چوتھی بار نکاح کرنے کے بعد پھر اسی طرح ہوگا۔

اگر اس نے چار ماہ سے کم کی قسم کھائی ہے تو یہ ایلاء نہیں ہے' کیونکہ حضرت ابن عباس نے فرمایا: چار ماہ سے کم میں ایلاء نہیں ہے' کیونکہ جس شخص نے ایک ماہ مقاربت نہ کرنے کی قسم کھائی اور پھر چار ماہ تک مقاربت نہیں کی تو بقیہ تین ماہ کے عرصہ میں اس نے بغیر قسم کے مقاربت نہیں کی اور جو بغیر قسم کے تین ماہ بلکہ اس سے زائد عرصہ تک بھی مقاربت نہ کرے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

(ہدایہ اولین ص ۴۰۲۔۴۰۱' مطبوعہ شرکتہ علمیہ ملتان)

علامہ المرغینانی نے امام شافعی کا جو یہ مذہب نقل کیا ہے کہ چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد قاضی کی تفریق سے طلاق بائن ہوگی' یہ نقل صحیح نہیں ہے' بلکہ امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ مدت گزرنے کے بعد شوہر کو اختیار ہے چاہے تو رجوع کرلے اور چاہے تو طلاق دے دے۔

ایلاء کے بعد وقوع طلاق میں ائمہ ثلاثہ کا مذہب اور دلائل اور فقہاء احناف کی طرف سے جوابات

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں:

چار ماہ گزرنے کے بعد وقوع طلاق کے متعلق دو قول ہیں حضرت عثمان (رض)، حضرت علی (رض)، حضرت ابن زید (رض)، حضرت زید بن ثابت (رض)، حضرت ابن مسعود (رض)، حضرت ابن عمر (رض)، اور حضرت ابن عباس (رض)، کا قول ہے کہ اس مدت کے گزرنے کے بعد طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے اور حضرت عمر (رض) اور حضرت علی (رض) کا دوسرا قول اور ایک روایت میں حضرت عثمان (رض) کا دوسرا قول یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد شوہر کو اختیار ہے خواہ رجوع کرے خواہ طلاق دے دے امام شافعی اور اہل مدینہ کا یہی مذہب ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۲۹۰، ۲۸۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

علامہ ابن جوزی حنبلی نے بھی موخر الذکر قول نقل کیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

ابو صالح نے بیان کیا کہ بارہ صحابہ سے یہی (مؤخر الذکر) قول منقول ہے اور امام مالک امام احمد اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد از خود طلاق واقع ہو جائے گی اور یہ طلاق بائن ہوگی حضرت عثمان (رض)، حضرت علی (رض)، حضرت ابن عمر (رض)، حضرت زید بن ثابت (رض) اور حضرت قبیصہ بن ذویب (رض) سے یہی منقول ہے:

(زاد المسیر ج ۱ ص ۲۵۷ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۷ھ)

قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: (آیت) "وان عزموا الطلاق"۔ (البقرہ: ۲۲۷) پس اگر وہ طلاق کا ارادہ کریں اس میں یہ دلیل ہے کہ مدت گزرنے سے از خود طلاق واقع نہیں ہوتی بلکہ طلاق اس وقت واقع ہوگی جب شوہر طلاق دینے کا قصد کرے گا امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ چار ماہ تک اس کا رجوع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا عزم طلاق ہے ہمارے علماء نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ چار ماہ تک رجوع نہ کرنا اس کا ماضی ہے اور ماضی پر عزم کرنا محال ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ چار ماہ گزرنے کے بعد اگر وہ طلاق کا عزم کریں اس سے معلوم ہوا کہ چار ماہ گزرنے کے بعد اس کے طلاق دینے سے طلاق واقع ہوگی۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲۴۷، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۸ھ)

قاضی ابو بکر ابن العربی کا یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے اگر وہ طلاق کا عزم کریں یہ نہیں فرمایا کہ وہ زبان سے طلاق دیں جب کہ ائمہ ثلاثہ کا یہ مذہب ہے کہ شوہر جب زبان سے طلاق دے گا تو طلاق واقع ہوگی اور قرآن مجید میں زبان سے طلاق دینے کا ذکر نہیں ہے بلکہ طلاق کے عزم کا ذکر ہے اور اس کا چار ماہ تک رجوع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس عزم کا ذکر ہے اور اس کا چار ماہ تک رجوع نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا عزم طلاق دینا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پس اگر وہ طلاق کا عزم کریں اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس مدت کے بعد وہ عزم کریں بلکہ اس کا معنی ہے: اگر وہ طلاق کے عزم پر مستمر اور برقرار رہیں تو اللہ تعالیٰ خوب سننے والا ہے بہت جاننے والا ہے یعنی ان کے دل کی بات کو سننے والا ہے اور ان کی نیت کو جاننے والا ہے سننے کا تعلق صرف کلام لفظی سے نہیں ہوتا بلکہ کلام نفسی سے بھی ہوتا ہے۔

مُدّتِ رضاعت کے بیان میں

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَي الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٣٣﴾

”مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو(۱) اور جن کے بچے ہیں ان کے ذمہ ان کا روٹی کپڑا ہے جو مطابق دستور کے ہو(۲) ہر شخص اتنی ہی تکلیف دیا جاتا ہے جتنی اس کی طاقت ہو ماں کو اس بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے (۳) وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے، پھر اگر دونوں (یعنی ماں باپ) اپنی رضامندی سے باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں جب کہ تم ان کو مطابق دستور کے جو دینا ہو وہ ان کے حوالے کر دو (٤) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جانتے رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی دیکھ بھال کر رہا ہے“۔

(سورۃ البقرۃ: آیت 233)

دودھ پلانے کے شرعی احکام:

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کے احکام بیان کیے جس سے فرقت واقع ہوئی ہے اور اب ان چیزوں کے احکام بیان کیے جو نکاح کے نتیجہ میں واقع ہوتی ہیں، کیونکہ بعض مطلقہ عورتوں کے دودھ پیتے بچے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ماں باپ کے جھگڑوں کی وجہ سے دودھ پیتے بچے ضائع ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات باپ سے انتقام لینے کیلیے ان کو مائیں دودھ نہیں پلاتیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ماؤں کو یہ نصیحت کی یہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلائیں اور یہ کہ باہمی رضامندی سے وہ بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں اور بچوں کے باپ پر یہ لازم کیا کہ وہ اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق دودھ پلانے والیوں کو کھانے اور کپڑوں کا خرچ مہیا کریں اور یہ کہ بچوں کی وجہ سے ماں باپ میں سے کوئی فریق دوسرے پر زیادتی نہ کرے مثلاً ماں بچوں کو پالنے اور پرورش

کرنے کی وجہ سے باپ کو ضرر پہنچائے اور کھانے اور کپڑوں کا دستور سے زیادہ خرچ طلب کرے' یا ماں بچوں کو دودھ پلانا چاہتی ہے اور باپ زبردستی بچوں کو ماں سے چھین لے یا اس کو دودھ پلانے پر مجبور کرے یا اس کے خرچ میں قدرِ معروف سے کمی کرے۔ اس تفسیر کی بناء پر اس آیت میں وہ مطلقہ عورتیں مراد ہیں جن کی ان کے خاوندوں سے اولاد ہو' اور اجنبی دائیوں کی بہ نسبت دودھ پلانے کی وہ زیادہ حق دار ہیں اور بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اس آیت میں مطلقاً دودھ پلانے والی مائیں مراد ہیں خواہ وہ مطلقہ عورتیں ہوں یا منکوحہ عورتیں ہوں۔

امام مالک کے نزدیک ماں پر دودھ پلانا واجب ہے خواہ وہ منکوحہ ہو یا مطلقہ اور جمہور کے نزدیک ماں پر اس وقت دودھ پلانا واجب ہے جب بچہ کسی اور عورت کا دودھ نہ پیئے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کی مکمل مدت دو سال پلانا ہے' کیونکہ اس مدت میں بچہ کو اپنی نشوونما کے لیے دودھ کی حاجت ہوتی ہے' نیز اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کم از کم دودھ پلانے کی کوئی حد نہیں ہے اور ماں باپ باہمی مشورہ سے جتنے عرصہ تک چاہیں دودھ پلائیں اور اس کے بعد دودھ چھڑا دیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کا خرچ باپ کے ذمہ ہے اور دایہ کی اجرت بھی باپ کے ذمہ ہے اور امام شافعی کے نزدیک بچہ کی ماں کا بھی دودھ پلانے کی اجرت طلب کرنا جائز ہے خواہ وہ نکاح میں ہو یا عدت میں' اور بچہ کا خرچ بھی باپ کے ذمہ ہے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو باپ کے وارث کے ذمہ بھی یہی احکام ہیں' اس پر لازم ہے کہ وہ دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کا خرچ دے اور دودھ پلانے کی اجرت دے اور دودھ پلانے والی کو ترک نہ کرے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک یہ آیت محارم کے نفقہ کے وجوب کی اصل ہے' ان کے نزدیک ہر ذو رحم محرم پر خرچ واجب ہے مثلاً ماموں اور پھوپھی پر اور امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک بچوں کا خرچ صرف والدین پر واجب ہے بچہ کا خرچ باپ پر واجب ہے باپ فوت ہو گیا ہو تو اس کے ترکہ سے خرچ کرنا واجب ہے اور اگر اس کا مال نہ ہو تو پھر ماں پر واجب ہے' قرآن مجید کی اس آیت سے امام ابوحنیفہ اور امام احمد کی رائے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ قرآن مجید نے باپ کے بعد وارث پر بچہ کے خرچ کو واجب کیا ہے۔

دودھ پلانے کی مدت میں ائمہ مذاہب کی آراء:

علامہ ماوردی شافعی لکھتے ہیں: دو سال کی مدت کی تفسیر میں دو قول ہیں' ایک قول یہ ہے کہ جس عورت کے ہاں چھ ماہ کے بعد بچہ پیدا ہو جائے وہ دو سال دودھ پلائے تاکہ تیس مہینے پورے ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "وحمله وفصله ثلثون شهرا "۔(الاحقاف:۱۵)

ترجمہ: اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔

یہ حضرت ابن عباس (رض) کا قول ہے اور عطاء اور ثوری کا قول یہ ہے کہ ہر بچہ کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔

(النکت والعیون ج۱ ص۳۰۰' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے کی کم از کم مدت کی کوئی حد نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ حد دو سال ہے۔

(احکام القرآن ج۱ ص' ۲۷۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۰۸ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے، حضرت عمر (رض)، حضرت علی (رض)، حضرت ابن مسعود (رض)، حضرت ابن عباس (رض)، حضرت ابوہریرہ (رض)، حضرت عائشہ (رض) کے علاوہ باقی ازواج مطہرات، امام مالک، امام شافعی، امام ابویوسف، امام محمد، شعبی اوزاعی اور ابوثور کا یہی مسلک ہے۔

(المغنی ج ۸ ص ۱۴۲، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

علامہ المرغینانی الحنفی لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ (رح) کے نزدیک دودھ پلانے کی مدت تیس مہینے ہے اور امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک دو سال ہے، امام شافعی کا بھی یہی قول ہے اور امام زفر کے نزدیک یہ مدت تین سال ہے، کیونکہ دو سال کے بعد بچے کو دفعتہ دودھ سے غذا کی طرف لانا مشکل ہے۔ اس لیے بعد کے ایک سال میں دودھ کے ساتھ اس کو غذا کا عادی بنایا جائے اور تین سال کے بعد مکمل دودھ چھڑا دیا جائے۔ امام ابویوسف اور امام محمد کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔ (الاحقاف: ۱۵) اور کم از کم حمل کی مدت چھ ماہ ہے تو دودھ چھڑانے کے لیے دو سال باقی بچے، امام دارقطنی حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: طفولیت کی دو سال کی عمر کے بعد دودھ پلانے کا عمل نہیں ہے۔

(سنن دارقطنی ج ۴ ص ۱۷۴)

اس حدیث کو امام عبدالرزاق اور امام مالک نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل یہی آیت ہے اور اس کی توجیہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں ذکر کیں (حمل اور دودھ چھڑانا) اور دونوں کی ایک مدت ذکر فرمائی یعنی تیس مہینے کہ ان میں سے ہر ایک کی مدت مکمل تیس ماہ ہوگی لیکن ان میں ایک یعنی حمل کی مدت ایک حدیث سے دو سال متعین ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا: کہ بچہ ماں کے پیٹ میں دو سال سے زیادہ نہیں باقی رہتا۔

(سنن دارقطنی ج ۳ ص ۳۲۲، مطبوعہ ملتان سنن بیہقی ج ۷ ص ۴۴۳، مطبوعہ ملتان)

ان میں سے ایک کی مدت اس حدیث کی بناء پر دو سال رہ گئی تو دوسرے یعنی دودھ چھڑانے کی مدت اپنی اصل پر تیس ماہ رہے گی، نیز دو سال تک بچہ کو دودھ پلانے کے بعد فوراً غذا کی طرف راجع کرنا مشکل ہوگا اس لیے اس کو بقیہ چھ مہینے میں بہ تدریج غذا کا عادی بنایا جائے گا اور اڑھائی سال کے بعد کلی طور پر دودھ چھڑا دیا جائے گا اور سورۃ بقرہ میں جو ارشاد ہے: اور مائیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں۔ (البقرہ: ۲۳۳) اور حدیث میں ہے: دو سال کے بعد دودھ پلانا نہیں ہے، اس میں مائیں اپنے بچوں کو مکمل دو سال دودھ پلائیں (البقرہ: ۲۳۳) اور حدیث میں ہے: دو سال کے بعد دودھ پلانا نہیں ہے، اس آیت اور اس حدیث کا محمل یہ ہے کہ دو سال سے زیادہ بچے کو دودھ پلانے کا استحقاق نہیں ہے۔

(ہدایہ اولین ص ۳۵۱ - ۳۵۰، مطبوعہ مکتبہ شرکۃ علمیہ ملتان)

غیر مدخولہ اور اس کے حق مہر کی وضاحت

لَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡهُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَهُنَّ فَرِيۡضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوۡهُنَّ ۚ عَلَى الۡمُوۡسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهٗ ۚ

مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾

"اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کئے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں،
ہاں انہیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوش حال اپنے انداز سے اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق
دستور کے مطابق اچھا فائدہ دے بھلائی کرنے والوں پر یہ لازم ہے"۔

(سورۃ البقرۃ: آیت 236)

غیر مدخولہ کے مہر اور متاع کی ادائیگی کا بیان

عدت طلاق ہو یا عدت وفات اس کے نتیجے میں عورت کے مہر کی ادائیگی مرد پر واجب ہو جاتی ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں مہر کے بعض احکام بیان فرمائے' جس عورت کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جس کا نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر نہیں کیا گیا اور دوسری وہ ہے جس کا نکاح کے وقت مہر مقرر کیا گیا ہو' اول الذکر کو شوہر اپنی حیثیت کے مطابق کچھ استعمال کی چیزیں دے دے اور ثانی الذکر کو نصف مہر ادا کرنا لازم ہے الا یہ کہ عورت نصف مہر سے کچھ رقم معاف کر دے' یا شوہر نصف مہر سے زائد ادا کرے اور شوہر کا نصف مہر سے زائد ادا کرنا مکارم اخلاق کے زیادہ قریب ہے۔ غیر مدخولہ کو استعمال کی کچھ چیزیں یا نصف مہر ادا کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ مباشرت سے پہلے فوراً اس کو طلاق دینے سے اس کے مستقبل پر برا اثر پڑے گا اور اس قدر جلد طلاق ہونے سے چہ میگوئیاں ہوں گی اور اس کے لیے جو نکاح کے مزید پیغام آنے ہیں ان میں کمی ہو گی تو اس کی اشک شوئی اور تلافی کے لیے اس کے واسطے نصف مہر کا لازم کیا گیا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر نکاح سے پہلے مہر کو مقرر نہ کیا جائے تو نکاح پھر بھی صحیح ہے' تاہم اس صورت میں مہر مثل ادا کرنا لازم ہوتا ہے یعنی اس جیسی لڑکی یا اس لڑکی کے خاندان میں جتنے مہر کو مقرر کرنے کا رواج ہو اتنا مہر ادا کیا جائے۔

مطلقہ کی متاع کی مقدار میں ائمہ مذاہب کی آراء:

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ مطلقہ کی متاع میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک خادم دیا جائے' اس سے کم درجہ یہ ہے کہ چاندی دی جائے اور اس سے کم یہ ہے کہ کپڑے دیئے جائیں۔

شعبی نے کہا: متوسط مطلقہ کی متاع دوپٹہ' قمیص' چادر اور ملحفہ ہے۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۲۲۸' مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت' ۱۴۰۹ھ)

علامہ ماوردی شافعی نے لکھا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک مطلقہ کی متاع حاکم کے اجتہاد پر موقوف ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۳۰۵' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں: امام احمد کے اس میں دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ حاکم کے اجتہاد پر موقوف ہے' اور دوسرا قول یہ ہے کہ جتنے کپڑوں کے ساتھ عورت نماز ادا کر سکے وہ مطلقہ کی متاع ہے۔

(زاد المیسر ج ۱ ص ۲۸۰' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں: امام مالک نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک مطلقہ کی متاع کی کوئی معین مقدار نہیں ہے قلیل متاع کی کوئی حد ہے نہ کثیر کی اور ائمہ کا اس کی حد میں اختلاف ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۳ ص ۳۰۱ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں: جس عورت سے بلا مہر نکاح کیا گیا ہو اور مباشرت سے پہلے اس کو طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا واجب ہے اور یہ قمیص، دوپٹہ اور ملحفہ ہے (سر سے قدم تک اوڑھے جانے والی چادر' علامہ شامی نے لکھا ہے اس کے ساتھ ازار بھی ضروری ہے) یہ متاع نصف مہر مثل سے زائد نہیں ہونی چاہیے' خواہ زوج' خوشحال ہو' اور نہ پانچ درہم سے کم ہو' تنگ دستی اور خوشحالی میں عورت کے حال کا اعتبار کیا جائے گا' اس کے سوا باقی مطلقہ عورتوں کے لیے متاع مستحب ہے' البتہ جس عورت کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی اس کے لیے متاع کو دینا مستحب نہیں ہے۔ مطلقات کی چار قسمیں ہیں: مطلقہ کا مہر پہلے مقرر کیا گیا تھا یا نہیں اور ہر تقدیر پر مباشرت سے پہلے طلاق دی گئی یا مباشرت کے بعد' سو جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی اس کو متاع دینا واجب ہے اور باقی قسموں کی مطلقات کو متاع دینا مستحب ہے' علامہ حصکفی نے لکھا ہے کہ جس مطلقہ کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور اس کو وطی سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا مستحب نہیں ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ مبسوط' محیط' کنز اور ملتقی وغیرھا میں لکھا ہے کہ اس کو بھی متاع دینا مستحب ہے اور یہی صحیح ہے۔

(درمختار علی ھامش الرد ج ۲ ص ۲۳۶۔۲۳۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت ۱۴۰۷ھ)

مطلقہ کی متاع کے شرعی حکم کے متعلق ائمہ مذاہب کی آراء:

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں: مطلقہ کی متاع کے شرعی حکم میں صحابہ کرام' فقہاء تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے۔ حضرت علی' حسن بصری' ابو العالیہ اور زہری کا مذہب یہ ہے کہ ہر مطلقہ کے لیے متاع واجب ہے' حضرت ابن عمر' قاسم بن محمد' شریح اور ابراہیم کا یہ نظریہ ہے کہ جس مطلقہ کا مہر مقرر کیا گیا ہو اور مباشرت سے پہلے اس کو طلاق دے دی گئی ہو اس کے سوا ہر مطلقہ کے لیے متاع واجب ہے' اور اس مطلقہ کے لیے نصف مہر واجب ہے' امام اوزاعی' ثوری' امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کے لیے متاع واجب ہے' اور اگر اس کے ساتھ مباشرت کی گئی ہو تو پھر اس کو متاع نہیں دی جائے گی۔ امام مالک لیث بن سعد' حکم اور ابن ابی لیلی کے نزدیک متاع مستحب ہے اور کسی عورت کے لیے واجب نہیں ہے خواہ اس عورت کا مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہیں اور اس کے ساتھ مباشرت کی گئی ہو یا نہیں۔

(زاد المیسر ج ۱ ص ۲۸۰' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۴۰۷ھ)

علامہ ماوردی شافعی نے لکھا ہے کہ امام شافعی کے نزدیک جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو دخول سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا واجب ہے۔

(النکت والعیون ج ۱ ص ۳۰۶' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

قاضی ابو بکر ابن العربی مالکی لکھتے ہیں:

ہمارے علماء کے نزدیک مطلقہ کی متاع واجب نہیں ہے' اولا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے متاع کی مقدار بیان نہیں فرمائی بلکہ

اس کو دینے والے کے اجتہاد پر معلق فرمایا: ثانیا اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (آیت) "حقا علی المحسنین"۔ (البقرہ:۲۳۶)
یہ محسنین پر واجب ہے" اگر مطلقہ کی متاع واجب ہوتی تو مطلقا تمام مسلمانوں پر واجب ہوتی۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۲۸۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۸ھ)

متاع کے وجوب پر فقہاء احناف کے دلائل:

علامہ ابوبکر رازی جصاص حنفی لکھتے ہیں: امام ابوحنیفہ امام ابو یوسف امام محمد اور امام زفر کے نزدیک جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اس کو دخول سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو اس کو متاع دینا واجب ہے وجوب کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (آیت) "فمتعوھن" ان کو متاع دو"۔ یہ امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے الا یہ کہ اس کے خلاف استحباب پر کوئی دلیل قائم ہو اور وہ یہاں نہیں ہے نیز فرمایا: (آیت) "وللمطلقت متاع بالمعروف"۔ (البقرہ:۲۴۱) دستور کے مطابق متاع مطلقات کی ملکیت ہے" کیونکہ لام تملیک کے لیے ہے اور جو چیز کسی کی ملکیت اور اس کا حق ہو اس کا ادا کرنا واجب ہوتا ہے اور تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (آیت) "حقا علی المحسنین" اور "حق علی المتقین" یہ وجوب کی تاکید ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۴۲۸، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

متاع کے وجوب کے خلاف فقہاء مالکیہ کے دلائل کے جوابات:

علامہ ابن عربی مالکی نے جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر متاع واجب ہوتی تو ہر مسلمان پر واجب ہوتی صرف متقین اور محسنین پر واجب نہ ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وجوب کی تاکید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ متاع محسنین اور متقین پر حق ہے اور حق سے زیادہ اور کوئی وجوب کے لیے موکد نہیں ہے جس طرح (آیت) "ھدی للمتقین"۔ سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید تمام مسلمانوں کے لیے ہدایت نہ ہو اسی طرح (آیت) "حقا علی المتقین" سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقہ کی متاع ہر مسلمان پر واجب نہ ہو نیز اس کا معنی ہے جو تقوی اور احسان کی طرف رجوع کرنے والا ہو اور ہر مسلمان تقوی اور احسان کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ باقی یہ جو کہا ہے کہ اگر متاع واجب ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کی مقدار معین نہیں کی جاسکتی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: خوشحال پر (یہ متاع) اس کے (حال کے) موافق ہے اور تنگ دست پر اس کے لائق ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے: البتہ عورتیں کچھ چھوڑ دیں یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ کچھ زیادہ دے دے۔

(تو درست ہے) (البقرہ:۲۳۷)

نکاح کی گرہ کا مالک شوہر ہے یا عورت کا ولی:؟

اس میں اختلاف ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اس سے مراد شوہر ہے یا عورت کا ولی اگر اس سے مراد شوہر ہو تو اس آیت کا وہ معنی ہوگا جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور اگر اس سے مراد عورت کا ولی ہو تو معنی یہ ہوگا: البتہ عورتیں (نصف مہر سے) کچھ معاف کر دیں یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے یعنی ولی وہ کچھ معاف کر دے۔ امام ابوحنیفہ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اس سے مراد شوہر ہے اور امام مالک کے نزدیک اس سے مراد عورت کا ولی ہے۔

علامہ قرطبی مالکی لکھتے ہیں: جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اس سے ولی کے مراد ہونے پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: البتہ عورتیں (نصف مہر سے) کچھ معاف کر دیں اور یہ بات معلوم ہے کہ ہر عورت اپنے مہر کو معاف نہیں کر سکتی، کیونکہ صغیرہ اور مجنونہ اپنے حقوق میں خود تصرف نہیں کر سکتی اس کے حق میں اس کا ولی تصرف کرتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے ذکر کے بعد اس کے ولی کا ذکر فرمایا، یعنی جس کو وہ معاف کر سکتی ہیں وہ معاف کر دیں اور جس کو وہ معاف نہیں کر سکتیں اس کو ان کا ولی معاف کر دے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۳ ص ۲۰۷ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

علامہ قرطبی کی یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ ولی یعنی لڑکی کے باپ کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ لڑکی کے مال سے کسی کو کوئی چیز ہبہ کرے، خود کو نہ کسی اور کو نیز جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ صرف شوہر ہے، اسی کو اختیار ہے کہ وہ نکاح پر برقرار رہ کر نکاح کی گرہ کو قائم رکھے یا طلاق دے کر نکاح کی گرہ کو کھول دے اور لڑکی کے ولی کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ مطلق نہیں ہے حقیقۃً نہ مجازاً، علامہ ابوبکر جصاص حنفی نے اسی طرح لکھا ہے۔

(احکام القرآن ج ۱ ص ۴۴۰ مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

شوہر کے حق میں عقد نکاح کی ملکیت پر جمہور کے دلائل:

علامہ ابن جوزی حنبلی لکھتے ہیں: جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے اس کے مصداق کے متعلق تین قول ہیں:

(۱) حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جبیر بن مطعم، ابن المسیب، ابن جبیر، مجاہد، شریح، جابر بن زید، ضحاک، محمد بن کعب القرظی، الربیع بن انس، ابن شبرمہ، امام شافعی، امام احمد، امام ابوحنیفہ اور دیگر فقہاء (رض) کا مسلک یہ ہے کہ اس سے مراد شوہر ہے۔

(۲) حضرت ابن عباس (رض)، حسن، علقمہ، طاؤس، شعبی، ابراہیم اور دیگر حضرات کا یہ نظریہ ہے کہ اس سے مراد ولی ہے۔

(۳) عورتوں کا معاف کرنا شادی شدہ عورتوں پر محمول ہے اور اگر لڑکی کنواری ہو تو پھر اس کا ولی معاف کرے گا، یہ بھی حضرت ابن عباس اور ابوالشعثاء سے منقول ہے۔

ان تینوں اقوال میں پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ نکاح کے بعد نکاح کی گرہ ولی کے ہاتھ سے نکل کر خاوند کے ہاتھ میں آگئی اور معاف کرنے کا تعلق اس چیز کے ساتھ ہے جو انکی ملکیت میں ہو، اور مہر ولی کی ملکیت میں نہیں ہے تو وہ اس کو معاف کرنے کا بھی مالک نہیں ہے، نیز اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور تم ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کرنے میں (ہبہ کرنے) کو فراموش نہ کرو، اور انسان اپنے مال سے کسی کو کوئی چیز ہبہ کر سکتا ہے دوسرے کے مال سے کوئی چیز ہبہ نہیں کر سکتا، لہٰذا سیاق وسباق کے اعتبار سے یہاں شوہر کو مراد لینا ہی صحیح ہے۔

(زاد المیسر ج ۱ ص ۲۸۱، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

شوہر کے حق میں عقد نکاح کی ملکیت کے متعلق احادیث:

حافظ جلال الدین سیوطی نے اس آیت میں شوہر کے مراد ہونے پر متعدد روایات بیان کی ہیں، بعض از اں یہ ہیں:

امام ابن جریر، امام ابن ابی حاتم، امام طبرانی، اور امام بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عمر (رض) سے روایت کیا ہے کہ

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام ابن ابی شیبہ' امام عبد بن حمید' امام ابن جریر' امام ابن ابی حاتم' امام دارقطنی اور امام بیہقی نے حضرت علی بن ابی طالب (رض) سے روایت کیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام ابن ابی شیبہ' امام ابن المنذر' امام ابن جریر اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر' مجاہد ضحاک' شریح ابن المسیب' شعبی' نافع اور محمد بن کعب سے روایت کیا ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے وہ شوہر ہے۔

امام عبدالرزاق نے ابن المسیب سے روایت کیا ہے کہ زوج کا عفو یہ ہے کہ وہ پورا مہر دے اور بیوی کا عفو یہ ہے کہ وہ نصف مہر معاف کر دے۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۲۹۲' مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

عدّت کے بیان میں

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

{سورۃ بقرہ پارہ 2}

''تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں پھر جب مدت ختم کر لیں تو جو اچھائی کے ساتھ وہ اپنے لیے کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے خبر دار ہے''۔

عدت وفات کا بیان اور عدت کی تعریف:

وہ مدت جس میں عورت شوہر کے گھر میں بغیر نکاح کے ٹھہری رہے اور بغیر عذر شرعی کے گھر سے باہر نہ نکلے تا کہ اس کے رحم کا استبراء ہو جائے یا شوہر کی موت پر سوگ ہو' مطلقہ کے لیے یہ مدت تین حیض ہے اور بیوہ کے لیے یہ عدت چار ماہ دس دن ہے اور جو عورت حاملہ ہو اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ شوہر کی موت کے ایک ساعت بعد وضع حمل ہو جائے' عدت وفات میں مدخول بہا اور غیر مدخول بہا کا کوئی فرق نہیں ہے۔ چار ماہ دس دن تک سوگ کرنا صرف شوہر کی موت کے ساتھ خاص ہے اور کسی عزیز یا رشتہ دار کی موت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

زینب بنت ابی سلمہ بیان کرتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ حضرت ام حبیبہ کے پاس گئی انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو عورت اللہ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کی مرگ پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، سوائے شوہر کے اس پر چار ماہ دس دن سوگ کرے۔ پھر جب حضرت زینب بنت جحش کے بھائی فوت ہو گئے تھے تو میں ان کے پاس گئی انھوں نے خوشبو منگا کر اپنے جسم پر لگائی اور کہا: مجھے خوشبو لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، البتہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ جو عورت اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائی ہو اس کے لیے کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ خاوند (کی موت) پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرے گی۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۷۱، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

عدت کے مسائل اور شرعی احکام:

علامہ علاء الدین حصکفی حنفی لکھتے ہیں

مسلمان منکوحہ بالغہ عورت جب طلاق ثلاثہ مغلظہ کی عدت گزارے یا عدت وفات گزارے تو انقطاع نکاح پر افسوس کے اظہار کے لیے زینت کو ترک کر دے، زیورات اور ریشمی کپڑے نہ پہنے باریک دانانوں کی کنگھی سے بال نہ سنوارے، خوشبو اور تیل نہ لگائے سرمہ اور مہندی نہ لگائے، زعفران اور سرخ یا زرد رنگ میں رنگے کپڑے نہ پہنے، ہاں عذر کی وجہ سے ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی اختیار کر سکتی ہے، کالے اور نیلے رنگ کے کپڑے پہن سکتی ہے، کافرہ، صغیرہ، مجنونہ، نکاح فاسد، وطی بالشبہ اور طلاق رجعی کی معتدہ پر سوگ نہیں ہے۔ دیگر رشتہ داروں کی موت پر صرف تین دن تک سوگ کرنا مباح ہے، خاوند کے لیے جائز ہے کہ عورت کو تین دن سے زیادہ سوگ کرنے پر منع کرے کیونکہ عورت کا مزین ہونا اس کا حق ہے، ہاں اگر خاوند کو اعتراض نہ ہو یا عورت شادی شدہ نہ ہو تو پھر تین دن سے زیادہ بھی سوگ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

نوٹ:

(علامہ شامی نے کہا ہے کہ علامہ حصکفی کا تین دن سے زیادہ سوگ کی اجازت دینا صحیح نہیں ہے اور یہ حدیث کے خلاف ہے جیسا کہ ابھی "صحیح بخاری" کے حوالے سے گزرا ہے۔)

ہر قسم کی عدت گزارنے والی کو نکاح کا پیغام دینا حرام ہے، البتہ اشارہ کنایہ سے اپنا مدعا ظاہر کرنا جائز ہے مثلاً کہے: مجھے امید ہے کہ ہم اکٹھے رہیں گے، یا آپ بہت خوبصورت ہیں یا نیک ہیں، بشرطیکہ وہ عورت عدت وفات گزار رہی ہو اور عدت طلاق میں ایسا کہنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے شوہر کے ساتھ عداوت پیدا ہو گی۔ جو عورت عدت گزار رہی ہو خواہ وہ طلاق رجعی کی عدت ہو یا طلاق بائن کی وہ گھر سے بالکل نہ نکلے، نہ رات کو نہ دن کو، اور اگر حویلی میں دوسرے لوگوں کے گھر ہوں تو اس کے صحن میں بھی نہ جائے خواہ شوہر کی اجازت ہو، کیونکہ یہ اللہ کا حق ہے، اور جو عورت عدت وفات گزار رہی ہو وہ دن اور رات میں گھر سے باہر جا سکتی ہے لیکن رات کا اکثر حصہ اپنے گھر میں گزارے۔

وجہ فرق یہ ہے کہ مطلقہ کے خرچ کا کفیل اس کا خاوند ہے اس لیے اس کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے اور جو عدت وفات گزار رہی ہے‘اس کے خرچ کا کوئی کفیل نہیں ہے اس لیے اس کو طلب معاش کے لیے دن اور رات کے وقت میں نکلنا ہوگا‘ہاں اگر اس کے خرچ کی کفالت کا انتظام ہو تو پھر اس کو بھی مطلقہ کی طرح گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے اور وہاں عدت گزارے خواہ عدت طلاق ہو یا عدت وفات‘اور اس گھر سے نہ نکلے‘ماسوا اس صورت کے کہ اس کو اس گھر سے نکال دیا جائے‘یا وہ گھر منہدم ہو جائے یا اس گھر کے انہدام کا خدشہ ہو یا وہاں اس کے مال کے تلف ہونے کا خطرہ ہو‘اس کے پاس اس گھر کا کرایہ نہ ہو اس قسم کی اگر کوئی ناگزیر صورت ہو مثلاً وہ اس گھر میں تنہا ہو اور اس کی جان کو خطرہ ہو ایسی صورت میں وہ اس گھر کے قریب کسی گھر میں منتقل ہو سکتی ہے اور عدت طلاق میں جہاں اس کا شوہر چاہے وہاں منتقل ہو جائے‘جب عورت عدت طلاق گزار رہی ہو تو اس کے اور شوہر کے درمیان ایک پردہ ضروری ہے اور اگر گھر تنگ ہو یا شوہر فاسق ہو تو پھر اس کا اس گھر سے نکل جانا بہتر ہے۔

{درمختار علی ھامش الردص ٦٢١ـ ٦١٦‘ملخصاً مطبوعہ دار احیاء التراث العربی‘بیروت ١٤٠٧ھ}

عدت کے دوران عورتوں کو جن کاموں سے منع کیا ہے مثلاً بغیر عذر شرعی کے گھر سے باہر نکلنا یا بناؤ سنگھار کرنا‘یا کسی سے عقد ثانی کا عہد و پیمان کرنا‘اگر عورتیں عدت کے دوران ان میں سے کوئی کام کریں تو اس عورت کے وارثوں اور سرپرستوں پر لازم ہے کہ عورت کو اس سے منع کریں اور اگر وہ منع نہیں کریں گے تو گناہ گار ہوں گے اور اگر اس عورت کے اولیاء نہ ہوں تو پھر یہ حکام اور عام مسلمانوں کا فریضہ ہے‘کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اور جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو وہ دستور کے موافق جو کام اپنے لیے کریں اس میں تم پر کوئی حرج (یا گناہ) نہیں ہے۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انھوں نے عدت سے پہلے یہ کام کیے اور تم نے ان کو نہ روکا تو تمہیں گناہ ہوگا۔

اس آیت میں عدت وفات چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے لیکن یہ عدت وفات غیر حاملہ کے ساتھ مخصوص ہے جو عورت حاملہ ہو اس کی عدت وضع حمل ہے خواہ شوہر کی وفات کے ایک منٹ بعد وضع حمل ہو جائے۔

قرآن مجید میں ہے:

(آیت) ”واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن“۔ (الطلاق: ٤)

ترجمہ: اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔

اس سے پہلے عدت وفات ایک سال تھی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے:

(آیت) ” والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا، وصیۃ لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج“۔ (البقرہ: ٢٤٠)

اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں وہ (مرنے سے پہلے) اپنی بیویوں کے لیے یہ وصیت کر جائیں کہ ان کا گھر سے نکالے بغیر ان کو ایک سال کا خرچ دیا جائے۔۔۔

آیاتِ محکمات اور متشابہات کے بیان میں

هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝

(تلک الرسل: سورۃ آل عمران: آیت 7)

''وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری جس میں واضح مضبوط آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ آیتیں ہیں۔(۱) پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں، فتنے کی طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لئے، حالانکہ ان کی حقیقی مراد کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا (۲) اور پختہ اور مضبوط علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو ان پر ایمان لا چکے ہیں، یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں''۔

آیات محکمات اور متشابہات کے ذکر کی مناسبت:

عیسائیوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق فرمایا ہے:

(آیت) "انما المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ و کلمته القھا الی مریم و روح منه"۔ (النساء: ۱۷۱)

ترجمہ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے' جس کو اللہ نے مریم کی طرف القا کیا اور اللہ کی طرف سے روح ہے۔

عیسائیوں نے یہ کہا کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ کا کلمہ اور اس کی روح کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ ابن اللہ ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے رد میں یہ آیات نازل فرمائیں کہ قرآن مجید میں محکم آیات بھی ہیں اور متشابہ آیات بھی ہیں اور یہ آیت متشابہات میں سے ہے اور متشابہات کی اصل مراد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

محکم کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

علامہ سید محمد مرتضی زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ نے لکھا ہے کہ حکم کے معنی ہیں منع کرنا' حکمت کو حکمت اس لیے کہتے ہیں کہ عقل اس کے خلاف کرنے کو منع کرتی ہے' اس لیے محکم کا معنی ہے جس میں اشتباہ اور خفاء ممنوع ہو اور محکم وہ آیات ہیں جن میں تاویل اور نسخ ممنوع ہو۔

(تاج العروس ج ۸ ص ۳۵۳ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

محکم وہ آیت ہے جس میں لفظ کی جہت سے کوئی شبہ پیدا ہو نہ معنی کی جہت سے۔

(المفردات ص ۱۲۸، مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران ۱۳۴۲ھ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ لکھتے ہیں:

جس لفظ کی مراد تبدیل، تغیر، تخصیص اور تاویل سے محفوظ ہو وہ محکم ہے اس کی مثال وہ آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر دلالت کرتی ہیں جیسے "اللہ تعالیٰ کرتا ہے جیسے "اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے" اس آیت کے منسوخ ہونے کا احتمال نہیں ہے۔

(کتاب التعریفات ص ۸۹، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا ہے محکمات وہ آیات ہیں جو ناسخ ہیں، اور ان میں حلال، حرام، حدود اور فرائض کا بیان ہے اور یہ کہ کس پر ایمان لایا جائے اور کس پر عمل کیا وہ آیات ہیں جو منسوخ ہیں وہ اور موخر ہیں ان پر ایمان لایا جائے اور ان پر عمل نہ کیا جائے۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا محکم وہ آیات ہیں جن کا صرف ایک معنی اور ایک محمل ہے اور اس میں کسی اور تاویل کی گنجائش نہیں ہے اور متشابہ وہ آیات ہیں جن میں کئی تاویلات کی گنجائش ہے۔

ابن زید نے کہا محکم وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے سابقہ امتوں اور ان کے رسولوں کے واقعات اور قصص بیان فرمائے اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی امت کے لیے ان کی تفصیل کی، اور متشابہ وہ آیات ہیں جن میں ان واقعات کو بار بار ذکر فرمایا ہے اور ان کے الفاظ اور معانی میں اختلاف ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) نے بیان فرمایا محکم وہ آیات ہیں جن کے معنی اور ان کے تاویل اور تفسیر علماء کو معلوم ہے اور متشابہ وہ آیات ہیں جن کا معنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اور مخلوق میں سے کسی کو بھی ان کا علم نہیں ہے، آیات متشابہات میں حروف مقطعہ ہیں جو اوائل سورۃ میں مذکور ہیں جیسے الم، المر، المص وغیرہ اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے نزول کا وقت، اور سورج کب مغرب سے طلوع ہوگا، اور قیامت کب واقع ہوگی۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۱۱۵۔ ۱۱۶، مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

متشابہہ کا لغوی اور اصطلاحی معنی:

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

جس لفظ کا معنی اس لفظ سے معلوم نہ ہو سکے وہ متشابہ ہے، اس کی دو قسمیں ہیں ایک قسم وہ ہے کہ اس کو محکم کی طرف لوٹانے سے اس کا معنی معلوم ہو جائے دوسری قسم وہ ہے جس کی حقیقت کی معرفت کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور جو شخص اس کے معنی کے درپے ہو وہ بدعتی اور فتنہ پرور ہے، بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اگر لفظ سے اس کی مراد ظاہر ہو تو اگر وہ منسوخ ہونے کا احتمال نہ رکھے تو وہ محکم ہے اور اگر وہ منسوخ ہونے کا احتمال رکھتا ہو لیکن اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو مفسر ہے اور اگر اس میں تاویل کی گنجائش ہو لیکن عبارت اس کی وجہ سے لائی

گئی ہو تو نص ہے ورنہ وہ ظاہر ہے اور اگر کسی عارض کی بناء پر لفظ سے اس کی مراد مخفی ہو تو وہ مخفی ہے اور اگر اس لفظ کی وجہ سے اس کی مراد مخفی ہو تو وہ مشکل ہے اور اگر عقل یا نقل سے اس کا ادراک ہو سکے تو وہ مجمل ہے اور اگر کسی وجہ سے اس کا ادراک نہ ہو سکے تو وہ متشابہ ہے۔

(تاج العروس ج ۹ ص ۳۹۳ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

متشابہ کی تین قسمیں ہیں لفظی

(اول) جس کی معرفت کا کوئی ذریعہ نہ ہو جیسے وقت وقوع قیامت اور دابۃ الارض کے نکلنے کا وقت، وغیرہ (ثانی) جس کی معرفت کا انسان کے لیے کوئی ذریعہ ہو جیسے مشکل اور غیر مانوس الفاظ اور مجمل احکام (ثالث) جو ان دونوں کے درمیان ہو علماء راسخین کے لیے اس کی معرفت حاصل کرنا ممکن ہے اور عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی (رض) کے متعلق دعا کی تھی: اے اللہ اس کو دین کی فقہ عطا فرما اور اس کو تاویل کا علم عطا فرما، اس دعا سے اسی قسم کی متشابہہ آیات کا علم مراد ہے آپ نے حضرت ابن عباس (رض) کے لیے بھی اسی قسم کی دعا کی ہے۔

(المفردات ص ۲۵۵، مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران ۱۳۴۲ھ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ لکھتے ہیں:

جس کا معنی نفس لفظ کی وجہ سے مخفی ہو اور اس کی معرفت کی بالکل امید نہ ہو جیسے اوائل سورۃ میں حروف مقطعات ہیں۔

(کتاب التعریفات ص ۸۶، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ)

اصولیین کے نزدیک محکم اور متشابہ کی تعریفیں:

علامہ عبد العزیز بن احمد بخاری متوفی ۷۳۰ھ لکھتے ہیں:

لفظ سے جس معنی کا ارادہ کیا گیا ہے اگر اس میں نسخ اور تبدیل ممتنع ہو تو وہ محکم ہے، اس سے معلوم ہوا کہ لفظ محکم اپنے معنی کا فائدہ پہنچانے میں انتہائی واضح ہوتا ہے اور چونکہ وہ معنی منسوخ نہیں ہو سکتا اس لیے اس کو محکم کہتے ہیں ہمارے عام اصولیین کی یہی رائے ہے، اس کی تفسیر میں اور بھی اقوال ہیں۔

(۱) جس میں صرف ایک محمل کی گنجائش ہو۔

(۲) عقل کے نزدیک وہ واضح ہو۔

(۳) وہ ناسخ ہو۔

(۴) اس کے معنی کا علم اور اس کی مراد معلوم ہو۔

(۵) تمام اہل اسلام کے نزدیک اس کا معنی ظاہر ہو اور کسی کا اس معنی میں اختلاف نہ ہو۔

(۶) جو فرائض اور حدود کے بیان پر مشتمل ہو۔

(۷) جو حلال اور حرام کے بیان پر مشتمل ہو۔ محکم کی یہ متعدد تعریفیں ہیں لیکن صحیح تعریف پہلی ہے۔

(کشف الاسرار ۱ ص ۱۳۶، مطبوعہ دار الکتاب العربی ۱۴۱۱ھ)

علامہ عبدالعزیز بن احمد بخاری متوفی ۷۳۰ھ متشابہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

جب کسی لفظ سے اس کی مراد مشتبہ ہو اور اس کی معرفت کا کوئی ذریعہ نہ ہو حتی کہ اس کی مراد کی طلب ساقط ہو جائے اور اس کی مراد کے حق ہونے کا اعتقاد واجب ہو تو اس کو متشابہہ کہتے ہیں۔

(کشف الاسرار ج ۱ ص ۱۴۹۔۔۱۴۸، مطبوعہ دار الکتاب العربی ۱۴۱۱ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی کے لیے اور متشابہ کا محمل نکالنے کے لیے آیت متشابہ کے درپے رہتے ہیں حالانکہ متشابہ کے محمل کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور ماہر علماء یہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ (آل عمران ۷:)

زائغین (جن کے دلوں میں کجی ہے) کا مصداق:

"جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے" اس سے مراد نجران کے عیسائی ہیں کیونکہ انھوں نے قرآن مجید کی آیات سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے پر استدلال کیا، یہ ربیع کا قول ہے، اور حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد یہود ہیں کیونکہ یہودی عالم حی بن اخطب اور اس کے اصحاب کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف سورتوں کے اوائل سے حروف مقطعات پڑھے تو وہ ابجد کے حساب سے ان کے عدد نکال کر اس دین کی مدت کا حساب کرنے لگے، اور جب آپ نے کئی حروف پڑھے تو وہ کہنے لگے ہم پر حساب مشتبہ ہو گیا کہ ہم قلیل عدد کا اعتبار کریں یا کثیر کا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ اس کتاب میں آیات محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں، قتادہ نے کہا کہ ان لوگوں سے مراد منکرین بعثت ہیں، اور ابن جریج نے کہا اس سے مراد منافقین ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد تمام مبتدعین ہیں، قرآن مجید کا ظاہر لفظ عموم کا تقاضا کرتا ہے اور اس کے عموم میں ہر وہ فرقہ داخل ہے جس کے دل میں کجی ہے۔

لایعلم تاویلہ الا اللہ" میں وقف کی تحقیق:

"حالانکہ متشابہ کے محمل کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا" اس میں اختلاف ہے کہ آیت کے اس حصہ پر وقف کیا جائے گا یا "والراسخون فی العلم" کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا اور اس پر وقف کیا جائے گا، دوسری صورت میں یہ معنی ہوگا حالانکہ متشابہ کے محمل کو اللہ اور ماہر علماء کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ، حسن، عروہ، عمر بن عبدالعزیز، ابی نہیک اسدی، مالک بن انس، کسائی، فراء، جلبائی، اخفش اور ابوعبید کے نزدیک الا اللہ پر وقف ہے اور اس کا معنی ہے اللہ کے سوا اور کوئی متشابہہ کے علم کو نہیں جانتا، علامہ خطابی اور فخر الدین رازی کا بھی یہی موقف ہے۔ مجاہد، ربیع بن انس، محمد بن جعفر بن زبیر اور اکثر متکلمین کے نزدیک "والراسخون فی العلم" پر وقف ہے اور معنی ہے" حالانکہ متشابہ کے محمل کو اللہ اور ماہر علماء کے سوا کوئی نہیں جانتا" پہلی تفسیر راجح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے متشابہات کے علم کے درپے ہونے والوں کی مذمت کی ہے، نیز وقت وقوع قیامت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول اور دجال کے خروج اور دابۃ الارض کے ظہور کا وقت بھی متشابہات میں ہے اور اس کو ماہر علماء نہیں جانتے نیز اللہ تعالیٰ نے ماہر علماء کی مدح اس بات میں کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ" ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے" حضرت ابن عباس نے فرمایا قرآن مجید کی تفسیر کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) وہ تفسیر جس میں جہل نہیں ہے۔
(۲) وہ تفسیر جس کو عرب اپنی زبان دانی کی وجہ سے جان لیتے ہیں۔
(۳) وہ تفسیر جس کو صرف علماء ماہرین ہی جانتے ہیں۔
(٤) وہ تفسیر جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

قرآن مجید میں ہے:
(آیت) "الرحمن علی العرش استوی"۔ (طٰہٰ:٥)
ترجمہ: رحمن عرش پر جلوہ فرما ہے۔

یہ آیت بھی متشابہات میں سے ہے امام مالک سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا استوی کا مطلب (قائم قرار گزیں) معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی کیفیت کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے امام مالک کے اس جواب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس آیت میں وقف الا اللہ پر ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۳ ص ۲۸۔۲٦ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

آیات متشابہات کو نازل کرنے کا فائدہ:

علماء متقدمین کا یہی مذہب تھا کہ آیات متشابہات کے معنی کا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو علم نہیں ہے ان پر یہ اعتراض ہوا کہ پھر آیات متشابہات کے نازل کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ انھوں نے اس کا یہ جواب دیا کہ اس میں علماء کا امتحان ہے جس طرح جاہل کے لیے تحصیل علم مشکل ہے اسی طرح علماء کے لیے کسی لفظ کے معنی میں تدبر اور تفکر نہ کرنا مشکل ہے سو آیات متشابہات کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے علماء کو اس کا مکلف کیا ہے کہ وہ ان آیات میں تدبر اور تفکر کرنے سے باز رہیں نیز علماء امت کو ان آیات متشابہات کے معنی معلوم نہیں ہیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان آیات کا معنی قطعی طور پر معلوم ہے۔

ملا احمد جیون جون پوری متوفی ۱۱۳۰ھ لکھتے ہیں:

آیات متشابہات کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اس کی مراد حق ہے اگر چہ قیامت سے پہلے ہمیں اس کا علم نہیں ہوگا اور قیامت کے بعد ان کا معنی ہر شخص پر منکشف ہو جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ اور یہ امت کے حق میں ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کا معنی قطعی طور پر معلوم ہے ورنہ آپ سے خطاب کرنا بے سود ہوگا اور یہ مہمل الفاظ کے ساتھ خطاب کرنے کے مترادف ہوگا یا ایسے ہوگا جیسے حبشی کے ساتھ کوئی شخص عربی میں گفتگو کرے۔

(التفسیرات الاحمدیہ ص ۹۳ مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور)

آیات متشابہات میں غور و فکر کرنے والے علماء متاخرین کا نظریہ:

علماء متقدمین آیات متشابہات میں غور و فکر نہیں کرتے تھے اور نہ کسی کو ان کا معنی بیان کرتے تھے لیکن متاخرین علماء احناف نے جب یہ دیکھا کہ بدمذہب لوگ ان آیات کے ظاہری معنی بتا کر لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں مثلاً وجہ اللہ سے اللہ کا چہرہ بیان کرتے ہیں ید اللہ

سے اللہ کا ہاتھ "یوم یکشف عن ساق" سے اللہ کے لیے پنڈلی ثابت کرتے ہیں تو انھوں نے مسلمانوں کے عقائد کو محفوظ کرنے کے لیے ان آیات کی تاویلات کیں، اور یہ تصریح کر دی کہ یہ تاویلات ظنی ہیں اور ان آیات متشابہات کے صحیح محمل اور حقیقی مراد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

امام ابو بکر محمد بن حسین آجری متوفی ۳۶۰ھ اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو آیات متشابہات میں بحث کر رہے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن سے بچنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، نیز حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا لوگ قرآن کے متشابہ میں بحث کریں گے تو تم علم رکھنے والے لوگوں کو لازم پکڑ لینا۔

(الشریعہ ص ۷۶-۷۴، مطبوعہ مکتبہ دار السلام ریاض، ۱۴۱۳ھ)

ملا احمد جونپوری متوفی ۱۱۳۰ھ لکھتے ہیں:

متاخرین علماء نے جب یہ دیکھا کہ ملحدین آیات صفات کے ظاہری معانی سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت، مکان اور اعضاء ثابت کر رہے ہیں اور حضرت آدم کو اللہ کی روح کا عین ثابت کر رہے ہیں، اور انھوں نے دیکھا کہ عوام کا شریعت پر اعتقاد ضعف کا شکار ہو رہا ہے تو انھوں نے ان آیات کی ایسی تاویل کرنے کے جواز کا فتویٰ دیا جس سے ان آیات کے ذریعہ فاسد عقائد نہ بیان کئے جائیں، اور وہ معانی اہل سنت و جماعت کے عقائد کے موافق ہوں، متاخرین کے بیان کردہ معانی کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

(آیت) "ونفخت فیه من روحی"۔ (الحجر: ۲۹)

اس کا ظاہری معنی ہے: اور میں اس میں اپنی روح سے پھونک دوں، متاخرین نے اس میں تاویل کی: اور میں اس میں اپنی پیدا کی ہوئی روح سے پھونک دوں۔

(آیت) "الله نور السموات والارض"۔ (النور: ۳۵)

اس کا ظاہری معنی ہے: اللہ آسمانوں اور زمینوں کی روشنی ہے، اس کی تاویل ہے: اللہ آسمانوں اور زمینوں کو روشن کرنے والا ہے۔

(آیت) "ید الله فوق ایدیهم"۔ (الفتح: ۱۰):

ترجمہ: ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اس کی تاویل ہے: ان کی قدرتوں پر اللہ کی قدرت ہے۔

(آیت) "فثم وجه الله"۔ (البقرة: ۱۱۵)

ترجمہ: سو وہیں اللہ کا چہرہ ہے"۔ اس کی تاویل ہے: سو وہیں اللہ کی ذات ہے۔

(آیت) "وجاء ربك"۔ القمر: ۲۲)

اور آپ کا رب آیا، اس کی تاویل ہے: اور آپ کے رب کا حکم آیا۔

(آیت) "الرحمن علی العرش استوی"۔ (طه: ۵)

ترجمہ: رحمٰن عرش پر قائم ہے۔ اس کی تاویل ہے: عرش پر اللہ کی حکومت اور اس کا تسلط ہے۔

(آیت) "یحسرتی علی ما فرطت فی جنب الله"۔ (الزمر: ۵۶)

ترجمہ: ہائے افسوس ان کوتاہیوں پر جو میں نے اللہ کے پہلو میں کیں۔ یعنی اللہ کی جوار رحمت میں، اللہ کے حضور کے قرب میں، یا اللہ کے متعلق۔

متاخرین نے آیات صفات کے علاوہ حروف مقطعات میں بھی تاویلات کی ہیں الم (الف لام میم) کے متعلق کہا الف سے اللہ کی طرف لام سے جبرائیل کی طرف اور میم سے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہے' یعنی اللہ نے جبرائیل کو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف قرآن دے کر بھیجا۔ یا اس کا معنی ہے میں اللہ جاننے والا ہوں۔ "المص" کا مطلب ہے میں اللہ حق اور باطل میں فیصلہ کرنے والا ہوں۔ "الر" کا معنی ہے میں اللہ دیکھتا ہوں "کھیعص" میں کاف کریم سے' ھا' ہادی سے' یا' حکیم سے' عین' علیم سے اور' صاد' صادق سے کنایہ ہے' طٰہٰ کا معنی ہے اہل بیت کی طہارت کی قسم' طسم" میں طا' ذی الطول سے' سین' قدوس سے' میم' رحمن سے کنایہ ہے' اس طرح حم عسق' میں حاء اور میم رحمن سے' عین' علیم سے' سین' قدوس سے اور قاف قاہر سے کنایہ ہے باقی حروف مقطعات بھی اسی قیاس پر ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا ہے کہ ان آیات کی تاویل کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو ان آیات کی تاویل کے درپے ہیں ان کے دلوں میں کجی ہے' تو پھر ان متاخرین کو ان آیات کا معنی کیسے معلوم ہو گیا؟ اور کیا وہ اس وعید کے مصداق نہیں بنے' اس کا جواب یہ ہے کہ ان آیات کے حقیقی معنی اور ان کے قطعی محمل کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اللہ تعالیٰ نے اسی علم کی اپنے غیر سے نفی کی ہے اور علماء متاخرین نے جو تاویل کی ہے وہ ظنی ہے اور وہ ان کے محامل میں سے ایک محمل ہے' اور کجی ان لوگوں کے دلوں میں ہے جو ان آیات کے ایسے معانی بیان کرتے ہیں جو قرآن مجید اور احادیث کی تصریحات کے خلاف ہیں اور اہل سنت و جماعت کے عقائد کے منافی ہیں۔

(التفسیرات الاحمدیہ ص ۱۹۷۔ ۱۹۵ مطبوعہ مکتبہ حقانیہ پشاور)

علماء راسخین کی تعریف

علماء راسخین سے مراد ایسے علماء ہیں جنہوں نے دین کا پختہ علم حاصل کیا اور قرآن اور حدیث میں مہارت حاصل کی اور تمام اصول اور فروع پر حاوی ہوں' ان سے عقائد اسلام اور احکام شرعیہ کے متعلق جو بھی سوال کیا جائے وہ اس کا جواب دینے پر قادر ہوں۔

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

علماء راسخین سے مراد ایسے علماء ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو دلائل یقینیہ قطعیہ سے جانتے ہوں' اور ان کو دلائل یقینیہ سے معلوم ہو کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور جب وہ کسی آیت کو دیکھیں کہ اس کا ظاہری معنی قطعی طور پر مراد نہیں ہے تو وہ قطعیت سے جان لیں کہ یہ آیت متشابہہ ہے اور اس کی مراد کا صرف اللہ تعالیٰ کو ہی علم ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل سے قرآن مجید میں غور کرتے ہیں اور جس آیت کا معنی ظاہری دلائل شرعیہ کے مطابق ہوتا ہے اس کو محکم قرار دیتے ہیں اور جس کا ظاہر دلائل شرعیہ کے خلاف ہوتا ہے اس کو متشابہ قرار دیتے ہیں' اس آیت سے متکلمین کی قدر و منزلت کا علم ہوتا ہے جو دلائل عقلیہ سے بحث کرتے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات اور افعال کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور دلائل عقلیہ' لغت' قواعد عربیہ اور احادیث اور آثار سے قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہیں' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تفسیر کرنے کے لیے لغت' قواعد عربیہ اور احادیث اور آثار میں تبحر درکار ہے اور جو شخص ان علوم میں تبحر حاصل کئے بغیر قرآن مجید کی تفسیر کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہو گا' اور اسی لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے۔ جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن مجید کی تفسیر کی وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔

(تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۰۱' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ)

علماء راسخین کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ علم کے تقاضوں پر عامل ہوں اور جس شخص کو اصول اور فروع کے مسائل حفظ ہوں اور وہ عمل سے خالی ہو یا بدعمل ہو وہ علماء راسخین میں سے نہیں ہے قرآن مجید میں ہے؛

(آیت) "مثل الذین حملوا التورۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا"۔ (الجمعہ: ۵)

ترجمہ: ان لوگوں کی مثال جن پر توراۃ کا بوجھ رکھا گیا پھر انھوں نے اسے نہ اٹھایا (اس پر عمل نہیں کیا) اس گدھے کی طرح ہے جس کی پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابودرداء اور حضرت ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ علم میں راسخ کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو اپنی قسم پوری کرے اور اس کی زبان سچی ہو اور اس کا دل (حق پر) مستقیم ہو اور اس کا پیٹ اور اس کی شرم گاہ حرام سے محفوظ ہو۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۱۲۳ مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت ۱۴۰۹ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اس حدیث کو امام طبرانی اور امام ابن عساکر کے حوالوں سے بیان کیا ہے۔

(الدرالمنثور ج ۲ ص ۷، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

اتباعِ رسول کے احکام

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٣١﴾

فرمادیجئے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو (۱) خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمادے گا (۲) اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اتباع رسول کے حکم کا شان نزول اور آیات سابقہ سے مناسبت:

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار سے محبت اور دوستی رکھنے سے منع فرمادیا تھا اور صرف اہل اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی اجازت دی تھی اور جب کہ بعض کفار بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا دعوی کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع اور آپ کی پیروی کرنا ہے جو آپ کا پیروکار ہے وہ اللہ تعالیٰ کا محب ہے اور جو آپ کی پیروی سے محروم ہے وہ اللہ کی محبت سے محروم ہے۔

مخلوق کے کمال کی معراج یہ ہے کہ وہ اللہ سے محبت کرے اور اللہ کی ان پر عنایت یہ ہے کہ وہ ان سے محبت کرے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے حصول کے لیے تمام مخلوق پر یہ واجب کردیا ہے کہ وہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع اور آپ کی اطاعت کریں، امام احمد، حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر موسیٰ

تمہارے سامنے زندہ ہوتے تو میری اتباع کرنے کے سوا ان کے لیے کوئی امر جائز نہ ہوتا۔(مسند احمد ج ۳ ص ۳۳۸، مطبوعہ بیروت) تو جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر بھی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع واجب ہے تو جو لوگ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف منسوب اور ان کے امتی ہیں ان پر تو سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع بطریق اولی واجب ہوگی۔اسی طرح جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا آسمان سے نزول ہوگا تو وہ بھی آپ کی شریعت کی اتباع کریں گے، امام بخاری نے روایت کیا ہے: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس وقت تمہارا کیا مرتبہ ہوگا جب تم میں ابن مریم کا نزول ہوگا اور امام تم میں سے ہوگا۔(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۰، مطبوعہ کراچی، ۱۳۸۱ ھ) سو جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بھی ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کریں گے تو ان کی ملت کے پیروکاروں پر بہ طریق اولی واجب ہے کہ وہ ہمارے رسول سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی کریں۔

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے پہلی آیتوں میں بطور تہدید اور وعید لوگوں کو نبی کریم پر ایمان لانے کی دعوت دی اور اب ایک اور طریقہ سے ان کو آپ پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے، وہ یہ ہے کہ یہود یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ کہیئے کہ اگر تم سے محبت کے دعوے دار: دوسری روایت یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد حرام میں گئے وہاں قریش بتوں کو سجدہ کر رہے تھے، آپ نے فرمایا اے جماعت قریش! بہ خدا تم ملت ابراہیم کی مخالفت کر رہے ہو۔قریش نے جواب دیا ہم اللہ کی محبت میں ان کی عبادت کر رہے ہیں تاکہ یہ بت ہمیں اللہ کے قریب کر دیں، تو یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ کہیئے کہ اگر تم اللہ کی محبت کے دعوے دار ہو تو میری اتباع کرو، ایک اور روایت یہ ہے کہ عیسائیوں نے کہا ہم اللہ کی محبت مسیح کی تعظیم کرتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی، خلاصہ یہ ہے کہ جو فریق بھی اللہ کی محبت کا مدعی ہو اور اس کی رضا اور اس کی اطاعت کا طالب ہو تو آپ اس سے کہیئے کہ اگر تم اللہ کی محبت کے دعوی میں صادق ہو تو اللہ کے حکم کو مانو اور اس پر عمل کرو، اور اللہ کا حکم یہ ہے کہ میری اتباع کرو۔

محبت کا معنی اور اللہ اور رسول کی محبت کی تحقیق:

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

انسان جس چیز کو اپنے گمان کے مطابق اچھا گمان کرے اس چیز کے ارادہ کرنے کو محبت کہتے ہیں، اس کی تین صورتیں ہیں۔انسان لذت کی وجہ سے محبت کرتا ہے جیسے انسان عمدہ کھانوں اور حسین عورتوں سے محبت کرتا ہے، اور کبھی انسان نفع کی وجہ سے محبت کرتا ہے جیسے انسان اطباء اور حکماء سے محبت کرتا ہے اور کبھی انسان فضل اور کمال کی وجہ سے محبت کرتا ہے جیسے انسان علماء اور اولیاء اللہ سے محبت کرتا ہے، بہادروں اور سخیوں سے محبت کرتا ہے، ملک اور قوم کے لیے نمایاں کام کرنے والے سے محبت کرتا ہے۔کبھی ایک چیز کو دوسری چیز پر ترجیح دینے کو بھی محبت کہتے ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "الذین یستحبون الحیاۃ الدنیا علی الاخرۃ"۔(ابراھیم: ۳)

ترجمہ جو لوگ دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں"۔

اللہ تعالیٰ جو بندہ سے محبت کرتا ہے اس کا معنی ہے وہ ان پر انعام و اکرام کرتا ہے اور اس کو اپنی رحمت اور مغفرت سے نوازتا ہے۔

(آیت) "واللہ یحب المحسنین"۔ (آل عمران: ۱۳۴)

اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے (یعنی ان کو ثواب عطا فرماتا ہے۔)

اور جو بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے اس کا معنی ہے بندہ اللہ کے رب اور اس کی رضا کا طالب ہے

(المفردات ص ۱۰۵ مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران ۱۳۴۲ھ)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

ابن عرفہ نے کہا اہل عرب کے نزدیک کسی شے کے ارادہ اور اس کے قصد کو محبت کہتے ہیں، ازہری نے کہا اور اس کے رسول کی محبت کا معنی یہ ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے اور ان کے احکام پر عمل کیا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی بندہ سے محبت کا معنی یہ ہے کہ وہ اس کو اپنی مغفرت سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ" بیشک وہ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔" اس کا معنی یہ ہے کہ وہ کافروں کو نہیں بخشے گا۔ سہل بن عبداللہ نے کہا اللہ سے محبت کی علامت قرآن سے محبت کرنا ہے اور قرآن سے محبت کی علامت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کرنا ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کی علامت سنت سے محبت کرنا ہے اور ان سب سے محبت کی علامت آخرت سے محبت کرنا ہے اور آخرت سے محبت کی علامت یہ کہ قدر ضرورت کے علاوہ دنیا سے بغض رکھے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۴ ص ۶۱۔ ۶۰ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

اللہ کی محبت کا حصول جن نفوس قدسیہ کی محبت پر موقوف ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوگا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد اس کی اولاد اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس پالے گا۔ یہ کہ اسے اللہ اور اس کا رسول ان کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہوں، اور وہ جس شخص سے محبت کرے تو صرف اللہ کے لیے محبت کرے اور اس کے نزدیک کفر میں لوٹنا آگ میں ڈالے جانے کی طرح مکروہ ہو۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایمان کی علامت انصار سے محبت کرنا اور نفاق کی علامت انصار سے بغض رکھنا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۷، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مغفل (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرے اصحاب کے متعلق اللہ سے ڈرو میرے بعد ان کو طعن اور تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ جس نے ان سے محبت رکھی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھی اور جس نے ان سے بغض رکھا، اس نے میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھا، جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھ کو ایذا دی اور جس

نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی اور جس نے اللہ کو ایذا دی تو وہ عنقریب اس کو اپنی گرفت میں لے لے گا۔
(جامع ترمذی ص ۵۴۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے حسن اور حسین (رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھی اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔
(سنن ابن ماجہ ص ۱۳ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے میں اس سے اعلان جنگ کر دیتا ہوں (صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۶۳' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرائیل ندا کرتا ہے کہ اللہ فلاں بندہ سے محبت رکھتا ہے تم اس سے محبت رکھو تو جبرائیل اس بندہ سے محبت کرتا ہے' پھر جبرائیل آسمان والوں میں ندا کرتا ہے کہ اللہ فلاں بندہ سے محبت کرتا ہے تم اس سے محبت رکھو تو آسمان والے اس سے محبت رکھتے ہیں پھر اس بندہ کے لیے زمین میں مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔
(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۹۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کی محبت کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت رکھنا' آپ کے اصحاب اور اہل بیت سے محبت رکھنا اور آپ کی امت کے اولیاء اللہ سے محبت رکھنا ضروری ہے اور جو شخص ان نفوس قدسیہ کی محبت سے محروم ہو وہ کبھی اللہ کی محبت حاصل نہیں کر سکتا۔

اس آیت میں یہ فرمایا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اتباع کرنے والوں کو اللہ اپنا محبوب بنالیتا ہے سو ہم قرآن اور سنت کی روشنی میں وہ افعال بیان کرنا چاہتے ہیں جن کو کرنے سے اللہ بندے کو اپنا محبوب بناتا ہے اور وہ افعال جن کو کرنے سے بندہ اللہ کی محبت سے محروم رہتا ہے۔

ان افعال اور عبادات سے اللہ محبت کرتا ہے:

(آیت) "واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین"۔ (البقرۃ: ۱۹۵)
ترجمہ: اور نیکی کرو بیشک اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(آیت) "ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین"۔ (البقرۃ: ۲۲۲)
ترجمہ: پس بیشک اللہ' توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور پاکیزگی حاصل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(آیت) "فان اللہ یحب المتقین"۔ (آل عمران: ۷۶)
ترجمہ: پس بیشک اللہ' اللہ سے ڈرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(آیت) "واللہ یحب الصابرین"۔ (ال عمران: ۱۴۶)

ترجمہ: اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(آیت) "ان اللہ یحب المتوکلین (ال عمران: ۱۵۹)

ترجمہ: بیشک اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(آیت) "ان اللہ یحب المقسطین"۔ (المائدہ: ۴۲)

ترجمہ: بیشک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(آیت) "ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص"۔ (الصف: ۴)

ترجمہ: بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ فرماتا ہے جو شخص میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے میں اس سے اعلان جنگ کر دیتا ہوں' جن چیزوں سے بندہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں ان سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہے جن کو میں نے اس پر فرض کیا ہے' اور بندہ نوافل کے ساتھ ہمیشہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں پھر میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اس کو ضرور پناہ دیتا ہوں' اور میں کسی کام کے کرنے میں اتنی تاخیر نہیں کرتا جتنی بندہ مومن کی روح قبض کرنے میں تاخیر کرتا ہوں وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے رنجیدہ کرنے کو ناپسند کرتا ہوں۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۶۳' مطبوعہ کراچی)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ یہود کی ایک جماعت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئی انھوں نے کہا السام علیکم (تم پر موت ہو) حضرت عائشہ (رض) فرماتی ہیں میں نے اس کو سمجھ لیا میں نے کہا تم پر موت اور لعنت ہو' تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ٹھہرو! اے عائشہ! اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں نرمی کرنے سے محبت کرتا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۹۰ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سہل بن سعد (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کرنے لگا یا رسول اللہ! مجھے ایسا عمل بتلائیے جب میں وہ عمل کرلوں تو اللہ بھی مجھ سے محبت کرے اور لوگ بھی محبت کریں' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دنیا سے بے رغبتی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے ہاتھوں میں جو چیزیں ہیں ان سے بے رغبتی کرو تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔

حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس بندہ مومن سے محبت کرتا ہے جو تنگ دست ہو' سوال سے بچتا ہو اور عیال دار ہو۔

(سنن ابن ماجہ ص ۳۰۳' ۳۰۲' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

جن افعال سے اللہ تعالیٰ محبت نہیں کرتا:

(آیت) "ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین"۔ (البقرہ: ۱۹۰)
ترجمہ: اور حد سے نہ بڑھو بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

(آیت) "واللہ لا یحب کل کفار اثیم"۔ (البقرہ: ۲۷۶)
ترجمہ: اور اللہ کسی ناشکرے، گناہ گار سے محبت نہیں کرتا:

(آیت) "واللہ لا یحب الظلمین"۔ (آل عمران: ۵۷)
ترجمہ: اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔

(آیت) "ان اللہ لا یحب من کان خوانا اثیما" (النساء: ۱۰۷)
ترجمہ: بیشک کسی خائن اور بڑے گناہ گار سے محبت نہیں کرتا۔

(آیت) "لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم"۔ (النساء: ۱۴۸)
ترجمہ: اللہ اس شخص سے محبت نہیں کرتا جو بری بات کو آشکارا کرے۔

(آیت) "واللہ لا یحب المفسدین"۔ (المائدہ: ۶۴)
ترجمہ: اور اللہ فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا:

(آیت) "ولا تسرفوا ان اللہ لا یحب المسرفین"۔ (الاعراف: ۳۱)
ترجمہ: اور فضول خرچ نہ کرو بیشک اللہ فضول خرچ کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتا۔

(آیت) "انہ لا یحب المستکبرین" (النحل: ۲۳)
ترجمہ: بیشک وہ تکبر کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا:

(آیت) "ان اللہ لا یحب الفرحین"۔ (القصص: ۷۶)
ترجمہ: بیشک اللہ اترانے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

(آیت) "ان اللہ لا یحب کل مختال فخور"۔ (لقمان: ۱۸)
ترجمہ: بیشک اللہ کسی اکڑنے والے متکبر سے محبت نہیں کرتا۔

حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی متوفی ۸۰۷ھ بیان کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ مال ضائع کرنے سے، زیادہ سوال کرنے سے اور بحث کرنے سے محبت نہیں کرتا۔ اس حدیث کو امام ابویعلی نے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔
(مجمع الزوائد ج ۱ ص ۳۰۲، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت، ۱۴۰۲ھ)

حضرت علی ابن طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ جاہل بوڑھے، ظالم امیر اور

متکبر فقیر سے محبت نہیں کرتا اس حدیث کو امام بزاز نے روایت کیا ہے اور اس میں حارث نام کا راوی ضعیف ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۷۵ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲ھ)

امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ روایت کرتے ہیں:

بنو ضمرہ کے ایک شخص نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ ماں باپ کی نافرمانی سے محبت نہیں کرتا۔

(المصنف ج ۸ ص ۴۹ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

امام سلیمان بن احمد طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت اسامہ بن زید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ عزوجل بد خلق اور بد زبان سے محبت نہیں کرتا۔

(المعجم الکبیر ج ۱ ص ۱۶۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

نذر تحنیک اور عقیقے کے بارے میں وضاحت

اِذۡ قَالَتِ امۡرَاَتُ عِمۡرٰنَ رَبِّ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لَکَ مَا فِیۡ بَطۡنِیۡ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّیۡ ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۵﴾

”جب عمران کی بیوی نے کہا کے اے میرے رب! میرے پیٹ میں جو کچھ ہے، اسے میں نے تیرے نام آزاد کرنے (۱) کی نذر مانی، تو میری طرف سے قبول فرما، یقیناً تو خوب سننے والا اور پوری طرح جاننے والا ہے“۔

عمران کی بیوی کی نذر ماننے کی تفصیل:

علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں:

عمران کی بیوی حضرت مریم کی ماں ہیں اور حضرت عیسیٰ بن مریم صلوات اللہ علیہ کی نانی ہیں، ان کا نام حنہ بنت فاقوذ بنت قتیل ہے اور ان کے خاوند کا نام عمران بن یاثھم ہے یہ حضرت سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) کی اولاد سے ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ حضرت زکریا اور حضرت عمران نے دو بہنوں سے شادی کی، حضرت زکریا کی بیوی سے حضرت یحییٰ پیدا ہوئے اور حضرت عمران کی بیوی سے حضرت مریم پیدا ہوئیں۔ حضرت عمران فوت ہوئے تو ان کی بیوی حنہ حضرت مریم سے حاملہ تھیں۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ وہ عمر رسیدہ ہو چکی تھیں اور ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی ان کے گھر کے پاس ایک درخت تھا ایک دن انھوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ اپنی چونچ سے اپنے بچے کو دانہ کھلا رہا تھا اس وقت ان کے دل میں بچہ کی تمنا پیدا ہوئی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کو بچہ عطا

فرمائے تو انھیں حضرت مریم کا حمل ہوگیا اور حضرت عمران فوت ہو گئے جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ ان کے پیٹ میں بچہ ہے تو انھوں نے اس کی اللہ کے لیے نذر مان لی یعنی وہ اس کو عبادت گاہ کے لیے وقف کر دیں گی اور وہ بچہ دنیا کی کسی چیز سے نفع نہیں اٹھائے گا، اور جب ان کے ہاں حضرت مریم پیدا ہوئیں تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر پیش کرتے ہوئے کہا اے اللہ! میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے، کیونکہ انھوں نے بیت المقدس کی خدمت کے لیے نذر مانی تھی اور لڑکی اپنی کمزور طبیعت کی وجہ سے خدمت کے بہت سے کام سرانجام نہیں دے سکتی، اور بعض احوال میں (مثلاً حیض اور نفاس میں) مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم نے جس لڑکے کے حصول کی دعا کی تھی وہ اس مرتبہ کا نہیں ہے جس پائے کی میری دی ہوئی لڑکی ہے۔

(جامع البیان ج۱ ص ۱۵۹۔ ۱۵۷، مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

حضرت عیسیٰ کا مس شیطان سے محفوظ رہنا ہمارے نبی کی فضیلت کے منافی نہیں ہے۔

عمران کی بیوی نے کہا میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے ان کی زبان میں مریم کا معنی عبادت کرنے والی، اللہ کا قرب حاصل کرنے والی اور اللہ کے سامنے عاجزی اور خشوع اور خضوع کرنے والی ہے، اور انھوں نے کہا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بنو آدم میں سے جو شخص بھی پیدا ہوتا ہے اس کی پیدائش کے وقت شیطان اسے چھوتا ہے تو وہ شیطان کے چھونے سے چیخ مار کر روتا ہے ماسوا مریم اور بیٹے کے، پھر حضرت ابوہریرہ (رض) نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔

(صحیح بخاری ج۱ ص ۴۸۸، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

علامہ شرف الدین طیبی متوفی ۷۴۳ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کو ولادت کے وقت مس شیطان سے مستثنیٰ کرنے سے ہمارے نبی پر ان کی فضیلت لازم نہیں آتی کیونکہ ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بہت سے ایسے فضائل اور معجزات ہیں جو حضرت عیسیٰ کو حاصل تھے نہ کسی اور نبی کو اور افضل میں مفضول کی خصال کا ہونا لازم نہیں ہے۔

(شرح الطیبی ج۱ ص ۲۰۶)

ملا علی قاری نے طیبی کی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے اس کی نظیر طبرانی کی یہ حدیث ہے ہر ابن آدم نے خطا کی ہے یا خطا کا ہم (ارادہ) کیا ہے سوا حضرت یحییٰ بن زکریا (علیہما السلام) کے۔

(مرقات ج۱ ص ۱۳۹)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ علامہ طیبی کی تحریر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

مشہور یہ ہے کہ فضیلت کلی جزی کے منافی نہیں لیکن بندہ ضعیف یہ کہتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنو آدم کے اس عموم سے مستثنیٰ ہیں اور اس حدیث میں آپ نے دوسرے فرزندان آدم کی خبر دی ہے اور طہارت میں آپ کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت شیطان آپ پر کسی قسم کا تصرف کر سکے، بعض شارحین نے کہا ہے کہ جب متکلم اس قسم کا کلام کرتا ہے تو اس کی

ذات عموماً کلام سے خارج ہوتی اور ذوق اور حال اس کا قرینہ ہوتا ہے۔

شیخ محمد ادریس کاندھلوی نے شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی اس تقریر کو لمعات کے حوالے سے لکھا ہے۔

(اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۸۲ مطبع تیج کمار لکھنؤ التعلیق الصبیح ج ۱ ص ۶۴ مطبوعہ لاہور)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی متوفی ۸۰۰ھ لکھتے ہیں:

قاضی نے یہ اشارہ کیا ہے کہ انبیاء (علیہم السلام) اس فضیلت کے حصول میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی شریک ہیں علامہ قرطبی نے کہا یہ قتادہ کا قول ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۱۵ ص ۱۷۷، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر ۱۳۴۸ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

ہمارے علماء نے یہ کہا ہے کہ اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کی دعا متجاب ہوگئی اور شیطان تمام اولاد آدم کی کوکھ میں انگلی چھوتا ہے حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء کے بھی انگلی چھوتا ہے سوا حضرت مریم اور ان کے بیٹے کے۔ قتادہ نے کہا شیطان ہر نوزائیدہ بچے کے پہلو میں چھوتا ہے سوا حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کی والدہ کے ان کے درمیان حجاب کر دیا گیا تو اس کی انگلی حجاب پر لگی اور حجاب کے پار نافذ نہیں ہوئی اور بچہ کے انگلی چھونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیطان اس بچہ کو گمراہ کرنے یا بہکانے پر قادر ہوگیا ہے کیونکہ کتنے انبیاء (علیہ السلام) کو بہکانے اور ورغلانے کے لیے شیطان نے حملے کیئے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "ان عبادی لیس لك علیهم سلطان"۔ (الحجر: ۴۲)

علاوہ ازیں ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان پیدا کیا جاتا ہے تو مریم اور ان کے بیٹے حضرت عیسیٰ اگرچہ شیطان کے انگلی چھونے سے محفوظ رہے لیکن شیطان کے ہر وقت ساتھ اور لازم رہنے سے محفوظ نہیں رہے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۴ ص ۶۸ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

خلاصہ یہ کہ شیطان کے انگلی نہ چھونے سے زیادہ فضیلت اس میں ہے کہ باقی انبیاء (علیہم السلام) اس کے انگلی چھونے کے باوجود اس کے شر سے محفوظ رہے۔

ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی یہ فضیلت اور خصوصیت ہے کہ آپ کے ساتھ جو شیطان اور ہمزاد پیدا کیا گیا تھا آپ کی نگاہ کیمیا اثر سے اس کی بھی کایا پلٹ گئی وہ شیطان مسلمان ہوگیا اور بجائے ورغلانے اور بہکانے کے آپ کو نیکی اور بھلائی کے مشورے دینے لگا۔

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان لگا دیا جاتا ہے (سفیان کی روایت میں ہے اور ایک فرستہ لگا دیا جاتا ہے) صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ آپ کے ساتھ بھی؟ آپ نے فرمایا: ہاں میرے ساتھ بھی لیکن اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی وہ مسلمان ہوگیا اور وہ مجھے بھلائی کے سوا کوئی اور مشورہ نہیں دیتا۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۷۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۷۵ھ)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فیض نگاہ سے شیطان کا مسلمان ہوجانا بہت عظیم فضیلت ہے اور یہ فضیلت بشمول حضرت عیسیٰ کے کسی نبی کو بھی حاصل نہیں ہے۔

بچہ کا نام رکھنا' اس کو گھٹی دینا' اور بچہ کی ولادت کے دیگر مسائل:

ان آیات میں ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر دلیل ہے اور یہود کے اس دعوی کا رد ہے کہ انبیاء صرف بنو اسرائیل سے مبعوث ہوں گے' اور مشرکین کا رد ہے جن کا زعم تھا کہ بشر نبی نہیں ہوسکتا کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو گزشتہ نبیوں اور امتوں کے ان احوال سے مطلع فرمایا جن کی تصدیق ان کی کتابوں میں موجود تھی اور یہ آپ کی نبوت کے صدق پر واضح دلیل ہے۔

نبی کی ولادت اور اعلان نبوت سے پہلے جو امور خلاف عادت ظاہر ہوں ان کو ارہاص کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ مریم ایسی خاتون سے پیدا ہوئیں جو بوڑھی اور بانجھ تھیں یہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ارہاص ہے، اسی طرح حضرت مریم کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے قبول کرلیا گیا یہ بھی ان کے معمول کے خلاف تھا تاکہ ان کی پاکیزہ سیرت ان کے بیٹے کے روح اور کلمۃ اللہ ہونے کا عنوان بن جائے۔

عمران کی بیوی حنہ نے اپنی بیٹی کے ولادت کے دن ان کا نام مریم رکھا اس سے معلوم ہوا کہ ولادت کے دن نام رکھنا جائز ہے ہر چند کہ یہ شریعت سابقہ لیکن ہماری شریعت میں بھی اس کی تائید ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میرے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا میں اس کو لے کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور اس کو کھجور کی گھٹی کھلائی اور اس کے لیے برکت کی دعا کی یہ حضرت ابوموسیٰ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۱' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ (رض) کا بیٹا بیمار تھا وہ سفر پر چلے گئے اس اثناء میں وہ بیٹا فوت ہوگیا جب واپس آئے تو حضرت ام سلیم سے پوچھا میرا بیٹا کیسا ہے؟ حضرت ام سلیم نے کہا پہلے سے زیادہ پرسکون ہے۔ ان کو شام کا کھانا کھلایا اور رات کو حضرت ابوطلحہ (رض) نے ان سے عمل زوجیت کیا۔ صبح کو حضرت ام سلیم نے کہا اب بیٹے کو دفن کردو۔ حضرت ابوطلحہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ماجرا بیان کیا آپ نے پوچھا تم نے رات اس عمل میں گزاری؟ انھوں نے کہا ہاں! آپ نے دعا کی اے اللہ ان دونوں کو برکت عطا فرما تو ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ مجھ سے حضرت ابوطلحہ نے کہا تم اس بچہ کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے جاؤ میں اس بچہ کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے گیا اور میں نے کچھ کھجوریں بھی بھیجیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بچہ کو لے کر پوچھا کے اس کے ساتھ کچھ چیز بھی ہے لوگوں نے کہا ہاں کچھ کھجوریں ہیں، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھجور لی اور اس کو چبا کر اس بچہ کے منہ میں رکھا اور اس کو گھٹی دی اور اس کا نام عبداللہ رکھا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۲' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کے مسائل میں سے یہ ہے کہ جب کوئی شخص تھکا ماندہ سفر سے آئے تو فوراً اس کو غمناک خبر نہیں سنانی چاہیے، بچہ کی موت پر ماں باپ کو پرسکون رہنا چاہیے۔ بچہ پیدا ہوا تو کسی بزرگ سے اس کے منہ میں گھٹی ڈلوانی چاہیے اس سے برکت کی دعا کرانی چاہیے اور بچہ کا اچھا نام رکھنا چاہیے۔ خصوصاً انبیاء (علیہم السلام) اور بزرگوں کے نام پر اس کا نام رکھنا چاہیے، امام ابو داؤد سلمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں؛

حضرت ابو ہب جشمی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا انبیاء (علیہم السلام) کے نام رکھو۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہے اور سب سے سچا نام حارث اور ہمام ہے اور سب سے برا نام حرب اور مرہ ہے۔

حضرت ابو درداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن تم کو تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا اس لیے اپنے اچھے نام رکھو۔

(سنن ابو داؤد ج ص، مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کو قیامت کے دن ان کے آباء سے منسوب کرکے پکارا جائے گا مثلاً فلاں بن فلاں اور یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ لوگوں کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا یہ صحیح نہیں ہے۔

عقیقہ کے متعلق احادیث، آثار اور اقوال تابعین:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سلیمان بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے۔ اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس گندگی کو دور کرو۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۲۲، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ام کرز (رض) روایت کرتی ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف ایک بکری (ذبح کرو) اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نر ہو یا مادہ۔

امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

اس حدیث کو امام دارمی (سنن دارمی ج ۲ ص ۸) اور امام احمد (مسند احمد ج ٦ ص ٤٥٦۔ ٤٢٢۔ ۳۸۱) نے بھی روایت کیا ہے۔

حضرت سمرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لڑکا اپنے عقیقہ کے بدلے میں گروی ہے۔ ولادت کے ساتویں دن اس کی طرف سے ذبح کیا جائے اس کا نام رکھا اور اس کے بال مونڈے جائیں۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (جامع ترمذی ص ۲۳۷، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کی طرف دو

دو مینڈھے ذبح کئے۔

(سنن ابو داؤد ج ۲ ص ۳۶ مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور ۱۴۰۵ھ)

امام ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کی طرف سے دو دو مینڈھے ذبح کئے۔

(سنن نسائی ج ۲ ص ۱۸۸، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی)

صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں جن احادیث کا ذکر ہے وہ سب سنن ابو داؤد اور سنن نسائی میں بھی مذکور ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سنن ابو داؤد میں حضرت حسن اور حضرت حسین کی طرف سے ایک ایک مینڈھے کو ذبح کرنے کا تذکرہ ہے اور سنن نسائی میں دو دو مینڈھے ذبح کرنے کا ذکر ہے تو اس کی کیا توجیہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی ولادت کے دن ایک ایک مینڈھا ذبح کیا اور ساتویں دن ایک ایک مینڈھا اور ذبح کیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک مینڈھا آپ نے اپنی طرف سے ذبح کیا اور حضرت علی (رض) اور حضرت فاطمہ (رض) کو دوسرا مینڈھا ذبح کرنے کا حکم دیا تو جس نے ایک ایک مینڈھے کے ذبح کی روایت کی اس نے آپ کی طرف ذبح کی حقیقی نسبت کی اور جس نے دو دو کو ذبح کرنے کی روایت کی اس نے آپ کی طرف مجازاً نسبت کی۔

امام عبدالرزاق نے حضرت عائشہ (رض) اور عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن اور حضرت حسین کی طرف سے دو دو مینڈھے ذبح کئے۔

(المصنف ج ۴ ص ۳۳۰)

امام ابن ابی شیبہ نے حضرت ابو درداء، حضرت جابر اور عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کا عقیقہ کیا۔

(المصنف ج ۸ ص ۴۷۔۴۶)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کی طرف سے دو مینڈھے ذبح کئے۔

محمد بن علی بن حسین روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کے بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کی اور امام مالک نے یحیی بن سعید سے روایت کیا ہے کہ آپ نے حضرت علی کے دو بیٹوں حضرت حسن اور حسین (رض) کا عقیقہ کیا۔

(سنن کبری ج ۹ ص ۲۹۹ مطبوعہ ملتان)

امام عبدالرزاق بن ھمام متوفی ۲۱۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول نے اعلان نبوت کے بعد خود اپنا عقیقہ کیا۔

(المصنف ج ۴ ص ۳۲۰)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے اس حدیث کو امام بزار نے اور امام طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور اس حدیث کے رواۃ ثقہ ہیں۔
(مجمع الزوائد ج ٤ ص ٥٩)

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔
(سنن کبریٰ ج ٩ ص ٣٠٠، مطبوعہ ملتان)

امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ٢٣٥ھ روایت کرتے ہیں:
عطا بیان کرتے ہیں کہ ام اسباع نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا کیا میں اپنی اولاد کی طرف سے عقیقہ کروں آپ نے فرمایا ہاں لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک۔
(المصنف ج ٨ ص ٥٠ مطبوعہ کراچی)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ نے ہمیں لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کا عقیقہ کرنے کا حکم دیا نیز حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا لڑکے کی طرف سے دو بکریاں سنت ہیں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری سنت ہے۔
(المصنف ج ٨ ص ٥٠ مطبوعہ کراچی)

امام عبد الرزاق روایت کرتے ہیں۔
نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر (رض) سے جو بھی عقیقہ کے متعلق سوال کرتا وہ اس کو عقیقہ کرنے کا حکم دیتے۔
(المصنف ج ٨ ص ٣٣١ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت)

امام ابو القاسم سلیمان احمد طبرانی متوفی ٣٦٠ھ روایت کرتے ہیں:
حضرت اسماء بنت یزید بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لڑکے کی طرف سے دو بکریوں کا عقیقہ ہے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کا۔
(المعجم الکبیر ج ٢٤ ص ١٨٣)

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک اپنے بیٹوں کی طرف سے اونٹ ذبح کر کے عقیقہ کرتے تھے۔
(المعجم الکبیر ج ١ ص ٢٤٤، مطبوعہ بیروت)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں۔
(مجمع الزوائد ج ٤ ص ٥٩ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ١٤٠٢ھ)

امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ٢٣٥ھ روایت کرتے ہیں:
جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ نے جو عقیقہ کیا تھا اس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ حکم دیا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ دائی کے پاس بھیجی جائے اور اس کی کسی ہڈی کو نہ توڑا جائے۔
ابن ابی ذئب بیان کرتے ہیں کہ میں زہری سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا انھوں نے کہا اس کی ہڈیوں کو توڑا جائے نہ سر کو اور نہ بچہ کو اس کے خون میں لتھیڑا جائے۔
ہشام بیان کرتے ہیں کہ حسن اور ابن سیرین عقیقہ میں ان تمام باتوں کو مکروہ کہتے تھے جو قربانی میں مکروہ ہیں اور ان کے

نزدیک عقیقہ بہ منزلہ قربانی ہے اس کے گوشت کو کھایا جائے اور کھلایا جائے۔

حضرت سمرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ساتویں دن عقیقہ کیا جائے بچہ کا سر مونڈا جائے اور اس کا نام رکھا جائے۔

ابوجعفر بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ نے ساتویں دن اپنے بیٹے کا عقیقہ کیا۔ اس کا نام رکھا۔ اس کا سر مونڈا۔ اس کا ختنہ کیا اور اس کے بالوں کے برابر چاندی صدقہ کی۔

(المصنف ج ۸ ص ۵۵۔ ۵۲ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۰۶ھ)

امام عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ روایت کرتے ہیں:

عطا کہتے ہیں کہ ساتویں دن بچہ کا عقیقہ کیا جائے اگر اس دن نہ کرسکیں تو اگلے ساتویں دن موخر کردیں اور میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ساتویں دن ہی عقیقہ کا قصد کرتے ہیں اور عقیقہ کرنے والے خود بھی گوشت کھائیں اور لوگوں کو ہدیہ بھی دیں۔ ابن عیینہ نے کہا میں نے پوچھا کیا یہ سنت ہے؟ کہا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کا حکم دیا ہے ابن عیینہ نے کہا کیا اس کے گوشت کو صدقہ کردیں؟ کہا نہیں اگر چاہیں تو صدقہ کریں اور چاہیں تو خود کھالیں۔

(المصنف ج ۸ ص ۳۳۲ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۰ھ)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت بریدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عقیقہ ساتویں دن کیا جائے اور چودھویں دن اور اکیسویں دن۔

(سنن کبری ج ۹ ص ۳۰۳، مطبوعہ نشر السنہ ملتان)

جو دن بھی سات سے تقسیم ہو جائے اس میں عقیقہ کرنا سنت ہے اگر بچہ مثلاً منگل کو پیدا ہوا ہے تو جس پیر کو بھی عقیقہ کی جائے وہ سات دن سے تقسیم ہوگا۔

عقیقہ کے متعلق فقہاء حنبلیہ کا نظریہ:

علامہ عبداللہ بن احمد ابن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

عقیقہ کرنا سنت ہے۔ عام اہل علم کا یہی مذہب ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت عائشہ، فقہاء تابعین اور تمام ائمہ کا یہی نظریہ ہے ماسوا فقہاء احناف کے انھوں نے کہا یہ سنت نہیں۔ بلکہ امر جاہلیت سے ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت ہے کہ آپ سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ عقوق کو ناپسند کرتا ہے گویا آپ نے لفظ عقوق کو ناپسند فرمایا (اس کا معنیٰ قطع کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی ہے) اور فرمایا جس کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ جانور ذبح کرنا چاہے تو جانور ذبح کرے۔ (سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۳۷۔ ۳۶، سنن نسائی ج ۲ ص ۱۸۷، ابوداؤد اور نسائی میں اس کے بعد مذکور لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری) امام مالک نے اس حدیث کو اپنی موطا میں روایت کیا ہے۔ حسن بصری اور داؤد (ظاہری) نے کہا عقیقہ کرنا واجب ہے حضرت بریدہ (رض) نے بیان کیا کہ لوگ پانچ نمازوں کی طرح عقیقہ کا اہتمام کرتے ہیں کیونکہ حضرت سمرہ بن جندب (رض)

نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے کہ ہر لڑکا اپنے عقیقہ کے ساتھ گروی رکھا ہوا ہے، ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے اس کا نام رکھا جائے اور اس کا سر مونڈا جائے۔ حضرت ابوہریرہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے امام احمد نے کہا اس حدیث کی سند جید ہے۔ عقیقہ کے استحباب پر یہ احادیث دلیل ہیں۔ اور حضرت ام کرز سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کا عقیقہ کیا جائے اور عقیقہ کے استحباب پر اجماع ہے۔ ابوالزناد نے کہا عقیقہ کو ترک کرنا مکروہ ہے، امام احمد نے کہا عقیقہ کرنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت ہے آپ نے حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کا عقیقہ کیا ہے اور آپ کے اصحاب نے عقیقہ کیا ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا لڑکا عقیقہ کے ساتھ گروی رکھا ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے یہ کہا کہ عقیقہ جاہلیت کے افعال میں سے ہے اور ان کے ساتھ حسن ظن یہ ہے کہ ان کو یہ احادیث نہیں پہنچیں۔

(المغنی ج ۹ ص ۳۶۳ ،مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

عقیقہ کے متعلق فقہاء شافعیہ کا نظریہ:

علامہ ابواسحٰق ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی شافعی متوفی ۴۵۵ھ لکھتے ہیں:

عقیقہ سنت ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ مولود کی طرف سے ایک جانور ذبح کی جائے کیونکہ حضرت بریدہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) کی طرف سے عقیقہ کی اور یہ واجب نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوسعید خدری (رض) نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا میں عقوق کو پسند نہیں کرتا، اور جس شخص کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور وہ جانور ذبح کرنا چاہتا ہو تو کرے۔ آپ نے عقیقہ کو محبت پر معلق کیا ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ عقیقہ واجب نہیں ہے نیز عقیقہ بغیر کسی جنایت (جرم) اور نذر کے خون بہانا ہے لہٰذا یہ قربانی کی طرح واجب نہیں ہے (شوافع کے نزدیک قربانی بھی واجب نہیں ہے۔ سعیدی غفرلہ) اور سنت یہ ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرے کیونکہ حضرت ام کرز (رض) بیان کرتی ہیں۔ کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عقیقہ کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا لڑکے کے لیے دو بکریاں اور لڑکی کے لیے ایک بکری نیز عقیقہ خوشی کی وجہ سے مشروع کیا گیا ہے اور لڑکے کی ولادت پر لڑکی کی بہ نسبت زیادہ خوشی ہوتی ہے اس لیے اس کی ولادت پر دو بکریاں ذبح کی جائیں گی۔

(المہذب ج ۱ ص ۲۴۱ ،مطبوعہ دارالفکر بیروت)

عقیقہ کے متعلق فقہاء مالکیہ کا نظریہ:

امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) کے اہل سے جو شخص بھی عقیقہ کے متعلق سوال کرتا وہ اس کو عقیقہ کرنے کا حکم دیتے اور آپ اپنی اولاد کی طرف سے ایک ایک بکری کا عقیقہ کرتے تھے۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے۔

محمد بن حارث تیمی بیان کرتے ہیں کہ عقیقہ کرنا مستحب ہے خواہ چڑیا سے کیا جائے۔ (یہ مبالغہ فرمایا)

امام مالک فرماتے ہیں ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب (رض) کے دو بیٹوں حسن اور حسین (رض) کا

عقیقہ کیا گیا۔

ہشام بن عروہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد عروہ بن زبیر اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا ایک ایک بکری کے ساتھ عقیقہ کرتے تھے۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک عقیقہ کا حکم یہ ہے کہ جو شخص عقیقہ کرے وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی طرف سے ایک ایک بکری ذبح کرے اور عقیقہ کرنا واجب نہیں ہے لیکن عقیقہ مستحب ہے' اور ہمارے نزدیک یہ وہ کام ہے جس کو ہمیشہ لوگ کرتے رہے ہیں جو شخص اپنے بیٹے کی طرف سے عقیقہ کرے وہ بہ منزلہ قربانی ہے اس میں کانے' لاغر' سینگ ٹوٹے ہوئے اور بیمار جانور کو ذبح کرنا جائز نہیں ہے اس کی کھال اور گوشت کو فروخت نہیں کیا جائے گا اس کی ہڈیوں کو توڑا جائے گا۔ گھر والے اس کے گوشت کو کھائیں گے اور اس میں صدقہ کریں گے اور بچہ کو اس کے خون میں نہ لتھیڑا جائے گا۔

(موطا امام مالک ص ۴۹۵۔۴۹۴' مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور)

امام مالک نے عقیقہ میں لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے ایک ایک بکری ذبح کرنے کے متعلق جو ارشاد فرمایا ہے یہ ان احادیث کے خلاف ہے جن میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کرنے کا حکم فرمایا ہے اور حضرت ابن عمر اور عروہ بن زبیر نے جو بیٹوں کی طرف سے ایک ایک بکری ذبح کی ہے وہ کسی عذر پر محمول ہے اسی طرح ہڈیاں توڑنا بھی احادیث کے خلاف ہے اور خون میں لتھیڑنا بھی احادیث کے خلاف ہے۔

عقیقہ کے متعلق احکام شرعیہ اور مسائل:

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

عقیقہ نفل ہے اگر چاہے تو کرے اور اگر چاہے تو نہ کرے' اور عقیقہ کی تعریف یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے سات دن گزرنے کے بعد ایک بکری ذبح کی جائے اور امام شافعی (بلکہ ائمہ ثلاثہ) کے نزدیک عقیقہ سنت ہے' پھر جب کوئی شخص عقیقہ کرنے کا ارادہ کرے تو لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرے' کیونکہ عقیقہ ولادت کی خوشی کے لیے مشروع کیا گیا ہے اور لڑکے کی ولادت پر زیادہ خوشی ہوتی ہے' اور اگر لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے ایک ایک بکری ذبح کی تب بھی جائز ہے کیونکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن اور حضرت حسین کی طرف سے ایک ایک بکری کو ذبح کیا تھا (سنن ابو داؤد میں اسی طرح ہے اور سنن نسائی' مصنف ابن ابی شیبہ' مصنف عبد الرزاق اور سنن بیہقی میں ہے آپ نے ان کی طرف سے دو دو بکریاں ذبح کیں اور یہی صحیح ہے) عقیقہ میں بھیڑ اور دنبہ چھ ماہ سے کم کا نہ ہو اور بکری ایک سال سے کم نہ ہو' عقیقہ کا جانور قربانی کے جانور کی طرح عیوب اور نقائص سے بری ہو کیونکہ عقیقہ بھی قربانی کی طرح شرعاً جانور کا خون بہانا ہے' اگر عقیقہ کو ساتویں دن پر موخر یا مقدم کر دیا جائے تو پھر بھی جائز ہے البتہ ساتواں دن افضل ہے' اور مستحب یہ ہے کہ اس کا گوشت ہڈیوں سے الگ کر لیں اور نیک شگون کے لیے ہڈیوں کو نہ توڑیں تاکہ اس بچہ کی ہڈیاں سلامت رہیں۔ عقیقہ کے گوشت کو خود کھائیں، کھلائیں اور صدقہ کریں۔ فصل الکراہۃ والاستحسان میں مذکور ہے کہ ولادت کے ساتویں دن عقیقہ کیا جائے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عقیقہ حق ہے۔ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بعثت کے بعد کے خود اپنا عقیقہ کیا ہے۔ عقیقہ کی دعا یہ ہے: ذبح کے وقت کہے۔

اے اللہ یہ میرے فلاں بیٹے کا عقیقہ ہے اس جانور کا خون میرے بیٹے کے خون کے عوض ہے اور اس کا گوشت اس کے گوشت کے عوض ہے اس کی ہڈیاں اس کی ہڈیاں کے عوض ہیں اس کی کھال اس کی کھال کے عوض ہے اس کے بال اس کے بال کے عوض ہیں۔ اے اللہ! اس جانور کو میرے بیٹے کی جہنم سے آزادی کا فدیہ بنا دے۔

عقیقہ کی ہڈیوں کو توڑا نہ جائے اور اس کی ران دائی کو دی جائے اور گوشت پکا لیا جائے اور بچہ کے سر کو اس کے خون میں لتھیڑنا مکروہ ہے۔

(العقود الدریۃ ج ۲ ص ۲۳۳۔۲۳۲ مطبوعہ دار الاشاعۃ العربیہ کوئٹہ)

عقیقہ ولادت کے ساتویں روز سنت ہے اور یہی افضل ہے ورنہ چودھویں اکیسویں دن اور خصی جانور اور قربانی میں افضل ہے اور عقیقہ کا گوشت آباء و اجداد بھی کھا سکتے ہیں۔ مثل قربانی اس میں بھی تین حصہ کرنا مستحب ہے اور اس کی ہڈی توڑنے میں علماء تفاولاً نہ توڑنا بہتر جانتے ہیں۔ پسر کے عقیقہ میں دو جانور درکار ہیں اور یہی کافی ہے اگرچہ خصی نہ ہو۔

نیز فرماتے ہیں:

باپ اگر حاضر اور ذبح پر قادر ہو تو اسی کا ذبح کرنا بہتر ہے کہ یہ شکر نعمت ہے جس پر نعمت ہوئی وہی اپنے ہاتھ سے شکر ادا کرے وہ نہ ہو یا ذبح نہ کر سکے تو دوسرے کو قائم کرے یا کیا جائے اور ذبح کرے وہی دعا پڑھے۔ عقیقہ پسر میں کہ باپ ذبح کرے دعا یوں پڑھے:

اللھم ھذہ عقیقۃ ابنی فلان (فلاں کی جگہ بیٹے کا نام لے) دمھا بدمہ ولحمھا بلحمہ وعظمھا بعظمہ وجلدھا بجلدہ وشعرھا بشعرہ اللھم اجعلھا فداء لابنی من النار بسم اللہ اللہ اکبر۔

فلاں کی جگہ پسر کا جو نام رکھنا ہو لے۔ دختر ہو تو دونوں جگہ ابنی کی جگہ بنتی اور پانچوں جگہ کی جگہ پاک ہے اور دوسرا شخص ذبح کرے تو دونوں جگہ ابنی فلاں یا بنتی فلاں کی جگہ فلاں بن فلاں یا فلانہ بنت فلاں کہے بچہ کو اس کے باپ کی طرف نسبت کرے۔ ہڈیاں توڑنے میں حرج نہیں اور نہ توڑنا بہتر اور دفن کر دینا افضل۔ عقیقہ ساتویں دن افضل ہے نہ ہو سکے تو چودھویں ورنہ اکیسویں۔ ورنہ زندگی بھر میں جب کبھی ہو۔ وقت دن کا ہو رات کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ کم سے کم ایک تو ہے ہی اور پسر کے لیے دو افضل ہیں استطاعت نہ ہو تو ایک بھی کافی ہے گوشت بنانے کی اجرت داموں میں مجرا کر سکتا ہے۔ سری پائے خود کھائے خواہ اقرباء یا مساکین جسے چاہے خواہ سب حجام یا سب سقا کو دے دے۔ شرع مطہر نے ان کا کوئی خاص حق مقرر نہ فرمایا۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۸ ص ۵۴۲۔۵۴۱ مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

نذر کے بعض احکام اور ماں کی اولاد پر ولایت:

علامہ ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

عمران کی بیوی حنہ نے اپنے پیٹ کے بچہ کو بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی جو نذر مانی تھی اس طرح کی نذر ماننا ہماری شریعت میں بھی صحیح ہے مثلاً انسان یہ نذر مانے کہ وہ اپنے چھوٹے بیٹے کی پرورش اور تربیت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت میں کرائے گا اور اس کے سوا اس کو اور کسی کام میں مشغول نہیں رکھے گا اور اس کو قرآن مجید احادیث فقہ اور دیگر علوم دینیہ کی تعلیم دے گا یہ نذر صحیح ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی عبادت ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نذر سے کوئی چیز واجب

ہو جاتی ہے اور جس عبادت کی نذر مانی جائے اس کا پورا کرنا واجب ہے اور یہ کہ نذر پورا کرنے کا تعلق مستقبل کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ کہ کسی مجہول چیز کی نذر ماننا جائز ہے کیونکہ حنہ نے اپنے پیٹ کے بچہ کی نذر مانی تھی اور ان کو معلوم نہیں تھا کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ماں کو بھی اپنی اولاد پر ایک قسم کی ولایت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی تادیب، تعلیم اور تربیت کا حق رکھتی ہے اگر وہ اس کی مالک نہ ہوتی تو اپنی اولاد میں اس کی نذر نہ مانتی، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ماں کو بھی بچہ کا نام رکھنے کا حق ہے اور اس کا رکھا ہوا نام صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو اس کے رب نے اس کو اچھی طرح قبول کر لیا یعنی حنہ نے مریم کو بیت المقدس کی عبادت کے لیے وقف کرنے کی جو اخلاص کے ساتھ نذر مانی تھی اس کو قبول کر لیا۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۱۱، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

انبیاءٔ کرام کے مراتب

سورۃ البقرۃ: آیت 253

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

''یہ رسول ہیں جن میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے (۱) ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات چیت کی ہے اور بعض کے درجے بلند کئے ہیں، اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے اور روح القدس سے ان کی تائید کی (۲) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے بعد والے اپنے پاس دلیلیں آجانے کے بعد ہرگز آپس میں لڑائی بھڑائی نہ کرتے، لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، ان میں سے بعض تو مومن ہوئے اور بعض کافر، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے (۳) لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔

رسولوں کی باہمی فضیلت:

اس سورت میں متعدد نبیوں اور رسولوں کا ذکر ہے، مثلاً حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت شموئیل، حضرت حزقیل، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، اور حضرت عیسیٰ علیہم وعلی نبینا سیدنا محمد الصلوۃ والسلام اس لیے پڑھنے

والے کے ذہن میں یہ تجسس پیدا ہوگا کہ آیا یہ تمام نبی اور رسول درجہ اور مرتبہ میں برابر ہیں یا ان میں درجات اور مراتب کا فرق ہے؟ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ان سب رسولوں (میں سے) ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے یعنی بعض رسولوں کو ایسی خصوصیات اور فضیلتیں عطا فرمائی ہیں جو دوسرے بعض رسولوں کو عطا نہیں فرمائیں اور چونکہ اس سورت کا اکثر حصہ بنو اسرائیل کے احوال پر مشتمل تھا اور ان میں زیادہ تر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے متبع تھے اور ان کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پیروکار تھے کیونکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بنو اسرائیل کے آخری نبی تھے اس لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کی فضیلتوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کہ ہم نے بعض کو کلام سے سرفراز فرمایا' یعنی ان سے بلاواسطہ کلام فرمایا' ان سے حضرت آدم (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مراد ہیں' اس کے بعد فرمایا: اور بعض کو (بے شمار درجوں کی) بلندی عطا فرمائی' اس سے مراد سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اللہ تعالیٰ نے یہاں صراحۃً آپ کا نام نہیں کیونکہ غیر متناہی درجات کے ساتھ آپ کا مخصوص ہونا اس قدر مشہور اور معروف ہے کہ آپ کا صراحۃً ذکر نہ کیا جائے پھر بھی ذہن آپ کے سوا اور کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا' اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ آپ کو درجات کی بلندی عطا کی ہے' یہ نہیں بیان فرمایا کہ کتنے درجات کی بلندی عطا فرمائی ہے کیونکہ عالم اعداد میں کوئی عدد ایسا ہے ہی نہیں جو آپ کے تمام درجات کو بیان کرسکے اور کسی عدد کا ذکر نہ فرما کر اس پر متنبہ کیا ہے کہ آپ کے درجات کا کوئی شمار نہیں نہ ان کی کوئی حد ہے' کہ آپ رحمت للعالمین اور خاتم النبیین ہیں' لواء حمد کے حامل اور مقام محمود پر فائز ہیں' تمام سابقہ شریعتوں کے ناسخ ہیں' کوثر و سلسبیل کے ساقی ہیں' عالم میثاق میں تمام انبیاء اور مرسلین سے آپ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا' آپ تمام انبیاء اور مرسلین کے قائد ہیں' شب معراج اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دیدار سے مشرف فرمایا' روز حشر تمام اہل محشر کو آپ کی شفاعت کی احتیاج ہوگی' آپ کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی گئی ہے' کائنات اللہ کو راضی کرتی ہے اور اللہ آپ کو راضی فرماتا ہے' اور ایسے بہت سے فضائل اور خصائص ہیں جو صرف آپ ہی کو حاصل ہیں' یہ اجمالی ذکر ہے اور ان شاء اللہ ہم اس کو تفصیل سے بھی بیان کریں گے' اس کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا علیحدہ ذکر فرمایا کیونکہ ان کے معجزات زیادہ تر حسی تھے' مثلاً مردوں کو زندہ کرنا' مادر زاد اندھوں کو بینا کرنا اور برص اور کوڑھ کے مریضوں کو تندرست کرنا وغیرہ' پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح نشانیاں آنے کے بعد آپس میں قتال نہ کرتے لیکن انھوں نے اختلاف کیا۔ (البقرہ: ۲۵۳)

بعض کفار عرب کے اسلام نہ لانے پر آپ کو تسلی دینا:

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سابقہ امتوں کی خبر دی ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم نے واضح دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود کہا: ہمیں اللہ تعالیٰ کو ظاہر باہر دکھاؤ' اور ہمارے لیے ایک معبود بنا دو جیسے ان کا معبود ہے' اسی طرح حضرت عیسیٰ کی قوم نے روشن دلائل اور معجزات مثلاً مردوں کو زندہ کرنا اور کوڑھیوں کو تندرست کرنا دیکھا' اس کے باوجود انھوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی تکذیب کی اور ان کو قتل کرنے کے درپے ہوئے اب آپ کو یہ بتایا جارہا ہے کہ آپ بھی سابقہ رسولوں کی طرح ایک رسول ہیں تو اگر آپ کے دلائل اور معجزات پیش کرنے کے باوجود آپ کی قوم کے بعض لوگ آپ کی تکذیب کررہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے:

(آیت) "وان یکذبوك فقد کذبت قبلهم قوم نوح وعاد وثمود۔ وقوم ابرهیم وقوم لوط۔ واصحب مدین، و کذب موسیٰ"۔ (الحج: ۴۲-۴۴)

ترجمہ: اور اگر یہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں (تو آپ پریشان نہ ہوں) سو ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور عاد نے اور ثمود نے تکذیب کی تھی۔ اور ابراہیم کی قوم نے اور لوط کی قوم نے۔ اور اصحاب مدین نے (بھی تکذیب کی تھی) اور موسیٰ کی تکذیب کی گئی۔

نیز فرمایا:

(آیت) "فان کذبوك فقد کذب رسل من قبلك جآء و بالبینت والزبر والکتب المنیر"۔۔ (آل عمران: ۱۸۴)

ترجمہ: اگر یہ آپ کی تکذیب کریں (تو غم نہ کریں) آپ سے پہلے رسولوں کی بھی تکذیب کی گئی ہے جو واضح دلائل آسمانی صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے۔۔

اور اگر اللہ چاہتا تو نہ وہ لوگ اختلاف کرتے اور نہ آپ کی قوم کے بعض لوگ مخالف ہوتے' اور اللہ تعالیٰ ان سب کو جبراً مسلمان کر دیتا اور دنیا میں کبھی کوئی شخص کسی نبی کا مخالف اور کافر نہ ہوتا لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے خلاف ہے' اس نے انسان کو حریت فکر اور سوچ و بچار کی آزادی عطا کی ہے' اس نے کفر اور ایمان اور ہدایت اور گمراہی کے راستے پیدا کیے شیطان کو پیدا کیا جو انسان کو کفر اور گمراہی کی طرف بلاتا ہے اور انبیاء اور رسل مبعوث فرمائے جو اس کو ایمان اور ہدایت کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کو عقل سلیم عطا کی' سچ اور جھوٹ اور کھرے اور کھوٹے کو پرکھنے کا شعور دیا' اب وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ انبیاء اور رسل کی دعوت پر کتنے لوگ صراط مستقیم کو اختیار کرتے ہیں اور شیطان کے بہکانے میں آکر کتنے لوگ کفر اور گمراہی کو اختیار کرتے ہیں' اس لیے فرمایا: لیکن انھوں نے اختلاف کیا' سو ان میں سے کوئی ایمان لے آیا اور کسی نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں قتال نہ کرتے لیکن اللہ وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔

اب ہم قرآن مجید اور احادیث صحیحہ مشہورہ سے بیان کریں گے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں۔

فنقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

"رحمۃ للعلمین" ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا"۔

(۱) (آیت) "وما ارسلنك الا رحمۃ للعلمین"۔۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی تو بھیجا ہے"۔

آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں اور اپنے وجود اور بقاء میں ہر چیز کو رحمت کی ضرورت ہے تو ساری کائنات آپ کی محتاج ہوئی اور محتاج الیہ محتاج سے افضل ہوتا ہے اس لیے آپ ساری کائنات سے افضل قرار پائے اور یہ اس کو متلزم ہے کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے بھی افضل ہوں' آپ سے پہلے جو نبی آئے ان کی قوموں نے ان کی تکذیب کی تو ان قوموں پر عذاب آیا' جب آپ کی قوم کے کافروں نے آپ کی تکذیب کی اور عذاب کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم"۔ (الانفال: ۳۳)

ترجمہ: اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ آپ کے ہوتے ہوئے ان کافروں کو عذاب دے۔

انبیاء سابقین کے آنے کے بعد کافروں سے عذاب ٹل نہیں سکتا تھا اور آپ کے آنے کے بعد عذاب آ نہیں سکتا تھا۔

تمام نبیوں اور رسولوں کے نبی ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا"۔

(آیت) " واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اتیتکم من کتب و حکمۃ ثم جآء کم رسول مصدق لما معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ قالء اقررتم واخذتم علی ذلکم اصری قالوا اقررنا، قال فاشھدوا وانا معکم من الشھدین، فمن تولی بعد ذلک فاولیک ھم الفسقون"۔۔ (آل عمران: ۸۲۔۸۱)

ترجمہ: اور یاد کیجئے جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ میں تم کو جو کتاب اور حکمت دوں' پھر تمہارے پاس ایک عظیم رسول آجائے جو اس (کتاب اور حکمت) کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے' تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا' فرمایا: کیا تم نے اس کا اقرار کرلیا اور اس پر میرے بھاری عہد کو قبول کرلیا؟ ان سب نے کہا: ہم نے اقرار کیا' فرمایا: سو گواہ ہوجاؤ اور میں خود تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں' پھر اس عہد کے بعد جو اس سے پھرا تو وہی لوگ نافرمان (فاسق) ہیں۔۔

اس آیت سے واضح ہوا کہ انبیاء سابقین میں سے جس نبی کے زمانہ میں بھی آپ مبعوث ہوجاتے' اس نبی پر لازم ہوتا کہ وہ آپ پر ایمان لائے۔

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کے بعد جس نبی کو بھی بھیجا اس سے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے متعلق یہ عہد لیا کہ اگر اس نبی کی زندگی میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مبعوث ہوجائیں تو وہ ضرور ضرور ان پر ایمان لائے اور ضرور ضرور ان کی نصرت کرے اور اپنی قوم کو بھی ان پر ایمان لانے کا حکم دے۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۲۳۶' مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت' ۱۴۰۹ ھ)

امام ابن ابی شیبہ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عمر (رض) سے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو میری پیروی کے سوا ان کے لیے اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

(المصنف ج ۹ ص ۴۷ مطبوعہ ادارۃ القرآن' کراچی' ۱۴۰۶ ھ)

اس حدیث کو امام بغوی نے بھی روایت کیا ہے۔

(شرح السنۃ ج ۳ ص ۲۱۹' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت' ۱۴۱۲ ھ)

امام ابویعلی روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: خدا کی قسم: اگر موسیٰ تمہارے زمانہ میں زندہ ہوتے تو ان کے لیے میرے سوا کسی کی پیروی کرنا جائز نہ ہوتا۔

(مسند ابویعلی ج ۲ ص ۲۴۷' مطبوعہ دارالمامون تراث بیروت' ۱۴۰۴ ھ)

امام احمد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۳۳۸، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

حافظ الہیثمی۔ ۱ (حافظ نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ، مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۷٤، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت،

اور حافظ سیوطی۔ ۲ (حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، درمنثور ج ۲ ص ٤۸، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران) نے بھی اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء اور رسل حکما اور تقدیرا ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت ہیں اور نبی امت سے افضل ہوتا ہے اس سے واضح ہوا کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں۔

تمام نبیوں اور رسولوں کو عالم میثاق میں کیے ہوئے اس عہد کو پورا کرنے کا انتظار تھا اسی لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا کی:

(آیت) "۔ ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم ایتك ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویز کیھم انك انت العزیز الحکیم "۔۔ (البقرہ: ۱۲۹)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ان میں ایک عظیم رسول بھیج دے جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی باطنی اصلاح کرے، بیشک تو ہی بڑا غالب اور بہت حکمت والا ہے۔۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے آپ کے آنے کی بشارت دی:

(آیت) "۔ واذقال عیسیٰ ابن مریم یبنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقالما بین یدی من التورۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد"۔ الصف: ٦)

ترجمہ: اور یاد کیجئے جب عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے بنو اسرائیل! بیشک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں مجھ سے پہلی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا ہوں اور اس عظیم رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام نامی احمد ہے۔

امام احمد اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عرباض بن ساریہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور بیشک (اس وقت) آدم اپنی مٹی میں تھے اور عنقریب میں تم کو اپنی ابتداء کے متعلق بتاؤں گا، میں ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ کی بشارت ہوں اور میں اپنی ماں کا خواب ہوں جو انھوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا اور بیشک ان سے ایک نور نکلا جس سے (ملک) شام کے محلات روشن ہو گئے۔

۳۔ (امام احمد بن حنبل متوفی ۲٤۱ھ، مسند احمد ج ٤ ص ۱۲۷،۱۲۸، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ)

اس حدیث کو امام طبرانی۔ ۱

(امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳٦۰ھ، معجم کبیر ج ۱۸ ص ۲۵۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام بزار۔ ۲

(امام احمد بن عمرو بن عبد الخالق البزار المتوفی ۲۹۲ھ، کشف الاستار عن زوائد البزار ج ٤ ص ۱۱۳، مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ، بیروت)

امام ابن حبان ۔۳

(امام ابو حاتم محمد بن حبان بسی متوفی ۳۵۴ھ موارد الظمآن ص ۵۱۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

امام ابو نعیم ۔۴

(امام ابو نعیم بن عبداللہ اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ حلیۃ الاولیاء ج ۶ ص ۸۹ مطبوعہ دار الکتب العربی ۱۴۰۷ھ)

امام حاکم ۔۵

(امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵، المستدرک ج ۲ ص ۶۰۰، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ)

امام بیہقی ۔۶

(امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۱۳۰ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

اور امام بغوی ۷۔

(امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ شرح السنۃ ج ۷ ص ۱۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۲ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔ امام ذہبی نے لکھا ہیں اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ ۸ (علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ تلخیص المستدرک ج ۲ ص ۶۰۰، مطبوعہ مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ)

تمام انبیاء کے اوصاف اور کمالات کے جامع ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

(آیت) "اولئك الذين هدى الله فبهدهم اقتده"۔ (الانعام: ۹۰)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے، سو آپ بھی ان کے طریقہ پر چلیں۔

اس آیت میں عقائد اور اصول مراد نہیں ہیں کیونکہ عقائد اور اصول میں تقلید جائز نہیں ہے اور نہ فروع اور اعمال مراد ہیں کیونکہ آپ کی شریعت تمام شرائع سابقہ کے لیے ناسخ ہے، سو اس سے مراد یہ ہے کہ آپ محاسن اخلاق میں تمام انبیاء (علیہم السلام) کی پیروی کیجئے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمام اوصاف حمیدہ اور تمام اخلاق حسنہ جو تمام انبیاء (علیہم السلام) میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے آپ ان تمام اوصاف اور اخلاق کے جامع ہیں، گویا آپ کی صفات کو پھیلاؤ تو کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی صفات ہیں اور کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی صفات کو سمیٹو تو وہ تنہا آپ کی صفات ہیں، آپ کی ذات بہ منزلہ متن ہے اور انبیاء بہ منزلہ شرح ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) "وانك لعلى خلق عظيم"۔۔ (القلم: ۴)

ترجمہ: اور بیشک آپ ضرور خلق عظیم پر فائز ہیں۔۔

علی کا لفظ استعلاء اور تفوق کے لیے آتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص سواری پر سوار ہے، سو آپ بہ منزلہ سوار ہیں اور خلق عظیم بہ منزلہ سواری ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ دوسرے لوگ نیک ہونے میں نیکی کے تابع ہوتے ہیں اور یہاں نیکی آپ کے تابع ہے، آپ جس کام کو کرلیں وہ اچھا ہے اور جس سے منع فرمادیں وہ برا ہے، خلق عظیم کی باگیں آپ کے ہاتھ میں ہیں، آپ جس طرف ان کا رخ موڑ دیں عظمتیں وہیں ہیں آپ عظمتوں کے تابع نہیں، عظمتیں اپنے عظیم ہونے میں آپ کے تابع ہیں:

(آیت) "وما اتكم الرسول فخذوه وما نهكم عنه فانتهوا" (الحشر: ۷)

ترجمہ: اور رسول تمہیں جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس سے منع فرمائیں اس سے باز رہو۔

(آیت) "یکادزیتھا یضیء ولو لم تمسسه نار نور علی نور"۔ (النور: ۳۵)

ترجمہ: قریب ہے کہ (آپ کی نبوت کا) تیل خود ہی روشن ہو جائے گا خواہ اسے (وحی کی) آگ نہ چھوئے (نزول وحی کے بعد) وہ نور علی نور ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

قریب ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی استعداد کا تیل اپنی صفائی اور زکاوت کی وجہ سے خود ہی روشن ہو جاتا، خواہ اس کو نور قرآن نے نہ چھوا ہوتا۔ امام بغوی نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے کہ قریب ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے محاسن لوگوں کے سامنے وحی سے پہلے ظاہر ہو جاتے۔

(روح المعانی ج ۱۸ ص ۱۷۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

قاضی عیاض لکھتے ہیں: قریب ہے کہ اس تیل کی طرح سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت لوگوں پر آپ کے دعوی نبوت سے پہلے ہی ظاہر ہو جاتی۔

(الشفاء ج ۱ ص ۱۱، مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان)

علامہ شہاب الدین خفاجی نے لکھا ہے:

اس آیت میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کو اس تیل سے تشبیہ دی گئی ہے جو از خود روشن ہو جاتا ہے۔

(نسیم الریاض ج ۱ ص ۱۱۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

ملا علی قاری نے لکھا ہے: کیونکہ آپ کا ظاہر اور باطن صاف تھا، آپ میں نبوت اور رسالت مجتمع تھی، آپ میں انوار الہیہ بہت قوی تھے اور آپ انوار صمدیہ کے مظہر تھے اور آپ ایسے کامل تھے کہ اگر آپ دعوی نبوت نہ کرتے پھر بھی لوگوں پر آپ کی نبوت ظاہر ہو جاتی۔

(شرح الشفاء علی ہامش نسیم الریاض ج ۱ ص ۱۱۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ (رض) سے پوچھا: یا ام المومنین! مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلق کے متعلق بتایئے؟ آپ نے فرمایا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خلق قرآن تھا۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۵۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام بخاری۔ ۱

(امام محمد اسماعیل بخاری (رح) متوفی ۲۵۶ھ الادب المفرد ص ۸۷۔ ۸۶ مطبوعہ مکتبہ اثریہ سانگلہ ہل)

امام ابو داؤد۔ ۲

(امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ، سنن ابو داؤد ج ۱ ص ۱۹۰۔ ۱۸۹، مطبوعہ مطبع مجتبائی، پاکستان، لاہور ۱۴۰۵ھ)

امام نسائی۔ ۳

(امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۲ھ'سنن نسائی ج ۱ص ۲۳۷مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

امام ابن ماجہ ٤

(امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ'سنن ابن ماجہ ص ۱٦۸ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

امام احمد۔ ٥

(امام احمد بن حنبل متوفی ۲٤۱ھ'مسند احمد ج ٦ ص ۲۱٦،۔ ۱۸۸۔ ۱۱۱۔ ۹۱۔ ٥٤ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ)

امام دارمی۔ ٦

(امام عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی متوفی ۲۰۰ھ'سنن دارمی ج ۱ص ۲۸٤'مطبوعہ نشر السنۃ'ملتان۔)

اور امام بیہقی۔ ۷

(امام احمد بن حسین بیہقی متوفی ٤٥۸ھ'دلائل النبوۃ ج ۱ص ۳۱۰'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ'بیروت) نے روایت کیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خصائل اور شمائل کی جامع عبارت قرآن مجید ہے۔

امام مالک نے فرمایا: ہمیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے حسن اخلاق کو مکمل کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

(موطا امام مالک ص ۷۰۰'مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان'لاہور)

امام بغوی روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارم اخلاق کو تمام تک پہنچانے اور محاسن افعال کو کمال تک پہنچانے کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔

(شرح السنۃ ج ۷ ص ۱۰۔ ۹'مطبوعہ دار الکتب العلمیہ'بیروت'۱٤۱۲ھ)

ان احادیث سے واضح ہوگیا کہ آپ سے پہلے کوئی نبی اور رسول مکارم اخلاق اور محاسن افعال کا جامع نہیں تھا' حضرت داؤد اور سلیمان نے شاہی کی زندگی گزاری اس میں فقر کا نمونہ نہیں ہے' حضرت یحییٰ اور عیسیٰ نے تجرد کی زندگی گزاری اس میں ازدواجی زندگی اور عائلی حیات کا نمونہ نہیں ہے' ایسی کامل زندگی جو انسانیت کے ہر شعبہ پر محیط ہو وہ صرف آپ کی زندگی ہے۔ آپ نے بکریاں چرائیں' گڈریوں اور چرواہوں کو اعزاز بخشا' دودھ دوہا' گوالوں کی عزت افزائی کی' جوتی مرمت کرلی' موچیوں کا مقام اونچا کیا' پھٹے ہوئے کپڑے سی لیے' خندقیں کھودیں' تجارت ہو' صنعت وحرفت ہو' حکومت کا کوئی شعبہ ہو' امامت ہو' خطابت ہو' سپہ سالاری ہو' ہر شعبہ میں آپ کا نمونہ ہے۔ اگر ایک حاکم فخر سے کہے کہ میں حکومت چلا کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت پر عامل ہوں تو پیوند لگے ہوئے لباس پہن کر زمین کھودنے والا مزدور بھی کہے گا کہ میں بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کا امین ہوں' سو ایسی کامل زندگی نبیوں اور رسولوں میں سے کسی نے نہیں گزاری' آپ تمام نبیوں اور رسولوں میں مکارم اخلاق اور محاسن افعال کے سب سے زیادہ جامع ہیں' اس لیے سب رسولوں میں آپ ہی سب سے افضل ہیں۔

رسالت کے عموم کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

(آیت) "وما ارسلنك الا كافة للناس بشيرا ونذيرا". (سبأ : ۲۸)

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہی بنا بھیجا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آپ قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے رسول ہیں، نیز فرمایا:

(آیت) "تبرك الذي نزل الفرقان على عبده ليكون للعلمين نذيرا". (الفرقان : ۱)

ترجمہ: وہ برکت والا ہے جس نے اپنے (مقدس) بندہ پر فیصلہ کرنے والی کتاب نازل کی تا کہ وہ تمام جہانوں کے لیے ڈرانے والے ہوں۔

اسی طرح احادیث میں بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت کا عموم اور شمول بیان کیا گیا ہے امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی (نبی) کو نہیں دی گئیں، ایک ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری کر کے میری مدد کی گئی ہے، تمام روئے زمین میرے لیے مسجد بنا دی گئی ہے اور طہارت (تیمم) کا ذریعہ بنا دی گئی ہے، سو میری امت کا جو شخص بھی نماز کا وقت پائے وہ (جہاں بھی ہو) نماز پڑھ لے، اور میرے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا اور وہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا، اور مجھے شفاعت (کبری) عطا کی گئی ہے اور ہر نبی بالخصوص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۸، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام بغوی۔ ۱

(امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ، شرح السنۃ ج ۷ ص ۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

اور امام دارمی۔ ۲

(امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی متوفی ۲۵۵ھ، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۳۹۵ھ، دار المعرفۃ بیروت"۔ نے بھی روایت کیا ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے چھ وجوہ سے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے، جوامع الکلم عطا کیے گئے، میری رعب سے مدد کی گئی میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا، تمام روئے زمین کو میرے لیے طہارت کا آلہ (تیمم) اور مسجد بنا دیا گیا، مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور مجھ پر نبوت ختم کی گئی۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

امام احمد روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوموسٰی اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں،

مجھے ہر کالے اور گورے کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور میرے لیے تمام زمین مسجد اور آلہ طہارت (تیمم) بنا دی گئی ہے۔ الحدیث
(مسند احمد ج ٤ ص ٤١٦ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ١٣٩٨ھ)

حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی صحیح ہیں۔
(مجمع الزوائد ج ٨ ص ٢٥٨ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ١٤٠٢ھ)

امام احمد نے اس حدیث کو حضرت ابو ذر (رض) سے بھی روایت کیا ہے۔
(مسند احمد ج ٤ ص ١٦٢۔ ١٦١ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ١٣٩٨ھ)

حافظ الہیثمی نے امام بزار کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر نبی بالخصوص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام جن اور انس کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں
(مجمع الزوائد ج ٨ ص ٢٥٨ مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت ١٤٠٢ھ)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت عوف بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہمیں چار ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو ہم سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں اور میں نے اپنے رب سے پانچویں چیز مانگی تو میرے رب نے وہ بھی عطا کر دی پہلے نبی کسی ایک شہر (قوم) کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور اس سے تجاوز نہیں کرتا تھا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔
(مختصر تاریخ دمشق ج ١٢ ص ١٣٤ مطبوعہ دار الفکر دمشق ١٤٠٤ھ)

اس حدیث کو امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔
(معجم کبیر ج ١١ ص ٦١۔ ٥١ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام طبرانی نے اس حدیث کو حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) سے بھی روایت کیا ہے۔
(معجم کبیر ج ١٢ ص ٢١٥ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

قرآن مجید اور بہ کثرت احادیث صحیحہ سے واضح ہوگیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام جن وانس بلکہ تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں۔ ہرنی نے آپ کا کلمہ پڑھا، درختوں نے آپ کی اطاعت کی، پتھروں نے آپ کو سلام عرض کیا اور اونٹنی آپ کے فراق میں روئی اور یہ وہ عظیم خصوصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے سوا اور کسی نبی کو عطا نہیں کی، اس سے واضح ہوا کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں۔

خاتم الانبیاء ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسول ہونا:

(آیت) "ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین"۔ (الاحزاب: ٤٠)

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے آخر۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آخر النبیین ہیں ہر نبی کی شریعت بعد میں آنے والے نبی سے منسوخ ہوتی رہی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آخر الانبیاء ہیں اور قیامت تک کے نبی ہیں اس لیے آپ کی شریعت باقی اور غیر منسوخ ہے اور اس کا لازمی تقاضا

یہ ہے کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہوں۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت جبیر بن مطعم (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میرے پانچ اسماء ہیں: میں محمد اور احمد ہوں، میں ماحی ہوں جس کے سبب سے اللہ کفر کو مٹاتا ہے، میں حاشر ہوں لوگ میرے قدموں میں جمع کیے جائیں گے اور میں عاقب (آخری نبی) ہوں۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۱، ج ۲ ص ۷۲۷، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت جبیر بن مطعم (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں محمد اور احمد ہوں، میں ماحی ہوں جس کے سبب سے اللہ کفر کو مٹاتا ہے، میں حاشر ہوں میری ایڑیوں پر لوگ جمع کیے جائیں گے اور میں عاقب ہوں اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۶۱، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث کو امام ترمذی۔ ۱

(امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، جامع ترمذی ص ۵۹۷ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اور امام بغوی۔ ۲

(امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ، شرح السنۃ ج ۷ ص ۱۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے نبیوں کی مثال ایسے ہے جیسے کسی شخص نے بہت حسین وجمیل گھر بنایا لیکن اس کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ باقی ہو، لوگ اس گھر کے گرد طواف کریں اور تعجب کریں اور کہیں کہ کیوں نہ یہ ایک اینٹ بھی رکھ دی گئی تو میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ ۳

(امام محمد اسماعیل بخاری (رح) متوفی ۲۵۶ھ صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۰۱، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۴۸، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بنواسرائیل کے انبیاء ان کا سیاسی نظام چلاتے تھے، جب بھی کوئی نبی فوت ہوتا تو دوسرا نبی اس کا خلیفہ ہوجاتا اور بیشک میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۱، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم۔ ۴

(امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۲۶، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

اور امام احمد۔ ٥

(امام احمد بن حنبل متوفی ۲٤۱ھ، مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۷، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تبوک کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت علی کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا، حضرت علی نے کہا: آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے فرمایا: کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے: مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ٦۳۲، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم۔ ۱

(امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲٦۱ھ، صحیح مسلم ج ۲ ص ٤۷۸، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷٥ھ)

امام ترمذی۔ ۲

(امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، جامع ترمذی ص ٥۳٥۔ ٥۳٤ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

امام ابن ماجہ۔ ۳

(امام ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ، سنن ابن ماجہ ص ۱۲ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

امام احمد۔ ٤

(امام احمد بن حنبل متوفی ۲٤۱ھ، مسند احمد ج ۱ ص ۱۸۳، ۱۸۲۔ ۱۷۷، ج ۳ ص ۲۳۸۔ ۲۲، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ)

اور امام ابن حبان۔ ٥

(امام ابو حاتم محمد بن حبان البستی متوفی ۳٥٤ھ، الاحسان بہ ترتیب صحیح ابن حبان ج ۱۰ ص ٤۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱٤۹۷ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میرے بعد رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی ہے، سو میرے بعد کوئی رسول ہوگا نہ نبی۔ ٦

(امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، جامع ترمذی ص ۲۳۱ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اس حدیث کو امام احمد۔ ۷

(امام احمد بن حنبل متوفی ۲٤۱ھ، مسند احمد ج ۳ ص ۲٦۷، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ)

امام حاکم۔ ۸

(امام ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری متوفی ٤۰٥، المستدرک ج ٤ ص ۳۹۱، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ)

امام ابن ابی شیبہ۔ ۹

(امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳٥ھ، المصنف ج ۱۱ ص ٥۳، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱٤۰٦ھ) نے بھی روایت کیا ہے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ثوبان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تک میری امت کے قبائل مشرکین کے ساتھ لاحق نہ ہوں' اور جب تک بتوں کی عبادت نہ کی جائے اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی' اور عنقریب میری امت میں تیس کذاب ہوں گے جن میں ہر ایک نبوت کا دعوی کرے گا حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

(جامع ترمذی ص ۳۲۳ 'مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام ابوداؤد۔ ۱۰

(امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ 'سنن ابوداؤد ج ۲ ص ۲۲۸ مطبوعہ مطبع مجتبائی' پاکستان' لاہور ۱۴۰۵ھ)

امام احمد۔ ۱۱

(امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۸، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ)

اور امام بیہقی۔ ۱۲

(امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ دلائل النبوۃ ج ۶ ص ۴۸۱ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت) نے بھی روایت کیا ہے۔

کثرت معجزات کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

(آیت) "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون"۔ (الحجر: ۹)

ترجمہ: بیشک ہم ہی نے قرآن نازل کیا اور بیشک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

(آیت) "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ"۔ (حم السجدہ: ۴۲)

ترجمہ: اس قرآن مجید میں سامنے سے باطل آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔

پہلی آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی آیت بلکہ کسی حرف کی کمی نہیں ہوسکتی اور دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی حرف کی کمی نہیں ہوسکتی اور دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی حرف کا اضافہ نہیں ہوسکتا' غرض قرآن مجید کے یہ دو دعوے ہیں اس میں کمی ہوسکتی ہے نہ زیادتی ہوسکتی ہے اور تیسرا دعوی یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن مجید کی کسی سورت بلکہ کسی آیت کی بھی نظیر اور مثیل نہیں لاسکتا:

(آیت) "وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ، (البقرہ: ۲۳)

ترجمہ: اور ہم نے جو اپنے (مقدس) بندے پر کلام نازل کیا ہے اگر تم اس کے (منزل من اللہ ہونے کے) متعلق شک میں ہو تو اس (کلام) کی مثل کوئی سورت لے آؤ۔

(آیت) "فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صدقین"۔ (الطور: ۳۴)

ترجمہ: اگر وہ سچے ہیں تو اس قرآن جیسی کوئی آیت لے آئیں۔

قرآن مجید کی چھ ہزار سے زیادہ آیتیں ہیں اور ہر آیت میں قرآن مجید کی حقانیت اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کی صداقت پر تین دلیلیں ہیں:

(۱) قرآن مجید میں زیادتی نہیں ہو سکتی۔
(۲) قرآن مجید میں کمی نہیں ہو سکتی۔
(۳) اس کی کوئی مثل نہیں لا سکتا' اسی طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت کے صدق پر اٹھارہ ہزار سے زائد دلائل ہو گئے۔

علوم وفنون میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے اور اسلام کے مخالفین اور آپ کی رسالت کے منکرین کی تعداد بھی دن بہ دن بڑھ رہی ہے' اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ چودہ سو سال سے زیادہ گزر گئے اور اب تک کسی نے اس چیلنج کو نہیں توڑا نہ کوئی شخص قرآن مجید کی کسی آیت کی کوئی مثال لا سکا نہ اس میں کمی یا زیادتی کر سکا اگر اس چیلنج کو توڑنا کسی کے بس کی بات ہوتی تو اب تک وہ اس چیلنج کو توڑ چکا ہوتا۔

دوسرے انبیاء (علیہم السلام) کے معجزات مثلاً لاٹھی اور اونٹنی وغیرہ اعیان وجواہر کے قبیل سے تھے لیکن وہ باقی نہ رہے اور قرآن مجید اعراض اور معانی کے قبیل سے ہے اور ہنوز باقی ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بلکہ اس کے بعد تک باقی رہے گا' خلاصہ یہ ہے کہ جس قدر کثیر اور قوی دلائل نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر قائم کیے گئے وہ کسی اور نبی اور رسول کی نبوت پر قائم نہیں کیے گئے دیگر انبیاء (علیہم السلام) کی نبوت پر دلیل فانی معجزات ہیں' آپ کی نبوت پر دلیل باقی رہنے والا ' اللہ کا کلام قرآن مجید ہے۔

آپ کے دین کے ناسخ الادیان ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

اللہ تعالیٰ نے آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنی نعمت تامہ قرار دیا اور فرمایا:

(آیت) " الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا " (المائدہ: ۳)

ترجمہ: آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا۔

آپ کے دین کو ادیان سابقہ کے لیے ناسخ قرار دیا اور فرمایا:

(آیت) "ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ"۔ (آل عمران: ۸۵)

ترجمہ: اور جس شخص نے اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو طلب کیا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اور یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تمام انبیاء اور رسل پر عظیم فضیلت ہے کہ آفتاب محمدیت کے طلوع کے بعد اب کسی نبی یا رسول کی شریعت کا چراغ نہیں جلے گا' حتی کہ اگر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بھی ظاہری حیات سے زندہ ہوتے تو آپ کی پیروی کرتے اور جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا نزول ہوگا تو وہ بھی آپ کی شریعت کی پیروی کریں گے' امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس وقت تمہارا کیا مرتبہ ہوگا جب تم میں ابن مریم کا نزول ہوگا اور امام تم میں سے ہوگا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا دین تمام ادیان سے افضل ہے اس لیے ضروری ہوا کہ آپ تمام انبیاء اور رسل سے افضل ہوں۔

امت کی کثرت اور افضیلت کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

(آیت) " کنتم خیرامة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر "۔
(آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: تم ان امتوں میں سب سے بہترین امت ہو جن کو لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

آپ کی امت کے افضل ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں بھی ایمان لانے والے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی امت کو

(آیت) "یایھا الذین امنوا "۔

اے ایمان والے" کہہ کر مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مثلا یا بنی اسرائیل، کہہ کر پکارا اور یہ اس امت کی بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس کو

(آیت) "یایھا الذین امنوا "۔

سے خطاب کیا کیونکہ اس پر ایمان لانے کے تو بہت دعوی دار ہیں لیکن فضیلت ان کی ہے جن کو وہ خود

(آیت) "یایھا الذین امنوا "۔ فرمائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن جب انبیاء (علیہم السلام) کی ان کے امتی تکذیب کریں گے اور کہیں گے: ہمیں کسی نے خدا کے عذاب سے نہیں ڈرایا، اس وقت انبیاء (علیہم السلام) کی صداقت پر آپ کی امت گواہی دے گی:

(آیت) "و کذلك جعلنکم امة وسطا لتکونوا شهدآء علی الناس، (البقرہ: ۱۴۳)

ترجمہ: اور اے مسلمانو! اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تاکہ تم لوگوں (انبیاء علیہم السلام) پر گواہ ہو جاؤ۔

اور یہ امت کی کتنی بڑی فضیلت ہے کہ وہ انبیاء (علیہم السلام) کے مقدمہ میں گواہ ہو گی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کے متعلق فرمایا:

(آیت) "یبنی اسرآءیل اذکروا نعمتی "۔ (البقرہ: ۴۷)

ترجمہ: اے بنو اسرائیل! میری نعمت کو یاد کرو۔

اور آپ کی امت کے متعلق فرمایا:

(آیت) "فاذکرونی "۔ (البقرہ: ۱۵۲)

ترجمہ: تم میری ذات کو یاد کرو۔

بنو اسرائیل کی رسائی صرف اللہ کی صفت انعام تک تھی اور آپ کی امت کی رسائی اللہ کی ذات تک ہے، کیونکہ باقی امتوں کے نبیوں نے اللہ کی صفات کا مشاہدہ کیا اور آپ نے اللہ کی ذات کا مشاہدہ کیا، وہ صرف صفات کے مظہر تھے آپ عین ذات کے مظہر ہیں، اس لیے ان کی امتیں صفات کو یاد کرتی ہیں اور آپ کی امت ذات کو یاد کرتی ہے۔

امت کی وجہ سے آپ کے افضل الرسل ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی امت کی تعداد تمام امتوں کے مجموعہ سے بھی زیادہ ہے۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر نبی کو اتنے معجزات دیئے گئے جن کی مثل پر ایک بشر ایمان لے آئے اور مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام عطا فرمایا ہے اور مجھے امید ہے کہ میری امت قیامت کے دن ان سب سے زیادہ ہوگی۔ ۱

(امام محمد اسماعیل بخاری (رح) متوفی ۲۵۶ھ صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۴۴ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم۔ ۲

(امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ صحیح مسلم ج ۱ ص ۸۶، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

اور امام بغوی۔ ۳

(امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ شرح السنۃ ج ۷ ص ۵ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ)

نے بھی روایت کیا ہے۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھ پر امتیں پیش کی گئیں، میں نے ایک نبی کو دیکھا ان کے ساتھ ایک جماعت تھی، ایک اور نبی کو دیکھا ان کے ساتھ ایک اور دو آدمی تھے، ایک اور نبی کو دیکھا ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا، پھر میرے سامنے ایک عظیم جماعت بلند کی گئی، میں نے گمان کیا یہ میری امت ہوگی! مجھے بتایا کہ یہ حضرت موسیٰ کی امت ہے، البتہ آپ آسمان کے کنارے پر دیکھیں میں نے دیکھا تو ایک بہت بڑی جماعت تھی، پھر مجھ سے کہا گیا: آپ دوسرے کنارے کو دیکھیں تو وہاں بھی ایک بہت بڑی جماعت تھی، مجھ سے کہا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے اور ان کے ساتھ ستر ہزار ایسے لوگ ہیں جو جنت میں بغیر حساب اور عذاب کے داخل ہوں گے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مسلمان کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا، اے اللہ! کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے؟ اے اللہ! تو گواہ ہو جا، پھر فرمایا: کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم نصف اہل جنت ہو؟ تمہارے مقابلہ میں دوسری امتیں ایسی ہوں گی جیسے بیل میں ایک سیاہ بال ہو یا سیاہ بیل میں ایک سفید بال ہو۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۷ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

اس حدیث میں ہے کہ آپ کی امت نصف اہل جنت میں ہوگی اور دوسری حدیث میں ہے اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی، ان میں سے اسی صفیں آپ کی امت کی ہوں گی یعنی آپ کی امت کل اہل جنت کی دو تہائی ہوگی اور آپ کی امت کا کل نبیوں کی امتوں سے تعداد میں سب سے زیادہ ہونا اور مرتبہ میں سب سے افضل ہوں اس کی دلیل ہے کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں میں سب سے افضل ہیں۔

مقام محمود پر فائز ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

(آیت) "عسی ان یبعثك ربك مقاما محمودا"۔ (الاسراء: ۷۹)

عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر جلوہ کرے گا۔

مقام سے مراد وہ مقام ہے جس مقام پر فائز ہونے والے کی تمام اولین اور آخرین حمد کریں گے' جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا' اور آپ کو شفاعت کبری عطا کی جائے گی اور آپ تمام اہل محشر کی شفاعت کریں گے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے اذان سننے کے بعد یہ کہا: اے اللہ! اس دعوت تامہ اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب! محمد کو وسیلہ (جنت میں ایک بلند مقام) اور فضیلت عطا فرما اور ان کو اس مقام محمود پر فائز فرما جس کا تو نے وعدہ کیا ہے' اس شخص کیلیے میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔

(جامع ترمذی ص ۵۸' مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اور امام مسلم نے روایت کیا ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم موذن سے اذان سنو تو اذان کے کلمات کی مثل کہو' پھر مجھ پر درود پڑھو کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے' پھر میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو' وہ جنت میں ایک مقام ہے' جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک بندہ کو ملے گا اور مجھے امید (بہ معنی یقین) ہے کہ وہ بندہ میں ہوں' سو جس نے میرے لیے وسیلہ کی دعا کی اس کے حق میں میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱٦٦' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ کو کلام عطا کیا اور مجھے دیدار عطا کیا اور مجھے مقام محمود اور حوض مورود (جس حوض پر لوگ وارد ہوں گے) کی فضیلت عطا کی۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۰۸' مطبوعہ دارالفکر' دمشق' ۱۴۰۴ھ)

قرآن مجید اور ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مقام محمود صرف ہمارے نبی کریم سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو عطا ہوگا' نیز وسیلہ (جنت میں مقام بلند) بھی صرف آپ کو عطا ہوگا اور اس میں آپ کے افضل الرسل ہونے کی واضح دلیل ہے۔

اللہ کی رضا جوئی کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

(آیت) "قد نری تقلب وجهك فی السمآء فلنولینك قبلة ترضها"۔ (البقرہ ۱۴۴)

ترجمہ: بیشک ہم آپ کے رخ (انور) کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں' سو ہم آپ کو ضرور اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس پر آپ راضی ہیں۔

(آیت) "ومن اناۤیء الیل فسبح و اطراف النھار لعلك ترضی"۔۔ (طلہ:۱۳۰)
اور رات کے کچھ اوقات (مغرب اور عشاء) میں اس کی تسبیح کیجئے اور دن کے درمیان کناروں میں اس کی تسبیح کیجئے تا کہ آپ راضی ہو جائیں۔

(آیت) "ولسوف یُعْطِیكَ ربك فترضی۔ (الضحی:۵)
ترجمہ: اور عنقریب آپ کا رب آپ کو ضرور اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ (رض) نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں صرف یہی جانتی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش پوری کرنے میں بہت جلدی فرماتا ہے۔
(صحیح بخاری ج۱ص۷۶۶ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث کو امام مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔
(صحیح مسلم ج۱ص ۴۷۳، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

نیز امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مرتبہ وہ آیات تلاوت کیں جن میں حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے شفاعت کرنے کا ذکر ہے، پھر آپ نے ہاتھ بلند کیے اور روتے ہوئے فرمایا اے اللہ میری امت! میری امت! اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے جبرائیل! محمد کے پاس جاؤ حالانکہ آپ کا رب خوب جانتا تھا (پھر بھی) فرمایا: ان سے پوچھو آپ کس وجہ سے رو رہے ہیں؟ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) نے آکر آپ سے پوچھا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو بتایا کہ آپ نے کیا کہا تھا، حالانکہ اللہ خوب جانتا تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبرائیل محمد کے پاس جاؤ اور کہو: بیشک ہم آپ کو آپ کی امت کے متعلق راضی کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ نہیں ہونے دیں گے۔
(صحیح مسلم ج۱ص۱۱۳ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

تمام انبیاء اور رسل اللہ کو راضی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمارے رسول سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو راضی کرتا ہے اور یہ آپ کے افضل الرسل ہونے کی واضح دلیل ہے۔

آپ کے ذکر کی رفعت کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

(آیت) "ورفعنالك ذكرك"۔۔ (الم نشرح:۴)
اور ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر بلند کر دیا"۔۔

دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی جگہ پر سورج غروب ہو رہا ہے اور غروب آفتاب کے وقت مغرب کی اذان ہو رہی ہے، اسی طرح ہر وقت کہیں نہ کہیں فجر ہو رہی ہے اور جہاں طلوع فجر ہے وہاں فجر کی اذان ہو رہی ہے وعلی ہذا القیاس، اور اذان میں جہاں اللہ کا نام بلند کیا جا رہا ہے وہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام بھی بلند کیا جا رہا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی جگہ پر آپ کا نام بلند کیا جا رہا

ہے اور جس طرح کلمہ شہادت میں' اذان میں' اور تشہد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آپ کا نام رکھا ہے' انبیاء سابقین میں سے کسی کا نام اپنے نام کے ساتھ نہیں رکھا' نیز اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا' آپ کی بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا: فرمایا:

(آیت) "من یطع الرسول فقد اطاع الله"۔ (النساء: ۸۰)

ترجمہ: جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(آیت) "ان الذین یبایعونك انما یبایعون الله"۔ (الفتح: ۱۰)

ترجمہ: بیشک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔

نیز اللہ تعالیٰ نے آپ کی عزت کو اپنی عزت کے ساتھ مقرون کیا اور فرمایا:

(آیت) "الله ورسوله احق ان یرضوه"۔ (التوبہ: ۶۲)

اور آپ کی اجابت کو اپنی اجابت کے ساتھ مقرون کیا اور فرمایا:

(آیت) "یایها الذین امنوا استجیبوا لله وللرسول"۔ (الانفال: ۲۴)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذکر کی بلندی کا اس سے اندازہ کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عزت اور سربلندی کے مقام پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذکر کو اپنے ساتھ ذکر کیا ہے اور فرمایا:

(آیت) "ان الله وملئکته یصلون علی النبی"۔ (الاحزاب: ۵۶)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے سارے فرشتے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صلوۃ بھیجتے (رحمت بھیجتے) رہتے ہیں۔

گویا ازل سے لے کر ابد تک کوئی وقت نہیں گزرتا مگر اس وقت میں اللہ تعالیٰ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر صلوۃ بھیج رہا ہے حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ پر یوم ولادت' یوم وفات اور یوم بعثت میں صرف تین بار اللہ نے سلام نازل کرنے کا ذکر فرمایا اور نبی کریم پر زمان ومکان کی کسی قید کے بغیر اللہ تعالیٰ نے صلوۃ نازل کرنے کا ذکر فرمایا' پھر وہاں سلام کا ذکر تھا یہاں صلوۃ کا ذکر ہے' وہاں تین ایام کی قید ہے' یہاں اعداد وشمار کا ذکر نہیں ہے' نہ الوہیت کے عدم کا تصور ہے نہ آپ کے ذکر کے انقطاع کا تصور ہے۔

(آیت) "ورفعنا لك ذکرك"۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سدرۃ المنتہی پر پہنچے تو آپ نے اپنے رب سے کلام کیا' آپ نے عرض کیا: تو نے ابراہیم کو خلیل بنایا اور ان کو ملک عظیم عطا کیا اور موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا اور داؤد کو ملک عظیم عطا کیا اور ان کے لیے لوہے کو نرم کیا' اور ان کے لیے پہاڑوں کو مسخر کیا اور سلیمان کو ملک عظیم عطا کیا اور ان کے لیے پہاڑ' جن اور انسان مسخر کر دیئے اور شیطانوں اور ہوا کو ان کے لیے مسخر کر دیا' اور ان کو ایسی سلطنت عطا کی جو ان کے بعد اور کسی کو سزاوار نہ ہوگی' اور عیسیٰ کو تورات اور انجیل کا علم دیا' اور ان کو یہ حکمت دی کہ وہ برص اور کوڑھ کے مریضوں کو تندرست کرتے تھے اور تیرے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے' اور تو نے ان کو اور ان کی ماں کو شیاطین سے اپنی پناہ میں رکھا' اللہ عزوجل نے فرمایا:

میں نے آپ کو خلیل بنایا اور تورات میں لکھا ہوا ہے کہ وہ خلیل الرحمن ہیں' اور آپ کو تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنایا اور آپ

کے لیے شرح صدر کیا' اور آپ سے مشکل احکام کا بوجھ دور کیا' اور آپ کے ذکر کو بلند کیا' اور جب بھی میرا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ آپ کا ذکر کیا جاتا ہے اور آپ کی امت کو سب سے بہتر امت بنایا' اور امت وسط بنایا' اور آپ کی امت کو اول اور آخر بنایا' اور آپ کی امتوں کے دل اناجیل کی کیفیت پر بنائے اور آپ کی امت جب بھی خطبہ پڑھتی ہے تو یہ شہادت دیتی ہے کہ آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں' اور آپ کو بہ اعتبار خلقت کے اول الانبیاء اور بہ لحاظ بعثت کے آخر الانبیاء بنایا اور آپ کو عرش کے خزانہ کے نیچے سے سورۃ فاتحہ دی گئی جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی اور آپ کو فاتح اور خاتم بنایا

(دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۴۰۳۔ ۴۰۲ مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ بیروت)

آپ کے ذکر کی رفعت سے متعلق قرآن مجید کی آیات اور اس حدیث میں ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے افضل الرسل ہونے کا واضح بیان ہے۔

دنیا میں اعلان مغفرت ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

(آیت) " انا فتحنالك فتحا مبينا ، ليغفرلك الله ماتقدم من ذنبك وما تاخر ويتم نعمته عليك ويهديك صراط مستقيما ۔ وينصرك الله نصرا عزيزا ۔ (الفتح : ۳۔۱)

ترجمہ: بیشک ہم نے آپ کو روشن فتح عطا فرمائی۔ تاکہ اللہ آپ کے لیے اگلے اور پچھلے (بہ ظاہر) خلاف اولی سب کام معاف فرمادے اور آپ پر اپنی نعمت پوری کردے اور آپ کو صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھے۔ اور اللہ آپ کو غالب نصرت عطا فرمائے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر حدیبیہ سے لوٹتے وقت یہ آیت نازل ہوئی:

(آیت) "ليغفرلك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر "۔۱

(ذنب کا معنی ہے: جرم اور اثم اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے افعال پر ذنب کا اطلاق مجازا ہے کیونکہ آپ معصوم ہیں اور معصوم کا ذنب نہیں ہوتا اس لیے یہاں ذنب سے مراد ہے: بظاہر خلاف اولی کام، اب سوال یہ ہے کہ جب آپ کے گناہ نہیں ہیں تو مغفرت ذنوب کا کیا معنی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب معصوم کے ساتھ مغفرت کا تعلق ہوتا ہے' تو اس سے مراد ہوتا ہے درجات کا بلند کرنا اور اپنی رحمت سے نوازنا۔ منہ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھ پر ایک ایسی آیت نازل ہوئی ہے جو مجھے تمام روئے زمین سے زیادہ محبوب ہے' پھر آپ نے اس آیت کو صحابہ کرام (رض) کے سامنے پڑھا' صحابہ (رض) نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ کو مبارک ہو' اللہ تعالیٰ نے بیان کردیا کہ آپ کے ساتھ قیامت کے دن کیا کیا جائے گا' لیکن ہمارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان جنات میں داخل کرے گا جن کے نیچے دریا بہتے ہیں۔ آپ نے یہ آیت "فوزا عظیما" تک تلاوت فرمائی۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(جامع ترمذی ص' ۴۶۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

اس حدیث کو امام بخاری۔ ۱

(امام محمد اسماعیل بخاری (رح) متوفی ۲۵٦ھ صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۱۹ ۔ ٦۰۰، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

اور امام مسلم۔ ۲

(امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲٦۱ھ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰٦، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

نے بھی روایت کیا ہے؛

امام بخاری نے حضرت انس (رض) سے ایک طویل حدیث روایت کی۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع فرمائے گا، لوگ کہیں گے: کاش! ہم اپنے رب کے حضور شفاعت طلب کرتے ہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس جگہ ہم کو راحت عطا فرماتا، پھر وہ حضرت آدم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی (پسندیدہ) روح پھونکی اور فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا اور انھوں نے آپ کو سجدہ کیا، آپ ہمارے رب کے حضور ہماری شفاعت کیجئے، حضرت آدم فرمائیں گے: میں تمہارا کام نہیں کرسکتا، اور اپنی (اجتہادی) خطاء یاد کریں گے، تم نوح کے پاس جاؤ (اخیر حدیث تک) پھر لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس جائیں گے، وہ کہیں گے کہ میں تمہارا کام نہیں کرسکتا، تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ، ان کے اگلے اور پچھلے ذنب (یعنی بظاہر خلاف اولیٰ کاموں) کی مغفرت کر دی گئی ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۷۱، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے ایک طویل روایت میں ذکر کیا ہے کہ جب لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس جائیں گے تو وہ فرمائیں گے:

میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ پھر لوگ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں اور تمام انبیاء کے خاتم ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے ذنب (یعنی خلاف اولیٰ کاموں) کو بخش دیا ہے، اپنے رب کے پاس ہماری شفاعت کیجئے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۱۱ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۵ھ) امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (جامع ترمذی ص ۳۵۱ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں:

امام بزار نے سند جید کے ساتھ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے انبیاء (سابقین) پر چھ وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے، مجھ سے پہلے کسی کو وہ فضیلتیں نہیں دی گئیں میرے اگلے اور پچھلے ذنب (یعنی خلاف اولیٰ کاموں) کی مغفرت کر دی گئی، میرے لیے غنیمتوں کو حلال کر دیا گیا، میری امت کو سب سے بہتر امت قرار دیا گیا، تمام روئے زمین کو میرے لیے مسجد بنا دیا گیا اور اس سے تیمم کو جائز کر دیا گیا مجھے کوثر عطا کی گئی اور میری رعب سے مدد کی گئی، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! تمہارے نبی کے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور آدم اور ان کے ماسوا سب قیامت کے دن اس جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔

(خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۹۲، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد)

حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو "کشف الاستار" ۱ (حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ کشف الاستار ج ۳ ص ۱۴۷ مطبوعہ موسسۃ الرسالہ بیروت ۱۴۰۴) میں امام بزار کی سند سے روایت کیا ہے اور "مجمع الزوائد" ۔۲ (حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۶۹، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت ۱۴۰۲) میں ان کے حوالہ سے درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام بزار کی سند جید ہے۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: پھر مجھے السدرۃ المنتہی کی بلندی پر لے جایا گیا اس کا ہر پتا اتنا بڑا تھا کہ وہ اس امت کو چھپا لیتا اس کے نیچے سے ایک چشمہ جاری تھا جس کا نام سلسبیل تھا اور اس سے دو دریا نکلے تھے ایک کوثر اور ایک رحمت میں نے اس میں غسل کیا، پھر میرے اگلے اور پچھلے ذنب کی مغفرت کر دی گئی۔

(دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۲۹۴ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے کچھ چیزیں دی گئی ہیں جن کا میں فخر سے ذکر نہیں کرتا، وہ مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں میرے اگلے اور پچھلے ذنب کی مغفرت کر دی گئی ہے اور میری امت کو سب امتوں سے بہتر بنایا گیا ہے اور میرے لیے مال غنیمت حلال کر دیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا اور میرے لیے تمام روئے زمین کو مسجد اور آلہ طہارت بنا دیا اور مجھے کوثر دی گئی اور میری رعب سے مدد کی گئی اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے! بیشک تمہارے پیغمبر ہی قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والے ہوں گے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۳۵ مطبوعہ دارالفکر دمشق ۱۴۰۴ھ)

حضرت حذیفہ بن یمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم سے غائب ہوگئے اور باہر نہیں آئے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ تشریف نہیں لائیں گے پھر آپ باہر آئے اور آپ نے اتنا طویل سجدہ کیا کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ کی روح قبض ہوگئی پھر آپ نے سجدہ سے سر اٹھا کر فرمایا: میرے رب نے مجھ سے میری امت کے متعلق مشورہ کیا کہ میں ان کے ساتھ کیا کروں؟ میں نے کہا: اے میرے رب! جو تو چاہے وہ تیری مخلوق اور تیرے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ مشورہ کیا، میں نے پھر یہی کہا، اس نے پھر مشورہ کیا، میں نے پھر اسی طرح کہا پھر اللہ نے فرمایا: اے محمد! میں نے آپ کی امت میں سزا نہیں رکھی اور مجھے یہ بشارت دی کہ میری امت سے ستر ہزار کا ایک گروہ پہلے جنت میں داخل ہوگا اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے اس سے حساب نہیں ہوگا، پھر اللہ نے میری طرف پیغام بھیجا: آپ دعا کریں قبول ہوگی۔ آپ سوال کریں آپ کو دیا جائے گا۔ میں نے اللہ کے سفیر سے کہا: کیا اللہ میرے سوال کو عطا کرے گا؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کرنے کے لیے ہی تو بھیجا ہے، اور میں بغیر فخر کے کہتا ہوں کہ اللہ نے مجھے یہ چیزیں عطا کی ہیں: میرے اگلے اور پچھلے ذنب کی مغفرت کر دی اور میرا سینہ کھول دیا اور مجھے یہ نعمت دی کہ میری امت بھوکی نہیں رہے گی اور نہ مغلوب ہوگی، اور مجھے جنت میں ایک نہر کوثر عطا کی جو میرے حوض میں بہ رہی ہے، اور مجھے عزت اور نصرت عطا کی، اور ایک ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری رہتا ہے اور مجھے یہ نعمت دی کہ میں انبیاء میں سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گا، اور میرے اور میری امت

کے لیے غنیمت کو حلال کر دیا' اور ہم سے پہلی امتوں پر جن بہت سی چیزوں میں سختی کی گئی تھی وہ ہم پر حلال کر دیں اور ہم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور میں نے (ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے) اس سجدہ کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں پایا۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۳۶۔ ۱۳۵ مطبوعہ دار الفکر دمشق' ۱۴۰۴ھ)

حافظ ابن کثیر نے سورۂ فتح کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

یہ آیت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان خصائص میں سے ہے جن میں کوئی اور آپ کا شریک نہیں ہے' آپ کے علاوہ اور کسی شخص کے لیے کسی حدیث صحیح میں یہ نہیں ہے کہ اس کی اگلی اور پچھلی (ظاہری) خطاؤں کی مغفرت کر دی گئی ہو اور اس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نہایت تعظیم اور توقیر ہے اور اطاعت' نیکی اور پارسائی میں اولین اور آخرین میں سے کسی نے آپ کے مقام کو نہیں پایا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا اور آخرت میں علی الاطلاق اکمل البشر اور سید البشر ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۶ ص ۳۲۹ مطبوعہ ادارہ اندلس' بیروت' ۱۳۸۵ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف مغفرت کی نسبت کے محامل:

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

علامہ سبکی نے اس آیت کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ ہر چند کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کے شرف اور مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لیے یہ فرمایا: ہم نے آپ کے اگلے اور پچھلے ذنب بخش دیئے کیونکہ بادشاہوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ اپنے خواص اور مقربین کو نوازنے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم نے تمہارے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے اور تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا حالانکہ بادشاہ کو علم ہوتا ہے کہ اس شخص نے کوئی گناہ نہیں کیا' نہ آئندہ کرے گا لیکن اس کلام سے اس شخص کی تعظیم اور توقیر کو بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔

بعض محققین نے یہ کہا کہ (آیت) "لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر" کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی اگلی اور پچھلی زندگی میں گناہوں سے بچائے رکھے گا اور آپ کو عصمت پر قائم رکھے گا اس آیت میں مغفرت' عصمت سے کنایہ ہے اور قرآن مجید میں بعض مقامات پر مغفرت سے عصمت کا کنایہ کیا گیا ہے

شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے کتاب "نہایۃ السؤل فیما سنح من تفضیل الرسول" میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تمام انبیاء (علیہم السلام) پر فضیلت دی ہے' پھر انھوں نے فضیلت کی وہ وجوہات ذکر کی ہیں اور ان فضیلت کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے تمام ذنوب (یعنی بظاہر خلاف اولی کاموں) کو بخش دیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ انبیاء سابقین میں سے اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی مغفرت کی خبر نہیں دی' یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن جب دیگر انبیاء (علیہم السلام) سے شفاعت طلب کی جائے گی تو سب نفسی نفسی کہیں گے اور ہیبت الٰہی سے شفاعت نہیں کریں گے اور جب رسول اللہ سے لوگ شفاعت طلب کریں گے تو آپ فرمائیں گے: یہ میرا کام ہے' اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کے لیے فتح مبین کو ثابت کیا' پھر مغفرت ذنوب کا ذکر کیا' پھر اپنی نعمت پوری کرنے اور صراط مستقیم کی ہدایت پر ثابت رکھنے اور نصر عزیز کا ذکر کیا جس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس آیت سے مقصود گناہوں کا ثابت کرنا نہیں بلکہ گناہوں کی نفی کرنا ہے۔

ابن عطاء (رح) نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے متعدد نعمتوں کو جمع کر دیا ہے، فتح مبین عطا فرمائی جو اجابت کی علامت ہے، مغفرت عطا فرمائی جو محبت کی علامت ہے، اتمام نعمت سے سرفراز کیا جو آپ کے اختصاص کی نشانی ہے اور ہدایت عطا فرمائی جو ولایت کی علامت ہے، پس مغفرت سے مراد تمام عیوب اور نقائص سے آپ کی تنزیہہ ہے اور اتمام نعمت سے مراد آپ کو درجہ کاملہ پر پہنچانا ہے اور ہدایت سے مراد آپ کو مشاہدہ ذات وصفات کے اس مرتبہ پر پہنچانا ہے، جس سے بڑھ کر کوئی مرتبہ نہیں۔

(مدارج النبوۃ ج ۱ ص ۷۳ - ۷۲، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر)

قاضی عیاض مالکی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے سورۃ فتح میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم وتوقیر کا جو بیان فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو حضور کا مرتبہ اور مقام ہے اس کا ذکر کیا ہے اس کی ابتداء اللہ تعالیٰ نے دشمنوں پر حضور کے غلبہ اور آپ کی شریعت کی سربلندی کی خبر دینے سے کی ہے اور یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ مغفور ہیں اور ماضی اور مستقبل کی کسی چیز پر آپ سے مواخذہ نہیں ہوگا، بعض علماء نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ آپ سے کوئی چیز ہوئی ہے یا نہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس کی مغفرت کر دی ہے۔

(شفاء ج ۱ ص ۳۱، مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان)

علامہ شہاب الدین خفاجی لکھتے ہیں:

علامہ تجانی نے کہا ہے کہ یہ آیت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعظیم وتوقیر بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے جیسے کوئی شخص کسی سے اظہار محبت کے لیے کہے: اگر تمہارا کوئی پہلا یا پچھلا گناہ ہو بھی تو ہم نے اس کو معاف کر دیا، اس کلام سے اس شخص کا یہ ارادہ نہیں ہوتا کہ اس نے فی الواقع کوئی گناہ کیا ہے اور وہ اس کو معاف کر رہا ہے اور میں کہتا ہوں کہ ذنب کا معنی ستر ہے جو نہ دکھائی دینے کا تقاضا کرتا ہے اور اس کو لازم ہے عدم ذنب یعنی جب گناہ ہے ہی نہیں تو کیسے دکھائی دے گا، کیونکہ اگر گناہ ہوتا تو دکھائی دیتا اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقدم اور موخر دونوں کا ذکر کیا ہے حالانکہ موخر کا وجود ہی نہیں ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ آپ کا گناہ مقدم ہے نہ موخر، سو آپ سے مطلقاً گناہ سرزد نہیں ہوا۔

(نسیم الریاض ج ۱ ص ۲۷۳، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ ہر چند کہ بندہ اپنے مقسوم کے مطابق اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جائے پھر بھی وہ اللہ کی مغفرت سے مستغنی نہیں ہوتا کیونکہ بندہ اپنے بشری عوارض کی بناء پر تقاضائے ربوبیت کے مطابق عبادت کا حق ادا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مباح امور میں مشغول ہونے کی وجہ سے یا امت کے اہم کاموں میں منہمک اور مستغرق ہونے کی وجہ سے جو حضرت الوہیت میں غفلت واقع ہوتی ہے، حضرات انبیاء (علیہم السلام) اپنے بلند مقام کے اعتبار سے اس کو بھی سیہ اور گناہ خیال کرتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک گناہ ہوتی ہیں۔

(شرح الشفاء علی ھامش نسیم الریاض ج ۱ ص ۲۷۳، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں،

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بکثرت عبادت کا جو حال مشہور تھا اس کا لحاظ رکھتے ہوئے اس آیت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقام کی بلندی پر جو دلالت ہے اس کو الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہیں اور حدیث صحیح میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نفلی روزے رکھے اور نفلی نمازیں پڑھیں حتیٰ کہ آپ کے قدم مبارک سوج گئے اور سالخوردہ مشک کی طرح آپ کا جسم لاغر ہوگیا' آپ سے کہا گیا کہ آپ عبادت میں اس قدر مشقت کیوں کرتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذنب (یعنی بظاہر خلاف اولیٰ کاموں) کی مغفرت کر دی ہے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

(روح المعانی ج ۲۶ ص ۹۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

بعض علماء نے اس آیت کی توجیہ میں یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور آپ کی امت کے گناہ معاف کر دیئے یعنی مغفرت کا تعلق آپ کے ساتھ نہیں ہے' حضرت آدم اور آپ کی امت کے ساتھ ہے۔ ملا علی قاری اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس شخص کا قول بہت بعید ہے جس نے یہ کہا کہ آپ کے اگلے ذنب ہیں اور آپ کے پچھلے ذنب سے مراد امت کے ذنب ہیں' اور ظاہر یہ ہے کہ اس سے آپ کے وہ افعال مراد ہیں جن کو آپ نے سہوا ترک کر دیا یا جن میں آپ نے انسیان سے تاخیر کر دی اور خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے فضل کو کوئی بھی مستغنی نہیں ہے' اسی وجہ سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اپنے عمل کے سبب سے نجات نہیں پائے گا' صحابہ (رض) اجمعین نے کہا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ بھی نہیں؟ فرمایا: میں بھی نہیں' ماسوا اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ عدل کرے تو تمام اولین اور آخرین کو عذاب دے گا اور یہ اس کا ظلم نہیں ہے' ہم اللہ سے اس کے فضل کا سوال کرتے ہیں اور اس کے عدل سے اس اس کی پناہ میں آتے ہیں۔

(جمع الوسائل ج ۲ ص ۸۱' مطبوعہ مکتب اسلامی' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

باعث تخلیق کائنات ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا

امام طبرانی روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب حضرت آدم (علیہ السلام) سے اجتہادی خطا ہوگئی تو انھوں نے سر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھا اور دعا کی: میں محمد کے حق میں سوال کرتا ہوں تو میری مغفرت فرما' اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ محمد کون ہیں؟ حضرت آدم نے کہا: جب تو نے مجھے پیدا کیا تھا تو میں نے عرش کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تھا' وہاں یہ لکھا ہوا تھا: "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ سو میں نے ان کی طرف وحی کی کہ اے آدم! وہ آپ کی اولاد سے آخر النبیین ہیں اور ان کی امت آپ کی اولاد میں سے آخری امت ہے' اور اے آدم! اگر وہ ہوتے تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا۔

(معجم صغیر ج ۲ ص ۸۳' مطبوعہ مکتبہ سلفیہ' مدینہ منورہ' ۱۳۸۸ھ)

حافظ الہیثمی نے اس حدیث کو "معجم صغیر" اور "معجم اوسط" کے حوالے سے بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند میں ایسے روای ہیں جن کو میں نہیں پہچانتا۔

(مجمع الزوائد ج ۸ ص ۲۵۳' مطبوعہ دار الکتاب العربی' بیروت' ۱۴۰۲ھ)

امام ابن جوزی نے بھی اس حدیث کو حضرت عمر بن الخطاب سے روایت کیا ہے۔

(الوفاء ج۱ ص ۲۳، مطبوعہ مکتبہ رضویہ فیصل آباد)

امام بیہقی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں:

اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم! تم نے محمد کو کیسے پہنچانا' حالانکہ ابھی میں نے ان کو پیدا نہیں کیا؟ حضرت آدم نے کہا: اے میرے رب! اس لیے کہ جب تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور مجھ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی تو میں نے عرش کے پایوں پر لکھا ہوا دیکھا "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ تو میں نے جان لیا کہ جس نام کو تو نے اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا وہ تجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہوگا' اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم! آپ نے سچ کہا: بیشک وہ مجھے اپنی تمام مخلوق میں بہت زیادہ محبوب ہیں اور جب آپ نے ان کے وسیلہ سے سوال کیا ہے تو میں نے آپ کو بخش دیا اور اگر محمد نہ ہوتے تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا۔ اس حدیث کی سند میں عبدالرحمن بن زید ایک ضعیف راوی ہیں۔

(دلائل النبوۃ ج ۵ ص ۴۸۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

امام حاکم نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور اس میں بھی یہ الفاظ ہیں: اگر محمد نہ ہوتے تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا' اور امام حاکم نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(المستدرک ج ۲ ص ۶۱۵، مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ)

قائدالمرسلین ہونے اور بعض دیگر فضائل کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت واثلہ بن اسقع (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک اللہ عزوجل نے حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں سے کنانہ کو فضیلت دی اور کنانہ سے قریش کو فضیلت دی۔ ۱ (امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ ھ' صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۴۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ ھ) اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ ۲ (امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ' جامع ترمذی ص ۵۱۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت عباس بن عبدالمطلب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول! قریش اپنی مجلسوں میں اپنے حسب ونسب کا ذکر کرتے ہیں اور آپ کی مثال وہ اس طرح دیتے ہیں جیسے کسی زمین میں کھجور کا درخت ہو' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا تو مجھے ان کے بہترین فریقین میں رکھا' پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے سب سے بہتر قبیلہ میں رکھا' پھر سب سے افضل گھر میں رکھا پس گھرانے اور شخصیت کے اعتبار سے میں سب سے افضل ہوں۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قبروں سے اٹھنے والوں میں' میں سب سے پہلا ہوں' جب لوگوں کے وفد آئیں گے تو میں خطبہ دوں گا' اور جب لوگ مایوس ہوجائیں گے تو میں بشارت دوں گا' اور

قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا' اولادِ آدم میں اپنے رب کے نزدیک میں سب سے مکرم ہوں اور مجھے فخر نہیں ہے۔
(جامع ترمذی ص ۵۱۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب زمین شق ہوگی تو سب سے پہلے میں اٹھوں گا' مجھے جنت کے حلوں میں سے حلہ پہنایا جائے گا' پھر میں عرش کی دائیں طرف کھڑا ہوں گا اور میرے سوا مخلوق میں سے کوئی شخص اس مقام پر کھڑا نہیں ہوگا۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابی بن کعب (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن میں نبیوں کا امام اور خطیب ہوں گا' اور میں ہی ان کی شفاعت کرنے والا ہوں گا' اس پر فخر نہیں ہے۔
(جامع ترمذی ص ۵۲۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن اولاد آدم کا میں سردار ہوں گا' اور اس پر فخر نہیں اور میرے ہی ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور اس پر فخر نہیں اور آدم اور ان کے علاوہ جتنے نبی ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور جب زمین شق ہوگی تو سب سے پہلے میں اٹھوں گا اور اس پر فخر نہیں۔
(جامع ترمذی ص ۵۲۰ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

حافظ ابن عساکر روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں قائد المرسلین ہوں اور فخر نہیں ہے اور میں خاتم النبیین ہوں اور فخر نہیں ہے اور میں پہلا شفاعت کرنے والا اور میں ہی وہ پہلا شخص ہوں جس کی شفاعت قبول ہوگی اور اس پر فخر نہیں ہے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲ ص ۱۰۸' مطبوعہ دار الفکر' دمشق' ۱۴۰۴ھ)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا گیا' آپ کے لیے نبوت کب واجب ہوئی؟ فرمایا: جب آدم کو پیدا کر کے ان میں روح پھونکی جارہی تھی۔ ۱ (حافظ القاسم علی بن الحسن ابن العساکر متوفی ۵۷۱ھ' اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔

(جامع ترمذی ص ۵۱۹ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' کراچی)

خالق اور خلق کے محبوب ہونے کی وجہ سے آپ کا افضل الرسل ہونا:

قل ان کان اباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفسقین"۔ (التوبہ: ۲۴)

ترجمہ: آپ فرمائیے کہ تمہارے باپ دادا' اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کے گھاٹے کا تمہیں خوف ہے اور تمہارے پسندیدہ مکان اگر تم کو اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی

راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو پھر انتظار کرو حتی کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے اور اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

ماں باپ اور بھائی بہنوں سے طبعی محبت ہوتی ہے' بیوی سے شہوانی محبت ہوتی ہے اور مال و دولت' تجارت اور مکانوں سے عقلی محبت ہوتی ہے' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ محبت کی جو قسم بھی ہو اس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت سے مغلوب کردو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت کو ہر محبت پر غالب کردو۔

صحابہ کرام (رض) و رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جو محبت تھی اور اپنی جان سے' ماں باپ اور اولاد سے' بیویوں سے اور مال و دولت سے اور ہر چیز سے زیادہ تھی' جنگ بدر میں حضرت ابوبکر اپنے بیٹے کے خلاف صف آرا تھے' جنگ احد میں حضرت ابوعبیدہ نے اپنے باپ کو قتل کردیا' حضرت مصعب بن عمیر نے جنگ احد میں اپنے بھائی کو قتل کردیا' جنگ بدر میں حضرت عمر (رض) نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کردیا اور حضرت علی (رض) نے اپنے کئی رشتہ داروں کو قتل کردیا۔

(نسیم الریاض ج ۳ ص ۳۶۸' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

قاضی عیاض لکھتے ہیں: ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک عورت کا باپ' بھائی اور شوہر قتل کردیا گیا' اس نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کیا حال ہے؟ صحابہ نے کہا: الحمد للہ! وہ تمہاری تمنا کے مطابق خیریت سے ہیں' اس نے کہا: مجھے دکھاؤ حتی کہ میں آپ کو دیکھ لوں' جب اس نے آپ کو دیکھا تو کہا: آپ (کی خیریت) کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔

(شفاء ج ۲ ص ۱۸' مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان)

نیز قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ کفار مکہ حضرت زید بن دثنہ کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے جانے لگے۔ اس وقت ان سے ابوسفیان بن حرب نے کہا: اے زید! میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں یہ بتاؤ کہ کیا تم کو یہ پسند ہے کہ اس وقت تمہاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوتے اور تمہارے بدلے ہم ان کی گردن اتار دیتے؟ حضرت زید نے کہا: خدا کی قسم! مجھے تو یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میں اپنے گھر میں آرام سے ہوں اور اُن کے کانٹا چبھ جائے' ابوسفیان نے کہا: میں نے اصحاب محمد کی طرح کسی شخص کو کسی سے محبت کرتے نہیں دیکھا۔

(شفاء ج ۲ ص ۱۹' مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی ملتان)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

حضرت حنظلہ بن ابی عامر اور حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی ابن سلول نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنے مشرک اور منافق باپ کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی مگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اجازت نہ دی' حضرت حنظلہ بن ابی عامر جنگ احد میں شہید ہوگئے' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ فرشتے ان کو غسل دے رہے ہیں' جاؤ ان کی بیوی سے جا کر پوچھو' بیوی نے کہا: جس وقت انھوں نے جہاد کی آواز سنی تو یہ غسل کیے بغیر حالت جنابت میں جہاد کے لیے نکل گئے تھے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اسی لیے فرشتے ان کو غسل دے رہے تھے۔

(اصابہ ج ۱ ص ۳۶۱' مطبوعہ دارالفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

یہ اپنی جان' اپنے ماں باپ' اولاد اور رشتہ داروں کی طبعی محبت سے زیادہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کرنے کی مثالیں ہیں' اور حنظلہ بن ابی عامر کے واقعہ میں شہوانی محبت سے زیادہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کی دلیل ہے اور جن

صحابہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خاطر مکہ میں اپنے مال و دولت، مکانات اور تجارت کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت کی اس میں ان کی عقلی محبت سے زیادہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت کرنے کا بیان ہے، ثابت ہوا کہ صحابہ کرام کے نزدک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت ہر محبت پر غالب تھی، صرف انسان ہی نہیں، شجر و حجر اور حیوان بھی آپ سے محبت کرتے تھے، آپ نے فرمایا: احد پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے۔ کھجور کا تنا آپ کے فراق میں چیخیں مار کر روتا تھا، اور جب آپ قربانی کرتے تو ہر اونٹنی آگے بڑھ بڑھ کر آپ کی چھری کے قریب ہوتی تھی،

(صحیح بخاری وسنن ابو داؤد)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابہ بیٹھے ہوئے آپ کا انتظار کر رہے تھے آپ (حجرے سے) نکل کر ان کے قریب ہو کر ان کی باتیں سننے لگے، ان میں سے بعض نے تعجب سے کہا: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے ایک خلیل بنانے لگا تو حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا۔ دوسرے نے کہا: اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو ہم کلام ہونے کا شرف بخشا ایک اور نے کہا: حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، دوسرے نے کہا: اور حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے صفی بنایا، آپ نے ان کے پاس آ کر ان کو سلام کیا اور فرمایا: میں نے تمہارا کلام اور اس پر تعجب سنا کہ ابراہیم اللہ کے خلیل ہیں، اور ایسے ہی ہیں اور موسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے کلیم ہیں، وہ ایسے ہی ہیں اور عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، وہ ایسے ہی ہیں اور آدم کو اللہ نے صفی بنایا اور وہ ایسے ہی ہیں، سنو! میں اللہ کا محبوب ہوں اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے، میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہوں گا اور مجھے اس پر فخر نہیں ہے، میں قیامت کے دن سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی اور اس پر فخر نہیں، میں سب سے پہلے جنت کُنڈی کھٹکھٹاؤں گا، پھر اللہ میرے خاطر جنت کو کھولے گا اور اس میں مجھ کو داخل کرے گا اور میرے ساتھ فقراء مومنین ہوں گے اور اس پر فخر نہیں اور میں اولین اور آخرین میں سب سے زیادہ معزز ہوں اور اس پر فخر نہیں۔

(جامع ترمذی ص ۵۲۰، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ تمام انبیاء (علیہم السلام) کے مقابلہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے محبوب ہیں، اور امام بخاری روایت کرتے ہیں، حضرت عائشہ (رض) نے کہا: میرا یہی گمان ہے کہ آپ کا رب کی خواہش بہت جلد پوری کرتا ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۰۶، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ ھ)

خلیل اور حبیب میں فرق کا بیان:

قاضی عیاض مالکی نے خلیل اور حبیب کا فرق بیان کرتے ہوئے امام ابوبکر بن فورک کے حوالے سے لکھا ہے، خلیل اللہ تک بالواسطہ پہنچے۔

(آیت) "و کذلك نری ابرهیم ملکوت السموت والارض"۔ (الانعام: ۷۵)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمینوں کی ساری بادشاہی دکھائی۔

اور حبیب، اللہ تک بلا واسطہ پہنچے:

(آیت) "ثم دنا فتدلی۔ فکان قاب قوسین او ادنی"۔۔ (النجم: ۹۔۸)
ترجمہ: پھر (اللہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے) قریب ہوا پھر زیادہ قریب ہوا، پھر دو کمانوں کی مقدار کے برابر اللہ کے قریب ہوئے یا اس سے بھی زیادہ قریب ہوئے۔۔

خلیل کی مغفرت کا بیان رتبہ طمع میں ہے:

(آیت) "والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی یوم الدین"۔۔ (الشعراء: ۸۲)
ترجمہ: اور جس سے میری امید وابستہ ہے وہ قیامت کے دن میری خطا معاف فرمادے گا۔

اور حبیب کی مغفرت کا بیان مرتبہ یقین میں ہے:

(آیت) "انا فتحنا لك فتحا مبینا۔ لیغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر"۔ (الفتح: ۲۔۱)
ترجمہ: بیشک ہم نے آپ کو روشن فتح عطا فرمائی، تا کہ اللہ آپ کے لیے اگلے اور پچھلے (بظاہر) خلاف اولی سب کا معاف فرمادے۔

خلیل نے دعا کی کہ اللہ انھیں روز حشر شرمندہ نہ کرے:

(آیت) "ولا تخزنی یوم یبعثون"۔۔ (الشعراء: ۸۷)
ترجمہ: اور مجھے روز حشر شرمندہ نہ فرمانا"۔۔

اور حبیب کو بن مانگے یہ مقام عطا فرمایا:

(آیت) "یوم لا یخزی الله النبی والذین امنوا معه"۔ (التحریم: ۸)
ترجمہ: جس دن اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو شرمندہ کرے گا نہ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو۔

امتحان کے موقع پر خلیل نے کہا:

(آیت) "حسبی الله"۔
ترجمہ: مجھے اللہ کافی ہے۔

اور حبیب کے لیے اللہ نے از خود فرمایا:

(آیت) "یایها النبی حسبك الله ومن اتبعك من المومنین"۔۔ (الانفال: ۶۴)
ترجمہ: اے نبی آپ کے لیے اللہ اور وہ ایمان لانے والے کافی ہیں، جنہوں نے آپ کی اتباع کی ہے"۔۔

خلیل نے دعا کی:

(آیت) "واجعل لی لسان صدق فی الاخرین"۔۔ (الشعراء: ۸۴)
ترجمہ: اور بعد کے آنے والوں میں میرا ذکر جمیل جاری کردے"۔۔

اور حبیب کے لیے از خود فرمایا:

(آیت) "ورفعنا لك ذكرك"۔۔ (الانشراح: ۴)
ترجمہ: اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کردیا"۔۔

سو قیامت تک کلمہ، اذان، نماز اور خطبہ میں مسلمانوں کی زبان سے آپ کا ذکر بلند ہوتا رہے گا۔
خلیل نے دعا کی:

(آیت) "واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام"۔۔ (ابراھیم: ۳۵)

ترجمہ: اور مجھے اور میرے (خاص) بیٹوں کی بتوں کی عبادت سے اجتناب پر برقرار رکھ"۔A

اور حبیب کے لیے بلا طلب از خود فرمایا:

(آیت) "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا"۔۔ (الاحزاب: ۳۳)

ترجمہ: اے اہل بیت رسول! اللہ یہی ارادہ فرماتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی دور کر کے تم کو خوب پاکیزہ کر دے۔

قاضی عیاض فرماتے ہیں: ہم نے جو چند آیات ذکر کی ہیں ان سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احوال اور آپ کے مقامات کی افضلیت کی ایک جھلک معلوم ہو جاتی ہے اور ان آیات سے ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق مفہوم اخذ کرتا ہے اور تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون احسن طریقہ پر ہے۔

(شفاء ج ۱ ص ۱۴۳۔ ۱۳۳، مطبوعہ عبدالتواب اکیڈمی، ملتان)

کلیم اور حبیب میں فرق کا بیان:

کلیم اور ان کے بھائی حضرت ہارون نے فرعون کے پاس جاتے وقت اپنا خوف عرض کیا:

(آیت) "ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان یطغی"۔ (طه: ۴۵)

ترجمہ: اے ہمارے رب! ہمیں یہ خدشہ ہے کہ وہ (فرعون) ہم پر کوئی زیادتی یا سرکشی کرے گا،

اور حبیب کے لے از خود فرمایا:

(آیت) "واللہ یعصمك من الناس"۔ (المائدہ: ۶۷)

ترجمہ: اور اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

کلیم دعا کرتے ہیں:

(آیت) "رب اشرح لی صدری"۔۔ (طه: ۲۵)

ترجمہ: اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے۔۔

حبیب کے لیے از خود فرمایا:

(آیت) "الم نشرح لك صدرك"۔۔ (الم نشرح: ۱)

ترجمہ: کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ نہیں کھولا۔۔

کلیم دعا کرتے ہیں:

(آیت) "رب ارنی انظر الیك"۔ (الاعراف: ۱۴۳)

ترجمہ: اے رب! مجھے اپنی ذات دکھا میں تجھے دیکھوں۔

حبیب سے فرمایا:

(آیت) "الم تر الی ربك"۔ (الفرقان: ۴۵)

ترجمہ کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا۔

کلیم سے فرمایا:

ۃ (آیت) "لن ترنی" (الاعراف: ۱۴۳)

ترجمہ: تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے۔

حبیب سے فرمایا:

ۃ (آیت) "ما زاغ البصر وما طغی"۔۔ (النجم: ۱۷)

ترجمہ: نہ نظر ایک طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے بڑھی۔۔

کلیم اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں:

ۃ (آیت) "وعجلت الیك رب لترضی"۔۔ (طه: ۸۴)

ترجمہ: اے میرے رب! میں نے تیرے پاس حاضر ہونے میں جلدی کی تاکہ تو راضی ہو جائے۔۔

اور حبیب کی رضا رب تعالیٰ چاہتا ہے:

ۃ (آیت) "فلنولینك قبلة ترضها"۔ (البقرہ: ۱۴۴)

ترجمہ: ہم ضرور آپ کو اس قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس سے آپ راضی ہوں گے۔

ۃ (آیت) "ولسوف یعطیك ربك فترضی"۔۔ (الضحی: ۵)

ترجمہ: اور بیشک آپ کو آپ کا رب اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔۔

ۃ (آیت) "ومن انآیء الیل فسبح واطراف النہار لعلك ترضی"۔۔ (طه: ۱۳۰)

ترجمہ: اور رات کے کچھ اوقات اور دن کے کناروں میں تسبیح کیجئے تاکہ آپ راضی رہیں"۔۔

کلیم نے اپنے اور اپنی قوم کے لیے دعا کی:

ۃ (آیت) "واکتب لنا فی ھذہ الدنیا حسنة وفی الاخرۃ"۔ (الاعراف: ۱۵۶)

ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں۔

حبیب کی امت کے متعلق فرمایا:

ۃ (آیت) " فسا کتبها للذین یتقون ویؤتون الزکوۃ والذین ھم بآیتنا یؤمنون "۔۔ الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندھم فی التورۃ والانجیل"۔ (الاعراف: ۱۵۷۔۱۵۶)

ترجمہ: عنقریب میں اس (بھلائی) کو ان لوگوں کے حق میں لکھ دوں گا جو پرہیزگاری کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور وہ لوگ

جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ جو اس رسول، نبی امی (اللقب) کی پیروی کرتے ہیں جس کا نام ان کے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا ہے۔

دیکھئے مانگا حضرت کلیم نے اور ملا آپ کے غلاموں کو معلوم ہوا کہ زمانہ کسی نبی کا ہو کسی رسول کا ہو سکہ چلتا تھا تو مصطفے کا چلتا تھا اور ڈنکا بجتا تھا تو مصطفے کا بجتا تھا۔

انبیاء سابقین علیھم السلام کے معجزات پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معجزات کی افضیلت:

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو کلام الٰہی لینے کے لیے طور پر جانا پڑا اور آپ کو کلام الٰہی کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا تھا' آپ جہاں ہوتے کلام الٰہی وہیں نازل ہو جاتا تھا' حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا یہ معجزہ تھا کہ انھوں نے زمین پر لاٹھی ماری تو پانی نکل آیا' لیکن زمین میں عادۃ پانی ہوتا ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے توجہ فرمائی تو آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے ابل پڑے اور جہاں عادۃ پانی نہیں ہوتا وہاں سے پانی نکل آیا۔

حضرت داؤد (علیہ السلام) کے لیے لوہا نرم کر دیا گیا تھا اور وہ اس سے زرہ بنا لیتے تھے لیکن لوہے کو بھی عادۃ آگ سے گرم کیا جا سکتا ہے' آپ کے لیے تو پتھر نرم ہو گیا جو کبھی نرم نہیں ہوتا' حافظ ابونعیم نے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غار میں گئے اور آپ نے اس میں سر مبارک داخل کیا تو وہ نرم ہوتا چلا گیا' اور "صحیح بخاری" میں ہے: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: احد ایک پہاڑ ہے یہ ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ (ج ۲ ص ۵۸۵) دیکھئے پتھر وہ جنس ہے جس میں محبت پیدا نہیں ہوتی حتیٰ کہ جس شخص کو کسی سے محبت نہ ہو اس کو سنگدل کہتے' لیکن یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اعجاز ہے کہ جس چیز کی حقیقت میں محبت نہیں ہے' وہاں بھی اپنی محبت پیدا کر دی' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ پہاڑ نے تسبیح کی اور آپ کے ہاتھ میں سنگریزوں نے تسبیح پڑھی' کہاں لوہے کا نرم ہونا اور کہاں پتھروں کا محبت کرنا' سنگ ریزوں کا تسبیح پڑھنا۔

حضرت داؤد (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(آیت) ولا تتبع الھوی"۔ (ص: ۲۶)

ترجمہ: اور آپ خواہش کی پیروی نہ کریں۔

اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے فرمایا:

(آیت) "وما ینطق عن الھوی"۔ (النجم: ۳)

ترجمہ: وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے"۔

سبحان اللہ! آپ وہ ہیں جن کی اللہ کی رضا کے مقابلہ میں اپنی کوئی خواہش نہیں۔

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو پرندوں سے گفتگو کا ملکہ دیا اور جنات اور ہوا کو مسخر کیا گیا' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بکری کے گوشت کے ٹکڑے نے کلام کیا' اور آپ سے کہا: مجھ میں زہر ملا ہوا ہے ہرن اور اونٹ نے آپ سے شکایت کی اور سنگ ریزوں نے آپ کے ہاتھ پر تسبیح پڑھی' پتھروں نے سلام عرض کیا اور درختوں نے آپ کی اطاعت کی' آپ کے حکم سے درخت ایک جگہ

سے دوسری جگہ چل کر آیا اور پھر واپس چلا گیا' یہ امور پرندوں کے ساتھ گفتگو کرنے کی بہ نسبت زیادہ عجیب وغریب اور با کمال ہیں' ہوا کے مسخر کرنے کا قصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان اپنے تخت پر بیٹھ کر ہوا میں اڑتے تھے اور صبح کی سیر میں ایک ماہ کی مسافت طے کر لیتے اور شام کی سیر میں ایک ماہ کی مسافت طے کر لیتے:

(آیت) "ولسلیمن الریح غدوھا شھر ورواحھا شھر"۔ (سبا: ۱۲)

ترجمہ: اور سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا' اس کی صبح کی رفتار ایک مہینہ کی راہ تھی اور شام کی رفتار ایک مہینہ کی راہ تھی۔

ہوا مسخر سہی' لیکن حضرت سلیمان جس جگہ کا قصد کرتے انھیں وہاں جانا پڑتا تھا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کہیں جانا نہیں پڑتا۔ آپ جس جگہ کا بھی قصد کرتے وہ جگہ وہیں آجاتی تھی' معراج سے واپسی کے بعد جب کفار قریش نے آپ سے بیت المقدس کے متعلق سوالات کیے تو بیت المقدس کو آپ کے سامنے دار ارقم میں لا کر رکھ دیا گیا۔

(مشکوۃ ص ۵۳۰' مطبوعہ اصح المطابع' دہلی)

نیز آپ نے فرمایا:

ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا ومغاربھا"۔

اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لیے سمیٹ دیا اور میں نے زمین کے تمام مشارق اور مغارب کو دیکھا لیا۔

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۹۰' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۷۵ھ)

اور رہا حضرت سلیمان کے لیے جنات کا مسخر ہونا تو اس کے مقابلہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تبلیغ سے جنات مسلمان ہو گئے اور جنات کا مسخر ہونا اور بات ہے اور ان کا مسلمان ہونا اور چیز ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اندھوں اور کوڑھیوں کے تندرست کرنے اور مردہ زندہ کرنے کا معجزہ عطا فرمایا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت قتادہ بن نعمان کی نکلی ہوئی آنکھ دوبارہ لوٹا دی' حضرت سلمہ بن اکوع کی ٹوٹی پنڈلی جوڑ دی' آپ کے بلانے سے درخت چل کر آئے' کھجور کا تنا آپ کے فراق میں چیخیں مار کر رویا' اور یہ سب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات سے کہیں بڑھ کر کمالات اور معجزات ہیں' کیونکہ مردے میں پہلے جان آچکی ہوتی ہے' آپ نے ان چیزوں میں حیات جاری کی جہاں عادۃ حیات نہیں ہوتی' آنکھ والے کو دکھانا اور کان والے کو سنانا اور بات ہے اور بغیر آنکھوں کے دکھانا اور بغیر کانوں کے سنانا اور چیز ہے۔ الغرض نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو معجزات اور کمالات دیئے گئے وہ تمام نبیوں کے معجزات اور کمالات سے فائق اور ان پر غالب تھے' آپ کے معجزات کی تعداد' کیفیات اور حیثیات ہر اعتبار سے سب پر بلند وبالا تھے' دوسرے نبیوں نے نبوت کا دعوی کرتے ہی معجزات پیش کیے اور آپ نے اعلان نبوت کے بعد کسی معجزہ کو پیش کرنے کی بجائے اپنی زندگی کو پیش کر دیا اور یوں ظاہر ہوا کہ آپ کو اپنی نبوت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی معجزہ کی احتیاج نہیں تھی' آپ کی زندگی خود سراپا معجزہ تھی' یوں ہی تو نہیں فرمایا تھا: (آیت) "لعمرک"۔ (الحجر: ۷۲) تمہاری زندگی کی قسم:"۔

حضرت نوح (علیہ السلام) نے دعا کی:

(آیت) "رب انصرنی بما کذبون"۔۔ (المؤمنون: ۲٦)

ترجمہ: اے میرے رب! میری مدد فرما کیونکہ انھوں نے مجھے جھٹلایا"۔

آپ سے بلاطلب فرمایا:

(آیت) "وینصرك الله نصرا عزیزا"۔۔ (الفتح: ۳)

ترجمہ: اور اللہ آپ کی قوی مدد فرمائے گا۔۔

حضرت نوح نے اپنی قوم کے کافروں کی ہلاکت کی دعا کی:

(آیت) "رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا"۔۔ (نوح: ۲۶)

ترجمہ: اے میرے رب! زمین پر کافروں میں کوئی بسنے والا نہ چھوڑ!"۔۔

اور آپ سے فرمایا:

(آیت) "وما کان الله لیعذبھم وانت فیھم"۔ (الانفال: ۳۳)

ترجمہ: اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ آپ کے ہوتے ہوئے ان کو عذاب دے۔

سب سے پہلے قبر سے اٹھنے والی حدیث کا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پہلے اٹھنے والی حدیث سے تعارض کا جواب:

حدیث میں ہے: سب سے پہلے قبر سے میں اٹھوں گا' اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے موسیٰ (علیہ السلام) پر فضیلت نہ دو کیونکہ قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہوں گے' میں بھی ان کے ساتھ بے ہوش ہوں گا میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا' اس وقت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) عرش کی ایک جانب پکڑے کھڑے ہوں گے میں نہیں جانتا کہ وہ بے ہوش ہوئے تھے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے یا ان لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے بے ہوش ہونے سے مستثنیٰ رکھا تھا۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲۵ مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ ھ)

علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں:

ان حدیثوں میں تعارض نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ "صحیح بخاری" کی روایت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو ارشاد ہے اس وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ نہ ہو کہ آپ مطلقا سب سے پہلے قبر سے اٹھائے جائیں گے اور مسلم کی روایت میں جو ارشاد ہے وہ بعد کا واقعہ ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۲۵۱ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ مصر ۱۳۴۸ ھ)

علامہ وشتانی ابی مالکی نے بھی اس تعارض کا یہی جواب دیا ہے

(اکمال اکمال المعلم ج ٦ ص ۹۷' مطبوعہ دارالکتب العلمیۃ بیروت)

جس حدیث میں آپ نے دوسرے انبیاء پر فضیلت دینے سے منع کیا ہے' اس کے جوابات:

امام بخاری نے حضرت ابوسعید خدری (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: انبیاء میں

(کسی کو) فضیلت نہ دو

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۲۵ ،مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

"صحیح بخاری) کی ان روایات سے معلوم ہوا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیگر انبیاء (علیہم السلام) پر فضیلت دینا ممنوع ہے حالانکہ صحیح مسلم کی روایت میں نبی کریم نے تمام انبیاء (علیہم السلام) پر اپنی فضیلت بیان کی ہے اس تعارض کے جواب میں علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

علامہ ابن التین نے کہا ہے کہ "انبیاء میں کسی کو فضیلت نہ دو" اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ بغیر علم کے کسی نبی کو پر فضیلت نہ دو ورنہ انبیاء (علیہم السلام) کی ایک دوسرے پر فضیلت کو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا ہے"

(آیت) "تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض". (البقرۃ: ۲۵۳)

یہ سب رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے"۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی فضیلت کا علم ہونے سے پہلے یہ فرمایا تھا،

تیسرا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس طرح فضیلت دینے سے منع فرمایا ہے جو دوسرے نبی کی تنقیص کو مستلزم ہو۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسی فضیلت دینے سے منع فرمایا ہے جو دوسرے نبی کی دل آزاری کا موجب ہو،

پانچواں جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نفس نبوت میں فرق کرنے سے منع فرمایا ہے۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ آپ کا یہ قول تواضع پر محمول ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۲ ص ۲۵۱ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

شکر کا بیان

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝۲۷۸

(سورۃ البقرۃ: آیت 278)

"اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو"۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے اصل مال تمہارا حق ہیں، نہ تم ظلم کرو نہ تم ظلم کیے جاؤ گے۔

(البقرہ: ۲۷۹۔۲۷۸)

سودی کاروبار ترک نہ کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنے کا حکم:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اے ایمان والو! سود حرام قرار دیئے جانے کے بعد لوگوں کے اوپر جو تمہاری سودی رقوم ہیں ان کو چھوڑ دو اور ان سے صرف اپنی اصل رقم وصول کرو امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سدی بیان کرتے ہیں کہ یہ آیات حضرت عباس بن عبد المطلب اور بنو مغیرہ کے ایک شخص کے متعلق نازل ہوئی ہیں، وہ دونوں زمانہ جاہلیت میں شریک تھے، جس وقت وہ مسلمان ہوئے تو لوگوں کے اوپر ان کے سود کی بڑھی بھاری رقمیں تھیں، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ زمانہ جاہلیت میں جو سود تھا اس کو وصول مت کرو۔

ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ ثقیف نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس بات پر صلح کرلی کہ ان کا جو سود لوگوں پر ہے اور لوگوں کا جو سود ان پر ہے وہ سب چھوڑ دیا جائے گا، فتح مکہ کے بعد حضرت عتاب بن اسید مکہ مکرمہ کے عامل بنائے گئے اس وقت بنو عمرو بن عمیر بن عوف، بنو مغیرہ سے سود لیتے تھے اور بنو مغیرہ ان کو جاہلیت میں سود ادا کرتے تھے، جب وہ مسلمان ہوئے تو ان پر بہت زیادہ سود کی رقمیں واجب الادا تھیں، بنو عمرو نے آکر ان سے اپنے سود کا مطالبہ کیا، بنو مغیرہ نے مسلمان ہونے کے بعد ان کو سود ادا کرنے سے انکار کردیا، یہ مقدمہ حضرت عتاب بن اسید (رض) کے پاس پیش کیا گیا، حضرت عتاب نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس معاملہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے خط لکھا، تو یہ آیت نازل ہوگئی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عتاب اسید کو جواب لکھا کہ اگر بنو عمرو سود کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوں تو ان سے اعلان جنگ کردو۔

(جامع البیان ج ۳ ص ۷۱، مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو ثقیف سود لینے سے باز آگئے اور کہا: ہم اللہ اور رسول سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتے۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ جو لوگ سود لینے کو ترک نہ کریں ان سے اسی طرح جنگ کی جائے گی جس طرح مرتدین اور باغیوں سے جنگ کی جاتی ہے۔ جمہور مفسرین کا یہی مختار ہے۔

(روح المعانی ج ۳ ص ۵۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

سود پر وعید کے متعلق احادیث:

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں: امام مسلم اور امام بیہقی حضرت جابر (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود پر گواہی دینے والے اور سود کے لکھنے والے پر لعنت کی ہے اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔

اس حدیث سے واضح ہوگیا کہ بینک سے سود وصول کرکے غریبوں کو کھلانا جائز نہیں ہے، اور نہ بینک کی ملازمت کرنا جائز ہے۔

امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ وہ چار آدمیوں کو جنت میں داخل نہ کرے اور ان کو جنت کی نعمتیں نہ چکھائے، عادی شرابی، سود خور، ناحق مال یتیم کھانے

والا اور ماں باپ کا نافرمان۔

امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن سلام (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: انسان سود کا جو ایک درہم وصول کرتا ہے وہ اللہ کے نزدیک اسلام میں تینتیس بار زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔

امام طبرانی نے "معجم اوسط" میں حضرت براء بن عازب (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سود کے بہتر درجے ہیں اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے۔

امام ابویعلی نے حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس قوم میں زنا اور سود کی کثرت ہو جاتی ہے اس قوم پر اللہ کا عذاب حلال ہو جاتا ہے۔

امام احمد نے حضرت عمرو بن العاص (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس قوم میں سود کی کثرت ہوتی ہے اس قوم پر قحط مسلط کر دیا جاتا ہے اور جس قوم میں رشوت کی کثرت ہوتی ہے اس پر رعب طاری کر دیا جاتا ہے۔

امام احمد نے حضرت عمرو بن العاص (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس قوم میں سود کی کثرت ہوتی ہے اس قوم پر قحط مسلط کر دیا جاتا ہے اور جس قوم میں رشوت کی کثرت ہوتی ہے اس پر رعب طاری کر دیا جاتا ہے۔

امام ابوداؤد، امام ابن ماجہ اور امام بیہقی اپنی سنن میں حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ کوئی شخص سود کھانے سے نہیں جو شخص سود نہیں کھائے گا اس کو سود کا غبار پہنچے گا۔

(الدر المنثور ج ۱ ص ۳۶۷، مطبوعہ مکتبہ آیۃ اللہ العظمی ایران)

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس رات مجھے معراج کرائی گئی مجھے ایک ایسی قوم کے پاس سے گزارا گیا جن کے پیٹ کوٹھڑیوں کی طرح تھے ان کے پیٹوں میں باہر سے سانپ دکھائی دے رہے تھے میں نے پوچھا: اے جبرائیل یہ کون ہیں؟ کہا: یہ لوگ سود کھانے والے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سود کے ستر گناہ ہیں اور ان میں سب سے ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے

(سنن ابن ماجہ ص ۱۶۵-۱۶۴ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

امام بخاری روایت کرتے ہیں:

حضرت سمرہ بن جندب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک صبح کو اپنا خواب بیان فرمایا کہ مجھے جبرائیل اور میکائیل لے گئے میں نے دیکھا کہ خون کا ایک دریا ہے جس کے وسط میں ایک شخص کھڑا ہوا ہے اور دریا کے کنارے ایک شخص ہاتھ میں پتھر لیے ہوئے کھڑا ہے، جب دریا میں کھڑا ہوا شخص کنارے کی طرف آنے کی کوشش کرتا ہے تو کنارے پر کھڑا ہوا شخص اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے اور اس کو پھر دریا کے وسط میں دھکیل دیتا ہے اور وہ جب بھی دریا میں

سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا' مجھے جبرائیل اور میکائیل نے بتایا کہ خون کے دریا میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ سود خور تھے۔

(صحیح بخاری ج۱ ص ۱۸۵' مطبوعہ نور محمد اصح المطابع' کراچی' ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں سود خوروں کے عذاب قبر کا بیان ہے اور چونکہ یہ لوگ دنیا میں غریبوں کی رگوں سے خون نچوڑتے تھے اس لیے ان کو خون کے دریا میں ڈبویا گیا۔

سُود کے بارے میں

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

(سورۃ البقرۃ: آیت 280)

''اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیے اور صدقہ کرو تو تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے(۱) اگر تمہیں علم ہو''۔

مقروض کو مہلت دینے اور اس سے قرض وصول کرنے کا طریقہ:

جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ سود چھوڑ کر قرض خواہ کی اصل رقم واپس کر دی جائے اور ثقیف نے اپنی اصل رقوم کا بنو مغیرہ سے مطالبہ کیا تو بنو مغیرہ نے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور کہا: اس وقت ہمارے پاس مال نہیں ہے اور کہا: جس وقت ہمارے پھل اتریں گے ہم اس وقت ادائیگی کر دیں گے' تب یہ آیت نازل ہوئی اور اگر مقروض تنگ دست ہے تو اسے اس کی فراخ دستی تک مہلت دو اور تمہارا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے

جس شخص پر لوگوں کے بہت زیادہ قرض ہوں اور قرض خواہ مطالبہ کر رہے ہوں تو حاکم کے لیے یہ جائز ہے کہ مقروض کی ضروریات کے سوا باقی مال نیلام کر کے قرض خواہوں کے قرض ادا کر دے' اگر مقروض لوگوں کے واجبات ادا نہ کرے تو امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام شافعی' اور دیگر فقہاء کے نزدیک اس کو قید کرنا جائز ہے الا یہ کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے پاس واقعہ مال نہیں ہے۔

(تفسیر منیر ج ۳ ص ۱۰۱' ملخصا' مطبوعہ دار الکفر بیروت' ۱۴۱۲ھ)

مقروض کو ادائیگی کی مہلت دینا واجب ہے اور اس کا قرض معاف کر دینا مستحب ہے اور اس معاملہ میں مستحب کا اجر واجب سے زیادہ ہے۔

مقروض کو مہلت دینے اور قرض معاف کرنے کے اجر و ثواب کے متعلق احادیث:

مقروض کا قرض معاف کرنے کی فضیلت میں حسب ذیل احادیث ہیں:

حافظ سیوطی بیان کرتے ہیں: امام احمد، امام مسلم اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابوالیسر (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے تنگ دست کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا اللہ اس کو اس دن اپنے سائے میں رکھے گا جس دن اس کے سائے کے سوا اور کوئی سایا نہیں ہوگا۔

امام احمد، امام بخاری، اور امام مسلم نے حضرت حذیفہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ اللہ عزوجل کے سامنے ایک شخص کو پیش کیا جائے گا' اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا: تم نے دنیا میں کیا کیا؟ وہ شخص کہے گا: میں نے دنیا میں ایک ذرہ برابر بھی نیکی نہیں کی' تین بار یہی مکالمہ ہوگا' تیسری بار وہ کہے گا: میں دنیا میں اپنا فاضل مال دے دیا کرتا تھا' میں لوگوں کو چیزیں فروخت کرتا' امیر آدمی پر آسانی کرتا اور غریب کو مہلت دیتا تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہم تم سے زیادہ معاف کرنے کے حق دار ہیں' میرے بندے سے درگزر کرو' پھر اس کو بخش دیا جائے گا۔

امام احمد نے حضرت عمران بن حصین (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نے فرمایا: جس شخص کا کسی آدمی پر کوئی حق ہو اور وہ اس کو مؤخر کر دے تو اس کو ہر روز صدقہ کا اجر ملے گا۔

امام احمد حضرت ابن عمر (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی دعا قبول کی جائے اور اس کی مصیبت دور کی جائے وہ تنگ دست کے لیے کشادگی کرے۔

امام طبرانی نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے تنگ دست کو کشادگی تک مہلت دی اللہ تعالیٰ اس کو گناہوں سے توبہ کرنے کی مہلت دے گا۔

امام احمد، امام ابن ماجہ، امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت بریدہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے تنگ دست کو مہلت دی اس کو ہر دن قرض کے برابر صدقہ کا اجر ملے گا' پھر میں نے آپ سے سنا کہ جس نے تنگ دست کو مہلت دی اس کو ہر دن اس قرض کے دگنے صدقہ کا اجر ملے گا' میں عرض کیا: یارسول اللہ! پہلے تو آپ نے قرض کے برابر صدقہ کے اجر کا فرمایا تھا اور اب آپ نے دگنے صدقہ کے اجر کا فرمایا ہے' آپ نے فرمایا: جب تک قرض کی میعاد پوری نہیں ہوگی اس کو ہر روز قرض کے برابر صدقہ کا اجر ملے گا اور جب میعاد پوری ہو جائے گی اور وہ اس کو مہلت دے گا تو پھر اس کو ہر روز اس کے دگنے صدقہ کا اجر ملتا رہے گا۔ ۱ (اس حدیث میں قرض سے مراد دین ہے' یعنی کاروباری قرض' مدت معینہ کے ادھار پر کوئی چیز خریدنا' کیونکہ نجی قرضوں میں مدت کا تعین قرض دینے والے کی طرف سے جائز نہیں ہے ورنہ وہ قرض سود ہو جائے گا مثلاً سو روپے دے کر ایک ماہ کے تعین کے بعد دو روپے لینا ربا النسیہ ہے اور اگر مدت کا تعین نہ ہو تو پھر جائز ہے ہاں اگر قرض لینے والا مدت کا تعین کرے پھر جائز ہے' مثلاً وہ کہے: میں ایک ماہ بعد ادا کروں گا۔)

(مسند احمد ج ۵ ص ۳۶۰' سنن ابن ماجہ ص ۱۷۶' شعب الایمان ج ۷ ص ۵۳۸)

امام احمد' امام دارمی اور امام بیہقی نے "شعب الایمان" میں حضرت ابوقتادہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے مقروض کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا وہ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا۔ ۱ مسند احمد ج ۵ میں ۳۶۰ میں اسی طرح روایت ہے اور "سنن ابن ماجہ" "شعب الایمان" میں اسی طرح ہے کہ قرض کی میعاد پوری ہونے تک اس کو

صدقہ کا اجر ملے گا اور مہلت دینے کے بعد اس قرض کی مثل صدقہ کا اجر ملے گا" نیز مسند احمد ج ٥ ص ٣٥١ میں بھی اسی طرح ہے۔)

(مسند احمد ج ٢ ص ٣٥٩، سنن دارمی ج ٢ ص ١٧٩، شعب الایمان ج ٧ ص ٥٣٥)

امام احمد نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے کسی تنگ دست کو مہلت دی یا اس کا قرض معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی تپش سے محفوظ رکھے گا۔

(الدر المنثور ج ١ ص ٣٦٩۔ ٣٦٨ ملتقطا)

یتیم کا مال ادا کرنے کا حکم میں

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾

''اور یتیموں کا مال ان کو دے دو اور حلال چیز کے بدلے ناپاک اور حرام چیز نہ لو اور اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال ملا کر کھا نہ جاؤ، بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔۔۔۔ اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی (١) یہ زیادہ قریب ہے (کہ ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھکنے سے بچ جاؤ (٢)''۔

اس آیت میں یتیموں کے سرپرستوں کو خطاب ہے کہ جب یتیم بالغ ہو جائیں تو ان کے اموال ان کو دے دیئے جائیں یتیم کا ولی اس کا اچھا مال رکھ لیتا تھا اور اپنا خراب مال اس کو دے دیتا تھا اس آیت میں ان کو اس سے منع کیا گیا۔

علامہ ابو للیث نصر بن محمد سمرقندی حنفی متوفی ٣٧٥ھ اس آیت کے شان نزول میں لکھتے ہیں:

مقاتل نے کہا یہ آیت غطفان کے ایک شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے اس کے پاس اس کے یتیم بھتیجے کا بہت سارا مال تھا جب یتیم بالغ ہوا تو اس نے اپنا مال طلب کیا، اس کے چچا نے اس کو منع کیا اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس شخص کے سامنے اس آیت کی تلاوت کی، اس شخص نے کہا ہم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں اور بہت بڑے گناہ سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں اس نے اپنے بھتیجے کو مال دے دیا اس جوان نے اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا

(تفسیر سمرقندی ج ١ ص ٣٣١، مطبوعہ دار الباز مکرمہ مکرمہ ١٤١٣ھ)

یتیم کا مال کھانے اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی مذمت اور حسن سلوک کی تعریف:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، عرض کیا گیا: یارسول اللہ! وہ کیا کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا، مسلمان پاک دامن بے قصور عورت پر تہمت لگانا۔

(صحیح البخاری۔ رقم الحدیث ۶۸۵۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۹، سنن ابو داؤد رقم الحدیث، ۲۸۷٤، سنن نسائی رقم الحدیث: ۳۶۷۳)

امام ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جائے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۳۶۷۹، ج ٤ ص ۱۹۳، مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت، ۱٤۱۶)

اس حدیث میں امام ابن ماجہ منفرد ہیں اس کی سند میں ایک راوی یحییٰ بن ابی سلیمان ہے، امام بخاری نے کہا وہ منکر الحدیث ہے، (تاریخ الکبیر ج ۸ ص ۲۹۹۹) امام ابو حاتم نے کہا وہ مضطرب الحدیث ہے (الجرح والتعدیل ج ۹ ص ۶۳۸) امام ابن حبان نے اس کا ثقات میں ذکر کیا ہے۔

(کتاب الثقات ج ۹ ص ۲۶٤)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲٤۱ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنے دل کی سختی کی شکایت کی آپ نے فرمایا: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو اور مسکین کو کھانا کھلاؤ۔

(مسند احمد ج ۲ ص ۳۸۷، ۲۶۳ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

اس حدیث کی سند صحیح ہے (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۶۰)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (النساء: ۳)

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳

''اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین، چار چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی (۱) یہ زیادہ قریب ہے (کہ ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھکنے سے بچ جاؤ''۔

نکاح کی ترغیب اور فضیلت کے متعلق احادیث:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اے نوجوانوں کے گروہ تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہو وہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح نظر کو زیادہ نیچے رکھتا ہے اور شرم گاہ کی زیادہ حفاظت کرتا ہے اور تم میں سے جو شخص نکاح کی طاقت نہیں رکھتا وہ روزے رکھے کیونکہ روزے اس کی شہوت کو کم کریں گے۔

(صحیح البخاری: رقم الحدیث: ۱۹۰۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۴۰۰، جامع الحدیث: ۱۰۸۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۰۴۶، سنن نسائی رقم الحدیث: ۳۲۰۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۴۵)

امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نکاح میری سنت سے ہے۔ جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا۔ وہ میرے طریقہ (کاملہ) پر نہیں ہے، نکاح کرو کیونکہ تمہاری وجہ سے میری امت دوسری امتوں سے زیادہ ہوگی، جس کے پاس طاقت ہو وہ نکاح کرے اور جس کے پاس طاقت نہ ہو وہ روزے رکھے، کیونکہ روزے اس کی شہوت کو کم کریں گے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۴۶)

اس حدیث کی سند میں عیسیٰ بن میمون ایک ضعیف راوی ہے مگر اس حدیث کا ایک صحیح شاہد ہے۔

امام ابوعیسی محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوایوب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں: ختنہ کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا اور نکاح کرنا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے

(جامع ترمذی رقم الحدیث: ۱۰۸۰)

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دنیا عارضی نفع کا سامان اور اس میں بہترین نفع کی چیز نیک عورت ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۴۶۷، سنن نسائی رقم الحدیث: ۳۲۳۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۵۵، مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۸)

امام محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے خوف کے بعد مومن کے فائدہ کی سب سے اچھی چیز اس کی نیک بیوی ہے اگر وہ اس کو حکم دے تو وہ اس کی فرمان برداری کرے اگر وہ اس کو دیکھے تو وہ اس کو خوش کرے اگر وہ اس پر قسم کھائے تو وہ اس کی قسم کو پورا کرے اور اگر وہ کہیں چلا جائے تو اس کی جان اور مال کی خیر خواہی کرے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث ۱۸۵۷)

اس حدیث کی سند میں علی بن یزید بن جدعان ضعیف ہے لیکن اس حدیث کا ایک شاہد ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ازواج کے پاس تین شخص آئے اور انھوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عبادت کے متعلق سوال کیا۔ جب ان کو آپ کی عبادت کے متعلق بتایا گیا تو انھوں نے اس کو کم گمان کیا انھوں نے کہا کہاں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے بظاہر خلاف اولی سب کام

معاف فرما دیئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو ہمیشہ ساری رات نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ ساری عمر روزے رکھوں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور ساری عمر نکاح نہیں کروں گا۔ سو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تشریف لے آئے اور آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس اس طرح کہا تھا بہ خدا میں تم سب لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ سو جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ میرے طریقہ (کاملہ) پر نہیں ہے۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث، ۵۰۶۳ صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۴۰۱ سنن کبری للبیہقی ج ۷ ص ۷۷، شعب الایمان ج ٤ ص ۳۸۱)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی عورت سے چار سبب سے نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب (آباء واجداد کا شرف اور فضیلت) کی وجہ سے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کی دینداری کی وجہ سے۔ تم اس کو اس کی دینداری کی وجہ سے طلب کرو۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث، ۵۰۹۰، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱٤٦٦، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۲۰٤۷، سنن نسائی، رقم الحدیث: ۳۲۳۰، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۸۵۸، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۱۷٦، مسند احمد ج ۲ ص ٤۲۸، سنن کبری للبیہقی ج ۷ ص ۸۰)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲٤۱ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کئی خصلتوں کی وجہ سے عورت سے نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کے حسن کی وجہ سے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے عمدہ اخلاق کی وجہ سے اور اس کی دینداری کی وجہ سے، تم دیندار اور اچھے اخلاق والی سے نکاح کرو اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہوں۔

(مسند احمد ج ۳ ص ۸۰، کشف الاستار عن زوائد البزار رقم الحدیث: ۱٤۰۳، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۱۰۰۸)

امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دنیا کی (یہ چیزیں) میرے نزدیک محبوب کی گئی ہیں۔ عورتیں، خوشبو اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں بنائی گئی ہے۔

(سنن نسائی، رقم الحدیث: ۳۹٤۹، مسند احمد ج ۳ ص ۲۸۵، ۱۹۹، ۱۲۸، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۳٤٦۹، سنن کبری للبیہقی ج ۷ ص ۷۸)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳٦۰ ھ روایت کرتے ہیں:

ابونجیح بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص نکاح کرنے کی مالی وسعت رکھتا ہو پھر نکاح نہ کرے وہ میری سنت (میرے طریقہ کاملہ) پر نہیں ہے

(المعجم الاوسط، رقم الحدیث: ۹۹۳، ج ۱ ص ۵۲۸، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض ۱٤۰۵ ھ)

یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند حسن ہے (مجمع الزوائد ج ٤ ص ۲۵۱)

امام ابویعلی احمد بن علی موصلی متوفی ۳۰۷ ھ روایت کرتے ہیں:

عبید بن سعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں: آپ نے فرمایا جو میری فطرت سے محبت رکھتا وہ میری سنت پر عمل کرے اور میری سنت سے نکاح ہے۔ (مسند ابویعلی رقم الحدیث ۲۷٤۰، سنن کبری للبیہقی ج ۷ ص ۷۸، الاصابہ ج ٤ ص ۲۰٤،

شعب الایمان ج ٤ ص ٣٨١) یہ حدیث مرسل ہے (ابن حجر) اس کے راوی ثقہ ہیں۔

(مجمع الزوائد ج ٤ ص ٢٥٢)

امام احمد بن عمرو بزار متوفی ٢٩٢ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے قریش کے جوانو! زنا نہ کرو جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی اس کے لیے جنت ہے۔ (کشف الاستار عن زوائد البزار رقم الحدیث: ١٤٠١، المعجم الکبیر ج ١٢ ص ١٢٨ رقم الحدیث: ٢٧٧٦، المعجم الاوسط رقم الحدیث ٦٨٤٦) اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(مجمع الزوائد ج ٤ ص ٢٥٣)

امام مسلم بن حجاج قشیری ٢٦١ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب انسان مرجاتا ہے تو تین چیزوں کے سوا اس کے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں صدقہ جاریہ یا وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جائے یا نیک بیٹا جو اس کے لیے دعا کرے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٦٣١، جامع ترمذی رقم الحدیث: ١٣٧٦، سنن نسائی رقم الحدیث ٣٦٥٣، الادب المفرد رقم الحدیث: ٣٨، مسند احمد ج ٢ ص ٣٧٢، مصابیح السنۃ ج ١ ص ١٦٧، رقم الحدیث: ١٥٢)

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ٢٧٥ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت معقل بن یسار (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا مجھے ایک معزز خاندان کی خوبصورت عورت ملی ہے لیکن وہ بانجھ ہے کیا میں اس سے نکاح کرلوں؟ آپ نے فرمایا نہیں۔ اس نے دوسری اور تیسری بار پوچھا آپ نے فرمایا (خاوند سے) محبت کرنے والی اور بچہ پیدا کرنے والی عورت سے نکاح کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے امتوں پر فضیلت حاصل کروں گا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٢٠٥٠، سنن نسائی رقم الحدیث: ٣٢٢٧، سنن ابی ماجہ رقم الحدیث: ١٨٦٣، مسند احمد ج ٣ ص ١٥٤٨، ٣٥٤ ج ٤، ٣٤٩، ٣٥١)

نکاح کی حکمتیں اور فوائد:

(١) نکاح کے ذریعے نسل انسان کا فروغ ہوتا ہے انسان میں شہوت اس لیے رکھی گئی ہے کہ مذکر بیج کا اخراج کرے اور مونث کی کھیتی میں اس کی کاشت کرے، اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کے بغیر بھی نسل انسانی کی افزائش کرسکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا کہ اسباب کا مسببات پر ترتب ہو، مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کی وجہ سے اولاد کی طلب کی کوشش کرے اور رسول اللہ سے محبت کی وجہ سے آپ کی امت کو بڑھانے کی کوشش کرے۔

(٢) نکاح کے ذریعہ اولاد کا حصول ہوتا ہے اور انسان کو نیک اولاد کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں جو بعض اوقات اس کی بخشش کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

(٣) انسان اولاد کی اچھی تربیت کرکے ملک وملت کی تعمیر اور استحکام کے لیے افراد مہیا کرتا ہے۔

(٤) اولاد کی وجہ سے رسول اللہ کی سیرت کے اس حصہ پر عمل کا موقعہ ملتا ہے جس کا تعلق اولاد سے ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے جن احکام کا تعلق اولاد سے ہے ان پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے۔

(۶) اولاد کی تربیت اور پرورش کر کے مسلمان اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا مظہر ہو جاتا ہے۔

(۷) جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو اولاد اس کا سہارا بن جاتی ہے۔

(۸) بچوں کی وجہ سے انسان کا گھر میں دل بہلتا ہے انسان بیمار ہو تو بچے اس کی تیمارداری کرتے ہیں۔

(۹) بچوں کی کفالت کی وجہ سے انسان کے دل میں زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور کمانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس سے ملک وملت کی تعمیر اور ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۱۰) بچوں کی وجہ سے انسان کے دل میں رحم اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

(۱۱) شادی شدہ شخص معاشرہ میں الگ تھلگ نہیں رہتا اور اس کو عزت اور توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۱۲) اولاد کی شادی بیاہ کی وجہ سے نئی نئی رشتہ داریاں پیدا ہوتی ہیں

(۱۳) بچے اگر کم عمری میں فوت ہو جائیں تو وہ ماں باپ کی شفاعت کرتے ہیں اور ان کی مغفرت کا سبب بن جاتے ہیں۔

(۱۴) ماں باپ کی تعلیم کی وجہ سے اولاد جو نیکیاں کرتی ہے ان کا اجر ماں باپ کو ملتا رہتا ہے۔

(۱۵) بعض اوقات اولاد کی نیکیوں سے ماں باپ کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

(۱۶) نکاح کے ذریعہ انسان کی شہوت کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور وہ شیطان کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے اس کی نظر پاکیزہ ہو جاتی ہے اور وہ بدکاریوں سے بچا رہتا ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص نکاح کرتا ہے وہ اپنے نصف دین کو محفوظ کر لیتا ہے سو باقی نصف دین کو محفوظ کرنے کے لیے خدا سے ڈرنا چاہیے۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۷۶۴۳)

(۱۷) انسان کو بیوی کے ذریعہ سکون ملتا ہے:

(آیت) "هو الذی خلقکم من نفس واحدة وجعل منها زوجها لیسکن الیها"۔ (الاعراف: ۱۸۹)

ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کیا اور اس سے اس کی بیوی بنائی تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔

(۱۸) نکاح کی وجہ سے انسان پر اس کی بیوی اور بچوں کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور ان کے حقوق و فرائض اس کے ساتھ متعلق ہو جاتے ہیں اور اس کی قوت عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۱۹) انسان اپنے اہل اور عیال کی اصلاح میں مصروف ہوتا ہے اور جو شخص صرف اپنی اصلاح میں منہمک ہو اس سے اس کا درجہ بہت زیادہ ہے جو اپنے اہل و عیال کی اصلاح میں بھی مشغول ہو۔

(۲۰) حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اچھی طرح نماز پڑھتا ہو اس کے بچے زیادہ ہوں اور مال کم ہو اور وہ شخص مسلمانوں کی غیبت نہ کرتا ہو میں اور وہ جنت میں ایک ساتھ ہوں گے۔

(کنز العمال رقم الحدیث: ۴۳۴۷۸)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ جب کسی شخص کے گناہ زیادہ ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو بال بچوں کے غم میں مبتلا کردیتا ہے۔
(مسند احمد ج ۲ ص ۱۵۷)

حضرت ام سلمہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی دو بیٹیوں یا دو بیٹیوں یا دو بہنوں یا اپنی دو رشتہ دار لڑکیوں پر خرچ کیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے غنی کردیا یا ان سے کفایت کردی تو وہ اس کے لیے دوزخ سے حجاب ہوجائیں گی۔
(المعجم الکبیر ج ۲۳ رقم الحدیث: ۳۹۲)

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عورتوں سے فرمایا تم میں سے جو عورت تین نابالغ بچوں کی موت پر صبر کرے گی وہ اس کے لیے دوزخ سے حجاب بن جائیں گے ایک عورت نے پوچھا اور دو پر؟ فرمایا دو پر۔
(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۰۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۳۳، جامع ترمذی رقم الحدیث: ۱۰۵۹، سنن نسائی رقم الحدیث: ۱۸۷۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۶۰۵، مسند احمد ج ۱ ص ۳۷۵، ۴۲۹، ۴۵۱، ج ۲ ص ۲۷۶)

یتیم کے مال کے متعلق احکام

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝

(سورۃ النساء آیت 6)

اور یتیموں کو ان کے بالغ ہونے تک سدھارتے اور آزماتے رہو پھر اگر ان میں تم ہوشیاری اور حسن تدبیر پاؤ تو انہیں ان کے مال سونپ دو اور ان کے بڑے ہوجانے کے ڈر سے ان کے مالوں کو جلدی جلدی فضول خرچیوں میں تباہ نہ کردو مال داروں کو چاہیے کہ (ان کے مال سے) بچتے رہیں ہاں مسکین محتاج ہو تو دستور کے مطابق واجبی طرح سے کھالے، پھر جب انہیں ان کے مال سونپو تو گواہ بنالو دراصل حساب لینے والا اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے وابتلو الیتمیٰ اور یتیموں کی جانچ کرلو یعنی بالغ ہونے سے پہلے یتیموں کی عقل کی جانچ کرلو تھوڑا سا مال ان کے قبضہ میں دے کر دیکھو کہ وہ کس طرح اس میں تصرف کرتے ہیں اگر وہ ہوشیار ہوں گے تو شروع میں ہی ان کی ہوشیاری ظاہر ہوجائے گی۔ ہوشیار بچہ کو تجارتی لین دین کی اجازت اس آیت سے معلوم ہوتی ہے یہی امام ابوحنیفہ (رح) کا قول ہے کہ امام شافعی کے نزدیک بچہ کو تجارت کی اجازت نہیں اور آیت میں جانچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے نکاح کے مبادی ان کے سپرد کردیئے جائیں۔ امام

ابوحنیفہ (رح) کا قول زیادہ ظاہر ہے۔

حتی اذا بلغوا النکاح یہاں تک کہ جب وہ نکاح کو پہنچ جائیں یعنی اس عمر کو پہنچ جائیں کہ نکاح اور نسل آفرینی کی ان میں صلاحیت پیدا ہو جائے لڑکے میں اس کی علامت احتلام جماع کے وقت انزال اور صلاحیت تولید ہے اور لڑکی میں حیض احتلام اور حاملہ ہونے کی صلاحیت ہے اگر ان علامات میں سے کوئی علامت نہ پیدا ہو تو امام مالک، امام احمد، امام شافعی، امام ابو یوسف کے نزدیک لڑکے اور لڑکی کے بلوغ کی عمر پورے پندرہ سال ہیں ایک روایت میں امام ابوحنیفہ کا قول بھی یہی آیا ہے اور اسی پر فتویٰ بھی ہے مگر امام صاحب کا مشہور قول یہ ہے کہ لڑکی کے لیے پورے سترہ اور لڑکے کے لیے پورے اٹھارہ سال اور ایک روایت کے بموجب پورے انیس سال ہونا چاہیے۔

جمہور کے مسلک کی دلیل

جمہور نے اپنے مسلک کی دلیل میں حضرت انس کی روایت کو پیش کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: جب مولود (بچہ اور بچی) کی عمر پورے پندرہ سال کی ہو جاتی ہے تو اس کے مفید مضر اعمال لکھے جاتے ہیں اور اس پر حدود قائم کی جائیں۔ (رواہ البیہقی فی الخلافیات) اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ صحیحین میں حصرت ابن عمر کا قول آیا ہے کہ احد کے دن جب کہ میری عمر چودہ سال تھی (شرکت جنگ کی اجازت کے لیے) مجھے رسول اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شرکت کی اجازت نہیں دی۔ پھر خندق کے دن جب کہ میری عمر ۱۵ سال تھی مجھے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاینہ میں پیش کیا گیا اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اجازت دے دی۔

بلوغ کی علامت

امام احمد کے نزدیک بلوغ کی ایک علامت پوشیدہ بالوں کی روئیدگی بھی ہے (مشرکین کے لیے بھی اور مسلمانوں کے لیے بھی) امام شافعی کے نزدیک مشرکین کے لیے بلوغ کی علامت روئیدگی ہے مسلمانوں کے لیے نہیں ہے یا ہے۔ یہ دونوں روایتیں امام شافعی سے منقول ہیں امام ابوحنیفہ (رح) پوشیدہ بالوں کی روئیدگی یا عدم روئیدگی کو ہیچ قرار دیتے ہیں نا قابل اعتبار۔ امام احمد و امام شافعی کے قول کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ابن حبان اور حاکم اور اصحاب سنن نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے کہ عطیہ قرظی نے فرمایا: بنی قریظہ (کی گرفتاری و قتل) کے دن مجھے رسول اللہ کے معاینہ میں پیش کیا گیا کیونکہ لوگوں کو میرے بالغ اور نابالغ ہونے میں شک تھا رسول اللہ نے حکم دیا کہ پوشیدہ بالوں کو دیکھو پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں لوگوں نے حکم کی تعمیل کی مگر بال نہ پائے اس لیے مجھے (قتل سے) چھوڑ دیا گیا اور قیدیوں میں شامل کر دیا گیا۔

فان انستم منهم رشدا پس اگر بلوغ کے بعد تم ان سے ہوشیاری دیکھو (محسوس کرو) یعنی لین دین میں خرابی محسوس نہ ہو اور معاملات میں درستی نظر آئے۔ امام ابوحنیفہؒ امام مالک اور امام احمد نے رشدًا کا مطلب یہی بیان کیا ہے امام شافعی نے فرمایا۔ صلاح دین، حفاظت مال اور مال کو ترقی دینے کی تدبیروں کا علم رشد سے مراد ہے۔

بیہقی نے علی (رض) بن طلحہ (رض) کی سند سے حضرت ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم کو ان کے

اندر دینی صلاح اور حفاظت مال بلوغ کے بعد نظر آئے۔ثوری نے جامع میں منصور کی روایت سے مجاہد کا قول بھی یہی نقل کیا ہے اور بیہقی نے یزید بن ہارون از ہشام بن حسان کی روایت سے حسن بصری کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔نتیجہ اختلاف یہ ہے کہ امام شافعی کے نزدیک فاسق صاحب رشد نہیں ہے اور دوسرے لوگوں کے نزدیک فاسق رشید ہے۔

فادفعوا الیھم اموالھم تو ان کا مال فوراً بالغ ہوتے ہیں بلا تاخیر ان کو دیدو۔

ترکیب عبارت اذا بلغوا ظرف ہے لیکن اس میں شرط کا معنی ہے اور ظرف کا تعلق ادفعوا سے ہے حتیٰ ابتدائیہ ہے ما قبل حتیٰ ما بعد کا سبب ہے یہ حتیٰ جارہ نہیں ہے کیونکہ اذا کے اندر فی (ظرفیت) کا معنی ہے۔اس لیے حتیٰ جارہ اس پر داخل نہیں ہوسکتا۔

مطلب یہ ہے کہ یتیموں کی جانچ کرلو تاکہ نکاح کی عمر کو پہنچنے پر جب تم کو ان کی ہوشیاری نظر آجائے تو ان کا مال ان کو دیدو۔گو جانچ کرنا مال دینے کا سبب ہے لیکن دینا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے بلوغ اور احساس رشد۔اسی لیے امام شافعی، امام مالک، امام احمد اور صاحبین نے فرمایا: کہ جب تک رشد دیکھ نہ لیا جائے ان کا مال ان کے ہاتھوں میں نہ دیا جائے مگر امام ابوحنیفہ (رح) کے نزدیک احساس رشد لازم نہیں۔مال دینے کے لیے پچیس سال کی عمر پوری ہوجانا کافی ہے کیونکہ مال دینے کی ممانعت بچپن کے آثار کی وجہ سے کی گئی ہے اور ابتدائی بلوغ میں بچپن کے آثار باقی رہتے ہیں اور زیادہ وقت گذرنے پر نشان طفولیت ختم ہوجاتا ہے۔لہٰذا ممانعت کا حکم باقی نہیں رہ سکتا۔اسی لیے امام صاحب کا قول ہے کہ بلوغ کے وقت اگر کوئی بچہ صاحب رشد تھا پھر سفیہ ۱؎ ہوگیا تو مال سے اس کو نہیں روکا جائے گا کیونکہ اس کی یہ سفاہت بچپن کے اثر کی وجہ سے نہیں ہے۔امام صاحب نے فرمایا: کہ رشداً کی تنوین تقلیل کے لیے ہے یعنی اگر تم کو ان کے اندر کسی قسم کا تھوڑا سا رشد بھی نظر آئے تو ان کا مال دیدو۔تکمیل رشد کا انتظار نہ کرو اور چونکہ پچیس سال کی عمر میں کسی نہ کسی قسم کا رشد کسی درجہ میں حاصل ہو ہی جاتا ہے۔لہٰذا اس کا مال دیدو مال کی روک کا حکم تو ادب آموزی کے لیے تھا اس عمر کے بعد ادب سیکھنے کا بظاہر کوئی امکان نہیں یا یوں کہو کہ غالباً امکان ادب آموزی ختم ہوجاتا ہے ایسی حالت میں مال روکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔لہٰذا دیدینا لازم ہے۔

مسئلہ* جس سفیہ کو مال دینے کی ممانعت کی گئی ہے اس کا کوئی مالی معاملہ نافذ نہیں ہوسکتا نہ بیع کرسکتا ہے نہ غلام کو آزاد کرسکتا ہے یہ مسلک امام شافعی کا ہے لیکن امام محمد کے نزدیک سفیہ کا وہ تصرف تو جاری ہوجائے گا جو فسخ کردینے کے قابل ہی نہیں ہے اور وہ تصرف نافذ نہ ہوگا جس کو ولی کی اجازت سے فسخ کیا جاسکتا ہے جیسے خرید و فروخت لیکن امام ابو یوسف اور اکثر علماء کے نزدیک جب تک قاضی نے روک نہ کردی ہو سفیہ کے تمام تصرفات نافذ ہوں گے اور قاضی ہر تصرف سے روک سکتا ہے۔اگر قاضی روک دے تو سفیہ کی نہ بیع نافذ ہوگی نہ کوئی ایسا تصرف نافذ ہوگا جس میں مذاق کے طور پر زبان سے کہہ دینا بھی سنجیدگی کا حکم رکھتا ہے لیکن غلام کی آزادی کا حکم نافذ ہوجائے گا اور امام ابو یوسف کے نزدیک غلام پر لازم ہوگا کہ محنت مزدوری یا اور کوئی کام کرکے اپنی قیمت ۲؎ ادا کرے امام محمد کے مثبت و منفی دو قول آئے ہیں اوّل قول امام ابو یوسف کے موافق ہے اور دوسرے قول میں غلام کو اپنی قیمت کا ذمہ دار نہیں قرار دیا ہے۔

امام ابوحنیفہ (رح) نے فرمایا: قاضی کے لیے جائز ہی نہیں کہ کسی عاقل بالغ کو بکی عقل یا دین یا فسق کی وجہ سے تصرفات سے روک دے۔اس فعل کا معنی یہ ہوگا کہ آدمیت کے حقوق سلب کرکے چوپایوں میں اس کو پہنچادے اور حقوق انسانیت کا سلب بربادی

مال سے زیادہ سخت ہے ادنٰی ضرر کو دفع کرنے کے لیے بڑے ضرر کو نہیں اختیار کیا جاسکتا۔

شافعی اور احمد وغیرہ سفیہ کو تصرفات سے روک دینے کے جواز کے قائل ہیں ان کے اس مسلک کی دلیل یہی آیت ہے آیت دلالت کر رہی ہے کہ سفیہ سے مال کو روک دیا جائے لیکن اگر اس کے ہاتھ کو تصرف سے روک بھی دیا جائے تب بھی کوئی نتیجہ نہ ہوگا کیونکہ وہ زبان سے (خرید وفروخت وغیرہ) تصرفات کرسکے گا اس لیے اس کو ہر طرح کی باز داشت قاضی کی طرف سے ہونی چاہیے۔ امام ابوحنیفہ (رح) نے فرمایا: مالی تصرف سے صرف ہاتھ کو روکنا بھی مفید ہوسکتا ہے کیونکہ بکی عقل کا ظہور اکثر ہبہ اور صدقات وخیرات کی صورت میں ہوتا ہے اور ایسا تصرف ہاتھ کا محتاج ہے زبانی ہبہ (اور صدقہ) بغیر قبضہ کے نافذ نہیں۔ امام اعظم کی دلیل حضرت انس کی روایت ہے کہ ایک آدمی بیع وشراء کے معاملہ میں کمزور تھا مگر خرید وفروخت کرتا ضرور تھا اس کے گھر والوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کو خرید وفروخت سے روکدیا جائے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بلوا کر بیع کرنے کی ممانعت فرمادی۔ اس شخص نے عرض کیا یارسول اللہ مجھ سے تو بغیر بیع کے صبر نہیں ہوتا فرمایا: تو جب بیع کیا کرو تو یہ کہہ دیا کرو کہ کوئی دھوکہ نہ ہونا چاہیے (مجھے فسخ کا اختیار ہے ۱۔)۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے دیکھو رسول اللہ نے اس کو بیع سے بالکل باز داشت نہیں کی اور تحریمی ممانعت نہیں فرمائی۔

شافعی (رح) کی طرف سے اس کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ وہ شخص خود قصداً اپنا مال برباد نہیں کرتا تھا بلکہ سبک عقلی کی وجہ سے خرید وفروخت میں اس کو نقصان ہوجاتا تھا اس کا تدارک حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس قول سے ہوسکتا تھا کہ کوئی دھوکہ ۲۔ نہ ہونا چاہیے۔ (چنانچہ آپ نے یہی فرمایا) اور ہماری گفتگو اس سفیہ کے متعلق ہے جو دانستہ خود اپنا مال برباد کرتا ہو۔ بغوی نے لکھا کہ سفیہ کو تمام مالی تصرفات سے روک دینے کے جواز کی دلیل صحابہ کا اتفاق آراء ہے۔

عروہ نے ہشام سے ہشام نے قاضی ابو یوسف سے امام ابو یوسف نے امام محمد سے، امام شافعی سے بیان کیا کہ عبداللہ بن جعفر نے کچھ بھوڑ زمین ساٹھ ہزار درہم کو خریدی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: میں عثمان کے پاس جا کر تیری خرید کا اختیار بند کرادوں گا۔ عبداللہ نے جا کر حضرت زبیر سے یہ بات کہہ دی۔ حضرت زبیر نے کہا میں اس بیع میں تمہارا شریک (مشورہ) ہوں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عثمان کے پاس گئے اور کہا اپنے بھتیجے کو تصرفات سے روک دیجئے۔ (وہ سفیہ ہے) حضرت زبیر نے کہا میں (مشورہ میں) ان کا شریک ہوں حضرت عثمان نے کہا اب میں کسی کو کیسے اس تصرف سے روک دوں جس (کے مشورہ میں) ان کا شریک ہوں حضرت عثمان نے کہا اب میں کسی کو کیسے اس تصرف سے روک دوں جس (کے مشورہ) میں زبیر شریک ہیں۔ ابو عبیدہ نے کتاب الاموال میں اپنی سند سے ابن سیرین کی روایت سے لکھا ہے کہ عثمان نے علی سے کہا۔ (غالبا کتابت کی غلطی ہے حضرت عثمان نے حضرت علی سے یہ بات نہیں کہی بلکہ حضرت علی نے حضرت عثمان سے کہی تھی جیسا کہ شافعی کی مذکورہ بالا روایت میں صراحت ہے۔)

آپ اپنے بھتیجے کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتے اور اس کی خرید وفروخت کی بندش کیوں نہیں کر دیتے۔ اس نے ساٹھ ہزار درہم کو ایسی شورناک زمین خریدی ہے کہ مجھے وہ اپنی جوتی کے بدلہ میں بھی نہیں بھاتی۔ بغوی نے کہا اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیہ کی بندش اختیار پر صحابہ متفق تھے اسی وجہ سے تو حضرت زبیر نے بندش اختیار کو دور کرنے کا حیلہ کیا۔

مسئلہ* اگر نابالغ بالغ ہونے کے وقت تو صاحب رشد ہو پھر سبک سر بربادکن ہوجائے تو اس کو ممنوع التصرف قرار دینا ان علماء

کے نزدیک جائز ہے جو بلوغ کے وقت سفیہ کو ممنوع التصرف قرار دینے کے قائل ہیں جیسا کہ عبداللہ بن زبیر کے قصہ سے واضح ہو رہا ہے۔ رہا قرضدار تو اس کو بھی ممنوع التصرف قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ کعب بن مالک نے اپنے باپ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے حضرت معاذ کو مال میں تصرف (خرید فروخت) کرنے سے قرضدار ہونے کی وجہ سے روک دیا تھا اور آپ کا مال بکوادیا تھا۔ (رواہ الدارقطنی والحاکم والبیہقی)

ابوداؤد نے مراسیل میں اور سعید نے سنن میں مرسلاً عبدالرزاق کی روایت سے اور ابن جوزی نے ابن مبارک از معمر کی روایت سے مرسلاً بیان کیا کہ حضرت معاذ بن جبل سخی جوان تھے کچھ روک کر نہیں رکھتے تھے اور برابر قرض لیتے رہتے تھے یہاں تک کہ آپ کا مال قرض میں ڈوب گیا مجبوراً آپ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ حضور قرض خواہوں سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے متعلق کچھ گفتگو کریں اگر قرض خواہ کسی کو چھوڑ دیتے تو رسول اللہ کی سفارش سے حضرت معاذ کو چھوڑ دیتے (لیکن انھوں نے کچھ نہیں چھوڑا) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت معاذ کا مال فروخت کردیا اور حضرت معاذ ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہوگئے۔ عبدالحق نے کہا یہ حدیث بصورت ارسال متصل سے زیادہ صحیح ہے۔ ابن صلاح نے احکام میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ثابت ہے یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قرض خواہوں کے مطالبہ کا ۷/۵ حصہ دیا۔ قرض خواہوں نے کہا ۷/۲ بھی فروخت کرکے ہم کو دیدیجئے فرمایا: اب تمہارے لیے (باقی مال پر قبضہ کرنے کا) کوئی راستہ نہیں۔

امام ابوحنیفہ (رح) نے فرمایا: کہ قاضی قرضدار کو نہ ممنوع التصرف کرسکتا ہے نہ اس کا مال فروخت کرسکتا ہے کیونکہ اس کے مال کی خود اپنے حکم سے فروختگی بھی ایک قسم کی بندش تصرف ہے اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ یہ بغیر رضامندی کی بیع ہے جو ناجائز ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے: اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ بلکہ قاضی یہ کرسکتا ہے کہ قرضدار کو قید کردے یہاں تک کہ وہ تنگ آ کر اپنا مال فروخت کردے اور قرضخواہوں کا قرض چکا دے اور اس پر بھی (قاضی کی طرف سے) ظلم نہ ہو۔ رہا حضرت معاذ کا قصہ تو ہم کو یہ تسلیم نہیں ہے کہ حضرت معاذ کی مرضی کے خلاف رسول اللہ نے ان کا مال فروخت کردیا تھا یہ ناممکن تھا کہ رسول اللہ کے عمل سے معاذ ناراض ہوتے بلکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کی مرضی سے ان کا مال فروخت کیا تھا جیسے کسی کی طرف سے وکیل فروخت کرتا ہے یا فضولی آدمی کسی کا مال بیچ ڈالتا ہے اور بعد کو اصل مالک رضامندی دیدیتا ہے روایت میں جو آیا ہے کہ **حجر علی معاذ مالہ و اباعہ** یہ صرف زاری کا خیال ہے کہ حضرت معاذ کے مال کی فروخت کو انھوں نے حجر علی معاذ قرار دیدیا کیونکہ واقدی کے سلسلہ سے بیہقی نے اس حدیث کو بیان کیا ہے اس حدیث کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ رسول اللہ نے اس کے بعد حضرت معاذ کی شکستہ دلی دور کرنے کے لیے یمن کو عامل بنا کر بھیج دیا۔ طبرانی نے کبیر میں لکھا ہے کہ رسول اللہ نے جب حج کیا تو معاذ کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا آپ ہی سب سے پہلے اللہ کے مال (وصول کرنے) کے لیے اجیر بنے۔ اس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ کہ رسول اللہ نے حضرت معاذ کو ممنوع التصرف نہیں کیا تھا۔

مسئلہ: اگر کوئی دیوالیہ ہوجائے اور حاکم اس کا مال قرض خواہوں کی تقسیم کرادے اور پھر بھی قرض باقی رہ جائے مگر اس کو پیش ایسا آتا ہو جس کی اجرت اس کے ضروری مصارف سے زائد ہو تو امام احمد نے (ایک روایت کے اعتبار سے) کہا ہے کہ حاکم ادائے قرض کے لیے اسکو مزدوری کرنے کی اجازت دے سکتا ہے دوسری روایت میں امام احمد (رح) کا قول اس کے خلاف ہے باقی ائمہ نفی اجازت کے قائل ہیں۔

اوّل قول کے ثبوت میں امام احمد نے اس حدیث کو پیش کیا ہے جو دارقطنی نے زید بن اسلم کی روایت سے لکھی ہے زید بن اسلم نے کہا میں نے اسکندریہ میں ایک بوڑھا شخص دیکھا جس کو سرق کہا جاتا تھا میں نے کہا یہ کیسا نام ہے؟ بوڑھے نے کہا میرا یہ نام رسول اللہ نے رکھا تھا اور میں اس کو ہر گز ترک نہیں کروں گا۔ میں نے کہا رسول اللہ نے تمہارا یہ نام کیوں رکھا تھا؟ بوڑھے نے کہا: میں (ایک بار) مدینہ کو گیا اور لوگوں سے کہا: میرا مال آنے والا ہے لوگوں نے مجھ سے آنے والے مال کا سودا کر لیا لیکن سب مال برباد ہو گیا (اور میرا مال نہیں آیا) لوگ رسول اللہ کی خدمت میں پہنچے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تو چور ہے اور حضور ﷺ نے مجھے چار اونٹوں کی قیمت میں بیچ ڈالا۔ جس شخص نے مجھے خریدا تھا قرض خواہوں نے اس سے پوچھا تم اس کا کیا کرو گے؟ اس نے کہا: میں اسے آزاد کردوں گا قرض خواہوں نے کہا: تو ثواب کی طلب میں ہم تم سے کم نہیں ہیں چنانچہ قرض خواہوں نے مجھے آزاد کر دیا اور میرا نام باقی رہ گیا۔

ابن جوزی (رح) نے لکھا ہے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ رسول اللہ نے اس کی ذات کو تو فروخت کیا نہ تھا کیونکہ آزاد تھا (اور آزاد مملوک نہیں ہو سکتا) بلکہ اس کے منافع (یعنی مزدوری کی آمدنی) کو فروخت کیا تھا پس آزاد کرنے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے خدمت لینے سے مجھے آزاد کر دیا۔

کوئی وجہ نہیں کہ اس حدیث میں لفظ بیع سے بیع منافع مراد لی جائے کیونکہ یہ تو عمل مجہول کا ٹھیکہ ہو جائے گا لہٰذا یہ حدیث باجماع علماء متروک ہے (کیونکہ آزاد کی بیع بالاجماع ناجائز ہے) رہا رسول اللہ کا عمل تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لوگوں کی جانوں میں تصرف کرنے کا حق تھا دوسروں کو وہ حق حاصل نہیں۔ حضرت ابو سعید کی روایت ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں ایک شخص نے پھل خریدے اور اس کے پھل مارے گئے اور اس پر قرض بہت ہو گیا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس کو خیرات دو حکم کی تعمیل کی گئی مگر چندہ اتنا نہیں ہوا کہ اس کا قرض پورا ہو سکتا۔ حضور نے قرض خواہوں سے فرمایا: جتنا تم کو مل گیا لے لو بس اس سے زیادہ تم کو نہیں ملے گا۔ یہ حدیث صاف بتا رہی ہے کہ وصول قرض کے لیے قرض دار کا فقط مال لیا جا سکتا ہے۔ مدیون پر (قرض خواہوں کا) اور کوئی حق نہیں (یعنی قرض دار کو نہ ممنوع التصرف کیا جا سکتا ہے نہ مزدوری یا نوکری وغیرہ سے روکا جا سکتا ہے) واللہ اعلم۔

ولا تاکلوھا (یعنی اے یتیموں کے سرپرستو!) یتیم کا مال نہ کھاؤ۔

اسرافاً وبدارا (حد اعتدال اور ضرورت سے) زیادہ اور جلدی جلدی۔

قاموس میں ہے سَرَفٌ توسط کی ضد۔ صحاح میں ہے سرف کا معنی ہے ہر فعل میں حد سے تجاوز کرنا اللہ نے فرمایا ہے: لَا تُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ دوسری آیت ہے: یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ لیکن مال کے صرف میں حد سے تجاوز کرنے پر سرف کا اطلاق زیادہ ہوتا ہے حد سے تجاوز کبھی تو مقدار کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی کثرت ہو جاتی ہے اللہ نے فرمایا ہے: کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کھاؤ اور پیو اور حد اعتدال سے آگے نہ بڑھو اور کبھی کیفیت کے لحاظ سے حد سے تجاوز ہوتا ہے اسی لیے سفیان ثوری نے فرمایا کہ اللہ کی طاعت سے ہٹ کر جو کچھ بھی خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے خواہ اس کی مقدار قلیل ہی ہو۔

اللہ نے فرمایا ہے:

اِنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هم اصحاب النار

(اللہ کی طاعت سے ہٹ کر صرف کرنے والے ہی دوزخی ہیں ۲۔)

میں کہتا ہوں اس صورت میں مالدار سرپرست کے لیے یتیم کا مال کھانا خواہ قلیل مقدار میں ہی ہو اسراف ہے اور نادار کے لیے یتیم کا مال اتنا کھالینا جو دستور کے خلاف ہو ۳۔ اسراف اور افراط کہلائے گا۔

ان یکبروا اس اندیشہ سے وہ بڑے ہو جائیں گے اور اپنا مال تم سے لے لیں گے۔ اِسرافاً اور بداراً دونوں مصدر بمعنی اسم فاعل ہیں اور مقام حال میں ہیں یعنی اسراف اور جلدی کرتے ہوئے دونوں مفعول لہٗ بھی ہو سکتے ہیں یعنی اسراف اور جلدی کرنے کی وجہ سے۔

و من کان غنیا فلیستعفف

اور جو مالدار ہو وہ یتیم کے مال سے بچتا رہے۔ یتیم کا مال بالکل نہ لے تھوڑا نہ بہت استعفاف کے معنی ہیں عفاف سے زیادہ زور ہے عفاف بچنا۔ استعفاف بچتا رہنا۔

ومن کان فقیرا فلیاکل بالمعروف اور جو محتاج ہو وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا میں محتاج ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے اور میرے زیر پرورش ایک یتیم ہے (جس کا مال موجود ہے) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اپنے یتیم کے مال میں سے کچھ کھالو مگر (حد اعتدال سے) زیادتی نہ کرنا۔ نہ جلدی جلدی ہڑپ کرنا نہ (اپنی مزدوری کے) مال کو بچا کر اس کے مال کو کھانا۔

(رواہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)

حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ سے عرض کیا میری گود میں ایک یتیم ہے کیا میں اس کے مال میں سے کھا سکتا ہوں فرمایا: (کھا سکتے ہو) بغیر اس کے کہ اپنے مال کو بچا کر اس کے مال کو کھاؤ اور اپنا مال جمع رکھو۔ (رواہ الثعلبی) مراد یہ ہے کہ یتیم کی تربیت کے معاوضہ کے بقدر کھا سکتے ہو۔ حضرت عائشہ (رض) کا یہی مسلک ہے اور ہم بھی اسی مطلب کو لیتے ہیں۔ عطا اور عکرمہ نے یا کل بالمعروف کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ انگلیوں کے پوروں سے کھائے زیادتی نہ کرے اور (یتیم کے مال میں سے) کپڑے نہ پہنے۔ نخعی نے کہا: یتیم کے مال سے کتان اور صوف خرید کر نہ پہنے صرف بھوک دور کرنے کی بقدر کھالے اور ستر پوشی کے بقدر پہن لے اور ان مصارف میں جتنی رقم آئی ہو اس کی واپسی لازم نہیں۔ حسن بصری اور ایک جماعت علماء نے کہا یتیم کے درختوں کے پھل کھا سکتا ہے، اس کے جانور کا دودھ پی سکتا ہے مگر دستور کے موافق اور اس کا معاوضہ لازم نہیں۔ البتہ چاندی سونا نہ لے اگر لے گا تو اس کا معاوضہ ادا کرنا لازم ہے کلبی نے کہا: معروف سے مراد ہے یتیم کی سواری پر سوار ہونا؟ اس کے خادم سے خدمت لینا یتیم کے مال میں سے کچھ کھانا جائز نہیں۔

بغوی نے اپنی سند سے قاسم بن محمد کی روایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر حضرت ابن عباس سے عرض کیا میرے زیر تربیت ایک یتیم ہے اور اس کے اونٹ ہیں کیا میں ان کا دودھ پی سکتا ہوں؟ فرمایا: اگر ایسا ہو کہ تم اس کے گم شدہ اونٹوں کو تلاش کرو۔ خارشتی اونٹوں کی مالش کرو ان کے پیاؤ کو درست کرو اور پانی پلانے کے دن ان کو پانی پلاؤ تو ان کا دودھ بھی پی سکتے ہو لیکن اس طرح کہ اونٹوں کے بچوں کو (بھوک کا) ضرر نہ پہنچے اور نہ بالکل تھنوں سے دودھ نچوڑ لیا جائے۔ شعبی نے کہا ایسی مجبوری کے بغیر جس میں آدمی مردار کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے یتیم کا مال نہ کھائے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے معروف کا ترجمہ قرض کیا ہے یعنی ضرورت ہو تو یتیم کے مال میں سے قرض لے سکتا ہے۔ جب فراخدستی ہو تو واپس کر دے۔ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے فرمایا: میں نے اللہ کے مال (بیت

المال) کے معاملہ میں اپنی ذات کو یتیم کے سرپرست کی طرح قرار دے رکھا ہے۔ اگر غنی ہوں گا تو بچتا رہوں گا اور محتاج ہوں گا تو معروف کے ساتھ (یعنی بطور قرض) کھالوں گا اور جب فراخدست ہوں گا تو ادا کر دوں گا۔

فاذا دفعتم الیھم اموالھم

(یعنی بالغ ہونے اور ہوشیار پانے کے بعد) جب ان کا مال تم ان کو دو۔

فاشھدوا علیھم تو دیتے وقت شاہد بنا لو۔ یہ حکم استحبابی ہے واجب نہیں ہے تہمت کو دور کرنے اور آئندہ جھگڑے کو کاٹنے کے لیے گواہ بنانا اولیٰ ہے۔ امام شافعی اور امام مالک نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اگر سرپرست یتیم کے بالغ ہونے بعد مال ادا کر دینے کا دعویٰ کرے تو بغیر گواہوں کے اس کا دعوی قابل قبول نہ ہوگا۔ امام اعظم (رح) نے فرمایا: اگر گواہ نہ ہوں تو اس کا قول قسم کے ساتھ قبول کر لیا جائے گا کیونکہ وہ اپنے اوپر تاوان عائد کئے جانے کا منکر ہے (اور منکر کا قول قسم کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے) اسی مفہوم پر دلالت کر رہا ہے آئندہ قول۔ فرمایا:

و کفیٰ باللہ حسیبا اور اللہ ہی حساب لینے والا کافی ہے یعنی حساب فہی کرنے والا۔ بدلہ دینے والا اور شہادت دینے والا اللہ ہی کافی ہے کسی دوسرے گواہ کی ضرورت نہیں بلکہ ولی کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہے حقیقت معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ باللہ کفیٰ کا فاعل ہے باء زائد ہے۔

حق مہر کی وضاحت

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَـكُمۡ عَنۡ شَىۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِيۡٓـئًـا مَّرِیۡٓـئًـا ﴿۴﴾

''اور عورتوں کو ان کے مہر راضی خوشی دے دو ہاں اگر وہ خود اپنی خوشی سے کچھ مہر چھوڑ دیں تو اسے شوق سے خوش ہو کر کھاؤ پیو''۔ (النساء آیت نمبر 4)

و اتو النساء صدقاتھن اور عورتوں کو ان کے مہر دو۔ صداق اور صَدُقَۃٌ مہر کو کہتے ہیں۔ کلبی اور علماء کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ اس آیت میں خطاب عورت کے سرپرستوں کو ہے ابن ابی حاتم نے ابو صالح کا قول نقل کیا ہے کہ بعض لوگ اپنی لڑکی کا نکاح کرانے کے بعد مہر خود لے لیتے تھے لڑکی کو نہیں دیتے تھے۔ اللہ نے اس کی ممانعت میں یہ آیت نازل فرمادی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عورت کا ولی جب اس کا نکاح کرا دیتا اور نکاح کے بعد عورت خاندان میں ہی رہتی تو ولی مہر خود لے لیتا تھا اس کو کچھ بھی نہیں دیتا تھا اور اگر کوئی اجنبی آدمی عورت سے نکاح کر کے خاندان سے باہر لے جاتا تو ولی مہر پر خود قبضہ کرنے کے بعد عورت کو ایک اونٹ پر سوار کرا کے روانہ کر دیتا بس یہ اونٹ اس کو مہر میں ملتا اور کچھ نہ ملتا۔

حضرمی نے بیان کیا کہ لوگ نکاح شغار (تورکا نکاح) کرتے تھے جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کسی عورت کا ولی اس عورت کا

نکاح کسی شخص سے کر دیتا اور وہ شخص اپنی بہن بیٹی کا نکاح تبادلہ میں اوّل شخص سے کر دیتا اور اس طرح عورتوں کا تبادلہ ہو جاتا، مہر کسی کا کچھ نہ ہوتا اس کی ممانعت کر دی گئی اور مہر مقرر کرنے کا حکم دیدیا گیا۔

مسئلہ* امام مالک اور امام احمد کے نزدیک نکاح شغار باطل ہے۔ امام شافعی نے فرمایا: اگر نفس عقد میں یہ الفاظ کہے کہ ہر ایک کا بضع گوشت کا ٹکڑا مراد فرج) دوسری کا مہر ہے تو ہر ایک کا نکاح باطل ہے اور اگر یہ الفاظ نہ کہے بلکہ اس طرح کہا کہ میں نے اپنی لڑکی کا نکاح تجھ سے اس شرط پر کیا کہ تو اپنی لڑکی کا نکاح مجھ سے بغیر مہر کے کر دے اور دوسرے شخص نے جواب میں کہا میں نے (اپنی لڑکی کا نکاح) تجھ سے کر دیا تو دونوں نکاح صحیح ہو گئے اور دونوں میں مہر مثل لازم ہوگا۔ امام مالک و امام احمد کے نزدیک اس صورت میں بھی نکاح باطل ہوگا۔ حقیقت میں یہ اختلاف شغار کی تعریف میں ہے امام مالک و احمد کے نزدیک موخر الذکر صورت بھی شغار کی ہے اور امام شافعی اس کو شغار نہیں کہتے۔ امام ابوحنیفہ (رح) نے فرمایا: دونوں صورتوں میں نکاح صحیح ہوگا اور مہر مثل لازم ہوگا۔

اگر ایک شخص نے کہا میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے اس شرط پر کیا کہ تو اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دے اور مہر کا ذکر نہیں کیا نہ بغیر مہر کے لفظ کہا۔ تو بعض روایات میں آیا ہے کہ باتفاق ائمہ اربعہ نکاح صحیح ہوگا یہ شغار ہی نہ ہوگا اور اگر یوں کہا کہ میری بیٹی کا بضع تیری بیٹی کا مہر ہوگا اور دوسرے نے (زبان سے) قبول نہیں کیا بلکہ اپنی لڑکی کا نکاح کرا دیا اور اس کا مہر کچھ مقرر نہیں کیا تو دوسرا نکاح باتفاق ائمہ صحیح ہوگا (اور مہر مثل لازم ہوگا) لیکن امام ابوحنیفہ (رح) کے نزدیک پہلا نکاح بھی صحیح ہوگا (اور اس میں بھی مہر مثل لازم ہوگا) نکاح شغار کے باطل ہونے پر حضرت ابن عمر (رض) کی حدیث دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ نے نکاح شغار کی ممانعت فرمائی ہے اور شغار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی (یا بہن) کا نکاح کسی شخص سے کر دے کہ وہ شخص اپنی بیٹی (یا بہن) کا نکاح اس سے کر دے اور کسی کا مہر نہ ہو۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہے اور اصحاب السنن نے بھی اس کو ذکر کیا ہے مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے اسلام میں شغار [1] نہیں۔ یہ حدیث شغار کے شرعی وجود کی نفی کر رہی ہے اور اوّل الذکر حدیث میں شغار کی ممانعت مذکور ہے اور ممانعت کا تقاضا ہے کہ شیٔ ممنوع (کا اگر ارتکاب کیا جائے تو) صحیح نہ ہو اور غیر صحیح نکاح مفید ملک بالاتفاق نہیں ہوتا [2]۔ شغار کے باطل ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ شغار میں ہر بضع بجائے خود منکوح بھی ہوتا ہے اور دوسرے بضع کا مہر بھی پس منکوح ہونے کے اعتبار سے مستحق مہر ہوگا اور مہر ہونے کے اعتبار سے دوسرے کے نکاح کا بدل گویا اس کی حیثیت مشترک ہوگی اور یہ باطل ہے۔

احناف کا جواب:

احناف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ احادیث مذکورہ میں نہی یا نفی کا تعلق شغار کے مفہوم سے ہے یعنی جس کو شغار کہا جاتا ہے وہ ممنوع اور منفی ہے شغار کے مفہوم کے دو جزء ہیں: (۱) مہر سے خالی ہونا۔ (۲) بضعکو مہر قرار دینا۔ گر اس مفہوم کا شغار ہو تو ہم بھی کہتے ہیں کہ بضع کو مہر قرار دینا باطل ہے حقیقت شغار شرعاً منفی اور ممنوع ہے لیکن ماہیت شغار کی نفی سے نکاح کا نہ ہونا لازم نہیں بلکہ نکاح ہو جائے گا اور (بطور شغار جس چیز کو مہر قرار دیا ہے وہ مہر نہ ہوگا بلکہ) مہر مثل لازم ہوگا۔ جیسے وہ نکاح جس میں شراب یا خنزیر کو مہر قرار دیا گیا ہو باطل نہیں ہے بلکہ مہر مثل کا موجب ہے اور جس (مہر شغاری یعنی بضع) سے شرعی نہی کا تعلق ہے اس کو ہم ثابت نہیں کرتے اور جس (مہر مثل) کو ہم ثابت کرتے ہیں اس سے نہی غیر متعلق ہے بلکہ شرع کی عمومی عبارتیں تو اس کے صحیح ہونے کی مقتضی ہیں لہٰذا بضع کو مہر قرار دینا باطل

ہے اور نکاح ہر طرح درست ہے۔ بعض علماء کے نزدیک (اولیاءِ زوجہ کو خطاب نہیں ہے بلکہ) نکاح کرنے والے مردوں کو خطاب ہے کہ اپنی بیویوں کا مہر ادا کرو۔

نحلة بطيب خاطر (ابو عبیدہ) یہ اٰتُوْا کا مفعول مطلق ہے یا تو اٰتُوا کی فاعل ضمیر سے حال ہے۔ یعنی طیب خاطر رکھتے ہوئے دو یا صدقات سے حال ہے یعنی عورتوں کے مہر اس مال میں سے دو جو اللہ نے اپنی عنایت سے تم کو دیئے ہیں مراد یہ ہے کہ کسی غیر کے مال میں سے نہ دو نہ مشتبہ مال میں سے۔ ابوعبیدہ نے کہا نحلہ محدود معین ہی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے نحلہ کا ترجمہ عطیہ اور بخشش کیا ہے یعنی اللہ کی طرف سے عورتوں کے لیے مہر (ضروری قرار دینا) ایک مہربانی اور عطیہ ہے اور چونکہ حق مہر عورتوں کو اللہ کی طرف سے عنایت کیا ہوا ہے۔ اس لیے مردوں کے ذمے وہ فرض اور لازم ہوگیا اسی کا لحاظ کر کے قتادہ نے نحلہ کا ترجمہ فریضہ کیا ہے اور ابن جریج نے مقررہ فریضہ لیکن زجاج نے نحلہ کا ترجمہ تَدَیُّنًا کیا ہے یعنی مہر کا قانون اللہ کی طرف سے جاری کیا ہوا ہے پس دینی ضابطہ ہونے کی وجہ سے تم ان کا مہر ادا کرو۔

فان طبن لكم عن شى منه نفسا پس اگر وہ بیبیاں خوش دلی کے ساتھ تم کو مہر کا کچھ حصہ چھوڑ دیں۔

مِنۡهُ میں واحد مذکر کی ضمیر صداق کی طرف راجع ہے کیونکہ کلام سابق سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ہر ایک کو اس کا مہر دیدو ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صدقات کے اندر جو صداق ضمناً مذکور ہے اس کی طرف ضمیر راجع ہے۔ بعض کے نزدیک ایتاء (دینا) کی طرف ضمیر راجع ہے (جس پر اٰتوا دلالت کر رہا ہے) نفساً تمیز ہے طِبۡنَ معنی وتجاوز کو متضمن ہے یعنی اگر عورتیں خوش دلی کے ساتھ کچھ مہر چھوڑ دیں کچھ مہر سے درگذر کریں۔ مِنۡهُ میں مِن تبعیضیہ ہے اس سے مردوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ مہر کا جو کچھ حصہ عورتیں تم کو معاف کردیں تم اس پر بس کرو کل یا زیادہ مہر کی معافی کی طمع نہ کرو۔

فكلوه هنيئا مريئا تو اس کو کھالو یعنی لے لو رچتے پچتے۔ مزے اور خوشگواری کے ساتھ یعنی بطور حلال بلا اعتراض۔ ھنیٔ پاکیزہ خوشگوار جس میں کوئی تکدر نہ ہو بعض نے کہا مزہ دار مریٔ کا معنی ہے خوش انجام کامل الهضم غير مضر ھنیٔ یھنی (ضرب یضرب) اور مَرِءَ یَمۡرِیٔ (سمع یسمع) سے ھنأ اور مریٔا صفت مشبہ کے صیغے ہیں اور بجائے مصدر کے مستعمل ہیں۔ یا محذوف مصدر کی صفت ہیں۔ ابوجعفر نے دونوں لفظ بغیر ہمزہ کے یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھے ہیں۔ باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور دوسرے قاریوں کا یہی اختلاف بریٔ بریُّوۡنَ بَرِیًّا اور کَھَیۡئَتِهِ میں ہے۔

تقسیم وراثت

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝

''ماں باپ اور خویش و اقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ بھی ہے اور عورتوں کا بھی (جو مال ماں باپ اور خویش و اقارب چھوڑ کر مریں) خواہ وہ مال کم ہو یا زیادہ (اس میں) حصہ

مقرر کیا ہوا ہے"۔

{سورۃ النسآء: آیت 7}

زمانہ جاہلیت میں بچوں اور عورتوں کو وارث نہ بنانا:

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ روایت کرتے ہیں:

ابن زید بیان کرتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں باپ دادا کے ترکہ سے عورتیں وارث نہیں ہوتی تھیں۔ اسی طرح چھوٹا بچہ خواہ مذکر ہو وہ اپنے ماں باپ کے ترکہ سے وارث نہیں کیا جاتا تھا۔ عکرمہ نے بیان کیا ہے کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہوگیا۔ اس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا یا رسول اللہ! میرا خاوند فوت ہوگیا اور اس نے مجھ کو اور ایک بیٹی کو چھوڑا ہے اور ہم کو وارث نہیں بنایا جارہا' اس کی بچی کے چچا نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ عورتیں نہ گھوڑے پر سوار ہوسکتی ہیں نہ گھاس کا گٹھا اٹھا کر لاسکتی ہیں نہ دشمن کا مقابلہ کرسکتی ہیں نہ کما لاسکتی ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی مردوں کے لیے اس (مال میں) سے حصہ ہے جس کو ماں باپ اور قرابت داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس (مال میں) سے حصہ ہے جس کو ماں باپ اور قرابت داروں نے چھوڑا ہو خواہ (وہ مال) کم ہو یا زیادہ یہ (اللہ کی طرف سے) مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔

(جامع البیان ج ٤ ص ١٧٦ مطبوعہ دار المعرفتہ بیروت ١٤٠٩ھ)

تقسیم وراثت میں ورثاء کا اقرب ہونا معیار ہے:

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یتیموں کا مال کھانے سے منع فرمایا تھا اور یہ حکم دیا تھا کہ جب وہ سن شعور کو پہنچ جائیں تو ان کے اموال ان کے حوالے کردو اور اس آیت میں یہ واضح کیا ہے کہ یتیموں کے ولی ان کے جس مال کی حفاظت کرتے ہیں اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو وارث بنایا جاتا تھا نہ بچوں کو' وہ کہتے تھے کہ ہم اس کو وارث نہیں بنائیں گے جو نیزوں سے جنگ کرسکے نہ مال غنیمت لوٹ سکے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ جب یتیم بچوں کے ماں باپ اور قرابت دار مال چھوڑ جائیں تو وہ ترکہ کے مستحق ہونے میں برابر ہیں اس میں مرد اور عورت کا کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ترکہ کے کم یا زیادہ ہونے سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ ہر چند کہ حصہ کی مقدار میں فرق ہوتا ہے' اسی طرح میت کے ساتھ لاحق ہونے میں بھی فرق ہوتا ہے اور جو میت کے ساتھ بلاواسطہ لاحق ہو اس کے ہوتے ہوئے وہ محروم ہوتا ہے جو کسی واسطہ کے ساتھ میت کے ساتھ لاحق ہوتا ہے مثلاً میت کا ایک بیٹا ہو اور ایک یتیم پوتا ہو تو بیٹا میت کے ساتھ بلاواسطہ لاحق ہے اور یتیم پوتا (فوت شدہ) دوسرے بیٹے کے واسطہ سے لاحق ہے۔ اس لیے بیٹے کے ہوتے ہوئے یتیم پوتا محروم رہے گا۔

یتیم اس نابالغ بچہ کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہوگیا ہو:

علم وراثت کا یہ قاعدہ ہے کہ قریب وارث کے ہوتے ہوئے بعید وارث محروم ہوجاتا ہے اس بناء پر اگر کسی شخص کا ایک بیٹا زندہ اور دوسرے فوت شدہ بیٹے کا بیٹا یعنی یتیم پوتا بھی زندہ ہو تو اس شخص کی وراثت سے بیٹے کے ہوتے ہوئے یتیم پوتے کو حصہ نہیں

ملے گا کیونکہ یتیم پوتا میت سے ایک واسطہ سے بعید ہے اور بیٹا میت سے بلاواسطہ لاحق ہے اور اقرب ہے۔ اس قاعدہ کی اصل یہ حدیث ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: فرائض اہل فرائض کو لاحق کردو۔ (قرآن مجید میں ورثاء کے مقرر کردہ حصص کو فرائض کہتے ہیں) اس کے بعد جو ترکہ باقی بچے وہ میت کے سب سے قریب مرد کو دے دو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۷۳۲، ۶۷۳۵، ۶۷۴۷)

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ وارث اقرب کے ہوتے ہوئے وارث ابعد محروم ہو جاتا ہے اور اقرب اور ابعد کا یہ اصول ورثاء کے لیے ہے مورث کے لیے نہیں ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں جو اقربون کا لفظ ہے وہ مورث کے لیے ہے۔ مردوں کے لیے (اس مال) میں سے حصہ ہے جس کو والدین اور اقربین نے چھوڑا ہے۔ طرف

مفتی محمد شفیع نے اس آیت میں اقربین کے لفظ سے یہ استدلال کیا ہے کہ استحقاق وراثت کے لیے ورثاء کا اقرب ہونا ضروری ہے۔ یہ اصول تو صحیح ہے مگر اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس آیت میں اقربون کا لفظ مورثین اور مرنے والوں کے لیے ہے ورثاء کے لیے نہیں ہے۔

نیز اسی لفظ "اقربون" سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مال وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہے اس لیے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے بلکہ جو میت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہو گا وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہو گا۔۔۔

{تفسیر تبیان القرآن سورۃ النساء: آیت 7}

وراثت کے بیان میں

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَاۗءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَھُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَھَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِھَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّھُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝11

اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد کے بارے میں حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے (۱) اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں اور دو سے زیادہ ہوں تو انہیں مال متروکہ کا دو تہاء ملے گا (۲) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لیے آدھا ہے اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے اگر اس میت کی اولاد ہو (۳) اگر اولاد نہ ہو اور ماں باپ وارث ہوتے ہوں تو اس کی ماں کے لیے تیسرا حصہ ہے (٤) ہاں اگر میت کے کئی بھائی ہوں تو پھر اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے (٥) یہ حصے اس کی وصیت (کی تکمیل) کے بعد ہیں جو مرنے والا کر گیا ہو یا ادائے قرض کے بعد تمہارے باپ ہوں یا تمہارے بیٹے تمہیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں زیادہ قریب ہے (٦) یہ حصے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں بیشک اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمتوں والا ہے۔

(سورۃ النسآء: آیت 11)

وراثت کے تفصیلی احکام:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر وراثت کے احکام بیان فرمائے تھے: مردوں کے لیے اس (مال میں) سے حصہ ہے جس کو ماں باپ اور قرابت داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس (مال میں) سے حصہ ہے جس کو ماں باپ اور قرابت داروں نے چھوڑا ہو خواہ وہ (مال) کم ہو یا زیادہ۔ یہ (اللہ کی طرف سے) مقرر کیا ہوا حصہ ہے (النساء: ۷) اور اب اللہ تعالیٰ نے تفصیلی طور پر وراثت کے احکام شروع فرمائے۔ وراثت کے احکام میں اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ذکر سے احکام شروع فرمائے کیونکہ انسان کا سب سے زیادہ تعلق اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ امام بخاری متوفی ۲۵٦ھ نے حضرت مسور بن مخرمہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (سیدتنا) فاطمہ (رض) میرے جسم کا ٹکڑا ہے جس نے اس کو غضب ناک کیا اس نے مجھے غضب ناک کیا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳٦۷) اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وراثت کے احکام میں سب سے پہلے اولاد کے حصص بیان فرمائے۔

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں بنو سلمہ میں اپنے گھر کے اندر بیمار تھا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میری عیادت کے لیے تشریف لائے میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! میں اپنے مال کو اپنی اولاد کے درمیان کس طرح تقسیم کروں؟ آپ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی: اللہ تمہاری اولاد (کی وراثت کے حصوں) کے متعلق تمہیں حکم دیتا ہے کہ میت کے ایک بیٹے کا حصہ دو بیٹیوں کے برابر ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۰۳، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱٤۱٤ھ)

اولاد کے احوال:

اولاد کئی صورتوں میں وارث ہوتی ہے، ایک حال یہ ہے کہ میت کی اولاد کے ساتھ میت کے والدین بھی ہوں اور دوسرا حال یہ ہے کہ میت کی وارث صرف اس کی اولاد ہو اور اس کی تین صورتیں ہیں یا تو بیٹے اور بیٹیاں دونوں وارث ہوں گے یا صرف بیٹیاں یا

صرف بیٹے اگر میت نے بیٹے اور بیٹیاں دونوں چھوڑے ہیں تو اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ بیٹے کو دو حصے اور بیٹی کو ایک حصہ ملے گا مثلاً اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑی ہے تو امور متقدمہ علی الارث کے بعد میت کے ترکہ کے تین حصے کریں دو حصص بیٹے کو اور ایک بیٹی کو ملے گا۔ علی ہذا القیاس اور دوسری صورت یہ کہ اگر میت نے زوجہ ماں باپ اور بیٹے اور بیٹیوں کو چھوڑا ہو تو اس صورت میں زوجہ اور ماں باپ اصحاب الفرائض ہیں یعنی ان کے حصص مقرر ہیں زوجہ کا آٹھواں حصہ ماں کا چھٹا حصہ اور باپ کا بھی چھٹا حصہ تو اصحاب الفرائض کو ان کے حصص دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ سب اولاد میں تقسیم کر دیا جائے گا کیونکہ اولاد عصبات ہیں اور اصحاب الفرائض کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ عصبات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کتاب اللہ کے مطابق مال کو اصحاب الفرائض کے درمیان تقسیم کرو اور اصحاب الفرائض کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ (میت کے) سب سے اقرب مرد کو دو۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۴۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۷۳۷، ۶۷۳۵، ۶۷۳۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۴۱۷، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۰۹۸)

سو اس صورت میں کل ترکہ کے ۲۴ حصص کئے جائیں اس میں سے ۳ حصے اس کی بیوی کو، ۴ حصے اس کے باپ اور ماں کو اور باقی ماندہ ۱۳ حصص اس کی اولاد میں اس طرح تقسیم کر دیں کہ بیٹے کو دو اور بیٹی کو ایک حصہ ملے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ میت نے صرف بیٹیاں چھوڑی ہوں اگر دو یا دو سے زیادہ بیٹیاں ہوں تو ان کو دو ثلث (دو تہائی) ملیں گے اور اگر صرف ایک بیٹی چھوڑی ہو تو اس کو کل ترکہ کا نصف ملے گا اور اس کے بعد جو ترکہ بچے گا تو وہ دیگر اصحاب الفرائض کو ملے گا اور اگر وہ نہ ہوں تو پھر میت کے عصبات کو مل جائے گا، اور اگر میت نے صرف بیٹے چھوڑے ہوں تو وہ تمام مال کے وارث ہوں گے اور اگر بیٹوں کے ساتھ اصحاب الفرائض بھی ہوں تو اصحاب الفرائض کو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی تمام مال بیٹوں کو دے دیا جائے گا۔

مرد کو عورت سے دگنا حصہ دینے کی وجوہات:

عورت کو وراثت میں مرد کے حصہ کا نصف ملتا ہے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ عورت مرد کی بہ نسبت پیسوں کی زیادہ محتاج ہے کیونکہ مرد آزادی کے ساتھ بے خوف و خطر گھر سے باہر نکل سکتا ہے اور عورت اپنے شوہر یا والدین کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکل نہیں سکتی اور اگر باہر جائے تو اس کی عزت اور عصمت کے لیے متعدد خطرات ہیں نیز چونکہ اس کی عقل کم ہوتی ہے اس لیے اگر وہ خرید و فروخت کرے تو اس کے لٹ جانے یا دھوکا کھانے کا بہت اندیشہ ہے اور جسمانی طور پر وہ کمزور صنف ہے اس لیے اگر اس کو مرد سے دگنا حصہ نہ دیا جائے تو کم از کم برابر حصہ دینا چاہیے۔

اس سوال کے حسب ذیل متعدد جوابات ہیں:

(۱) مرد کے بہ نسبت عورت کے اخراجات کم ہوتے ہیں کیونکہ مرد پر اپنی بیوی اور بچوں کی اور اپنے بوڑھے والدین کے مصارف کی ذمہ داری ہوتی ہے اس کے برخلاف عورت پر کسی کی پرورش کی ذمہ داری نہیں ہے اور جب عورت کی بہ نسبت مرد کے اخراجات زیادہ ہیں تو مرد کا حصہ بھی عورت سے دگنا ہونا چاہیے۔

(۲) سماجی کاموں کے لحاظ سے مرد کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ امام اور قاضی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ملک اور وطن کے نظم و نسق چلانے کی ذمہ داریاں رکھتا ہے اور ملک اور وطن کے دفاع کے لیے جہاد کی ذمہ داری بھی مرد پر ہے۔ حدود اور قصاص میں وہی گواہ ہو سکتا ہے اور کاروباری معاملات میں بھی مرد کی گواہی عورت سے دگنی ہے سو جس کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں اس کا وراثت میں حصہ بھی دگنا ہونا چاہیے۔

(۳) عورت چونکہ صنفاً کمزور ہوتی ہے اور اس کو دنیاوی معاملات کا زیادہ تجربہ نہیں ہوتا اس لیے اگر اس کو زیادہ پیسے مل جائیں تو اندیشہ ہے کہ اس کے وہ سب پیسے ضائع ہو جائیں گے۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے یہ بحث ذکر کی ہے کہ ایک بیٹی کا وراثت سے نصف حصہ قطعی ہے اور جس حدیث میں ہے کہ ہم گروہ انبیاء مورث نہیں بنائے جائیں گے وہ ظنی ہے تو حضرت ابوبکر (رض) نے ظنی حکم کے مقابلہ میں قطعی کو کیوں ترک کر دیا اور حضرت سیدنا فاطمہ (رض) کو وراثت سے حصہ کیوں نہیں دیا' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ہمارے لیے ظنی ہے حضرت ابوبکر (رض) نے چونکہ اس کو زبان رسالت سے سنا تھا اس لیے ان کے لیے یہ حدیث قرآن مجید کی طرح قطعی تھی اس کی مفصل بحث ہم نے شرح مسلم جلد خامس میں کی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر میت کی اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اگر میت کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ماں کا تیسرا حصہ ہے (اور باقی سب باپ کا حصہ ہے) اور اگر میت کے (بہن) بھائی ہوں تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔ (النساء:۱۱)

والدین کے احوال:

اولاد کا اطلاق مذکر اور مونث دونوں پر ہوتا ہے اس لیے میت کے ماں باپ کے ساتھ اگر اولاد ہو تو اس کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے: کہ ماں باپ کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ بیٹے ہوں تو ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا'

تیسری صورت یہ ہے کہ میت کی صرف ایک بیٹی ہو اور ماں باپ ہوں تو بیٹی کو نصف ملے گا اور ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا البتہ باقی مال بھی باپ کو بہ طور عصبہ ہونے کے مل جائے گا۔

اگر میت کی اولاد نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو ماں کو تہائی مل جائے گا اور باقی دو تہائی مال باپ کو بطور عصبہ دے دیا جائے گا اور اس صورت میں مرد (باپ) کو عورت (ماں) سے دگنا حصہ مل جائے گا۔

اگر میت کے (بہن) بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔ یہ والدین کے احوال میں سے تیسرا حال ہے، جس میں میت نے والدین کے ساتھ اپنے بہن بھائیوں کو بھی چھوڑا ہو' اس پر اتفاق ہے کہ ایک بہن یا بھائی ماں کے تہائی حصہ کے لیے حاجب بن کر اس کو چھٹا نہیں کرتے۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ جب بہن یا بھائی کا عدد تین کو پہنچ جائے تو وہ ماں کا حصہ تہائی سے کم کر کے چھٹا کر دیتے ہیں اور اگر دو بہنیں یا دو بھائی ہوں تو اس میں اختلاف ہے اکثر صحابہ کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بھی ماں کا حصہ تہائی سے کم کر کے چھٹا کر دیتے ہیں اور حضرت ابن عباس (رض) فرماتے ہیں دو بہنیں ماں کا حصہ تہائی سے کم نہیں کرتیں۔ فقہاء احناف کا

مذہب اکثر صحابہ کے قول کے مطابق ہے' یہ بھی واضح رہے کہ دو بہنیں کسی قسم کی ہوں سگی یا سوتیلی خواہ ماں کی طرف سے خواہ باپ کی طرف سے ۔اسی طرح سے بھائی بھی ۔ وہ ماں کے لیے حاجب ہیں اور اس کا حصہ تہائی سے کم کر کے چھٹا کر دیتے ہیں اور ایک بہن ہو یا ایک بھائی وہ ماں کے لیے حاجب نہیں ہیں خواہ وہ بہن یا بھائی عینی ہوں علاتی ہوں یا اخیافی ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یہ تقسیم) اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد' اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد ہے ۔(النساء:۱۱)

قرض کو وصیت پر مقدم کرنے کے دلائل:

اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ وارثوں میں ترکہ کی تقسیم پر قرض کی ادائیگی مقدم ہے ۔اگر میت پر لوگوں کا اتنا قرض ہے کہ وہ اس کے تمام ترکہ پر محیط ہے تو وارثوں کو کچھ نہیں ملے گا اور میت کے ترکہ سے اس کا قرض ادا کیا جائے گا اور اگر میت کا قرض ادا کرنے کے بعد مال بچ رہتا ہے اور میت نے وصیت بھی کی ہوئی ہے تو ایک تہائی مال سے اس کی وصیت پوری کی جائے گی اور اس کے بعد اس کا باقی ماندہ ترکہ ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

اس آیت میں میت کی وصیت پوری کرنے کا قرض کی ادائیگی سے پہلے ذکر کیا ہے لیکن اس پر امت کا اجماع ہے کہ پہلے میت کا قرض ادا کیا جائے گا پھر اس کی وصیت پوری کی جائے گی ۔اس کے حسب ذیل دلائل ہیں:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

اور ذکر کیا جاتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فیصلہ کیا کہ قرض کی ادائیگی وصیت پر مقدم ہے' اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا"۔ (النساء:۵۸)

ترجمہ: اور بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانات امانتوں والوں کو ادا کر دو۔

اور نفلی وصیت پوری کرنے کی بہ نسبت امانت کو ادا کرنا مقدم ہے (قرض بھی ایک طرح سے امانت ہے)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حارث' حضرت علی (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وصیت کو پورا کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا حالانکہ تم قرآن مجید میں وصیت کو قرض سے پہلے پڑھتے ہو۔امام ترمذی نے کہا عام اہل علم کا اس حدیث پر عمل ہے کہ وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا۔

(سنن ترمذی' رقم الحدیث: ۲۱۲۹' ۲۱۰۱' سنن ابن ماجہ' رقم الحدیث: ۲۷۱۵)

حارث اعور کے ضعف کا بیان:

یہ حدیث حارث نے حضرت علی (رض) سے روایت کی ہے' حارث کے ترجمہ میں حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ لکھتے ہیں:

حارث بن عبداللہ ہمدانی اعور (یک چشم) کبار علماء تابعین میں سے ہے اور اس میں ضعف ہے ۔یہ حضرت علی (رض) اور

حضرت ابن مسعود (رض) سے حدیث روایت کرتا ہے اور اس سے عمرو بن مرہ، ابواسحاق اور ایک جماعت حدیث روایت کرتی ہے شعبی نے کہ ابواسحاق نے اس سے صرف چار احادیث کا سماع کیا ہے نیز شعبی نے کہا مجھے حارث اعور نے حدیث بیان کی اور وہ کذاب تھا، نیز مغیرہ نے کہا حضرت علی (رض) سے روایت میں حارث کی تصدیق نہیں کی جاتی تھی۔ ابن المدینی نے کہا یہ کذاب ہے۔ ابن معین نے کہا ضعیف ہے۔ نسائی نے کہا یہ قوی نہیں ہے۔ ابن عدی نے کہا اس کی عام روایات غیر محفوظ ہیں۔ دارقطنی نے کہا ضعیف ہے۔ حصین نے شعبی سے روایت کیا کہ حضرت علی کی طرف حارث نے جتنی جھوٹی احادیث منسوب کی ہیں اتنی اور کسی نے نہیں کیں۔ ابن سیرین کا یہ گمان تھا کہ اس کی حضرت علی سے عام روایات باطل ہیں۔ ابن اسحاق نے اس کو کذاب کہا۔ ابن حبان نے کہا حارث تشیع میں غالب تھا اور حدیث میں ضعیف تھا۔

ابوبکر بن ابی داؤد نے کہا حارث بہت بڑا فقیہہ تھا اور علم میراث کا ماہر تھا اس نے یہ علم حضرت علی سے سیکھا تھا حارث اعور نے ٦٥ھ میں وفات پائی

(میزان الاعتدال ج ٢ ص ١٧٢۔ ١٧٠ ملخصا)

نیز اس کے ترجمہ کے متعلق دیکھیں: تاریخ صغیر للبخاری ج ١ ص ١٤١، الجرح والتعدیل ج ٣ ص ٣٦٣، ضعفاء ابن الجوزی ج ١ ص ١٨١، النجوم الزاھرۃ ج ١ ص ١٨٥، شذرات الذھب ج ١ ص ٧٣، طبقات ابن سعد ج ٦ ص ١٦٨، مراۃ الجنان ج ١ ص ١٤١۔

حافظ جمال الدین ابی الحجاج یوسف مزی متوفی ٧٤٢ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

امام مسلم بن الحجاج نے اپنی سند کے ساتھ شعبی سے روایت کیا ہے کہ حارث اعور کذاب تھا، ابومعاویہ نے ابواسحاق سے روایت کیا ہے کہ حارث اعور کذاب تھا ابن معین سے ایک روایت ہے کہ حارث ثقہ ہے۔ امام ابوزرعہ نے کہا اس کی روایات سے استدلال نہیں کیا جائے گا، امام نسائی سے ایک روایت ہے کہ یہ قوی نہیں ہے اور ایک روایت ہے کہ اس کی روایت کردہ حدیث میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جابر جعفی نے عامر شعبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین (رض) حارث سے حضرت علی کرم اللہ الوجہ الکریم کی روایات کے متعلق سوال کرتے تھے۔ امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی اور امام ابن ماجہ نے اس کی روایات درج کی ہیں۔

(تہذیب الکمال ج ٤ ص ٤٤۔ ٣٩ ملخصا مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١٤ھ)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ٨٥٢ھ نے بھی زیادہ تر یہی نقل کیا ہے کہ حارث اعور کذاب اور ضعیف ہے۔ اور بعض ائمہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ ثقہ ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ٢ ص ١٣٥۔ ١٣٣ ملخصا، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ٨٥٢ھ کی اس کے متعلق رائے یہ ہے:

یہ حضرت علی (رض) کا شاگرد تھا شعبی نے اس کو کذاب کہا ہے، اور اس پر رفض کی تہمت ہے اور اس کی احادیث ضعیف ہیں۔ امام نسائی نے اس کی صرف دو حدیثیں روایت کی ہیں یہ حضرت عبداللہ بن الزبیر (رض) کی خلافت میں فوت ہوا تھا۔

(تہذیب التہذیب ج ١ ص ١٧٥، ملخصا، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

اہل علم کے عمل سے حدیث ضعیف کی تقویت:

ہر چند کہ حارث کی جس روایت میں قرض کو وصیت پر مقدم کرنے کا ذکر ہے اس کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں تعلیقا درج کیا

ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے، اس کے باوجود علماء امت کا اس حدیث پر عمل ہے، جیسا کہ امام ترمذی نے کہا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا ہے کہ اسی وجہ سے امام بخاری نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، حالانکہ حدیث ضعیف سے استدلال کرنا ان کی عادت نہیں ہے اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے۔

(فتح الباری ج ۵ ص ۳۷۸۔ ۳۷۷، مطبوعہ لاہور ۱۴۰۱ھ)

اس سے معلوم ہوا کہ اہل علم کے عمل سے بھی حدیث ضعیف کی تقویت ہو جاتی ہے۔

قرض کو وصیت پر مقدم کیا جاتا ہے لیکن قرآن مجید میں وصیت کے ذکر کو قرض پر مقدم کیا گیا ہے اس لیے کہ قرض کا مطالبہ کرنے والے قرض خواہ ہوتے ہیں اور وصیت کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا، اس لیے یہ خدشہ ہے کہ ورثاء وصیت کو چھپا لیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے وصیت کا ذکر پہلے فرمایا، دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص موت تک قرض ادا نہ کرے اس لیے یہ نادر الوجود ہے اور وصیت عام طور پر کی جاتی ہے اس لیے وصیت کو پہلے اور قرض کو بعد میں ذکر فرمایا لیکن ذکر میں تقدم واقع میں تقدم کو مستلزم نہیں ہوتا جیسا کہ (آیت) "واسجدی وارکعی"۔ (ال عمران: ۴۳) میں سجدہ کا پہلے اور رکوع کا بعد میں ذکر ہے۔

کلالہ کے بیان میں

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۗ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؕ ﴿۱۲﴾

"تمہاری بیویاں جو چھوڑ مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھو آدھ تمہارا اگر ان کی اولاد ہو تو ان کے چھوڑے ہوئے مال میں سے تمہارے لیے چوتھائی حصہ ہے (۱) اس کی وصیت کی ادائیگی کے بعد جو وہ کر گئیں ہوں یا قرض کے بعد۔ اور جو (ترکہ) تم چھوڑ جاؤ اس میں سے ان کے لیے چوتھائی ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو اور اگر تمہاری اولاد ہو تو پھر انہیں تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا

(۲) اس وصیت کے بعد جو تم کر گئے ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد۔ اور جن کی میراث لی جاتی ہے وہ مرد یا عورت کلالہ ہو یعنی اس کا باپ بیٹا نہ ہو (۳) اور اس کا ایک بھائی اور ایک بہن ہو (٤) تو ان دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ اگر اس سے زیادہ ہوں تو ایک تہاء میں سب شریک ہیں (٥) اس وصیت کے بعد جو کی جائے اور قرض کے بعد (٦) جب کہ اوروں کا نقصان نہ کیا گیا ہو (۷) یہ مقرر کیا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ جاننے والا بردبار ہے"۔

(سورۃ النساء آیت 12)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمہاری بیویوں کے ترکہ میں سے تمہارے لیے آدھا حصہ ہے بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو اور اگر ان کی اولاد ہو تو تمہارے لیے ترکہ میں سے چوتھائی حصہ ہے۔ ان کی وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی حصہ ہے۔ ان کی وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد اور اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی حصہ ہے اور اگر تمہاری اولاد ہو تو تمہارے ترکہ میں سے ان کا آٹھواں حصہ ہے تمہاری وصیت پوری کرنے اور تمہارا قرض ادا کرنے کے بعد۔

شوہر اور بیوی کے احوال:

اولاد کی ماں باپ کے ساتھ اور ماں باپ کی اولاد کے ساتھ نسبی قرابت ہے اور یہ بلا واسطہ قرابت ہے اور شوہر کی بیوی کے ساتھ اور بیوی کی شوہر کے ساتھ نکاح کے سبب سے قرابت ہے اور یہ بھی بلا واسطہ قرابت ہے ان کے علاوہ جو قرابتیں ہیں مثلاً بھائی بہن وغیرہ وہ بالواسطہ قرابتیں ہیں کیونکہ بھائی، بہن وغیرہ کی قرابت ماں باپ کے واسطہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے بلا واسطہ قرابت داروں کے احکام وراثت بیان فرمائے اور پھر بالواسطہ قرابت داروں کے احکام بیان فرمائے اور بلا واسطہ قرابت میں نسبی قرابت سببی قرابت سے قوی ہے اس لیے پہلے نسبی قرابت داروں میں اولاد اور ماں باپ کے حصص بیان فرمائے اس کے بعد سببی قرابت میں شوہر اور بیوی کے حصص بیان فرمائے اور یہ نہایت عمدہ ترتیب ہے۔

اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ اگر بیوی کی اولاد نہ ہو تو شوہر کا حصہ نصف (آدھا) ہے اور اگر اولاد ہو تو اس کا حصہ چوتھائی ہے اور اگر شوہر کی اولاد نہ ہو تو بیوی کا حصہ ربع (چوتھائی) ہے اور اگر اولاد ہو تو اس کا حصہ ثمن (آٹھواں) ہے اس سے واضح ہوا کہ شوہر کا حصہ بیوی کے حصہ سے دگنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دگنا ہوتا ہے۔

اس آیت میں اولاد سے مراد عام ہے خواہ ایک ہو یا زیادہ، مذکر ہو یا مونث، نیز وہ اولاد واسطہ ہو جیسے بیٹا یا بیٹی یا بالواسطہ ہو جیسے پوتا اور پوتی، اور جب بیوی شوہر کی وارث ہو تو شوہر کی اولاد عام ہے خواہ اسی بیوی سے ہو یا کسی اور بیوی سے۔ اسی طرح جب شوہر بیوی کا وارث ہو تب بھی اولاد عام ہے خواہ وہ اسی شوہر کی اولاد ہو یا اس کے پہلے شوہر کی اولاد ہو، اسی طرح بیوی ایک ہو یا کئی بیویاں ہوں سب کا حصہ ثمن (آٹھواں) ہے اور آٹھواں حصہ ان سب بیویوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ تقسیم کرنا ہو جس کا نہ والد ہو اور نہ اولاد اور (اس کا ماں کی طرف سے)

بھائی یا بہن ہوتو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ (بھائی یا بہن) ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کا تہائی حصہ ہے اس شخص کی وصیت پوری کرنے اور اس کا قرض ادا کرنے کے بعد وصیت میں نقصان نہ پہنچایا گیا ہو۔ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ خوب جاننے والا، بہت حکمت والا ہے۔

کلالہ کا معنی اور اس کے مصداق کی تحقیق:

کلالہ کی کئی تفسیریں ہیں: ایک تفسیر یہ ہے کہ کلالہ ان وارثوں کو کہتے ہیں جو میت کے نہ والد ہوں اور نہ اولاد۔ یہ تفسیر حضرت ابو بکر (رض) سے مروی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ کلالہ اس مورث میت (مرنے والے شخص) کو کہتے ہیں جس کا نہ والد ہو اور نہ اس کی اولاد ہو، یہ تفسیر حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے اور یہی تفسیر مختار ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ کلالہ میت کے ترکہ کو بھی کہتے ہیں۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ روایت کرتے ہیں:

شعبی بیان کرتے کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر (رض) نے فرمایا کلالہ کی تفسیر میں میری ایک رائے ہے اگر یہ درست ہے تو اللہ وحدہ لاشریک کی طرف سے ہے اور اگر یہ خطاء ہے تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے اور اللہ اس سے بری ہے، کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو میت کا نہ والد ہو اور نہ اولاد، اور حضرت عمر (رض) جب خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے کہا میں اس بات سے اللہ سے حیاء کرتا ہوں کہ میں نے کلالہ کی تفسیر میں حضرت ابو بکر کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

(جامع البیان ج ٤ ص ۱۹۲، مطبوعہ دارالمعرفۃ ۱۴۰۹ھ)

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب میں بیمار ہوا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابو بکر صدیق (رض) میری عیادت کے لیے آئے مجھ پر بے ہوشی طاری تھی آپ نے وضو کیا اور وضو کا بچا ہوا پانی مجھ پر ڈالا مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے کہا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں اپنے مال کو کس طرح تقسیم کروں۔ آپ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا حتی کہ میراث کی آیت نازل ہوئی:

آیت) "ویستفتونك قل الله یفتیكم فی الكلالة ان امرؤا هلك لیس له ولد وله اخت لها ولد فان كا نتا اثنتین فلهما الثلثن مما ترك وان كانوا اخوة رجالا ونسآء فللذ كر مثل حظ الانثیین"۔ (النسا: ۱۷۶)

ترجمہ: آپ سے حکم معلوم کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اللہ تمہیں کلالہ (کی میراث) میں یہ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص فوت ہو جائے جس کی نہ اولاد ہو (نہ والد) اور اس کی ایک بہن ہو تو اس کے لیے نصف ترکہ ہے، اور وہ شخص اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس کا بیٹا نہ ہو، اور اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو اس شخص کے ترکہ کا دو تہائی ۲۔ ۳، ملے گا اور اگر اس کے وارث بہن بھائی ہوں مرد بھی اور عورتیں بھی تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۶۱۶)

یہ سورۃ النساء کی آخری آیت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کلالہ کی تفسیر میں اسی آیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حجرت عمر نے ابوبکر (رض) کا ذکر کیا اور کہا میں اپنے بعد کلالہ سے اہم اور کوئی چیز چھوڑ کر نہیں جا رہا اور میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جتنا کلالہ کے متعلق پوچھا ہے اور کسی چیز کے متعلق نہیں پوچھا اور آپ نے نے جتنی سختی اس میں کی ہے اور کسی چیز میں نہیں فرمائی حتی کہ آپ نے میرے سینہ میں انگلی چبھوئی اور فرمایا اے عمر کیا تم کو سورۃ النساء کی آخری آیت کافی نہیں ہے؟

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۶۱۷)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۰۰ھ لکھتے ہیں:

کلالہ کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ کلالہ ان وارثوں کو کہتے ہیں جو والد (ماں باپ) اور اولاد (یا بیٹے کی اولاد) کے ماسوا ہوں اس کے ثبوت میں حضرت براء بن عازب سے حدیث صحیح ہے ایک قول یہ ہے کہ جو وارث بیٹے کے ماسوا ہوں ایک قول یہ ہے کہ اخیافی بھائیوں کو کلالہ کہتے ہیں ایک قول ہے، عم زاد بھائیوں کو کلالہ کہتے ہیں ایک قول ہے تمام عصبات کو ایک قول ہے تمام وارثوں کو ایک قول ہے میت کو ایک قول ہے مال موروث کو، جوہری نے کہا کلالہ اس مرنے والے کو کہتے ہیں جس کی نہ اولاد ہو نہ والد (ماں باپ) ہو زمخشری نے کہا کلالہ کا اطلاق تین پر کیا جاتا ہے اس مرنے والے پر جس کی نہ اولاد ہے نہ والد (ماں باپ) اور اس وارث پر جو نہ والد (ماں باپ) ہے نہ اولاد اور ان قرابت داروں پر جو والد (ماں باپ) اور اولاد کی جہت سے نہ ہوں۔

(عمدۃ القاری ج ۳ ص ۸۷، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۷ھ)

علامہ محمد بن خلفہ وشتانی ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ لکھتے ہیں:

صحیح یہ ہے جس پر علماء کی ایک جماعت کا اتفاق ہے کہ کلالہ اس مرنے والے کو کہتے ہیں جس کا نہ والد (ماں باپ) ہو اور نہ اولاد۔

(اکمال اکمال المعلم ج ۵ ص ۵۶۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

جب کوئی شخص فوت ہو جائے اور نہ اس کا والد (ماں باپ) ہو اور نہ اس کی اولاد تو اس کے وارث کلالہ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق (رض) حضرت عمر (رض) اور جمہور اہل علم کا قول ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن ج ۵ ص ۷۶ مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ)

امام فخرالدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ لکھتے ہیں:

اکثر صحابہ اور حضرت ابوبکر صدیق (رض) کا قول یہ ہے کہ کلالہ وہ وارث ہیں جو والدین اور اولاد کے ماسوا ہوں یہی قول صحیح اور مختار ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۳ ص ۱۶۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ)

امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

مرنے والا خود کلالہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

(آیت) "وان کان رجل یورث کلالۃ"۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ کلالہ میت کا اسم ہے اور کلالہ اس کا حال اور اس کی صفت ہے اسی لیے منصوب ہے' حضرت عمر (رض) نے فرمایا تھا کلالہ مرنے والے کا وارث ہے جو نہ والد (ماں باپ) ہو نہ ولد' اور میں حضرت ابو بکر کی مخالفت سے حیا کرتا ہوں اور جب حضرت عمر (رض) زخمی ہوئے تو انھوں نے کہا کلالہ اس مرنے والے کو کہتے ہیں جس کی نہ اولاد ہو نہ والد۔ حضرت ابن عباس (رض) سے بھی یہی مروی ہے سو قرآن مجید کی یہ آیت اور صحابہ کرام کے اقوال اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مرنے والا خود کلالہ ہے۔

(احکام القرآن ج ٦ ص ٨٦' مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور' ١٤٠٠ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ترکہ تقسیم کرنا ہو جس کا نہ والد ہو اور نہ اولاد اور (اس کا ماں کی طرف سے) بھائی یا بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ (بھائی یا بہن) ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کا تہائی حصہ ہے۔

آیت مذکورہ میں بھائی بہن سے اخیافی بھائی بہن مراد ہونے پر دلائل:

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ١٢٧٢ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کریمہ میں بھائی یا بہن سے مراد فقط اخیافی بھائی بہن (ماں کی طرف سے) عام مفسرین کا اسی پر اتفاق ہے حتی کہ بعض نے کہا اس پر اجماع ہے۔ متعدد مفسرین نے حضرت سعد بن ابی وقاص (رض) سے روایت کیا ہے کہ وہ اس آیت کو یوں پڑھتے تھے۔ "ولہ اخ واخت من ام"۔ اور حضرت ابی اس کو پڑھتے تھے ولہ اخ او اخت من الام" ہر چند کہ یہ قرات شاذ ہے تاہم اکثر علماء کا یہ مختار ہے کہ جب قرات شاذہ صحیح سند کے ساتھ مروی ہو تو وہ خبر واحد کے حکم میں ہے اور اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے اور اس میں بعض کا اختلاف بھی ہے۔ اس پر دوسری دلیل یہ ہے کہ عینی اور علاتی بھائی بہن (سگے اور باپ کی طرف سے) کا ذکر اس سورت کی آخری آیت میں ہے۔ نیز اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ اگر اخیافی بھائی یا بہن ایک ہو تو اس کا حصہ سدس (چھٹا) ہے اور اگر ایک سے زیادہ ہو تو ان کا حصہ ثلث (تہائی) ہے اور ماں کا بھی یہی حصہ ہے تو مناسب ہوا کہ ماں کی طرف بھائی یا بہن کا بھی یہی حصہ ہو نیز عینی بھائی اور بہن عصبہ ہوتے ہیں جیسا کہ اس سورت کے آخر میں فرمایا ہے اور آیت میں بھائی اور بہن کا حصہ سدس اور ثلث مقرر فرمایا ہے اب اگر اس آیت میں بھائی اور بہن سے علاتی بھائی اور بہن مراد لیا جائے تو ان آیتوں میں تعارض لازم آئے گا۔

صبر کا معنی اور اس کے فضائل

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۚ وَٱتَّقُوا ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

(سورۃ آل عمران آیت 200)

اے ایمان والو! فی نفسہ صبر کرو اور لوگوں کی زیادتیوں پر صبر کرو اور اپنے نفسوں اور اپنی سرحدوں کی نگہبانی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو۔

یہ اس سورت کی آخری آیت ہے اور سورۃ آل عمران میں جو تمام مضامین تفصیلی طور پر ذکر کیے گئے ہیں وہ تمام مضامین اجمالی طور پر اس آیت میں ذکر کر دیئے گئے ہیں اس آیت میں عبادات کی مشقتوں کو برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کی طرف "اصبروا" میں اشارہ ہے اور مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی طرف "صابروا" میں اشارہ ہے اور کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے اس کی طرف "رابطوا" میں اشارہ ہے اور اصول اور فروع یعنی عقائد اور اعمال سے متعلق احکام شرعیہ پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی طرف "واتقوا اللہ" میں اشارہ ہے۔

صبر کا لغوی اور شرعی معنی:

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

صبر کے معنی ہیں تنگی میں کسی چیز کو روکنا' صبرت الدابۃ کا معنی ہے میں نے بغیر دانے اور چارہ کے سواری کو روک لیا' اور صبر کا اصطلاحی معنی ہے عقل اور شرع کے تقاضوں کے مطابق نفس کو روکنا اور پابند کرنا' صبر ایک جنس ہے اور اس کی کئی انواع ہیں' مصیبت پہنچنے پر نفس کو جزع وفزع ہے اور جنگ کے وقت نفس کو بزدلی سے روکنا صبر ہے اس کو شجاعت کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں بزدلی ہے' عبادات میں مشقتوں کو برداشت کرنا اور غضب' شہوت اور حرص وطمع کی تحریک کے وقت اپنے نفس کو اللہ کی نافرمانی سے روکنا بھی صبر ہے اس کو اطاعت کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں فسق وفجور ہے۔

(مفردات الفاظ القرآن ص ۲۷۳' مطبوعہ المکتبہ المرتضویہ ایران' ۱۳۶۲ھ)

صبر کے متعلق احادیث:

مصیبت کے وقت نفس کو جزع اور فزع سے روکنے کے متعلق یہ حدیث ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک عورت کے قریب سے گزرے جو قبر کے پاس رو رہی تھی' آپ نے فرمایا اللہ سے ڈرو اور صبر کرو اس نے کہا ایک طرف ہٹو تم کو میری طرح مصیبت نہیں پہنچی' اس نے آپ کو پہچانا نہیں تھا' اس کو بتایا گیا کہ یہ تو نبی کریم ہیں' وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دروازہ پر آئی وہاں اس نے کوئی دربان نہیں پایا' اس نے کہا میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا' آپ نے فرمایا جب پہلی بار صدمہ (یا مصیبت نہیں پہنچی' اس نے آپ کو پہنچانا نہیں تھا' آپ نے فرمایا جب پہلی بار صدمہ (یا مصیبت) پہنچے اسی وقت (نفس کو روکنا) صبر ہوتا ہے۔

(صحیح البخاری' رقم الحدیث: ج ۱۲۸۳' صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۹۲۶)

اور کفار سے جنگ کے وقت اپنے نفس کو بزدلی سے روکنے کے متعلق یہ حدیث ہے

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے ایک دن انتظار کیا حتی کہ سورج ڈھل گیا' پھر آپ نے لوگوں میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: اے لوگو! دشمن سے مقابلہ کی توقع نہ کرو' اور اللہ سے

عافیت کا سوال کرو اور جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو صبر کرو (یعنی بز دلی نہ کرو) اور یقین رکھو کہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۶، ۲۹۶۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۷۷)

عبادات کی مشقتوں کو برداشت کرنے کے متعلق یہ حدیث ہے:

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت اسماء بنت ابی بکر (رض) بیان کرتی ہیں کہ جس دن سورج گرہن ہوا اس دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھبرائے آپ نے اپنی قمیص پہنی، اور چادر اوڑھی، پھر آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اور اس میں بہت لمبا قیام کیا پھر آپ نے رکوع کیا، میں نے دیکھا کہ ایک عورت مجھ سے عمر میں بڑی تھی اور کھڑی ہوئی تھی اور ایک عورت میری بہ نسبت بیماری تھی وہ بھی قیام میں تھی تو میں نے دل میں کہا میں تمہاری بنسبت زیادہ حقدار ہوں کہ طول قیام کی مشقت پر صبر کروں۔

(مسند احمد ج ۶ ص ۳۴۹، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ)

حرص، غضب اور شہوت کے تقاضوں پر صبر کرنے کے متعلق یہ حدیث ہے:

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سلمہ بن صخر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رمضان میں اپنی بیوی سے ظہار کیا پھر ایک رات کو اس سے جماع کر لیا، صبح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ واقعہ عرض کیا: آپ نے فرمایا اے سلمہ! تم نے یہ کام کیا؟ میں نے دو مرتبہ عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھ سے تقصیر ہوگئی اور میں اللہ کے حکم پر صابر ہوں، آپ کو جو اللہ فرمائے آپ مجھے اس کا حکم دیجئے۔ الحدیث:

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۲۱۳)

صابروا کا لغوی معنی اور صبر اور مصابرہ میں فرق:

علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: (اصبروا وصابروا ورابطوا) اس آیت میں ادنی سے اعلی کی طرف انتقال ہے، صبر، مصابرہ سے کم ہے اور مصابرہ، مرابطہ سے کم ہے، ایک قول یہ ہے کہ اصبروا کا معنی ہے اپنے نفوس کے ساتھ صبر کرو اور صابروا کا معنی ہے مصیبتوں پر اپنے دلوں میں اللہ پر صبر کرو، اور رابطوا کا معنی ہے اپنے اسرار کا اللہ کے ساتھ رابطہ رکھو اور ایک قول یہ ہے کہ اصبروا کا معنی ہے اللہ میں صبر کرو، اور صابروا کا معنی ہے اللہ کے ساتھ صبر کرو اور رابطوا کا معنی ہے اللہ کے ساتھ رابطہ رکھو۔

(تاج العروس ج ۳ ص ۳۲۴ مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر، ۱۳۰۶ھ)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت اسامہ بن زید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب مشرکین کو معاف کر دیتے تھے اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ج ۶۲۰۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۹۸)

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص اپنے امیر کی کوئی ناگوار چیز دیکھے وہ اس پر صبر کرے کیونکہ جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھی علیحدہ ہوا اور مر گیا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۴۹)

امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی متوفی ۲۰۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت صہیب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، آپ ہنسے، پھر آپ نے فرمایا کیا تم مجھ سے نہیں دریافت کرتے کہ میں کس وجہ سے ہنسا ہوں؟ صحابہ نے عرض کیا آپ کس وجہ سے ہنسے ہیں؟ آپ نے فرمایا مجھے مومن کے حال پر تعجب ہوتا ہے، اس کا ہر حال خیر ہے اگر اس کو کوئی پسندیدہ چیز ملے اور وہ اس پر اللہ کی حمد کرے تو یہ اس کے لیے خیر ہے اور اگر اس کو کوئی ناگوار چیز ملے اور وہ اس پر صبر کرے تو یہ بھی اس کے لیے خیر ہے اور مومن کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا ہر حال خیر ہو۔

(سنن دارمی، رقم الحدیث: ۲۷۸۰، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۹۹۹، مسند احمد ج ۴ ص ۳۳۳، ۳۳۲، ج ۶ ص ۱۵۱۶)

مرابطہ کے معنی:

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

مرابطہ کی دو قسمیں ہیں، مسلمانوں کی سرحدوں کی نگہبانی اور حفاظت کرنا، کہیں اس پر دشمن اسلام حملہ آور نہ ہوں اور دوسری قسم ہے نفس کا بدن کی نگہبانی اور حفاظت کرنا کہیں شیطان اس سے گناہ نہ کرائے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی رباط ہے، یہ دوسری قسم ہے اور پہلی قسم کے متعلق یہ آیت ہے:

(آیت) "واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل"۔ (الانفال: ۶۰)

ترجمہ: ان کے لیے بہ قدر استطاعت ہتھیاروں کی قوت اور گھوڑے باندھنے کو فراہم کرو۔

(مفردات الفاظ القرآن ص ۱۸۶، ۱۸۵، مطبوعہ مطبوعہ المکتبہ المرتضویہ ایران، ۱۳۶۲ھ)

آیت مذکورہ میں رابطور کے محامل:

ہر چند کہ انسان ضبط نفس کر کے فی نفسہ صبر کرتا ہے اور لوگوں کی ایذاء رسانی پر بھی صبر کرتا ہے لیکن پھر بھی اس میں شہوت، غضب اور حرص پر مبنی برے اخلاق ہوتے ہیں اور اپنے نفس کو برے اخلاق سے پاک کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے نفس سے جہاد کرے اور اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور جب بھی شہوت یا حرص کے غلبہ سے کسی گناہ کی تحریک ہو تو اپنے نفس کو اس گناہ سے آلودہ نہ ہونے دے، اور یہ محاسبہ اور نگہبانی اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان کے دل میں اللہ کا ڈر اور خوف ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا: (آیت) "ورابطوا واتقوا اللہ"۔ یعنی اپنے نفس کی نگہبانی کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تمہیں کامیابی کی امید ہو۔

چونکہ سورۃ آل عمران کی زیادہ تر آیتیں جنگ احد سے متعلق ہیں اور بعض مسلمانوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک حکم کی خلاف ورزی کی تھی جس کے نتیجہ میں وہ شکست سے دوچار ہوئے اور اس شکست پر آزردہ خاطر ہوئے، اس لیے اس آیت کا

ایک ظاہری محمل یہ ہے کہ کفار سے جنگ کے دوران ثابت قدم رہو اور جنگ میں ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرو اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو اور اس سلسلہ میں اللہ اور رسول کے احکام پر عمل کرنے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور کسی قسم کی حکم عدولی نہ کرو تا کہ تمہیں کامیابی اور سرفرازی کی امید ہو۔

اس آیت کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ نفسہ صبر کرو اور مخالفوں کی ایذاء رسانیوں پر صبر کرو اور ہر حال میں اللہ سے رابطہ استوار رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

اسلامی ملک کی سرحد کی حفاظت کے متعلق احادیث:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ٢٥٦ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سہل بن سعد ساعدی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کی راہ میں ایک دن سرحد کی حفاظت کرنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

امام مسلم بن حجاج قشیری ٢٦١ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سلمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایک دن اور ایک رات سرحد کی حفاظت کرنا' ایک ماہ کے روزوں اور قیام سے افضل ہے' اور اگر وہ مرگیا تو اس کا یہ اجر جاری رہے گا اور وہ فتنہ میں ڈالنے والے سے محفوظ رہے گا۔

(صحیح مسلم' رقم الحدیث: ١٩١٣' سنن نسائی' رقم الحدیث: ٣١٦٨' ٣٦٧' سنن ابن ماجہ' رقم الحدیث: ٢١٦٧'
مسند احمد' ج ٢ ص ١٧٧' ج ٥ ص ٤٤١' ٤٤٠' تحفۃ الاشراف: رقم الحدیث: ٤٤٩١)

فتنہ میں ڈالنے سے مراد یا تو منکر نکیر ہیں اور یا اس سے مراد شیطان ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل منقطع ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کے ثواب کو جاری رکھے گا اور جس حدیث میں ہے ابن آدم میں سے ہر ایک کا عمل منقطع ہو جاتا ہے ماسوا تین کے اس کا مطلب ہے ان تین کا عمل منقطع نہیں ہوتا اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل منقطع ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کا ثواب جاری رکھے گا۔

امام احمد بن حنبل متوفی ٢٤١ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عثمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منی میں فرمایا اللہ کی راہ میں ایک دن سرحد کی حفاظت کرنا اس کے علاوہ ہزار ایام سے افضل ہے۔

(مسند احمد ج ١ ص ٥٧' ٦٦' ٦٤' سنن دارمی' رقم الحدیث: ٢٤٣١)

امام مسلم بن حجاج قشیری ٢٦١ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کیا میں تم کو وہ چیز نہ بتاؤں جس سے اللہ گناہوں کو مٹا دے اور درجات کو بلند کردے' صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں! یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے فرمایا مشقت کے وقت مکمل وضو کرنا' زیادہ قدم چل کر مسجد میں جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا' سو یہی رباط ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٥١' جامع ترمذی' رقم الحدیث: ٥١' سنن نسائی' رقم الحدیث: ١٤٣' مسند احمد ج ٢ ص ٢٧٧' ٢٠٢)

گناہوں کو مٹانے سے مراد یہ ہے کہ ان کے نامہ اعمال سے گناہ مٹا دیئے جائیں' یا گناہ کے مقابلہ میں دل کے اندر جو ایک سیاہ نقطہ بن جاتا ہے اس کو مٹا دیا جائے' مشقت کے وقت مکمل وضو کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب انسان کو پانی ٹھنڈا لگے یا پانی کے استعمال سے جسم میں تکلیف ہو اس وقت مکمل وضو کرے' دور سے چل کر مسجد میں آنا یہ واضح ہے' ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا اس سے یا تو مسجد میں بیٹھ کر انتظار کرنا مراد ہے تو یہ اعتکاف کے ایام میں پانچوں نمازوں سے حاصل ہوتا ہے اور عام دنوں میں آسانی سے عصر کے بعد مغرب کی نماز اور مغرب کے بعد مسجد میں عشاء کی نماز کے انتظار میں حاصل ہوتا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ انسان ایک نماز پڑھ کر اپنے گھر یا دکان یا دفتر میں آجائے لیکن اس کا دل و دماغ دوسری نماز کے انتظار میں لگا ہوا ہو' تو یہ انتظار پانچویں نمازوں میں آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے' اس کو آپ نے رباط فرمایا ہے کیونکہ رباط سے مراد نفس کو پابند کرنا ہے۔ خواہ سرحد کی حفاظت پر خواہ ان عبادات میں یا اس لیے کہ رباط کا معنی ہے نفس اور جسم کا عبادات کے ساتھ ارتباط رکھنا' یا رباط کا معنی ہے نگہبانی کرنا خواہ سرحد کی دشمنان اسلام سے نگہبانی کی جائے خواہ وضو سے نماز کی حفاظت کی جائے اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کر کے اس کی نگہبانی کی جائے اور اس کو ضائع ہونے سے بچایا جائے' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو فرمایا ہے سو یہی رباط ہے اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ سورۃ آل عمران میں جو رابطوا کا لفظ ہے اس سے مراد ان عبادات کی نگہبانی کرنا ہے۔

روضہ رسول پر حاضری

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَلَوۡ اَنَّہُمۡ اِذۡ ظَّلَمُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ جَآءُوۡکَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰہَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَہُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۶۴﴾

(سورۃ النسآء: آیت 64)

''اور ہم نے ہر رسول کو صرف اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے اور جب یہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو یہ آپ کے پاس آجاتے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو یہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، بے حد رحم فرمانیوالا پاتے''۔ (النساء:٦٤)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کو سرزنش کی ہے جو دعوی یہ کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ پر نازل والی کتاب پر ایمان لائے ہیں اپنے مقدمہ کا فیصلہ یہودی عالم کے پاس لے جاتے تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرنے کیلیے جب انھیں بلایا جاتا تو وہ منہ موڑ کر کترا کر نکل جاتے تھے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس نے ہر رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے' مجاہد نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اسی کو نصیب ہوتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ازل میں یہ نعمت مقدر کر دی ہے۔

پھر فرمایا جب ان منافقوں نے کعب بن اشرف کے پاس اپنا مقدمہ پیش کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر ہی لیا تھا تو یہ چاہیے تھا

کہ یہ آپ کے پاس آ کر معذرت کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی چاہتے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو وہ ضرور اللہ کو بہت بخشنے والا اور مہربان پاتے۔

نبی کریم ﷺ کے روضہ پر حاضر ہو کر شفاعت طلب کرنے کا جواز:

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی ۷۷٤ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عاصیوں اور گنہگاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ جب ان سے خطا اور گناہ ہو جائے تو وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آ کر استغفار کریں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ درخواست کریں کہ آپ بھی ان کے لیے اللہ سے درخواست کریں اور جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا اور بہت مہربان پائیں گے مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے ان میں الشیخ ابو منصور الصباغ بھی ہیں انھوں نے اپنی کتاب الشامل میں عتبی کی یہ مشہور حکایت لکھی ہے کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی نے آ کر کہا السلام علیک یارسول اللہ! میں نے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد سنا ہے۔

(آیت) "ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاؤك"۔ الآیہ اور میں آپ کے پاس آگیا ہوں اور اپنے گناہ پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اپنے رب کی بارگاہ میں آپ سے شفاعت طلب کرنے والا ہوں، پھر اس نے دو شعر پڑھے:

اے وہ جو زمین کے مدفونین میں سب سے بہتر ہیں جن کی خوشبو سے زمین اور ٹیلے خوشبو دار ہو گئے۔

میری جان اس قبر پر فدا ہو جس میں آپ ساکن ہیں اس میں عفو ہے اس میں سخاوت ہے اور لطف و کرم ہے۔

پھر وہ اعرابی چلا گیا، عتبی بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر نیند غالب آ گئی میں نے خواب میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کی اور آپ نے فرمایا اے عتبی! اس اعرابی کے پاس جا کر اس کو خوشخبری دو کہ اللہ نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج۲ ص ۳۲۹۔۳۲۸، الجامع لاحکام القرآن ج۵ ص ۲٦۵، البحر المحیط ج۳ ص ٦۹٤، مدارک التنزیل علی ہامش الخازن ج۱ ص ۳۹۹)

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا کہ جو شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعاء مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیاوی حیات کے زمانہ میں ہو سکتی تھی اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے، اس کے بعد مفتی صاحب نے بھی عتبی کی مذکور الصدر حکایت بیان کی ہے۔

(معارف القرآن ج۲ ص ٤٦۰۔٤۵۹ مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی)

معروف دیوبندی عالم محمد سرفراز گکھڑوی لکھتے ہیں

عتبی کی حکایت اس میں مشہور ہے اور تمام مذاہب کے مصنفین نے مناسک کی کتابوں میں اور مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے اور سب نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اسی طرح دیگر متعدد علماء کرام نے قدیما وحدیثا اس کو نقل کیا ہے اور تھانوی لکھتے ہیں کہ مواہب میں بہ سند امام ابو منصور صباغ اور ابن النجار اور ابن عساکر اور ابن الجوزی رحمہم اللہ تعالیٰ نے محمد بن حرب ہلالی سے روایت کیا ہے کہ

میں قبر مبارک کی زیارت کر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور زیارت کر کے عرض کیا کہ یا خیر الرسل اللہ تعالیٰ آپ پر ایک سچی کتاب نازل فرمائی جس میں ارشاد ہے

(آیت) "ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاؤك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما"۔ اور میں آپ کے پاس اپنے گناہوں سے استغفار کرتا ہوا اور اپنے رب کے حضور میں آپ کے وسیلہ سے شفاعت چاہتا ہوا آیا ہوں پھر دو شعر پڑھے۔ اور اس محمد بن حرب کی وفات ۲۲۸ھ میں ہوئی ہے، غرض زمانہ خیر القرون کا تھا اور کسی سے اس وقت نکیر منقول نہیں، پس حجت ہو گیا (نشر الطیب ص ۲۰٤) اور

نانوتوی یہ آیت کریمہ لکھ کر کہتے ہیں: "کیونکہ اس میں کسی کی تخصیص نہیں آپ کے ہم عصر ہوں یا بعد کے امتی ہوں، اور تخصیص ہو تو کیونکر ہو آپ کا وجود تربیت تمام امت کے لیے یکساں رحمت ہے کہ پچھلے امتیوں کا آپ کی خدمت میں آنا اور استغفار کرنا اور کرانا جب ہی متصور ہے کہ قبر میں زندہ ہوں (آب حیات ص ٤٠) اور ظفر احمد عثمانی یہ سابق واقعہ ذکر کر کے آخر میں لکھتے ہیں: پس ثابت ہوا کہ اس آیت کریمہ کا حکم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد بھی باقی ہے۔

(اعلاء السنن ج ۱۰ ص ۳۳۰)

ان کے بیان سے معلوم ہوا کہ قبر پر حاضر ہو کر شفاعت مغفرت کی درخواست کرنا قرآن کریم کی آیت کے عموم سے ثابت ہے، بلکہ امام سبکی فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس معنی میں صریح ہے۔

(شفاء السقام ص ۱۲۸)

اور خیر القرون میں یہ کارروائی ہوئی مگر کسی نے انکار نہیں کیا جو اس کے صحیح ہونے کی واضح دلیل ہے

(تسکین الصدور ص ۳٦٦۔۳٦٥، ملخصا، مطبوعہ ادارہ نصرت العلوم گوجرانوالہ)

اِسلام میں سلام کے احکام اور آداب

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝۸۶

(سورۃ النسآء آیت 86)

اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھا جواب دو یا انہی الفاظ کو لوٹا دو (۱)

بے شبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اور جب تم کو کسی لفظ سے سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر لفظ کے ساتھ سلام کرو یا اسی لفظ کو لوٹا دو، بیشک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ (النساء: ۸٦)

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا تھا اور جہاد کے احکام میں سے یہ بھی ہے کہ جب فریق مخالف صلح کرنے

پر تیار ہو تو تم بھی اس سے صلح کرلو' قرآن مجید میں ہے:

(آیت) "وان جنحوا للسلم فاجنح لها". (الانفال: ۶۱)

ترجمہ: اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہوں۔

اسی طرح جب کوئی شخص سلام کرے تو اس کے سلام کا عمدہ طریقہ سے جواب دینا چاہیے ورنہ کم از کم اسی لفظ سے سلام کا جواب دیا جائے۔ مثلا السلام علیکم کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہے اور اسلام علیکم ورحمۃ اللہ کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے۔

اسلام میں سلام کے مقرر کردہ طریقہ کی افضلیت:

عیسائیوں کے سلام کا طریقہ ہے منہ پر ہاتھ رکھا جائے (آج کل پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہیں) یہودی ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں' مجوسی جھک کر تعظیم کرتے ہیں عرب کہتے ہیں حیاک اللہ (اللہ تمہیں زندہ رکھے) اور مسلمانوں کا سلام یہ ہے کہ کہیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام طریقوں سے افضل ہے کیونکہ سلام کرنے والا مخاطب کو یہ دعا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آفتوں' بلاؤں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے' نیز جب کوئی شخص کسی کو سلام کرتے ہیں تو وہ اس کو ضرر اور خوف سے مامون اور محفوظ رہنے کی بشارت دیتا ہے' مکمل سلام یہ ہے السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ' اور تشہد میں بھی اتنا ہی سلام ہے' جب کوئی شخص فقط السلام علیکم کہے تو اس کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہنا چاہیے اور اگر کوئی السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہے تو اس کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے اگر کوئی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے تو اس کے جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہے' اور بعض روایات میں ومغفرتہ کا اضافہ بھی ہے۔ (سنن ابوداؤد: ۵۱۹۶) سلام کی ابتداء کرنے والا پہلے لفظ السلام کہتا ہے اور جواب دینے والا وعلیکم السلام کہہ کر بعد میں لفظ السلام کہتا ہے' اس میں نکتہ یہ ہے کہ سلام اللہ کا نام ہے اور مجلس کی ابتداء بھی اللہ کے نام سے ہو اور انتہاء بھی اللہ کے نام پر ہو' اور ابتداء بھی سلامتی کی دعا سے ہو اور انتہاء بھی سلامتی کی دعا پر ہو۔

مصافحہ اور معانقہ کی فضیلت اور اجر وثواب کے متعلق احادیث:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا کہ اسلام کا کونسا وصف سب سے بہتر ہے آپ نے فرمایا: تم کھانا کھلاؤ اور ہر (مسلمان) کو سلام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہیں۔

(صحیح البخاری' رقم الحدیث: ۱۲' سنن ابوداؤد' رقم الحدیث: ۵۱۹۴)

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں داخل نہیں ہو گے' اور جب تک تم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرو گے تمہارا ایمان (کامل) نہیں ہوگا' کیا میں تم کو ایسی چیز نہ بتاؤں جس کے کرنے کے بعد تم ایک دوسرے سے محبت کرو؟ ایک دوسرے کو بکثرت سلام کیا کرو۔

(صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۵۴' سنن ابوداؤد' رقم الحدیث: ۵۱۹۳' سنن ترمذی' رقم الحدیث: ۲۶۹۷' سنن ابن ماجہ' رقم الحدیث: ۳۶۹۲' الادب المفرد' رقم الحدیث: ۲۶۹' کشف الاستار عن زوائد البزار' رقم الحدیث: ۲۰۰۲' شعب الایمان' رقم الحدیث: ۸۷۴۵)

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو امامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔

(سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۵۱۹۷، سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۲۶۹٤، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۹۱۱)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ہوتے اگر ہم کسی درخت کی وجہ سے جدا ہو کر پھر مل جاتے تو ایک دوسرے کو سلام کرتے۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(المعجم الاوسط، رقم الحدیث: ۷۹۸۳)

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمران بن الحصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: السلام علیکم آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دس (نیکیاں)، پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ نے سلام کا جواب دیا اور وہ بیٹھ گیا پھر آپ نے فرمایا (تیس) نیکیاں، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، امام بیہقی نے بھی اس کو حسن کہا ہے، امام ابو داؤد نے سہل سے مرفوعا روایت کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے: پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ، آپ نے فرمایا چالیس (نیکیاں)

(سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۵۱۹۵، سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۲۶۹۸، کتاب الآداب للبیہقی، رقم الحدیث: ۲۸۰، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۹۸۶، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی، رقم الحدیث: ۳۳۹)

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب بھی دو مسلمان ملاقات کے بعد مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے الگ ہونے سے پہلے ان کو بخش دیا جاتا ہے۔

(سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۵۲۱۲، سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۲۷۳۶، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۷۰۳، کشف الاستار، رقم الحدیث: ۲۰۰٤)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب جب ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے اور جب سفر سے آتے تو معانقہ کرتے۔ حافظ منذری نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(الترغیب والترہیب ج ۳ ص ٤۲۳، المعجم الاوسط، رقم الحدیث: ۹۷)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حماد بن زید نے ابن المبارک سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔

حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے تشہد کی تعلیم دی درآں حالیکہ میری دونوں ہتھیلیاں آپ کی دونوں ہتھیلیوں میں تھیں

(صحیح البخاری کتاب الاستیذان، باب ۲۸، الاخذ بالیدین، رقم الحدیث: ۶۲۶۵)

حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے ملاقات کرے تو اس کو سلام کرے اگر دونوں کے درمیان کوئی درخت یا دیوار یا پتھر حائل ہو جائے اور پھر ملاقات ہو تو دوبارہ سلام کرے (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۰۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ جو شخص سلام کرنے میں ابتداء کرے وہ تکبر سے بری ہو جاتا ہے۔

(شعب الایمان رقم الحدیث: ۸۷۸۶)

کن لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کرنی چاہیے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سوار پیدل کو سلام کرے اور پیدل بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور کم لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں۔

(صحیح بخاری رقم الحدیث: ۶۳۳۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۱۹۸، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۷۱۲، الادب المفرد رقم الحدیث: ۹۹۵، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۹۴۴۵)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھا آپ کا بچوں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے ان کو سلام کیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۲۶۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۸، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۰۲، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۷۰۵، عمل الیوم واللیلۃ للنسائی رقم الحدیث: ۳۳۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۰۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۵۹، حلیۃ الاولیاء: ج ۶ ص ۲۹۱)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: چھوٹا بڑے کو سلام کرے اور گزرنے والا بیٹھے ہوئے پر اور قلیل کثیر پر

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۲۳۱، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۷۱۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۱۹۸)

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

اسماء بنت یزید (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہم عورتوں کے پاس سے گزر ہوا تو آپ نے ہم کو سلام کیا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۲۰۴، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۶۹۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۰۱، مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۷، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۲۴۸۶)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے میرے بیٹے جب تم اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو اس سے تم پر برکت ہوگی اور تمہارے گھر والوں پر برکت ہوگی۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۷۰۷) حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کلام سے پہلے سلام کرو امام ترمذی نے کہا یہ حدیث منکر ہے

(سنن ترمذی: ۲۷۹۸)

امام مسلم بن حجاج قشیری ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تم کو اہل کتاب سلام کریں تو تم کہو وعلیکم

(صحیح مسلم: ۲۱۶۳، سنن ابو داؤد: ۵۲۰۷)

جن مواقع پر سلام نہیں کرنا چاہیے:

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ لکھتے ہیں:

(۱) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے یہودی کو سلام کی ابتداء نہ کرو، امام ابوحنیفہ نے کہا ہے اس کو خط میں بھی سلام نہ کہو، امام ابو یوسف نے کہا نہ ان کو سلام کرو نہ ان سے مصافحہ کرو، اور جب تم ان پر داخل ہو تو کہو "السلام علی من اتبع الھدی" اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت ان کو ابتداء سلام کرنا جائز ہے (مثلاً کسی کا افسر کافر یا بد مذہب ہو تو اس کو اس کے دائیں بائیں فرشتوں کی نیت کر کے سلام کرے) اور جب وہ سلام کریں تو وعلیک کہنا چاہیے حسن نے کہا ہے کہ کافر کو وعلیکم السلام کہنا تو جائز ہے لیکن وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ مغفرت کی دعا ہے اور کافر کے لیے مغفرت کی دعا جائز نہیں، شعبی نے ایک نصرانی کے جواب میں کہا وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ، ان پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے کہا کیا یہ اللہ کی رحمت میں جی نہیں رہا!

(۲) جب جمعہ کے دن امام خطبہ دے رہا ہو تو حاضرین کو سلام نہ کرے کیونکہ لوگ امام کا خطبہ سننے میں مشغول ہیں۔

(۳) اگر حمام میں لوگ برہنہ نہا رہے ہوں تو ان کو سلام نہ کرے اور اگر ازار باندھ کر نہا رہے ہوں تو ان کو سلام کرسکتا ہے۔

(۴) جو شخص قرآن مجید کی تلاوت کر رہا ہو، روایت حدیث کر رہا ہو، یا مذاکرہ علم میں مشغول ہو اس کو بھی سلام نہ کرے۔

(۵) جو شخص اذان اور اقامت میں مشغول ہو اس کو بھی سلام نہ کرے۔

(۶) امام ابو یوسف نے کہا جو شخص چوسر یا شطرنج کھیل رہا ہو یا کبوتر اڑا رہا ہو، یا کسی معصیت میں مبتلا ہو اس کو بھی سلام نہ کرے۔

(۷) جو شخص قضاء حاجت میں مشغول ہو اس کو سلام نہ کرے۔

(۸) جو شخص گھر میں داخل ہو تو اپنی بیوی کو سلام کرے اگر اس ساتھ کوئی اجنبی عورت ہو تو اس کو سلام نہ کرے۔

(تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۸۰)

سلام کرنا سنت ہے اور اس کا جواب دینا واجب ہے، اگر جماعت مسلمین کو سلام کیا تو ہر ایک پر جواب دینا فرض کفایہ ہے لیکن جب کسی ایک نے جواب دے دیا تو باقیوں سے جواب دینے کا فرض ساقط ہو جائے گا، فساق اور فجار کو پہلے سلام نہیں کرنا چاہیے اگر کوئی اجنبی عورت کسی مرد کو سلام کرے تو اگر بوڑھی ہو تو اس کا جواب دینا چاہیے اور اگر جوان ہو تو اس کے سلام کا جواب نہ دے۔

قتل اور قصاص کے احکام

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَھُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِــيْمًا حَكِــيْمًا ۹۲

(سورۃ النسآء: آیت 92)

''کسی مومن کو دوسرے مومن کا قتل کر دینا زیبا نہیں (۱) مگر غلطی سے ہو جائے (۲) (تو اور بات ہے) جو شخص کسی مسلمان کو بلا قصد مار ڈالے، اس پر ایک مسلمان غلام کی گردن آزاد کرانا اور مقتول کے عزیزوں کو خون بہا پہنچانا ہے (۳) ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں (٤) اور اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا ہو اور ہو وہ مسلمان، تو صرف ایک مومن غلام کی گردن آزاد کرانی لازمی ہے (٥) اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہے تو خون بہا لازم ہے، جو اس کے کنبے والوں کو پہنچایا جائے اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا بھی ضروری ہے (٦) پس جو نہ پائے اس کے ذمے لگاتار دو مہینے کے روزے ہیں (٧) اللہ تعالیٰ سے بخشوانے کے لیے اور اللہ تعالیٰ بخوبی جاننے والا اور حکمت والا ہے''۔

قتل خطا کا بیان

قول باری ہے (وما کان لمومن ان یقتل مومنا الا خطا کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے)۔ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ اس مقام میں لفظ کان کے معنی میں اختلاف ہے، قتادہ کا قول ہے کہ فقرے کا مفہوم یہ ہے اللہ کے حکم اور اس کے امر میں یہ نہیں تھا، دوسرے حضرات کا قول ہے اس کے لیے قتل کے جواز کا سبب نہیں تھا۔

کچھ اور حضرات کا قول ہے، ماضی میں بھی اس کے لیے یہ نہیں تھا جیسا کہ اب نہیں ہے، اسی طرح لفظ، الا، کے معنی کے بارے میں بھی اختلاف ہے کچھ لوگوں کا قول ہے کہ استثنا منقطع ہے اور لکن کے معنوں میں ہے مفہوم یہ ہے لیکن ایک مومن دوسرے مومن کو کبھی خطا اور چوک کی بنا پر قتل کر دیتا ہے، اگر ایسا واقعہ وہ ہو جائے تو اس کا حکم یہ ہے، یہاں، الا کا وہی مفہوم ہے جو نابالغہ کے اس شعر میں ہے۔

وقفت فیھا اصیلا لا اسائلھا، عیت جوابا وما لربع من احد۔

میں محبوبہ کے مسکن کے کھنڈر پر دن ڈھلے جا کھڑا ہوا اور بار بار اس سے پوچھتا رہا لیکن یہ کھنڈر میرے سوال کا جواب دینے سے عاجز رہا اور اس مسکن میں اب کوئی بھی نہیں تھا۔

الا الاواری لایاما ابینھا، والنوی کالحوض بالمضلومۃ الجلد۔

وہاں جانوروں کو باندھنے کی رسیاں تھیں بڑی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد میں انھیں بمشکل پہچان سکا، اس کے علاوہ اس مسکن کے چاروں طرف چوبچہ کھدا ہوا دیکھا، جو اس حوض کے مانند تھا جسے کسی سخت اور پتھریلی زمین میں بڑی مشکل سے کھودا گیا ہو۔

بعض دوسروں کا قول ہے یہ استثناء صحیح ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض حالات میں مومن کے لیے دوسرے مومن کو غلطی اور چوک کی بنا پر قتل کر دینے کی گنجائش ہے مثلاً ایک مومن دوسرے مومن کو ایسی حالت میں پاتا ہے کہ اس پر مشرکین کی نشانیاں اور علامتیں ہوتی ہیں یا وہ اسے مشرکین کے علاقے میں دیکھتا ہے اور اسے بھی مشرک سمجھ بیٹھتا ہے ایسی صورت میں اگر وہ اسے قتل کر دیتا ہے تو یہ قتل خطا شمار ہوگا۔

جیسا کہ زہری نے عروہ بن زبیر سے روایت کی کہ حضرت حذیفہ بن الیمان احد میں حضور کے ہمراہ کافروں سے برسرپیکار تھے مسلمانوں کو ان کے والد کے متعلق غلط فہمی ہوگئی اور انھیں دشمن کا آدمی سمجھ لیا گیا۔

مسلمانوں نے ان پر تلواروں سے حملہ کر دیا حضرت حذیفہ چلاتے رہ گئے کہ یہ میرے والد ہیں لیکن حملہ کرنے والے مسلمان ان کی بات سمجھ نہ سکے اور وہ ان کے ہاتھوں قتل ہو گئے حضرت حذیفہ نے اس موقعہ پر صرف اتنا ہی کہا، اللہ تم لوگوں کو معاف کر دے وہ ارحم الراحمین ہے۔ جب حضور کی اس بات کی خبر ہوئی تو آپ کی نظروں میں حضرت حذیفہ کی نیکی کی اور زیادہ قدر و منزلت ہوگئی۔

ایک قول یہ ہے کہ (الا خطا) کے معنی ہیں، ولا خطا، کیونکہ جنگ اور قتال کی حالت میں، بھی مومن کا قتل مباح نہیں ہوتا، اس لیے استثناء کو اس کے حقیقی معنوں پر محمول کرنا درست نہیں ہے لیکن اس قول میں کوئی وزن نہیں ہے، اس کے دو وجوہ ہیں ایک تو یہ عربی زبان کے محاورات میں الا کبھی، ولا، کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قول کے قائل نے جس بات کا انکار کیا ہے یعنی قتل خطا کی اباحت کا امتناع کہ قتل خطا کی اباحت کا وجود ہی نہیں ہے تو اس کا امتناع کیسا، یہ بات قتل خطا کے حظر یعنی ممانعت میں بھی موجود ہے اس لیے کہ اگر قتل خطا یہ فعل واقع ہو گیا تو اس کی اباحت درست نہیں ہوگی کیونکہ قاتل کے نزدیک اس کا قتل خطا ہونا ہی مسلم نہیں ہے جب اس کی اباحت درست نہیں ہوگی تو اس کی ممانعت اور اس سے نہی بھی درست نہیں ہوگی، اور اس طرح کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہے گا۔

کسی نے آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ قول باری (وما کان لمومن ان یقتل مومنا) قاتل کے لیے سزا کے ایجاب کو متضمن ہے اس لیے کہ فقرے میں نہیں کا اطلاق اس کا تقاضا کرتا ہے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر قاتل گناہ کا مستحق قرار پائے گا۔

پھر فرمایا (الا خطا) یعنی خطا کی صورت میں اس کے مرتکب کو گناہ نہیں ہوگا، اب حرف استثناء کو صرف گناہ کے استحقاق کے مفہوم پر داخل کر کے قتل خطا کے مرتکب کو اس سے خارج کر دیا گیا ہے فقرے میں استثناء اپنی جگہ استعمال ہوا ہے اور اسے اس کے معنی سے ہٹایا نہیں گیا ہے استثناء کا دخول صرف اس گناہ کے استحقاق پر ہوا ہے جو قتل کی بنا پر لازم ہوتا ہے پھر اس سے قتل خطا

کے مرتکب کو خارج کر دیا گیا ہے استثناء قاتل سے سرزد ہونے والے فعل پر داخل نہیں ہوا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ فقرے کے الفاظ میں جس بات کی ممانعت کی گئی تھی، الا، کے ذریعے اس کی اباحت ہوگئی۔

ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ یہ توجیہ درست ہے اور اس کی گنجائش موجود ہے جن لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ استثناء سے اس شخص کو خطا قتل کر دینے کی اباحت ظاہر ہوتی ہے جسے قاتل مشرک سمجھتا ہو تو اس سلسلے میں یہ بات واضح ہے کہ اگر اس کا نام اباحت ہے تو قاتل کے لیے یہ فعل اس وقت ہی درست ہوگا جب اسے مشروط حالت کے تحت بروئے کار لایا جائے گا اور وہ یہ کہ قاتل بھی اسے قتل خطا سمجھ رہا ہو۔

اب یہ بات قابل غور ہے کہ اس مسلمان کا قتل جو دشمن کے علاقے اور اس کی جگہ میں ہو قصداً قتل کہلائے گا قاتل کے نزدیک یہ قتل خطا نہیں ہوگا، بلکہ اس کے نزدیک قتل عمد ہوگا جس کی بنیاد یہ ہوگی کہ ایسے آدمی کو قتل کر دینے کا اسے حکم ملا ہے۔

اس لیے یہ درست نہیں ہوگا کہ آیت میں یہ قتل مراد ہو اس لیے کہ اباحت کے قول کے اس قائل کے مطابق اباحت کی شرط نہیں پائی گئی اور وہ شرط یہ ہے کہ قاتل بھی اسے قتل خطا سمجھتا ہو۔

قاتل کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر وہ کسی سے یہ کہے، لاتقتلہ عمدا، اسے قصداً قتل نہ کرو) تو قاتل یعنی مخاطب کے نزدیک اس فقرے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اسے اس قتل کے ارتکاب سے روکا گیا ہے جو صفت عمد کے ساتھ متصف ہو، اسی طرح کسی سے یہ کہا جائے، (اسے تلوار سے مت قتل کرو) تو اس کا یہی مفہوم ہوگا کہ فقرے میں اس قتل کی ممانعت ہے جو تلوار کے ذریعے کیا جائے۔

اسی طرح قول باری (الا خطا) کا مفہوم ہے کہ جب اسے قتل خطا کی اباحت کا مقتضی تسلیم کر لیا جائے تو ضروری ہے اباحت کی شرط بھی پائی جائے اور وہ یہ کہ قاتل بھی اسے قتل خطا سمجھتا ہو لیکن اس شرط کا پایا جانا محال ہے اس کے وقوع کا کوئی جواز نہیں کیونکہ قتل خطا ہوتا ہی وہ قتل ہے جس میں قاتل کو اس بات کا علم نہیں ہوتا، کہ اس سے خطا ہوئی ہے، اب جس حالت اور کیفیت کا اسے علم ہی نہ ہو اس کے ساتھ ممانعت اور اباحت کا متعلق ہونا درست ہی نہیں ہوتا۔

ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ قتل کی چار صورتیں ہوتی ہیں، قتل عمد، قتل خطا، قتل شبہ عمد، اور ایسا قتل جو نہ عمد ہو، نہ خطا اور نہ ہی شبہ عمد۔

قتل عمد وہ قتل ہے، جس میں کسی ہتھیار سے جان بوجھ کر مقتول پر وار کیا گیا ہو اور وار کرنے والے کو اس وار کے مقصد کا بھی پوری طرح علم ہو۔

قتل خطا کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ مثلاً کسی مشرک یا پرندے وغیرہ پر تیر چلانے کا ارادہ ہو لیکن یہ کسی مسلمان کو جا لگے۔ دوسری یہ کہ قاتل مقتول کو مشرک سمجھ کر قتل کر ڈالے اور اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہو کہ مقتول نے مشرکوں والا لباس پہن رکھا ہو یا وہ اہل شرک کے علاقے میں رہتا ہو، پہلی صورت خطا فی الفعل کی ہے اور دوسری صورت خطا فی القصد کی ہے۔

شبہ عمد وہ قتل ہے جس میں ہتھیار کے سوا کسی اور چیز مثلاً پتھر، لاٹھی، وغیرہ سے جان بوجھ کر وار کرے اور قتل کر دے، فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے جس کا ذکر ہم انشاء اللہ اس کے مقام پر کریں گے۔

ایسا قتل جو نہ عمد ہو، نہ شبہ عمد اور نہ ہی خطا، وہ بے خیال اور غیر متوجہ انسان نیز سوئے ہوئے انسان کا ارتکاب قتل ہے، اس لیے کہ قتل عمد میں بعینہ ارادہ قتل ہوتا ہے قتل خطا میں بھی فعل قتل مقصود ہوتا ہے لیکن خطا بعض دفعہ فعل اور بعض دفعہ قصد اور ارادے میں واقع ہو جاتی ہے اور بے خیال انسان یعنی ساہی کا ارتکاب قتل قصد اور ارادے سے عادی ہوتا ہے اس لیے وہ عمد اور خطا کے دائرہ

میں نہیں آتا تاہم دیت اور کفار کے لحاظ سے اس کا حکم قتل خطا جیسا ہے۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ قتل کے حکم کے ساتھ اس صورت کو بھی ملحق کر دیا گیا ہے جو حقیقت میں قتل کی صورت نہیں ہوتی، نہ عمد اور نہ ہی غیر عمد مثلاً کنواں کھودنے والا یا راستے میں پتھر رکھنے والا جس میں گر کر یا جس سے ٹکرا کر کوئی شخص ہلاک ہو جائے یہ شخص حقیقت میں قاتل نہیں ہوتا کیونکہ مرنے والے انسان کی ہلاکت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔

کیونکہ ہم سے سرزد ہونے والا فعل یا تو براہ راست سرزد ہوتا ہے یا بالواسطہ وقوع پذیر ہوتا ہے کنواں کھودنے والے اور پتھر رکھنے والے انسان کا کنویں میں گر جانے والے اور پتھر سے ٹکرا جانے والے انسان کے سلسلے میں کوئی فعل نہیں ہوتا نہ تو بلا واسطہ اور نہ ہی بالواسطہ۔ اس لیے وہ حقیقت میں قاتل نہیں ہوتا۔

اس بنا پر ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ اس پر کفارہ عائد نہیں ہوگا، قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس پر دیت بھی عائد نہ ہو لیکن فقہاء کا دیت کے وجوب پر اتفاق ہے۔ ارشاد باری ہے (ومن قتل مومنا خطاء فتحریر رقبۃ مومنہ، ودیۃ مسلمۃ الی اھلھا۔ جس نے کسی مومن کو خطا قتل کر دیا تو ایک مسلمان مملوک کا آزاد کرنا اور مقتول کے اہل کو دیت حوالے کرنا ہے) آیت میں یہ ذکر نہیں ہے کہ دیت کسی پر واجب ہے قاتل پر یا اس کے عاقلہ پر۔

دیت کی عاقلہ پر ذمہ داری:

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے قتل خطا کی دیت کا عاقلہ پر ایجاب کے سلسلے میں متواتر احادیث مروی ہیں اور اس پر فقہاء کا بھی اتفاق ہے حجاج نے حکم سے روایت کی ہے انھوں نے مقسم اور انھوں نے حضرت ابن عباس سے کہ حضور نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک تحریر لکھوائی تھی جس میں مرقوم تھا کہ وہ اپنی اپنی دیتیں ادا کریں گے اور درست طریقے سے اپنے اپنے قیدی چھڑائیں گے اور مسلمان کے درمیان اصلاح کریں گے۔

ابن جریج نے ابو الزبیر سے اور انھوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے حضور نے تحریری حکمنامہ بھیجا تھا کہ ہر بطن یعنی قبیلے کی شاخ پر اس کی دیت واجب ہے آپ نے پھر یہ مراسلہ بھیجا کہ یہ بات جائز نہیں کہ ایک شخص کا آزاد کردہ غلام آقا کی اجازت کے بغیر اپنی ولاء کا تعلق کسی اور شخص سے جوڑ دے۔

مجالد نے شعبی سے اور انھوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے کہ بنو ہذیل کی ایک عورت نے اپنے ہی قبیلے کی دوسری عورت کو قتل کر دیا ہے، دونوں عورتوں کے شوہر اور بیٹے موجود تھے حضور نے مقتولہ کی دیت قاتلہ کی عاقلہ پر ڈال دی اور اس کے شوہر اور لڑکے پر کوئی چیز عائد نہ کی اس پر مقتولہ کی عاقلہ نے کہا کہ اس کی میراث ہمیں ملنی چاہیے۔

حضور نے فرمایا (لا میراثھا الزوجھا ولدھا، نہیں، اس کی میراث اس کے شوہر اور بیٹے کے لیے ہے، وہ عورت حاملہ تھی، اسے اسقاط ہو گیا قاتلہ کے عاقلہ ڈر گئے کہ کہیں حضور اس بچے کا تاوان بھی ان پر ڈال دیں۔

انہوں نے آپ سے عرض کیا اسقاط کی بنا پر پیدا ہونے والے جنین نے نہ کچھ کھایا نہ پیا نہ رویا اور نہ ہی آواز نکالی۔ اس پر حضور نے فرمایا، یہ زمانہ جاہلیت کی سزا بندی ہے آپ نے اس جنبین کے تاوان کے طور پر ایک غرہ یعنی ایک غلام یا ایک لونڈی دینے کا

فیصلہ دیا تھا، جس شخص کے متعلق حضور نے عقل یعنی دیت کے لزوم کا فیصلہ دیا تھا وہ کہنے لگا کہ ہم اس کی بھی دیت ادا کریں جس نے نہ کھایا نہ پیا نہ رویا، نہ ہی کوئی آواز نکالی، اس جیسا خون باطل ہوگیا۔

حضور نے فرمایا، یہ شاعرانہ بات ہے اس کی دیت ایک غلام یا لونڈی ہے عبدالواحد بن زیاد نے مجالد سے انھوں نے شعبی سے اور انھوں نے حضرت جابر سے روایت کی ہے حضور نے جنین میں قاتل کے عاقلہ پر ایک غرہ یعنی غلام یا لونڈی لازم کردی۔

اعمش نے ابراہیم سے روایت کی ہے حضور نے عصبہ پر خونبہا کی ادائیگی لازم کردی تھی، ابراہیم نخعی نے روایت کی ہے کہ حضرت صفیہ کے آزاد کردہ غلاموں کی ولاء کے متعلق حضرت علی اور حضرت زبیر اپنا مقدمہ حضرت عمر کے پاس لے کر گئے۔ حضرت عمر نے حضرت زبیر کے حق میں میراث اور حضرت علی پر اس کی دیت کا فیصلہ دیا۔

حضرت عمر اور حضرت علی سے ان لوگوں کے متعلق مروی ہے جنہیں مقتول کی لاش ملی تھی کہ اس کی دیت بیت المال پر ہوگی، حضرت عمر سے ایک مقتول کے متعلق جو وداعہ اور ایک اور قبیلے کے علاقے کے وسط میں پڑا ملا ہوا تھا، آپ کے عاقلہ پر دیت کے لزوم کا فیصلہ دیا تھا۔

حضور سے تواتر کے ساتھ روایت منقول ہیں کہ آپ نے قتل خطا میں عاقلہ پر دیت واجب کردی تھی، فقہاء، امصار اور سلف کا بھی اس پر اتفاق ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قول باری (ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخری، ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا اور کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) نیز حضور کا ارشاد ہے، (لا یوخذ الرجل بجریرۃ ابیہ ولا بجریرۃ اخیہ، کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے جرم کی بنا پر ماخوذ نہیں ہوگا۔

آپ نے حضرت ابورمثہ سے فرمایا تھا، (لا یجنی علیک ولا تجنی علیہ، اس کے جرم کی سزا تم نہیں بھگتو گے اور تمہارے جرم کی سزا یہ نہیں بھگتے گا) عقل انسانی کا بھی تقاضا یہی ہے کہ ایک انسان کو کسی اور کے جرم کی بنا پر نہ پکڑا جائے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ مذکورہ بالا آیت میں عاقلہ پر وجوب دیت کی نفی نہیں ہے، اس میں کسی کو کسی دوسرے کے جرم پر پکڑنے کی نفی ہے۔ عاقلہ پر دیت کے ایجاب میں مجرم کے جرم کی بنا پر ان کے ماخوذ ہونے کا مفہوم موجود نہیں ہے، ہمارے نزدیک دیت تو دراصل قاتل پر عائد ہوتی تھی لیکن عاقلہ کو قاتل کے ساتھ مل کر دیت کا بوجھ اٹھانے کا حکم اس لیے دیا گیا کہ وہ اس کی دست گیری کرسکیں۔ یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اس کے اس جرم کی سزا اور اس کا گناہ انھیں لازم آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے اموال میں فقراء کے حقوق رکھے ہیں اس کی یہ وجہ نہیں کہ اغنیاء نے کوئی جرم یا گناہ کیا ہے جس کی پاداش ان پر مالی بوجھ ڈالا گیا ہے بلکہ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ وہ غریبوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرسکیں اور ان کی دست گیری کرسکیں۔

اسی طرح ہر ممکن صورت سے صلہ رحمی اور والدین کے ساتھ نیکی کا حکم دیا گیا ہے ہمدری اور غمخواری کا جذبہ ابھارنے اور آپس کے تعلقات کو بہتر بنانے کی خاطر ان باتوں کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسی طرح قاتل کے ساتھ غمخواری کرنے اور اس کو بوجھ بٹانے کی خاطر عاقلہ کی دیت کا بوجھ مل کر برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس میں عاقلہ یا قاتل پر طاقت سے زیادہ بوجھ برداشت کرنے کا کوئی پہلو نہیں ہے، ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ تین یا چار

درہم فی کس کے حساب سے دینے پڑتے ہیں، اگر وظائف حاصل کرنے والوں کے رجسٹروں میں ان کے ناموں کا اندراج ہوگا یہ رقم وہیں منہا کرلی جائے گی اور اس کی ادائیگی میں تین سال تک کی مہلت بھی مل جاتی ہے اس طرح جس بات کی انھیں ترغیب دی گئی ہے وہ مکارم اخلاق میں داخل ہے۔

عربوں میں اسلام سے پہلے بھی دیت کا بوجھ مل جل کر برداشت کرنے کا رواج تھا، اور یہ چیز ان کے اچھے افعال اور مکارم اخلاق میں شمار ہوتی تھی، حضور کا ارشاد ہے، بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، دنیا میں میری بعثت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میں عمدہ اخلاق کی تکمیل کردوں) اس لیے دیت کا بوجھ مل جل کر برداشت کرنے کا فعل عقلی طور پر بھی مستحسن ہے اور اخلاق کی عادات کی رو سے بھی پسندیدہ ہے۔

عاقلہ پر دیت کے وجوب کی کئی مستحسن اور قابل قبول وجوہات ہیں، اول جس طرح اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے اموال میں فقراء کے لیے صدقات کا وجوب فرمادیا ہے اسی طرح اس کی گنجائش ہے کہ قاتل سے قتل کا فعل سرزد ہوئے بغیر اللہ اس کے عاقلہ پر شروع ہی سے اس کے لیے مال کے ایجاب کا حکم لگادے۔

دوم عاقلہ پر دیت کا بوجھ دستگیری کرنے اور ہاتھ بٹانے کے تصور کی بنیاد پر کیا گیا ہے اسی لیے ہمارے اصحاب نے اس دیت کا بوجھ ان لوگوں پر ڈالا ہے جن کے ناموں کا سرکاری طور پر اندراج اس قاتل کے نام کے ساتھ دیوان یعنی وظائف کے رجسٹر میں ہوگا، دیت کا بوجھ اس کے رشتہ داروں پر نہیں ڈالا جائے گا اس لیے کہ قاتل کے اہل دیوان اس کی مدد کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ جنگ کے موقعہ پر وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے، ایک دوسرے کی حمایت کرتے اور اپنی عزت وآبرو کی مدافعت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، چونکہ یہ لوگ جنگ اور دفاع کی صورت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اس لیے انھیں دیت کا بوجھ اٹھانے میں بھی ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کا حکم دیا گیا تاکہ جنگ میں جس طرح ایک دوسرے کی یکساں طور پر مدد کرتے ہیں اسی طرح دیت کا بوجھ بھی یکساں طور پر اٹھائیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عاقلہ پر دیت کے وجوب سے ان کے درمیان پہلے سے پیدا شدہ بغض وعداوت اور کینہ کا خاتمہ ہوجائے گا اور یہ چیز آپس کی الفت ومحبت اور تعلقات کی بہتری کا سبب بن جائے گی آپ نہیں دیکھتے کہ اگر دو شخصوں کے درمیان نفرت وعداوت موجود ہو اور پھر ایسا ہوجائے کہ ان میں سے ایک شخص دوسرے پر لازم ہونے والی ذمہ داری کو اپنے سر لے لیے تو اس سے دونوں کے درمیان پایا جانے والا کینہ ختم ہوجائے گا، آپ میں محبت پیدا ہوجائے گی اور تعلقات درست ہوجائیں گے۔

مثلاً کوئی شخص ان دونوں میں سے کسی کو نقصان پہنچانا چاہیے، اور دوسرا شخص اس کی پوری حمایت کرے اور اس کی مدافعت کرے تو اس سے دلوں کا کینہ اور بغض ختم ہوکر اس کی جگہ ایک دوسرے کی مدد تعاون اور اچھے تعلقات کا جذبہ پیدا ہوجائے گا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اگر اس موقعہ پر ایک شخص قاتل پر عائد ہونے والی دیت کا بوجھ اٹھالیتا ہے تو اس سے اس بات کا امکان پیدا ہوجاتا ہے کہ وقت پڑنے پر قاتل بھی اس پر عائد ہونے والی دیت کا بوجھ اٹھالے گا۔ اس طرح دیت کے سلسلے میں اس شخص کے تعاون کا اقدام ضائع نہیں جائے گا بلکہ اس کا ایک خوش گوار اثر یہ ہوگا کہ وقت پڑنے پر قاتل بھی اس شخص کے لیے ایسے ہی اقدامات کرے گا۔

یہ وہ وجوہات ہیں جو عقل کی نظروں میں مستحسن ہیں اور ان کی کوئی تردید نہیں کرسکتا، البتہ ان میں صرف ان لوگوں کو کیڑے نظر آتے ہیں جن کے ذہنوں میں الحاد ہوتا ہے اور نہ صرف قلت علم ومعرفت اور تنگ نظری کے شکار ہوتے ہیں بلکہ غور فکر کی نعمت سے بھی

محروم ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی توفیق و ہدایت سے نوازا ہے اس پر اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

قتل خطا کی دیت کے وجوب کے لیے تین سالوں کی مدت کے متعلق اختلاف رائے نہیں ہے ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ ہر وہ دیت جو صلح کے بغیر واجب ہوگئی ہو اس کی مدت تین سال ہے۔

اشعث نے شعبی سے اور حکم نے ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ سرکاری طور پر وظائف دینے کا کام سب سے پہلے حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانے میں لازم کر دیا۔ اور ان وظائف میں تین سالوں کے دوران دیت کی پوری رقم کی وصولی کو بھی لازم کر دیا، آپ نے دو ثلث اور نصف دیت کے لیے دو سال کا عرصہ مقرر کیا اور اس سے کم کے لیے ایک سال کا عرصہ۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ حضرت عمر سے یہ بات بکثرت منقول ہوئی ہے اور سلف میں سے کسی نے بھی اس سے اختلاف نہیں کیا، فقہاء امصار نے بھی اس پر اتفاق کیا اس لیے یہ اجماع بن گیا اور اب اس کے خلاف چلنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

عاقلہ کے بارے میں فقہاء کی آراء:

عاقلہ کے متعلق فقہاء امصار کا اختلاف ہے کہ اس کا اطلاق کن لوگوں پر ہوگا، امام ابوحنیفہ اور ہمارے دوسرے تمام اصحاب کا قول ہے کہ قتل خطا میں دیت عاقلہ پر واجب ہوگی، اور اس کی مدت فیصلے کی تاریخ سے لے کر تین سالوں تک ہوگی، اگر قاتل اہل دیوان میں سے ہے تو اہل دیوان اس کے عاقلہ ہوں گے ان کے وظائف میں سے اس حساب سے دیت کی وصولی ہوگی کہ ان میں سے ہر ایک کو پوری دیت میں سے زیادہ سے زیادہ تین یا چار درہم ادا کرنے پڑیں۔

اگر ہر شخص کے حصے میں آنے والی رقم اس سے زائد ہوگی تو اہل دیوان کے ساتھ اس ادائیگی میں ان قبائل کو بھی شامل کر لیا جائے گا جو نسب کے لحاظ ان سب سے زیادہ قریب ہوں گے۔ اگر قاتل اہل دیوان میں سے نہیں ہوگا، تو اس کے عاقلہ پر تین سالوں کی مدت کے اندر دیت کی ادائیگی لازم کر دی جائے گی، قاتل سے جو سب سے قریب ہوگا، اس کی باری پہلے آئے گی اور بقیہ رشتہ داروں کے لیے بھی الاقرب فالاقرب، کا یہی اصول اپنایا جائے گا، ادائیگی کی مدت کی ابتداء قاضی کے فیصلے سنانے کے دن سے شروع ہوگی۔

دیت کی وصولی کا طریق کار ہوگا کہ ہر سال کے شروع میں تہائی دیت فی کس تین یا چار درہم کے حساب سے وصول کیا جائے گا اس رقم میں اضافہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کی یہ حد قائم رکھنے کے لیے بوقت ضرورت نسب کے لحاظ سے قریب ترین قبائل کو بھی اس کی ادائیگی میں حصہ دار بنا لیا جائے گا۔

محمد بن الحسن کا قول ہے حلیف پر لازم ہونے والی دیت اس کے حلفاء ادا کریں گے اور اس کی قوم اس پر عائد ہونے والی دیت ادا نہیں کرے گی۔ عثمان البتی کا قول ہے کہ دیت کی ادائیگی میں اہل دیوان دوسرے تمام عاقلہ سے بڑھ کر ذمہ دار نہیں ہوتے، ابن القاسم نے امام مالک سے نقل کیا ہے کہ دیت کا بوجھ قبائل پر ڈالا جائے گا۔ مالدار پر اس کے حساب سے اور اس سے کم مال رکھنے والے پر اس کے حساب سے حتیٰ کہ ایک شخص کے حصے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو درہم کی رقم آجائے۔

امام مالک سے منقول ہے کہ یہ رقم ان کے سرکاری وظائف سے وصول کی جائے گی، سفیان یہ وصولی مردوں کو وظائف ملنے کے موقعہ پر کی جائے گی، حسن بن صالح کا قول ہے کہ دیت کی ادائیگی کا لزوم مردوں پر ان وظائف میں ہوگا، جو لڑائی میں شرکت کے قابل

افراد کو دیے جاتے ہیں۔لیث کا قول ہے کہ عقل یعنی دیت کا لزوم قاتل کے ساتھ ساتھ اس قوم پر بھی ہوگا، جن کے ساتھ قاتل سرکاری وظائف حاصل کرتا ہے، قاتل کی اپنی قوم پر اس کا لزوم نہیں ہوگا، اگر اس قوم میں ایسے لوگ موجود نہیں ہوں گے جو دیت کا بوجھ اٹھا سکتے ہوں تو ان کے ساتھ ان کے قریب ترین قبائل کو شامل کرلیا جائے گا۔

المزنی نے اپنی کتاب ،المختصر ، میں ، میں امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ دیت کی ادائیگی کا وجوب رشتہ داروں پر ہوتا ہے اہل دیوان ،اور حلیفوں پر نہیں ہوتا، رشتہ داروں میں یہ ترتیب رکھی جائے گی کہ اس کے باپ کی طرف سے، پھر دادا کی طرف سے، پھر پردادا کی طرف سے اس کے رشتہ داروں سے الاقرب فالاقرب کے اصول کے تحت رقم وصول کی جائے گی، اگر مذکورہ بالا رشتہ دار بعض حصہ ادا کرنے سے قاصر رہیں تو ان کے موالی یعنی انھیں آزاد کرنے والے یہ باقی ماندہ حصہ ادا کریں گے۔

اگر موالی بھی اس سے عاجز رہیں تو ان کے عاقلہ اگر ہوں گے تو ادائیگی کریں گے، اگر ان کے رشتہ دار نہیں ہوں گے ،اور نہ ہی موالی اعلی یعنی آزاد کرنے والے آقا موجود ہوں گے تو موالی اسفل یعنی ان کے آزاد کردہ غلام ادائیگی کا بوجھ اٹھائیں گے جو شخص مالدار ہوگا وہ نصف دینار کی ادائیگی کا بوجھ اٹھائے گا،اور جو اس سے کمتر ہوگا وہ ربع دینار کا بوجھ اٹھائے گا کسی پر نصف دینار سے زائد یا ربع دینار سے کم رقم لازم نہیں کی جائے گی۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ حضرت جابر کی روایت ہے کہ حضور کا ارشاد ہے (علی کل بطن عقولہ) نیز (لایتولی مولی قوم الاباذنھم) الاقرب فالاقرب، کے اعتبار کے سقوط پر دلالت کرتی ہے نیز یہ کہ اس معاملے میں مجرم کے قریب وبعید رشتہ دار سب یکساں ہیں، حضرت عمر سے مروی ہے کہ آپ نے سلمہ بن نعیم سے، جبکہ ان کے ہاتھوں ایک مسلمان کافر کے شبہ میں قتل ہوگیا فرمایا تھا، تم پر اور تمہاری قوم پر دیت ہے۔

حضرت عمر نے اس معاملے میں قریب وبعید کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا، یہ چیز اس معاملے میں قریب وبعید کی یکسانیت نیز انہیں لازم آنے والے فی کس حصے کے اعتبار سے ان کی یکسانیت پر دلالت کرتی ہے اور اس معاملے میں غنی اور فقیر کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

یہ بات اس پر بھی دال ہے کہ قاتل بھی دیت کی ادائیگی میں عاقلہ کے ساتھ شامل ہوگا، اس لیے حضور نے فرمایا تھا (علیک وعلی قومک الدیہ) زمانہ جاہلیت میں لوگ نصرت اور مدد کی بنیاد پر ایک دوسرے پر عائد ہونے والے دیتیں بھرتے تھے پھر اسلام کا زمانہ آگیا اور یہ معاملہ اسی طرح چلتا رہا پھر حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں انتظامی اصلاحات کے تحت دوو ین یعنی رجسٹر ڈ بنوائے جن میں تمام لوگوں کے ناموں کا اندراج کر دیا اور ایک جھنڈے اور فوجی دستے کے تحت آنے والے افراد کو ایک ہاتھ یعنی ایک بازو قرار دیا۔ پھر ان پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ ان کے مقابلہ میں آنے والے دشمنوں سے سب مل کر جنگ کریں گے، اس طرح یہ لوگ جھنڈوں اور دواوین کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد کرتے اور ایک دوسرے پر لازم ہونے والی دیت بھرتے۔اگر کوئی شخص اہل دیوان میں سے نہ ہوتا تو پھر دیت کا لزوم قبائل پر ہوتا کیونکہ اس صورت میں قبائل کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد ہوتی۔

اس لحاظ سے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں ایک دوسرے پر لازم ہونے والی دیت کی ادائیگی کا سبب ایک ہی تھا، یعنی نصرت اور مدد، جب زمانہ اسلام میں مدد اور نصرت کی بنیاد جھنڈوں اور دواوین پر رکھی گئی تو لوگ اسی بنیاد پر ایک دوسرے پر لازم ہونے

والی دیت بھرتے رہے کیونکہ اس صورت میں ان کی یہ نصرت قبیلے کی بنیاد پر نصرت سے اخص تھی، پھر جھنڈوں اور دواوین کی عدم موجودگی میں قبائل کے ذریعے ایک دوسرے کی مدد کرتے اس لیے اسی بنیاد پر ایک دوسرے پر لازم ہونے والی دیت بھی بھریں گے۔

عقل یعنی دیت کی ادائیگی نصرت کے تابع ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ عورتیں عقل میں داخل نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذات میں نصرت کے معنی نہیں پائے جاتے، یہ بات اس پر دلالت کرتی ہے کہ عقل کے سلسلے میں نصرت کا اعتبار درست ہے، رہا حلف کی بنا پر عقل کا اعتبار تو اس سلسلے میں وہ روایت بطور دلیل پیش کی جاتی ہے جسے سعد بن ابراہیم نے حضرت جبیر بن مطعم سے اور انھوں نے حضور ﷺ سے نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔

لاحلف فی الاسلام ویما حلف کان فی الجاھلیۃ، فلم یزدہ الاسلام الاشدۃ۔ اسلام میں کوئی حلف نہیں زمانہ جاہلیت میں جو حلف اور معاہدہ ہوا تھا اسلام نے اسے اور پختہ کر دیا ہے) اس طرح حضور نے زمانہ جاہلیت کے حلف اور معاہدے کو برقرار رکھا، اہل جاہلیت کے نزدیک نصرت اور عقل کے معاملوں میں حلف کی حیثیت قرابت جیسی ہوتی تھی، پھر اسلام نے اسے اور پختہ کر دیا۔

حضور سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا (مولی القوم من انفسھم وحلیفھم منھم کسی قوم کا آزاد کردہ غلام ان میں سے ہی ہے اور ان کا حلیف بھی ان میں سے ہے) ایک دفعہ حضور کے سواروں نے ایک مشرک پر حملہ کر کے اسے پکڑ لیا تھا اور پھر آپ نے اسے مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا تھا اس شخص نے جب یہ پوچھا کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں یہاں قید کیا گیا ہے تو آپ نے جواب دیا تھا کہ تمہارے حلیفوں کے جرم کی پاداش میں۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضور نے حلف اسلام کی نفی کر دی ہے کیونکہ آپ کا ارشاد ہے (لاحلف فی الاسلام) تو اس کے جواب میں کہا جائے گا، کہ اس حلف کی نفی کا مفہوم یہ ہے کہ ذوی الارحام کی موجودگی میں حلف کی بنا پر ایک دوسرے کی وراثت حاصل نہیں ہوسکتی کیونکہ حلف کی بنا پر ایک دوسرے کو وارث قرار دیتے تھے اور ذوی الارحام کو نظر انداز کر دیتے تھے لیکن نصرت اور عقل کے سلسلے میں حلف کا حکم بحالہ باقی اور ثابت ہے اسی طرح ولا بھی ثابت اور باقی ہے اس کی بنیاد پر ایک دوسرے پر لازم ہونے والی دیت کی ادائیگی کی جائے گی۔

اس کی دلیل وہ روایتیں ہیں جو حضور سے گزشتہ سطور میں نقل کی گئی ہے ہمارے اصحاب نے ہر شخص پر زیادہ سے زیادہ تین یا چار درہم لازم کیے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقدار کے لزوم پر سب کا اتفاق ہے اس سے زائد مقدار میں اختلاف ہے اس کے لزوم کی کوئی دلیل نہیں ہے اس لیے یہ لازم نہیں ہوگا۔

دیت کی ادائیگی میں عاقلہ کے ساتھ قاتل بھی داخل ہوگا، ہمارے اصحاب، امام مالک، ابن شبرمہ لیث اور امام شافعی کا یہی قول ہے حسن بن صالح اور اوزاعی کا قول ہے کہ قاتل داخل نہیں ہوگا، حضرت عمر اور حضرت عمر بن عبدالعزیز سے مروی ہے قاتل بھی داخل ہوگا اور عاقلہ کے ساتھ یہ بھی دیت بھرے گا، سلف سے اس قول کی مخالف میں کوئی روایت نہیں ہے، عقل طور پر بھی یہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ دیت کا لزوم بنیادی طور پر قاتل پر ہوتا ہے، اور عاقلہ صرف قاتل کی دستگیری اور اس کی مدد کی بنیاد پر دیت کی ادائیگی کرتے ہیں۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ عاقلہ کو صرف متقین مقدار لازم ہو جب کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عاقلہ کو ان کے ایک فرد کے حصے کے سوا باقی حصے لازم ہیں، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ دیت کی وہ کون سی مقدار ہے جو ان کے ایک فرد کے حصے میں آتی ہے آیا اس حصے کو

بھی عاقلہ کو برداشت کرنا ہوگا، اس لیے ضروری ہے کہ وہ حصہ عاقلہ کو لازم نہ ہو، کیونکہ عاقلہ پر اس کے لزوم کی کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔

اسے ایک اور جہت سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ عاقلہ دیت کی ادائیگی صرف قاتل کی طرف سے کرتا ہے اس لیے قاتل کی اپنی ذات کی طرف سے اس کی ادائیگی بطریق اولی ہونی چاہیے، اس لیے اسے بھی اس میں داخل (رح) ہونا چاہیے نیز اگر مجرم قاتل کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو قاتل کی دیت کی ادائیگی میں عاقلہ کے ساتھ شامل ہوتا تا کہ عاقلہ کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے اب جبکہ وہ خود مجرم ہو تو عاقلہ پر بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے، ان کے ساتھ اسے بطریق اولی داخل ہونا چاہیے کیونکہ ایک دوسرے کی مدد اور دست گیری کے لحاظ سے ان سب کا درجہ یکساں ہے۔

قول باری ہے: فتحریر رقبۃ مومنۃ، ایک مومن گردن آزاد کرنا ہے امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، زفر، حسن بن زیاد، اوزاعی اور امام شافعی کا قول ہے قتل کے کفارہ میں ایک غلام بچے کو آزاد کرنا بھی درست ہے جبکہ اس کے والدین میں سے ایک مسلمان ہو۔

عطاء کا بھی یہی قول ہے حضرت ابن عباس، حسن، شعبی، اور ابراہیم سے منقول ہے کہ صرف اسی غلام کا آزاد کرنا درست ہوگا جو نماز پڑھتا اور روزے رکھتا ہو، یعنی بالغ ہو، کفارہ ظہار میں اس کے جواز پر سب کا اتفاق ہے۔

پہلے قول کی صحت پر قول باری (فتحریر رقبہ مومنہ) دلالت کرتا ہے اس لیے کہ آزاد کیا جانے والا بچہ، رقبہ مومنہ، حضور کا ارشاد ہے، (کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ وینصرانہ، ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت یعنی فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی اور نصرانی بنا دیتے ہیں)۔

حضور نے بچے کی پیدائش کے وقت اس پر فطرت پر ہونے کا حکم ثابت کر دیا، اس لیے لفظ کے مطلق ہونے کی بنا پر اس بچے کا جواز واجب ہوگیا، اس پر قول باری (ومن قتل مومنا خطا) بھی دلالت کرتا ہے آیت میں وارد لفظ بالغ مومن کی طرح نابالغ بچے کو بھی شامل ہے اس لیے ضروری ہے کہ قول باری (فتحریر رقبۃ مومنہ) کا عموم بچے کو بھی شامل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے صوم وصلوۃ کی شرط نہیں لگائی، اس لیے اس مطلق لفظ پر اس شرط کی زیادتی جائز نہیں ہوگی، کیونکہ نص پر زیادتی اس کے نسخ کی موجب ہوتی ہے اگر کوئی غلام مسلمان ہو جاتا اور اس کا آقا اسے نماز اور روزے کے اوقات کی آمد سے پہلے اپنے کفارہ میں آزاد کر دیتا تو اس کا کفارہ ادا ہو جاتا کیونکہ اس غلام میں اسم ایمان کا وجود حاصل ہو چکا تھا، اس لیے بچے کا بھی یہی حکم ہونا چاہیے کیونکہ وہ بھی اسم ایمان کے اطلاق میں داخل ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اسلام لانے کے بعد آزاد ہونے والا غلام کفارہ کے لیے اس وقت تک جائز نہیں ہوگا، جب تک وہ نماز نہ پڑھ چکا ہو اور روزے نہ رکھ چکا ہو تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ مسلمانوں کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان ہونے والے غلام پر نماز یا روزے کے وقت کی آمد سے پہلے ایمان کے اسم کا اطلاق درست ہے۔

اس لیے معترض نے ایمان کے ساتھ نماز اور روزے کے افعال ادا کرنے کی شرط کہاں سے لگائی جبکہ اللہ تعالیٰ ان دونوں باتوں کی شرط نہیں لگائی ہے نیز معترض آیت میں اس مفہوم کا کیوں اضافہ کر رہا ہے جو آیت میں موجود نہیں ہے، اور نص جس چیز کی اباحت کر رہا ہے، معترض اس کی کیوں ممانعت کر رہا ہے جب کہ اس کے پاس اس سلسلے میں کوئی نص موجود نہیں جو اس ممانعت کا موجب بن سکتا ہو۔

معترض کے اعتراض سے نسخ قرآن کا ایجاب لازم آتا ہے ایک اور پہلو سے دیکھیے توراث نماز جنازہ اور قاتل پر دیت کے وجوب کے لحاظ سے بچے کا حکم بالغ مرد کے حکم جیسا ہے اس لیے یہ ضروری ہے کفارہ کے جواز کے لحاظ سے اس کا حکم بھی بالغ مرد کے حکم کی طرح ہو کیونکہ بچہ بھی ایسا مکمل غلام ہے جس پر ایمان کا حکم لگا ہوا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ قول باری (فتحریر رقبۃ مومنۃ،) حقیقتاً ایک ایسے بالغ ،غلام کا مقتضی ہے جو ایمان کا اعتقاد بھی رکھتا ہو ایسے غلام کا مقتضی نہیں جس پر ایمان کا حکم تو لگا ہو لیکن اسے ایمان کا کوئی اعتقاد نہ ہو، دوسری طرف اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کہ جس غلام کی یہ صفت ہو وہ آیت میں مراد ہے۔

اس لیے اس کے ساتھ آیت کے اندر اس غلام کو دخول نہیں ہوگا، جس پر اس صفت ایمان کا مجازی طور پر اطلاق ہوتا ہو، یعنی ایسا بچہ جس کا ابھی کوئی اعتقاد ہی نہ ہو، اس اعتراض کے جواب میں کہا جائے گا کہ سلف کے مابین اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قتل خطا کے کفارہ میں غیر بالغ غلام کو آزاد کر دینا جائز ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا اور روزے رکھتا ہو، ایسے غلام میں کسی نے بھی حقیقت کی صورت میں ایمان کے وجود کی شرط کا، اعتبار غلط اور ساقط ہے۔

جب سلف کے اتفاق کی بنا پر یہ بات ثابت ہوگئی تو ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ ہر اس فرد میں ایمان کے وجود کا اعتبار کرنا درست ہوگا جس سے ایمان کی علامت اور نشانی لاحق ہو جائے چاہے یہ علامت اسے جس طرح بھی لاحق ہو اس سے کوئی بحث نہیں۔ بچے کے والدین میں سے اگر ایک مسلمان ہوگا تو بچے کو یہ علامت لاحق ہو جائے گی، اس لیے کفارہ میں ایسے غلام بچے کو آزاد کرنا درست ہوگا۔

قول باری ہے (الا ان یصدقوا) الایہ کہ مقتول کے وارثین خونبہا معاف کر دیں) ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ مراد یہ ہے، واللہ اعلم، کہ مقتول کے اولیاء قاتل کو خون بہا اور دیت کی ادائیگی سے بری الذمہ قرار دے دیں، ابراء کے اس عمل کا صدقہ کا نام دیا گیا۔

اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے، جس شخص کا کسی دوسرے کے ذمہ قرض ہو اور وہ مقروض سے کہہ دے کہ میں نے قرض تجھ پر صدقہ کر دیا تو اس سے مقروض قرض کی ادائیگی سے بری الذمہ ہو جائے گا، مقروض کی طرف سے اسے قبول کرنا برات کی صحت کے لیے ضروری نہیں ہوگا۔

اسی بنا پر ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ جب تک مقروض اس پیش کش کو رد نہ کرے اس وقت تک برات کا حکم باقی رہے گا، زفر کا قول ہے کہ جب تک مقروض اسے قبول نہیں کرے گا، اس وقت تک قرض سے اس کی برات نہیں ہوگی۔

زفر کے نزدیک صدقہ کا بھی یہی حکم ہے انھوں نے اسے اعیان کے ہبہ کی حیثیت دی ہے، کہ جب تک وہ شخص ہبہ کیا جا رہا ہے اسے قبول نہ کرلے اس وقت تک کسی عین کا ہبہ درست نہیں ہوگا۔

ظاہر آیت ہمارے اصحاب کے قول کی صحت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں قبول کر لینے کی شرط نہیں ہے نیز یہ کہ دین قرض، دینے والے کا اپنا حق ہوتا ہے اس لیے اپنے حق کا اسقاط اسی طرح درست ہوتا ہے جس طرح قتل عمد میں قاتل کو معاف کر دینا اور اپنے غلام کو آزاد کر دینا درست ہوتا ہے اور اس کی صحت کے لیے دوسرے فریق کا قبول کر لینا ضروری نہیں ہوتا۔

ہمارے اصحاب کا قول کہ اگر مقروض برات کو رد کر دے گا اور اسے قبول نہ کرے گا تو اس صورت میں قرض پھر سے اس کے ذمہ عائد ہو جائے گا دوسرے حضرات کے نزدیک قرض پھر سے عائد نہیں ہوگا، انھوں نے اسے عتق اور قتل عمد معاف کر دینے کا حکم میں

رکھاہے،ان دونوں صورتوں میں آزاد کردہ غلام پر پھر سے غلامی لاحق نہیں ہوتی اور قتل عمد میں قاتل قابل گردن زدنی نہیں رہتا۔

ہمارے اصحاب کے قول کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ قرض سے برات کو فسخ لاحق ہوسکتا ہے آپ نہیں دیکھتے کہ قرض خواہ مقروض سے کسی چیز مثلاً کپڑے وغیرہ پر مصالحت کرلے تو مقروض بری الذمہ ہوجائے گا لیکن اگر مقرض کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی وہ کپڑا ضائع ہوجائے تو برات باطل ہوجائے گی اور قرض دوبارہ عائدہ ہوجائے گا۔

اس کے برعکس عتق اور خون کی معافی ایک دفعہ واقع ہوجانے کے بعد کسی حالت میں بھی فسخ نہیں ہوتے ،تملیک کے لفظ کے ساتھ بھی قرض سے برات واقع ہوجاتی ہے اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ صدقہ بھی تملیک کے الفاظ میں سے ایک لفظ ہے۔

اور آیت میں لفظ صدقہ سے برات کی صحت کا حکم لگایا گیا ہے اس کی حیثیت اعیان جیسی نہیں ہوتی ،جب ابراء کے لفظ کے ساتھ کوئی شخص کسی کو ان اعیان کا مالک بنادیتا ہے تو وہ ان کا مالک نہیں بنتا۔

مثلاً کوئی شخص کسی سے یہ کہے،میں نے تمہیں اس غلام سے بری الذمہ قرار دیا ان الفاظ کی بنا پر وہ شخص اس غلام کا مالک نہیں بنے گا،خواہ دوسرا شخص اس برات کو قبول بھی کیوں نہ کرلے لیکن اگر وہ یہ کہے تم پر میرا جو قرض ہے وہ میں نے تمہیں صدقہ کردیا، یا یوں کہے تم پر میرا جو قرض ہے وہ میں نے تمہیں ہبہ کردیا۔ تو ان فقروں کے ذریعے برات درست ہوجائے گی۔اس پر یہ بات بھی دلالت کرتی ہے کہ جس شخص کسی دوسرے کے ذمہ قرض ہو اور وہ مالدار ہو پھر وہ مقروض سے کہے میں نے تم پر اپنا قرضہ صدقہ کردیا، تو مقروض اس قرض سے بری الذمہ ہوجائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں غنی اور فقیر کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا ہے۔

زیر بحث آیت کے سلسلے میں یہ دلالت بھی حاصل ہوتی ہے کہ اولیاء اور ورثاء کو خون بہا ادا کرے۔اس کے معنی ہیں خون بہا اس کے ورثاء کو ادا کیا جائے۔

محمد بن الحسن کا قول ہے، کہ ایک شخص اگر کسی کے اہل کے لیے وصیت کرتا ہے تو قیاس کا تقاضا ہے کہ اس سے مراد اس کی بیویاں ہوں لیکن میں نے قیاس کو ترک کرکے اس وصیت ان تمام افراد کے حق میں قرار دیا ہے جو اس شخص کے عیال میں داخل ہوں۔

ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ اہل کے اسم کا اطلاق بیوی پر نیز ان تمام لوگوں پر ہوتا ہے جو شخص کے گھر میں اس کے ساتھ رہتے ہوں، اسی طرح ایک شخص کے پیروکاروں اور اس کے رہنے والے لوگوں پر بھی اہل کا اسم محمول ہوتا ہے۔

ارشاد باری ہے (انا منجوك واهلك الا امر تك، ہم تمہیں اور تمہارے کو بچانے والے مگر تمہاری بیوی) یہاں لفظ اہل کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوا جو لوط (علیہ السلام) کے اہل منزل تھے یعنی آپ کی اولاد اور ان کے علاوہ وہ تمام افراد جو آپ کے ساتھ گھر میں سکونت پذیر تھے۔

نیز ارشاد ہے، (فانجیناہ واهله اجمعین، ہم نے انھیں اور ان کے اہل کو سب کو بچالیا) اسی طرح لفظ اہل کا اطلاق ان لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو دین کے اندر کسی کے پیروکار ہوں جیسا کہ قول باری (ونوحا اذ نادی من قبل فاستجبنا له ونجیناہ من الكرب العظیم) اور نوح کو جب انھوں نے اس سے پہلے پکارا تھا ہم نے ان کی پکار کا جواب دیا اور ایک بڑے کرب سے انھیں رہائی دلائی) اللہ تعالیٰ نے دین کے اندر حضرت نوح (علیہ السلام) کے متبعین کو ان کے اہل کے نام سے موسوم کیا۔

حضرت نوح کے بیٹے کے متعلق فرمایا، انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح، وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے اس کا عمل غیر صالح ہے) اس لیے اسم اہل مختلف معانی پر محمول ہوتا ہے۔

کبھی اہل کا اطلاق کر کے اس سے آل مراد لیا جاتا ہے اور اہل وہ ہوتے ہیں جو اس کے باپ کی طرف سے اس کے رشتہ دار ہوتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے، آل نبی، اہل بیت نبی ﷺ ان دونوں کے معنی ایک ہیں۔

قتل شبہ عمد

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایک اصول یہ ہے ہر وہ قتل جو کسی ہتھیار یا ہتھیار جیسی چیز کے ذریعے ہو مثلا بانس کی چھال یا پتھر کی دھار یا کسی دھار دار چیز کے ذریعے جو ہتھیار کی طرح کام کرتی ہو۔ یا آگ میں جلانے کے ذریعے قتل کی یہ تمام صورتیں خالص قتل عمد ہیں ان میں قصاص واجب ہوگا، اس بارے میں فقہاء کے درمیان کسی اختلاف کا ہمیں علم نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ان چیزوں کے ماسوا لاٹھی اور پتھر کی ضرب سے کسی کو قتل کر دینا خواہ پتھر چھوٹا ہو یا بڑا وہ شبہ عمد کہلاتا ہے اسی طرح پانی میں ڈبو کر مار دینا بھی شبہ عمد ہے اس میں عاقلہ پر دیت مغلظہ ہے اور قاتل پر کفارہ ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک دیت کو مغلظہ بنانا صرف اونٹوں کی عمروں کے لحاظ سے ہوگا ان کی تعداد کے لحاظ سے نہیں۔ نیز جان لینے سے کم درجے کا نقصان شبہ عمد نہیں ہوگا، بلکہ جس چیز سے بھی اس نے ضرب لگا کر نقصان پہنچایا ہوگا، اس پر اس کا قصاص واجب ہوگا بشرطیکہ قصاص لینا ممکن ہو۔

اگر قصاص لینا ممکن نہیں ہوگا، تو اس پر دیت مغلظہ واجب ہوگی، اگر دیت اونٹوں کی شکل میں ہوگی تو جتنے اونٹ واجب ہوں گے انھیں قسطوں میں ادا کرے گا۔

امام ابو یوسف اور امام محمد کا اصول یہ ہے کہ شبہ عمد قتل کی وہ صورت ہے جس کی وجہ سے عام طور پر قتل کا وقوعہ نہیں ہوگا، مثلا ایک طمانچہ مارنا یا کوڑے کی ایک ضرب لگانا وغیرہ، اگر قاتل اس فعل کی تکرار کرتا ہے اور اس کا مجموعہ کسی کو قتل کرنے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہوگا تو ایسی صورت میں یہ قتل عمد ہوگا اور تلوار کے ذریعے اس کا قصاص لیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی کو پانی میں اس طرح ڈبوئے رکھا کہ مرنے والے کو اس سے نکالنا ناممکن ہوگا تو یہ بھی قتل عمد شمار ہوگا، عثمان البتی کا بھی یہی قول ہے البتہ انھوں نے شبہ عمد کی دیت قاتل کے مال میں واجب کی ہے۔

ابن شبرمہ کا قول ہے جو قتل شبہ عمد کی صورت میں ہوگا، اس کی دیت کا وجوب قاتل کے مال میں ہوگا، دیت کی ابتداء اس کے مال سے کی جائے گی، اور دیت کی مقدار مکمل کرنے کے لیے اس کا سارا مال بھی لیا جا سکے گا، اگر اس کا سارا مال کفایت نہیں کرے گا، تو دیت کا باقی ماندہ حصہ اس کے عاقلہ پر لازم آئے گا۔

ابن وہب نے امام مالک سے روایت کی ہے جب کوئی شخص کسی کو لاٹھی مارے یا اس پر پتھر پھینکے یا عمداً ضرب لگائے اگر ان صورتوں کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو جائے گی تو یہ قتل عمد ہوگا اور اس پر قصاص واجب ہوگا۔

قتل عمد کی یہ بھی صورت ہے کہ دو شخصوں کے درمیان گرما گرمی ہو جائے اور ایک کی طرف سے دوسرے کو ضرب لگائی

جائے، ضرب لگانے والا جب اس جگہ سے واپس ہو تو اس وقت مضروب زندہ ہو لیکن اس کے بعد مر جائے اس میں قسامہ واجب ہو گا۔

ابن القاسم نے امام مالک سے روایت کی ہے قتل شبہ عمد باطل ہے، قتل کی صرف دو قسمیں عمد اور خطا، شعبی نے سفیان ثوری سے روایت کی ہے کہ شبہ عمد کی صورت یہ ہے کہ کوئی کسی کو لاٹھی یا پتھر یا اپنے ہاتھ سے ضرب لگائے اور مضروب مر جائے تو اس میں دیت مغلظہ لازم آئے گی، قصاص لازم نہیں آئے گا۔

قتل عمد وہ قتل ہے جس کا ارتکاب کسی ہتھیار کے ذریعے کیا جائے اس میں قصاص واجب ہو گا، انسانی جان لینے کی صورتیں قتل عمد، قتل شبہ عمد اور قتل خطا کی شکل میں ہو سکتی ہیں۔ زخم میں یا تو عمد ہوتا ہے یا خطا۔

فضل بن دکین نے سفیان ثوری سے نقل کیا ہے اگر کسی شخص نے لکڑی یا ہڈی کی دھار دار نوک بنا کر کسی آزاد آدمی کے پیٹ میں چبھو دی اور اسے زخمی کر دیا تو یہ شبہ عمد کی صورت ہو گی اس میں قصاص نہیں ہو گا۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ سفیان ثوری سے منقول ہے یہ قول شاذ ہے اور اہل علم کا قول اس کے خلاف ہے اوزاعی کا قول ہے کہ شبہ عمد میں دیت ہے، جو مجرم کے مال سے ادا کی جائے گی، اور اگر اس کے مال سے دیت کی مقدار پوری نہیں ہو گی تو عاقلہ پر اس کی ادائیگی لازم آئے گی۔ شبہ عمد کی صورت یہ ہے کہ کوئی کسی کو لاٹھی یا کوڑے کی ایک ضرب لگائے اور مضروب مر جائے اگر اس نے دوبارہ ضرب لگائی اور مضروب اسی جگہ مر گیا تو یہ قتل عمد ہو گا، اور اس کے قصاص میں قاتل کو قتل کر دیا جائے گا قتل خطا میں دیت عاقلہ پر لازم آئے گی۔

حسن بن صالح کا قول ہے اگر کسی نے کسی کو لاٹھی سے ایک ضرب لگائی اور پھر لاٹھی بلند کر کے دوسری ضرب لگائی اسی جگہ اسے قتل کر دیا تو اس پر قصاص لازم آئے گا، اگر اس نے دوسری ضرب لگائی لیکن مضروب کی فوری موت واقع نہیں ہوئی بلکہ بعد میں اس کی موت واقع ہو گئی تو یہ شبہ عمد ہو گا، اس میں قصاص لازم نہیں آئے گا، بلکہ عاقلہ پر دیت لازم آئے گی۔ قتل خطا میں بھی عاقلہ پر دیت لازم آئے گی۔

لیث بن سعد کا قول ہے قتل عمد وہ قتل ہے جس کا ارتکاب عمداً کیا جائے، اگر کسی نے کسی کو اپنی انگلی سے ضرب لگائی اور اس کی موت واقع ہو گئی تو قاتل کو مقتول کے ولی کے حوالے کر دیا جائے گا، قتل خطا میں عاقلہ پر دیت لازم ہو گی۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ اس قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیث کے نزدیک قتل شبہ عمد کی کوئی صورت نہیں ہے قتل یا تو خطا ہو گا یا عمداً، مزنی نے اپنی کتاب المختصر میں امام شافعی سے نقل کیا ہے اگر کوئی شخص کسی پر تلوار یا پتھر یا نیزے کی نوک یا جسم کو پھاڑ ڈالنے والی کوئی دھاری دار چیز سے ضرب لگائے یا اس کی جلد یا گوشت کو نشانہ بنائے اور اس طرح اسے زخمی کر دے خواہ زخم چھوٹا ہو یا بڑا اور اس سے اس کی موت واقع ہو جائے تو قاتل پر قصاص لازم آئے گا۔

اگر اس نے پتھر سے سر کچل دیا یا مسلسل اس کا گلا دباتا رہا یا مسلسل کوڑے برساتا رہا یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو گئی یا اسے کسی چیز کے اندر بند کر کے اوپر سے ڈھکنا لگا دیا اور کھانے پینے کو کچھ نہ دیا اسے سخت گرمی یا سردی میں اسی شکل میں کوڑے لگاتا رہا جس سے اغلبا موت واقع ہو جاتی ہے اور اس طرح مضروب مر گیا تو قاتل پر قصاص لازم آئے گا۔

اگر اس نے مقتول کو کسی ستون یعنی خیمے کے بانس، یا پتھر سے مارا ہو جس سے اس کا سر نہ کچلا گیا ہو یا تلوار کی دھار سے ضرب لگائی ہو لیکن مقتول زخمی نہ ہوا ہو یا اسے کنارے سے قریب ہی دریا میں یا سمندر میں پھینک دیا ہو اور اسے اچھی طرح تیرنا آتا ہو یا کوئی ایسی حرکت کی ہو جو اغلبا جان لیوا نہیں ہوتی ان صورتوں میں اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو قاتل پر قصاص لازم نہیں آئے گا، البتہ

عاقلہ پر دیت مغلظہ لازم آئے گی۔

قتل شبہ عمد کی ثبوت کی دلیل وہ روایت ہے جسے ہشیم نے خالد الحذاء سے انھوں نے قاسم بن ربیعہ بن جوشن سے انھوں نے عقبہ بن اوس السدی سے، انھوں نے حضور کے ایک صحابی سے روایت کی ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے دن خطبہ دیا اور اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا۔

(الاان قتیل خطا العمد باخوط والعصا والحجر فیه الدیة مغلظة مائته من الابل منها اربعون خلفة فی بطونها اولادها. لو گوسن لو، خطا عمد شبه عمد کا مقتول جسے کوڑا یا لاٹھی، یا پتھر مار کر قتل کر دیا گیا ہو، اس کی دیت مغلظہ ہو گی، یعنی سو اونٹ جن میں سے چالیس حاملہ اونٹنیاں ہوں گی۔

ابراہیم نے عبید بن فضلہ خزاعی سے، انھوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کی ہے ایک عورت نے دوسری عورت کو خیمے کے بانس کے ساتھ ضرب لگائی جس سے اس کی موت واقع ہوگئی حضور نے قاتلہ کے عصبہ پر دیت کی ادائیگی اور مقتولہ کے جنین کے بدلے ایک غلام یعنی لونڈی دینے کا فیصلہ سنایا۔

یونس بن شہاب زہری سے انھوں نے سعید بن المسیب اور ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں ایک نے دوسری کو ایک پتھر دے مارا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی ساتھ ہی اس کا جنین بھی ہلاک ہوگیا، لوگ یہ معاملہ حضور کی خدمت میں لے کر آئے آپ نے فیصلہ دیا کہ مقتولہ کے جنین کی دیت ایک غلام یا باندی، ہے اور مقتولہ کی دیت قاتلہ کے عاقلہ پر لازم کر دی۔

درج بالا روایتوں میں سے ایک کے مطابق خیمے کے بانس سے ضرب لگائی گئی تھی اور دوسری روایت کے مطابق پتھر مارا گیا تھا ابوعاصم نے ابن جریج سے انھوں نے عمرو بن دینار سے انھوں نے طاؤس سے، انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے حضرت عمر نے لوگوں سے قسم دے کر جنین کی دیت کے متعلق حضور کے فیصلے کے بارے میں پوچھا۔

حمل بن مالک بن نابغہ نے عرض کیا کہ میں اپنی دو بیویوں کے درمیان تھا، ایک نے دوسری کو بیلن یا خیمے کے بانس سے ضرب لگائی اور اس کی موت واقع ہوگئی ساتھ ہی اس کا جنین بھی ہلاک ہوگیا حضور نے فیصلہ دیا کہ جنین کی دیت میں ایک غلام یا لونڈی دی جائے گی، اور قاتلہ کو قتل کر دیا جائے گا۔

حجاج نے محمد بن ابن جریج سے انھوں نے عمرو بن دینار سے انھوں نے طاؤس سے، انھوں نے حضرت ابن عباس سے، انھوں نے حضرت عمر سے اسی طرح کی روایت کی ہے ابوعاصم اور حجاج نے ابن جریج سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں آپ نے اس عورت کو قتل کر دینے کا حکم دیا۔

اس حدیث کو ہشام بن سلیمان المخزومی نے ابن جریج سے روایت کی ہے انھوں نے ابن دینار اور سفیان بن عیینہ سے انھوں نے عمرو بن دینار سے ان کی سند کے ساتھ روایت کی ہے اس میں ابن دینار اور سفیان بن عیینہ نے یہ ذکر نہیں کیا کہ حضور نے اس عورت کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔

جبکہ ابوعاصم اور حجاج نے یہ ذکر کیا کہ آپ نے اس عورت کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا، اس طرح اس واقعہ کے سلسلہ میں حضرت

ابن عباس کی حدیث مضطرب ہوگئی ہے، سعید نے قتادہ سے انھوں نے ابوالملیح سے انھوں نے حمل بن مالک سے رایت کی ہے ان کی دو بیویاں تھیں، ایک نے دوسری کو ایک پتھر دے مارا، وہ پتھر اس کے دل پر لگا، وہ حاملہ تھی، اس کا حمل گر گیا اور وہ مرگئی۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک جب یہ معاملہ پہنچا تو آپ نے فیصلہ دیا کہ قاتلہ کے عاقلہ پر دیت واجب ہے اور جنین کی دیت میں ایک غلام یا لونڈی دی جائے، قاتلہ پر قصاص کے ایجاب کے سلسلے میں حمل بن مالک کی روایت میں اختلاف ہے اور تضاد ہے، حضرت ابن عباس سے بعینہ اسی واقعہ کے سلسلہ میں بعض میں قصاص کا ذکر ہے اور بعض میں نہیں ہے۔

حمل بن مالک جن کی ذات سے اس واقعہ کا تعلق ہے ان کا قول ہے کہ حضور نے قاتلہ کے عاقلہ پر دیت واجب کر دی تھی، اس طرح حمل بن مالک کے واقعہ میں روایات کے اندر تضاد پیدا ہوگیا جس کی بنا پر یہ روایات ساقط ہوگئیں۔

اور نفی قصاص کے بارے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت ابو ہریرہ کی روایتیں باقی رہ گئیں جن کی کوئی روایت معارض نہیں ہے ابومعاویہ نے حجاج سے، انھوں نے قتادہ سے انھوں نے حسن سے روایت کی ہے کہ حضور نے فرمایا

(قتل السوط والعصا شبہ العمد، کوڑے اور لاٹھی سے قتل کیا جانے والا مقتول شبہ عمد ہے)۔

شبہ عمد کو قتل کی ایک ایسی قسم قرار دینا جو قتل خطا کے علاوہ ہے اس پر ہمارے نزدیک سلف کا اتفاق ہے اس بارے میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں، ان کے درمیان صرف شبہ عمد کی کیفیت کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔

امام مالک کا یہ کہنا کہ میں قتل خطا اور قتل عمد کے سوا اور کسی قسم کے قتل کو نہیں جانتا، تو ان کا یہ قول جملہ سلف کے اقوال کے دائرے سے خارج ہے شریک نے ابواسحاق سے انھوں نے عاصم بن ضمرہ سے اور انھوں نے حضرت علی سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا، شبہ عمد لاٹھی اور بھاری پتھر کے ذریعے وقوع پذیر ہوتا ہے ان دونوں صورتوں میں قصاص نہیں ہے۔

حضرت عمر سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص قصداً اپنے بھائی کا (گوشت کو کھا جانے والی چیز) یعنی لاٹھی جیسی کسی چیز سے ضرب لگاتا ہے اور پھر کہتا ہے مجھ پر کوئی قصاص نہیں میرے پاس کوئی شخص جس نے یہ حرکت کی ہو جب لایا جائے گا تو میں اس سے قصاص لے لوں گا، لاٹھی سے ضرب لگا کر ہلاک کر دینا حضرت عمر کے نزدیک قتل عمد تھا کیونکہ اس جیسی ضرب سے انسان عموماً ہلاک ہو جاتا ہے جیسا کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے۔

شبہ عمد پر صحابہ کرام کے اجماع کو جو چیز واضح کرتی ہے نیز یہ بتاتی ہے کہ یہ قتل کی تیسری قسم ہے نہ محض عمد ہے اور نہ محض خطا وہ قتل خطا کی دیت میں اونٹوں کی عمروں کے متعلق بھی یہ حضرات مختلف الرائے ہیں نیز یہ کہ شبہ عمد کی دیت قتل خطا کی دیت کے مقابلہ میں زیادہ ثقیل ہے۔

ان حضرات میں حضرت علی، حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عثمان، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسی اشعری، اور حضرت مغیرہ بن شعبہ شامل ہیں۔

ان تمام حضرات نے شبہ عمد کی دیت میں دیے جانے والے اونٹوں کو قتل خطا کی دیت میں دیے جانے والے اونٹوں کی بہ نسبت میں دیے جانے والے اونٹوں کو قتل خطا کی دیت میں دیے جانے والے اونٹوں کی بہ نسبت زیادہ عمروں والے اونٹ ثابت کیا ہے جیسا کہ ہم اسے انشاء اللہ بعد میں بیان کریں گے، اس کی بنا پر شبہ عمد کا ثبوت مل گیا۔

جب ہم نے مذکورہ بالا روایات اور اتفاق سلف کے ذریعہ شبہ عمد کا ثبوت مہیا کر دیا، اگرچہ اس کی کیفیت میں ان حضرات کا

اختلاف ہے تو اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس کا اعتبار بھی کریں۔

ہم نے حضرت علی کو یہ فرماتے ہوئے پایا ہے کہ شبہ عمد لاٹھی اور بڑے پتھر کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتا ہے یہ بات سب کے علم میں ہے شبہ عمد ایک شرعی اسم ہے اور توقیف کے سوا اس کے اثبات کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، کیونکہ لغت میں قتل کی کسی نوعیت پر اس اسم کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضرت علی نے توقیف یعنی شریعت کی طرف سے رہنمائی اور آگاہی کے ذریعے ہی بڑے پتھر سے قتل کو شبہ عمد کا نام دیا ہے نیز آپ نے حجر عظیم یعنی بڑے پتھر کا اس لیے ذکر کیا ہے کہ آپ کے نزدیک قصاص کے سقوط میں بڑا اور چھوٹا پتھر دونوں یکساں ہیں۔

اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے ہمیں عبدالباقی بن قانع نے بیان کی ہے انھیں العمری نے، انھیں عبدالرحمن بن عبداللہ عراقی نے، انھیں ابن المبارک نے سلیمان تیمی اور خالد الحذا ء نے، انھوں نے قاسم بن ربیعہ سے، انھوں نے عقبہ بن اوس سے، انھوں نے عبداللہ بن عمر سے اور انھوں نے حضور سے کہ آپ نے فرمایا۔

(قتیل خطا العمد، قتیل السوط، والعصا فیہ مائۃ من الابل منھا اربعون خلفۃ فی بطونھا، خطاء عمد کا مقتول وہ ہے جو کوڑے اور لاٹھی سے قتل کیا گیا ہو اس کی دیت ایک سو اونٹ ہیں جن میں سے چالیس حاملہ اونٹنیاں ہوں) اس روایت میں کئی معانی ہیں۔

ایک تو یہ کہ آپ نے خطاء عمد کے قتل، قتل عمد اور قتل خطا کے علاوہ کوئی اور قسم قرار دیا اور یہ قسم شبہ عمد ہے۔

دوسری یہ کہ کوڑے اور لاٹھی سے قتل کیے جانے والے کی دیت، واجب کر دی اور یہ فرق نہیں رکھا کہ اس جیسی لاٹھی یا اس جیسے کوڑے کسی کا قتل ہوسکتا ہے یا نہیں ہوسکتا، نیز یہ فرق بھی نہیں کیا کہ مقتول کو پے درپے ضرب لگا کر قتل کیا گیا ہے یا ایک ہی ضرب سے اس کا کام تمام کر دیا گیا ہے۔

تیسری یہ کہ آپ نے کوڑے اور لاٹھی کا ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے حالانکہ کوڑے کی مار سے اکثر حالات میں موت واقع نہیں ہوتی جبکہ لاٹھی کی ضرب سے ہو جاتی ہے، یہ بات اس پر، دلالت کرتی ہے کہ دیت کے ایجاب میں ان دونوں کے حکم کا یکساں ہونا واجب ہے۔

ہمیں عبدالباقی بن قانع نے روایت بیان کی، انھیں محمد بن عثمان بن ابی شیبہ نے، انھیں عقبہ بن مکرم نے، انھیں یونس بن بکیر نے، انھیں قیس بن الربیع نے ابوحصین سے، انھوں نے ابراہیم بن النعمان بن بشیر سے انھوں نے حضرت نعمان بن بشیر سے اور انھوں نے حضور سے کہ آپ نے فرمایا (کل شی سوی الحدید خطا ولکل خطا ارش، دھار والے آلے کے سوا کسی بھی چیز سے کیا جانے والا قتل قتل خطا ہے اور ہر قتل خطا میں دیت ہے)۔

ہمیں عبدالباقی بن قانع نے روایت بیان کی، انھیں محمد بن یحییٰ بن سہل بن محمد العسکری نے، انھیں محمد بن المثنی نے، انھیں یوسف بن یعقوب ضبعی نے، انھیں سفیان ثوری اور شعبہ نے جابر جعفی سے، انھوں نے ابوعازب سے، انھوں نے نعمان بن بشیر سے کہ حضور نے فرمایا، (کل شی خطا الا السیف، تلوار کے ساتھ کسی بھی چیز سے کیا جانے والا قتل قتل خطا ہے) نیز فرمایا (وفی کل خطا ارش، اور ہر قتل

خطامیں دیت ہے)۔

ایک اور پہلو سے اس پر غور کیا جائے، سب کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کسی نے کسی کو چھوٹی چھری سے زخمی کر دیا تو قصاص کے وجوب کے لحاظ سے اس چھوٹی چھری اور بڑے چھرے کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا، اس لیے ضروری ہے کہ قصاص کے سقوط کے لحاظ سے چھوٹے اور بڑے پتھر اور لکڑی کے حکم میں کوئی فرق نہ ہو۔

یہ چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ قصاص کے ایجاب کے سلسلے میں حکم کا تعلق آلہ قتل کے ساتھ ہوتا ہے اور آلہ قتل ہتھیار ہوتا ہے یا وہ چیز ہوتی ہے جو ہتھیار کی طرح کام کرتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے حضور کے ارشاد (قتیل خطاء العمد) کی گزشتہ سطوریں روایت کی ہے اس سے یہ لازم آتا ہے قتل عمد، قتل خطا، نہ ہو، اور قتل خطا قتل عمد نہ ہو یہ چیز اس حدیث کے فساد پر دلالت کرتی ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا، کہ بات ایسی نہیں ہے حضور نے اس قسم کو خطاء العمد کا نام دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم میں قتل خطا ہے لیکن فعل کے لحاظ سے یہ قتل عمد ہے اور یہ ایک درست معنی ہے کیونکہ یہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ عمد ہونے کی بنا پر دیت مغلظہ واجب ہوگی اور قتل خطا کے حکم میں ہونے کی بنا پر قصاص کا حکم ساقط ہو جائے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ قول باری (کتب علیکم القصاص فی القتلی، مقتولین کے سلسلے میں تم پر قصاص فرض کر دیا گیا ہے، نیز (النفس بالنفس جان کے بدلے جان) اور ایجاب قصاص پر مشتمل دوسری تمام آیتیں بڑے پتھر کے ذریعے قتل کرنے والے مجرم سے قصاص لینے کے حکم کو واجب کرتی ہیں۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیات قتل عمد میں قصاص کو واجب کرتی ہیں اور اعتراض میں مذکور صورت قتل عمد نہیں ہے تاہم اس کے باوجود یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ آیات کا بنیادی طور پر قصاص کے ایجاب کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اور ہماری مذکورہ روایات کا ورود قتل کی ان صورتوں کے بارے میں ہوا ہے جن میں قصاص واجب ہوتا ہے اس لیے آیات واحادیث اپنے اپنے مورد کے لحاظ سے الگ الگ دائروں میں قابل عمل ہیں اور ایک کے ذریعے دوسرے پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

نیز قول باری (ومن قتل مومنا خطا فتحریر رقبہ مومنہ، ودیۃ مسلمۃ الی اھلہ، اور حضور نے شبہ عمد کو خطا عمد کے مقتول کے نام سے موسوم کیا جب آپ نے اس پر خطا کے لفظ کا اطلاق کر دیا تو ضروری ہوگیا کہ اس میں بھی دیت ہو۔

اگر اختلاف رائے رکھنے والے حضرات حضرت ابن عباس کی اس روایت سے استدلال کریں جس میں کہا گیا ہے کہ دو عورتیں لڑ پڑیں، ایک نے دوسری کو خیمے کے ستون سے ضرب لگائی اور اس کی موت واقع ہوگئی، حضور نے قاتلہ پر قصاص واجب کر دیا تھا تو اس استدلال کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں اس حدیث کے الفاظ میں اضطراب کو واضح کر دیا تھا نیز یہ بھی بیان کر دیا تھا کہ قصاص کی بجائے دیت کے ایجاب کے سلسلے میں حمل بن مالک کی روایت اس کے معارض ہے۔

اگر اس روایت سے قصاص ثابت ہو بھی جائے تو اس کا تعلق صرف ایک خاص واقعہ کے ساتھ ہوگا، اور اس کے حکم کا ڈنڈے کے ذریعے واقع ہونے والے ہر قتل کے لیے عموم نہیں ہوگا، اس روایت میں یہ بھی گنجائش ہے کہ خیمے کے ڈنڈے میں لوہے کی کوئی پتری لگی ہو اور مقتولہ کو لکڑی کی بجائے یہی پتری لگی ہو جس کی بنا پر حضور نے قصاص واجب کر دیا ہو۔

اگر ان حضرات کا استدلال اس روایت سے ہو جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک یہودی نے ایک لونڈی کا سر ایک پتھر سے

کچل دیا تھا،حضور نے اس یہودی کا سر بھی پتھر سے کچلنے کا حکم دیا تھا، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا یہ ممکن ہے کہ پتھر سخت قسم کا ہو جسے مروہ کہتے ہیں اس کی دھار چاقو کی طرح اثر کرتی ہے اسی بنا پر حضور نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔

نیز عبدالرزاق نے روایت کی ہے انھیں معمر نے ایوب سے یہ روایت بیان کی ہے انھوں نے ابوقلابہ سے اور انھوں نے حضرت انس سے کہ ایک یہودی نے انصار کی ایک لونڈی سے زیور ہتھیانے کے لیے اسے قتل کر کے نہر میں پھینک دیا تھا اور اس کا سر بھی پتھر سے کچل دیا تھا، یہودی پکڑا گیا حضور نے حکم دیا کہ اسے سنگسار کر دیا جائے، چنانچہ اسے سنگسار کر کے ہلاک کر دیا گیا۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قصاص کے طور پر کسی کو رجم نہیں کیا جاتا، نیز اس میں یہ بھی امکان ہے کہ یہودی امن لے کر اس علاقے میں آیا ہو اور پھر لونڈی کو قتل کر کے اپنے علاقے میں بھاگ گیا ہو پھر وہ بطور حربی پکڑا گیا ہو کیونکہ یہودیوں کے علاقے مدینہ منورہ سے قریب تھے۔

اسے حرب ہونے کی بنا پر پتھروں سے مار کر قتل کر دیا گیا ہو جس طرح بنو عرنہ کے ان لوگوں کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دی گئی تھیں جو چرواہے کو قتل کرنے کے بعد مسلمانوں کے اونٹ بھگا کر لے گئے تھے ان کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ ڈالے گئے تھے اور تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے انھیں چھوڑ دیا گیا تھا، پھر مثلہ کر کے قتل کرنے کا حکم منسوخ ہو گیا تھا۔

فصل:

اگر جان لینے سے کم تر جرم کیا جائے تو اس میں آلہ جرم کی جہت سے شبہ عمد نہیں ہوتا۔ اگر کسی نے کسی کو پتھر یا دھار دار چیز سے زخمی کر دیا تو اس پر قصاص واجب ہوتا ہے اور اگر قصاص لی ناممکن نہ ہو تو دیت کے مغلظ ہونے کی جہت سے ایسا جرم شبہ عمد ہوتا ہے۔

جان لینے سے کم تر جرم میں شبہ عمد کا اس لیے ثبوت نہیں ہے کہ قول باری ہے، والجرح قصاص، اور زخموں میں قصاص ہے، نیز فرمایا، السن بالسن، دانت کے بدلے دانت، اس میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا کہ آیا یہ زخم کسی دھار دار چیز سے پہنچایا گیا یا اس کے سوا کسی اور چیز سے۔

دوسری طرف حدیث کا ورود قتل کے سلسلے میں صرف خطا عمد شبہ عمد کے اثبات میں ہوا ہے خطا عمد ایک شرعی اسم ہے اس کا اثبات توقیف یعنی شریعت کی طرف سے رہنمائی ہدایت کے سوا کسی اور ذریعے سے جائز نہیں ہوتا، اور جان لینے سے کم تر جرم کے سلسلے میں شریعت کی طرف سے شبہ عمد کی کوئی ہدایت وارد نہیں ہوئی، فقہاء نے اس نوعیت کے جرم میں دیت مغلظہ کا اثبات کیا ہے، بشرطیکہ قصاص ممکن نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جرم کی حیثیت بھی شبہ عمد جیسی ہے اس لیے کہ ارتکاب جرم میں قصداً اور ارادہ کو دخل ہوتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے چہرے کو ہمیشہ شاداب رکھے) سے مروی ہے آپ نے قتادہ مدلجی پر جب کہ اس نے بیٹے کو تلوار پھینک ماری تھی، اور اس طرح اسے قتل کر دیا تھا، سو اونٹوں کی دیت مغلظہ کے لزوم کا فیصلہ دیا تھا، یہ ایسا عمد تھا جس میں قصاص ساقط ہو گیا تھا اسی طرح جان لینے سے کم تر جرم میں جب کہ وہ عمداً ہو اور قصاص ساقط ہو گیا ہو، اس میں متاثر ہونے والے عضو کی دیت کے حصے کا ایجاب پوری دیت مغلظہ میں سے ہو گا۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں ان زخموں میں قصاص کے ایجاب کے متعلق فقہاء کے درمیان کسی اختلاف کا علم نہیں جن میں قصاص ممکن ہو خواہ زخم جس سے چاہے لگایا گیا ہو۔ ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ ہم نے اس باب میں قتل خطا اور قتل شبہ عمد کا ذکر کیا ہے جبکہ قتل عمد کا

ذکر ہم سورۃ بقرہ میں کر آئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اونٹوں میں دیت کی مقدار:

دیت کی مقدار کے متعلق حضور سے تواتر کے ساتھ روایات منقول ہیں۔ اور یہ سو اونٹ ہیں، سہل بن ابی حثمہ کی حدیث اس سلسلے کی ایک روایت ہے جو خیبر کے مقام پر پائے جانے والے مقتول کے بارے میں ہے۔ حضور نے اس کی دیت سو اونٹ مقرر کی تھی۔

سفیان بن عیینہ نے علی بن زید بن جدعان سے روایت کی ہے انھوں نے قاسم بن ربیعہ سے اور انھوں نے حضرت ابن عمر سے کہ حضور نے مکہ مکرمہ میں ہمیں خطبہ دیا تھا آپ نے فرمایا تھا، (الا ان قتیل خطا العمد بالسوط والعصا فیہ الدیۃ مغلظہ مائۃ من الابل اربعون خلفۃ فی بطونھا اولادھا) حضرت عمر بن حزم کو حضور نے جو مکتوب تحریر فرمایا تھا، اس میں درج تھا، جان کے اندر سو اونٹ ہیں۔

عمرو بن دینار نے طاؤس سے روایت کی ہے کہ حضور نے قتل خطا میں سو اونٹوں کی دیت مقرر کی تھی، علی بن موسیٰ القمی نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں یعقوب بن شیبہ نے روایت بیان کی، انھیں قیس بن حفص نے، انھیں فضل بن سلیمان نمیر نے، انھیں غالب بن ربیعہ بن قیس نمری نے، انھیں قرہ بن عموص نمیری نے کہ میں اور میرے چچا حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے میں نے عرض کیا۔

حضور! اس شخص (میرے چچا) پر میرے باپ کی دیت واجب ہے آپ اسے یہ دیت مجھے دے دینے کا حکم دیں، آپ نے یہ سن کر میرے چچا سے فرمایا، اسے اس کے باپ کی دیت دے دو، میرے چچا نے میرے والد کو زمانہ جاہلیت میں قتل کر دیا تھا، میں نے آپ سے پھر عرض کیا، حضور اس دیت میں میری ماں کا بھی کوئی حق ہے، آپ نے اثبات میں اس کا جواب دیا، اس کی دیت میں سو انٹ دیے گئے تھے۔

یہ روایت کئی احکام پر مشتمل ہے، ایک یہ کہ ایک دیت میں مسلمان اور کافروں دونوں یکساں ہیں، کیونکہ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ قتل زمانہ جاہلیت میں وقوع پذیر ہوا تھا، دوسرا یہ کہ عورت کو اپنے شوہر کی دیت میں وراثت کا حق ہے۔ تیسرا حکم یہ ہے کہ دیت سو اونٹوں کی ہوتی ہے اس بارے میں سلف اور فقہاء امصار کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔ واللہ اعلم

قتل خطا کی دیت میں اونٹوں کی عمریں:

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ اس بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف رائے ہے علقمہ اور اسود نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے کہ قتل خطا کی دیت میں سو اونٹوں کی پانچ ٹکڑیاں کی جائیں گی جس کی تفصیل یہ ہے۔

بیس حقے (اونٹنی کا بچہ جو چوتھے سال میں ہو یہ سواری کے قابل ہوتا ہے) بیس جذعے (اونٹنی کا بچہ جو پانچویں سال میں ہو) بیس بنت مخاض (اونٹنی کا مادہ بچہ جو دوسرے سال میں ہو) بیس ابن مخاض (نر بچہ جو دوسرے سال میں ہو) اور بیس بنت لبون (مادہ بچہ جو تیسرے سال میں ہو) حضرت عمر سے بھی پانچ ٹکڑیوں کے متعلق اسی طرح کی روایت ہے۔

عاصم بن ضمرہ اور ابراہیم نے حضرت علی سے روایت کی ہے قتل خطا کی دیت میں دیے جانے والے سو اونٹوں کی چار ٹکڑیاں ہوں گی جس کی تفصیل یہ ہے پچیس حقے، پچیس جذعے، پچیس بنت مخاض اور پچیس بنت لبون، جس طرح زکوۃ میں ادا کیے جانے والے

اونٹوں کی عمروں کے حساب سے چار قسمیں ہیں اسی طرح دیت میں ادا کیے جانے والے اونٹوں کی یہی چار قسمیں ہیں۔

حضرت عثمان، اور حضرت زید بن ثابت کا قول ہے کہ قتل خطا میں تیس بنت لبون، تیس جزعے بیس ابن لبون اور بیس بنت مخاض ہیں، ان دونوں حضرات سے جذعہ کی جگہ حقہ بھی مروی ہے۔ ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ فقہاء امصار یعنی ہمارے اصحاب، امام مالک، اور امام شافعی اس پر اتفاق ہے کہ قتل خطا کی دیت میں دیے جانے والے اونٹوں کی پانچ صنفیں ہوں گی البتہ ہر صنف کی عمروں کے متعلق اختلاف رائے ہے۔

ہمارے تمام اصحاب کا قول ہے کہ بیس بنت مخاض، بیس ابن مخاض، بیس بنت لبون بیس حقہ اور بیس جذعہ، امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے کہ بیس بنت مخاض، بیس بنت لبون اور بیس حقہ اور بیس جذعہ۔

ہمیں عبدالباقی بن قانع نے روایت بیان کی، انھیں احمد بن داؤد بن توبہ التمار نے انھیں عمرو بن محمد الناقد نے، انھیں ابو معاویہ نے، انھیں حجاج بن ارطاۃ، نے زید بن جبیر سے انھوں نے خشف بن مالک سے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قتل خطا کی دیت پانچ ٹکڑیاں بنائی تھیں۔

اس خبر پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں فقہاء کا اتفاق اس کی صحت پر دال ہے تاہم اس میں عمروں کی کیفیت بیان نہیں ہوئی، ہمیں منصور نے ابراہیم سے، انھوں نے حضرت ابن مسعود سے قتل خطا کی دیت کے پانچوں اصناف بیان کرتے ہوئے ان کی عمروں کا بھی ذکر کیا جو ہمارے اصحاب کے قول سے مطابقت رکھتی ہیں۔

یہ چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابن مسعود نے حضور سے دیت کے اونٹوں کے جن پانچ اصناف کا ذکر کیا ہے ان کی عمریں یہی تھیں، کیونکہ اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت ابن مسعود حضور سے ایک چیز کی روایت کریں اور پھر خود اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی اور چیز پر عمل پیرا ہو جائیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس روایت میں ایک راوی خشف بن مالک مجہول ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس راوی کی روایت پر فقہاء کا عم پیرا ہونا اور دیت کے سو اونٹوں کی پانچ صنفیں مقرر کرنا اس کی سلامت روی اور روایت کے عمل میں اس کی استقامت پر دال ہے نیز قتل خطا کی دیت میں جن لوگوں یعنی ہمارے اصحاب نے تیسرے سال والے نر اور مادہ بچوں بنو لبون کی جگہ دوسرے سال والے نر اور مادہ بچے بنو مخاض کا قول کیا ہے انکا قول اولی ہے کیونکہ ابن لبون کی حیثیت بنت مخاض کی طرح ہے، اس لیے حضور کا ارشاد ہے، فان لم توجد ابنۃ مخاض فابن لبون، اگر بنت مخاض میسر نہ ہو تو اس کی جگہ ابن لبون جو امام شافعی اور مام مالک کا مسلک ہے اس کی حیثیت یہ ہوگی گویا انھوں نے چالیس بنت مخاض واجب کر دیے ہیں اور یہ بات درست نہیں ہے۔

نیز بنو لبون، بنو مخاض سے بڑھ کر ہوتے ہیں، اس لیے بنو مخاض کی جگہ بنو لبون جو کہ بنات مخاض سے بھی بڑھ کر ہوتے ہیں ان کا ثبات صرف توقیف یعنی نقلی دلیل کے ذریعے ہو سکتا ہے، نیز حضور کے ارشاد (الدیۃ مائۃ من الابل) کا تقاضا ہے کہ جس تعداد پر اسم ابل کا اطلاق ہوتا ہے وہی جائز ہے اس لیے دلالت کے بغیر اضافے کا اثبات نہیں ہو سکتا۔

ہمارے اصحاب کا مسلک اس بارے میں بیان کردہ اقوال سے کم از کم قول کے مطابق ہے اس لیے وہ ثابت ہو گیا اور چونکہ اس سے زائد پر دلالت موجود نہیں ہے اس لیے وہ ثابت نہیں ہوگا، نیز عمروں کی کیفیت کے متعلق حضرت ابن مسعود سے ہمارے

اصحاب کے قول کی موافقت میں روایت منقول ہے اور جو صحابہ کرام پانچ صنفوں کے قائل ہیں ان میں سے کسی سے بھی اس روایت کے خلاف کوئی روایت منقول نہیں ہے۔

جبکہ امام شافعی اور امام مالک کے قول کی موافقت میں کسی صحابی سے کوئی روایت نہیں ہے اس کی روایت صرف سلیمان بن یسار سے ہے اس لیے ہمارے اصحاب کا قول اولی ہوگا، کیونکہ تمام فقہاء امصار کا ان پانچ صنفوں کے اثبات پر اتفاق ہے اور ان پانچ صفتوں کے متعلق ہمارے اصحاب کا جو مسلک ہے اس کی کیفیت حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت کی رو سے ثابت ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ تیسرے سال والے نر اور مادہ بچوں بنو لبون کا ایجاب دوسرے سال والے نر اور مادہ بچوں بنو مخاض کی نسبت اولی ہے، اس لیے کہ زکوۃ بنو لبون لیے جاتے ہیں اور بنو مخاض نہیں لیے جاتے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا زکوۃ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا آپ نہیں دیکھتے ہمارے مخالف کے نزدیک قتل شبہ عمد کی دیت میں چالیس حاملہ اونٹنیاں واجب ہوتی جبکہ زکوۃ میں ایسی اونٹنیاں واجب نہیں ہوتیں۔

شبہ عمد کی دیت میں اونٹوں کی عمریں

حضرت عبداللہ بن مسعود سے قتل شبہ عمد کی دیت کے متعلق روایت ہے کہ سو اونٹوں کی چار صنفیں ہوں گی جس کی تفصیل یہ ہے کہ پچیس بنت مخاض، پچیس بنت لبون، پچیس حقے اور پچیس جذعے، جس طرح زکوۃ میں اونٹوں کی عمروں کی کیفیت ہے یہاں بھی اسی طرح ہے۔

حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابوموسی، اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے شبہ عمد میں تیس حقے، تیس جذعے، اور چالیس گابھن اونٹنیاں جو پانچ سال سے لے کر سات سال تک کی ہوں، حضرت عثمان اور حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے کہ تیس بنت لبون، تیس حقے اور چالیس حاملہ اونٹنیاں جو پانچویں سال میں ہوں

ابو اسحاق نے عاصم بن ضمرہ سے اور انھوں نے حضرت علی سے شبہ عمد کی دیت کے متعلق روایت کی ہے کہ تینتیس حصے، تینتیس جذعے اور چونتیس گابھن، اونٹنیاں جو عام طور پر پانچ سال ہیں

شکاری جانوروں کے بارے میں حکم

یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَیْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۴

(سورۃ المآئدہ: آیت 4)

’’آپ سے دریافت کرتے ہیں ان کے لیے کیا کچھ حلال ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ تمام پاک چیزیں تمہارے لیے حلال کی گئیں ہیں (۱) اور جن شکار کھیلنے والے جانوروں کو تم نے سدھا رکھا ہے، یعنی جنہیں تم تھوڑا بہت وہ سکھاتے ہو جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے تمہیں دے رکھی ہے (۲) پس جس شکار کو وہ تمہارے لیے پکڑ کر روک رکھیں تو تم اس سے کھالو اور اس پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیا کرو (۳) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے‘‘۔

قول باری ہے **وما علمتم من الجوار**۔
اور جن شکاری جانوروں کو تم نے سدھایا ہو)

ہمیں عبدالباقی بن قانع نے روایت بیان کی، انھیں یعقوب بن غیلان عمانی نے، انھیں ہناد بن السری نے، انھیں یحییٰ بن زکریا، انھیں ابراہیم بن عبید نے انھیں ابان بن صالح نے قعقاع بن حکیم سے انھوں نے سلمی سے انھوں نے حضرت ابورافع (رض) سے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے کتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا تھا۔لوگوں نے عرض کیا کہ آپ نے کتوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا ہے ان میں سے کس قسم کے رکھنا ہمارے لیے حلال ہے؟

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ارشاد ہوا:

قل احل لکم الطیبات وما علمتم من الجوارح۔

ہمیں عبدالباقی نے روایت بیان کی انھیں عبداللہ بن احمد بن حنبل اور ابن عبدوس بن کامل نے ان دونوں کو عبیداللہ بن عمر الحشمی نے انھیں ابومعشر النواء نے انھیں عمرو بن بشیر نے، انھیں عامر شعبی نے حضرت عدی بن حاتم (رض) سے کہ جب میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کتوں کے ذریعے شکار کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے جواب دینے میں توقف کیا حتیٰ کہ آیت **وما علمتم من الجوارح مکلبین** نازل ہوئی۔ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ ظاہر حدیث اول اس بات کا مقتضی ہے کہ اباحت ان تمام شکاری جانوروں کو شامل تھی جنہیں ہم نے سدھایا ہو۔یہ شکاری کتوں اور شکاری پرندوں سب کو شامل ہے۔یہ چیز ان جانوروں اور پرندوں سے ہر قسم کے انتفاع کی موجب ہے اس میں کتوں کی خرید وفروخت نیز شکاری جانوروں کی خرید وفروخت اور ان سے ہر قسم کے انفاع کے جواز کی دلالت موجود ہے سوائے اس انتفاع کے جس کی تخصیص کسی دلیل نے کردی ہے۔یعنی ان کے گوشت کا استعمال۔بعض اہل علم نے سلسلہ کلام میں حذف کا قول کیا ہے اور اس کا مفہوم یوں بیان کیا ہے۔" **قل احل لکم الطیبات من صید ما علمتم من الجوارح**، (کہہ دو تمہارے لیے ان شکاری جانوروں کے پاکیزہ شکار کو حلال کردیا گیا ہے جنہیں تم نے شکار کی تعلیم دی ہے)۔انھوں نے اس مفہوم کے لیے حضرت عدی بن حاتم (رض) کی روایت سے جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں اور جس کے مطابق انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کتے کے کئے ہوئے شکار کے بارے میں دریافت کیا تھا اور اس پر آیت **وما علمتم من الجوارح مکلبین** نازل ہوئی تھی استدلال کیا ہے۔انھوں نے حضرت ابورافع کی روایت سے بھی استدلال کیا ہے جس کے مطابق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تو آپ سے پوچھا گیا کہ کس قسم کے کتے رکھنا حلال ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت

نازل فرمائی اس میں کوئی امتناع نہیں کہ آیت کتوں اور کتوں کے کئے ہوئے شکار دونوں سے فائدہ اٹھانے کے مفہوم پر مشتمل ہو۔ تاہم لفظ اپنے حقیقی معنی کے لحاظ سے خود کتوں سے انتفاع کا مقتضی ہے۔ اس لیے کہ قول باری **وما علمتم** ان جانوروں کی اباحت کا موجب ہے جنہیں ہم نے شکار کی تعلیم دی ہے اس کلام میں شکار کے لفظ کی محذوف ماننے کے لیے دلالت کی ضرورت ہے۔ اور آیت کے مضمون میں ان کے کئے ہوئے شکار کی اباحت کی دلیل موجود ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے **فکلوا مما امسکن علیکم**، وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو) آیت کو دو معنوں پر محمول کرنا اور اسے دو فائدوں کے لیے عمل میں لانا اسے صرف ایک معنی اور فائدے تک محدود کر دینے سے بہتر ہے۔ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ شکاری جانوروں کے شکار کی اباحت کے لیے ان جانوروں کا شکار کے سلسلے میں سدھایا ہوا ہونا شرط ہے کیونکہ قول باری ہے **وما علمتم من الجوارح**) نیز فرمایا (**تعلمونھن مما علمکم اللہ**) جن کو خدا کے دیئے ہوئے علم کی بنا پر تم شکار کی تعلیم دیا کرتے ہو)۔ جوارح یعنی شکاری جانوروں کے متعلق ایک قول ہے کہ یہ وہ جانور ہیں جو اپنے مالکوں کے لیے شکار حاصل کرتے ہیں یہ کتے اور چیر پھاڑ کرنے والے پرندے ہیں جو دوسرے پرندوں کا شکار کرتے ہیں جوارح کی واحد جارح ہے اسی سے ہاتھ کو جارحہ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس کے ذریعے کمائی کی جاتی ہے۔ ارشاد باری ہے ماجرحتم بالنھار) یعنی جو تم کماتے ہو اسی سے یہ قول باری ہے **ام حسب الذین اجترحوا السیئات**، کیا ان لوگوں نے جو گناہوں کی کمائی کرتے ہیں یہ گمان کیا ہے۔ یہ چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر اس جانور کے ذریعے شکار کرنا جائز ہے جسے شکار کی تعلیم دی گئی ہو اس میں کچلی کے دانت والے تمام جانور اور جنگلوں والے تمام پرندے داخل ہیں۔ جوارح کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ جانور اور پرندے ہیں جو کچلی کے دانت اور چنگل کے ذریعے زخمی کر دیتے ہیں امام محمد نے زیادات میں کہا ہے کہ اگر کتا شکار سے ٹکرا جائے اور اسے زخمی نہ کرے اور شکار اس ٹکر کی وجہ سے مر جائے تو اس کا گوشت نہیں کھایا جائے گا کیونکہ وہ شکار کچلی کے دانت یا چنگل کے ذریعے زخمی نہیں ہوا تھا۔ آپ قول باری **وما علمتم من الجوارح مکلبین**) کو نہیں دیکھتے یہ آیت اس جانور کے شکار کو حلال قرار دیتی ہے جو کچلی کے دانت یا چنگل کے ذریعے شکار کو زخمی کر دیتا ہے جب اسم کا اطلاق ان دونوں چیزوں پر ہوتا ہے تو لفظ سے یہ دونوں چیزیں مراد لینے میں کوئی امتناع نہیں ہے۔ تو اس سے وہ جانور مراد ہوں گے جو شکار کرنے کے ذریعے اپنے مالکوں کے لیے کمائی کرتے ہیں۔ اس میں شکاری جانوروں کے تمام اصناف کتے، چیتے، چیر پھاڑ کرنے والے پرندے اور دیگر جانور شامل ہو جائیں گے جو شکار کی تعلیم قبول کر لیتے ہیں اس سے یہ بھی حاصل ہوگا کہ ذکاۃ کی شرط یہ ہے کہ ہلاک شدہ شکار کو زخم لگے ہوں اور زخمی ہونا ہی اس کے شرعی ذبح یعنی ذکاۃ کی شرط ہے۔ یہ اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ بے پروں والے تیر کے بارے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حدیث میں زخم مراد ہے آپ نے فرمایا تھا "اگر معراض یعنی بے پر کا تیر اپنی دھار سے جسم میں پیوست ہو جائے تو اس کا گوشت کھالو اور اگر عرضاً لگے تو نہ کھاؤ"۔ ہمیں جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی ایسا حکم ملے جو اس بات کے ہم معنی ہو جس کا وجود قرآن میں ہو تو اس صورت میں قرآن کی مراد کو اس حکم پر محمول کرنا واجب ہوگا اور یہ سمجھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی ہے۔

قول باری ہے مکلبین، تم نے سدھایا ہو) اس کی تفسیر میں دو قول ہیں۔ اول یہ کہ مکلب کتے کا مالک ہے جو اسے شکار کی تعلیم دیتا ہے اور اسے اس کے طریقے سکھاتا ہے دوم یہ کہ اس کے معنی ہیں "مضرین علی الصید" یعنی شکار پر بھڑکاتے ہو جس طرح کتے بھڑکائے جاتے ہیں"۔ تکلیب کے معنی تضریہ یعنی بھڑکانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے "کلب کلب" یعنی کتے کو لوگوں پر بھڑکایا گیا۔ قول باری

مکلبین میں کتوں کی تخصیص نہیں ہے۔ دوسرے شکاری جانور بھی اس میں داخل ہیں۔ اس لیے کہ تضریہ یعنی بھڑکانے کا عمل ان سب کے لیے عام ہے اس طرح اگر اس قول باری سے کتے کی تعلیم وتادیب مراد لی جائے تو یہ معنی بھی تمام شکاری جانوروں کے لیے عام ہوگا۔

شکرے اور باز کے شکار پر آرائے ائمہ:

جس شکار کو کتوں کے علاوہ دوسرے شکاری جانور قتل کر دیں اس کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ مروان العمری نے نافع سے انھوں نے علی بن حسین (رض) سے روایت کی ہے کہ شکرا یعنی چرغ اور باز ان شکاری جانوروں میں سے ہیں جنہیں سدھایا جاتا ہے۔ معمر نے لیث سے روایت کی ہے کہ مجاہد سے باز اور چیتے اور شکاری درندوں کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ سب جوارح یعنی شکاری جانور ہیں۔ ابن جریج نے مجاہد سے قول باری من الجوارح مکلبین کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد پرندے اور کتے ہیں، معمر نے طاؤس کے بیٹے سے اور انھوں نے اپنے والد سے اس آیت کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے کہ جوارح سے مراد کتے ہیں نیز سدھائے ہوئے باز اور چیتے بھی مراد ہیں۔ اشعث نے حسن سے اس سلسلے میں نقل کیا ہے کہ جوارح سے شکرا اور باز مراد ہیں اور چیتا بمنزلہ کتے کے ہے۔ صخر بن جویریہ نے نافع سے روایت کی ہے ان کا کہنا ہے کہ میں نے حضرت علی (رض) کی ایک تحریر میں پڑھا ہے کہ باز کا مارا ہوا شکار کھانا درست نہیں ہے ابن جریج نے نافع سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ کا قول ہے کہ باز وغیرہ شکاری پرندے جو شکار پکڑیں اگر تم اسے ذبح کرلو تو اس کا گوشت کھاسکتے ہو اگر ذبح نہ کر پاؤ تو اسے نہ کھاؤ، سلمہ بن علقمہ نے نافع سے روایت کی ہے کہ حضرت علی (رض) شکرے کے مارے ہوئے شکار کو مکروہ سمجھتے تھے وہ یہ کہتے کہ قول باری مکلبین سے صرف کتے مراد ہیں۔ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ درج بالا اقوال کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سلف میں سے بعض نے مکلبین کی تاویل وتفسیر صرف کتے کی ہے بعض نے کتے وغیرہ مراد لیے ہیں۔ یہ بات تو واضح ہے کہ قول باری وما علمتم من الجوارح) کتوں اور شکاری پرندوں دونوں کو شامل ہے۔ پھر اس کے بعد قول باری مکلبین میں احتمال ہے کہ اس سے کتے مراد لیے جائیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے وہ تمام شکاری جانور مراد لیے جائیں جن کا پہلے ذکر گزر چکا ہے ان میں شکاری کتے بھی شامل ہیں اس صورت میں مکلبین کے معنی "مودبین" یا "مضرین" (ادب سکھانے والے، بھڑکانے والے) ہوں گے۔ پھر اس میں کتوں کی تخصیص باقی نہیں رہے گی دوسرے شکاری جانور بھی شریک ہوں گے۔ اس وضاحت کی روشنی میں ہم یہ کہیں گے کہ آیت کو عموم پر محمول کرنا واجب ہے اور احتمال کی بنا پر اس کی تخصیص درست نہیں ہے ہمیں فقہاء امصار کے درمیان شکاری پرندے کے پکڑے ہوئے شکار کی اباحت کے متعلق کسی اختلاف کا علم نہیں ہے خواہ اس شکاری پرندے نے شکار کو ہلاک ہی کیوں نہ کر دیا ہو۔ پرندے کا کیا ہوا شکار کتے کے کئے ہوئے شکار کی طرح ہے۔ ہمارے اصحاب امام مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، لیث اور امام شافعی کا قول ہے کہ چنگل والے سدھائے ہوئے شکاری پرندوں اور کچلیوں والے سدھائے ہوئے درندوں کا کیا ہوا شکار درست ہے۔ ظاہر آیت بھی اس قول کی تائید میں ہے اس لیے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے شکاری جانوروں یعنی جوارح کے کئے ہوئے شکار کی اباحت کر دی ہے۔ یہ ان تمام جانوروں پر مشتمل ہے جو اپنی کچلیوں یا اپنے چنگلوں کے ذریعے شکار کو زخمی کر دیتے ہوں اور اپنے مالکوں کے لیے شکار کرنے کے ذریعے کمائی کرتے ہوں آیت کے اندر اس سلسلے میں کتے اور دوسرے جانور کے درمیان فرق نہیں کیا گیا ہے۔ قول باری وما علمتم من الجوارح) اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان جانوروں کے پکڑے ہوئے شکار کی اباحت کی یہ شرط ہے کہ یہ جانور

سدھائے ہوئے ہوں۔اگر یہ سدھائے ہوئے نہیں ہوں گے اور شکار کو پکڑ کر ہلاک کر دیں گے تو وہ مذکی یعنی شرعی ذبیحہ نہیں ہوگا۔اس لیے کہ آیت میں خطاب باری کا انداز بیان یہ ہے کہ شکار کی حلت کے متعلق سائلین کے سوال کے جواب میں اس کا ورود ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کے کیئے ہوئے شکار کی مطلقاً اباحت کر دی اور یہ انداز بیان ان تمام صورتوں کو شامل ہے جو اس اباحت کے تحت آتی ہیں اور اطلاق جن پر مشتمل ہے اس لیے کہ سوال شکار کی تمام حلال صورتوں کے متعلق کیا گیا تھا۔اللہ تعالیٰ نے آیت میں شکاری جانوروں کے بیان کردہ اوصاف کے ذریعے جواب کی تخصیص کر دی۔اس لیے اب شکار کی صرف اسی صورت کو مباح سمجھا جائے گا جو آیت میں مذکورہ وصف پر مشتمل ہوگی۔پھر ارشاد ہوا تعلموھن مما علمکم اللہ حضرت سلیمان (رض) اور حضرت سعد (رض) سے مروی ہے کہ اس تعلیم سے شکاری جانوروں کو شکار کے لیے بھڑکانا اور انھیں اس کا خوگر بنانا مراد ہے۔شکاری جانور کو اپنے مالک سے اس قدر ہل جانے کا عادی بنا دیا جائے کہ شکار پر چھوڑے جانے کے بعد وہ اس کی طرف واپس لوٹ جائے اور اس سے چھوٹ کر بھاگ نہ جائے۔حضرت ابن عمر (رض) اور سعید ابن المسیب کا بھی یہی قول ہے انھوں نے یہ شرط نہیں لگائی ہے کہ شکاری جانور شکار کو پکڑے کے بعد اس میں سے کچھ نہ کھائے لیکن ان کے علاوہ دوسرے حضرات سے مروی ہے کہ ترک اکل یعنی کچھ نہ کھانا بھی کتے کے سدھانے میں داخل ہے اور پکڑے ہوئے شکار کی اباحت کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ کتا اس شکار میں سے کچھ نہ کھائے اگر کتے نے کھالیا تو وہ شکار حرام ہو جائے گا اور اس کا گوشت ناقابل استعمال ہو جائے گا۔حضرت ابن عباس (رض) حضرت عدی بن حاتم (رض) اور حضرت ابوہریرہ (رض) کا یہی قول ہے ان سب حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ باز کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے خواہ باز اس میں سے کچھ کھا بھی لے۔باز کی تعلیم صرف یہی ہے کہ جب تم اسے آواز دو تو تمہاری آواز سن کر فوراً تمہارے پاس آجائے۔

اس بارے میں فقہاء کے مابین اختلاف آراء کا ذکر:

امام ابوحنیفہ امام ابویوسف امام محمد اور زفر کا قول ہے کہ اگر کتا اپنے پکڑے ہوئے شکار میں سے کھالے تو اسے غیر معلم سمجھا جائے گا اور اس کا شکار درست نہیں ہوگا البتہ باز کے پکڑے ہوئے شکار کو کھالیا جائے گا خواہ اس نے اس میں سے کچھ کھالیا ہی کیوں نہ ہو۔سفیان ثوری کا بھی یہی قول ہے۔امام مالک، اوزاعی اور لیث کا قول ہے کہ خواہ کتا شکار میں سے کچھ کھا بھی لے شکار کے گوشت کا استعمال درست ہوگا۔امام شافعی کا قول ہے کہ اگر کتا کھالے تو شکار کا گوشت قابل استعمال نہیں ہوگا۔نیز قیاس کے لحاظ سے باز کا بھی یہی حکم ہے۔ابوبکر جصاص کہتے ہیں سلف میں سے جن حضرات نے چیر پھاڑ کرنے والے شکاری پرندوں کے پکڑے ہوئے شکار کو جائز قرار دیا ہے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ ان شکاری پرندوں کا پکڑا ہوا شکار حلال ہے اس کا گوشت قابل استعمال ہے خواہ شکاری پرندے نے اس میں سے کچھ کھا کیوں نہ لیا ہو۔ان میں حضرت سعد، حضرت ابن عباس حضرت سلمان، حضرت ابن عمر حضرت ابوہریرہ (رض) اور سعید بن المسیب شامل ہیں۔البتہ ان حضرات کے درمیان کتے کے شکار کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔حضرت علی (رض)، حضرت ابن عباس (رض) حضرت عدی بن حاتم (رض) اور حضرت ابوہریرہ (رض) سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ اگر شکاری کتا اپنے شکار میں سے کچھ کھالے تو اس کا شکار نہیں کھا جائے گا۔حضرت سلمان حضرت سعد اور حضرت ابن عمر (رض) کا قول ہے کہ یہ شکار کھایا جائے گا خواہ کتے نے صرف اس کا ایک تہائی کیوں نہ چھوڑا ہو حسن عبید بن عمیر، عطار، سلیمان بن یسار، اور ابن شہاب زہری

کا یہی قول ہے ۔حضرت ابو ہریرہ (رض) سے بھی ایک روایت یہی ہے ۔ابو بکر جصاص ان اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کتے کے مزاج اور اس کی حالت سے یہ بات واضح ہے کہ اگر اسے پکڑے ہوئے شکار کو نہ کھانے کی تربیت دی جائے تو وہ اس تربیت کو قبول کر لیتا ہے اس لیے اسے شکار نہ کھانے کی تعلیم اور تربیت دینا ممکن ہے اور اس کا شکار کے گوشت میں سے کچھ نہ کھانا اس کی تعلیم کی علامت ہے اور اس کے معلم یعنی سدھائے ہوئے ہونے کی دلیل ہے ۔اس لیے اس کے پکڑے ہوئے شکار کی ذکاۃ کی صحت کے لیے اس میں سے کچھ نہ کھانا شرط قرار دیا جائے گا اور اگر اس نے کچھ کھالیا تو یہ اس شکار کی ذکاۃ کی صحت کے لیے مانع بن جائے گا۔ جہاں تک باز کا تعلق ہے تو اس کے متعلق یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اسے ترک کل کی تعلیم نہیں دی جا سکتی کیونکہ اس کی تعلیم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے ۔ اور یہ بات درست نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ اسے ایسی بات سکھانے کا مکلف بنادے جسے وہ سیکھ نہیں سکتا اور جس کی تربیت کو وہ قبول نہیں کرسکتا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ترک اکل باز اور شکاری پرندوں کی تعلیم کا جز نہیں ہے بلکہ یہ کتے کی تعلیم اور اس کی تربیت کا جز ہے کیونکہ وہ اسے قبول کرتا ہے اور اسے اس کی تربیت دینا ممکن بھی ہے ۔حضرت علی (رض) اور دوسرے حضرات سے اس بارے میں جو بات مروی ہے کہ باز کا ہلاک شدہ شکار نا قابل استعمال ہے وہ شاید اس لحاظ سے ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ترک اکل تعلیم کی شرط ہے لیکن یہ بات پرندوں میں ممکن نہیں ہے اس لیے پرندے نہ تو سدھائے جاسکتے ہیں اور نہ ہی ان کا ہلاک کردہ شکار پاک ہوسکتا ہے ۔ البتہ ان حضرات کی یہ بات اس پر منتج ہوتی ہے کہ شکاری پرندوں کے متعلق تعلیم کے ذکر کا کوئی فائدہ نہیں ہے ۔کیونکہ ان کا پکڑا ہوا شکار پاک اور حلال ہو نہیں سکتا اور اس لحاظ سے سدھایا ہوا اور نہ سدھایا ہوا پرندہ دونوں کی ایک حیثیت ہوتی ہے ۔آیت کی رو سے یہ بات درست نہیں ہوسکتی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام شکاری جانوروں کے لیے حکم کی تعمیم کردی ہے اور انھیں سدھانے کی شرط لگا دی ہے اس لحاظ سے اس نے کتے اور پرندے میں کوئی فرق نہیں رکھا ہے ۔اس لیے ان جانوروں کے متعلق عموم لفظ کا استعمال واجب ہے اس لیے شکاری پرندوں میں سے بھی سدھائے ہوئے ہوں گے اور کتوں سے بھی اگرچہ پرندوں اور کتوں کی تعلیم اور شکار کے لیے ان کی تربیت کے طریقے مختلف ہوں گے کتوں اور ان جیسے دوسرے شکاری جانوروں کی تعلیم کے اندر یہ بات داخل ہوگی کہ وہ شکار کا کوئی حصہ خود نہ کھائیں ۔اسی طرح شکاری پرندوں کی تعلیم کے اندر یہ بات داخل ہوگی کہ جب مالک آواز دے تو فوراً آجائے ۔اس سے وہ مانوس ہو اور اس سے بدک کر نہ بھاگے اس طرح آیت میں جن شکاری جانوروں کا اجمالاً ذکر ہے تعلیم ان سب کو عام ہوگی ۔ کتے اور اس جیسے شکاری جانوروں کے پکڑے ہوئے شکار کی ذکاۃ کی صحت کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ شکار میں سے کچھ نہ کھائیں ۔اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ ارشاد باری ہے فکلوا مما امسکن علیکم جس شکار کو وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں ان میں سے کھالو) کتا اگر کسی شکار کو پکڑ رکھے گا تو یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا یہ شکار اس نے اپنے واسطے پکڑا ہے یا اپنے مالک کے واسطے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ اس سے کچھ کھاتا ہے یا نہیں ۔اگر پہلی صورت ہوگی تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس نے یہ شکار اپنے لیے پکڑا تھا دوسری صورت اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس نے اسے مالک کے لیے پکڑا تھا گویا ان دونوں صورتوں میں ترک اکل ہی فرق کا باعث ہے ۔اگر ترک اکل کی شرط نہ ہوتی تو درج بالا آیت کا فائدہ زائل ہوجاتا۔ اب چونکہ ترک اکل اس بات کی علامت ہے کہ اس نے یہ شکار اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھنے کی شرط صرف کتوں اور ان جیسے شکاری جانوروں کے اندر ہے لیکن شکاری پرندوں کے لیے شکار کو اپنے مالک کی خاطر روک رکھنے کی شرط نہیں ہے جیسا کہ ہم اس کی وجہ بحث کے آغاز میں بیان کر آئے ہیں ۔ کتے کے متعلق یہ حکم کہ مالک کے لیے اس کے شکار پکڑنے کی علامت یہ ہے کہ وہ اس

میں سے کچھ نہ کھائے اور جب کھالے تو وہ اپنے لیے شکار پکڑنے والا سمجھا جائے گا۔اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو حضرت ابن عباس (رض) سے مروی ہے کہ جب کتا اس میں سے کھالے تو تم نہ کھاؤ لیکن اس صورت میں اس نے اپنے لیے یہ شکار پکڑا تھا“۔حضرت ابن عباس (رض) نے یہ بتادیا کہ کتے کے شکار کو منہ نہ لگانا اس بات کی علامت ہے کہ اس نے یہ شکار مالک کے لیے پکڑا تھا جب امساک کا اسم اس صورت کو شامل ہے جس کا حضرت ابن عباس (رض) نے ذکر کیا ہے اور اگر اسے شامل نہ ہوتا تو آپ آیت کی تاویل میں یہ بات نہ کہتے تو اب آیت کو اسی معنی پر اس طرح محمول کرنا واجب ہے کہ گویا امساک کا لفظ اب اسی مفہوم کے لیے اسم بن گیا ہے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے اس لیے دو وجوہ سے اس کی حجیت ثابت ہوگئی ایک تو یہ کہ یہ آیت کے معنی اور اس کی مراد کا بیان ہے اور دوسری یہ کہ سنت کی رو سے اس کی تحریم منصوص ہوگئی۔ہمیں عبدالباقی بن قانع نے روایت بیان کی انہیں بشر بن موسیٰ نے انھیں الحمیدی نے انھیں سفیان نے انھیں مجالد نے شعبی سے انھوں نے حضرت عدی بن حاتم (رض) سے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سدھائے ہوئے کتے کے پکڑے ہوئے شکار کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا اذا ارسلت کلبک المعروذ کرت اسم اللہ فکل مما امسک علیک فان اکل منہ فلا تاکل فانما امسک علی نفسہ جب تم اپنا سدھایا ہو ا کتا شکار پر چھوڑ و اور چھوڑتے وقت اللہ کا نام لے لو تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھے اسے کھالو اور جس میں سے وہ بھی کھالے اسے نہ کھاؤ کیونکہ اس صورت میں اس نے یہ شکار اپنے لیے پکڑا تھا) ہمیں محمد بن بکر نے روایت بیان کی انھیں ابو دوٗد نے انھیں محمد بن کثیر نے انھیں شبہ نے عبداللہ بن ابی السفہ نے شعبی سے کہ عدی بن حاتم (رض) نے فرمایا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معراض بے پروں والے تیر کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا اگر شکار کو اس کی دھار لگ جائے تو کھالو اور عرضاً اسے لگے تو نہ کھاؤ اس لیے کہ یہ دقیذ یعنی چوٹ کھا کر مرنے والا جانور ہوگا)۔

میں نے عرض کیا کہ میں اپنا سدھایا ہوا کتا شکار پر چھوڑتا ہوں اس کے بعد میں اس کے ساتھ ایک اور کتا بھی دیکھتا ہوں اس پر آپ نے فرمایا فلا تاکل لاک انما سمیتع علی کلبک پھر نہ کھاؤ کیونکہ تم نے تو صرف اپنا کتا چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھی تھی) اس حدیث سے قول باری فکلوا مما امسکن علیکم میں اللہ کی مراد ثابت ہوگئی اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نصاً اس شکار کے گوشت کی نہی کردی جس میں سے کتے نے بھی کھالیا ہو۔اگر یہ کہا جائے کہ حبیب المعلم نے عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے عمرو کے دادا حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابو ثعلبہ (رض) الخشنی سے فرمایا تھا کتا تمہارے لیے جو شکار پکڑ رکھے اسے کھالو) ابو ثعلبہ (رض) نے پوچھا ”خواہ کتا اس شکار کا کچھ حصہ کھا جائے“ آپ نے جواب دیا وان اکل منہ، خواہ کتا اس میں سے کچھ کھا جائے)۔اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ابو ثعلبہ (رض) کی روایت میں یہ فقرہ غلط ہے وہ اس لیے کہ ابو ثعلبہ سے اس حدیث کی ابو ادریس خولانی اور ابو اسماء وغیرہ ہما نے بھی روایت کی ہے اور ان دونوں نے اس روایت میں یہ فقرہ بیان نہیں کیا ہے علاوہ ازیں اگر حضرت ابو ثعلبہ (رض) سے یہ روایت درست بھی ہوجائے پھر بھی حضرت عدی بن حاتم (رض) کی روایت دو وجہ سے اولیٰ ہوگی۔اول یہ کہ حضرت عدی (رض) کی روایت ظاہر آیت فکلوا مما امسکن علیکم۔سے مطابقت رکھتی ہے۔دوم یہ کہ ابو ثعلبہ (رض) کی روایت میں اس شکار کے کھانے کی ممانعت نہیں ہے جس میں سے شکار کرنے والے کتے نے بھی کچھ کھالیا ہو۔اور یہ اصول ہے کہ جب دو روایتیں ایسی وارد ہوں کہ ایک میں ایک چیز کی ممانعت ہو اور دوسری کے اندر اس کی اباحت تو ممانعت والی

روایت عمل کے لحاظ سے اولیٰ ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ قول باری فکلوا مما امسکن علیکم کا مفہوم یہ ہے کہ شکاری کتا شکار کو ہلاک کرنے کے بعد مالک کے لیے اسے روکے رکھے بعینہ مالک کے لیے اس کے امساک یعنی پکڑے رکھنے کا مفہوم بھی یہی ہے اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ بات غلط ہے کیونکہ ہلاکت کے بعد شکار تو محبوس ہوگیا اب اس کے بعد کتے کے مالک کے لیے اسے روکے رکھنے کے کوئی معنی نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ کتے کا شکار کو قتل کر دینا ہی مالک کے لیے روکے رکھنا ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ بے معنی بات ہے کیونکہ اس مفہوم کی بنا پر آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ "تم وہ شکار کھالو جسے شکاری جانوروں نے تمہارے لیے ہلاک کر دیا ہو"۔ یہ مفہوم آیت کے فائدے کو ساقط کر دیتا ہے اس لیے کہ شکاری جانوروں کے ذریعے ہلاک ہونے والے شکار کی بحث تو اس سے قبل کی آیت (وما علمتم من الجوارح) کے ضمن میں موجود ہے۔ اس آیت میں ان شکاری جانوروں کا کیا ہوا شکار مراد ہے جنہیں ہم نے اس مقصد کے لیے سدھایا ہو۔ یہ آیت اس شخص کے سوال کے جواب میں وارد ہوئی تھی جس نے مباح شکار کے متعلق پوچھا تھا۔ علاوہ ازیں امساک یعنی پکڑے رکھنا ہلاکت کے مفہوم سے عبارت نہیں ہے اس لیے کہ شکاری کبھی شکار کو ہمارے لیے زندہ حالت میں بھی روکے رکھتا ہے اور اسے ہلاک نہیں کرتا اس لیے امساک کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ شکار کو مالک کے آجانے تک پکڑے رکھے۔ مالک کے لیے شکار کو پکڑے رکھنے کی صورت یا تو یہ ہوگی کہ وہ شکار کو ہلاک کئے بغیر روکے رکھے یا ہلاک کرنے کے بعد روکے رکھے گا یا اسے ہلاک کرنے کے بعد اس کا کوئی حصہ نہیں کھائے گا۔

یہ بات تو واضح ہے کہ آیت میں امساک سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شکار کو ہلاک کئے بغیر زندہ حالت میں روکے رکھے کیونکہ سب کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت میں یہ مفہوم مراد نہیں ہے۔ رہ گئی یہ صورت کہ وہ شکار کو زندہ حالت میں روکے رکھے اور اس طرح روکے رکھنا شکار کی اباحت کے لیے شرط نہیں ہے کیونکہ اگر بات اس طرح ہوتی تو پھر اس کے ہاتھوں ہلاک ہوجانے والے شکار کا کھانا حلال نہ ہوتا۔ یہ مراد لینا بھی جائز نہیں ہے کہ وہ شکار کو ہلاک کرنے کے بعد مالک کے لیے روکے رکھے خواہ اس میں سے کچھ کھالے کیونکہ یہ ایک بے معنی بات ہوگی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اس کے امساک کو شکار کی اباحت قرار دیا ہے اور اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر کتا شکار کو ہلاک کر کے واپس ہوجائے اور اسے مالک کے لیے روکے نہ رکھے تو اس شکار کا کھانا جائز ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ آیت میں یہ مفہوم مراد نہیں ہے، اس لیے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آیت میں امساک سے مراد ترک اکل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قول باری (فکلوا مما امسکن علیکم) شکاری کتے کے منہ سے بچے ہوئے باقی ماندہ حصے کی اباحث کا مقتضی ہے کیونکہ کتے نے باقی ماندہ حصہ نہ کھا کر اسے ہمارے لیے روک رکھا ہے۔ البتہ جو حصہ اس نے کھالیا وہ گویا اس نے ہمارے لیے نہیں روکا۔ باقی ماندہ کو اس نے روک لیا اس لیے ظاہر آیت اس کے یعنی شکار کے باقی ماندہ حصے کی اباحت کا مقتضی ہے کیونکہ اس پر آیت کا مفہوم صادق آتا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ بات کئی وجوہ سے غلط ہے۔ اول یہ کہ امساک کے مفہوم کے متعلق سلف سے دو قول منقول ہیں، ایک تو یہ کہ شکاری جانور اس شکار میں سے کچھ نہ کھائے۔ حضرت ابن عباس (رض) کا قول ہے اور دوسرا یہ کہ شکاری جانور شکار کو ہلاک کرنے کے بعد مالک کے لیے اسے روکے رکھے۔ سلف میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ شکاری جانور کا شکار کے ایک حصے کو کھا جانے کے بعد باقی ماندہ حصہ کو نہ کھانا امساک ہے۔ اس لیے یہ قول باطل ہوگیا۔

دوم یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (اذا اکل منہ فلا تاکل فانما امسک علی نفسہ، اگر شکاری کتا شکار میں سے کچھ کھالے تو تم نہ کھاؤ کیونکہ اس صورت میں اس نے شکار کو اپنے لیے پکڑا تھا) آپ نے شکار کے باقی ماندہ حصے کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ شکاری جانور نے اسے ہمارے لیے پکڑ رکھا ہے۔

سوم یہ کہ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہو جائے گا جس شکار کو شکاری جانور نے ہلاک کر دیا اس میں سے کھالو" اور اس میں امساک کے ذکر کی گنجائش نہیں ہوگی کیونکہ یہ بات تو معلوم ہے کہ شکاری جانور نے شکار کا جو حصہ کھالیا ہے ممانعت کے دائرے میں اس کے آنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس سے آیت میں (مما امسک علیکم) کا ذکر کا فائدہ ساقط ہو جائے گا نیز شکاری جانور جب شکار کا کچھ حصہ کھا جائے گا تو اس سے ہمیں بات معلوم ہوگی کہ اس نے اپنے لیے یہ شکار کیا تھا اور اپنے لیے اسے پکڑے رکھا تھا، ہمارے لیے اس نے پکڑ کر نہیں رکھا تھا۔ پھر اگر وہ اس کا کچھ حصہ کھالے تو باقی ماندہ حصے کو نہ کھانے کی وجہ سے اس پر یہ مفہوم صادق نہیں آئے گا کہ اس نے یہ حصہ ہمارے لیے روکا تھا اس لیے کہ دراصل وہ باقی ماندہ حصہ بھی نہ چھوڑتا اگر وہ سیر نہ ہو جاتا۔ پیٹ بھر جانے کی وجہ سے اس نے یہ حصہ چھوڑ دیا تھا اور اسے اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ہمارے لیے روکے رکھنے کی اس میں کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے ابتدا ہی سے شکار کا ایک حصہ کھالیا تھا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ شکار کرنے کے بعد اس نے شکار کو ہمارے لیے نہیں پکڑا تھا۔ اس صورت حال کے تحت اس کی تعلیم کی صحت کے بارے میں ہمارے لیے غور کرنا ضروری ہو جائے گا، اس کی تعلیم تو یہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ ہمارے لیے شکار کرے اور ہمارے لیے اسے پکڑے رکھے جب وہ شکار کا ایک حصہ کھا جائے گا تو اس سے یہ بات معلوم ہوگی کہ اسے سدھانے اور شکار کی تعلیم دینے کا کام ابھی تک نامکمل ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کتا تو اپنے لیے شکار کرتا ہے اور اسے اپنے لیے پکڑے رکھتا ہے۔ مالک کے لیے پکڑے نہیں رکھتا۔ آپ نہیں دیکھتے کہ اگر شکار پر چھوڑنے کے وقت وہ شکم سیر ہو تو شکار پکڑتا ہی نہیں، شکار پر وہ اسی صورت میں جھپٹے گا کہ اس کا ایک حصہ خود کھالے۔ اس لیے شکار کا ایک حصہ کھا جانے سے تعلیم کی نفی نہیں ہوتی اور اس بات کی بھی نفی نہیں ہوتی کہ اس نے شکار کو ہمارے لیے نہیں پکڑے رکھا۔ اگر آپ کی بات کا اعتبار کیا جائے تو ہمیں کتے کی نیت اور اس کی پوشیدہ خواہش کے اعتبار کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ ایسی بات ہے جسے نہ ہم معلوم کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے متعلق ہمیں کوئی واقفیت ہو سکتی ہے بلکہ ہم تو اس بارے میں شک بھی نہیں کر سکتے کہ اس کی نیت اور اس کا ارادہ اپنی ذات کے لیے تھا۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ معترض کا یہ کہنا درست نہیں کہ کتا اپنی ذات کے لیے شکار کرتا اور شکار کو پکڑے رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر بات اس طرح ہوتی تو اس کی پٹائی اس حد تک نہ ہوتی کہ کھانا چھوڑ جائے، اور ترک اکل کی تعلیم ملنے کے باوجود وہ یہ بات نہ سیکھتا۔ جب وہ ترک اکل کی تعلیم ملنے پر کھانا چھوڑ دینے کی بات سیکھ جاتا ہے اور شکار میں سے کچھ نہیں کھاتا تو اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب وہ کھانا چھوڑ جائے گا تو شکار کو ہمارے لیے روکنے والا بن جائے گا اور اللہ کی مقرر کردہ شرط تعلیم کے مطابق وہ معلم یعنی سدھایا ہوا قرار پائے گا۔ اس صورت میں وہ اپنے مالک کے لیے شکار کرے گا اور اپنے مالک ہی کے لیے شکار کو پکڑے رکھے گا۔ معترض کا یہ کہنا کہ اگر کتا اپنے مالک کے لیے شکار کرتا تو شکم سیری کی حالت میں بھی وہ یہ کام کرتا تو اس میں بات دراصل یہ ہے کہ شکم سیری کی حالت میں جب مالک اسے شکار پر چھوڑتا ہے تو وہ مالک ہی کے لیے شکار کرتا اور مالک ہی کے لیے شکار کو پکڑے رکھتا

ہے۔اگر وہ سدھایا ہوا ہوتو شکار پر چھوڑے جانے کی صورت میں وہ شکار پکڑنے سے باز نہیں رہتا۔
معترض کا یہ کہنا کہ وہ شکار پر اس صورت میں جھپٹتا ہے کہ اس میں سے خود کچھ کھالے، تو یہاں بھی یہ بات ہوتی ہے کہ وہ شکار کا ایک حصہ کھاتا ضرور ہے مگر اس وقت جب کہ وہ شکار کو پہلے اپنے مالک کے لیے روک لیتا ہے۔ جہاں تک کتے کی پوشیدہ خواہش اور اس کی نیت کا تعلق ہے تو اسے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ شکار کی تعلیم ملنے اور اس کے سدھائے جانے کا کیا مقصد ہے، وہ اس مراد اور مقصد تک پہنچ جاتا اور اس سے آگاہ ہوجاتا ہے جس طرح گھوڑے کو یہ معلوم ہوتا ہے اسے ہنکانے اور اس پر چابک بلند کرنے کا کیا مقصد اور مراد ہے۔ کتے کو اس سلسلے میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ شکار کو نہ کھائے لیکن جب وہ شکار کو کھالیتا ہے تو اس سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ اس نے اپنی ذات کے مقصد سے شکار پکڑا تھا، مالک کے مقصد سے شکار نہیں کیا تھا۔
اوپر ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے نیز یہ کہ کتے کی تعلیم کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ ترک اکل سیکھ جاتا ہے اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ کتا واضح طور پر ایک پالتو جانور ہے وحشی جانور نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اسے اس لیے سدھایا جاتا ہے کہ وہ پالتو جانور بن جائے اور وحشی نہ رہے اس لیے یہ ضروری ہوگیا کہ اس کی تعلیم کی تکمیل ترک اکل پر ہو۔ اس کے برعکس باز بنیادی طور پر چیر پھاڑ کرنے والا وحشی پرندہ ہے اس لیے اس کی تعلیم اس طرح نہیں ہوسکتی کہ اس کی پٹائی ہوتی رہے حتیٰ کہ وہ کھانا چھوڑ دے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اسے اپنے مالک سے مانوس ہونے اور اس سے وحشت دور کرنے کی تعلیم دی جائے کہ جب اس کا مالک اسے آواز دے تو وہ اس کی آواز پر اس کے پاس پہنچ جائے۔ جب اس کے اندر یہ صفت پیدا ہوجائے گی تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے اپنی پہلی فطرت ترک کردی ہے اور اس سے ہٹ گیا ہے۔
یہ بات اس کی تعلیم کی تکمیل کی علامت بن جائے گی۔ قول باری (فکلوا مما امسکن علیکم) میں ایک قول یہ ہے کہ اس میں حرف من تبعیض کا مفہوم ادا کررہا ہے اور تبعیض کے معنی یہ ہوں گے کہ شکاری جانور ہمارے لیے جو شکار پکڑ رکھیں گے ان میں سے بعض ہمارے لیے مباح ہوں گے سب کے سب مباح نہیں ہوں گے جس شکار کو یہ شکاری جانور زخمی کرکے ہلاک کردیں وہ مباح ہوگا اور جسے ٹکر مار کر زخمی کئے بغیر ہلاک کردیں وہ مباح نہیں ہوگا۔ بعض کا قول ہے کہ یہاں حرف من زائد ہے اور تاکید کے معنی دے رہا ہے جس طرح یہ قول باری ہے (یکفر عنکم من سیئاتکم) ابتدائے غایت ہے یعنی "اللہ تعالیٰ ہمارے ان اعمال سئیہ کو بخش دے گا جن پر پردہ پڑا رہنا تمہیں پسند ہے۔" ان کے قول کے مطابق اس کے یہ معنی لینا بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے سیئاً میں سے ان گناہوں کی بخشش کردے گا جن کی تکفیر کا اس کی حکمت میں جواز نہیں۔ یہ معنی لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تمام مکلفین کو خطاب ہے۔

امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ جب شکاری کتا اپنے پکڑے ہوئے شکار میں سے کچھ کھاجائے اور اس نے اس سے پہلے بہت سے شکار پکڑے ہوں اور ان کے کسی حصے کو اس نے نہ کھایا ہو تو اس صورت میں اس کے پہلے کئے ہوئے تمام شکار حرام ہوجائیں گے اس لیے کہ جب اس نے شکار میں سے کھالیا تو یہ ظاہر ہوگیا کہ ابھی تک معلم نہیں بنا یعنی اس کے سدھانے اور سکھانے کا کام مکمل نہیں ہوا۔ ابتدا میں ترک اکل کی بنا پر سیکھ جانے کا جو حکم لگایا گیا تھا وہ اجتہاد اور ظن غالب کی بنا پر تھا۔ اب شکار میں سے کھالینے کی وجہ سے نفی تعلیم کا جو حکم لگایا جا رہا تھا وہ یقین کی بنا پر ہے۔ یقین کے ہوتے ہوئے اجتہاد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ شروع ہی سے کتا سدھائے بغیر شکار کو نہیں

کھاتا۔جس طرح دوسرے تمام درندے اپنے شکار کو ہلاک کر دینے کے بعد فوری طور پر اسے نہیں کھاتے، جب کتا اکثر اوقات شکار کو ہاتھ نہیں لگاتا تو اس پر ظن غالب کی بنیاد پر سیکھ جانے کا حکم لگایا جاتا ہے لیکن جس اس کے بعد وہ کھالیتا ہے تو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اس نے ابھی سیکھا نہیں ہے اس لیے اس کے کئے ہوئے سابقہ تمام شکار حرم ہو جاتے ہیں ۔

امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے کہ اگر کتا تین مرتبہ کھانا چھوڑ دے ۔۔تو وہ سدھایا ہوا شمار ہوگا۔اگر اس کے بعد اس نے بیشمار شکار میں سے کھالیا تو اس کے سابقہ شکار حرام نہیں ہوں گے ۔کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ وہ تعلیم بھلا چکا ہو اس لیے صرف احتمال کی بنیاد پر اس کے وہ سابقہ شکار حرام قرار نہیں دیئے جائیں گے جن پر اباحت کا حکم لگ چکا ہے ۔یہاں یہ مناسب ہے کہ امام ابوحنیفہ کے مسلک کو اس پر محمول کیا جائے کہ کتے نے اس مدت کے دوران شکار میں سے کھالیا تھا جس میں وہ اپنی تعلیم بھلا نہیں سکتا تھا۔اگر شکار کو طویل مدت گزر چکی ہو اور اس کے بعد کتا شکار کر کے اس میں سے کھالے تو اس کے سابقہ شکاروں کو حرام قرار دینا نہیں چاہیے جب کہ مدت کی طوالت اتنی ہو کہ اس کے لیے اپنی تعلیم کو بھلا دینا ممکن نظر آتا ہو۔اس وضاحت کے بعد امام ابوحنیفہ اور آپ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد کے درمیان صرف یہ اختلافی نکتہ باقی رہ جائے گا کہ دونوں حضرات تعلیم کی شرط میں تین مرتبہ ترک اکل کا اعتبار کرتے ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کی کوئی حد نہیں ہے ۔آپ تعلیم کے حصول میں صرف ظن غالب کا اعتبار کرتے ہیں ۔اگر ترک کل کی وجہ سے ظن غالب یہ ہو جائے کہ اس پر سدھانے کا عمل مکمل ہو چکا ہے اور وہ اب تعلیم پا چکا ہے پھر تھوڑے عرصے کے بعد اسے شکار پر چھوڑا گیا ہو اور اس نے اس میں سے کھالیا ہو تو اس پر ان شکاروں کے سلسلے میں غیر معلم ہونے کا حکم لگایا جائے گا جن میں سے اس نے کھایا نہیں تھا لیکن ترک اکل کے بعد ایک مدت دراز گزر جانے پر اگر اسے شکار پر چھوڑا گیا ہو اور اس نے اس میں سے کھالیا ہو تو ظن غالب یہی ہوگا کہ مدت کی طوالت کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم بھلا چکا ہے ۔اس لیے اس کے کئے ہوئے سابقہ شکار حرام قرار نہیں دیئے جاسکتے ۔

امام ابو یوسف اور امام محمد کا کہنا یہ ہے کہ جب اس نے تین مرتبہ شکار کر کے اس میں سے کچھ نہ کھایا ہو اس کے بعد شکار پکڑ کر اس میں سے کچھ کھالیا ہو تو چاہے مدت طویل ہو یا مختصر اس کے سابقہ شکاروں کو حرام قرار نہیں دیا جائے گا۔ یہ ہے وہ نکتہ جس پر امام ابوحنیفہ کا اپنے دونوں شاگردوں کے ساتھ اختلاف ہے ۔قول باری ہے (واذکروا اسم اللہ علیہ اس پر اللہ کا نام لو) حضرت ابن عباس (رض) حسن اور سدی کا قول ہے کہ اس سے شکاری جانوروں کو شکار پر چھوڑتے وقت اللہ کا نام لینا مراد ہے ۔ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ یہ قول باری امر کے صیغے کے ساتھ مذکور ہے اور یہ ایجاب کا مقتضی ہے ۔اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ اس اکل کی طرف راجع ہے جس کا ذکر قول باری (فکلوا مما امسکن علیکم) میں کیا گیا ہے اور یہ احتمال ہے کہ یہ ارسال کی طرف راجع ہے اس لیے کہ قول باری (وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللہ) شکار پر سدھائے ہوئے شکاری جانور چھوڑنے کے معنی کو متضمن ہے، اس لیے بسم اللہ پڑھنے کے حکم کا اس کی طرف راجع ہونا جائز ہے ۔اگر اس میں یہ احتمال نہ ہوتا تو سلف اس کی یہ تاویل نہ کرتے ۔

جب بات اس طرح ہے اور بسم اللہ پڑھنے کا حکم اس کے ایجاب کو متضمن ہے اور دوسری طرف سب کا اس پر اتفاق ہے کہ کھانے پر بسم اللہ پڑھنا واجب نہیں ہے اس لیے بسم اللہ پڑھنے کے حکم پر شکاری جانوروں کو شکار پر چھوڑتے وقت عمل کرنا واجب ہو گیا کیونکہ یہ مختلف فیہ ہے ۔اب جب ارسال کے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہو گیا تو یہ ذکاۃ کی ایک شرط بن گیا جس طرح شکاری

جانوروں کی تعلیم اس کی ایک شرط ہے، اور جس طرح یہ بھی ایک شرط ہے کہ چھوڑنے والا ایسا شخص ہو جس کی ذکاۃ شرعی لحاظ سے درست قرار دی گئی ہو اور جس طرح دھار دار آلے کے ذریعے شکار کو لگے ہوئے زخم سے خون بہا دینا بھی ایک شرط ہے۔ آیت اس امر کی مقتضی ہے کہ جان بوجھ کر ترک تسمیہ پر ذکاۃ کا فساد لازم ہو جاتا ہے۔ یعنی شرعی طریقہ سے ذبح نہیں ہوتی اس لیے کہ امر کا ایجاب ناسی یعنی بھول جانے والے انسان کو لاحق نہیں ہوتا کیونکہ اسے امر کے ساتھ مخاطب بنانا درست نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ اگر بھول کر بسم اللہ پڑھنا چھوڑ گیا ہو تو ذکاۃ کی صحت میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی اس لیے کہ نسیان کی حالت میں وہ دراصل بسم اللہ پڑھنے کا مکلف ہی نہیں ہوتا۔

کتے کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنے کے متعلق روایت ہمیں محمد بن بکر نے بیان کی، انھیں ابو داؤد نے، انھیں محمد بن کثیر نے، انھیں شعبہ نے عبداللہ بن ابی السفر سے، انھوں نے شعبی سے کہ حضرت عدی بن حاتم (رض) نے فرمایا، "میں نے شکار پر کتے کو چھوڑنے کے متعلق حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، (**اذا سمیت فکل والا فلا تاکل و ان اکل مئته فلا تاکل فانما امسك علی نفسه**) جب تم بسم اللہ پڑھ لو تو کھالو، ورنہ نہ کھاؤ، اور اگر کتا اس شکار میں سے کھالے تو بھی نہ کھاؤ کیونکہ اس نے اپنی ذات کے لیے شکار پکڑا۔

یہ چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ شکار کی ذکاۃ کی صحت کی ایک شرط یہ ہے کہ اس پر شکاری جانور چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھی جائے۔ یہ بات اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ بسم اللہ پڑھنے کے وجوب کے لحاظ سے شکار پر شکاری جانور چھوڑنے کی حالت، جانور ذبح کرنے کی حالت کی طرح ہے۔ شکار کے سلسلے میں بہت سی باتوں کے اندر فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ اول مجوسی کے کتے کے ذریعے شکار کرنا جس کے متعلق ہمارے اصحاب، امام مالک، اوزاعی اور امام شافعی کا قول ہے کہ مجوسی کا کتا اگر سدھایا ہوا ہو تو اس کے ذریعے شکار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگرچہ اسے سدھانے والا مجوسی ہو لیکن اسے شکار پر چھوڑنے والا مسلمان ہو۔ سفیان ثوری کا قول ہے مجوسی کے کتے کے ذریعے شکار کرنے کو میں مکروہ سمجھتا ہوں الا یہ کہ شکاری کتا اپنا شکار اس تعلیم کی بنا پر پکڑتا ہو جو اس نے مسلمان کے ہاتھوں حاصل کی ہے۔ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ ظاہر قول باری (**فکلوا مما امسکن علیکم**) مجوسی کے کتے کے کئے ہوئے شکار کے جواز اور اس کے کھا لینے کی اباحت کا مقتضی ہے۔ آیت میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا گیا کہ اس کا مالک مسلمان ہو یا مجوسی۔ نیز شکاری کتا تو ایک آلے کی طرح ہوتا ہے جس طرح ذبح کرنے کی چھری یا تیر چلانے کی کمان ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ کتے کا حکم بھی اس لحاظ سے مختلف نہ ہو کہ اس کا مالک کون ہے۔ جس طرح ان تمام آلات کا حکم ہے جن کے ذریعے شکار کیا جاتا ہے۔ نیز شکار کے سلسلے میں کتے کا اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ شکار پر کتا چھوڑنے والے کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

آپ نہیں دیکھتے کہ اگر کوئی مجوسی کسی مسلمان کے کتے کے ذریعے شکار کرے تو اس کا کھانا جائز نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی مجوسی کے کتے کے ذریعے شکار کرے تو اس کا کھانا جائز ہونا چاہیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قول باری ہے (**یسئلونك ماذا احل لهم قل احل لکم الطیبات وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونهن مما علمکم الله**) یہ بات ظاہر ہے کہ اس میں اہل ایمان سے خطاب ہے اس لیے یہ واجب ہوگا کہ شکار کی اباحت میں مسلمان کی تعلیم شرط قرار دی جائے۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ مجوسی کی دی ہوئی تعلیم یا تو مسلمان کی دی ہوئی تعلیم کی طرح ہوگی جس کی ذکاۃ کی اباحت میں شرط ہے یا مجوسی

کی دی ہوئی تعلیم مسلمان کی دی ہوئی تعلیم سے کم ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہوگی تو اس میں تعلیم پانے والے کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ حصول تعلیم کا اعتبار ہوگا۔ آپ نہیں دیکھتے کہ اگر کتا ایک مسلمان کی ملکیت میں آجائے اور اسے اسی طرح سدھایا گیا ہو جس طرح ایک مسلمان سدھاتا اور تعلیم دیتا ہے تو اس کا کیا ہوا شکار حلال ہوگا۔ اس طرح گویا ملکیت کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ تعلیم کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر مجوسی کی دی ہوئی تعلیم مسلمان کی دی ہوئی تعلیم سے کم ہوگی جس کی وجہ سے شکار کرتے وقت ذکاۃ کی بعض شرائط میں خلل واقع ہو جائے تو اس صورت میں یہ کتا سدھایا ہوا کتا نہیں کہلائے گا اور پھر اس کے کئے ہوئے شکار کی حلت کی ممانعت میں مجوسی اور مسلمان کی ملکیت کے حکم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

رہ گیا قول باری (تعلمونھن مما علمکم اللہ) تو اس میں مسلمانوں کو خطاب ہے لیکن حصول تعلیم سے مقصد ہے کہ کتے کو درست طریقے سے سدھایا گیا ہو۔ اگر مجوسی کتے کو مسلمان کی دی ہوئی تعلیم کی طرح تعلیم دے دیتا ہے تو وہ بات حاصل ہو جاتی ہے جس کی آیت میں شرط لگائی گئی ہے۔ اس کے بعد مجوسی کی ملکیت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ اگر شکار زندہ ہاتھ آجائے تو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے کہ اگر کتے کا کیا ہوا شکار یا تیر کے ذریعے حاصل ہونے والا شکار شکاری کے زندہ ہاتھ آجاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے تو اس کا گوشت نہیں کھایا جائے گا اگرچہ اسے ذبح کر لینے کی اس کو قدرت نہ بھی حاصل ہو سکے حتیٰ کہ اس کی موت واقع ہو جائے۔

امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے کہ اگر اسے ذبح کر لینے کی اس کو قدرت حاصل نہ ہو سکے حتیٰکہ اس کی موت واقع ہو جائے تو وہ شکار حلال ہوگا خواہ اس کی موت شکاری کے ہاتھوں میں کیوں نہ واقع ہوگئی ہو۔ اگر اسے ذبح کر لینے کی قدرت حاصل ہو اور پھر وہ اسے ذبح نہ کرے تو اس کا گوشت نہیں کھایا جائے گا خواہ اس کے ہاتھوں میں نہ بھی پہنچا ہو۔ سفیان ثوری کا قول ہے کہ اگر شکاری کو اتنی قدرت ہو کہ شکار کو کتے سے لے کر ذبح کر لے اور پھر ذبح نہ کرے تو اس کا گوشت حلال نہیں ہوگا۔ اوزاعی کا قول ہے کہ جب اسے ذبح کرنا ممکن ہوا اور وہ ذبح نہ کرے تو اس کا گوشت نہیں کھایا جائے گا اور اگر اس کے ہاتھ آجانے کے بعد اسے ذبح کرنا ممکن نہ ہو حتیٰ کہ اس کی موت واقع ہو جائے تو اس صورت میں وہ شکار حلال ہوگا۔

لیث بن سعد کا قول ہے کہ اگر شکاری شکار کو کتے کے منہ میں پا کر اسے ذبح کرنے کے لیے اپنے موزے یا کمر بند سے چھری نکالنے لگے اور اسی دوران شکار ہلاک ہو جائے تو اسے کھایا جائے گا۔ اگر اپنے خورجین سے یا تھیلے سے چھری لینے چلا جائے اور ذبح کرنے سے قبل ہی شکار مر جائے تو اسے نہیں کھایا جائے گا۔ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ شکار جب زندہ اس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے تو اس صورت میں ذبح اس کی ذکاۃ کی شرط ہوگی، ذبح کے امکان یا عدم امکان کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتے کا پکڑا ہوا شکار صرف اس بنا پر حلال ہوتا ہے کہ اس تک رسائی متعذر ہوتی ہے اور وہ ناممکن الحصول ہوتا ہے صرف کتے کے ذریعے وہ قابو میں آسکتا ہے لیکن جب وہ شکاری کے ہاتھوں میں زندہ پہنچ جاتا ہے تو اس سے وہ سبب دور ہوتا ہے جس کی بنا پر کتے کے کئے ہوئے شکار کی اباحت ہوئی تھی اور اس کی حیثیت چوپایوں جیسی ہو جاتی ہے جنہیں موت کا خطرہ رہتا ہے۔

اس لیے ذبح کے ذریعے ہی اس کی ذکاۃ ہو سکے گی چاہے اس کی موت میں اتنا وقفہ ہو کہ اسے ذبح کرنے کی قدرت حاصل نہ ہو سکے یا قدرت حاصل ہو جائے۔ اصل بات یہ ہوتی ہے کہ شکار اس کے ہاتھوں میں زندہ موجود ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تمام چوپایوں

کی ذکاۃ ذبح کے ذریعے صرف اس لیے ہوتی ہے کہ انھیں ذبح کرنا انسان کے بس میں ہوتا ہے۔ اگر چوپایہ اپنی طبعی موت مرجائے تو یہ ذکاۃ نہیں کہلائے گی۔ اگر شکار زندہ ہاتھ نہ آتا تو کتے یا تیر کے ذریعے لگا ہوا زخم اس کے لیے ذکاۃ قرار پاتا۔ اس لیے اگر وہ زندہ اس کے ہاتھ آجائے لیکن وہ اتنی دیر تک زندہ نہ رہے کہ اسے ذبح کرلیا جائے تو اس صورت میں وہ ذبیحہ یعنی مذکیٰ شمار ہوگا۔ کتے یا تیر کے ذریعے لگا ہوا زخم اس کی ذکاۃ کے لیے کافی ہوگا اور اس کی حیثیت اس شکار جیسی ہوجائے گی جو موت کے بعد ہاتھ آیا ہو۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس کی دو صورتیں ہیں، اول یہ کہ کتے نے اسے اس قدر زخمی کر دیا ہو کہ اس کی زندگی کی بس اتنی رمق باقی ہو جتنی ذبح شدہ جانور کے اندر ذبح کے فوراً بعد ہوتی ہے۔

اس کی صورت یہ ہوگی کہ مثلاً کتے نے اس کی گردن کی رگیں، حلقوم اور نرخرہ کاٹ دیئے ہوں یا اس کا پیٹ پھاڑ دیا ہو جس سے اس کی آنتیں وغیرہ باہر نکل آئی ہوں۔ اگر شکار کی یہ حالت ہو تو کتے کا لگایا ہوا یہ زخم اس کے لیے ذکاۃ قرار دیا جائے گا خواہ اس کے بعد اس کی ذبح ممکن ہو یا ممکن نہ ہو۔ یہ وہ صورت ہوگی جس میں کتے کا لگایا ہوا زخم اس شکار کی شرعی ذبح یعنی ذکاۃ کا کام دے جائے گا خواہ اس کے بعد اس کی ذبح ممکن ہو یا ممکن نہ ہو۔ اس صورت میں کتے کا لگایا ہوا زخم شکار کے لیے ذکاۃ بن جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کتے یا تیر کے ذریعے لگایا ہوا زخم اس شکار کی شرعی ذبح یعنی ذکاۃ کا کام دے جائے گا خواہ اس کے بعد اس کی ذبح ممکن ہو یا ممکن نہ ہو۔ اس صورت میں کتے کا لگایا ہوا زخم شکار کے لیے ذکاۃ بن جائے گا۔ دوسری صوری یہ ہے کہ کتے یا تیر کے ذریعے لگایا ہوا زخم مہلک نہ ہو اور اس جیسے زخم کے ساتھ زندہ رہنا ممکن ہو لیکن شکاری کے ہاتھ آنے کے بعد اس کی موت واقع ہوگئی ہو اور اس نے اتنا وقت نہ لیا ہو کہ اسے ذبح کرنے کی قدرت حاصل ہوسکتی تو اس صورت میں وہ شکار مذکیٰ نہیں ہوگا یعنی اسے شرعی ذبیحہ قرار نہیں دیا جائے گا۔

اس لیے کہ کتے یا تیر سے لگے ہوئے اس زخم کی رعایت اور لحاظ اس وقت کیا جاتا جب شکاری کے ہاتھ میں آنے سے پہلے شکار کی موت واقع ہوجاتی اور اس کے لیے اسے ذبح کرنا ممکن نہ ہوتا لیکن جب شکار زندہ اس کے ہاتھ میں آجائے تو زخم کا اعتبار باطل ہوجائے گا اور اس کی حیثیت ان تمام چوپایوں کی طرح ہوجائے گی جنہیں زخم آتے ہیں۔ لیکن یہ زخم ان کے لیے ذکاۃ کا سبب نہیں بنتے۔ مثلاً اوپر سے لڑھک کر نیچے گر جانے والا جانور یا ٹکر کھا کر مر جانے والا چوپایہ وغیرہ۔ اس لیے اس صورت میں ذبح کے ذریعے ہی اس کی ذکاۃ ہوگی۔ اس شکار کے بارے میں بھی فقاء کے درمیان اختلاف رائے ہے جو شکاری کی نظروں سے بھاگ کر اوجھل ہوجائے۔ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد اور زفر کا قول ہے کہ جب شکار اور شکاری کتا دونوں شکاری کی نظروں سے اوجھل ہوجائیں اور وہ ان دونوں کی تلاش میں ان کے پیچھے رہے پھر اسے یہ دونوں اس حالت میں مل جائیں کہ شکار کتے کے ہاتھوں قتل ہوچکا ہو تو اس شکار کا گوشت حلال ہوگا۔ لیکن اگر شکاری نے ان کی تلاش ختم کر کے اپنے کوئی اور کام شروع کر دیا ہو اور پھر انھیں اس حالت میں تلاش کرلیا ہو کہ شکار ہلاک ہوچکا اور کتا اس کے پاس موجود ہو تو ایسے شکار کا گوشت ہمارے نزدیک مکروہ ہوگا۔ تیر سے کئے ہوئے شکار کے متعلق بھی ہمارے اصحاب کی یہی رائے ہے جب تیر لگنے کے بعد شکار نظروں سے غائب ہوجائے۔

امام مالک کا قول ہے کہ اگر شکار نظروں سے غائب ہوجانے کے بعد اسی دن مل جائے تو کتے اور تیر دونوں صورتوں میں کئے گئے ایسے شکار کو کھایا جاسکے گا۔ اگرچہ شکار مردہ حالت میں کیوں نہ ملے بشرطیکہ اس کے جسم پر زخم کے نشانات موجود ہوں لیکن اگر ایک رات گزر جائے اور پھر وہ شکار ہاتھ آئے تو اس صورت میں وہ حلال نہیں ہوگا۔ سفیان ثوری کا قول ہے کہ جب شکار پر تیر چلایا ہو اور اس کے

بعد ایک دن یا ایک رات وہ اس کی نظروں سے غائب رہا ہو تو ان کے نزدیک اس کا گوشت مکروہ ہو جائے گا۔ اوزاعی کا قول ہے کہ اگر شکار اسے اگلے دن مردہ صورت میں مل جائے اور اس کے جسم پر اپنا تیر بھی پیوست نظر آئے یا اس کے جسم پر تیر لگنے کا نشان موجود ہو تو وہ اس کا گوشت کھا سکتا ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ شکار اگر نظروں سے غائب ہو جائے تو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا گوشت نہ کھایا جائے۔ ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) سے ان کا یہ قول مروی ہے۔ "جو شکار تمہیں فوراً مل جائے اس کا گوشت کھالو اور جو نظروں سے غائب ہو جائے اسے چھوڑ دو"۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباس (رض) کے الفاظ یہ ہیں: جو شکار ایک رات غائب رہنے کے بعد ملے اسے نہ کھاؤ" حضرت ابن عباس (رض) کی روایت میں دو لفظوں اصماء اور انماء کا ذکر ہوا ہے۔ پہلے کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اسی وقت فوری طور پر مل جائے اور دوسرے کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو نظروں سے غائب ہو جائے۔ سفیان ثوری نے موسیٰ بن ابی عائشہ، انھوں نے عبداللہ بن ابی رزین سے اور انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کی ہے کہ آپ نے نظروں سے غائب ہو کر مر جانے والے شکار کا ذکر کرتے ہوئے اس کے گوشت کو ناپسند فرمایا اور اس سلسلے میں حشرات الارض کا بھی ذکر کیا۔ یاد رہے کہ روایت میں مذکور ابو رزین صحابی نہیں ہیں بلکہ یہ ابو وائل کے آزاد کردہ غلام ہیں۔ اگر شکار زخمی ہونے کے بعد نظروں سے غائب ہو جائے اور شکاری اس کی تلاش میں تاخیر کر دے تو اس کا گوشت کھایا نہیں جائے گا۔ اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ زخمی ہونے کے بعد شکار نظروں سے غائب نہ ہو اور شکاری کے لیے اسے ذبح کرنا ممکن ہو لیکن وہ اسے ذبح نہ کرے حتیٰ کہ اس کی موت واقع ہو جائے تو اس صورت میں اس کا گوشت نہیں کھایا جائے گا۔

اگر شکاری اس کی جستجو ترک نہیں کرتا اور پھر اسے مردہ حالت میں پا لیتا ہے تو ہم یہ بات سمجھ لیتے ہیں کہ گویا شکاری کو اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ اسے ذبح کر سکے۔ اس لیے کتے یا تیر کا اسے ہلاک کر دینا اس کے حق میں ذکاۃ یعنی شرعی ذبح کے مترادف ہو جائے گا لیکن اگر اس کی تلاش میں تاخیر اور سستی کرتا ہے تو اس صورت میں اس بات کی گنجائش ہوتی ہے کہ اگر اسے فی الفور تلاش کرتا تو شاید اسے ذبح کر لیتا۔ اب جبکہ اس نے ایسا نہیں کیا حتیٰ کہ اس کی موت واقع ہو گئی تو اس کا گوشت نہیں کھایا جائے گا۔ جب اس کی تلاشی ترک نہ کرے اور اسے زندہ حالت میں پالے تو یہ بات یقینی ہو جائے کہ کتے کا اس ہلاک کر دینا اس کی ذکاۃ نہیں ہے۔ اس لیے اس کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔ آپ نہیں دیکھتے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عدی بن حاتم سے فرمایا (**فان شارکہ کلب اخو فلا تاکل فلعلہ ان یکون الثانی قتلہ** اگر اس کے ساتھ کوئی دوسرا کتا بھی شامل ہو جائے تو پھر اسے نہ کھاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوسرے کتے نے اسے قتل کر دیا ہو، شارع (علیہ السلام) نے اس کے کھانے کی ایسی صورت میں ممانعت کر دی جبکہ دوسرے کتے کے ہاتھوں اس شکار کی ہلاکت کا جواز اور اس کی گنجائش پیدا ہو جائے۔ اسی طرح اگر شکار کے غائب ہونے کی صورت میں اس کی گنجائش تھی کہ اگر شکاری اس کی تلاش جاری رکھتا تو اس کی شرعی ذبح ہو جاتی لیکن چونکہ اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے یہ ضروری ہو گیا کہ اس کا گوشت نہ کھایا جائے کیونکہ درج بالا حدیث میں بیان کردہ سبب کا اس صورت میں بھی جواز اور گنجائش موجود ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ معاویہ بن صالح نے عبدالرحمن بن جبیر بن نفیر حضرمی سے روایت کی ہے، انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے حضرت ثعلبہ سے، انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہ اگر ایک شخص تین دنوں کے بعد بھی گمشدہ شکار کو تلاش کرے تو اسے

کھالے گا۔الا یہ کہ اس میں بدبو پیدا ہو چکی ہو۔بعض طرق میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہ الفاظ منقول ہیں (اذا ادرکت بعد ثلاث و سهمك فيه فكله مالم ينتن۔ جب تین دنوں کے بعد تمہارا شکار تمہیں مل جائے اور اس کے جسم میں تمہارا چھوڑا ہوا تیر پیوست ہو تو جب تک اس میں بدبو پیدا نہ ہو جائے اسے کھا سکتے ہو) اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس روایت کو مسترد کر دینے پر سب کا اتفاق ہے اس کے کئی وجوہ ہیں۔اول یہ کہ کسی بھی فقیہہ کا یہ قول نہیں ہے کہ جب شکاری کو اپنا شکار تین دنوں کے بعد مل جائے تو وہ اسے کھا سکتا ہے۔دوم یہ کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بدبو نہ مارنے تک اس کے کھا لینے کی اباحت کر دی ہے جبکہ بو بدل جانے کا کسی کے ہاں بھی اعتبار نہیں ہے۔

سوم یہ کہ تمام اشیاء میں بو بدل جانے کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ حکم کا تعلق صرف ذکاۃ کے وجود اور عدم وجود کے ساتھ ہوتا ہے۔اگر مدت کی تاخیر کے باوجود شکار کو شرعی طریقے پر ذبح کر دیا گیا ہو تو وہ پاک اور حلال ہوگا اور بدبو بدلنے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اگر اس کی شرعی ذبح نہ ہو سکتی ہو تو چاہے بو بدل جائے یا نہ بدلے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔محمد بن ابراہیم التیمی نے عیسیٰ بن طلحہ سے روایت کی،انھوں نے عمیر بن سلمہ سے،انھوں نے قبیلہ نہد کے ایک شخص سے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقام روحاء سے گزر ہوا۔وہاں ایک جنگلی گدھا مرا پڑا تھا جس کے جسم میں تیر پیوست تھا۔آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ (رض) سے فرمایا کہ اسے یہیں پڑا رہنے دو اس کا شکاری آکر اسے لے جائے گا۔اس پر قبیلہ نہد کے ایک شخص نے جو اس روایت کا راوی ہے،حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ یہ جنگلی گدھا میرے تیر کا نشانہ بنا ہے،آپ نے کہا پھر اسے کھالو" ساتھ ہی آپ نے حضرت ابوبکر (رض) کو حکم دیا کہ اسے ساتھیوں میں تقسیم کر دیں،آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تمام لوگ حالت احرام میں تھے۔

بعض لوگوں نے اس واقعہ سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر شکاری اپنے شکار کی تلاش میں تاخیر اور سستی کرلے اور بعد میں اسے اس کا شکار مل جائے تو وہ اس شکار کو کھا سکتا ہے۔اس لیے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے اس کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔اگر اس کی بنا پر حکم میں فرق پڑ سکتا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ضرور اس نہدی سے اس بارے میں سوال کرتے۔

ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ اس واقعہ میں استدلال کے اندر مذکورہ بات کی کوئی دلیل نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عین ممکن ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس گدھے کی ایسی حالت کا مشاہدہ کیا ہو جس سے یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس کے زخمی ہونے کی مدت طویل نہیں ہے۔مثلاً آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے جسم سے تازہ خون بہتے ہوئے دیکھا ہو اور ساتھ تیرانداز یعنی شکاری بھی آگیا ہو۔جس سے آپ کو یہ بات معلوم ہو گئی ہو کہ اس نے اس کی تلاش میں کوئی وقفہ نہیں ڈالا ہے اس لیے آپ نے اس سے اس کے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔اگر یہ کہا جائے کہ ہشیم نے ابوہشیم سے روایت کی ہے،انھوں نے ابوبشہ سے،انھوں نے سعید بن جبیر سے اور انھوں نے حضرت عدی بن حاتم (رض) سے،وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کی،کہ ہم شکاری لوگ ہیں ہم میں کوئی اپنے شکار پر تیر چلاتا ہے اور وہ شکار ایک یا دو راتوں تک غائب رہتا ہے۔پھر صبح ہونے پر شکاری اس کا پیچھا کرتا ہے اور اسے تیر کے ساتھ شکار مل جاتا ہے،کیا یہ شکار اس کے لیے حلال ہوتا ہے؟" آپ نے جواب فرمایا (اذا وجدت سهمك فی ولم تجد به اثر سبع و علمت ان سهمك قتله فكله۔جب تمہیں اپنا تیر شکار کے جسم میں پیوست مل جائے اور شکار کے جسم پر درندے وغیرہ کا کوئی نشان نہ ہو،نیز تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے تیر سے ہی یہ ہلاک ہوا ہے تو پھر اسے کھالو) اس کے جواب میں کہا

جائے گا کہ یہ چیز اس بات کی موجب ہے کہ اگر کئی راتیں گزر جانے کے بعد شکاری کو اپنا شکار مع تیر مل جائے اور اسے یہ علم ہو جائے کہ شکار اس کے تیر سے ہی ہلاک ہوا ہے تو وہ اسے کھالے، جبکہ ہمیں نہیں معلوم کہ کسی اہل علم کا یہ قول ہو۔ اس لیے کہ اس میں صرف اس بات کا اعتبار کیا گیا ہے کہ شکار شکاری کے تیر سے ہی ہلاک ہوا ہے۔ نیز جب شکاری شکار کی تلاش میں تاخیر کر دے گا تو اس کے بعد اسے پتہ نہیں چل سکے گا کہ شکار اس کے تیر سے ہی ہلاک ہوا ہے حالانکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس میں یہ شرط عائد کی ہے کہ اسے اس بات کا علم حاصل ہو جائے۔ اس لیے جب اسے اس بات کا علم حاصل نہیں ہو سکے گا تو اس کے لیے اس کا نہ کھانا ضروری ہوگا۔

جب شکاری شکار کی تلاش میں تاخیر کر دے گا اور کافی عرصہ گزر جائے گا تو اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکے گا کہ شکار اس کے تیر سے ہلاک ہوا ہے۔ ہمارے اصحاب کے قول کی صحت پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو ہمیں عبدالباقی بن قانع نے بیان کی ہے، انھیں عبداللہ بن احمد بن حنبل نے، انھیں محمد بن عباد نے، انھیں محمد بن سلیمان نے مشمول سے، انھوں نے عمرو بن تیم سے، انھوں نے اپنے والد سے، انھوں نے عمرو کے دادا سے کہ انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ ہم صحرا نشین لوگ ہیں اور سدھائے ہوئے کتوں اور تیروں کے ذریعے شکار کرتے ہیں۔ ان میں سے کون سے شکار ہمارے لیے حلال اور کون سے حرام ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم اپنا سدھایا ہوا کتا شکار پر چھوڑو اور چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ لو، تو تمہارا کتا جس شکار کو تمہارے لیے پکڑے رکھے اسے کھالو، خواہ کتے نے اس میں سے کھایا ہو یا نہ کھایا ہو اور خواہ اس نے اسے ہلاک کر دیا ہو یا ہلاک نہ کیا ہو اور جب تم شکار پر تیر چلاؤ تو اس کے بعد فوری طور پر اگر اسے پکڑ لو تو کھالو اور اگر وہ غائب ہو جائے تو نہ کھاؤ"۔

آپ نے اس شکار کے گوشت کی ممانعت کر دی جو غائب ہو گیا ہو۔ یہ اس شکار پر محمول ہوگا۔ جو شکاری کی نظروں سے غائب ہو گیا اور شکاری نے اس کی تلاش میں تاخیر کر دی ہو۔ اس لیے کہ اگر شکاری اس کی تلاش میں رہے اور پھر وہ مل جائے تو اس کے کھالینے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

نبی ﷺ کے نورانیت کے بارے میں

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾

﴿المائدہ آیت ۱۵﴾

''بیشک آ گیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب''۔ (المائدہ: ۱۵)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور ہونے کے متعلق علماء کے نظریات:

جمہور مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں نور سے مراد سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات گرامی ہے اور کتاب مبین سے مراد قرآن مجید ہے۔

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ روایت کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اہل توراۃ اور اہل انجیل کو مخاطب کر کے فرمایا: تمہارے پاس نور اور کتاب مبین آ گئی۔ نور سے مراد سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں جنہوں نے حق کو روشن کیا' اسلام کو ظاہر کیا' اور کفر کو مٹایا۔ اسی نور کی وجہ سے آپ وہ باتیں بیان فرما دیتے تھے جن کو یہودی چھپاتے تھے اور کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جس نے ان چیزوں کو بیان فرما دیا جس میں ان کا اختلاف تھا۔ مثلاً اللہ کی توحید' حلال اور حرام اور شریعت کا بیان اور وہ کتاب قرآن مجید ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل فرمایا' جس میں دین سے متعلق احکام کو بیان فرمایا:

(جامع البیان' جز۶ ص ۲۲۰' مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۵ھ)

امام ابوالحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری متوفی ۴۵۸ھ لکھتے ہیں

نور سے مراد ہے گمراہی سے روشنی اور ہدایت' یعنی اسلام۔ قتادہ نے کہا اس سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مراد ہیں۔ یہی زجاج کا مختار ہے۔ اس نے کہا نور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ آپ بیان کرتے ہیں اور کتاب مبین سے مراد قرآن مجید ہے' جس چیز میں اہل کتاب اختلاف کرتے ہیں۔ اس میں قرآن مجید قول فیصل بیان کرتا ہے۔

(الوسیط' ج ۲ ص ۱۶۹۔ ۱۶۸' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

حسب ذیل تفاسیر میں بھی یہی تفسیر کی گئی ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ نور سے مراد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور دوسروں نے کہا اس سے مراد اسلام ہے اور کتاب مبین سے مراد قرآن مجید ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن' ج ۳ ص ۷۸' مطبوعہ بیروت' فتح القدیر' ج ۲ ص ۲۳' الدر المنثور' ج ۲ ص ۲۶۸' نظم الدرر' ج ۶' ص ۶۳' زاد المیسر' ج ۲ ص ۳۱۶)

علامہ ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی متوفی ۳۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

اس آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں:

(۱) نور سے مراد سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔

(۲) نور سے مراد اسلام ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے۔

(۳) نور اور کتاب دونوں سے مراد قرآن ہے۔ یہ قول ضعیف ہے' کیونکہ عطف تغایر کو چاہتا ہے۔ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اسلام اور قرآن پر نور کا اطلاق بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ نور ظاہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے آنکھ اشیاء ظاہرہ کا ادراک قوت سے کرتی ہے اور نور باطن اس چیز کو کہتے ہیں جس سے بصیرت' حقائق اور معقولات کا ادراک قوت سے کرتی ہے۔

(تفسیر کبیر' ج ۳ ص ۳۸۴' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۳۹۸ھ)

قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ۶۸۶ھ لکھتے ہیں:

نور سے مراد ہے قرآن جو شک کے اندھیروں کو دور کرتا ہے' اور کتاب مبین سے مراد ہے جس کا اعجاز واضح ہو اور ایک قول یہ ہے کہ نور سے مراد سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔

(علامہ بیضاوی کی پہلی تفسیر زمخشری سے مستفاد ہے' کشاف' ج ۱ ص ۶۱۷)

علامہ شہاب الدین احمد خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس تفسیر کے مطابق نور اور کتاب دونوں سے مراد واحد ہے۔ قرآن مجید کو نور اس لیے فرمایا ہے کہ یہ ہدایت اور یقین کے

طریقوں کوظاہر فرماتا ہے دوسری تفسیر جس کے مطابق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کونور فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے معجزات کے سبب سے ظاہر تھے اور آپ حق کو ظاہر کرنے والے تھے۔ (اور نور وہ ہوتا ہے جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کردے)

(عنایۃ القاضی ج ۳ ص ۲۲۶ مطبوعہ بیروت)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

نور سے مراد نور عظیم ہے جو تمام انوار کا نور ہے اور وہ نبی مختار (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ قتادہ کا یہی مذہب ہے اور یہی زجاج کا مختار ہے۔ ابوعلی جبائی (معتزلی) نے کہا نور سے مراد قرآن ہے۔ کیونکہ وہ ہدایت اور یقین کے طریقوں کو منکشف کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے اور زمخشری نے اسی تفسیر پر اقتصار کیا ہے اور اس صورت میں نور پر کتاب مبین کے عطف پر یہ اعتراض ہوگا کہ عطف تغایر کو چاہتا ہے اور جب دونوں سے مراد قرآن ہے تو تغایر کس طرح ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں عنوان کا تغایر کافی ہے۔

معطوف علیہ میں قرآن کو نور سے تعبیر کیا ہے اور مطوف میں اس کو کتاب مبین سے تعبیر کیا ہے اور عنوان کے تغایر کو تغایر بالذات کے قائم مقام کیا گیا ہے۔ اور میرے نزدیک یہ بعید نہیں ہے کہ نور اور کتاب مبین دونوں سے مراد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں اور یہاں بھی صحت عطف کے لیے عنوان کا تغایر کافی ہوگا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نور اور کتاب مبین دونوں کے اطلاق کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔

(روح المعانی ج ۶ ص ۹۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفی المتوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نور کا اطلاق کیا گیا کیونکہ آپ اندھیروں سے نور کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ نور اور کتاب مبین دونوں سے مراد قرآن ہے۔ یہ دونوں قرآن کے وصف ہیں اور عطف کے لیے لفظی تغایر کافی ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کیا چیز مانع ہے کہ یہ دونوں لفظ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نعت اور صفت ہوں۔ آپ نور عظیم ہیں۔ کیونکہ انوار میں آپ کا کامل ظہور ہے اور آپ کتاب مبین ہیں کیونکہ آپ اسرار کے جامع ہیں اور احکام احوال اور اخبار کے ظاہر کرنے والے ہیں۔

(شرح الشفاء علی ھامش نسیم الریاض ج ۱ ص ۱۱۴ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ لکھتے ہیں:

سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نور فرمایا گیا کیونکہ آپ سے تاریکی کفر دور ہوئی اور راہ حق واضح ہوئی۔

(خزائن العرفان ص ۱۷۶ مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی)

اکثر مفسرین کا مختار یہی ہے کہ اس آیت میں سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نور کا اطلاق کیا گیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد نور ہدایت اور نور معنوی ہے یا اس سے مراد نور حسی ہے۔ جیسے چاند اور سورج کا نور ہے۔ امام ابن جریر علامہ سمرقندی حنفی قاضی بیضاوی شافعی علامہ احمد خفاجی حنفی ملا علی قاری حنفی اور علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کی تفسیروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نور ہدایت ہیں اور علامہ آلوسی اور بعض دیگر علماء کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نور حسی ہیں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نورحسی ہونے پر دلائل:

علامہ ابوعبداللہ محمد بن الفاسی المالکی الشہیر بابن الحاج المتوفی ۷۳۷ھ لکھتے ہیں:

امام ابوعبدالرحمن الصقلی رحمۃ اللہ عنہ نے کتاب الدلالات میں نقل کیا ہے جس کی عبارت یہ ہے اللہ عزوجل نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو اس کو اس امت سے زیادہ محبوب ہو اور نہ اس امت کے نبی سے زیادہ کوئی عزت والا پیدا کیا ہے اور ان کے بعد نبیوں کا مرتبہ ہے' پھر صدیقین کا اور پھر اولیاء کرام کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور پیدا کیا اور وہ نور عرش کے ستون کے سامنے اللہ کی تسبیح اور تقدیس کرتا رہا' پھر سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا اور آدم (علیہ السلام) کے نور سے باقی انبیاء (علیہم السلام) کے نور کو پیدا کیا۔ (یہاں علامہ صقلی کی عبارت ختم ہوئی) اس کے بعد علامہ ابن الحاج لکھتے ہیں' فقیہہ خطیب ابوالربیع نے اپنی کتاب شفاء الصدور میں چند عظیم باتیں لکھی ہیں۔ ان میں سے یہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارکہ کو پیدا کرنا چاہا' تو اللہ سبحانہ نے جبرائیل (علیہ السلام) کو یہ حکم دیا کہ وہ زمین پر جائیں اور زمین کے قلب سے مٹی لے کر آئیں۔ جبرائیل (علیہ السلام) اور جنت کے فرشتے اور رفیق اعلی کے فرشتے گئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مبارک کی جگہ سے سفید نورانی مٹی لائے اس کو جنت کی نہروں کے پانی سے گوندھا گیا' حتی کہ وہ سفید موتی کی طرح ہوگئی۔ اس مٹی کا نور تھا اور اس کی شعاع عظیم تھی۔ حتی کہ فرشتوں نے اس مٹی کے ساتھ عرش' کرسی' آسمانوں' زمینوں' پہاڑوں اور سمندروں کے گرد طواف کیا اور فرشتوں نے اور تمام مخلوق نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی فضیلت کو پہچان لیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو ان کی پشت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مادہ خلقت کی مٹی رکھی۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے اپنی پشت میں پرندوں کی آواز کی مانند اس کی آواز سنی۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے رب! یہ کیسی آواز ہے؟ فرمایا: یہ محمد (علیہ الصلوۃ والسلام) کے نور کی تسبیح ہے' وہ خاتم الانبیاء ہیں' اللہ ان کو تمہاری پشت سے نکالے گا' تم میرے عہد اور میثاق پر قائم رہنا اور ان کو صرف پاکیزہ رحموں میں رکھنا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا میں تیرے عہد اور میثاق پر قائم ہوں اور ان کو صرف پاکیزہ مردوں اور پاکیزہ عورتوں میں رکھوں گا۔ حضرت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور حضرت آدم (علیہ السلام) کی پشت میں چمکتا تھا۔ اور فرشتے ان کے پیچھے کھڑے ہو کر صف باندھے ہوئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور کو دیکھتے تھے اور سبحان اللہ کہتے تھے۔

علامہ ابن الحاج اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس روایت میں یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور کو پیدا کیا اور یہ نور اللہ عزوجل کے سامنے سجدہ کرتا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس نور کے چار حصے کیے۔ پہلے حصہ سے عرش کو پیدا کیا' دوسرے حصہ سے قلم کو پیدا کیا اور تیسرے حصہ سے لوح کو پیدا کیا۔ پھر قلم سے فرمایا: چل لکھ! اس نے کہا اے میرے رب میں کیا لکھوں؟ فرمایا: میں قیامت تک جو کچھ پیدا کرنے والا ہوں' پھر قلم لوح پر چلنے لگا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا' وہ لکھ دیا۔ پھر چوتھا حصہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اس نور کے چار حصے کیے۔ پہلے حصہ سے عقل کو پیدا کیا' دوسرے حصہ سے معرفت کو پیدا کیا اور اس کو لوگوں کے دلوں میں

رکھااور تیسرے حصہ سے سورج اور چاند کے نور کو پیدا کیااور آنکھوں کے نور کو پیدا کیااور چوتھے حصہ کو اللہ تعالیٰ نے عرش کے گرد رکھا' حتیٰ کہ آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا تو یہ نور ان میں رکھا۔ پس عرش کا نور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور قلم کا نور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور لوح کا نور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور دن کا نور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور عقل کا نور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور معرفت کا نور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے اور سورج' چاند اور آنکھوں کا نور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور سے ہے۔ (اس روایت کی عبارت ختم ہوئی)

اس کے بعد علامہ ابن الحاج لکھتے ہیں:

اس معنی میں بکثرت روایات ہیں۔ جو ان پر مطلع ہونا چاہے' وہ ابو الربیع کی کتاب الشفاء کا مطالعہ کرے۔ اسی وجہ سے حضرت آدم (علیہ السلام) نے ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا: اے وہ! جو معنی میرے باپ ہیں اور صورۃ میرے بیٹے ہیں' اور امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کے لیے نبوت کب ثابت ہوئی؟ فرمایا: ابھی آدم روح اور جسد کے درمیان تھے۔

(المدخل' ج ۲ ص ۳۳۔ ۳۰' مطبوعہ دارالفکر' بیروت)

علامہ میر سید شریف جرجانی متوفی ۸۱۲ھ لکھتے ہیں:

حکماء نے کہا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا ہے جیسا کہ صریح حدیث میں وارد ہے۔ بعض علماء نے کہا: اس حدیث اور دوسری دو حدیثوں میں مطابقت ہے۔ وہ حدیثیں یہ ہیں۔ اللہ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا' اور اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا' اور مطابقت اس طرح ہے کہ معلول اول اس لحاظ سے کہ صرف اس کی ذات کا بہ حیثیت مبداء تعقل کیا جائے تو وہ عقل ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ باقی موجودات اور نفوس علوم کے صدور میں واسطہ ہے تو وہ قلم ہے' اور اس لحاظ سے کہ وہ انوار نبوت کے اضاضہ میں واسطہ ہے وہ سید الانبیاء (علیہ الصلوۃ والسلام) کا نور ہے۔

(شرح مواقف' ج ۷' ص ۲۵٤' مطبوعہ ایران' ۱۳۲۵ھ)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۰۰ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام احمد اور امام ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبادہ بن صامت (رض) سے مرفوعا روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا' پھر اس سے فرمایا: لکھ تو اس نے قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے' اس کو لکھ دیا۔ حسن' عطاء اور مجاہد کا یہی مختار ہے اور ابن جریر اور ابن جوزی کا بھی یہی مذہب ہے اور ابن جریر نے محمد بن اسحاق سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے نور اور ظلمت کو پیدا کیا' پھر ان کو ممتاز کیا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور کو پیدا کیا۔ تو ان مختلف روایات میں کس طرح موافقت ہوگی؟ میں کہتا ہوں کہ ان میں موافقت اس طرح ہے کہ ہر چیز کی اولیت اضافی ہے اور ہر چیز اپنے بعد والوں کے اعتبار سے اول ہے۔

(عمدۃ القاری' ج ۱۵' ص ۱۰۹' مطبوعہ بیروت)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب کے لیے اس اعتبار سے رحمت ہیں کہ آپ ممکنات پر ان کی صلاحیت کے اعتبار سے اللہ کے فیضان کا واسطہ ہیں' اسی وجہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور اول المخلوقات ہے' کیونکہ حدیث میں ہے' اے جابر سب سے پہلے اللہ نے تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا۔

(روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۰۵' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

نیز علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ملکی ہے جس سے آپ فیض لیتے ہیں اور ایک حیثیت بشری ہے' جس سے آپ فیض دیتے ہیں اور قرآن مجید آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی روح پر نازل کیا جاتا ہے کیونکہ آپ کی روح صفات ملکیہ کے ساتھ متصف ہے جن کی وجہ سے آپ روح امین سے فیض لیتے ہیں۔

(روح المعانی ج ۱۹ ص ۱۲۱' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی' بیروت)

نواب وحید الزمان (غیر مقلدین کے مشہور عالم) متوفی ۱۳۲۸ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے خلق کی ابتداء نور محمدی سے کی' پھر عرش کو پیدا کیا' پھر پانی کو' پھر ہوا کو' پھر دوات' قلم اور لوح کو پیدا کیا' پھر عقل کو پیدا کیا۔ پس آسمانوں' زمینوں اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے' ان کی پیدائش کا مادہ اولی نور محمد ہے۔ اس کے حاشیہ میں لکھا ہے:

وہ جو حدیث میں وارد ہے کہ سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا' اور سب سے پہلے عقل کو پیدا کیا' اس سے مراد اولیت اضافیہ ہے۔

(ھدیۃ المھدی' ص ۵٦' مطبوعہ سیالکوٹ)

جس حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا' بعض علماء نے کہا اس حدیث میں نور سے مراد روح ہے۔

ملا علی قاری متوفی ۱۰۱٤ھ لکھتے ہیں:

ایک روایت میں ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا اور ایک روایت میں ہے سب سے پہلے میری روح کو پیدا کیا' ان دونوں روایتوں سے مراد واحد ہے' کیونکہ ارواح روحانی ہوتی ہیں۔

(مرقاۃ المفاتیح' ج ۱' ص ١٦٧' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان' ۱۳۹۰ھ)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور ہدایت ہونے پر دلائل:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نور حسی ہونے کے متعلق علماء کے یہ نظریات ہیں' جن کو ہم نے اختصار کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔ البتہ ظاہر قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) انسان اور بشر ہیں' لیکن آپ انسان کامل اور افضل البشر ہیں۔ اور نبی انسان اور بشر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہماری جنس سے مبعوث کیا ہے اور اسی کو ہمارے لیے وجہ احسان قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(آیت) "لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم"۔ (آل عمران: ١٦٤)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر یہ احسان ہے کہ اس نے ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔

یہ کتنی عجیب بات ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرمائے کہ ہمارا تم پر یہ احسان ہے کہ ہم نے رسول کو تم میں سے بھیجا اور ہم یہ کہیں کہ نہیں

رسول ہماری جنس سے نہیں ہیں، ان کی حقیقت کچھ اور ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہم میں سے ہونا ہمارے لیے اس وجہ سے احسان ہے، تاکہ آپ کے افعال اور آپ کی عبادات ہمارے لیے نمونہ اور حجت ہوں، ورنہ اگر آپ کسی اور جنس سے مبعوث ہوتے تو کوئی کہنے کہہ سکتا تھا کہ آپ کے افعال اور آپ کی عبادات ہم پر حجت نہیں ہیں، کیونکہ آپ کی حقیقت اور ہے اور ہماری حقیقت اور ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ یہ افعال اور عبادات کر سکتے ہوں اور ہم نہ کرسکیں۔

(آیت) "لقد جآء کم رسول من انفسکم (التوبہ: ۱۲۸)

ترجمہ: بیشک تمہارے پاس تم میں سے ایک رسول آئے۔

(آیت) "وما ارسلنا قبلك الا رجالا نوحی الیهم"۔ (الانبیاء: ۷)

ترجمہ: ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف مردوں ہی کو رسول بنایا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔

کفار یہ کہتے تھے کہ کسی فرشتہ کو رسول کیوں نہیں بنایا؟ اللہ تعالیٰ اس کے رد میں فرماتا ہے:

(آیت) "ولو جعلنه ملکا لجعلنه رجلا وللبسنا علیهم ما یلبسون"۔ (الانعام: ۹)

ترجمہ: اور اگر ہم رسول کو فرشتہ بناتے تو اسے مرد (ہی کی صورت میں) بناتے اور ان پر وہی شبہ ڈال دیتے جو شبہ وہ (اب) کررہے ہیں۔

ان تمام آیات میں تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بشر، انسان اور مرد ہیں لیکن آپ افضل البشر، انسان کامل اور سب سے اعلیٰ مرد ہیں، اور اگر نور سے مراد نور ہدایت لیا جائے تو ان آیتوں میں کوئی تعارض اور تضاد نہیں ہے اور اکثر مفسرین نے نور ہدایت ہی مراد لیا ہے۔ اور اگر آپ کو چاند اور سورج کی طرح نور حسی مانا جائے اور یہ کہا جائے کہ آپ کی حقیقت نور حسی ہے، تو قرآن مجید کی ان صریح آیات کو ان اقوال کے تابع کرنا لازم آئے گا اور کیا قرآن مجید کی ان نصوص صریحہ کے مقابلہ میں ان اقوال کو عقیدہ کی اساس بنانا صحیح ہوگا؟ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بشریت اور نورانیت میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیونکہ حضرت جبرائیل حضرت مریم کے پاس بشری شکل میں آئے تھے، لیکن اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا فرشتے اور حضرت جبرائیل چاند اور سورج کی طرح نور حسی ہیں؟ کیا رات کے وقت ہمارے ساتھ منکر نکیر نہیں ہوتے؟ پھر کیا ان کے ساتھ ہونے سے اندھیرا دور ہوجاتا ہے؟ کیا جب رات کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حضرت جبرائیل (علیہ السلام) آتے تھے تو روشنی ہوجاتی تھی، فرشتے نور سے بنائے گئے ہیں، اللہ ہی جانتا ہے وہ کس قسم کے نور سے بنائے گئے؟ لیکن یہ بہرحال مشاہدہ سے ثابت ہے کہ وہ چاند اور سورج کی طرح نور حسی نہیں ہیں کیونکہ دنیا میں ہر جگہ، ہر وقت فرشتے موجود ہوتے ہیں، اس کے باوجود دنیا میں رات کو اندھیرا بھی ہوتا ہے۔

البتہ! معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نور حسی سے بھی وافر حصہ عنایت فرمایا تھا۔

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ لوگوں میں سب سے زیادہ حسین اور رنگ سب سے زیادہ روشن تھا۔ جو شخص بھی آپ کے چہرہ مبارک کے جمال کو بیان کرتا، اس کو چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ دیتا، اور کہتا کہ آپ ہماری نظر میں چاند سے زیادہ حسین ہیں۔ آپ کا رنگ چمکدار اور چہرہ منور تھا اور چاند کی طرح چمکتا تھا۔

(دلائل النبوۃ، ج ۱، ص ۳۰۰، مطبوعہ بیروت، خصائص کبریٰ، ج ۱، ص ۶۷، مطبوعہ لائل پور)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کے دو دانتوں میں جھری (خلاء) تھی۔ جب آپ گفتگو فرماتے تو آپ کے سامنے کے دانتوں سے نور کی طرح نکلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

(شمائل محمدیہ، رقم الحدیث: ۱۵، المعجم الکبیر، ج ۱۱، رقم الحدیث: ۱۲۱۸۱، المعجم الاوسط، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۷۱، دلائل النبوۃ للبیہقی، ج ۱، ص ۲۱۵، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۲۷۹، سنن دارمی، ج ۱، رقم الحدیث: ۵۸)

امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی متوفی ۲۵۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے زیادہ کسی شخص کو سخی دیکھا، نہ بہادر، نہ روشن چہرے والا۔

(سنن دارمی، ج ۱، رقم الحدیث: ۵۹، حجۃ اللہ علی العالمین، ص ۶۸۹)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن سمرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایک چاندنی رات میں دیکھا، میں کبھی آپ کی طرف دیکھتا اور کبھی چاند کی طرف۔ بخدا! آپ میرے نزدیک چاند سے زیادہ حسین تھے۔

(شمائل محمدیہ، رقم الحدیث: ۱۰، سنن دارمی، ج ۱، رقم الحدیث: ۵۷، المعجم الکبیر، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۸۴۲، المستدرک، ج ۴، ص ۱۸۶، حاکم اور ذہبی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے)

امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی متوفی ۲۵۵ھ روایت کرتے ہیں:

ابوعبیدہ بن محمد بن عمار یاسر نے ربیع بنت معوذ بن عفراء سے کہا: ہمارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفت بیان کیجئے۔ انھوں نے کہا اے میرے بیٹے اگر تم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھتے تو تم طلوع ہونے والے آفتاب کو دیکھتے۔

(سنن دارمی، ج ۱، رقم الحدیث: ۶۰، المعجم الکبیر، ج ۲۴، رقم الحدیث: ۶۹۶، حافظ الہیثمی نے کہا ہے کہ اس حدیث کے رجال کی توثیق کی گئی ہے۔ مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۲۸۰)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حسن و جمال اور آپ کے حسی نورانیت سے متعلق ہم نے یہ احادیث تلاش کر کے نقل کی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) چاند اور سورج سے زیادہ حسین تھے۔ آپ کا چہرہ بہت منور اور روشن تھا اور آپ کے دانتوں کی جھری میں نور کی مانند کوئی چیز نکلتی تھی، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کا خمیر مٹی سے بنایا گیا تھا اور آپ انسان اور بشر تھے، لیکن آپ انسان کامل اور سید البشر ہیں۔

امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

خطیب نے کتاب المتفق والمفترق میں عبداللہ بن مسعود (رض) سے روایت کی کہ حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر بچہ کے ناف میں اس مٹی کا حصہ ہوتا ہے جس سے وہ بنایا گیا، یہاں تک کہ اسی میں دفن کیا جائے اور میں اور ابوبکر و عمر ایک مٹی سے بنے، اسی میں دفن ہوں گے۔

(فتاویٰ افریقیہ، ص ۱۰۰۔۹۹، مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی)

نیز امام احمد رضا قادری متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

اور جو مطلقاً حضور سے بشریت کی نفی کرے، وہ کافر ہے۔

قال تعالیٰ: (آیت) "قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا"۔

(فتاوی رضویہ ج ٦ ص ٦٧، مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی)

اور صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ١٣٦٧ھ نے آپ کے نور ہدایت ہونے کی تصریح کی ہے۔ زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

سید عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نور فرمایا گیا، کیونکہ آپ سے تاریکی کفر دور ہوئی اور راہ حق واضح ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ انسان کامل اور سید البشر ہیں، کائنات میں سب سے زیادہ حسین ہیں۔

قسم کا کفّارہ

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٨٩﴾

اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں لغو قسم پر تم سے مواخذہ نہیں فرماتا لیکن مواخذہ اس پر فرماتا ہے کہ تم جن قسموں کو مضبوط کر دو (١) اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے اوسط درجے کا جو اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو (٢) یا ان کو کپڑے دینا (٣) یا ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرانا (٤) اور جس کو مقدور نہ ہو تو تین دن روزے ہیں (٥) یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب کہ تم قسم کھالو اور اپنی قسموں کا خیال رکھو! اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے احکام بیان فرماتا ہے تا کہ تم شکر کرو۔

(واذا سمعوا: سورۃ المآئدہ: آیت 89 تفسیر احکام القرآن للجصاص)

قسم کا کفارہ کتنا ہے؟:

قول باری ہے (اطعام عشرۃ مساکین ہیں مسکینوں کو کھانا کھلانا) حضرت علی، حضرت عمر، حضرت عائشہ، سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، مجاہد اور حسن کا قول ہے کہ قسم کے کفارہ میں ہر مسکین کو نصف صاع تقریباً دو سیر گندم دی جائے گی۔

حضرت عمر اور حضرت عائشہ کا قول ہے یا ایک صاع کھجور دیا جائے گا۔ ہمارے اصحاب کا بھی یہی قول ہے جب قسم کھانے والا ان مسکینوں کو طعام کا مالک بنا دے۔

حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، عطاء بن ابی رباح اور دوسرے حضرات کا قول ہے کہ یہ مسکین کو ایک مد ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل عراق کے نزدیک دو رطل یعنی اسی تولے اور اہل حجاز کے نزدیک پونے دو رطل ہے) گندم دی جائے گی۔ امام مالک اور امام شافعی کا یہی قول ہے۔

تملیک کئے بغیر کھانا کھلانے کے مسئلے میں اختلاف رائے ہے۔ حضرت علی، محمد بن کعب، قاسم، سالم، شعبی، ابراہیم نخعی اور قتادہ سے مروی ہے کہ ان مسکینوں کو صبح اور شام کا کھانا دیا جائے گا۔

ہمارے اصحاب کا یہی قول ہے۔ نیز امام مالک، سفیان ثوری اور اوزاعی کا بھی یہی قول ہے حسن بصری کا قول ہے کہ صرف ایک وقت کھلایا جائے گا اور یہی کافی ہوگا۔ حکم کا قول ہے کہ جب تک طعام مسکینوں کے حوالے نہیں کر دیا جائے گا کھانا کھلانا یعنی اطعام درست نہیں ہوگا۔

سعید بن جبیر کا قول ہے کہ دو مد تو طعام کے لیے دیئے جائیں گے اور ایک مد سالن کے لیے دیا جائے گا۔ ان مسکینوں کو اکٹھا کر کے کھانا کھلایا نہیں جائے گا بلکہ کفارہ ادا کرنے والا انھیں یہ طعام حوالے کر دے گا۔

ابن سیرین، جابر بن زید، مکحول، طاؤس اور شعبی سے مروی ہے کہ انھیں ایک ہی دفعہ بٹھا کر کھلا دیا جائے گا۔ حضرت انس سے بھی اسی قسم کی روایت ہے۔ امام شافعی کا قول ہے کہ انھیں طعام مشترکہ طور پر نہیں دے گا بلکہ ہر مسکین کو ایک مد کی مقدار طعام دے گا۔

ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ قول باری ہے (فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو) ظاہر آیت مسکینوں کو طعام دیے بغیر اکل کی صورت میں اطعام کے جواز کا مقتضی ہے۔

آپ اس قول باری کو نہیں دیکھتے (ویطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین کو کھانا کھلاتے ہیں) اس سے یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے کھانا مسکینوں کی ملکیت میں دیئے بغیر ان کے سامنے رکھ دیا جائے اور اس طرح انھیں کھلا دیا جائے۔ جب یہ فقرہ کہا جائے گا کہ "فلاں یطعم انطعام (فلاں شخص کھانا کھلاتا ہے) اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ فلاں شخص لوگوں کو کھانے پر بلاتا ہے۔

جب اطعام کا اسم اباحت کے مفہوم کو شامل ہے تو اس کا جواز واجب ہو گیا اور جب ملکیت میں دیئے بغیر اباحت کے طور پر اطعام جائز ہو گیا تو پھر ملکیت میں دے دینا بڑھ کر جائز ہوگا۔ اس لیے کہ تملیک اباحت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ تملیک کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

ہمارے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ انھیں صبح و شام دو وقت کا کھانا دیا جائے گا اس کی وجہ یہ قول باری ہے:

(من اوسط ما تطعمون اھلیکم)

اوسط کھانا وہ ہوتا ہے جو صبح و شام دو وقت کھایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ دن رات چوبیس گھنٹوں میں زیادہ سے زیادہ تین دفعہ کھانا کھایا جاتا ہے، کم سے کم ایک دفعہ اور اوسطاً دو مرتبہ لوگوں کی عام عادت اسی طرح ہے۔

لیث بن سعد نے ابن بریدہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (اذا کان خبزا یابساً فھو غداء لا و عشاؤہ اگر خشک روٹی ہو تو یہی اس کے صبح و شام کا کھانا ہے۔)

ہمارے اصحاب کا یہ قول ہے کہ اگر کفارہ ادا کرنے والا انھیں کھانا دینا چاہے تو نصف صاع گندم اور ایک صاع جو یا کھجور دے گا۔اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت کعب بن عجرہ کی روایت ہے جس کا تعلق سر کی تکلیف کے فدیہ سے ہے۔

آپ نے فرمایا (ادا طعم ثلاثہ آصع من طعام ستۃ مساکین یا تین صاع طعام چھ مسکینوں کو کھلاو ہ) ایک اور حدیث میں ہے (اطعم ستۃ آصع من تمر ستۃ مساکین چھ صاع کھجور چھ مسکینوں کو کھلادو)

آپ نے ہر مسکین کے لیے ایک صاع کھجور یا نصف صاع گندم مقرر کردی اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ قسم کا کفارہ بھی اسی طرح ہے۔اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سر کی تکلیف کے فدیہ میں اور قسم کے کفارہ میں طعام کی مقدار کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں کیا۔آپ سے ظہار کے کفارہ کے سلسلے میں مروی ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دیا جائے گا۔وسق کی مقدار ساٹھ صاعب کے برابر ہوتی ہے۔جب ظہار کے کفارے میں ہر مسکین کے لیے ایک صاع کھجور کا ثبوت ہوگیا تو قسم کا کفارہ بھی اسی طرح ہوگا۔اس لیے کہ ان دونوں کے اندر واجب ہونے والے طعام کے مقدار کی یکسانیت پر سب کا اتفاق ہے۔

جب ایک صاع کھجور کا ثبوت ہوگیا تو گندم میں نصف صاع کا وجوب ہوگیا اس لیے کہ جن حضرات نے اس میں ایک صاع کھجور واجب کیا ہے انھوں نے نصف صاع گندم واجب کی ہے۔

قول باری ہے:

(من اوسط ما تطعمون اھلیکم)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اہل مدینہ کے لیے خوراک کی جو مقدار ہوتی تھی اس میں بالغ اور آزاد کا حصہ نابالغ اور غلام کی بہ نسبت زیادہ ہوتا تھا۔

پھر یہ آیت نازل ہوئی:

(من اوسط ما تطعمون اھلیکم)

یعنی اوسط درجے کا کھانا۔نہ زیادہ بڑھیا اور نہ زیادہ گھٹیا،سعید بن جبیر سے بھی اسی قسم کی روایت ہے۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے بیان کردیا کہ اوسط سے مراد یہ ہے کہ اوسط مقدار ہو،یہ مراد نہیں کہ سالن کے ساتھ ہو۔حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ "اوسط طعام روٹی اور کھجور ہے۔نیز روٹی اور زیتون کا تیل ہے۔ہم اپنے بال بچوں کو جو بہترین کھانا کھلاتے ہیں وہ گوشت اور روٹی ہے۔"

عبیدہ سے مروی ہے کہ اوسط طعام روٹی اور گھی ہے۔ابو رزین نے کہا ہے اوسط طعام روٹی،کھجور اور سرکہ ہے۔ابن سیرین کا قول ہے کہ سب سے عمدہ کھانا گوشت روٹی ہے اوسط کھانا گھی روٹی ہے اور احسن کھانا کھجور اور روٹی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی اسی قسم کی روایت ہے۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلمہ بن صخر کو ظہار کے کفارہ میں ہر مسکین کو ایک صاع کھجور دینے کا حکم دیا تھا اور اس کے ساتھ سالن کے طور پر کوئی اور چیز دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔نیز آپ نے حضرت کعب بن عجرہ کو تین صاع طعام چھ مسکینوں پر صدقہ کو دینے کا حکم دیا تھا اس کے ساتھ سالن کے طور پر کچھ دینے کا حکم نہیں دیا تھا۔

کسی اہل علم کے نزدیک ظہار کے کفارہ اور قسم کے کفارہ کے درمیان طعام کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ طعام کے ساتھ اوام یعنی سالن واجب نہیں ہے۔ نیز یہ کہ آیت میں مذکورہ اوسط سے اسوط مقدار مراد ہے اس کے ساتھ اوام ملانا مراد نہیں ہے۔

قول باری افکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین) ان سب کے لیے عموم ہے جن پر مسکین کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔اس لیے ایک مسکین کو سارا کھانا دینے کے جواز پر اس سے استدلال کرنا درست ہے۔

یعنی سارا کھانا ایک مسکین کو دس دنوں میں نصف صاع یومیہ کے حساب سے دے دینا جائز ہے۔اس لیے کہ اگر ہم اسے دوسرے دن کھانا نہ دیں تو ہم اسم کے بعض مدلول کے اندر حکم کی تخصیص کر دیں گے اور بعض کو چھوڑ دیں گے۔

خاص طور پر ان مدلول کے اندر جو بالا تفاق آیت کے حکم میں داخل ہیں۔امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے کہ ایک مسکین کو دس دنوں میں نصف صاع یومیہ کے حساب سے سارا اطعام دے دینا قسم کے کفارہ کی ادائیگی کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دس مسکینوں کا ذکر فرمادیا تو اب ان سے کم پر اقتصار کرنا جائز نہیں ہے۔جس طرح یہ قول باری ہے (فاجلدوھم ثمانین جلدۃ انھیں اسی کوڑے لگاؤ یا یہ قول باری ہے (اربعۃ اشھر وعشرا چار مہینے دس دن)

جن اعداد کا ذکر کیا گیا ہے ان سے کم پر اقتصار کرنا جائز نہیں ہے۔اس لیے زیر بحث مسئلے، میں بھی دس مسکینوں سے کم پر اقتصار کرنا جائز نہیں ہوگا۔اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ چونکہ اطعام کا مقصد مساکین کی بھوک دور کرنا ہے اس لیے اس میں ایک مسکین اور مسکینوں کے ایک گروہ کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

جب کہ ان سب کے لیے ایک دن میں اطعام کے عمل کی تکرار ہو جانے یا صرف ایک کے لیے دس دنوں کے اندر اس عمل کو دہرایا جائے۔ یہ دونوں صورتیں اس مقصد کے مطابق ہیں، اس طرح دس مسکینوں کو اطعام کا جو معنی مقصود سے وہ ایک مسکین کو دس دنوں کے اندر اس عمل کے تکرار میں موجود ہے۔

اس میں کوئی امتناع نہیں ہے کہ اس عمل کی تکرار کی صورت میں ایک مسکین پر دس مسکینوں کے اطعام کا اطلاق کر دیا جائے۔اس لیے کہ مقصد تو اس عمل کی تکرار ہے نہ کہ مساکین کی تکرار۔

جس طرح یہ قول باری ہے (یسئلونك عن الاھلة آپ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کے متعلق پوچھتے ہیں) چاند تو ایک ہلال ہوتا ہے لیکن چونکہ ہر ماہ اس کی رویت میں تکرار ہوتی ہے اس لیے اس پر جمع کے اسم کا اطلاق ہوگیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استنجا میں تین ڈھیلے استعمال کرنے کا حکم دیا لیکن اگر کوئی شخص صرف ایک تکونی ڈھیلے سے استنجا کرلے تو یہ اس کے لیے کافی ہوگا۔ یا جس طرح آپ نے سات کنکروں کے ساتھ رمی جمار کا حکم دیا لیکن اگر کوئی شخص ایک ہی کنکر کو سات دفعہ رمی کے لیے استعمال کرے تو بھی اس کے لیے یہ کافی ہوگا اس لیے کہ رمی جمار میں سات دفعہ کنکر مارنا مقصد ہوتا ہے۔

اسی طرح اسنجا میں مقعد کو تین دفعہ ڈھیلا لگانا مقصد ہوتا ہے۔ڈھیلوں کی تعداد مقصد نہیں ہوتا۔ٹھیک اسی طرح جب کفارہ دینے کا مقصد مساکین کی بھوک دور کرنا ہے تو پھر ایک مسکین کو دس دن کھلانے اور دس مسکینوں کو ایک دن کھلانے کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔

اس پر یہ قول باری بھی دلالت کرتا ہے (**او کسوتھم** یا انھیں کپڑے پہنائے) یہاں یہ تو واضح ہے کہ مراد ان دس مسکینوں کو دس کپڑے پہنانا ہے اس طرح عبارت کی ترتیب کچھ اس طرح ہوگئی۔"اوعشرۃ اثواب" (یا دس کپڑے) کپڑے پہنانے میں ایک یا دس مساکین کی کوئی تخصیص نہیں کی اس سے یہ ضروری ہوگیا کہ اگر ایک مسکین کو دس جوڑے دے دیئے جائیں تو وہ کفارہ کے لیے کفایت کر جائے گا۔

آپ نہیں دیکھتے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "میں نے دس مسکینوں کے جوڑے ایک مسکین کو دے دیئے۔" تو اس کا یہ قول درست ہوگا۔اس طرح قول باری (اوکسوتھم) اس جہت سے اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حکم مسکینوں کی دس کی تعداد میں منحصر نہیں ہے۔

اس پر اس جہت سے بھی دلالت ہو رہی ہے جس میں جہت سے اطعام کے ذکر میں دلالت ہوتی ہے جس کا ہم نے درج بالا سطور میں ذکر کر دیا ہے۔

ہمارے اصحاب کے نزدیک ایک مسکین کو جوڑے دینے کی صورت اس وقت جائز ہوگی جب اسے دس دنوں کے اندر ہر روز ایک جوڑا دے دیا جائے اس لیے کہ کھانا کھلانے میں ایک مسکین کو دس دن کھلانے کا ہمارے بیان کی روشنی میں جب ثبوت ہوگیا تو پھر کپڑا پہنانے میں بھی یہ طریقہ واجب ہوگیا اس لیے کہ کسی نے کھانا کھلانے اور کپڑا پہنانے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

ہمارے اصحاب نے طعام اور کپڑوں کی بجائے ان کی قیمت کی ادائیگی کو بھی جائز قرار دیا ہے اس لیے کہ اس بات کا ثبوت ہوگیا کہ کفارہ میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ مساکین کو مال کی اس مقدار سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے جو انھیں وصول ہوئی ہے۔

یہی فائدہ انھیں قیمت کے طور پر نقد رقم حاصل ہونے کی صورت میں بھی ملتا ہے جس طرح طعام اور کپڑے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔نیز جب روایات اور قیاس ونظر کی رو سے زکوۃ کے اندر قیمت کی ادائیگی درست ہوتی ہے تو پھر کفارہ کی صورت میں بھی ایسا ہونا واجب ہوگیا۔اس لیے کہ کسی نے بھی ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔

علاوہ ازیں اگر کوئی شخص کسی کو رقم دے کر طعام اور کپڑے وغیرہ خریدنے کے لیے کہتا ہے تو اس کے متعلق یہ اطلاق ممتنع نہیں ہوتا کہ "اس نے فلاں کو کھانا کھلایا اور کپڑا پہنایا ہے۔" جب اس اطلاق کی گنجائش نکل آئی تو پھر آیت کے الفاظ اس صورت یعنی نقدی کی صورت میں کفارہ کی ادائیگی پر بھی مشتمل ہوگی۔

آپ نہیں دیکھتے کہ اطعام کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص کسی کو اس طرح کھلائے کہ کھانا اس کے لیے مباح کر دے یعنی اس کے سامنے لا کر رکھ دے اور پھر وہ اس میں سے جتنا چاہے کھالے۔

اس کے ساتھ اگر وہ اس کھانے کو مسکین کی مالیت میں دے دیتا اور مسکین اسے کھائے بغیر فروخت کر کے نقد رقم حاصل کر لیتا تو بھی کفارہ ادا ہو جاتا اگر چہ لفظ کے حقیقی معنی اس صورت کو شامل نہیں ہیں لیکن چونکہ اس مقدار میں مال اس تک پہنچانے کا مقصد حاصل ہوگیا اس لیے یہ صورت درست ہوگئی اگر چہ اس نے اسے کھایا نہیں اور کھانے کے طور پر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

اسی طرح اگر کفارہ ادا کرنے والا مسکین کو جوڑا دے دیتا لیکن مسکین اسے پہنے بغیر فروخت کر دیتا اور اس کی قیمت اپنے استعمال میں لے آتا تو اس کا کفارہ ادا ہو جاتا اگر چہ اس پورے عمل میں اس نے مسکین کو جوڑا نہیں پہنایا صرف اسے جوڑا دیا ہے۔

لیکن جواز کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اسے جوڑا دے کر مال کی یہ مقدار اس تک پہنچا دی ہے اس بنا پر وہ اسے کپڑا پہنانے

والا قرار پایا۔اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کفارے میں کھانے اور کپڑے کا حصول مقصد نہیں ہے بلکہ مال کی اس مقدار کا مسکین تک پہنچ جانا مقصد ہے اس مقصد کے حصول کے لیے جنس اور نقد کی صورتوں میں حکم کے اندر کوئی فرق نہیں ہوگا یعنی مسکین کو خواہ طعام یا کپڑا دے دیا جائے یا ان کی قیمت دونوں صورتوں میں مقصد حاصل ہو جائے گا۔

آپ نہیں دیکھتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ فطر میں نصف صاع گندم یا ایک صاع جو یا کھجور کی مقدار مقرر کر کے فرمایا (اغنوهم عن المسئلة فی هذا الیوم آج کے دن انھیں دست سوال دراز کرنے سے مستغنی کردو)

آپ نے بتادیا کہ صدقہ فطر میں مقصد یہ ہے کہ مساکین سوال کرنے سے مستغنی ہو جائیں بعینہ طعام مقصد نہیں۔ یہ مقصد جس طرح طعام کے ذریعے حاصل ہو جاتا ہے اسی طرح اس کے قیمت کے ذریعے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر قیمت جائز ہوتی اور مقصد یہ ہوتا کہ مال کی یہ مقدار مساکین تک پہنچ جائے تو پھر اطعام اور کسوہ کے ذکر کا کوئی فائدہ نہ ہوتا جبکہ اکثر احوال میں ان کی قیمتوں میں تفاوت ہوتا رہتا ہے۔

آیت میں کھانے اور کپڑے کے ذکر کے اندر یہ دلالت موجود ہے کہ انھیں چھوڑ کر ان کی قیمتوں کی ادائیگی جائز نہیں ہے نیز یہ کہ عین طعام اور کسوہ کی بجائے مال کی اس مقدار سے فائدہ اٹھانا مقصد نہیں ہے اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ معترض کی یہ سوچ درست نہیں ہے۔اور بات اس طرح نہیں ہے جس طرح اس نے سوچا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے طعام اور کسوہ کا ذکر فرمایا ہے۔اس کے بڑے فائدے ہیں۔وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باتوں کا ذکر فرما دیا اور اس ذکر سے ہمارے لیے یہ دلالت مہیا کر دی کہ ان دونوں کی بجائے ان کی قیمت دے دینا بھی جائز ہے تا کہ کفارہ ادا کرنے والے کو یہ اختیار مل جائے کہ چاہے تو گندم دے دے یا کھانا کھلا دے یا کپڑا پہنا دے یا چاہے تو گندم اور کپڑوں کی بجائے ان کی قیمت ادا کر دے۔

اس صورت میں قیمتوں کے تفاوت کے وقت اس کے لیے گنجائش ہوگی کہ ارفع کو چھوڑ کر ادنیٰ یا ادنیٰ کو چھوڑ کر ارفع کو بطور کفارہ ادا کر دے۔ یا ان دونوں مذکورہ اشیاء میں سے بعینیہ جو چیز چاہے دے دے۔

جس طرح حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: "جس شخص کے اونٹوں کی زکوۃ میں بنت لبون (دو سال پورا کر کے تیسرے سال میں پہنچ جانے والی مادہ بچی) واجب ہوگئی ہو اور اسے بنت لبون نہ ملے تو پھر ایک بنت مخاض (ایک سال پورا کر کے دوسرے سال میں پہنچ جانے والی مادہ بچی) لے لی جائے گی اور اس کے ساتھ دو بکریاں اور بیس درہم بھی وصول کئے جائیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زکوۃ ادا کرنے والے کو یہ اختیار دے دیا جبکہ اسے یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ مذکورہ فرض کی ادائیگی ایک بنت لبون خرید کر، کر سکتا تھا یا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیت میں سو اونٹ مقرر کر دیے۔امت کا اس پر اتفاق ہے کہ دیت اگر درہم اور دینار کی شکل میں ادا کی جائے گی تو وہ سو اونٹوں کی قیمتوں کے برابر ہوگی۔

اگر چہ قیمتوں کی تعیین میں اختلاف رائے ہے یا جس طرح یہ صورت ہے کہ کوئی شخص مہر میں اوسط درجے کا غلام دینا قبول کرے لے اگر وہ اوسط درجے کا غلام لے آئے گا تو اسے قبول کر لیا جائے گا اور اگر اس کی قیمت لے آئے گا تو قیمت بھی قبول کر لی جائے گی۔ان صورتوں میں قیمت لے لینے کے جواز نے مذکورہ چیزوں کی تعیین کو باطل نہیں کیا۔

یہی بات اس مسئلے میں بھی ہے جو ہمارے زیر بحث ہے۔ آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کفارہ ادا کرنے والے کو کھانا کھلانے، کپڑا پہنانے اور غلام آزاد کرنے کے درمیان اختیار دے دیا گیا ہے۔ اب قیمت بھی ان اشیاء میں سے ایک شے کی طرح ہے اس لیے اسے ان اشیاء اور قیمت کے درمیان اختیار مل جائے گا۔

اگرچہ طعام اور کسوہ کی قیمتوں میں فرق ہوتا رہتا ہے اس لیے کہ جب وہ ارفع چیز کفارہ کے طور پر ادا کرے گا تو اس میں زیادہ فضیلت حاصل ہوگی اور اگر ادنیٰ پر اقتصار کرے گا تو اس کی اسے اجازت ہوگی۔ ان میں سے جو بھی وہ کرے گا وہی فرض ہوگا اور اس کی انجام دہی پر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا۔

اس کی مثال یہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ نماز کے اندر فرض قرأت کی مقدار ایک آیت ہے لیکن اگر اس نے قرأت طویل کر دی تو پوری قرأت فرض میں شمار ہوگی۔

اسی طرح رکوع میں فرض وہ مقدار ہے جس کی بنا پر ایک شخص راکع کہلا سکتا ہو۔ اگر اس نے رکوع میں طوالت اختیار کر لی تو پورے رکوع کا شمار فرض کے اندر ہوگا۔ آپ نہیں دیکھتے کہ اگر امام رکوع طویل کر دے اور مقتدی آخر رکوع میں آ کر شامل ہو جائے تو اس صورت میں مقتدی کو وہ رکعت مل جائے گی۔

اسی طرح اس میں کوئی امتناع نہیں کہ کفارہ میں اس چیز کی قیمت کو فرض تسلیم کر لیا جائے جو طعام یا کپڑے کی قیمتوں میں سے کم ہو لیکن اگر وہ ارفع چیز کی قیمت ادا کرے گا تو یہی قیمت فرض شمار ہوگی۔

کپڑے کی مقدار میں فقہاء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ فرض کے کفارہ میں ہر مسکین کو ایک کپڑا دیا جائے گا خواہ وہ ازار ہو یا چادر یا قمیص ہو یا قبا یات چادر، ابن سماء نے امام محمد سے روایت کی ہے کہ اگر شلوار دے دے گا تو بھی کافی ہے۔ اسے یہ بھی روایت ہے کہ اگر کسی نے کپڑا نہ خریدنے کی قسم کھائی ہو تو اگر وہ مردانہ شلوار خرید ے گا تو حانث ہو جائے گا۔

ہشام نے امام مالک سے روایت کی ہے شلوار یا عمامہ دینا کفارہ کے لیے کافی نہیں ہوگا۔ بشر نے امام ابو یوسف سے یہی روایت کی ہے۔ امام مالک اور لیث بن سعد کا قول ہے کہ اگر مرد مسکین کو کپڑا پہنائے گا تو ایک کپڑا دے گا اور اگر عورت کو پہنائے گا تو دو کپڑے دے گا ایک قمیص اور دوسری اوڑھنی۔ اس لیے کہ نماز کے جواز کے لیے یہی کم سے کم لباس ہے۔ عورت کو صرف ایک کپڑا دینا کافی نہیں ہوگا۔ اسی طرح صرف عمامہ دینا کافی نہیں ہوگا۔

سفیان ثوری کا قول ہے کہ عمامہ بھی کافی ہوگا۔ امام شافعی کا قول ہے کہ عمامہ، شلوار اور سر پر ڈالنے کی اوڑھنی بھی کافی ہوگی۔ ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ حضرت عمران بن حصین، ابراہیم نخعی، حسن، مجاہد، طاؤس اور زہری سے مروی ہے کہ ہر مسکین کو ایک کپڑا دیا جائے گا۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ ظاہر روایت اس بات کی مقتضی ہے کہ کپڑا ایسا ہونا چاہیے کہ جب اسے کوئی شخص پہن لے تو وہ لباس میں ملبوس کہلا سکے۔ اس لیے کہ ایک شخص جس نے صرف شلوار پہن رکھی ہو اور اس کے جسم پر کوئی اور کپڑا نہ ہو یا صرف عمامہ باندھ رکھا ہو تو اسے لباس میں ملبوس نہیں کہا جا سکتا جس طرح صرف ٹوپی پہننے والے کو یہ نام نہیں دیا جا سکتا۔

اس لیے یہ واجب ہو گیا کہ صرف شلوار یا عمامہ یا اوڑھنی کافی نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں پہننے کے باوجود ایک شخص برہنہ ہی شمار

ہو گا۔کپڑے میں ملبوس شمار نہیں ہو گا۔لہٰذا ازار اور قمیص میں سے ہر ایک پورے جسم پر آجاتی ہے اور ایسا انسان لباس میں ملبوس کہلا سکتا ہے اس لیے کفارہ میں یہ کافی ہوتی ہے۔

قول باری ہے (اوتحریر رقبۃ یا ایک غلام آزاد کرنا) یعنی عتق رقبہ تحریر رقبہ کا مفہوم ہے کہ اس پر آزادی واقع کر دے۔رقبہ یعنی گردن کا ذکر کر کے اس سے غلام کا پورا سراپا مراد لیا ہے۔اسے قیدی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس کی گردن میں بندھی ہوئی رسی کو کھول کر اسے آزاد کر دیا جاتا ہے۔اس طرح رقبہ پورے شخص سے عبارت ہے۔

ہمارے اصحاب کا بھی یہی قول ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے غلام سے کہے "تیری گردن آزاد ہے۔" تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا۔ جس طرح "انت حر" (تو آزاد ہے) کہنے پر وہ آزاد ہو جاتا ہے۔رقبہ کا لفظ اس بات کا مقتضی ہے کہ آزاد کیا جانے والا غلام جسمانی نقائص اور بیماریوں سے محفوظ ہو۔اس لیے کہ یہ لفظ پورے اعضا والے انسان کے لیے اسم ہے تاہم فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ معمولی قسم کا جسمانی نقص اس کے جواز میں مانع نہیں ہے۔

ہمارے اصحاب نے اس سلسلے میں یہ معیار مقرر کیا ہے کہ اگر کسی عضو میں نقص ہو تو نقص اس درجے کا نہ ہو کہ اس عضو کی منفعت ہی ختم ہو گئی ہو اور عضو بے کار ہو چکا ہو۔اگر اس کی منفعت باقی ہو تو اس صورت میں کفارہ کے اندر ایسے غلام کو آزاد کرنا جائز ہو گا۔اگر منفعت ختم ہو چکی ہو تو ہمارے اصحاب کے نزدیک ایسا غلام آزاد کرنا جائز نہیں ہو گا۔

قول باری ہے (فمن لم یجد فصیام ثلاثۃ ایام) جس شخص کو یہ میسر نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے۔مجاہد نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور ابوالعالیہ نے حضرت ابی بن کعب سے آیت کی قرأت (فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام متتابعات) نقل کی ہے۔

ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ ہماری قرأت میں بھی یہ فقرہ اسی طرح ہے۔حضرت ابن عباس، مجاہد، ابراہیم، قتادہ اور طاؤس کا قول ہے کہ یہ تین روزے لگاتار رکھے جائیں گے ان میں وقفہ کفارہ کے لیے کافی نہیں ہو گا۔

ان حضرات کے قول سے تتابع کا ثبوت ہو گیا لیکن تلاوت کا ثبوت نہیں ہوا اس لیے کہ اس بات کی گنجائش ہے کہ تلاوت تو منسوخ ہو چکی ہو لیکن حکم ثابت ہو۔ہمارے اصحاب کا یہی قول ہے۔امام مالک اور امام شافعی کا قول ہے ان روزوں میں تفریق سے بھی کفارہ ادا ہو جائے گا۔

قول باری:

فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین

اس بات کا مقتضی ہے کہ قدرت ہونے کی صورت میں اطعام یا کسوہ یا عتق رقبہ کے ذریعہ کفارہ کا ایجاب ہے اور ان میں سے کسی ایک کے ذریعے کفارہ ادا کرنے کا خطاب باقی رہتا ہے۔اگر یہ چیزیں میسر نہ ہوں تو پھر روزہ جائز ہو گا۔

اس لیے کہ قول باری ہے:

فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا تین اشیاء میں سے کسی ایک سے حکم کو روزوں کی طرف اس صورت میں منتقل کر دیا ہے جب یہ

چیزیں موجود نہ ہوں۔

اس لیے جب تک کفارے کا خطاب ان میں سے کسی ایک چیز پر قائم ہے۔اس وقت تک اس اصل کفارہ کی موجودگی میں اس کے لیے روزہ رکھنا جائز نہیں ہوگا۔روزہ شروع کر دینے کی صورت میں ان تینوں اشیاء میں سے کسی ایک کے ذریعے کفارہ ادا کرنے کا خطاب اس سے ساقط نہیں ہوا۔۔۔۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ پہلے دن کا روزہ شروع کر لیتا پھر اسے فاسد کر دیتا جب کہ اسے آزاد کرنے کے لیے غلام دستیاب ہو جاتا تو اس کی دستیابی کے ساتھ اب روزہ رکھنا اس کے لیے جائز نہ ہوتا۔اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کا روزہ شروع کر لینا اصل کی فرضیت کے سقوط کا سبب نہیں بنا۔اس لیے روزہ شروع کرنے سے پہلے اور اس کے بعد آزاد کرنے کے لیے غلام کی دستیابی میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ دونوں حالتوں میں کفارہ ادا کرنے کا خطاب اس پر قائم رہتا ہے۔

سمندر کے شکار کے بیان میں

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩٦﴾

تمہارے لیے دریا کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے (۱) تمہارے فائدے کے واسطے اور مسافروں کے واسطے اور خشکی کا شکار پکڑنا تمہارے لیے حرام کیا گیا ہے جب تک کہ تم حالت احرام میں رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے پاس جمع کیے جاؤ گے۔

(واذاسمعوا: سورۃ المآئدہ: آیت 96 تفسیر احکام القرآن للجصاص)

سمندر کا شکار:

قول باری ہے (احل لکم صید البحر و طعامه، تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا) حضرت ابن عباس، حضرت زید بن ثابت، سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، قتادہ، سدی اور مجاہد کا قول ہے کہ سمندر کے شکار سے مراد وہ شکار ہے جو جال کے ذریعے تازہ پکڑا جائے۔

قول باری (وطعامه) کے متعلق حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت ابن عباس اور قتادہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد وہ مردہ جانور ہے جسے سمندر باہر پھینک دے۔حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، قتادہ اور مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد نمکین شکار ہے۔لیکن پہلا قول زیادہ واضح ہے اس لیے کہ یہ دونوں صنف یعنی شکار شدہ اور غیر شکار شدہ جانوروں پر مشتمل ہے۔نمکین شکار قول باری (صید البحر) میں داخل ہے۔اس صورت میں قول باری (وطعامه) سے اس چیز کا دوبارہ ذکر لازم آئے گا جسے پہلا لفظ (صید البحر) شامل ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ بات مر کر پانی کی سطح پر تیرنے والے جانور کی اباحت پر دلالت کرتی ہے اس لیے کہ آیت کے الفاظ شکار شدہ

اورغیرشکارشدہ دونوں قسموں کے جانوروں کوشامل ہیں جب کہ مرکر پانی کی سطح پر تیرنے والا جانورغیرشکارشدہ جانوروں میں شامل ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ سلف نے قول باری (وطعامہ) کی تفسیر میں کہا ہے اس سے مراد وہ جانور ہے جسے سمندر باہر پھینک دے۔ ہمارے نزدیک جس جانورکوسمندر باہر اچھال دے وہ طافی یعنی مرکر پانی کی سطح پر آجانے والا جانور نہیں ہوتا۔ طافی تو وہ ہوتا ہے جو پانی کے اندر قدرتی موت مرجاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ سلف کا قول ہے کہ (وطعامہ) سے مراد وہ جانور ہے جسے سمندر مردہ حالت میں باہر اچھال دے یہ بات اس امر کی موجب ہے کہ اس کی موت سمندر میں واقع ہوئی اور یہ چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ انھوں نے اس سے طافی مراد لیا ہے۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ یہ ضروری نہیں کہ جس جانورکوسمندر مردہ حالت میں باہر پھینک دے وہ طافی ہو یعنی سمندر کے اندر اس کی موت واقع ہوئی ہو کیونکہ ایسا ہوسکتا ہے کہ سمندر کے اندر سردی، گرمی یا کسی اور وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی ہو۔ اس صورت میں وہ طافی نہیں کہلائے گا۔

حسن سے قول باری (وطعامہ) کی تفسیر میں مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: ”تمہارے اس سمندر کے ماوراء جو کچھ ہے وہ سب سمندر ہے اور اس کا کھانا گندم، جو اور دیگر جبوب یعنی دانے ہیں جو بطور غذا استعمال ہوتے ہیں۔“ اشعث بن عبدالملک نے حسن سے یہ روایت کی ہے۔

حسن نے اس مقام پر صرف پانی والے سمندروں کو بحر قرار نہیں دیا بلکہ زمین کی پہنائی اور وسعت کوسمندر کہا اس لیے کہ عرب کے لوگ پھیلی ہوئی چیز کو بحر کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ اسی مفہوم میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد ہے (وجدناہ بحراً) ہم نے اس گھوڑے کوسمندر پایا) یعنی یہ بہشت کشادہ قدم ہے۔ یہ بات آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی تھی۔ جب آپ نے ابوطلحہ کے گھوڑے پر سواری کی تھی۔

حبیب بن الزبیر نے عکرمہ سے قول باری (ظہر الفساد فی البر والبحر، خشکی اورسمندر دونوں میں فساد پھیل گیا) کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ بحر سے مراد امصار یعنی شہری آبادیاں ہیں۔ اس لیے کہ عرب کے لوگ شہروں کو بحر کہتے ہیں۔

سفیان نے ایک واسطے سے عکرمہ سے درج بالا آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ بر سے مراد وہ بیابان ہے جہاں کوئی چیز نہ ہو اور بحر سے مراد دیہات یعنی آبادیاں ہیں حسن سے آیت کی جو تاویل مروی ہے وہ درست نہیں ہے اس لیے کہ قول باری (احل لکم صید البحر) سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد پانی والا سمندر ہے۔

اس سے خشکی اور شہری آبادیاں مراد نہیں ہیں۔ اس لیے کہ اس پر یہ قول باری (وحرم علیکم صید البر مادمتم حرماً، البتہ خشکی کا شکار، جب تک تم احرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے) عطف کیا گیا ہے۔

قول باری ہے (متاعا لکم وللسیارۃ جہاں تم ٹھہرو وہاں بھی اسے کھاسکتے ہو اور قافلے کے لیے زاد راہ بھی بناسکتے ہو) حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا ”مقیم اور مسافر دونوں کے لیے منفعت ہے۔“

اگر کوئی یہ کہے کہ آیا قول باری (احل لکم صید البحر) دریاؤں کے شکار کی اباحت کا مقتضی ہے؟ تو اس کا جواب اثبات میں دیا جائے گا اس لیے کہ عرب کے لوگ دریا کو بھی بحر کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

اس مفہوم میں یہ قول باری ہے (ظھر الفساد فی البر والبحر) ایک قول یہ ہے کہ بحر کے لفظ کا زیادہ تر اطلاق اس سمندر پر ہوتا ہے جس کا پانی کھارا ہوتا ہے۔ مگر جب بحر کے لفظ کا ذکر فی الجملہ آئے تو وہ دریاؤں کو بھی شامل ہوتا ہے۔ اس سے مقصود آبی شکار ہے۔ تمام آبی جانوروں کا شکار محرم کے لیے جائز ہے۔

اس بارے میں فقہاء کے مابین ہمیں کسی اختلاف کا علم نہیں ہے۔ قول باری (احل لکم صید البحر) سے وہ حضرات استدلال کرتے ہیں جو تمام آبی جانوروں کی اباحت کے قائل ہیں۔ اس بارے میں اہل علم کے مابین اختلاف رائے ہے۔

آبی جانوروں کی اباحت کے بارے میں اختلاف رائے کا ذکر:

ہمارے اصحاب کا قول ہے کہ آبی جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے۔ سفیان ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ ابو اسحاق فزاری نے ان سے یہ قول نقل کیا ہے۔ قاضی ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے کہ سمندر میں پائی جانے والی ہر چیز کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے مثلاً مینڈک، آبی سانپ وغیرہ

امام مالک کا یہی قول ہے اور سفیان ثوری سے بھی اس طرح کا قول منقول ہے۔ البتہ ثوری نے یہ کہا ہے کہ اسے ذبح کرلیا جائے گا اوزاعی کا قول ہے کہ ہر قسم کا سمندری شکار حلال ہے، انھوں نے یہ بات مجاہد سے نقل کی ہے۔ لیث بن سعد کا قول ہے کہ سمندر کا مردار کھالینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح آبی کتے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے یہی حکم اس جانور کا ہے جو آبی گھوڑا کہلاتا ہے۔ البتہ آبی سور اور آبی انسان نہیں کھائے جائیں گے۔

امام شافعی کا قول ہے کہ ہر وہ جانور جو پانی میں زندگی بسر کرتا ہے اس کا کھانا حلال ہے۔ اسے پکڑ لینا ہی اس کا ذبح ہے۔ آبی سور کھالینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ جن حضرات نے تمام آبی جانوروں کو مباح قرار دیا ہے انھوں نے قول باری (احل لکم صید البحر) سے استدلال کیا ہے۔ اس میں سارے آبی جانور آگئے ہیں کیونکہ اس میں کوئی کسی قسم کی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ آیت میں ان حضرات کے قول پر کوئی دلالت موجود نہیں ہے اس لیے کہ قول باری (احل لکم صید البحر) محرم کے لیے ان جانوروں کے شکار کی اباحت پر محمول ہے جو سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ ان جانوروں کو کھالینے پر آیت میں کوئی دلالت موجود نہیں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اس پر قول باری (وحرم علیکم صید البر مادمتم حرماً) کو عطف کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے کلام کا انداز بیان محرم کے لیے خشکی اور سمندری شکار کے حکم کے فرق کو ظاہر کرتا ہے نیز صید کا لفظ اسم مصدر ہے۔ یہ مصدر اصطیاد (شکار کرنا) کے لیے اسم ہے۔ اگر چہ یہ بعض شکار پر بھی واقع ہوتا ہے۔

آپ نہیں دیکھتے کہ آپ کا یہ فقرہ درست ہے "صدت صیدا" (میں نے شکار کیا) اگر لفظ صید مصدر ہو گا تو یہ اصطیاد مصدر کے لیے اسم ہو گا جو حقیقت میں شکاری کا فعل ہوتا ہے۔ اگر اس لفظ سے یہ معنی مراد لیے جائیں تو پھر اس میں اکل کی اباحت پر کوئی دلالت نہیں ہو گی اگر چہ بعض مواقع پر پکڑے ہوئے شکار کی اس لفظ سے تعبیر کی جاتی ہے لیکن یہ مجاز کے طور پر ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں مفعول کو فعل کا نام دے دیا جاتا ہے اور کسی چیز کو اس کے غیر کے نام سے پکارنا استعارہ ہوتا ہے جو مجاز کی ایک صورت ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے تمام آبی جانوروں کو مباح کر دیا ہے ان کے قول کے بطلان پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے ۔(احلت لنا المیتان و دمان السمک والجراد، ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کر دیئے گئے ہیں ایک مچھلی اور دوسری ٹڈی)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام مرداروں میں سے صرف یہی دو چیزیں مخصوص کر دی ہیں اور اس میں یہ دلیل ہے کہ قول باری (حرمت علیکم المیتۃ تم پر مردار حرام کر دیا گیا) کی تحریم کے تحت آنے والے تمام مرداروں میں سے صرف یہی دو چیزیں مخصوص کر دی گئی ہیں، کوئی تیسری چیز نہیں ۔اس لیے کہ ان دونوں چیزوں کے سوا بقیہ تمام مردار اس قول باری کی تحریم کے عموم میں داخل ہیں ۔

نیز قول باری ہے (الا ان تکون میتۃ الایہ کہ وہ مردار ہو) اس میں خشکی اور آبی تمام مرداروں کی تحریم کے لیے عموم ہے ۔

ہمارے اصحاب میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرداروں میں سے حلال کو دو کی تعداد میں منحصر فرما دیا ہے ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان دو کے ماسوا باقی تمام مردار حرام ہیں ۔ نیز جب حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان دونوں کا ذکر فرما دیا اور اس کے ذریعے ان دونوں مرداروں اور باقی ماندہ مرداروں میں فرق کر دیا تو آپ کا یہ فرق کر دینا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کی حالت دوسرے مرداروں کی حالت سے مختلف ہے اس پر قول باری (ولحم الخنزیر اور سور کا گوشت) بھی دلالت کرتا ہے کیونکہ اس تحریم میں جس طرح خشکی کے سور کی تحریم کے لیے عموم ہے اسی طرح آبی خنزیر کے لیے بھی تحریم میں عموم ہے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ آبی سور کو آبی گدھے کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر کسی انسان نے اس کا نام گندھا رکھ دیا تو اس کی وجہ سے خنزیر کا نام اس سے سلب نہیں ہوگا ۔اس لیے کہ لغت میں اس کے لیے یہی نام معہود و متعین ہے اس لیے تحریم کا عموم اسے شامل ہوگا ۔

مینڈک سے دوا تیار کرنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا

ابن ابی ذئب کی روایت بھی اس پر دلالت کرتی ہے جو انھوں نے سعید بن خالد سے، انھوں نے سعید بن المسیب سے اور انھوں نے عبدالرحمٰن بن عثمان سے نقل کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک طبیب نے کسی دوائی کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ یہ دوائی مینڈک سے تیار ہوتی ہے ۔ یہ سن کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اسے مینڈک ہلاک کرنے سے منع فرما دیا ۔

اب مینڈک آبی جانور ہے اگر اس کا کھانا حلال ہوتا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہوتا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسے ہلاک کرنے سے کبھی منع نہ فرماتے ۔ جب اس حدیث سے مینڈک کی تحریم ثابت ہوگئی تو مچھلی کے سوا تمام آبی حیوانات کا حکم بھی یہی ہوگا ۔اس لیے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ کسی نے مینڈک اور باقی ماندہ آبی جانوروں کے درمیان کوئی فرق کیا ہے ۔

جن حضرات نے اس کی اباحت کا قول نقل کیا ہے انھوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو مالک بن انس نے صفوان بن سلیم سے، انھوں نے سعید بن سلمۃ الزرقی سے، انھوں نے مغیرہ بن ابی بردہ سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سمندر کے متعلق ارشاد فرمایا (**ھو الطھور ماءہ والحل میتتہ** اس کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے)

اس روایت کا ایک راوی سعید بن سلمہ مجہول ہے اس لیے اس کی روایت کی بنا پر کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ سلسلہ سند میں بھی اس کی مخالفت ہوئی ہے۔

یحییٰ بن سعید انصاری نے مغیرہ بن عبداللہ سے روایت کی ہے یہ حضرت ابوبردہ کے بیٹے ہیں انھوں نے اپنے والد سے اور انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کی روایت کی ہے۔ اسے یحییٰ بن ایوب نے جعفر بن ربیعہ اور عمرو بن الحارث دونوں سے روایت کی ہے، انھوں نے بکر بن سوادہ سے انھوں نے ابومعاویہ العلوی سے، انھوں نے مسلم بن مخشی المدلجی سے، انھوں نے الفراسی سے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے سمندر کے متعلق فرمایا تھا کہ (هو الطهور ماءه والحل ميتته)

ہمیں عبدالباقی بن قانع نے روایت بیان کی، انھیں عبداللہ بن احمد بن حنبل اور محمد بن عبدوس نے، ان دونوں کو امام احمد بن حنبل نے، انھیں ابوالقاسم بن زناد نے، انھیں اسحاق بن حازم نے ابن مقسم یعنی عبیداللہ نے حضرت جابر بن عبداللہ سے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سمندر کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا (هو الطهور ماء کا الحل ميتته)

ان روایات سے کوئی ایسا شخص استدلال نہیں کر سکتا جسے علم حدیث کی معرفت حاصل ہو اگر یہ روایات ثابت بھی ہو جائیں تو انھیں (احلت لنا میتتان) والی روایت پر محمول کیا جائے گا۔ اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس ارشاد کے ذریعے صرف آبی حیوانات کی تخصیص نہیں کی بلکہ ان کا ذکر کیا جو پانی میں مر جاتے ہیں۔

اس ارشاد کا ظاہر آبی اور خشکی تمام جانوروں کے لیے عام ہے جب پانی میں ان کی موت واقع ہو جائے اور یہ بات تو واضح ہے کہ یہ عموم آپ کی مراد نہیں ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ نے صرف مچھلی مراد لی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی جانور مراد نہیں ہے کیونکہ یہ بات تو معلوم ہو چکی ہے۔ آپ نے اپنے ارشاد کے عموم کا ارادہ نہیں کیا۔ اس لیے اس کے بارے میں عموم کا اعتقاد درست نہیں ہے۔

اباحت کے قائلین نے حضرت جابر کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ جیش خبط" میں شامل مجاہدین کے لیے سمندر نے ایک جانور اچھال کر باہر پھینک دیا اس جانور کو عنبر کہتے ہیں۔

مجاہدین نے اس کا گوشت کھالیا پھر انھوں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا (هل معکم منه شیء تطعمونیه، کیا تمہارے پاس کچھ بچ گیا ہے۔ جو تم مجھے کھانے کے لیے دے سکو۔)

لیکن اس روایت میں ان حضرات کے قول کی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک اور جماعت نے یہی حدیث روایت کی ہے اور انھوں نے اس میں بیان کیا ہے کہ سمندر نے ان کے لیے ایک مچھلی اچھال دی تھی جس کا نام عنبر تھا، ان حضرات نے یہ بتایا کہ سمندر کا وہ پھینکا ہوا اور اصل حوت تھا جسے مچھلی کہتے ہیں مچھلی کی حلت میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور اس کے ماسوا کی حلت پر کوئی دلالت موجود نہیں۔

محرم کا غیر محرم کے کئے ہوئے شکار کا گوشت کھالینا:

قول باری ہے (وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرما تم پر (جب تک تم احرام کی حالت میں ہو) خشکی کا

شکار حرام کیا گیا ہے) حضرت علی اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ان دونوں حضرات نے لحال یعنی غیر محرم کے پکڑے ہوئے شکار کا گوشت محرم کے لیے مکروہ سمجھا ہے۔

البتہ حضرت علی کی روایت کی اسناد قوی نہیں ہے۔علی بن زید نے اس کی روایت کی ہے۔بعض طراق میں اسے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مرفوعاً اور بعض دوسرے طرق میں اسے موقوفاً روایت کیا گیا ہے۔حضرت عثمان، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت ابوقتادہ اور حضرت جابر وغیرھم سے اس کی اباحت منقول ہے۔

عبداللہ بن ابی قتاہ اور عطاء بن یسار نے حضرت ابوقتادہ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں" میں نے ایک جنگلی گدھا شکار کرلیا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ میں نے اس طرح شکار کیا تھا اور اس کا کچھ حصہ میرے پاس اب بھی بچا ہوا ہے، یہ سن کر آپ نے اسے لوگوں سے کھالینے کے لیے کہا یہ لوگ احرام کی حالت میں تھے۔

ابوالزبیر نے حضرت جابر سے روایت کی ہے کہ ابوقتادہ نے ایک جنگلی گدھا ذبح کیا اور ہم نے اس کا گوشت کھالیا ابوقتادہ حالت احرام میں نہیں تھے لیکن ہم محرم تھے۔ہمارے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تھے۔المطلب بن عبداللہ بن حنطب نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تھے۔المطلب بن عبداللہ بن حنطب نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا (لحم صید البر حلال لکم و انتم حرم مالم تصیدوہ اویصطاد لکم، خشکی کے شکار کا گوشت تمہارے لیے احرام کی حالت میں بھی حلال ہے۔بشرطیکہ وہ شکار تم نے نہ مارا ہو اور نہ ہی تمہارے لیے اسے پکڑا گیا ہو) اس کی اباحت کے سلسلے میں اور بھی بہت سی روایات ہیں، میں نے طوالت کے خوف سے انھیں بیان کرنا پسند نہیں کیا نیز اس وجہ سے بھی کہ اس مسئلے میں فقہاء امصار کے مابین کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔

جن حضرات نے ایسے شکار کی ممانعت کی ہے۔انھوں نے قول باری (وحرم علیکم صید البر مادمتم حرماً) سے استدلال کیا ہے۔اس کا عموم شکار کرنے کے فعل اور نفس شکار دونوں کو شامل ہے اس لیے کہ صید کا اسم ان دونوں چیزوں پر واقع ہوتا ہے، جن حضرات نے اس کی اباحت کی ہے۔انھوں نے قول باری (وحرم علیکم صید البر) سے استدلال کیا ہے۔

یہ آیت شکار کرنے کے فعل کو نیز نفس شکار دونوں کی تحریم کو شامل ہے۔جانور اس وقت تک شکار کہلاتا ہے جب تک وہ زندہ رہے لیکن ذبح ہوجانے کے بعد اس کے گوشت کو اس نام سے موسوم نہیں کیا جاتا۔اگر موسوم کر بھی لیا جائے تو صرف اس وجہ سے کہ یہ کبھی پہلے شکار تھا۔گوشت پر بہر حال شکار کا لفظ حقیقتاً واقع نہیں ہوتا۔

آیت کا لفظ صید گوشت کو شامل نہیں ہے اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ محرم کو ایسے گوشت میں تصرف کرنے سے منع نہیں کیا گیا وہ اس کی خرید و فروخت کرسکتا ہے نیز اسے تلف بھی کرسکتا ہے اور دوسرے قسم کے تمام تصرفات اس کے لیے جائز ہیں۔تحریم کے قائلین کے نزدیک وہ کھانے کے سوا اس میں ہر تصرف کرسکتا ہے۔

اگر آیت کا عموم گوشت کو بھی شامل ہوتا تو محرم کے لیے اکل کے سوا اس میں مذکورہ بالا تصرفات درست نہ ہوتے جس طرح زندگی کے اندر گوشت میں تصرف جائز نہیں ہوتا اور اگر محرم اس گوشت کو تلف کردیتا تو اس پر اس کا تاوان عائد ہوجاتا جس طرح زندہ شکار کے اتلاف کی صورت میں اس پر تاوان واجب ہوجاتا ہے اس لیے کہ قول باری (وحرم علیکم صید البر مادمتم حرماً) احرام کی حالت میں شکار

سے تعلق رکھنے والے تمام افعال کی تحریم کو شامل ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ شکار کے انڈے محرم پر حرام ہوتے ہیں اگرچہ یہ انڈے نہ خود اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہیں جس طرح جنگلی جانور کرتے ہیں اور نہ ہی ان پر صید کے اسم کا اطلاق ہوتا ہے، جس طرح انڈے حرام ہوتے ہیں اسی طرح محرم کے لیے شکار کا گوشت بھی حرام ہوگا۔

اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ بات اس طرح نہیں ہے۔ اس لیے کہ محرم کو شکار کا گوشت تلف کر دینے کی ممانعت نہیں ہے اور اگر وہ گوشت تلف کر دے تو اس کا تاوان نہیں بھرے گا لیکن اسے شکار کے انڈے اور چوزے سے تلف کرنے کی ممانعت ہے اور تلف کرنے پر اسے تاوان بھی بھرنا پڑتا ہے۔ نیز انڈے اور چوزے کسی مرحلے پر ایسے شکار بن جاتے جو اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہیں۔

اس لیے ان دونوں چیزوں پر شکار کا ہی حکم عائد کر دیا گیا ہے لیکن شکار کا گوشت کسی حالت میں بھی شکار نہیں بن سکتا اس لیے اس کی حیثیت دوسرے حیوانات کے گوشت کی طرح ہوگئی۔ اس لیے کہ وہ اس حالت میں نہ تو شکار بن سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی شکار پیدا ہو سکتا ہے یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے آیت کے عموم کی بنا پر انڈوں اور چوزوں کی تحریم کا حکم نہیں لگایا ہے بلکہ تمام کے اتفاق کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے۔

صعب بن جثامہ کی روایت میں اختلاف ہے۔ اس روایت میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ابواء کے مقام پر یا کسی اور جگہ جنگلی گدھے کا گوشت بطور ہدیہ پیش کیا آپ اس وقت احرام کی حالت میں تھے۔ آپ نے یہ ہدیہ واپس کر دیا اور جب دیکھا کہ ان کے چہرے پر اس کا ردعمل ظاہر ہو رہا ہے تو آپ نے ان سے فرمایا (لیس بنا ردعلیك ولکنا حرم، تمہارا ہدیہ واپس کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم احرام کی حالت میں ہیں۔)

امام مالک نے اس کے خلاف روایت کی ہے، انھوں نے زہری سے، انہوں نے ابن عباس سے اور انھوں نے صعب بن جثامہ سے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنگلی گدھے کا تحفہ پیش کیا تھا جب آپ مقام ابواء یا ودان میں تھے۔ آپ نے یہ تحفہ واپس کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم یہ تحفہ صرف اس لیے واپس کر رہے ہیں کہ ہم حالت احرام میں ہیں۔

ابن ادریس کہتے ہیں کہ امام مالک سے کہا گیا کہ سفیان تو یہ کہتے ہیں کہ آپ کو جنگلی گدھے کی ٹانگ تحفے کے طور پر پیش کی گئی تھی، امام مالک نے یہ سن کر فرمایا کہ "سفیان کو کیا پتہ ہے وہ تو ابھی بچہ ہے، وہ تو ابھی بچہ ہے۔" یہی روایت ابن جریج نے زہری سے ایک اور سند کے ساتھ نقل کی ہے اس کے الفاظ امام مالک کی روایت کی طرح ہیں۔ اس میں یہ مذکور ہے کہ انھوں نے جنگلی گدھے کا ہدیہ پیش کیا تھا۔

اعمش نے حبیب سے، انھوں نے سعید بن جبیر سے انھوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ صعب بن جثامہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنگلی گدھے کا ہدیہ پیش کیا تھا جبکہ آپ احرام کی حالت میں تھے۔ آپ نے اسے واپس کر دیا تھا اور فرمایا تھا "اگر ہم احرام کی حالت میں نہ ہوتے تو تمہارا یہ ہدیہ ضرور قبول کر لیتے۔" ان روایات سے ان کی روایت کا ضعف اور بودا پن واضح ہو جاتا ہے۔

ان میں درست روایت وہ ہے جو امام مالک نے نقل کی ہے۔ اس لیے کہ ان تمام راویوں کا اس پر اتفاق ہے۔ اس

بارے میں ایک اور پہلو سے بھی روایت ہوئی ہے۔ یہ روایت ابومعاویہ نے ابن جریج سے، انھوں نے جابر بن زید ابوالشعثاء سے اور انھوں نے اپنے والد سے کی ہے وہ کہتے ہیں۔کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس محرم کے متعلق پوچھا گیا تھا جس کے سامنے شکار کا گوشت پیش کیا جائے آیا وہ یہ گوشت کھاسکتا ہے تو آپ نے فرمایا تھا (احسبوالہ،اس کے لیے حساب کرلو۔)

ابومعاویہ نے آپ کے ارشاد کی توضیح کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی مراد یہ تھی کہ اگر احرام باندھنے سے پہلے یہ شکار مارا گیا تھا تو وہ کھاسکتا ہے ورنہ نہیں اس میں یہ احتمال ہے کہ آپ کی اس سے مراد یہ تھی اگر یہ شکار اس محرم کی خاطر کیا گیا ہو یا اس نے شکار کرنے کے لیے کہا ہو یا اس سلسلے میں اعانت کی ہو یا نشاندہی کی ہو یا اس قسم کی کوئی ممنوع حرکت کی ہو تو پھر وہ اس کا گوشت نہیں کھاسکتا۔

گھٹیا اور خبیث چیزوں کے بارے میں

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٠﴾

(سورۃ المائدہ، آیت: ۱۰۰)

’’آپ فرمادیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو آپ کو ناپاک کی کثرت بھلی لگتی ہو (۱) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو! تاکہ کامیاب ہو‘‘۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قل لایستوی الخبیث والطیب

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر ۱۔ حسن نے کہا: الخبیث اور الطیب سے مراد حلال اور حرام ہے۔ سدی نے کہا: مومن و کافر ہیں۔ بعض نے کہا: مطیع اور عاصی ہیں۔ بعض نے کہا: ردی اور جید ہے۔ یہ بطور مثال ہے صحیح یہ ہے کہ لفظ ان تمام امور کو شامل ہے مکاسب، اعمال، لوگ، علوم ومعارف وغیرہ سب متصور ہوسکتے ہیں اس میں سے خبیث فائدہ نہیں دیتا اور نہ اس کا انجام اچھا ہوتا ہے اگرچہ زیادہ بھی ہو اور پاکیزہ تھوڑا بھی نفع بخش ہوتا ہے اور انجام کے اعتبار سے عمدہ ہوتا ہے۔ (۱) (المحرر الوجیز، جلد ۲، صفحہ ۲۴۴)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (آیت) والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لایخرج الا نکدا (الاعراف: ۵۸) اور جو سرزمین عمدہ زرخیز ہے (کثرت سے) نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے اور جو خراب ہے نہیں نکلتی اس سے (پیداوار) مگر قلیل گھٹیا۔

اس آیت کی مثال یہ ارشاد بھی ہے: (آیت) ام نجعل الذین امنوا وعملوا الصلحت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار کیا ہم بنادیں گے انھیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان لوگوں کی مانند جو فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یا ہم بنادیں گے پرہیزگاروں کو فجار کی طرح۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : (آیت) ام حسب الذین اجترحوا السیات ان نجعلھم کا الذین امنو اوعملوا الصلحت (الجاثیہ:۲۱) کیا خیال کر رکھا ہے ان لوگوں نے جو ارتکاب کرتے ہیں برائیوں کا کہ ہم بنا دیں گے انھیں ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔

خبیث، طیب کے مساوی نہیں ہوتا نہ مقدار میں، نہ خرچ کرنے میں، نہ مکان میں، نہ ذہاب میں۔ پاکیزہ دائیں جہت سے لیتا ہے خبیث بائیں جہت سے لیتا ہے، پاکیزہ جنت میں ہے، خبیث دوزخ میں ہے۔ یہ بالکل واضح ہے اور برابری کی حقیقت ایک جہت میں ہمیشہ رہنا ہے اس کی مثل استقامت (سیدھا ہونا) ہے اور اس کی ضد اعوجاج (ٹیڑھا ہونا) ہے جب معاملہ اس طرح ہے تو یہ مسئلہ بنتا ہے۔

مسئلہ نمبر ۲۔ بعض علماء نے فرمایا: بیع فاسد فسخ کی جائے گی اور بازار کے حوالہ سے قائم نہیں رکھی جائے گی اور نہ بدن کے تغیر سے قائم رکھی جائے گی، کیونکہ اس کے قائم رکھنے میں بیع صحیح کے ساتھ برابر ہو جائے گی، بلکہ اسے ہمیشہ فسخ کیا جائے گا اور مشتری کو ثمن واپس کی جائے گی اگر وہ قابض ہو چکا ہوا گر اس (بائع) کے ہاتھ میں تلف ہو گئی تو وہ اس کا ضامن ہوگا، کیونکہ وہ امانت پر قابض نہیں ہوا تھا بلکہ شبہ عقد کی وجہ سے قابض ہوا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا: بیع کو فسخ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ بیع جب فسخ کی جائے گی اور اس کے فوت ہونے کے بعد رد کی جائے گی تو بائع پر اس میں ضرر اور غبن ہوگا اور وہ سامان جو سو روپے کے برابر تھا وہ جب بائع کا لوٹائی جائے گی تو وہ بیس روپے کے برابر ہوگا اور مال میں عقوبت نہیں ہے۔ پہلا قول اصح ہے، کیونکہ آیت عام ہے اور نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جس نے ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہیں ہے وہ رد ہے" (۱) (صحیح بخاری، کتاب البیوع، جلد ۱ صفحہ ۲۸۷)

میں کہتا ہوں: جب مسائل فقہ میں عدم استواء میں اس معنی کو تلاش کیا جائے گا تو وہ کثرت سے ملیں گے اس میں سے غاصب کا مسئلہ بھی ہے۔

مسئلہ نمبر ۳۔ جس نے مغصوبہ جگہ پر مکان بنایا، درخت لگایا تو اس عمارت اور درخت کو کاٹنا لازم ہے، کیونکہ وہ خبیث ہے اور اسے لوٹایا جائے گا، جب کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے: اس کو نہیں اکھیڑا جائے گا اور اس زمین کے مالک سے قیمت لے لے گا اس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قول لیس لعرق ظالم حق (۲) (صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، جلد ۱، صفحہ ۳۱۴) ظالم کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔ رد کرتا ہے۔

ہشام نے کہا: العرق الظالم سے مراد وہ ہے جو دوسرے کی زمین میں درخت لگاتا ہے تاکہ اس کا مستحق ہو جائے۔ امام مالک نے کہا العرق الظالم سے مراد وہ شخص ہے جو بغیر حق کے کوئی چیز لیتا ہے یا کنواں کھودتا ہے یا درخت لگاتا ہے۔ امام مالک نے فرمایا: جو زمین غصب کرے پھر اسے کاشت کرے یا کرائے یا گھر غصب کرے اس میں رہائش رکھے یا اسے کرائے پر دے پھر اس کا مالک اس کا مستحق ہو جائے تو رہائش رکھنے کا کرایہ غاصب پر ہوگا اور غاصب نے دوسرے سے جو کرایہ لیا تھا وہ بھی واپس کرنا ہوگا اور جب کوئی شخص اس گھر میں نہ رہے یا زمین کو کاشت نہ کرے اور اسے معطل کر دے تو امام مالک کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اس پر کچھ نہیں ہے اور ان سے یہ بھی مروی ہے کہ اس پر کرایہ ہے۔ وقار نے اس کو اختیار کیا ہے، یہی امام شافعی کا مذہب ہے، کیونکہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: "ظالم کے لیے کوئی حق نہیں ہے"۔

ابو داوٗد نے ابو زبیر سے روایت کیا ہے کہ دو آدمی جھگڑا لے کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے ایک نے دوسرے کی زمین میں کھجور کے درخت لگائے تھے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فیصلہ زمین والے کے حق میں کیا اور کھجوروں والے کو کہا کہ وہ اپنی کھجوریں نکال لے فرمایا: میں نے دیکھا کہ ان کھجوروں کی جڑوں کو کلہاڑی کے ساتھ مارا گیا حتیٰ کہ وہ نکالیں گئیں جب کہ وہ مکمل کھجوریں تھیں۔ یہ نص ہے۔ ابن حبیب نے کہا: اس میں حکم یہ ہے کہ زمین والے کا ظالم پر اختیار ہے اگر چاہے تو اکھیڑ ہوئے درختوں کی قیمت دے کر انھیں روک لے اگر چاہے تو انھیں اکھیڑ دے اور اکھیڑنے کی اجرت غاصب پر ہو گی۔

دار قطنی نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جس نے کسی قوم کے گھروں میں ان کی اجازت سے گھر بنایا تو اسے گھر کی قیمت دی جائے گی اور جس نے ان کی اجازت کے بغیر گھر بنایا تو اس کے لیے گھر توڑنا ہو گا" (۱)

(دار قطنی، باب المراۃ تقتل اذا ارتدت، جلد ۴، صفحہ ۲۴۳)

ہمارے علماء نے فرمایا: اس کے لیے قیمت ہو گی، کیونکہ اس نے ایسی جگہ پر مکان بنایا جس کی منفعت کا وہ مالک تھا یہ اس طرح ہے کہ جس نے کسی شبہ کی وجہ سے مکان بنایا یا درخت لگائے تو اس کے لیے حق ہے اگر مال کا ملک چاہے تو اسے اس کی قیمت دے دے جس حالت پر وہ قائم ہے اگر وہ انکار کرے تو جس نے عمارت بنائی یا درخت لگائے اسے کہا جائے گا: اسے خالی زمین کی قیمت دے دے۔ اور اگر وہ انکار کرے تو دونوں شریک ہوں گے۔ ابن الماجشون نے کہا: اس کے اشتراک کی تفسیر یہ ہے کہ خالی زمین کی قیمت لگائی جائے گی پھر اس عمارت کی قیمت لگائی جائے گی عمارت کے ساتھ والی قیمت خالی زمین کی قیمت سے بڑھ جائے گی تو کام کرنے والا اس زمین کے مالک کے ساتھ شریک ہو گا اگر وہ پسند کریں تو تقسیم کر لیں یا وہیں سے روکے رکھیں۔ ابن الجہم نے کہا: جب زمین کا مالک عمارت کی قیمت دے گا اور اپنی زمین لے گا تو اس کے لیے گزشتہ سالوں کا کرایہ ہو گا۔ ابن القاسم وغیرہ سے مروی ہے جب کوئی شخص کسی کی زمین میں اس کی اجازت سے مکان بنائے تو پھر اس کے لیے اس کا نکالنا واجب ہو جائے تو وہ اسے اپنی کھڑی ہوئی عمارت کی قیمت دے گا۔ پہلا قول اصح ہے، کیونکہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے "اس کے لیے قیمت ہے" اور اس پر اکثر فقہاء کا مذہب ہے۔

مسئلہ نمبر ۴۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (آیت) **ولو اعجبك كثرة الخبيث** بعض علماء نے فرمایا: یہ خطاب نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے اور مراد امت ہے کیونکہ نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خبیث پر تعجب نہیں کرتے بعض نے فرمایا مراد نبی مکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات ہے اور آپ کا اعجاب یہ ہے کہ آپ نے جو کفار کی کثرت اور مال حرام کی کثرت کا اور مومنین کی قلت اور حلال مال کی قلت کا مشاہدہ کیا تو تعجب کیا۔

صحابہؓ کرام کا نبی ﷺ سے متعلقاً سوال کرنے کے حوالے سے حکمِ خداندی

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ ۚ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٠١﴾

{سورۃ المائدہ آیت نمبر 101}

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو ناگوار ہوں' اور اگر تم ایسے وقت سوال کرو گے جب قرآن نازل کیا جا رہا ہو تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی اللہ نے ان سے درگزر کیا اور اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے''۔(المائدہ:١٠١)

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوالات کرنے کے متعلق احادیث:

لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بکثرت سوال کرتے تھے ان میں مسلمان بھی تھے اور منافق بھی۔ مسلمان تو امر واقع کو دریافت کرنے کے لیے سوال کرتے تھے' اور منافق امتحاناً' استہزاء اور عناداً سوال کرتے تھے' کوئی پوچھتا کہ میرا باپ کون ہے؟ اور کوئی پوچھتا کہ میری اونٹنی کہاں ہے؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ٢٥٦ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایسا خطبہ دیا کہ میں نے اس جیسا خطبہ کبھی نہیں سنا تھا۔ آپ نے فرمایا: کہ اگر تم ان چیزوں کو جان لو جن کو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو اور روؤ زیادہ' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے اور بلند آواز سے رونے لگے' ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا تمہارا باپ فلاں ہے' تب یہ آیت نازل ہوئی' ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو ناگوار ہوں۔

(صحیح البخاری' ج ٥' رقم الحدیث: ٤٦٢١' صحیح مسلم فضائل: ١٣٤' (٢٣٥٩) ٦٠٠٤' سنن ترمذی ج ٦' رقم الحدیث: ٣٠٦٧' سنن کبری للنسائی' ج ٦' رقم الحدیث: ١١١٥٤)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے استہزاء سوال کرتے تھے' کوئی پوچھتا کہ میرا باپ کون ہے؟ کوئی کہتا میری اونٹنی گم ہو گئی' وہ اونٹنی کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

(صحیح البخاری' ج ٥' رقم الحدیث: ٤٦٢٢)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوالات کیے' حتیٰ کہ بہت زیادہ سوال کیے تو ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا: تم مجھ سے جس چیز کے متعلق سوال کرو گے میں تمہیں

اس چیز کے متعلق بیان کروں گا' میں دائیں اور بائیں دیکھ رہا تھا' اس وقت ہر شخص اپنے کپڑوں میں سر ڈالے ہوئے رو رہا تھا' ایک شخص کا جب کسی سے جھگڑا ہوتا تھا تو لوگ اس کو اس کے باپ کے غیر کی طرف منسوب کرتے تھے' وہ کہنے لگا اے اللہ کے نبی میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے' پھر حضرت عمر (رض) نے کہا ہم اللہ کو رب مان کر راضی ہیں' اور اسلام کو دین مان کر اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رسول مان کر' ہم برے فتنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے آج کی طرح خیر و شر کو نہیں دیکھا میرے سامنے جنت اور دوزخ کی تصویر کو پیش کیا گیا' حتیٰ کہ میں نے ان کو اس دیوار کے پاس دیکھا۔ قتادہ اس حدیث کا اس آیت کو پڑھتے وقت ذکر کرتے تھے: "اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔۔"

(صحیح البخاری' ج ۸' رقم الحدیث: ۷۰۸۹' صحیح مسلم' فضائل ۱۳۷' (۲۳۵۹) ۶۰۰۸' مسند احمد' ج ۱۱' رقم الحدیث: ۱۲۷۵۶' طبع دار الحدیث' قاہرہ' مسند احمد' ج ۴' رقم الحدیث: ۱۳۶۶۷۔ ۱۲۸۲۰' طبع دار الفکر' بیروت' مسند احمد' ج ۳' ص ۱۷۷' طبع قدیم)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی بیت اللہ کا حج کرنا ان لوگوں پر اللہ کا حق ہے جو اس کے راستے کی استطاعت رکھتے ہوں (آل عمران: ۹۷) تو صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا ہر سال میں؟ آپ خاموش رہے' انھوں نے پھر پوچھا یا رسول اللہ! کیا ہر سال میں؟ آپ نے فرمایا نہیں اور اگر میں ہر سال میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج فرض ہو جاتا اور اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو ناگوار ہوں'۔

(المائدہ: ۱۰۱) (سنن ترمذی' ج ۵' رقم الحدیث: ۳۰۶۶' سنن ابن ماجہ' ج ۲' رقم الحدیث: ۲۸۸۴' صحیح مسلم' حج' ۴۱۲' (۱۳۳۷) ۳۱۹۹' سنن نسائی' ج ۵' رقم الحدیث: ۲۶۱۹)

امام ابوجعفر محمد ابن جریر متوفی ۳۱۰ ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر تشریف لائے' درآنحالیکہ آپ کا چہرہ غصے سے سرخ تھا' آپ منبر پر بیٹھ گئے' ایک شخص نے سوال کیا: میرا باپ کہاں ہے؟ آپ نے فرمایا دوزخ میں' دوسرے نے سوال کیا' میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا حذافہ؟ حضرت عمر بن خطاب (رض) نے کھڑے ہو کر عرض کیا ہم اللہ کو رب مان کر راضی ہیں' اسلام کو دین مان کر اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی مان کر اور قرآن کو امام مان کر' یا رسول اللہ! ہم زمانہ جاہلیت اور شرک سے تازہ تازہ نکل کر آئے ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو اللہ جانتا ہے' پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور یہ آیت نازل ہوئی اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھا کرو۔

(جامع البیان' جز ۷' ص ۱۱۰' مطبوعہ دار الفکر' بیروت ۱۴۱۵ھ)

آپ سے سوال کرنے کی ممانعت کی وجوہات:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جن چیزوں کے متعلق سوال کیے جاتے تھے ان میں سے بعض مخفی ہوتی تھیں' جن کے ظاہر ہونے سے کسی کا پردہ فاش ہو سکتا تھا اور اس کی رسوائی کا خطرہ تھا۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی نے پوچھا تھا: کہ میرے باپ کون ہیں؟ فرض کیجئے' کہ ان کے باپ حذافہ نہ ہوتے' کوئی اور ہوتے تو لوگوں میں رسوا ہو جاتے اور ان کی ماں کی ناموس پر دھبہ لگ جاتا' اسی طرح جس شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا ہر سال میں حج کرنا فرض ہے' اگر آپ ہاں فرما دیتے تو ہر سال حج فرض ہو جاتا اور مسلمان محض اس وجہ سے مشکل میں پڑ جاتے۔

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

سلمان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ سے گھی، پنیر اور جنگلی گدھے کے متعلق سوال کیا گیا' آپ نے فرمایا حلال وہ ہے جو اللہ کی کتاب میں حلال ہے اور حرام وہ ہے' جو اللہ کی کتاب میں حرام ہے اور جس سے اللہ نے سکوت کیا' وہ معاف ہے۔

(سنن ترمذی' ج ۳' رقم الحدیث: ۱۷۳۲' سنن ابن ماجہ' ج ۲' رقم الحدیث: ۳۳۶۷)

حضرت ابوثعلبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں' ان کو ضائع مت کرو اور کچھ حدود مقرر کی ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے منع فرمایا ہے' ان میں ملوث نہ ہو اور کچھ اشیاء سے سکوت فرمایا' ان میں تمہارے لیے رخصت ہے' اللہ انھیں بھولا نہیں ہے' تم ان سے بحث نہ کرو۔

(سنن کبریٰ للبیہقی' ج ۱۰' ص ۱۲' المستدرک' ج ۲ ص ۱۲۲)

حضرت سعد بن وقاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو مسلمانوں پر حرام نہیں تھی اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے وہ ان پر حرام کر دی گئی۔

(صحیح البخاری' ج ۸' رقم الحدیث: ۲۸۹' صحیح مسلم' فضائل' ۱۳۳' (۲۳۸۸) ۶۰۰۱' سنن ابوداؤد' ج ۳' رقم الحدیث: ۴۶۱۰)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے تم کو جن چیزوں سے منع کیا ہے' ان میں سے اجتناب کرو اور جن کا حکم دیا ہے' ان کو بجالاؤ جتنی تمہاری استطاعت ہے' کیونکہ تم سے پہلے لوگ محض زیادہ سوالات کرنے اور اپنے نبیوں سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔

(صحیح مسلم' فضائل: ۱۳۰ (۱۳۳۷) ۵۹۹۸)

آپ سے سوال کرنے کی ممانعت اور اجازت کے محامل:

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ زیر تفسیر آیت اور احادیث مذکورۃ الصدر میں سوالات کرنے سے منع فرمایا ہے' حالانکہ قرآن مجید کی ایک اور آیت اور ایک حدیث میں سوال کرنے کا حکم فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

(آیت) "فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون"۔ (الانبیاء: ۷)

ترجمہ: اگر تم نہیں جانتے تو علم والوں سے سوال کرو۔

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں گئے ہم میں سے ایک شخص کو پتھر لگ گیا' جس سے اس کا سر پھٹ گیا' پھر اس کو احتلام ہو گیا' اس نے اپنے اصحاب سے پوچھا کیا میرے لیے تیمم کرنے کی رخصت ہے؟ انھوں نے کہا نہیں' تم پانی کے استعمال پر قادر ہو' تمہارے لیے تیمم کی رخصت نہیں۔ سو اس نے غسل کیا اور وہ فوت ہو گیا' جب ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچے تو ہم نے آپ کو اس واقعہ کی خبر دی' آپ نے فرمایا انھوں نے اس کو مار ڈالا' اللہ ان کو ہلاک کر دے' جب ان کو مسئلہ کا علم نہیں تھا تو انھوں نے سوال کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ جہالت کی شفا سوال کرنا ہے' اس کے لیے تیمم کرنا کافی تھا' یا وہ اپنے زخم پر پٹی باندھ کر اس پر مسح کرتا اور باقی جسم پر پانی بہاتا۔

(سنن ابوداؤد ج ۱ رقم الحدیث: ۳۳٦ سنن ابن ماجہ ج ۱ رقم الحدیث: ۵۷۲ مسند احمد ج ۱ ص ۳۷۰ طبع قدیم)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا امتحان لینے کے لیے یا آپ سے استہزاء کے طور پر سوال کرنے سے ان کو منع کیا گیا تھا' یا جس عبادت کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم نہیں دیا تھا' نہ اس کا اپنی کتاب میں ذکر کیا تھا' اس کے متعلق سوال کرنے سے مسلمانوں کو منع فرمایا تھا' یا جس چیز سے کسی کی پردہ دری ہوتی ہو اس کے متعلق سوال کرنے سے منع فرمایا تھا' لیکن جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور اس کا وجوب ثابت ہو چکا ہو' اس کی وضاحت کے متعلق سوال کرنا جائز ہے' جیسا کہ اس آیت کے آخری حصہ میں فرمایا: اور اگر تم ایسے وقت سوال کرو گے جب قرآن نازل کیا جا رہا ہو گا تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائے گی۔ (المائدہ ۱۰۱)

اثناء وحی میں جو حکم مجمل ہو اس کی وضاحت کے لیے سوال کرنا' جو چیز سمجھ میں نہ آئے اس کو پوچھنا' کسی پیش آمدہ حاجت کے متعلق سوال کرنا' یہ تمام سوالات جائز ہیں اور قرآن مجید اور احادیث میں ان کی بہت نظائر ہیں۔

آپ سے کیے ہوئے سوالات کے متعلق قرآن مجید کی آیات:

اللہ تعالیٰ نے مطلقہ کی عدت بیان فرمائی' اور جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو اس کی عدت بیان فرمائی اور حاملہ کی عدت بیان فرمائی اور اس عورت کی عدت بیان نہیں فرمائی جس کو حیض آتا ہو نہ حمل ٹھہرتا ہو' یعنی وہ بہت بوڑھی ہو' تو صحابہ نے اس کے متعلق سوال کیا' تب یہ آیت نازل ہوئی۔

(آیت) "والی یئسن من المحیض من نسآئکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر"۔ (الطلاق: ۴)

ترجمہ: اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تمہیں اشتباہ ہو (کہ ان کی عدت کیا ہو گی؟) تو ان کی عدت تین مہینے ہے

(آیت) "یسئلونک ماذا ینفقون قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والاقربین والیتمی والمسکین وابن السبیل"۔ (البقرہ: ۲۱۵)

ترجمہ: وہ آپ سے خرچ کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ کہیے کہ تم جو (مال) بھی خرچ کرو تو وہ ماں باپ' قریبی رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے خرچ کرو۔

(آیت) "یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ قل قتال فیہ کبیر وصد عن سبیل اللہ و کفر بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ والفتنۃ اکبر من القتل"۔ (البقرہ: ۲۱۷)

ترجمہ: وہ آپ سے ماہ حرام میں قتال کے متعلق پوچھتے ہیں' آپ کہیے اس میں قتل کرنا بڑا گناہ ہے' اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام جانے سے روکنا اور اس کے رہنے والوں کو اس سے نکلنا' اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے اور فساد کرنا قتل سے زیادہ سخت ہے۔

(آیت) "یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما"۔ (البقرہ: ۲۱۹)

ترجمہ: وہ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں' آپ کہیے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ

فائدے (بھی) ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ بڑا ہے۔

(آیت) "یسئلونك عن الیتمی قل اصلاح لھم خیر"۔ (البقرہ: ۲۲۰)

ترجمہ: وہ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ کہیئے کہ ان کی اصلاح زیادہ بہتر ہے۔

(آیت) "یسئلونك عن المحیض قل ھو اذی فاعتزلوا النسآء فی المحیض۔"۔ (البقرہ: ۲۲۲)

ترجمہ: وہ آپ سے حیض کے حکم کا سوال کرتے ہیں آپ کہیئے کہ وہ گندگی ہے پس عورتوں سے حالت حیض میں الگ رہو۔

قرآن مجید میں اس طرح کے سوالات کی پندرہ آیتیں ہیں، جن میں سے بارہ آیتوں میں صحابہ کرام کے سوالات ہیں، ان آیات سے معلوم ہوا کہ کسی پیش آمدہ مسئلہ میں، کسی چیز کا حکم معلوم کرنے کے لیئے، کسی شرعی حکم کی وضاحت کے لیئے اور کسی اشتباہ کو دور کرنے کے لیے سوال جائز ہے، احادیث میں بھی اس کی بہت نظائر ہیں۔

آپ سے کیے ہوئے سوالات کے متعلق احادیث:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صحابہ کرام امور مستقبلہ کے متعلق بھی سوال کرتے تھے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک مجلس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صحابہ کرام سے گفتگو فرما رہے تھے، کہ ایک اعرابی نے آپ کی حدیث کے دوران سوال کیا: قیامت کب ہوگی؟ آپ نے اپنی حدیث جاری رکھی پھر سائل کو متوجہ کر کے فرمایا جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا، اس نے پوچھا امانت کیسے ضائع ہوگی؟ آپ نے فرمایا جب کوئی منصب نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔

(صحیح البخاری، ج۱، رقم الحدیث: ۵۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ)

صحابہ کرام کسی پیش آمدہ مسئلہ اور حادثہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کرتے تھے:

حضرت عبداللہ بن عمر بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں کے لیئے ٹھہر گئے لوگ آپ سے سوال کر رہے تھے ایک شخص نے کہا مجھے پتا نہیں چلا اور میں نے ذبح سے پہلے سر منڈا لیا، آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں (اب) ذبح کرلو ایک اور شخص نے کہا مجھے پتا نہیں چلا میں نے رمی سے پہلے نحر کرلیا، آپ نے فرمایا اب رمی کرلو، کوئی حرج نہیں ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جس چیز کے متعلق بھی سوال کیا گیا جس کو مقدم یا موخر کیا گیا ہو۔ آپ نے فرمایا کرلو کوئی حرج نہیں ہے۔

(صحیح بخاری، ج۱، رقم الحدیث: ۸۳، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۲ھ)

امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک تقدیم تاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے اور امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے دم لازم آتا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) سے اسی طرح مروی ہے اور اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اس سے آخرت میں حرج یعنی گناہ نہیں ہوگا۔

حضرت عقبہ بن عامر (رض) بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ابوھاب کی بیٹی سے شادی کی، ایک عورت نے ان سے کہا: میں نے عقبہ اور اس کی بیوی کو دودھ پلایا ہے، حضرت عقبہ نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ تم نے مجھے دودھ پلایا ہے اور نہ تم نے پہلے مجھے بتایا تھا،

پھر وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس مدینہ پہنچے اور آپ سے اس کے متعلق سوال کیا' تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم اس سے الگ کیوں نہیں ہوتے؟ جبکہ یہ کہا گیا ہے' تو عقبہ اس عورت سے الگ ہو گئے۔

(صحیح بخاری'ج ۱'رقم الحدیث: ۸۸'مطبوعہ دارالکتب العلمیہ'بیروت'۱۴۱۲ھ)

آپ کا یہ ارشاد بطور استحباب ہے' ورنہ ایک عورت کے قول سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی' ثبوت رضاعت کے لیے دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے۔

حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ مجھے مذی بہت آتی تھی' میں نے حضرت مقداد سے کہا کہ اس کے متعلق سوال کریں انھوں نے آپ سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا اس میں وضو ہے۔

(صحیح البخاری: ج ۱ رقم الحدیث: ۱۳۲)

خواتین آپ سے عورتوں کے خصوصی مسائل دریافت کرتی تھیں:

حضرت ام سلمہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام سلیم (رض) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ حق سے حیا نہیں فرماتا' کیا عورتوں پر بھی احتلام کی وجہ سے غسل فرض ہے؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہاں جب وہ پانی دیکھ لے' حضرت ام سلمہ (رض) نے کپڑے میں اپنے منہ کو چھپا کر کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! تمہارے ہاتھ خاک آلودہ ہوں پھر بچہ کس وجہ سے اس کے مشابہ ہوتا ہے۔

(صحیح البخاری: ج ۱ رقم الحدیث: ۱۳۰ بیروت)

قرآن مجید کی کسی اصطلاح کے متعلق بھی صحابہ آپ سے سوال کرتے تھے:

حضرت ابوموسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ کی راہ میں قتال کرنے کی کیا تعریف ہے؟ ہم میں سے کوئی شخص غضب کی وجہ سے قتال کرتا ہے' کوئی گروہی تعصب کی وجہ سے قتال کرتا ہے' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی طرف سر اٹھایا' اس وقت وہ شخص کھڑا ہوا تھا' آپ نے فرمایا جس شخص نے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے قتال کیا' وہی اللہ عزوجل کی راہ میں قتال کرتا ہے

(صحیح البخاری: ج ۱ رقم الحدیث: ۱۲۳ مطبوعہ بیروت)

بعض اوقات صحابہ آپ کی حدیث کے معارضہ قرآن مجید کی آیت پیش کرتے' پھر آپ اس کا جواب دیتے تھے:

ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت عائشہ (رض) جب بھی آپ سے کوئی حدیث سنتیں اور آپ اس کے مطلب کو نہ پہنچتیں تو آپ سے رجوع کرتی تھیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص سے حساب لیا گیا' اس کو عذاب دیا گیا حضرت عائشہ (رض) نے کہا کیا اللہ یہ نہیں فرماتا اس سے عنقریب بہت آسان حساب لیا جائے گا۔ (الانشقاق' ۸) آپ نے فرمایا اس آیت میں حساب کا پیش کرنا مراد ہے' لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا جائے گا' وہ ہلاک ہو جائے گا۔

(صحیح البخاری: ج ۱ رقم الحدیث: ۱۰۳ بیروت)

مشکل سوالات اور بجھارت ڈالنے کی ممانعت:

امام ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر مالکی اندلسی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں:

حضرت معاویہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہلیوں اور بجھارتوں کے ڈالنے سے منع فرمایا، کسی کو ساکت اور عاجز کرنے کے قصد سے اس پر بجھارت ڈالنا منع ہے، اور شاگردوں کا امتحان لینے کے لیے بجھارت ڈالنا جائز ہے، خود نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صحابہ سے پوچھا درختوں میں سے ایک درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور وہ مسلمان کی مثل ہے، بتاؤ وہ کونسا درخت ہے۔

(صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۶۳)

حضرت معاویہ بن ابی سفیان (رض) کے سامنے لوگوں نے سوالات کیے تو انھوں نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مشکل سوال کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا میں نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب سے افضل کوئی قوم نہیں دیکھی اور انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے صرف تیرہ سوالات کیے جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ وہ تیرہ سوالات یہ ہیں:

(۱) (آیت) "واذا سالك عبادي عني"۔

(۲) (آیت) "يسئلونك عن الاهلة"۔

(۳) (آیت) "يسئلونك ماذا ينفقون"۔

(۴) (آیت) "يسئلونك عن الشهر الحرام"۔

(۵) (آیت) "يسئلونك عن الخمر والميسر"۔

(۶) (آیت) "يسئلونك عن اليتامى"۔

(۷) (آیت) "ويسئلونك ماذا ينفقون"

(۸) (آیت) "ويسئلونك عن المحيض"۔ یہ آٹھ سوالات سورۃ البقرۃ میں ہیں۔

(۹) (آیت) "يسئلونك ماذا احل لهم"۔ (المائدہ)

(۱۰) (آیت) "يسئلونك عن الساعة۔"۔ (الاعراف)

(۱۱) (آیت) "يسئلونك عن الانفال"۔ (الانفال)

(۱۲) (آیت) "يسئلونك عن الجبال"۔

تحقیق یہ ہے کہ صرف سوالات صحابہ نے کیے تھے، قرآن میں "یسئلونک" کے صیغہ سے باقی جو سوال ہیں وہ یہود اور مشرکین کے ہیں۔ طاؤس بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر (رض) نے فرمایا کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس چیز کے لیے متعلق سوال کرے جو نہیں ہے، کیونکہ جو چیز بھی ہونے والی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ کر دیا۔

(جامع البیان العلم وفضلہ ج ۲، ص ۱۴۲، ملخصا، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

سوالات کرنے کے جائز اور ناجائز مواقع:

بہر حال اب حصول علم کے لیے شرعی سوالات کا کرنا جائز ہے' کیونکہ اب یہ خوف نہیں کہ کسی کے سوال کرنے کی وجہ سے کسی شے کی حرمت نازل ہو جائے گی' حلال وحرام احکام نازل ہونے کا معاملہ وحی پر موقوف ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وصال کے بعد سلسلہ وحی ختم ہو چکا ہے۔پس اگر کوئی شخص پیش آمدہ مسئلہ میں یا کسی نئے حادثہ میں یا کسی غیر منصوص صورت نازلہ میں کسی مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لیے علماء سے سوال کرتا ہے تو اس کا یہ سوال کرنا جائز ہے۔قرآن مجید میں ہے' اگر تم کو علم نہیں ہے تو علم والوں سے سوال کرو۔(الانبیاء: ۱۷) اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جہالت کی شفا سوال کرنا ہے۔(سنن ابو داؤد: ۳۳۶) اور جو شخص کسی پر اپنا علمی تفوق ظاہر کرنے کے لیے سوال کرے' تا کہ اس کو جواب نہ آئے اور وہ عاجز ہو جائے یا جو شخص محض ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے سوال کرے یا جو شخص عناداً سوال کرے' سوای سے سوال ناجائز ہیں' خواہ کم ہوں یا زیادہ البتہ! علماء کسی مسئلہ میں ایک دوسرے کی رائے معلوم کرنے کے لیے جو سوال کرتے ہیں اور مذاکرہ اور مباحثہ کرتے ہیں' وہ جائز ہے۔اسی طرح کسی کی دلیل پر نقض وارد کرنا اور مسلمات بین الفریقین سے معارضہ کرنا بھی جائز ہے اور احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے مناظرہ کرنا بھی جائز ہے' تاہم مناظرہ میں فریق مخالف کو حکمت کے ساتھ کسی کفریہ کلمہ سے بچانا چاہیے' اور اگر یہ چاہے کہ وہ کوئی کفریہ کلمہ کہے اور میں اس کی تکفیر کروں تو یہ خود کفر ہے اور اگر یہ چاہے کہ وہ دین میں کوئی ناروا بات کہے اور میں اس کی مذمت کروں تو یہ حرام ہے' بلکہ یہ نیت ہونی چاہیے کہ میں دلائل پیش کر کے حکمت کے ساتھ فریق مخالف کو حق کا قائل کرلوں' نہ یہ کہ اس کو مناظرہ میں شکست دوں۔

بحیرہ، وسیلہ اور بتوں کے نام پالے جانے والے جانوروں کے بارے میں

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۳

{سورت المائدہ آیت نمبر 103}

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ نے (جانوروں میں) کوئی بحیرہ نہیں بنایا اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی مگر یہ کافر جھوٹ بول کر اللہ پر بہتان تراشتے ہیں' اور ان میں اکثر لوگ عقل سے کام نہیں لیتے''۔(المائدہ: ۱۰۳)

اس سے پہلی آیتوں میں کثرت سوال سے منع فرمایا تھا' مبادا کوئی چیز حرام نہ ہو اور تمہارے سوال کی وجہ سے حرام کر دی جائے' اور اس آیت میں فرمایا ہے کہ مشرکوں نے از خود بعض جانوروں کو حرام کر لیا تھا' اللہ نے ان کو حرام نہیں کیا' وہ بدستور حلال ہیں' سو جس

چیز کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام نہ کیا ہو اس کو حرام قرار دے کر شریعت سازی نہ کرو۔

البحیرہ کا معنی:

بحر کے معنی وسعت ہے، جب کسی اونٹنی کے کان کو بہت لمبا چیر دیا جائے تو اسے بحیرہ کہتے ہیں، جب کوئی اونٹنی دس بچے جنتی تو وہ اس کان چیر کر اس کو آزاد چھوڑ دیتے، اس پر سواری کی جاتی نہ اس پر سامان لادا جاتا۔

(المفردات، ص ۳۷، مطبوعہ ایران، ۱۳۶۲ھ)

مسروق نے بیان کیا کہ جب اونٹنی کے پانچ یا سات بچے ہو جاتے تو وہ اس کا کان چیر دیتے اور کہتے ہیں یہ بحیرہ ہے۔

قتادہ نے بیان کیا کہ جب کسی اونٹنی کے پانچ ہو جاتے تو وہ پانچویں بچے کو دیکھتے اگر وہ نر ہوتا تو اس اونٹنی کو ذبح کر دیتے اور اس کو صرف مرد کھاتے، اور اگر وہ وہ بچہ مردہ ہوتا تو اس اونٹنی میں مرد اور عورت دونوں شریک ہوتے اور اگر پانچویں بار اونٹنی مونث کو جنم دیتی تو اس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا، اس کا دودھ دوہا جاتا نہ اس پر سواری کی جاتی، نہ اس کے بالوں کو حاصل کیا جاتا اور نہ اس کو ذبح کیا جاتا۔

(جامع البیان، جز ۷ ص ۱۳۳۔۱۲۰، مطبوعہ دارالفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

السائبہ کا معنی:

جب کوئی اونٹنی پانچ بچے جن لے تو اس کو چراگاہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا، اور اس کو پانی اور چارے سے منع نہیں کیا جاتا تھا، اس کو سائبہ کہتے تھے۔

(المفردات، ص ۲۴۶، مطبوعہ ایران، ۱۳۶۲ھ)

شعبی نے بیان کیا کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی اونٹنیوں اور بکریوں کو اپنے بتوں کے پاس ذبح کے لیے چھوڑ دیتے تھے، وہ لوگوں کی بکریوں کے ساتھ خلط ملط ہو جاتیں، ان کا دودھ صرف دوہتے تھے، اور جب ان میں سے کوئی مر جاتی تو مرد اور عورت دونوں اس کا گوشت کھاتے تھے۔ یہ سائبہ کی تفسیر ہے۔

سدی نے سائبہ کی تفسیر میں بیان کیا کہ زمانہ جاہلیت میں جب کسی شخص کا مال بہت زیادہ ہو جاتا، یا وہ کسی بیماری سے شفایاب ہو جاتا یا کسی سفر سے کامیاب لوٹتا تو وہ اپنی کسی اونٹنی کو آزاد چھوڑ دیتا، کوئی شخص اس سے نفع حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ ابن المسیب نے کہا جس اونٹنی کو وہ بتوں کے لیے چھوڑ دیتے وہ سائبہ کہلاتی۔

(جامع البیان، جز ۷ ص ۱۲۳۔۱۲۱، مطبوعہ دارالفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

سائبہ وہ اونٹنی ہے جس کی بتوں کے لیے نذر مانی جاتی اور اس کو بتوں کے خدام اور محافظوں کے سپرد کر دیا جاتا۔ وہ جہاں چاہتی، چرتی اس پر سامان لادا جاتا نہ اس کا اون کاٹا جاتا، اور نہ اس کا دودھ دوہا جاتا، البتہ مہمان مستثنیٰ تھا۔

(التفسیر المنیر، جز ۷، ص ۸۰، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

الوصیلہ کا معنی:

جب کسی شخص کی بکری نر اور مادہ دو بچے جنتی تو کہتے کہ بکری اپنے بھائی سے واصل ہو گئی ہے، پھر اس بچے کی وجہ سے نر اور

مادہ کو جنتی تو کہتے کہ یہ بکری اپنے بھائی سے واصل ہوگئی ہے' پھر اس مادہ بچے کی وجہ سے نر بچے کو بھی نہیں کرتے تھے' اس بکری کو مشرکین زمانہ جاہلیت میں "الوصیلہ" کہتے تھے۔

(المفردات' ص ۵۵' مطبوعہ ایران' ۱۴۶۲ھ)

علقمہ نے الوصیلہ کی تعریف میں کہا: جب اونٹنی صرف نر بچے کو جنم دیتی تو اس اونٹنی کو مرد کھاتے تھے' اور جب ایک ساتھ نر اور مادہ کو جنتی تو کہتے یہ اپنے بھائی کے ساتھ واصل ہوگئی ہے' پھر ان دونوں کو نہیں کھاتے تھے' اور جب نر مر جاتا تو اس کو صرف مرد کھاتے تھے' گویا نر کے ساتھ پیدا ہونے والی اونٹنی وصیلہ تھی۔

ابن المسیب نے بیان کیا کہ وصیلہ وہ اونٹنی تھی جو پہلی بار مادہ کو جنم دے' دوسری بار پھر مادہ کو جنم دے' وہ کہتے تھے کہ یہ وصیلہ ہے' دو مادہ اونٹنیوں کے درمیان نر نہیں ہے' اس اونٹنی کو وہ بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔

(جامع البیان' جز ۷' ص ۱۲۳۔۱۲۰' مطبوعہ دار الفکر' بیروت ۱۴۱۵ھ)

الحامی کا معنی:

وہ نر جو دس مرتبہ مادہ کو گیابھن کر دے' اس کو حامی کہتے تھے' اس پر سامان لادا جاتا تھا' نہ اس پر سواری کی جاتی تھی۔

(المفردات' ص ۱۳۳۔۱۳۲' مطبوعہ ایران' ۱۴۶۲ھ)

قتادہ نے کہا جو اونٹ اور اس کا بیٹا دس مرتبہ گیابھن کر دے' وہ حامی ہے۔

امام ابن جریر نے کہا کہ جس اونٹ کی ضرب سے مسلسل دس اونٹنیاں پیدا ہوں' درمیان میں نر نہ ہو' اس کو حامی کہتے تھے' اس پر سواری کی جاتی' نہ اس پر سامان لادا جاتا' نہ اس کا اون کاٹا جاتا' اس کو پانی اور چراگاہ سے منع نہیں کیا جاتا تھا۔

(جامع البیان' جز ۷' ص ۱۲۳۔۱۲۰' مطبوعہ دار الفکر' بیروت ۱۴۱۵ھ)

بحیرہ اور سائبہ وغیرھما کے متعلق احادیث:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

سعید بن المسیب نے بیان کیا کہ بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کا دودھ دوہنا بتوں کی وجہ سے منع کر دیا جاتا تھا' اور کوئی شخص اس کا دودھ نہیں دوہتا تھا' اور سائبہ وہ اونٹنی ہے جس کو وہ اپنے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے' اور اس پر کسی چیز کو لادا نہیں جاتا تھا' اور حضرت ابو ہریرہ (رض) نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا' وہ دوزخ میں اپنی آنتوں کو گھسیٹ رہا تھا' اور یہی وہ شخص ہے جس نے سب پہلے سائبہ اونٹنیوں کو چھوڑا تھا' اور وصیلہ وہ اونٹنی ہے جو پہلی بار اونٹ جنتی ہے اور دوسری بار اونٹنی جنتی ہے' وہ اس کو اپنے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے' بشرطیکہ وہ یکے بعد دیگرے مادہ کو جنم دے اور اس کے درمیان نر نہ ہو' اور حامی نر اونٹ ہے' جو چند معین مرتبہ گیابھن کرے' جب وہ اپنا عدد پورا کرے تو وہ اس اونٹ کو بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے' اور اس پر سامان نہیں لادتے تھے' اور اس کو الحامی کہتے تھے۔

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے دیکھا کہ دوزخ کی بعض آگ بعض کو کھا رہی تھی' اور میں نے دیکھا کہ عمرو اپنی آنتوں کو گھسیٹ رہا تھا اور یہ پہلا شخص تھا جس نے سائبہ اونٹنیوں کو چھوڑا۔

(صحیح البخاری' ج ۵' رقم الحدیث: ۴۶۲۴۔۴۶۲۳' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوالاحوص (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب تمہاری اونٹنیاں پیدا ہوتی ہیں تو ان کے کان سالم ہوتے ہیں' پھر تم استرا لے کر ان کے کان کاٹ ڈالتے ہو'اور کہتے ہو کہ یہ بحیرہ ہے'اور ان کے کان چیر دیتے ہو'اور کہتے ہو کہ یہ حرام ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا اللہ کی کلائی بہت سخت ہے اور اس کا استرا بہت تیز ہے اور تمہارا ہر مال جو تمہارے لیے حلال ہے'اس میں سے کوئی چیز حرام نہیں کی گئی۔

(مسند احمد ج ۵' رقم الحدیث: ۱۵۸۸۸' سنن کبری للبیہقی' ج ۱۰' ص ۱۰' جامع البیان' جز ۷' ص ۱۱۹-۱۱۸)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام عبدالرزاق' امام ابن ابی شیبہ اور امام ابن جریر نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ میں اس شخص کو ضرور پہچانتا ہوں جس نے سب سے پہلے سائبہ اونٹنیوں کو چھوڑا اور بتوں کے سامنے ذبح کرنے کے پتھر نصب کیے اور جس شخص نے سب سے پہلے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دین کو تبدیل کیا۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ شخص کون ہے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وہ شخص بنو کعب کا بھائی عمرو بن لحی ہے۔ میں نے اس کو دیکھا وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹ رہا تھا' اور اس کی آنتوں کی بدبو سے دوزخیوں کو اذیت پہنچ رہی تھی' اور میں اس شخص کو پہچانتا ہوں جس نے سب سے پہلے بحیرہ کے کان چیرے۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا وہ بنو مدلج کا ایک شخص ہے جس کی دو اونٹنیاں تھیں' اس نے ان کے کان چیرے اور ان کا دودھ دوہنا اور ان پر سامان لادنا حرام کر دیا' پھر اس کو ضرورت ہوئی تو اس نے ان کا دودھ پیا اور ان کی پشت پر سوار ہوا میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا' وہ اونٹنیاں اس کو اپنے مونہوں سے بھنبھوڑ رہی تھیں اور اپنے کھروں سے روند رہی تھیں۔

(یہ حدیث مرسل ہے) (در منثور ج ۲ ص ۳۳۸' جامع البیان' جز ۷' ص ۱۱۸' روح المعانی' جز ۷' ص ۴۴)

ایصال ثواب کے لیے نامزد جانوروں کا حلال اور طیب ہونا:

اللہ تعالیٰ نے ان چار جانوروں کو حرام نہیں کیا لیکن زمانہ جاہلیت میں مشرکوں نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حامی ٹھہرائے' ان کو اپنے بتوں کے لیے نامزد کیا' اور ان سے نفع حاصل کرنے کو حرام قرار دیا' اور یہ محض اللہ پر افتراء ہے' سو ان جانوروں کو جب مسلمان' اللہ کے نام پر ذبح کرے گا تو ان کا کھانا حلال اور طیب ہوگا' اسی طرح قربانی کے لیے جو جانور لوگوں کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں' یہ عبداللہ کی گائے ہے' یہ عبدالرحمن کا بکرا ہے' اور اولیاء اللہ کو ایصال ثواب کرنے کے لیے جو جانور ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں کہ مثلاً اس بکرے کو ذبح کر کے اس کے طعام کے صدقہ کے ثواب کو حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ یا حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش قدس سرہ کی روح کو پہنچایا جائے گا اور اس اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ یہ غوث پاک کا بکرا ہے یا یہ داتا صاحب کا بکرا ہے' تو جب اس کو مسلمان اللہ کے نام پر ذبح کرے گا تو اس کا گوشت بھی حلال اور طیب ہے۔

وصیت اور اس کے احکام

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ
الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ
ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ
بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا
قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾

(سورۃ المائدہ آیت 106)

’’اے ایمان والو! تمہارے آپس میں دو شخص کا گواہ ہونا مناسب ہے جبکہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وصیت کرنے کا وقت ہو وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں خواہ تم سے ہوں (۱) یا غیر لوگوں میں سے دو شخص ہوں اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو اور تمہیں موت آجائے (۲) اگر تم کو شبہ ہو تو ان دونوں کو بعد نماز روک لو پھر دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس قسم کے عوض کوئی نفع نہیں لینا چاہتے (۳) اگرچہ کوئی قرابت دار بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کی بات کو ہم پوشیدہ نہ کریں گے ہم اس حالت میں سخت گناہ گار ہونگے‘‘۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو: جب تم میں سے کسی کی موت (کا وقت) آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو تمہاری شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تم میں سے دو نیک آدمی (گواہ ہوں) اور اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو اور تم میں سے کسی کو موت آپہنچے تو غیروں میں سے ہی دو شخص (گواہ ہوں)' اگر تمہیں ان پر شک ہو تو تم ان دو گواہوں کو نماز کے بعد روک لو' وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم (کسی فائدہ کی وجہ سے) اس قسم کے عوض کوئی مال نہیں لیں گے اور خواہ قریبی رشتہ دار ہوں (ہم ان کی رعایت نہیں کریں گے) اور ہم اللہ کی گواہی نہیں چھپائیں گے ورنہ ہم سخت گنہگاروں میں شمار ہوں گے۔ پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو جن لوگوں کا حق ان گواہوں نے ضائع کیا ہے ان کی طرف سے دو گواہ ان کی جگہ کھڑے کیے جائیں اور وہ گواہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہماری شہادت ان (وصیوں) کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا' ورنہ ہمارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ یہ طریقہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ وہ (وصی) اس طرح شہادت دیں جس طرح شہادت دینے کا حق ہے یا وہ اس بات سے ڈریں کہ (ورثاء کی) قسموں کے بعد ان کی قسمیں مسترد کر دیں جائیں گی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام) سنو: اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

(المائدہ:۱۰۸۔۱۰۶)

سفر میں وصیت پر اہل کتاب کو گواہ بنانے کے متعلق احادیث:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں بنوسہم (عاص بن وائل سہمی کے قبیلہ) میں سے ایک شخص تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ (سفر میں) گیا۔ سہمی ایسی جگہ میں فوت ہوگیا جہاں کوئی مسلمان نہیں تھا، جب وہ دونوں سہمی کا ترکہ لے کر آئے تو اس کے ورثاء نے اس میں چاندی کا پیالہ گم پایا جس میں سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے حلف لیا، پھر وہ پیالہ مکہ میں پایا گیا اور ان لوگوں نے کہا ہم نے یہ پیالہ تمیم اور عدی سے خریدا ہے، پھر سہمی کے ورثاء میں سے دو شخصوں نے قسم کھا کر کہا کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور یہ پیالہ ان کے ساتھی کا ہے اور انھیں کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے۔

(المائدہ: ۱۰۸۔۱۰۶) (صحیح البخاری، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۷۸۰، سنن ابوداؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۶۰۶)

امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ نے اس حدیث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت ابن عباس (رض) اس آیت (المائدہ: ۱۰۶) کے متعلق تمیم داری سے روایت کرتے ہیں، تمیم داری نے کہا وہ اور عدی بن بداء دونوں نصرانی تھے، اور اسلام لانے سے پہلے شام کا سفر کرتے رہتے تھے۔ ایک بار وہ دونوں تجارت کے لیے شام روانہ ہوئے، تو ان کے پاس بنوسہم کے آزاد شدہ غلام بھی تجارت کے مقصد سے آئے، ان کا نام بدیل بن ابی مریم تھا، ان کے پاس چاندی کا ایک پیالہ تھا، وہ اس کو بادشاہ کے پاس لے جانا چاہتے تھے، وہ راستہ میں بیمار ہوگئے۔ انھوں نے ہم دونوں کو وصیت کی اور یہ کہا: ان کا ترکہ ان کے اہل کو پہنچا دیں۔ تمیم نے کہا جب وہ فوت ہوگئے تو ہم نے اس پیالہ پر قبضہ کرلیا، اس کو ہم نے ایک ہزار درہم میں فروخت کردیا۔ پھر میں نے اور عدی بن بداء نے اس رقم کو آپس میں تقسیم کرلیا، جب ہم بدیل سہمی کے گھر پہنچے تو اس کا باقی ترکہ جو ہمارے پاس تھا، وہ ہم نے اس کے گھر والوں کو دے دیا، انھوں نے اس ترکہ میں پیالہ کو گم پایا، تو ہم سے اس کے متعلق سوال کیا۔ ہم نے کہا اس نے اس کے سوا اور کچھ نہیں چھوڑا تھا، اور نہ اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہمیں دی تھی۔

تمیم نے کہا جب میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ تشریف لانے کے بعد مسلمان ہوگیا، تو میں نے اس فعل میں گناہ جانا، میں ان کے گھر گیا اور ان کو اصل واقعہ کی خبر دی، اور ان کو پانچ سو درہم واپس کردیئے، اور ان کو بتایا کہ میرے ساتھی کے پاس بھی اتنے درہم ہیں۔ وہ اس (عدی بن بداء) کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لائے آپ نے سہمی کے ورثاء سے گواہ طلب کیے، ان کے پاس گواہ نہیں تھے۔ پھر آپ نے ان کو حکم دیا کہ وہ عدی بن بداء سے قسم طلب کریں جو ان کے دین میں سب سے بڑی قسم ہو، اس نے قسم کھالی، تب یہ آیت نازل ہوئی (المائدہ: ۱۰۸۔۱۰۲) پھر عمرو بن العاص اور ایک اور شخص نے (ورثاء سہمی کے موقف پر اور عدی کے خلاف) قسم کھائی تو عدی بن بداء سے سو درہم وصول کیے گئے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد صحیح نہیں ہے۔

(سنن ترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۰۷۰، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

سفر میں وصیت کرنے اور غیر مسلموں کو گواہ بنانے کے جواز پر امام احمد کے دلائل:

ان آیتوں میں سفر اور حضر میں وصیت کرنے پر ترغیب دی گئی ہے، وصیت کے ثبوت اور اس کو نافذ کرنے کے لیے گواہ مقرر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل میں مسلمان گواہوں کو مقرر کرنا چاہیے اور یہ کہ ضرورت یا حاجت کے پیش نظر غیر مسلموں کو بھی گواہ بنایا جا سکتا ہے اس آیت میں فرمایا ہے تم میں سے دو شخص گواہ ہوں اس کا معنی ہے تمہارے دین اور تمہاری ملت سے دو گواہ ہوں یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، شریح، ابن سیرین اور شعبی کا قول ہے۔ امام احمد کا بھی یہی مختار ہے۔ پھر فرمایا ہے اور سفر میں غیروں میں سے ہی دو گواہ بنا لیے جائیں حضرت ابن مسعود، حضرت عباس اور دیگر مذکورالصدر فقہاء تابعین کے نزدیک اس سے مراد ہے جو لوگ تمہارے دین اور تمہاری ملت کے غیر ہوں، یعنی اہل کتاب میں سے ہوں، اور حسن اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہارے اقرباء اور رشتہ داروں کے غیر ہوں۔

جب یہ مراد لی جائے کہ غیروں سے مراد غیر مسلم اور اہل کتاب ہیں اور یہ کہ سفر میں وصیت پر اہل کتاب کو گواہ بنا لیا جائے، تو پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت محکمہ اور غیر منسوخ ہے یا یہ کہ اب یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے یا یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) ابن المسیب، ابن جبیر، ابن سیرین، قتادہ، شعبی، ثوری اور امام احمد کے نزدیک یہ آیت محکمہ اور اب بھی اہل کتاب کو سفر میں وصیت پر گواہ بنانا جائز ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہوئی:

(آیت) "واشهدوا ذوی عدل منکم"۔ (الطلاق: ۲)

ترجمہ: اور اپنوں (یعنی مسلمانوں) میں سے دو نیک شخصوں کو گواہ بناؤ۔

زید بن اسلم، امام مالک اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ کا بھی اسی طرح میلان ہے" انھوں نے کہا کہ اہل کفر عادل (نیک) نہیں ہیں اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ یہ حاجت اور ضرورت کا مقام ہے اور ایسے مواقع پر صرف عورتوں کی گواہی بھی صحیح ہوتی ہے۔ جیسے حیض، نفاس اور بچے کی پیدائش میں عورتوں کی گواہی صحیح ہوتی ہے۔ (زادالمیسر ج ۲ ص ۴۴۷۔۴۴۶، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۰۷ھ)

سفر میں وصیت پر غیر مسلموں کو گواہ بنانے کے عدم جواز پر جمہور فقہاء کے دلائل:

جمہور فقہاء کے نزدیک مسلمانوں کے معاملات میں کفار کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے، اور اس آیت میں جو غیروں کو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے، اس آیت میں غیروں سے مراد غیر مسلم ہو تو پھر یہ آیت "واشهدوا ذوی عدل منکم"۔ سے منسوخ ہے اور یا اس آیت سے منسوخ ہے:

(آیت) "واستشهدوا شهیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامراتن ممن ترضون من الشهدآء"۔ (البقرہ: ۲۸۲)

ترجمہ: اور اپنے (مسلمان) مردوں میں سے دو گواہ بنالو، اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔

اور ظاہر ہے کہ ذمی یا اہل کتاب شرعاً پسندیدہ ہیں، سو یہ آیت سورۃ مائدہ کی زیر تفسیر آیت کے لیے ناسخ ہے۔ اور ماضی میں

مسلمانوں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے اہل کتاب کو سفر میں وصیت پر گواہ بنانے کی اجازت دی گئی' کیونکہ اس وقت مسلمان صرف مدینہ میں تھے اور آج کے دور میں تو ہر جگہ مسلمان موجود ہیں'اس لیے کفار کی شہادت ساقط ہو جائے گی'اس لیے اب مسلمانوں کا کافروں کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے۔علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ اس بحث میں لکھتے ہیں:

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ شریح سے روایت کیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی صرف سفر میں وصیت پر گواہ بنانا جائز ہے'اور کسی موقع پر جائز نہیں ہے۔(جامع البیان'ج ۷'ص ۱۴۲)امام احمد بن حنبل سے بھی اسی کی مثل مروی ہے اور وہ اس میں منفرد ہیں۔ ائمہ ثلاثہ نے ان سے اختلاف کیا ہے'انھوں نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف اہل ذمہ کی گواہی جائز نہیں ہے۔(جامع البیان'ج ۷'ص ۱۴۴)اور امام طحاوی نے ابو داؤد سے روایت کیا ہے کہ ایک مسلمان شخص دقوقا میں فوت ہو گیا اور اس کو مسلمانوں میں سے کوئی شخص نہیں ملا جس کو وہ اپنی وصیت پر گواہ بناتا' تو اس نے دو اہل کتاب عیسائیوں کو گواہ بنا لیا' وہ دونوں کوفہ میں حضرت ابوموسیٰ کے پاس آئے' حضرت ابوموسیٰ نے کہا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد کے بعد اس طرح نہیں ہوتا تھا' پھر عصر کے بعد ان دونوں سے حلف لیا کہ انھوں نے خیانت کی ہے'نہ جھوٹ بولا ہے نہ وصیت میں کوئی تبدیلی کی ہے'پھر ان کی شہادت کو نافذ کر دیا۔(سنن ابو داؤد'ج ۲'رقم الحدیث: ۳۶۰۵' جامع البیان'جز ۷'ص ۱۴۳)امام طحاوی نے کہا یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اور حضرت ابن عباس (رض) کے نزدیک یہ آیت محکمہ (غیر منسوخ) تھی اور میرے علم کے مطابق صحابہ میں سے کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی ہے'اور اکثر فقہاء تابعین کا بھی یہی نظریہ ہے'اور نحاس نے ذکر کیا ہے کہ جو فقہاء یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اور کسی حال میں کافر کی شہادت جائز نہیں ہے'جس طرح فاسق کی شہادت جائز نہیں ہے۔وہ زید بن اسلم'امام شافعی اور نعمان (امام ابوحنیفہ) ہیں۔البتہ امام ابوحنیفہ نے کافروں کی ایک دوسرے کی خلاف شہادت کو جائز کہا ہے۔(عمدۃ القاری ج ۱۴'ص ۷۴ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

اہل ذمہ کی آپس میں گواہی کے جواز پر امام ابوحنیفہ کے دلائل:

امام ابوحنیفہ نے کہا ہے کہ کافروں کی ایک دوسرے کے خلاف گواہی جائز ہے'اور مسلمانوں کے خلاف ان کی گواہی جائز نہیں ہے' کیونکہ شہادت کی تمام آیات اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے مسلمانوں کے متعلق ہیں'اور کافروں کی گواہی ایک دوسرے کے متعلق قبول کی جائے گی۔قرآن مجید میں ہے:

(آیت)"والذین کفروا بعضھم اولیآء بعض"۔(الانفال:۷۳)

ترجمہ:اور کافر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

قرآن مجید نے کافروں کی ایک دوسرے پر ولایت ثابت کی ہے اور ولایت شہادت سے اعلیٰ درجہ ہے اور حدیث میں بھی اہل کتاب کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت کا ثبوت ہے۔

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ یہود ایک مرد اور عورت کو لے کر آئے'جنھوں نے زنا کیا تھا۔آپ نے فرمایا تم میرے پاس ایسے مردوں کو لے کر آؤ جو تمہارے سب سے بڑے عالم ہوں'وہ صوریا کے دو بیٹوں کو لے کر آئے آپ نے ان کو قسم دی کہ یہ بتاؤ کے توراۃ میں اس کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا توراۃ میں یہ مذکور ہے کہ جب چار آدمی یہ گواہی دیں کہ انھوں نے مرد کے

آلہ کو عورت کے اندام نہانی میں اس طرح دیکھا ہے جس طرح سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے تو ان دونوں کو رجم کر دیا جائے گا' آپ نے فرمایا پھر تم کو انھیں رجم کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ انھوں نے کہا ہماری سلطنت (اقتدار) چلی گئی' تو پھر ہم نے قتل کرنے کو ناپسند جانا' پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گواہوں کو بلایا' سو چار گواہ آئے اور انھوں نے یہ شہادت دی کہ انھوں نے اس مرد کے آلہ کو اس عورت کے اندام نہانی میں اس طرح دیکھا ہے' جس طرح سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے' تب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو رجم (سنگسار) کرنے کا حکم دیا۔ (سنن ابوداؤدج ۳' رقم الحدیث: ٤٤٥٣' سنن دارقطنی ج ٤' رقم الحدیث: ٤٣٠٥)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ اہل کتاب کی اہل کتاب کے خلاف شہادت جائز ہے' ایک اور حدیث سے بھی یہ بات مفہوم نکلتی ہے۔

امام علی بن عمر دارقطنی ۳۸۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ایک ملت والے دوسری ملت والوں کے وارث نہیں ہوتے اور ایک ملت والوں کی دوسری ملت والوں کے خلاف شہادت جائز نہیں ہے۔ ماسوا میری امت کے' کیونکہ ان کی شہادت دوسروں کے خلاف جائز ہے۔

(سنن دارقطنی ج ٤' رقم الحدیث: ٦٨' المعجم المعجم الاوسط للطبرانی' ج ٦' رقم الحدیث: ٥٤٣٠' مجمع الزوائد ج ٤' ص ٢٠١)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ملت کے افراد کی اپنی ملت والوں کے خلاف شہادت جائز ہے۔

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی ۵۹۳ لکھتے ہیں:

اہل ذمہ کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت قبول کی جائے گی' خواہ ان کی ملتیں مختلف ہوں۔ (مثلاً یہود کی گواہی نصاری کے خلاف مقبول ہوگی) امام مالک اور امام شافعی نے کہا ان کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی' کیونکہ یہ فاسق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

"(آیت) "والکافرون هم الفاسقون"۔

(قرآن مجید میں یہ آیت نہیں ہے' یہ صاحب ہدایہ کا تسامح ہے۔ البتہ اس معنی میں یہ آیت ہے

(آیت) "ومن کفر بعد ذالك فاولئك هم الفاسقون"۔ (النور: ٥٥)

اس لیے ان کی خبر پر توقف کرنا واجب ہے' اسی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف ان کی گواہی قبول نہیں کی جاتی اور وہ بمنزلہ مرتد ہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نصاری کی ایک دوسرے کے خلاف شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ نیز ان کو اپنے اوپر اور اپنے چھوٹے بچوں کے اوپر ولایت حاصل ہے۔ لہٰذا ان کو اس کی جنس پر شہادت کا حق بھی حاصل ہوگا' اور فسق اعتقادی شہادت کو قبول کرنے سے مانع نہیں ہے' کیونکہ وہ اپنے دین میں جس چیز کو حرام اعتقاد کرتے ہیں' اس سے اجتناب کرتے ہیں اور جھوٹ بولنا تمام ادیان میں حرام ہے۔ اس لیے وہ جھوٹی گواہی نہیں دیں گے اور ان کو مرتد پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے' کیونکہ مرتد کو کسی پر بھی ولایت حاصل نہیں ہوتی' اور ذمیوں کی گواہی مسلمانوں کے خلاف اس لیے مقبول نہیں ہے' کہ ذمیوں کو مسلمانوں پر ولایت حاصل نہیں ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

(آیت) "ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا"۔ (النساء: ١٤١)

اور اللہ کافروں کے لیے مسلمانوں کو مغلوب کرنے کا کوئی راستہ ہرگز نہیں بنائے گا۔

اور چونکہ کافر مسلمان سے دشمنی رکھتا ہے اور دار اسلام میں اس سے مغلوب ہے اس لیے وہ اس پر غلبہ پانے کے لیے جھوٹ بولے گا اور کفر کی ملتیں ہر چند کہ مختلف ہیں لیکن دار اسلام میں وہ ایک دوسرے سے مغلوب نہیں ہیں اس لیے ان میں باہم دشمنی نہیں ہوگی جو ان کو جھوٹی گواہی پر اکسائے اور حربی متامن (جو کافر پاسپورٹ لے کر ہمارے ملک میں آئے) کی گواہی ذمی کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی اور جو کافر الگ الگ ملکوں میں رہتے ہیں ان کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی۔

(ہدایہ اخیرین ص ۱۶۳ مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

اور اس سے پہلے جو ہم نے حدیث ذکر کی ہے کہ ایک ملت والوں کی دوسری ملت والوں کے خلاف قبول نہیں ہوگی اس سے مراد دو مختلف ملکوں میں رہنے والے کافر ہیں اور جو مختلف ملتوں والے ایک ملک کے کافر ہمارے ملک میں پاسپورٹ لے کر آئیں ان کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف قبول کی جائے گی کیونکہ یہاں وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں ہیں اور ان میں باہم دشمنی نہیں ہے جو ان کو ایک دوسرے کے خلاف جھوٹی گواہی پر ابھارے۔ البتہ! متامن کی شہادت ذمی کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی اور نہ مختلف ملکوں میں رہنے والے کافروں کی شہادت ایک دوسرے کے خلاف قبول کی جائے گی۔

(ہدایہ اخیرین ص ۱۶۳)

امام ابوحنیفہ کے استدلال پر علامہ قرطبی کے اعتراض کا جواب:

فقہاء مالکیہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک اہل ذمہ کی شہادت مطلقاً مقبول نہیں ہے مسلمان کے خلاف نہ اہل کتاب کے خلاف۔ اس لیے علامہ محمد بن احمد مالک قرطبی ۶۶۸ھ فقہاء احناف کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ نے اس آیت (المائدہ: ۱۰۸۔ ۱۰۶) سے یہ استدلال کیا ہے کہ اہل ذمہ کی آپس میں شہادت جائز ہے کیونکہ "اواخران من غیرکم" کا معنی ہے "یا ان کو گواہ بناؤ جو دین میں تمہارے غیر ہیں" اور جب اہل ذمہ کو مسلمان گواہ بنا سکتے ہیں تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو بطریق اولیٰ گواہ بنا سکتے ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ تمہارے نزدیک تو مسلمانوں کا اہل ذمہ کو گواہ بنانا جائز نہیں ہے اور تمہارے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے اس لیے تمہارا یہ استدلال جائز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت عبارت النص سے اس پر دلالت کرتی ہے کہ اہل ذمہ کو مسلمانوں کے خلاف گواہ بنانا جائز ہے اور بہ طریق تنبیہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اہل کتاب کی آپس میں گواہی بھی جائز ہے کیونکہ جب ان کی شہادت مسلمانوں کے خلاف جائز ہے تو اپنی ملت والوں کے خلاف بہ طریق اولیٰ جائز ہوگی۔ پھر جب دوسرے دلائل سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کے خلاف ان کی شہادت باطل ہے تو آپس میں ان کی شہادت کا جواز اپنے حال پر باقی رہا لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ اہل ذمہ کی آپس میں شہادت کا جائز ہونا اس مسئلہ کی فرع ہے کہ اہل ذمہ کی مسلمانوں کے خلاف شہادت جائز ہونا اس مسئلہ کی فرع ہے کہ اہل ذمہ کی مسلمانوں کے خلاف شہادت جائز ہو اور جب اہل ذمہ کی مسلمانوں کے خلاف شہادت باطل ہوگی جو اصل تھی تو جو اس کی فرع ہے یعنی اہل ذمہ کی آپس میں شہادت کا جواز وہ بہ طریق اولیٰ باطل ہو جائے گا۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۶ ص ۲۷۰۔ ۲۶۹ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ قرطبی کی اس عالمانہ بحث کی متانت سے ہمیں انکار نہیں ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ نے اہل ذمہ کی آپس میں شہادت کے جواز پر اس آیت سے استدلال نہیں کیا بلکہ ان کا استدلال اس آیت سے (آیت) "والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض"۔ (الانفال

:۷۳) یہ آیت اور اس کے علاوہ دو حدیثیں جن سے امام اعظم نے استدلال کیا ہے، ہم اس سے متصل پہلے عنوان میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اہل ذمہ آپس میں خرید و فروخت کرتے ہیں، اجرت اور قرض کا لین دین کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی دوسرے کے ساتھ زیادتی بھی کرتا ہے۔ مثلاً قتل کرتا ہے یا زخمی کرتا ہے اور ان میں دیگر جرائم بھی ہوتے ہیں اور باہمی تنازعات بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ اپنے مقدمات مسلمان حاکموں کے پاس لے جاتے ہیں، اگر ان کے معاملات، جرائم اور تنازعات میں ان کی اپنی شہادت قبول نہ ہو تو ان کے حقوق معطل ہو جائیں گے۔ ہمارے ملک میں ان کو انصاف نہیں مل سکے گا اور ظلم اور فساد کا غلبہ ہوگا، اور یہ اسلام کے منشاء کے خلاف ہے، اس لیے ضرورت کا یہ تقاضا ہے کہ دارالاسلام میں اہل ذمہ میں ایک دوسرے کے متعلق شہادت کو قبول کیا جائے۔ اور اس مسئلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہ کا موقف ہی قرآن مجید، احادیث اور عقل سلیم کے مطابق ہے۔

ناگزیر صورت میں غیر مسلموں کو گواہ بنانے کا جواز:

بعض اوقات سفر میں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی مسلمان کو وصیت کے وقت کوئی مسلمان گواہ میسر نہ ہو، تو اب اگر مسلمانوں کے معاملات میں اہل کتاب کی شہادت بالکل میسر نہ ہو تو بعض مواقع پر مسلمانوں کے حقوق معطل ہو جائیں گے۔ اس لیے جہاں ایسی صورت ہو وہاں کسی غیر مسلم سے اس کے مذہب کے مطابق قسم لے کر امام احمد بن حنبل کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے، اس کو گواہ بنا لیا جائے، تو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ اس آیت کا منسوخ ہونا متفق علیہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن المسیب، ابن جبیر، ابن سیرین، قتادہ شعبی، ثوری اور امام احمد کے نزدیک یہ آیت محکمہ ہے اور منسوخ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی ایسی صورت میں کسی غیر مسلم کو اس کے مطابق قسم لے کر گواہ بنا لیا جائے، تو یہ ظاہر قرآن کے بھی مطابق ہے اور اس میں آسانی ہے اور مسلمانوں کے حقوق کا بھی تحفظ ہے۔

شک اور شبہ کی بناء پر ملزم یا متہم کو قید میں رکھنے کا جواز:

اس آیت میں فرمایا ہے:

اگر تمہیں ان پر شک ہو تو تم ان دو گواہوں کو نماز کے بعد روک لو۔

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جس شخص پر کسی قسم کا شبہ ہو اس کو روکنا اور قید کرنا جائز ہے۔

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

بہز بن حکیم اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو تہمت کی بنا پر قید کر لیا۔ امام ترمذی کی روایت میں ہے، بعد میں اس کو رہا کر دیا۔

(سنن ابو داؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۶۳۰، سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۴۲۲، سنن نسائی، ج ۸، رقم الحدیث: ۴۸۹۱)

علامہ احمد بن محمد خطابی متوفی ۳۸۸ھ لکھتے ہیں:

قید کرنے کی دو قسمیں ہیں۔ بطور سزا کے قید کرنا اور بطور تفتیش کے قید کرنا اور بطور سزا کے اس وقت قید کیا جائے گا جب اس پر کوئی حق واجب ہوگا یا جرم ثابت ہوگا' اور جس شخص کو تہمت کی بناء پر قید کیا جائے گا تو اس کی تفتیش کی جائے گی اور حدیث میں ہے' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو دن کے تھوڑے وقت کے لیے قید کیا' پھر اس کو رہا کر دیا۔

(معالم السنن مع مختصر سنن ابو داؤد' ج ۵' ص ۲۳۷' مطبوعہ دار المعرفۃ' بیروت)

نیز امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں:

عبداللہ حزاری بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ کلاعیین کے لوگوں کی چوری ہوگئی' انھوں نے حاکہ کے کچھ لوگوں پر چوری کی تہمت لگائی' وہ لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صحابی حضرت نعمان بن بشیر (رض) کے پاس گئے' حضرت نعمان نے حاکہ کے لوگوں کو چند روز قید رکھا' پھر ان کو رہا کر دیا۔ کلاعیین حضرت نعمان کے پاس گئے اور کہا' آپ نے ان لوگوں کو بغیر مارے پیٹے اور بغیر امتحان لیے رہا کر دیا۔ حضرت نعمان (رض) نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں ان کو مار لگاؤں' پھر اگر تمہارا سامان نکل آیا تو فبہا' ورنہ میں تمہاری پشت پر اتنے کوڑے لگاؤں گا جتنے ان کو لگائے ہوں گے۔ انھوں نے کہا یہ آپ کا فیصلہ ہے؟ حضرت نعمان نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم ہے۔

امام ابو داؤد نے کہا اعتراف سے پہلے کسی کو مارنا جائز نہیں ہے۔

(سنن ابو داؤد ج ۳' رقم الحدیث: ۴۳۸۲' سنن النسائی' ج ۸' رقم الحدیث: ۴۸۸۹)

ہمارے ملک میں محض شبہ کی بنا پر کسی شخص کو حوالات میں اتنی مار لگائی جاتی ہے کہ وہ مار سے بچنے کے لیے اپنے ناکردہ جرائم کو اعتراف کر لیتا ہے' یہ اسلام کے خلاف ہے۔

علامہ سندی نے لکھا ہے کہ تہمت اور شبہ کی بناء پر کسی کو قید کرنا جائز ہے۔

مجرموں کو قید میں رکھنے کا جواز:

مجرموں کو قید میں رکھنے کی اصل یہ حدیث ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑے سواروں کی ایک جماعت نجد کی طرف بھیجی' وہ ایک شخص کو گرفتار کر کے لائے جس کا نام ثمامہ بن آثال تھا' صحابہ نے اس کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا' نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس تشریف لائے اور پوچھا اے ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا نیک خیال ہے۔ اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو آپ ایک خونی کو قتل کریں گے اور آپ مجھ پر احسان کریں گے تو ایک شکر گزار پر احسان کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو جتنا چاہیں مجھ سے سوال کریں' اس کو اسی طرح رکھا گیا۔ آپ نے دوسرے دن پھر اس سے فرمایا: اے ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا وہی جو میں نے آپ سے کہا تھا' اگر مجھ پر احسان کریں گے تو ایک شکر گزار پر احسان کریں گے' اس کو پھر اسی طرح رکھا گیا۔ تیسرے دن آپ نے پھر اس سے سوال کیا: اے ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا وہی جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں۔ آپ نے فرمایا ثمامہ کو کھول دو' پھر ثمامہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے درخت کے پاس گیا' اس

نے غسل کیا' پھر مسجد میں داخل ہوااور کہنے لگا۔"اشھدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھدان محمد رسول اللہ" اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بخدا (پہلے) تمام روئے زمین پر مجھے آپ کا چہرہ سب سے زیادہ برا لگتا تھا' اور اب آپ کا چہرہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے' اور بخدا! میں پہلے سب سے زیادہ آپ کے دین سے بغض رکھتا تھا اور اب آپ کا دین مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور پہلے میں آپ کے شہر سے سب سے زیادہ بغض رکھتا تھا اور اب آپ کا شہر مجھے تمام شہروں میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ آپ کے سواروں نے مجھے گرفتار کرلیا تھا' اور اب میں عمرہ کرنا چاہتا ہوں' آپ کی کیا رائے ہے؟ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو بشارت دی اور اسے عمرہ کرنے کا حکم دیا' جب وہ مکہ میں پہنچا تو اس سے کسی شخص نے کہا کیا تم نے دین بدل لیا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں! بخدا میں سیدنا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مسلمان ہوگیا ہوں' بخدا تمہارے پاس اب یمامہ سے اس وقت تک گندم کا ایک دانہ بھی نہیں پہنچے گا جب تک کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی اجازت نہیں دیں گے۔

(صحیح البخاری' ج ٥' رقم الحدیث: ٤٣٧٢' سنن ابوداؤد' ج ٢' رقم الحدیث: ٢٦٧٩'
صحیح مسلم' جہاد' ٨٩' (١٧٦٩) ٤٥٠٨' سنن النسائی ج ١' رقم الحدیث: ١٨٩' مسند احمد' ج ٢' ص ٤٥٢' ج ٣' ص ٨٢' طبع قدیم)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تین دن ثمامہ بن آثال کو قید رکھا اور یہ حدیث مجرموں کو قید میں رکھنے کی اصل ہے۔

نادہندہ مقروض کو قید کرنے کے متعلق احادیث:

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ٢٧٥ھ روایت کرتے ہیں:

ہرماس بن حبیب نے اپنے والد سے اور انھوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس اپنے مقروض کو لے کر آیا' آپ نے فرمایا اس کو قید کرلو' پھر مجھ سے فرمایا: اے بنو تمیم کے بھائی! تم اپنے قیدی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟

(سنن ابوداؤد' ج ٢ رقم الحدیث: ٣٦٢٩' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت)

اس حدیث میں نادہندہ مقروض کو قید میں رکھنے کی دلیل ہے۔

عمرو بن الشرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا متمول آدمی کی (قرض واپس کرنے میں) سستی اور تاخیر اس کی عزت اور سزا کو حلال کردیتی ہے۔

امام ابن المبارک نے کہا کہ عزت کو حلال کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس سے سختی اور درشت کلام کے ساتھ تقاضا کیا جائے اور سزا حلال کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس کو قید کرلیا جائے۔ (علامہ نووی اور علامہ سندی نے بھی یہی تشریح کی ہے)

(سنن ابوداؤد' ج ٢' رقم الحدیث: ٣٦٢٨' سنن النسائی' ج ٧' رقم الحدیث: ٤٧٠٤۔٤٧٠٣' سنن ابن ماجہ' ج ٢' رقم الحدیث: ٢٤٢٧' مسند احمد' ج ٦' رقم الحدیث: ١٧٩٦٨' طبع جدید' دارالفکر' مسند احمد' ج ٤' ص ٣٨٩۔٣٨٨۔٢٢٢' طبع قدیم' امام بخاری نے اس حدیث کو تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ کتاب الاستقراض' باب ١٣)

نیز امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ قاضی شریح مقروض کو مسجد کے ستون سے باندھنے کا حکم دیتے تھے۔

(کتاب الصلوٰۃ' باب ٧٦)

نادہندہ مقروض کو قید کرنے کے متعلق مذاہب ائمہ:

علامہ احمد بن محمد خطابی متوفی ۳۸۸ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ تنگ دست اور غریب مقروض کو عدم ادائیگی پر قید نہیں کیا جائے گا' کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو جائز کہا ہے جو ادائیگی پر قادر ہو اور اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ قاضی شریح کا نظریہ یہ تھا کہ متمول اور تنگ دست دونوں کو قید کر دیا جائے' اصحاب رائے کا بھی یہی نظریہ ہے۔ (فقہاء احناف کا یہ نظریہ نہیں ہے سعیدی غفرلہ) امام مالک نے کہا تنگ دست کو قید نہیں کیا جائے گا' اس کو ادائیگی کے لیے مہلت دی جائے گی' امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ جو شخص بظاہر تنگ دست ہو' اس کو قید نہیں کیا جائے گا اور جو شخص بظاہر متمول ہو اور وہ اپنے حق کو ادا نہ کرتا ہو' تو اس کو قید کیا جائے گا اور بعض اصحاب شافعیہ نے اس میں مزید قیود کا اضافہ کیا ہے۔

(معالم السنن مع مختصر سنن ابوداؤد ج ۵' ص ۲۳۷-۲۳۶)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں

اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جب مقروض قرض ادا کرنے پر قادر ہو (اور قرض ادا نہ کرے) تو اس پر سختی کرنے کے لیے اس کو قید کرنا جائز ہے۔

(فتح الباری ج ۵ ص ۶۲ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور ۱۴۰۱ھ)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث یہ استدلال کیا گیا ہے کہ جب مقروض قرض ادا کرنے پر قادر ہو (اور قرض ادا نہ کرے) تو اس پر سختی کرنے کے لیے اس کو قید کرنا جائز ہے' کیونکہ اس وقت وہ ظالم ہے اور ظلم حرام ہے' خواہ وہ قلیل ہو اور اگر مقروض کا تنگ دست ہونا ثابت ہو تو اس کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کو قید کرنا حرام ہے' اور جس شخص کا تنگ دست ہونا ثابت ہو گیا ہو اور اس کو قید سے نکال دیا گیا ہو تو اس میں اختلاف ہے' کہ آیا قرض خواہ مقروض کے ساتھ لازم رہے یا نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی یہ کہتے ہیں کہ جب تک اس کے پاس کسی اور مال کا ثبوت نہ ہو' وہ اس کے ساتھ لازم نہ رہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ یہ فرماتے ہیں کہ حاکم قرض خواہوں کو اس کے ساتھ لزوم سے منع نہ کرے۔

(عمدۃ القاری ج ۱۲ ص ۲۳۶' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ' مصر ۱۳۴۸ھ)

جس طرح مالی حقوق میں اس شخص کو قید کرنا جائز ہے جس پر کسی کا مالی حق ہو' اسی طرح بدنی حقوق میں استغاثہ کو حق دلانے کے لیے اس شخص کو قید کرنا جائز ہے جس پر قصاص لازم ہو' اسی طرح جس شخص نے حدود میں سے کسی حد کا ارتکاب کیا ہو' اس پر حد نافذ کرنے کے لیے اس کو قید کرنا جائز ہے۔

گواہ بنانے کے لیے بعد از نماز وقت کی خصوصیت:

اس آیت میں فرمایا ہے:

اگر تمہیں ان پر شک ہو تو تم ان دو گواہوں کو نماز کے بعد روک لو وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں۔

اکثر علماء نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں "بعد از نماز" سے مراد از نماز عصر ہے' کیونکہ تمام ادیان میں اس وقت کو عظیم گردانا جاتا ہے اور وہ اس وقت میں جھوٹ بولنے سے اور جھوٹی قسم کھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اس وقت میں دن کے فرشتے بندہ کے اعمال لکھ رہے ہیں اور رات کے فرشتے اس کے اعمال لکھنے کے لیے آ رہے ہوتے ہیں اور یہ وقت دونوں فرشتوں کے اجتماع کا ہوتا ہے اور اس وقت جو عمل کیا جائے اس کو دن کے فرشتے بھی لکھ لیتے ہیں اور رات کے فرشتے بھی لکھ لیتے ہیں' اس وقت بندوں کے اعمال قبول کیے جانے کے لیے عرش کی طرف فرشتے لے جاتے ہیں' اس لیے اس وقت میں زیادہ سے زیادہ نیک عمل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' اور برے اعمال سے حتی الامکان گریز کیا جاتا ہے' خصوصیت سے اس وقت میں جھوٹی قسم کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ کلام نہیں کرے گا' اور نہ ان کی طرف نظر (رحمت) فرمائے گا' اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے' ایک وہ شخص جس کے پاس راستہ میں فاضل پانی ہو اور وہ مسافروں کو پانی (لینے) سے منع کرے۔ دوسرا وہ شخص جو کسی شخص سے محض دنیا کے لیے بیعت کرے' اگر وہ اس کی خواہش کے مطابق دے تو اس سے بیعت کو پورا کرے' ورنہ بیعت پوری نہ کرے۔ اور تیسرا وہ شخص جو عصر کے بعد کسی آدمی کو کسی چیز کی قیمت بتائے' اور اللہ کی قسم کھا کر کہے کہ اسے وہ چیز اتنے اتنے میں ملی ہے اور وہ آدمی اس کو لے لے' حالانکہ اسے اتنے میں نہ ملی ہو۔

(صحیح البخاری' ج ۳' رقم الحدیث: ۲۶۷۲' ج ۸' رقم الحدیث: ۷۲۱۲)

اس حدیث میں یہ تصریح ہے کہ جو شخص عصر کے بعد جھوٹی قسم کھائے گا' اللہ عزوجل اس سے کلام نہیں کرے گا' نہ اس کی طرف نظر رحمت فرمائے گا' نہ اس کو پاک کرے گا اور اس کو دردناک عذاب ہوگا۔

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں

عصر کے وقت کو زیادہ گناہ کے ساتھ خاص کیا ہے۔ حالانکہ جھوٹی قسم ہر وقت کھانا حرام ہے' کیونکہ یہ عظیم الشان وقت ہے' اس وقت میں ملائکہ جمع ہوتے ہیں اور یہ اعمال کے ختم ہونے کا وقت ہے اور امور کا مدار خاتمہ پر ہے۔ اس لیے اس وقت میں گناہ کے ارتکاب پر سخت سزا رکھی ہے' تاکہ لوگ اس وقت میں گناہوں پر جرات نہ کریں اور متقدمین عصر کے بعد حلف لیتے تھے اور اس سلسلہ میں حدیث بھی ہے۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۰۳' مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ' لاہور ۱۴۰۱ھ)

قسم دلانے اور گواہ بنانے میں مقام کی خصوصیت میں مذاہب:

جس طرح قسم کو پختہ کرنے کے لیے زمان کے اعتبار سے عصر کے بعد کے وقت کی خصوصیت ہے' اسی طرح مکان اور مقام کے اعتبار سے کسی جگہ کی بھی اہمیت ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام بخاری نے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ مدعی علیہ جہاں چاہے قسم کھائے اور اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جائے گا اور اس کے تحت یہ اثر ذکر کیا ہے کہ مروان نے حضرت زید بن ثابت (رض) کے خلاف فیصلہ کیا کہ وہ منبر پر قسم کھائیں' حضرت زید (رض) نے کہا میں اپنی جگہ قسم کھاؤں گا' پھر زید قسم کھانے لگے اور

انھوں نے منبر پر قسم کھانے سے انکار کیا' مروان کو اس سے تعجب ہوا' حضرت زید (رض) نے کہا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم دو گواہ پیش کرو یا وہ قسم اٹھائے گا اور آپ نے کسی جگہ کی تخصیص نہیں فرمائی۔

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک قسم دلانے کے لیے کسی خاص مقام کی ضرورت نہیں ہے' اور امام بخاری کا بھی اسی طرف میلان ہے۔ علامہ ابن عبد البر مالکی نے کہا قسم میں امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ جب چوتھائی دینار یا اس سے زائد کے معاملہ پر قسم کھانی ہو تو جامع مسجد میں یا جامع مسجد کے منبر پر قسم دلائی جائے گی' اور جب اس سے کم کا معاملہ ہو تو حاکم کی مجلس میں' بازار میں یا کسی بھی جگہ قسم کھائی جاسکتی ہے' اور اس پر قبلہ کی طرف متوجہ ہونا ضروری نہیں ہے' اور امام مالک منبر مدینہ کے سوا اور کسی منبر کو نہیں پہچانتے تھے' اور جو شخص منبر مدینہ کے پاس قسم کھانے سے انکار کرے' وہ ان کے نزدیک قسم کھانے سے منکر ہے اور قسامت کی قسموں میں امام مالک کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ رکن اور مقام کے درمیان قسم کھائے۔ علامہ ابن عبد البر نے کہا ہے: کہ امام شافعی کا مذہب بھی امام مالک کی طرح ہے' لیکن ان کے نزدیک منبر مدینہ یا مکہ میں رکن اور مقام کے نزدیک قسم کھانا اس وقت ضروری ہے جب بیس دینار دینار یا اس سے زائد کا معاملہ ہو اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ عنہ اور صاحبین کے نزدیک کسی شخص سے کسی بھی معاملہ میں خواہ قلیل مال کا معاملہ ہو' یا کثیر مال کا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے منبر پر قسم لینا ضروری نہیں ہے' اور نہ قصاص اور دیت میں اور نہ کسی اور چیز میں' اور جس شخص پر قسم واجب ہو تو حکام اپنی مجلس میں اس سے قسم لے لیں۔

امام ابوحنیفہ نے حضرت زید بن ثابت کے اثر سے استدلال کیا ہے' کیونکہ انھوں نے منبر پر قسم نہیں کھائی اور جو اس کو ضروری قرار دیتے ہیں' وہ مروان کے قول سے بلا دلیل استدلال کرتے ہیں۔ صاحب التوضیح نے امام شافعی کی طرف سے استدلال کیا ہے کہ اگر حضرت زید بن ثابت (رض) کو یہ یقین ہوتا کہ منبر پر قسم کھانا سنت نہیں ہے تو وہ مروان پر رد کرتے اور کہتے کہ نہیں' خدا کی قسم! میں منبر پر قسم نہیں کھاؤں گا' میں صرف تمہاری مجلس میں قسم کھاؤں گا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ عجیب استدلال ہے' اگر حضرت زید کو علم ہوتا کہ منبر پر قسم کھانا سنت ہے' تو وہ مروان کی مجلس میں قسم نہ کھاتے اور منبر پر ہی قسم کھاتے' لیکن انھوں نے مروان کے کلام کی طرف توجہ نہیں کی اور اسی مجلس میں قسم کھائی اور یہ مروان کا رد نہیں تو اور کیا ہے!

(عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۲۵۳۔ ۲۵۲' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

حضرت زید بن ثابت (رض) کی تائید میں یہ اثر ہے۔ امام ابوعبیدہ نے کتاب القضاء میں سند صحیح کے ساتھ نافع سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) ایک شخص کے وصی تھے' ان کے پاس ایک شخص ایک دستاویز لے کر آیا' جس میں گواہوں کے نام مٹ چکے تھے۔ حضرت ابن عمر (رض) نے نافع سے کہا: اس کو منبر پر لے جا کر اس سے حلف لو۔ اس شخص نے کہا جب یہ منبر پر مجھ سے حلف لے گا تو آپ تو نہیں سن رہے ہوں گے حضرت ابن عمر (رض) نے فرمایا تم نے سچ کہا: اور اس شخص سے اسی مجلس میں حلف لیا۔

مروان کی تائید میں بھی اثر ہے۔ امام کرابیسی نے آداب القضاء میں سند قوی کے ساتھ سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے۔ ایک شخص نے کسی آدمی پر یہ دعوی کیا کہ اس نے اس شخص کا اونٹ غصب کرلیا ہے' اس نے حضرت عثمان (رض) کے پاس مقدمہ پیش

کیا، حضرت عثمان (رض) نے اس کو حکم دیا کہ وہ منبر پر قسم کھائے، اس نے قسم کھانے سے انکار کیا اور کہا: منبر کے علاوہ اور آپ جہاں چاہیں میں قسم کھاؤں گا، حضرت عثمان (رض) نے فرمایا نہیں تم کو منبر پر قسم کھانی ہوگی، ورنہ اونٹ تاوان میں دینا پڑے گا، اس شخص نے اونٹ تاوان میں دے دیا اور منبر پر قسم نہیں کھائی۔

جس طرح زمان کے اعتبار سے قسم کی تغلیظ میں عصر کے بعد کے وقت کی تخصیص ہے۔ اسی طرح مکان کے اعتبار سے قسم کی تغلیظ میں منبر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تخصیص ہے، اور اس سلسلہ میں دو مرفوع حدیثیں ہیں:

(۱) امام مالک، امام ابو داؤد، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام ابن خزیمہ نے تصحیح کے ساتھ اور امام ابن حبان اور امام حاکم وغیرہم نے حضرت جابر (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص میرے اس منبر پر جھوٹی قسم کھائے گا، خواہ وہ ایک سبز مسواک پر قسم کھائے، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔

(۲) امام نسائی نے ثقہ راویوں سے روایت کیا ہے حضرت ابو امامہ بن ثعلبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے میرے اس منبر پر جھوٹی قسم کھائی، جس سے وہ کسی مسلمان شخص کا مال ہڑپ کرنا چاہتا ہوں، اس پر اللہ کی فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہو، اللہ اس کا کوئی فرض قبول کرے گا، نہ نفل۔ (فتح الباری ج ۵ ص ۲۸۵ مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور ۱۴۰۱ھ)

اس میں کوئی شک نہیں کہ منبر رسول پر جھوٹی قسم کھانا بہت بڑا گناہ ہے، اور جس قسم میں تغلیظ مقصود ہو، تو وہ منبر رسول پر قسم دینی چاہیے، لیکن یہ ہے کہ کیا یہ واجب ہے؟ اور کیا تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے اس پر عمل کرنا ممکن ہے؟ عصر کے بعد کا وقت تو دنیا میں ہر جگہ حاصل ہوسکتا ہے، اس لیے سخت اور قوی قسم دینے کے لیے عصر کے وقت کی خصوصیت درست ہے۔ لیکن رکن اور مقام پر قسم دینا یا منبر رسول پر قسم دینا، یہ عملاً صرف حرمین طیبین میں ہی ممکن ہے اور اب اسلام تمام دنیا میں پھیل چکا ہے۔ خصوصاً پاسپورٹ اور ویزے کی پابندی کے اس دور میں معقول مذہب صرف امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا ہے، اور وہی قابل عمل ہے۔

صرف اللہ کی ذات کی قسم کھائی جائے یا اس کی صفات کا بھی ذکر کیا جائے:

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

جس ذات کی قسم کھائی جائے اس کی صفات کے ذکر میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے کہا ان الفاظ کے ساتھ قسم کھائے" باللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ الرحمن الرحیم" امام شافعی نے کہا اس میں یہ اضافہ بھی کرے" الذی یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور والذی یعلم من السر ما یعلم من العلانیۃ" علامہ سحنون مالکی نے کہا اللہ اور مصحف کی قسم کھائے اور ہمارے اصحاب احناف کے نزدیک صرف اللہ کے نام کی قسم کھانا کافی ہے، طلاق کی قسم نہ کھائے (یعنی اگر میں نے یہ کام کیا ہے تو میری بیوی کو طلاق) ہاں! اگر فریق مخالف اللہ کی قسم کو اہمیت نہ دیتا ہو اور طلاق کی قسم کا مطالبہ کرے تو پھر طلاق کی قسم کھائے، لیکن اگر اس نے طلاق کی قسم کھانے سے انکار کیا تو اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اس نے اس چیز سے انکار کیا ہے جو شرعاً ممنوع ہے، اور اگر اس کے خلاف فیصلہ کر بھی دیا گیا، تو وہ نافذ نہیں ہوگا۔ قسم کو زیادہ پختہ اور موکد کرنے کے لیے اللہ کی صفات کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ جو شخص عرف

میں نیک ہو اس سے پختہ قسم کا مطالبہ نہ کیا جائے اور دوسروں سے مطالبہ کیا جائے اور ایک قول یہ ہے کہ زیادہ مال کے معاملہ میں پختہ قسم کا مطالبہ کیا جائے اور کم مال کے معاملہ میں نہ کیا جائے اور زمان اور مکان کے اعتبار سے قسم کو پختہ نہ کیا جائے (یعنی عصر کے بعد قسم کا مطالبہ کرے یا مسجد کے منبر پر قسم کھانے کا مطالبہ کرے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ جب اس وقت میں اور منبر پر قسم کھانے کا رواج عام ہو جائے گا تو لوگوں کے نزدیک ان کی وقعت کم ہو جائے گی۔ ہاں کسی بہت اہم اور خاص معاملہ میں زمان و مکان کے ساتھ تغلیظ کرنی چاہیے اور اللہ کی ذات اور صفات کی قسم دینی چاہیے کیونکہ امام ابو داؤد نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو قسم دی اور فرمایا یہ قسم کھاؤ۔ "باللہ الذی لا الہ الا ھو" میرے پاس مدعی کی کوئی چیز نہیں ہے۔ (سنن ابو داؤد ج ۲ رقم الحدیث: ۳۶۲۰) اس طرح قرآن حدیث اور آثار صحابہ سب پر عمل ہوگا کیونکہ قرآن مجید میں (عصر کی) نماز کے بعد قسم دلانے کا حکم ہے اور حدیث میں اللہ کی ذات اور صفات کے ساتھ قسم دینے کا حکم ہے اور آثار صحابہ میں مسجد کے منبر پر قسم دینے کا ذکر ہے۔ اس لیے قسم کی تغلیظ تاکید اور اس کو پختہ کرنے کے لیے ان امور کے ساتھ قسم دی جائے لیکن چونکہ قرآن اور حدیث میں اس تغلیظ کو واجب اور ضروری نہیں قرار دیا اس لیے ان امور کے ساتھ تغلیظ کو عام معمول نہ بنایا جائے تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی وقعت اور اہمیت کم نہ ہو اور کسی بہت اہم اور غیر معمولی معاملہ میں جہاں بہت تاکید اور تغلیظ مقصود ہو وہاں عصر کے بعد مسجد کے منبر پر اللہ کی ذات اور صفات کی قسم دی جائے۔

توضیح میں یہ مذکور ہے کہ کیا قسم دیتے وقت مصحف (قرآن مجید) کو بھی حاضر کیا جائے؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام مالک نے اس کا انکار کیا اور بعض مالکی علماء نے کہا بیس دینار یا اس سے زیادہ کی مالیت میں مصحف کو حاضر کرنا لازم ہے اور ابن المنذر نے امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا میں نے مطرف کو دیکھا وہ مصحف کے سامنے حلف اٹھاتے تھے۔ (عمدۃ القاری ج ۱۳ ص ۲۵۳ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

مدعی کی قسم پر فیصلہ کرنے کی توجیہ:

اس آیت میں فرمایا ہے پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو جس لوگوں کا حق ان گواہوں نے ضائع کیا ہے ان کی طرف سے دو گواہ ان کی جگہ کھڑے کیے جائیں اور وہ گواہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اس واقعہ میں پہلے میت کے وصیوں نے قسم کھائی کہ ہم کو اس میت نے صرف اتنا ہی مال دیا تھا (جس میں چاندی کا پیالہ نہیں تھا) اور ورثاء نے یہ دعویٰ کیا کہ انھوں نے پورا مال نہیں پہنچایا اور انھوں نے جھوٹی قسم کھائی اور امانت میں خیانت کی ہے پھر وصیوں کی قسم کے مقابلہ میں ورثاء کے دو آدمی پیش ہوئے اور انھوں نے ان وصیوں کے خلاف قسم کھائی اور کہا ہماری قسم ان کی قسم کے مقابلہ میں برحق ہے۔

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ ورثاء مدعی تھے اور مدعی کے ذمہ گواہ ہوتے ہیں اور قسم مدعی علیہ پر ہوتی ہے اور یہاں مدعی کی قسم پر فیصلہ کر دیا گیا کیونکہ جب ورثاء کے گواہوں نے قسم کھائی کہ یہ وصی جھوٹے ہیں اس سامان میں پیالہ بھی تھا تو ان کی قسم پر فیصلہ کر دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ پیالہ مکہ میں مل گیا اور وصیوں سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ ہم نے میت

سے یہ پیالہ خرید لیا تھا تو اب معاملہ برعکس ہوگیا' اب وہ مدعی ہوگئے اور میت کے ورثاء اس خریداری کے منکر تھے' وہ مدعی علیہ ہوگئے اور چونکہ وصیوں کے پاس پیالہ خریدنے کے گواہ نہ تھے' اس لیے ورثاء پر قسم لازم آئی' انھوں نے قسم کھائی کہ یہ جھوٹے ہیں اور ان کی قسم پر فیصلہ کر دیا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض ورثاء کو مدعی ہی قرار دیا جائے' تب بھی اصول یہ ہے کہ اگر کسی خارجی قرینہ سے مدعی علیہ کی خیانت اس کا جھوٹ اور گناہ ثابت ہو جائے تو اس کی قسم غیر معتبر ہو جاتی ہے' اور پھر مدعی سے قسم لے کر اس کی قسم پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے' اور اس آیت سے یہی اصول ثابت ہوتا ہے اور جو قاعدہ ہے کہ اگر مدعی کے پاس گواہ نہ ہوں تو مدعی علیہ کی قسم پر فیصلہ کیا جاتا ہے' وہ اس وقت مدعی علیہ کی قسم کے جھوٹ ہونے پر کوئی خارجی دلیل اور قرینہ نہ ہو۔ اس سوال کا تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے جس میں گواہ کا مسلمان ہونا ضروری فرمایا ہے' اور اس آیت میں غیر مسلموں کو گواہ بنانے کا ذکر ہے'

مقامِ میزان کیا ہے؟

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ⑧

﴿سورت الاعراف ۸﴾

''اور اس روز وزن بھی برحق پھر جس شخص کا پلا بھاری ہوگا سو ایسے لوگ کامیاب ہونگے''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: '' اور اس دن اعمال کا وزن کرنا برحق ہے، پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں۔ اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں کیونکہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے''۔

'' وزن'' علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ وزن کا معنی ہے کسی چیز کی مقدار کی معرفت حاصل کرنا۔ اور عرف عام میں ترازو سے کسی چیز کے تولنے کو وزن کرنا کہتے ہیں۔

(المفردات ص523، مطبوعہ ایران، 362ھ)۔

علامہ جار اللہ زمخشری متوفی 583ھ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھجور کے درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو فروخت کرنے سے منع فرمایا حتی کہ اس درخت سے کھجوروں کو کھایا جائے اور ان کا وزن کیا جائے۔ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا وزن سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اس کی مقدار کا اندازہ کیا جائے۔

(الفائق ج3 ص358، مطبوعہ بیروت، 1417ھ، النہایہ، ج5 ص182، مطبوعہ ایران، 1367ھ، تاج العروس، ج10 ص360، مطبوعہ مصر)۔

'' میزان'' علامہ زبیدی حنفی متوفی 1205ھ لکھتے ہیں: جس آلہ کے ساتھ چیزوں کا وزن کیا جائے اس کو میزان کہتے ہیں۔

زجاج نے کہا ہے کہ جو میزان قیامت میں ہوگی اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔تفسیر میں ہے کہ وہ ایک ترازو ہے جس کے دو پلڑے ہیں۔دنیا میں میزان اتاری گئی تاکہ لوگ عدل کے ساتھ باہم معاملہ کریں اور اس کے ساتھ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔

(تاج العروس، ج9،ص361،مطبوعہ المطبعہ الخیریہ،مصر 1306ھ)۔

"موازین" یہ میزان کی جمع ہے۔اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قیامت کے دن میزان تو صرف ایک ہوگی۔پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا ہے۔اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ موزون کی جمع ہے اور موزون متعدد ہوں گے۔دوسرا جواب یہ ہے کہ اہل عرب واحد پر بھی تعظیماً جمع کا اطلاق کر دیتے ہیں اور تیسرا جواب یہ ہے کہ جو اعمال وزن اور حساب کے لائق ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔افعال قلوب،افعال جوارح (ظاہری اعضاء کے افعال) اور اقوال اور ہوسکتا ہے کہ ان تینوں کے لیے الگ الگ میزان ہوں۔ایک قول یہ ہے کہ وزن کرنے والوں کی اکثریت کے اعتبار سے میزان کو جمع کر کے لایا گیا ہے۔

اس سے پہلی آیت میں قیامت کے دن انبیاء کرام (علیہم السلام) اور ان کی امتوں سے سوال کرنے کا ذکر تھا اور یہ قیامت کے دن کا ایک حال ہے اور دوسرا حال میزان پر اقوال اور اعمال کا وزن کرنا ہوگا۔سو اس آیت میں قیامت کے دن کا یہ دوسرا حال بیان فرمایا ہے۔

اعمال کے وزن کے متعلق مذاہب علماء:

مجاہد،ضحاک،اعمش اور بہ کثرت متاخرین کا مذہب یہ ہے کہ قیامت کے اعمال کو وزن کرنے سے مراد عدل اور قضاء ہے۔ کیونکہ دنیا میں لین دین میں عدل کا ذریعہ ترازو میں وزن کرنا ہے اور وزن کرنے کو عدل اور قضاء لازم ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ جس شخص کے اعمال کا میزان میں وزن کیا جائے گا تو وہ اللہ کے عادل اور حکیم ہونے کا اقرار کرے گا یا نہیں۔اگر وہ اللہ تعالیٰ کے عادل اور حکیم ہونے کا اقرار کرے گا تو اس کے لیے میزان کی کوئی حاجت نہیں۔اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں اور گناہوں کے متعلق جو بھی فیصلہ فرمائے گا،وہ اس کو تسلیم ہوگا اور اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کو عادل اور صادق نہیں مانتا تو پھر وہ نیکیوں اور گناہوں کے کیے ہوئے وزن کو بھی نہیں مانے گا تو پھر میزان میں اس کے کیے ہوئے وزن کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی نیک مسلمان کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور اس کی نیکیوں کا پلڑہ گناہوں کے پلڑے سے بھاری ہوگا تو اس مسلمان شخص اور اس کے دوستوں کو فرحت اور مسرت حاصل ہوگی اور تمام اہل محشر کے سامنے اس کے جنتی ہونے پر حجت قائم ہوگی۔جو لوگ دنیا میں اس کو حقیر سمجھتے تھے،ان کے سامنے اس کی عزت و توقیر اور وجاہت ظاہر ہوگی اور وہ اپنے محبین کے سامنے سرخرو ہوگا اور یہ میزان کا بہت بڑا فائدہ ہے۔

حضرت ابن عباس (رض)،جمہور صحابہ،تابعین اور علماء راسخین کا مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا حقیقتاً وزن کیا جائے گا۔مانعین کا اس پر اعتراض یہ ہے کہ اعمال از قبیل اعراض ہیں اور وزن اجسام کا کیا جاتا ہے،اعراض کا نہیں کیا جاتا۔اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اعراض کے مقابلہ میں اجسام پیدا فرمادے اور ان اجسام کا وزن کیا جائے۔دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک اعمال حسین اجسام میں متمثل کر دیے جائیں گے اور بداعمال قبیح اجسام میں متشکل کر دیئے جائیں گے اور ان کا وزن کیا

جائے گا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ نفس اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا بلکہ صحائف اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ موخر الذکر دونوں جوابوں کے متعلق احادیث ہیں، جن کا ہم عنقریب ذکر کررہے ہیں۔

(تفسیر کبیر ج5 ص203۔ 204 مع التلخیص والتوضیح مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1415ھ)

قرآن مجید سے میزان کے ثبوت پر دلائل:

ونضع الموازین القسط لیوم القیامة فلا تظلم نفس شیئا و ان کان مثقال حبة من خردل اتینا بها و کفی بنا حاسبین

اور قیامت کے دن ہم انصاف کی میزان رکھیں گے سو جن کی میزان کے (نیکی کے) پلڑے بھاری ہوئے وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اور جن کی میزان کے (نیکی کے) پلڑے ہلکے ہوئے تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

فاما من ثقلت موازینه۔ فهو فی عیشة راضیة۔ واما من خفت موازینه فامه هاویة

سو جس (کی نیکی) کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا ہاویہ (دہکتی آگ کا گہرا گڑھا) ہوگا۔

احادیث اور آثار سے میزان کے ثبوت پر دلائل: حضرت سلمان فارسی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن میزان کو رکھا جائے گا، اگر اس میں آسمانوں اور زمینوں کو رکھا جائے تو وہ اس کی بھی گنجائش رکھتی ہے۔ پس فرشتے کہیں گے: اے رب اس میں کس کو وزن کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں اپنی مخلوق سے جس کو چاہوں گا، فرشتے کہیں گے تو پاک ہے ہم تیری اس طرح عبادت نہیں کرسکے جو تیری عبادت کا حق ہے (الحدیث) امام حاکم متوفی 405ھ نے کہا ہے کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔

(المستدرک ج4 ص586، مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ)

حافظ ذہبی متوفی 848ھ نے امام حاکم کی موافقت کی ہے۔

(تلخیص المستدرک ج4 ص586، مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ)

امام عبداللہ بن المبارک متوفی 181ھ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(کتاب الزہد، رقم الحدیث، 1357، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)

امام ابوبکر محمد بن الحسین آجری متوفی 360ھ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(الشریعہ ص339، مطبوعہ دارالسلام، ریاض)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: نیکیوں اور برائیوں کا میزان میں وزن کیا جائے گا۔ اس میزان کی ایک ڈنڈی اور دو پلڑے ہیں۔ رہا مومن تو اس کا عمل حسین صورت میں آئے گا اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا تو اس کی نیکیوں کا پلڑا،

برائیوں کے پلڑے کے مقابلہ میں بھاری ہوگا۔

(شعب الایمان ج1 ص264 رقم الحدیث:284۔ الجامع لاحکام القرآن، جز7 ص151 مطبوعہ دارالفکر، بیروت 1415ھ)

عبید اللہ بن عمیر نے کہا قیامت کے دن اقدام اس طرح ہوں گے جیسے ترکش میں تیر۔ خوش قسمت وہ شخص ہے جسے اپنے قدموں کے لیے جگہ مل جائے اور میزان کے پاس ایک فرشتہ ندا کرے گا، سنو فلاں بن فلاں (کی نیکیوں) کا پلڑا بھاری ہے، اس نے ایسی کامیابی حاصل کی ہے کہ پھر کبھی ناکام نہیں ہوگا۔ سنو فلاں بن فلاں (کی نیکیوں) کا پلڑا ہلکا ہے یہ ناکام ہوگیا ہے اس کے بعد کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج5 ص1441 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ المکرومہ 1417ھ)

حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے زیادہ راجح ہو قیامت کے دن میزان میں اس (کی نیکیوں) کا پلڑا ہلکا ہوگا اور جس شخص کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ راجح ہو قیامت کے دن میزان میں اس (کی نیکیوں) کا پلڑا بھاری ہوگا۔

(الدرالمنثور ج3 ص70 مطبوعہ ایران البدور السافرۃ رقم الحدیث 918)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا دو لفظ زبان پر آسان ہیں اور میزان میں بھاری ہیں اور رحمن کو محبوب ہیں۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

(صحیح البخاری ج7 رقم الحدیث 1406 رقم الحدیث 7563۔ صحیح مسلم، الذکر:31(2694)۔ سنن الترمذی ج5 رقم الحدیث 3467، ج2 رقم الحدیث 3806)

حضرت ابو مالک اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا وضو نصف ایمان ہے اور الحمد للہ میزان کو بھر لیتا ہے۔

(صحیح مسلم الطہارۃ (223) سنن الترمذی ج5 رقم الحدیث:3517۔ سنن الدارمی ج رقم الحدیث:653)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں میری جان ہے تمام آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ انمیں ہے اور ان کے درمیان ہے، اور ان کے نیچے ہے۔ اگر تم ان کو لے کر آؤ اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور کلمہ شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو وہ پہلے پلڑے سے بھاری ہوگا۔

(المعجم الکبیر ج12 ص254 رقم الحدیث:13024، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت میں سے ایک شخص کو قیامت کے دن تمام لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا۔ اس کے (گناہوں کے) ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر حد نظر تک ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتے ہو، وہ کہے گا نہیں! اے میرے رب! پھر فرمائے گا کیا میرے لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کوئی زیادتی کی ہے؟ وہ کہے گا نہیں اے میرے رب! پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں نہیں میرے پاس تمہاری ایک نیکی ہے اور آج تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا پھر اس کے لیے ایک پرچی نکالی جائے گی جس پر لکھا ہوگا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ وہ کہے گا اے میرے رب! یہ ایک پرچی اتنے بڑے رجسٹروں کے سامنے کیا وقعت رکھتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا بیشک تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ پھر ایک پلڑے میں یہ پرچی ہوگی اور دوسرے پلڑے میں وہ رجسٹر ہوں گے پھر ان رجسٹروں

کا پلڑا ہلکا ہوگا اور اس پرچی کا پلڑا بھاری ہوگا اور اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔
(سنن الترمذی ج4 رقم الحدیث 2548۔ سنن ابن ماجہ ج2 رقم الحدیث 4300۔ المستدرک ج1 ص 529)

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن میزان کو قائم کیا جائے گا۔ پھر ایک شخص کو لایا جائے گا اور اس کے گناہوں کو ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ وہ پلڑہ جھک جائے گا اور اس کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ جب وہ پیٹھ موڑ کر جائے گا تو رحمن کے پاس سے اس کو ایک بلانے والا بلائے گا۔ جلدی نہ کرو، جلدی نہ کرو اس کی ایک نیکی باقی ہے۔ پھر کلمہ شہادت کی ایک پرچی لائی جائے گی اور اس آدمی کی نیکیوں کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی اور اس سے میزان جھک جائے گی۔
(مسند احمد رقم الحدیث 7066۔ مجمع الزوائد، ج10 ص 82)

حضرت ابو الدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اچھے اخلاق سے بڑھ کر میزان میں کوئی چیز بھاری نہیں ہے۔
(سنن ابوداؤد ج4 رقم الحدیث 4799۔ سنن الترمذی ج3، رقم الحدیث 2009۔ مسند احمد ج10 رقم الحدیث 27587۔ صحیح ابن حبان، ج2، رقم الحدیث 481۔ مصنف ابن ابی شیبہ، ج8 ص 516۔ الادب المفرد، رقم الحدیث 270۔ مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث 20157۔ شرح السنہ ج2 رقم الحدیث: 783۔ حلیۃ الاولیاء ج5 ص 243۔ الشریعہ، رقم الحدیث: 864)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے اللہ پر ایمان اور اس کے وعدہ کی تصدیق کی وجہ سے اللہ کی راہ میں گھوڑے کو باندھا، اس گھوڑے کا چارہ، اس کا پانی اور اس کی لید اور اس کا پیشاب قیامت کے دن میزان میں وزن کیا جائے گا۔
(صحیح البخاری، ج3، رقم الحدیث 2853، المستدرک، ج2 ص 92۔ سنن کبری للبیہقی ج10 ص 27۔ شرح السنہ رقم الحدیث 2648)

امام ابن المبارک متوفی 181ھ نے حماد بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص آئے گا۔ وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم جان رہا ہوگا۔ وہ اسی کیفیت میں ہوگا کہ بادل کی طرح ایک چیز آئے گی اور اس کی نیکیوں کے پلڑے میں جا گرے گی۔ اس سے کہا جائے گا یہ وہ چیز ہے جو تم لوگوں کو نیکیوں کی تعلیم دیتے تھے۔ تمہارے بعد تمہاری تعلیم سے نیکیاں ظہور میں آئیں اور تم کو ان کا اجر دیا گیا۔
(کتاب الزہد لابن المبارک، رقم الحدیث 1384 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان شخص بھی ان کی حفاظت کرے گا، وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ وہ دونوں آسان کام ہیں اور کم لوگ ان کو کرتے ہیں۔ (پہلی خصلت یہ ہے کہ) ہر نماز کے بعد دس مرتبہ سبحان اللہ کہے، دس مرتبہ الحمد للہ کہے، اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہے۔ یہ زبان سے ڈیڑھ سو بار پڑھنا ہے اور میزان میں یہ ڈیڑھ ہزار نیکیاں ہیں (اور دوسری خصلت یہ ہے کہ) اور جب بستر پر جائے تو چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہے، اور تینتیس مرتبہ الحمد للہ کہے اور تینتیس مرتبہ سبحان اللہ کہے۔ یہ زبان سے ایک سو مرتبہ پڑھنا ہے اور میزان میں ایک ہزار نیکیاں ہیں تو بتاؤ تم میں سے کون شخص ایک دن رات میں ڈھائی ہزار نیکیاں کرتا ہے۔
(سنن ابوداؤد ج4 رقم الحدیث 5065۔ سنن الترمذی ج5 رقم الحدیث 3421۔ سنن ابن ماجہ ج1 رقم الحدیث 926۔ سنن النسائی ج3 رقم الحدیث 1347۔ مصنف عبدالرزاق ج2 رقم الحدیث 3189)

آیا میزان میں صرف مسلمانوں کا وزن ہوگا یا کافروں کا بھی وزن ہوگا؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا یا کافروں کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور کافروں کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔" اولئك الذين كفروا بايت ربهم ولقائه فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيمة وزنا: یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اس سے ملاقات کا انکار کیا سو ہم قیامت کے دن کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے" (الکہف:105)۔

لیکن اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ جن کافروں کو اللہ تعالیٰ جلد دوزخ میں ڈالنا چاہے گا ان کو بغیر وزن اعمال کے دوزخ میں ڈال دے گا اور بقیہ کافروں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے" ومن خفت موازینہ فاولئک الذین خسروا انفسھم فی جہنم خلدون: اور جن کی میزان کے پلڑے ہلکے ہوئے تو یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے" (المومنون:103)

اسی طرح بعض مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ بغیر وزن اعمال اور بغیر حساب کے جنت میں داخل کردے گا۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت عمران بن حصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت میں سے ستر ہزار جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو نہ دم کراتے ہوں گے، نہ بدشگونی نکالتے ہوں گے اور نہ جسم کو لوہے کے داغ سے جلاتے ہوں اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہوں گے۔

امام بخاری نے اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے۔

(صحیح مسلم، ایمان، 367(216)509، صحیح البخاری، 7 رقم الحدیث 1542، سنن الترمذی، ج4 رقم الحدیث، 2454، مسند احمد، ج1 ص 454، 443، 403، 401، 271۔

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی 360ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس (رض) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: قیامت کے دن شہید کو لایا جائے گا اور اس کو حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر صدقہ دینے والے کو لایا جائے گا اور اس کو حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر مصیبت میں مبتلا شخص کو لایا جائے گا اس کے لیے میزان قائم کی جائے گی نہ اس کے اعمال کا رجسٹر کھولا جائے گا اور اس پر اتنا اجر وثواب انڈیل دیا جائے گا کہ عیش وآرام میں رہنے والے محشر میں یہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ان کے جسموں کو قینچی سے کاٹ ڈالا جاتا اور ان کو بھی ایسا اجر وثواب مل جاتا۔

(المعجم الکبیر ج12 رقم الحدیث 12829، حلیۃ الاولیاء ج3 ص 91)۔

ان مسلمانوں کی مغفرت کی صورتیں جن کی نیکیاں گناہوں کے برابر یا گناہوں سے کم ہوں گی:

آیت 8 میں فرمایا ہے: پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں۔ اس آیت سے مراد مومن ہیں اور آیت 9 میں فرمایا ہے: اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں کیونکہ وہ ہماری

آیتوں پر ظلم کرتے تھے۔اس آیت سے کافر مراد ہیں۔کیونکہ وہی اللہ کی آیتوں کاانکار کر کےان پر ظلم کرتے تھے۔

ان آیتوں میں صالح اور نیک مسلمانوں کاذکر فرمایا ہے جن کی نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے اور کافروں کاذکر فرمایا ہے جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔اس آیت میں ان مسلمانوں کاذکر نہیں ہے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور نہ ان مسلمانوں کاذکر ہے جن کی نیکیاں برائیوں سے کم ہوں، رہے وہ مسلمان جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں تو وہ اعراف میں ہوں گے اور بعد میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کو جنت میں داخل فرمادے گااور رہے وہ مسلمان جن کے گناہ نیکیوں سے زیادہ ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل اور اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے جنت میں داخل فرمادے گا یا کچھ عذاب دے کر یا بغیر عذاب دیے ان کو محض اپنے فضل و کرم سے دوزخ سے نجات دے گااور جنت میں داخل فرمادے گا۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شفاعت سے نجات کے متعلق یہ حدیث ہے امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہر نبی کی ایک مقبول دعا ہوتی ہے اور ہر نبی نے اس مقبول دعا کو دنیا ہی میں جلد خرچ کرلیا اور میں نے اپنی اس دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کے لیے چھپا کر رکھا ہے اور یہ انشاءاللہ میری امت میں سے ہر اس شخص کو حاصل ہوگی جو اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کیا ہو۔

(صحیح البخاری ج 7 رقم الحدیث 6304۔صحیح مسلم الایمان:338(199)483۔سنن الترمذی ج 5 رقم الحدیث 3613۔سنن ابن ماجہ ج 2 رقم الحدیث 4307۔ موطا امام مالک، رقم الحدیث:492، مسند احمد، ج 3، رقم الحدیث 10315۔صحیح ابن حبان رقم الحدیث 6461۔مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث 20864)

محض اپنے فضل سے عذاب دینے کے بعد دوزخ سے نجات دینے کے متعلق یہ حدیث ہے۔امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جنت میں داخل فرمائے گااور اپنی رحمت سے جس کو چاہے گا، جنت میں داخل فرمائے گااور اہل جہنم میں سے جس کو چاہے گا جہنم میں داخل کردے گا۔پھر فرمائے گا دیکھو، جس کے دل میں رائی کے ایک دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، اس کو جہنم سے نکال لو، پس وہ لوگ جہنم میں سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ ان کا جسم جل کر کوئلہ ہو چکا ہوگا۔پھر ان کو آب حیات کی نہر میں ڈالا جائے گااور وہ اس نہر میں سے اس طرح تر و تازہ ہو کر نکلنا شروع ہوں گے جیسے دانہ پانی کے بہاؤ والی مٹی میں سے زردی مائل ہو کر اگ پڑتا ہے۔

(صحیح البخاری ج 1 رقم الحدیث:22، ج 7، رقم الحدیث:6560۔صحیح مسلم، ایمان، 304(184)(449)۔

اور محض اپنی رحمت سے بغیر عذاب دیئے ہوئے جنت میں داخل کرنے کے متعلق یہ حدیث ہے۔امام مسلم روایت کرتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کے دن مومن کو اپنے رب عزوجل کے قریب کیا جائے گا حتیٰ کہ اللہ اس کے اوپر اپنی رحمت کا پر رکھ دے گااور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گااور فرمائے گا تم (اس گناہ کو) پہنچانتے ہو؟ وہ کہے گا ہاں میرے رب میں پہچانتا ہوں۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تم پر ستر کیا تھا (تمہارا پردہ رکھا تھا) اور آج میں تمہیں بخش دیتا ہوں۔پھر اس کو اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دیا جائے گااور رہے کافر اور منافق تو ان کو تمام لوگوں کے سامنے بلایا جائے گااور کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا تھا۔

(صحیح البخاری، ج 3، رقم الحدیث:2441۔صحیح مسلم، التوبہ:52، (2768)(6882)۔السنن الکبریٰ ج 6، رقم الحدیث 1242۔سنن ابن ماجہ، ج 1، رقم الحدیث:183)

زمین کو مستقر بنانے کے بیان میں

وَلَقَدۡ مَكَّنّٰكُمۡ فِي الۡاَرۡضِ وَجَعَلۡنَا لَكُمۡ فِيۡهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ۠ ﴿۱۰﴾

﴿سورت الاعراف ۱۰﴾

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ” اور ہم نے تم کو زمین پر قابض کر دیا اور تمہارے لیے اس (زمین) میں اسباب زیست فراہم کیے (مگر) تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو“

مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے مناسبت:

ولقد مکنکم: یعنی اے بنو آدم ہم نے تمہارے لیے زمین کو مستقر بنایا اور زمین میں تمہیں جگہ دی، یا ہم نے تم کو زمین پر قبضہ دیا اور زمین میں تصرف کرنے کی قدرت دی۔

معایش: یہ معیشت کے جمع ہے۔ جن چیزوں سے زندگی بسر کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں۔ ان کو معیشت کہتے ہیں۔ علامہ طاہر پٹنی متوفی 986ھ نے لکھا ہے کہ جو چیزیں حیات کا آلہ ہیں، مثلاً زرعی پیداوار اور دودھ دینے والے جانوروں کے تھن ان کو معیشت کہتے ہیں۔

(مجمع بحار الانوار، ج 3 ص 719، مطبوعہ دار الایمان، مدینہ منورہ 1415ھ)

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء (علیہم السلام) کی دعوت کو قبول کرنے اور ان کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی پیروی نہ کرنے پر ان کو دنیا کے عذاب سے ڈرایا۔ اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت آیا یا جس وقت وہ دوپہر کو سو رہے تھے (الاعراف: 4) پھر ان کو آخرت کے عذاب اور مواخذہ سے ڈرایا پس ہم ان لوگوں سے ضرور باز پرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے (الاعراف: 6)۔ پھر فرمایا: پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں۔ اور جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں (الاعراف: 8-9) اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی نعمتوں کو یاد دلایا ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ترغیب دی ہے تا کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کر کے اس کا احسان مانیں اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت اور ان کے پیغام کو قبول کریں اور ان کی اطاعت اور اتباع کریں کیونکہ نعمتوں کی کثرت زیادہ اطاعت کو واجب کرتی ہے۔

معایش کی تفصیل:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو معایش (اسباب زیست) بنائے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے کہ بعض معایش کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا۔ مثلاً دریاؤں میں پانی پیدا کیا، آسمان سے بارش نازل فرمائی، پھلوں اور غلوں کو اگایا، حلال جانور پیدا

کیے اور بعض اسباب زیست وہ ہیں جن کو انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت سے اپنے اکتساب کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ جیسے انسان تجارت اور محنت مزدوری کر کے رزق حاصل کرتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان زمین میں بستے ہیں اور اس میں تصرف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فہم و دانش اور قوت و توانائی سے ہر دور میں انسان کی فوز و فلاح، اس کی بہتری، سہولت اور مصلحت کے لیے نت نئے ذرائع اور وسائل تلاش کر رہے ہیں۔ پہلے انسان پتوں سے بدن ڈھانپتا تھا، پھر سوت اور ریشم کے لباس کا دور آیا اور اب انسان پٹرولیم سے بھی لباس بنانے لگا ہے۔ پہلے لکڑی اور کوئل سے آگ حاصل کرتا تھا، پھر قدرت گیس کا دور آیا۔ برقی توانائی کے بعد ایٹمی توانائی کا دور آیا۔ پہلے بری سفر، خچروں اور گھوڑوں سے اور بحری سفر بادبانی کشتیوں سے کیا جاتا تھا۔ پھر موٹر کاروں ریل گاڑیوں اور دخانی جہازوں کا دور آیا اور اب ہوائی جہازوں، ہیلی کاپٹروں اور راکٹوں کا دور ہے۔ بہت سی بیماریوں کا پہلے پتا نہ تھا لوگ ان میں مبتلا ہو کر مر جاتے تھے۔ اب ان بیماریوں اور ان کے علاج کا پتا چلا لیا گیا ہے۔ مثلاً ذیابیطس ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے، دل اور دماغ کے پیچیدہ امراض ہیں۔ فالج ہے، دماغ کی رگ کا پھٹ جانا ہے۔ سرجری کا طریقہ ایجاد ہوا اور طب کی دنیا میں بہت سے لاعلاج مسئلے حل ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان اسباب زیست اور ان سے فائدہ اٹھانے والی قوتوں کو انسان کی بہتری اور اس کی مصلحت کے لیے بنایا ہے اور یہ مادی فوائد اس لیے عطا کیے ہیں کہ ان کی مدد سے انسان روحانی حیات میں تزکیہ اور جلاء کو حاصل کرے اور اپنے باطن کو پاک اور صاف کر کے اپنے آپ کو اخروی نعمتوں کا اہل بنائے۔ سو انسان کو چاہیے کہ وہ ان نعمتوں کے نتیجے میں اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھے اور ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرے۔

شکر کا لغوی اور اصطلاحی معنی: علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی متوفی 1205ھ لکھتے ہیں: علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی 897ھ نے قاموس میں لکھا ہے کہ شکر کا معنی ہے احسان کو پہچاننا اور اس کو بیان کرنا۔ اور علامہ فیروز آبادی نے بصائر میں لکھا ہے کہ شکر کی تین قسمیں ہیں۔ شکر بالقلب: یہ نعمت کا تصور کرنا ہے۔ شکر باللسان: یہ نعمت دینے والے کی حمد و ثناء کرنا اور زبان سے تعظیم کرنا ہے اور شکر بالجوارح: یہ بہ قدر استحقاق نعمت کے بدلہ میں کوئی نعمت دینا ہے (بعض علماء نے اس کی تعریف میں کہا یہ تعظیماً کھڑے ہونا، یا ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دینا ہے اور سجدہ کرنا ہے) نیز علامہ فیروز آبادی نے کہا کہ شکر پانچ بنیادوں پر مبنی ہے:

1۔ منعم کے سامنے شکر کرنے والے کا عجز و انکسار سے پیش آنا۔

2۔ منعم سے محبت کرنا۔

3۔ اس نعمت کا اعتراف کرنا۔

4۔ اس نعمت پر منعم کی تعریف کرنا۔

5۔ منعم کی نعمت کو اس کی ناپسندیدہ جگہ استعمال نہ کرنا۔

یہ پانچ امور شکر کی اساس اور بناء ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک امر بھی نہ ہو تو شکر ادا نہیں ہوگا۔ یہ پانچ امور شکر کا مرجع اور مدار ہیں۔

جنید بغدادی نے کہا: شکر یہ ہے کہ تم یہ گمان کرو کہ تم اس نعمت کے اہل نہ تھے۔ ابو عثمان نے کہا: شکر یہ ہے کہ تم یہ جان لو کہ تم منعم

کاشکرادا کرنے سے عاجز ہو۔رویم نے کہا:شکر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو منعم کی خدمت کے لیے فارغ کرلو۔شبلی نے کہا:شکر یہ ہے کہ تم نعمت کو نہ دیکھو،نعمت دینے والے کو دیکھو۔اس کا معنی یہ ہے کہ نعمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے تم منعم سے غافل نہ ہو جاؤ۔اور کمال شکر یہ ہے کہ بندہ نعمت اور منعم دونوں کا مشاہدہ کرے۔کیونکہ بندہ جس قدر زیادہ نعمت کا مشاہدہ کرے گا،اس قدر زیادہ شکرادا کرے گا،اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کا بندہ اس کی نعمت کو دیکھے اور اس کا اعتراف کرے اور اس پر اس کی ثناء اور تعریف کرے،اور اس نعمت کی وجہ سے اللہ سے محبت رکھے۔سوا اس کے کہ وہ نعمت فنا ہو جائے یا گم ہو جائے۔

علامہ فیروز آبادی نے کہا:علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ شکر اور حمد میں سے کون افضل ہے۔حدیث میں ہے حمد شکر کی سردار ہے۔جس شخص نے اللہ کی حمد نہیں کی،اس نے اللہ کا شکرادا نہیں کیا۔ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اقسام اور اسباب کے اعتبار سے شکر حمد سے عام ہے۔(کیونکہ حمد صرف زبان سے ہوتی ہے اور شکر،زبان،دل اور اعضاء اور جوارح سے بھی ہوتا ہے)اور متعلق کے اعتبار سے شکر حمد سے خاص ہے۔کیونکہ شکر صرف نعمت پر ادا کیا جاتا ہے جبکہ حمد میں یہ قید نہیں ہے۔(وہ مطلقاً زبان سے کسی کی ثناء کرنے کو کہتے ہیں)مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حیات،اس کی سمع اور بصر اور اس کے علم پر اس کا شکرادا کرتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے گا کہ ہم ان اوصاف پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں۔اسی طرح اللہ کی نعمتوں پر ہم دل میں جو اس کی تعظیم کرتے ہیں یا سجدہ شکر بجالاتے ہیں،تو اس کو حمد نہیں کہا جائے گا۔یہ صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور ہم زبان سے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی ثناء اور تعریف کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی حمد بھی ہے اور اس کی شکر بھی ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ ان میں عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے۔

شکور کا معنی ہے بہت زیادہ شکرادا کرنے والا۔قرآن مجید میں حضرت نوح (علیہ السلام) کے متعلق ہے انہ کان عبدا شکورا(بنو اسرائیل:3)یعنی وہ اپنے رب کا شکرادا کرنے کے لیے اس کی بہت کوشش سے عبادت کرتے تھے،اور شکور اللہ تعالیٰ کی بھی صفت ہے۔واللہ شکور حلیم (التغابن:17)اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ بندوں کے کم اعمال پر دگنا چوگنا بلکہ بہت زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ بندوں کا شکر کرتا ہے یعنی ان کو بخش دیتا ہے۔اللہ کی طرف جب شکر کی نسبت ہو تو اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا اور ثواب عطا فرمانا۔

(تاج العروس،ج3،ص312،مطبوعہ المطبعہ الخیریہ،مصر،1306ھ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی 806ھ لکھتے ہیں:شکر کا لغوی معنی یہ ہے کسی نعمت پر زبان،دل یا دیگر اعضاء سے منعم کی تعظیم وتکریم کرنا۔اور شکر کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو سمع،بصر اور دیگر نعمتیں جو عطا کی ہیں ان کو اپنے مقاصد تخلیق کے مطابق خرچ کرنا۔

(کتاب التعریفات ص65،مطبوعہ المطبعہ الخیریہ،مصر 1306ھ)

امام محمد بن غزالی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:دل کا شکر یہ ہے کہ نعمت کے ساتھ خیر اور نیکی کا قصد کیا جائے اور زبان کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی جائے اور باقی اعضاء کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خرچ کیا جائے،اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں صرف ہونے سے بچایا جائے۔حتیٰ کہ آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کو دیکھے اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں کو دیکھنے سے باز رہے۔یعنی جن چیزوں کے دیکھنے میں اجر وثواب ہے ان کو دیکھے اور جن چیزوں کا دیکھنا گناہ ہے ان کو نہ دیکھے۔علی ھذا القیاس۔تمام اعضاء کا حکم ہے۔

(احیاء العلوم ج3ص338،مطبوعہ دار الخیر،بیروت،1413ھ)

شکر کے متعلق قرآن مجید کی آیات: " واشکروا لی ولا تکفرون: اور میرا شکر ادا کرتے رہو، اور میری ناشکری نہ کرو (البقرہ:152)۔" مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وامنتم وکان اللہ شاکرا علیما: اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر ادا کرو اور ایمان لے آؤ اور اللہ شکر کی جزا دینے والا اور جاننے والا ہے" (النساء:147)۔ " وسنجزی الشاکرین: اور ہم عنقریب شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دیں گے" (آل عمران:145)۔" اعملوا آل داؤد شکرا وقلیل من عبادی الشکور: اے آل داوَد! شکر بجالانے کے لیے نیک کام کرو، میرے بندوں میں شکر ادا کرنے والے کم ہیں" (سبا:13)۔ " لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید: اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو یقیناً اور زیادہ دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو بیشک میرا عذاب ضرور سخت ہے" (ابراہیم:7)۔

شکر ادا کرنے کے طریقوں کے متعلق احادیث:

ہم اس سے پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ نعمت ملنے پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا اس نعمت کا شکر ہے۔ اس کے متعلق یہ حدیث ہے امام ابن ماجہ متوفی 273ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب کوئی بندہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پر الحمدللہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے افضل نعمت عطا فرماتا ہے۔

(سنن ابن ماجہ، ج2، قم الحدیث 3805، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت حکم بن عمیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم نے الحمد للہ رب العالمین کہا تو تم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دیا اور اللہ تعالیٰ تمہاری نعمت میں زیادتی کرے گا۔

(جامع البیان ج1 ص90، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1415ھ)

امام احمد بن حنبل متوفی 241ھ روایت کرتے ہیں: حضرت اسود بن سریع (رض) بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ثناء اور تعریف میں الحمد للہ سے زیادہ کوئی کلمہ پسند نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود الحمد للہ سے اپنی ثنا کی ہے۔

(مسند احمد، ج5، رقم الحدیث:15586، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، 1414ھ)۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: نعمت خواہ کتنی پرانی ہو جائے جب بھی بندہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیا ثواب عطا فرماتا ہے اور مصیبت خواہ کتنی پرانی ہو جائے جب بھی بندہ اس پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو نیا ثواب اور اجر عطا فرماتا ہے۔ نعمت پر شکر ادا کرنے سے اس نعمت کی مسؤلیت کم ہو جاتی ہے اور مصیبت پر صبر کرنے سے اس کے ثمرات کی حفاظت ہوتی ہے۔

(نوادر الاصول ج2 ص203، مطبوعہ دار الجبل، بیروت، 1412ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کی جائے اور اس کی کسی نعمت کی بے قدری نہ کی جائے۔

حضرت عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے پاس تشریف لائے اور اپنے گھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا۔ آپ نے اس کے پاس چل کر گئے۔ آپ نے اس کو اٹھایا، اس پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: اے عائشہ! اللہ کی نعمتوں

کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ جس نعمت کی لوگ ناقدری کرتے ہیں، ان کے پاس وہ نعمت بہت کم دوبارہ آتی ہے۔

(نوادر الاصول، ج 4،ص 174،مطبوعہ دار الجبل، بیروت،1412ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کم چیز پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور اللہ کی نعمت کا اظہار کیا جائے۔

حضرت نعمان بن بشیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے قلیل چیز کا شکر ادا نہیں کیا اس نے کثیر چیز کا بھی شکر ادا نہیں کیا اور اللہ کی نعمت کا بیان کرنا شکر ہے اور اس کو ترک کرنا کفر ہے۔ (علامہ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے)

(مسند احمد، ج 14، رقم الحدیث: 18361،مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ،1416ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بندوں کا شکر ادا کیا جائے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو بندوں کا شکر ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

(سنن ابوداود، ج 4، رقم الحدیث 4811۔ سنن الترمذی ج 3، رقم الحدیث 1961۔ مسند احمد ج 7 رقم الحدیث 4795 مطبوعہ قاہرہ، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث 2070۔ الادب المفرد، رقم الحدیث: 218۔ مسند ابویعلی، رقم الحدیث: 1122)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کو کوئی چیز دی گئی تو وہ اس کے بدلہ میں کوئی چیز دے۔ اگر کوئی چیز نہ ملے تو اس کی تعریف کرے۔ جس نے اس کی تعریف کی اس نے اس کا شکر کیا اور جس نے اس کو چھپایا، اس نے کفر کیا۔

(سنن ابوداود، ج 4 رقم الحدیث: 4813،مطبوعہ دار الفکر، بیروت،1414ھ)

حضرت اسامہ بن زید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کی گئی اور اس نے اس نیکی کرنے والے سے کہا جزاک اللہ خیرا اس نے اس شخص کی پوری تعریف کر دی۔

(سنن الترمذی، ج 3، رقم الحدیث: 2042،مطبوعہ دار الفکر، بیروت،1414ھ)

راحت کے ایام میں مصیبت کے ایام کو یاد کرنا بھی شکر ہے۔

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص مصیبت میں مبتلا کیا گیا ہو پھر اس کو یاد کرے تو اس نے شکر ادا کیا اور اگر اس نے اس مصیبت کو چھپایا تو اس نے ناشکری کی۔

(سنن ابوداود، ج 4 رقم الحدیث: 4814،مطبوعہ دار الفکر، بیروت،1414ھ)

شکر کی فضیلت کے متعلق احادیث:

حضرت صہیب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے مومن کے حال پر تعجب ہوتا ہے۔ اس کے ہر حال میں بھلائی ہے۔ اگر اس کو راحت پہنچے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کی فلاح ہے اور اگر اس کو ضرر پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کا فلاح ہے۔

(صحیح مسلم، زہد: 64،(2999) 7365۔ مسند احمد، ج 4،ص 332۔ 333، ج 6،15، طبع قدیم)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کہ میرے رب نے مکہ کی وادی کو پیش کیا

تا کہ اس کو میرے لیے سونا بنا دے۔ میں نے کہا: نہیں! اے میرے رب! میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا، جب میں بھوکا ہوں گا تو تجھے یاد کروں گا تجھ سے فریاد کروں گا اور جب میں سیر ہوں گا تو تیرا شکر ادا کروں گا اور تیری حمد کروں گا۔

(سنن الترمذی، جلد 4 رقم الحدیث: 2354۔ مسند احمد، جلد 8 رقم الحدیث 22252، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

حضرت فضیل بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے ملاقات کی۔ آپ نے اس سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں ٹھیک ہوں، آپ نے پھر پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں ٹھیک ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، آپ نے فرمایا میں تم سے یہی سننا چاہتا تھا۔

(کتاب الدعاء للطبرانی، رقم الحدیث 1939)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایمان کے دو نصف ہیں، نصف میں صبر ہے اور نصف میں شکر ہے۔ (شعب الایمان، رقم الحدیث: 9715، الجامع الصغیر، ج 1 رقم الحدیث: 3106)

سجدہ کا لغوی اور اصطلاحی معانی اور اس کی وضاحت

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝۱۲

﴿سورت الاعراف ۱۲﴾

"فرمایا تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا، اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے"۔

سجدہ کا لغوی اور شرعی معنی:

علامہ ابن اثیر جزری متوفی 606ھ لکھتے ہیں: سجدہ کا لغت میں معنی ہیں سر نیچے کرنا، جھکنا، عاجزی اور خاکساری کرنا اور اس کا فقہی معنی ہے زمین پر پیشانی رکھنا اور اس سے بڑھ کر عاجزی اور تذلل متصور نہیں ہے۔

(النہایہ، ج 2 ص 302۔ 309، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1418ھ مجمع بحار الانوار ج 3 ص 37، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان مدینہ منورہ 1415ھ)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی 502ھ لکھتے ہیں: سجدہ کا شرعی معنی ہے: اللہ کے لیے تذلل اور عاجزی کرنا اور اس کی عبادت کرنا اور یہ انسان، حیوانات اور جمادات سب کو شامل ہے اور اس سجدہ کی دو قسمیں ہیں۔ سجدہ بالاختیار اور سجدہ بالتسخیر۔ سجدہ بالاختیار پر انسان ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: "فاسجدوا للہ واعبدوا: سو اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو" (النجم: 63)۔ اور سجدہ بالتسخیر اور سجدہ بالاختیار دونوں کی مثال یہ آیت ہے: "وللہ یسجد ما فی السموات وما فی الارض من دابۃ والملائکۃ وھم لا یستکبرو: اور آسمانوں اور زمینوں میں جو چیزیں ہیں وہ سب اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہیں، (ہر قسم کے)

جاندار اور سب فرشتے اور وہ تکبر نہیں کرتے" (النحل:149)۔ اور صرف سجدہ بالتسخیر کی مثال یہ آیتیں ہیں: " والنجم والشجر یسجدان: اور زمین پر پھیلنے والے پودے اور اپنے تنے پر کھڑے درخت سجدہ کرتے ہیں" (الرحمن:6)۔" ولله یسجد من فی السموات والارض طوعا و کرھا وظلالھم بالغدو والاصال: آسمانوں اور زمینوں میں جو بھی ہیں، وہ (سب) خوشی یا مجبوری سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سائے (بھی) صبح اور شام کو" (الرعد:15)۔قرآن مجید میں سجدہ کا اطلاق سجدہ عبودیت کی بجائے سجدہ تعظیم پر بھی کیا گیا ہے:" اسجدوا لادم: آدم کو سجدہ کرو" (البقرہ:34)۔" وخروا له سجدا: اور (ماں، باپ اور بھائی سب) یوسف کے لیے سجدہ میں گر گئے" (یوسف:100)۔

سجدہ کا اطلاق نماز پر بھی کیا گیا ہے:" ومن اللیل فسبحه وادبار السجود: رات کے کچھ وقت میں اس کی تسبیح کیجیے اور نمازوں کے بعد (بھی)" (ق:40)۔

ابلیس جن تھا یا فرشتہ:

جمہور مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا۔ ان کی دلیل سورۃ بقرہ کی یہ آیت ہے: اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ ادم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا (البقرہ:34)۔ ابلیس کو سجدہ کا حکم اس وقت ہوگا جب وہ فرشتہ ہو، کیونکہ اس آیت میں سجدہ کا حکم فرشتوں کو دیا گیا ہے اور جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ابلیس فرشتہ نہیں تھا، وہ کہہ سکتے ہیں کہ ابلیس جنی تھا لیکن وہ فرشتوں کے درمیان چھپا رہتا تھا۔ اس لیے بہ طور مخاطب وہ بھی فرشتوں میں داخل تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جنات کو سجدہ کرنے کا حکم تھا لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ جب اکابر کو کسی کی تعظیم کرنے کا حکم دیا جائے تو اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اصاغر کو اس کی تعظیم کا بہ طریق اولی حکم ہے۔ ابلیس کے جن ہونے کی واضح دلیل یہ آیت ہے" کان من الجن ففسق عن امر ربہ: وہ (ابلیس) جنات میں سے تھا سو اس نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی" (الکہف:50)۔

امر کا وجوب کے لیے ہونا:

اس آیت میں فرمایا ہے: تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا علماء اصول نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ امر کا تقاضا وجوب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی اس پر مذمت کی ہے کہ ابلیس نے اللہ کے حکم کے بعد اس پر عمل نہیں کیا اور بعض علماء نے اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ امر کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر فوراً عمل کیا جائے، کیونکہ ابلیس نے جب اس پر علی الفور عمل نہیں کیا تو اس پر گرفت کی گئی۔

حضرت آدم سے افضل ہونے پر ابلیس کا یہ استدلال کہ آگ مٹی سے افضل ہے: اس آیت میں فرمایا ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کرنے کی یہ وجہ بیان کی: اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔ ابلیس کے جواب کی وضاحت یہ ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے۔ کیونکہ آگ گرم خشک ہے اور مٹی سرد خشک ہے۔ اور حرارت برودت سے افضل ہے۔ کیونکہ گرمی حیات کے اور جوانی کے مناسب ہے اور ٹھنڈک موت اور بڑھاپے کے مناسب ہے اور حیات اور جوانی، موت اور بڑھاپے سے افضل ہے۔ نیز آگ تاثیر اور فعل کرتی ہے اور مٹی اثر قبول کرتی ہے اور انفعال کرتی

ہے اور فعل، انفصال سے افضل ہے اور آگ کا خاصہ بلندی کی طرف جانا اور مٹی کا خاصا پستی کی طرف آنا ہے اور بلندی پستی سے افضل ہے۔ سوان تین وجوہ سے آگ مٹی سے افضل ہے اور ابلیس آگ سے اور حضرت آدمؑ سے افضل ہوا اور افضل کا مفضول کو سجدہ کرنا حکمت کے خلاف ہے۔

آگ سے مٹی کے افضل ہونے کی دس وجوہات:

ابلیس کی یہ دلیل متعدد وجوہ سے باطل ہے کسی مرکب کی چار علتیں ہوتی ہیں۔ علت مادی، علت صوری، علت فاعلی اور علت غائی، ابلیس نے اپنے اور حضرت آدم کے درمیان صرف علت مادی سے تقابل کیا اور باقی تین علتوں سے صرف نظر کر لی۔ ثانیاً علت مادی کے اعتبار سے حضرت آدم، ابلیس سے افضل ہیں کیونکہ مٹی آگے سے حسب ذیل وجوہ سے افضل ہے:

1۔ آگ کی طبیعت کا تقاضا چیزوں کو علی الفور جلانا اور ان کو تلف کرنا ہے جبکہ مٹی کسی چیز کو تلف یا ضائع نہیں کرتی۔

2۔ مٹی میں انسانوں اور حیوانوں کا رزق پیدا ہوتا ہے اور کپاس پیدا ہوتی ہے جس سے انسانوں کا لباس حاصل ہوتا ہے جبکہ آگ میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔

3۔ مٹی میں اگر ایک دانہ ڈالا جائے تو اس کی برکت سے وہ کم وبیش سات سو گنا زیادہ پیدا ہوتا ہے جبکہ آگ کسی چیز کو بڑھانا تو کجا اصلاً نیست ونابود کر دیتی ہے۔

4۔ آگ کو اپنے وجود میں مٹی کی احتیاج ہے۔ کیونکہ آگ زمین کے بغیر نہیں متحقق ہوگی۔ جبکہ زمین کو اپنے وجود میں آگ کی احتیاج نہیں ہے۔

5۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے بہ کثرت منافع اور فوائد کا قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے: ”الم نجعل الارض مہادا: کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا“ (النباء:6)۔ ”الم نجعل الارض کفاتا۔ احیاء واموتا۔ وجعلنا فیہا رواسی: کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہ بنایا۔ زندوں اور مردوں کے لیے۔ اور ہم نے اس میں بلند مضبوط پہاڑ پیدا کر دیے“ (المرسلات:25۔27)۔ ”ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعا: وہی ہے جس نے تمہارے نفع کے لیے زمین کی سب چیزوں کو پیدا کیا“ (البقرہ:29)۔ اس کے برخلاف قرآن مجید کی اکثر اور بیشتر آیتوں میں آگ کو عذاب قرار دیا گیا ہے اور اس سے ڈرایا گیا ہے۔

6۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے زمین کو برکت قرار دیا ہے: "قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین و تجعلون له اندادا۔ ذلك رب العالمین۔ وجعل فیها رواسی من فوقها وبارك فیها وقدر فیها اقواتها فی اربعة ایام۔ سواء للسائلین: آپ کہئے تم بیشک اس کے ساتھ ضرور کفر کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنائی اور تم اس کے لیے شریک بناتے ہو، یہ پروردگار ہے سارے جہانوں کا۔ اور جس نے زمین کے اوپر بھاری پہاڑوں کو گاڑ دیا اور اس میں برکت دی، اور اس میں اس کے باشندوں کے لیے چار دنوں میں غذائیں رکھ دیں، جو طلب کرنے والوں کے لیے برابر ہیں“ (حم السجدہ:9۔10)۔ "ونجیناه ولوطا الی الارض التی بارکنا فیها للعالمین: اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو اس زمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے

برکت فرمائی ہے" (الانبیاء: 71)۔" ولسیمان الریح عاصفة تجری بامرہ الی الارض التی بار کنا فیھا: اور سلیمان کے لیے تیز ہوا مسخر کر دی جو ان کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی" (الانبیاء :81)۔اس کے برخلاف آگ کی یہی صفت ہے کہ وہ چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

7۔ مٹی کے شرف کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنا گھر (البیت الحرام) بنایا ہے جس میں ہر وقت طواف کیا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کو سجدے کیے جاتے ہیں، اس کی عبادت کی جاتی ہے اور تسبیح تہلیل اور تمجید کی جاتی ہے۔ علی ھذا القیاس۔مسجد نبوی ہے، مسجد اقصیٰ ہے اور بیشمار مساجد ہیں جن میں دن رات اس کی حمد اور عبادت کی جاتی ہے اس کے برخلاف آگ میں ایسی کوئی فضیلت نہیں ہے۔

8۔ زمین میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے نفع کے لیے، معدنیات، دریا، سمندر، چشمے، پھلوں کے باغات، غلہ سے لدے ہوئے کھیت، سواریوں کے لیے اصناف و اقسام کے جانور اور طرح طرح کے لباس پیدا کیے ہیں اور اس کے مقابلہ میں آگ کے اندر ایسا کوئی نفع نہیں ہے۔

9۔ آگ کی زیادہ سے زیادہ فضیلت یہ ہے کہ اس کی حیثیت زمین کے خادم کی ہے۔اول تو آگ کا وجود زمین کے وسیلہ سے ہے۔آگ یا لکڑیوں کو جلا کر حاصل ہوتی ہے یا گوبر کو جلا کر۔ یا قدرتی گیس سے اور تیل سے حاصل ہوتی ہے اور ان تمام چیزوں کا حصول زمین سے ہوتا ہے۔ثانیاً آگ سے کھانا پکایا جاتا ہے یا حرارت حاصل کی جاتی ہے اور کھانے کے اجزاء ترکیبی بھی زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔خلاصہ یہ ہے کہ مٹی اصل اور مخدوم ہے اور آگ فرع اور خادم ہے اور اس کو مٹی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

10۔ ابلیس لعین کا مادہ خلقت (مارج من نار) بھڑکنے والی آگ ہے اور بھڑکنے والی آگ اور شعلے فی نفسہ ضعیف ہیں۔ہوا ان کو ادھر سے ادھر لے جاتی ہے اور ان کا بھڑکنا ہوا کے تابع ہے۔اور مٹی فی نفسہ قوی ہے۔ہوا اس کو اپنے زور سے ادھر ادھر نہیں لے جا سکتی بلکہ مٹی کی دیواریں اور پہاڑ ہوا کے لیے سد راہ بن جاتے ہیں قوی، ضعیف سے افضل ہوتا ہے اس لیے مٹی آگ سے افضل ہے۔ثانیاً ابلیس لعین کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آدم (علیہ السلام) کو مٹی سے بنایا گیا۔حضرت آدم (علیہ السلام) کا پتلا مٹی اور پانی کو گوندھ کر دونوں سے بنایا گیا تھا اور پانی بھی آگ سے افضل ہے کیونکہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ نیز پانی کے افضل ہونے کے لیے یہ آیت کافی ہے:" وجعلنا من الماءکل شیءحی: اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا" (الانبیاء :30)۔۔الغرض حضرت آدم (علیہ السلام) کا مادہ خلقت مٹی اور پانی ہے اور یہ دونوں آگ سے افضل ہیں۔اس لیے ابلیس لعین کا یہ کہنا غلط تھا کہ" میں آدم سے بہتر ہوں"۔

حضرت آدم کا چاروں علتوں کی وجہ سے ابلیس سے افضل ہونا: علت مادی کے بعد دوسری فضیلت کی وجہ علت صوری ہے اور علت صوری کے اعتبار سے بھی حضرت آدم (علیہ السلام) افضل ہیں:" لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم: بیشک ہم نے انسان کو سب سے حسین تقویم (ساخت) میں بنایا" (التین: 4)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔الحدیث۔

(صحیح البخاری، ج7، رقم الحدیث: 6237۔صحیح مسلم بر 115(2612)6532۔مسند احمد، ج2ص 244، 251، 315طبع قدیم)

علت صوری کے بعد تیسری فضیلت کی وجہ علت فاعلی ہے۔اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو حرف کن سے پیدا فرمایا اور حضرت آدم (علیہ السلام) کو خاص اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا:" قال یا ابلیس ما منعك ان تسجد لما خلقت بیدی: فرمایا: اے ابلیس! تجھے اس کے لیے سجدہ کرنے سے کس نے روکا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا؟" (ص:38)۔" اذ قال ربك للملئکة انی خالق بشرا من طین۔ فاذا سویته و نفخت فیه من روحی فقعوا له سجدین: جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بیشک میں مٹی سے بشر بنانے والا ہوں۔تو جب میں اسے درست کرلوں اور اس میں اپنی طرف کی (خاص) روح پھونک دوں تو تم اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا" (ص:71۔72)

فضیلت کی چوتھی وجہ علت غائی ہے اور حضرت آدم (علیہ السلام) کی غایت تخلیق اللہ تعالیٰ کی نیابت اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی خلافت ہے۔فرمایا:" واذ قال ربك للملئکة انی جاعل فی الارض خلیفة: اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بیشک میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں" (البقرہ:30)۔

اور اس سے بڑھ کر کسی مخلوق کی اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کا نائب اور اس کا خلیفہ ہو۔اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ حضرت آدم (علیہ السلام) علت مادی، صوری، فاعلی اور غائی ہر اعتبار سے ابلیس لعین سے افضل ہیں۔جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو ابلیس پر لازم اور واجب تھا کہ وہ آپ کو سجدہ کرے لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے مقابلہ میں فاسد قیاس کیا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ حضرت آدم سے افضل ہے اور افضل کا مفعول کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔بعض علماء ظاہر نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلقاً قیاس اور اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے۔اس لیے ہم یہاں پر قیاس اور اجتہاد کی تحقیق کر رہے ہیں۔

ابلیس کے باطل قیاس کی بنا پر منکرین قیاس کے دلائل اور ان کا تجزیہ: امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی 311ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ابن سیرین نے کہا سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا تھا اور سورج اور چاند کی پرستش صرف قیاس کی وجہ سے کی گئی ہے۔حسن بصری نے کہا سب سے پہلے جس نے قیاس کیا تھا، وہ ابلیس ہے۔

(جامع البیان، جز8ص 173مطبوعہ دارالفکر، بیروت، 1415ھ۔سنن دارمی ج1، رقم الحدیث 191طبع بیروت، 1407ھ)۔

حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی متوفی 430ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:"عمرو بن جمیع بیان کرتے ہیں کہ میں، ابن ابی لیلی اور (امام ابوحنیفہ، حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عبداللہ بن شبرمہ نے کہا میں اور (امام) ابوحنیفہ، حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت جعفر بن محمد نے ابن ابی لیلی سے پوچھا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انھوں نے کہا یہ وہ شخص ہے جس کو امور دین میں بہت مہارت اور بصیرت حاصل ہے۔حضرت جعفر نے کہا: شاید یہ دین کے معاملات میں اپنی رائے سے قیاس کرتے ہیں۔انھوں نے کہا نعمان! (الی قولہ) حضرت جعفر نے امام ابوحنیفہ سے کہا۔اے نعمان! مجھے میرے والد نے میرے دادا سے یہ حدیث روایت کی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے سب سے پہلے دین کے معاملہ میں اپنی رائے سے قیاس کیا، وہ ابلیس تھا۔اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: (حضرت) آدم کو سجدہ کرو اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے

آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، سو جس نے دین میں اپنی رائے سے قیاس کیا، اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ابلیس کے ساتھ اکٹھا کرے گا۔ ابن شبرمہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے، پھر حضرت جعفر نے ان سے پوچھا: قتل نفس اور زنا میں کونسا گناہ زیادہ بڑا ہے؟ امام ابوحنیفہ نے کہا: قتل نفس۔ حضرت جعفر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قتل نفس کے لیے صرف دو گواہ کافی قرار دیے۔ پھر زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی گواہی کیوں ضروری ہے؟ پھر پوچھا: نماز اور روزے میں کونسا فرض زیادہ اہم ہے؟ امام ابوحنیفہ نے کہا نماز! حضرت جعفر نے کہا: پھر کیا وجہ ہے کہ حائض عورت صرف روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں ہے؟ پھر کہا: تمہارے قیاس کرنے پر افسوس ہے! اللہ سے ڈرو اور دین میں اپنی رائے سے قیاس نہ کرو"

(حلیۃ الاولیاء، ج3ص196۔197، دارالکتاب العربی، بیروت، 1407ھ، ایضاً ج3، رقم الحدیث: 3797، دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1418ھ)

حضرت جعفر بن محمد نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے جو حدیث روایت کی ہے، اس کے متعلق قاضی محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی 1250ھ اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی متوفی 1307ھ لکھتے ہیں: اس حدیث کی سند میں غور کرنا چاہیے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد نہیں ہے اور یہ حدیث کلام نبوت کے مشابہ نہیں ہے"

(فتح القدیر، ج2ص193 مطبوعہ عالم الکتب، بیروت۔ فتح البیان، ج3ص262 مطبوعہ المطبعہ الکبری بولاق، مصر، 1301ھ)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہے۔ سعید بن عنبسہ۔ اس کے متعلق حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی 748ھ لکھتے ہیں: یحییٰ نے کہا: یہ کذاب ہے اور ابوحاتم نے کہا: یہ صادق نہیں۔ اس نام کا ایک دوسرا شخص ہے وہ مجہول ہے۔ اس نام کا ایک تیسرا شخص ہے۔ امام ابن جوزی نے اس پر کوئی طعن نہیں کیا لیکن یہ متعین نہیں ہے کہ اس سند میں کونسا شخص مراد ہے۔

(میزان الاعتدال، ج3ص223، مکتبہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ج3ص1416ھ)

اس حدیث کا ایک اور راوی ہے عمرو بن جمیع، اس کے متعلق حافظ ذہبی لکھتے ہیں: ابن معین نے اس کو کذاب قرار دیا۔ امام دارقطنی اور ایک جماعت نے کہا: یہ متروک ہے۔ ابن عدی نے کہا: اس پر حدیث گھڑنے کی تہمت ہے۔ امام بخاری نے کہا: یہ منکر الحدیث ہے۔

(میزان الاعتدال، ج5ص304 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1416ھ)

نظام معتزلی اور بعض اہل الظاہر قیاس کے منکر ہیں اور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد کے جمہور علماء قیاس کے قائل ہیں اور قیاس سے جو احکام مستنبط ہوں، ان پر عمل کرنا شرعاً جائز ہے اور عقلاً واقع ہے۔ بعض شوافع اور ابوالحسین بصری کے نزدیک اس پر عمل کرنا عقلاً واجب ہے

(الجامع لاحکام القرآن، جز7ص155 مطبوعہ دارالفکر، بیروت، 1415ھ)

مجوزین قیاس کا احادیث سے استدلال:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کیا ہے: جس شخص نے کسی پیش آمدہ مسئلہ کو ایسی متعارف اصل پر قیاس کیا ہو جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا ہو تا کہ سوال کرنے والا اس مسئلہ کو سمجھ سکے، اور اس عنوان پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور

سوال کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ پھر وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہوگئی۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کرلوں؟

آپ نے فرمایا: اس کی طرف سے حج کرلو۔ یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا کرتیں؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: پھر اللہ کا قرض ادا کرو۔ وہ ادا کیے جانے کا زیادہ حق دار ہے

(صحیح البخاری، ج 8، رقم الحدیث: 7315 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

نیز امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق قاضیوں کا اجتہاد کرنا اور یہ کہا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صاحب حکمت کی تعریف کی ہے جبکہ وہ حکمت سے فیصلے کرے اور حکمت کی تعلیم دے اور از خود کوئی حکم نہ دے اور خلفاء سے مشورے کرے اور اہل علم سے تبادلہ خیال کرے، اور اس پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا صرف دو (قسم کے) آدمیوں پر حسد (رشک) کرنا جائز ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور اس مال کو راہ حق میں خرچ کرنے پر اس کو مسلط کر دیا ہو اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت دی ہو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور لوگوں کو تعلیم دیتا ہو۔

(صحیح البخاری، ج 8، رقم الحدیث: 7316 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

نیز امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا: جن احکام کی معرفت دلائل سے ہو پھر دلائل کی یہ تفسیر کی کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گھوڑوں کے احکام بیان فرمائے اور جب آپ سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے ان کا حکم اس آیت سے مستنبط کیا **فمن یعمل مثقال ذرۃ خیر یرہ** اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گوہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اس کو کھاتا ہوں اور نہ اس کو حرام کرتا ہوں اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی ہے۔ اس سے حضرت ابن عباس (رض) نے یہ استدلال کیا ہے کہ گوہ حرام نہیں ہے اور اس عنوان کے تحت یہ حدیث سند کے ساتھ بیان کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں۔ گھوڑا کسی کے لیے باعث اجر ہوتا ہے اور کسی کی پردہ پوشی کا سبب ہوتا ہے اور کسی کے حق میں گناہوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کے لیے اس کا گھوڑا باعث اجر ہے، یہ وہ شخص ہے جس نے گھوڑے کو اللہ کے راستہ میں باندھ دیا۔ وہ چراگاہ یا باغ میں اس کی رسی دراز کر دیتا ہے۔ وہ اس چراگاہ یا باغ سے جو کچھ کھاتا ہے، وہ اس کی نیکیاں ہیں اور اگر وہ اس کی رسی کاٹ دے اور وہ کسی ایک ٹیلے یا دو ٹیلوں پر جائے تو اس کے چلنے اور اس کی لید کے بدلہ میں اس کی نیکیاں ہیں اور اگر وہ کسی دریا سے پانی پیئے خواہ اس کا قصد پانی پلانے کا نہ ہو پھر بھی اس کی نیکیاں ہیں اور اس گھوڑے میں اس شخص کے لیے اجر ہے۔ اور ایک شخص نے گھوڑے کو اس لیے رکھا کہ وہ اپنی ضروریات میں دوسروں سے مستغنی رہے اور ان سے سوال کرنے سے بچا رہے اور اس پر کسی کو سوار کرنے میں یا اس پر کسی کا بوجھ لادنے میں اللہ کے حق کو فراموش نہ کرے تو یہ گھوڑا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کا سبب ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے اپنے گھوڑے کو فخر کرنے اور ریاکاری کے لیے رکھا تو یہ اس کے اوپر گناہ ہے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھ پر ان کے متعلق کوئی خصوصی حکم نازل نہیں ہوا مگر یہ آیت جو تمام احکام کو جامع ہے: **فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ:** جس نے ایک ذرہ کے برابر نیکی کی وہ اس کی جزا پائے گا اور جس نے ایک ذرہ کے برابر برائی

کی وہ اس کی سزا پائے گا (الزلزال:7۔8) (صحیح البخاری، ج8، رقم الحدیث:3756۔صحیح مسلم، الزکوۃ:24(987)2254۔سنن النسائی، ج6، رقم الحدیث:3563)۔اس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مخصوص اور جزی حکم پر ایک عام اور کلی حکم سے استدلال کیا ہے اور اس حدیث میں پیش آمدہ مسائل اور جزئیات پر شرعی کلیات سے استدلال کرنے کی دلیل ہے۔

مجوزین قیاس کا آثار صحابہ اور اقوال علماء سے استدلال:

علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سے مسائل کا استنباط کرنا اور اجتہاد کرنا، اور امت کا اجماع برحق اور واجب ہے، اور اہل علم کے لیے لازماً فرض ہے۔اس کے ثبوت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث اور صحابہ اور تابعین کی روایات موجود ہیں۔ابوتمام مالکی نے کہا: کہ قیاس کے جواز پر امت کا اجماع ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ نے ربا الفضل میں چھ چیزوں (سونا، چاندی، گندم، جو، نمک اور کھجور) پر دوسری چیزوں کو قیاس کیا ہے اور ان میں بھی زیادتی کے ساتھ بیع کو حرام قرار دیا ہے اور جب حضرت ابوبکر (رض) نے بیعت لینے سے انکار کیا تو حضرت علی (رض) نے فرمایا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے دین میں آپ پر راضی ہوگئے تو ہم اپنی دنیا میں آپ پر کیوں راضی نہیں ہوں گے۔حضرت علی (رض) نے امام کو نماز پر قیاس کیا، اور حضرت ابوبکر (رض) نے زکوۃ کو نماز پر قیاس کیا اور کہا: بہ خدا اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوۃ کو جمع کیا ہے میں ان میں تفریق نہیں کروں گا، اور حضرت علی (رض) نے صحابہ کرام کے سامنے شراب کی حد کو حد قذف پر قیاس کیا اور فرمایا: انسان شراب کے نشہ میں ہذیان بکتا ہے اور ہذیان میں لوگوں پر تہمت لگاتا ہے لہٰذا اس کی حد بھی اسی کوڑے ہوگی، اور پھر اس حد پر تمام صحابہ کا اجماع ہوگیا اور حضرت عمر (رض) نے حضرت ابوموسی اشعری سے فرمایا: کہ جن نئے مسائل میں تم کو تشویش ہو اور کتاب اور سنت میں ان کی تصریح نہ ہو تو ان کے متعلق تم قیاس سے کام لو اور جو چیز حق کے مشابہ ہو اس پر عمل کرو۔اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔
(سنن دارقطنی، ج4، رقم الحدیث:4452، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1417ھ)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب (رض) شام کے علاقہ میں گئے۔حتی کہ جب وہ مقام سرغ میں پہنچے تو ان سے لشکر کے امراء نے ملاقات کی، جن میں حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور ان کے اصحاب بھی تھے۔انھوں نے یہ خبر دی کہ شام میں وبا پھیل چکی ہے۔اب ان کا اس میں اختلاف ہوا کہ وہ شام میں داخل ہوں یا نہ ہوں۔بعض صحابہ نے کہا: ہم ایک کام کے لیے آئے ہیں اور اس کام کو کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے اور بعض نے یہ کہا: کہ آپ کے ساتھ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب ہیں اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ ان کو وبا میں جھونک دیں۔حضرت عمر نے ان لوگوں کو مجلس سے اٹھا دیا اور انصار کو بلایا انھوں نے بھی مہاجرین کی طرح مشورہ دیا اور ان میں بھی اسی طرح اختلاف ہوا۔پھر آپ نے ان کو بھی اٹھا دیا اور قریش کے عمر رسیدہ لوگوں کو بلایا۔انھوں نے بالاتفاق یہ کہا کہ لوگوں کو اس بلا میں نہ ڈالیں اور واپس چلیں۔پھر حضرت عمر نے اعلان کر دیا کہ ہم صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے کہا: کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں! حضرت عمر نے فرمایا: اے ابوعبیدہ! کاش تمہارے علاوہ کوئی اور شخص یہ بات کہتا! ہم اللہ کی ایک تقدیر سے اللہ کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔یہ بتاؤ اگر تمہارے پاس اونٹ ہوں اور تم ایک وادی میں جاؤ جس کے دو کنارے ہوں، ایک سرسبز

ہو اور ایک بنجر ہو۔ اگر تم سرسبز کنارے کی طرف جاؤ پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف جاؤ گے اور اگر بنجر کنارے کی طرف جاؤ پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف جاؤ گے۔ اس وقت حضرت عبدالرحمن بن عوف آ گئے جو کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا: اس کے متعلق میرے پاس ایک حدیث ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تمہیں کسی علاقہ میں بلا کا علم ہو تو وہاں نہ جاؤ۔ اور جب تم کسی علاقہ میں ہو اور وہاں وبا آ جائے تو وہاں سے نہ نکلو۔ پھر حضرت عمر نے اللہ کی حمد کی اور وہاں سے واپس لوٹ گئے۔

(صحیح البخاری، ج7 رقم الحدیث 5729 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1412ھ)

اس مضمون کی احادیث آثار اور اقوال ائمہ بہ کثرت ہیں اور ان میں یہ دلیل ہے کہ قیاس دین کی ایک اصل ہے۔ مجتہدین اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور علماء اس سے استدلال کرتے ہیں اور احکام کا استنباط کرتے ہیں۔ اس پر ہر دور کے علماء کا اجماع رہا ہے اور چند شاذ لوگوں کی مخالفت سے اس اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جو قیاس ممنوع اور مذموم ہے یہ وہ قیاس ہے جس کی اصل کتاب اور سنت میں موجود نہ ہو اور جو نصوص صریحہ سے متصادم ہو جیسے ابلیس کا قیاس تھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے مقابلہ میں قیاس کیا۔ حالانکہ قیاس اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی مسئلہ میں صریح حکم نہ ہو۔ قرآن میں نہ حدیث میں۔ مخالفین قیاس نے اپنے موقف کی تائید میں جو روایات ضعیفہ اور اقوال رکیکہ پیش کیے ہیں برتقدیر ثبوت ان کا محمل اس قسم کا قیاس ممنوع اور مذموم ہے جس کی اصل کتاب، سنت اور اجماع امت میں موجود نہ ہو۔

(الجامع لاحکام القرآن، جز7 ص155۔156 مطبوعہ دارالفکر، بیروت، 1415ھ)

امام فخرالدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں: قیاس کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے" فاعتبروا یا اولی الابصار: اے آنکھیں رکھنے والو! عبرت حاصل کرو" (الحشر: 2)۔ اس آیت میں قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے زیادہ بصیرت رکھنے والے تھے اور قیاس کی شرائط پر سب سے زیادہ مطلع تھے اور اس آیت میں آپ کو بھی قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آپ بھی قیاس کرتے تھے

(المحصول، ج4 ص1364۔1356 مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفی، ریاض، 1417ھ)

ذبیحہ کے بیان میں

وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

﴿سورت انعام ۱۲۱﴾

"اور اس ذبیحہ کو نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا بیشک اس کو کھانا گناہ ہے، بیشک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے بحث کریں، اور اگر تم نے ان

کی اطاعت کی تو تم مشرک ہو جاؤ گے"۔(الانعام:۱۲۱)

جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو‘اس کے متعلق مذاہب فقہاء:

جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو‘اس کے متعلق فقہاء مذاہب کے مختلف آراء ہیں۔امام شافعی کے نزدیک مسلمان نے جس جانور کو ذبح کیا ہو اس کا کھانا حلال ہے۔خواہ اس نے عمداً بسم اللہ نہ پڑھی ہو یا نسیاناً"۔

(تفسیر کبیر ج ۵ ص ۱۳۰ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام احمد کے نزدیک اگر بھولے سے بسم اللہ نہیں پڑھی تو ذبیحہ حلال ہے‘اور اگر عمداً بسم اللہ کو ترک کردیا ہے تو اس میں ان کے دو قول ہیں۔

(زادالمسیر ج ۳‘ص ۱۱۰‘طبع بیروت‘۱۴۰۷ھ)

امام مالک اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر عمداً بسم اللہ کو ترک کردیا تو وہ ذبیحہ حرام ہے اور نسیاناً بسم اللہ کو ترک کردیا تو پھر وہ ذبیحہ حلال ہے۔

(بدایۃ المجتہد‘ج ۱‘ص ۳۲۸‘مطبوعہ دارالفکر‘بیروت)

امام ابوحنیفہ کے مذہب پر دلائل:

امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ اس پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ عمداً بسم اللہ ترک کرنے سے ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

اس آیت کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو وہ حرام ہے۔خواہ عمداً نام نہ لیا ہو یا نسیاناً لیکن احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نسیاناً بسم اللہ کو ترک کرنا موجب حرمت نہیں ہے۔اس لیے ہم نے کہا یہاں نسیان مراد نہیں ہے‘اب اگر بسم اللہ کو عمداً ترک کرنا بھی جائز ہو تو اس آیت پر بالکل عمل نہیں ہوگا۔نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(آیت)"واذکروا اسم اللہ علیہ"۔(المائدہ:۴)

ترجمہ:شکار پر(سدھائے ہوئے کتے کو چھوڑتے وقت)اللہ کا نام لو۔

اور امر وجوب کا تقاضا کرتا ہے‘اس لیے شکار پر شکاری جانور چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے اور سنت سے بھی اس پر دلیل ہے۔حضرت عدی بن حاتم (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے شکاری کتے کے متعلق سوال کیا؟ آپ نے فرمایا جب تم اپنا سدھایا ہوا کتا چھوڑو اور اس پر بسم اللہ پڑھو تو اس کو کھالو‘بشرطیکہ اس نے تمہارے لیے شکار کو (کھانے سے) روک رکھا ہو‘اور جب تم اس کے سوا دوسرا کتا دیکھو جس نے ہلاک کیا ہو تو اس کو نہ کھاؤ‘ کیونکہ تم نے اپنے کتے پر بسم اللہ پڑھی ہے اور دوسرے کتے پر بسم اللہ نہیں پڑھی۔اس آیت اور اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذبیحہ پر بھی بسم اللہ پڑھنا واجب ہے اور اس کو عمداً ترک کرنا جائز نہیں ہے۔

(احکام القرآن‘ج ۳‘ص ۷-۶‘ملخصاً‘مطبوعہ لاہور)

اور اگر بھولے سے بسم اللہ نہ پڑھی جائے تو ذبیحہ کے حلال ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے:

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ مسلمانوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا کہ کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لے کر آتے ہیں، ہمیں پتا نہیں کہ انھوں نے ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں! آپ نے فرمایا تم اس پر بسم اللہ پڑھ کر کھالو، حضرت عائشہ (رض) نے کہا اس وقت لوگ نئے نئے کفر سے نکلے تھے۔

(صحیح البخاری، ج ٦، رقم الحدیث: ٥٥٠٧، سنن النسائی، ج ٧، رقم الحدیث: ٤٤٤٨، سنن ابن ماجہ، ج ٢، رقم الحدیث: ٣١٧٤، مصنف عبدالرزاق، ج ٤، رقم الحدیث: ٨٧٩٥، کنز العمال، ج ٦، رقم الحدیث: ١٥٥٩٨، سنن دار قطنی، ج ٤، رقم الحدیث: ٤٧٦٣)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مسلمان کے لیے اللہ کا نام کافی ہے۔ اگر وہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا بھول گیا تو وہ کھانے کے وقت بسم اللہ پڑھ کر کھالے۔ (اس حدیث کی سند حسن ہے)

(سنن دار قطنی، ج ٤، رقم الحدیث: ٤٧٦٢، سنن کبری للبیہقی، ج ٩ ص ٢٤)

حلال کو حرام کرنے یا حرام کو حلال کرنے کا شرعی حکم:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا بیشک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں، تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔

اس وسوسہ کا بیان اس حدیث میں ہے۔ امام ابن ماجہ متوفی ٢٦٣ ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ مشرکین یہ کہتے تھے کہ جس پر اللہ کا نام لیا جائے، اس کو نہ کھاؤ اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اس کو کھالو۔

(سنن ابن ماجہ، ج ٢، رقم الحدیث: ٣١٧٣، سنن ابو داؤد، ج ٣، رقم الحدیث: ٢٨١٨)

اور وہ بحث یہ کرتے تھے کہ یہ کیا بات ہے جس کو اللہ نے مارا ہے اس کو تم نہیں کھاتے اور جس کو تم نے قتل کیا ہے اس کو کھالیتے ہو۔ اس کے بعد فرمایا اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرک ہو جاؤ گے۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حلال کیے ہوئے کو حرام کیا یا اس کے حرام کیے ہوئے کو حلال کیا، تو وہ مشرک ہو جائے گا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال اعتقاد کرے۔ تب وہ کافر اور مشرک ہوگا اور اگر وہ اللہ کے حرام کیے ہوئے کاموں کو اپنی نفسانی خواہش سے کرتا ہو لیکن وہ ان کاموں کو حرام ہی جانتا ہو تو وہ فاسق اور مرتکب معصیت کبیرہ ہوگا، کافر اور مشرک نہیں ہوگا۔

عشر اور اُس کے جمع کے احکام

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝١٤١ ﴿سورت انعام آیت 141﴾

غ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہی ہے جس نے بیلوں والے باغ پیدا کیے اور جس نے درختوں والے باغ پیدا کیے اور کھجور کے درخت اور کھیت اگائے جن کے کھانے مختلف ہیں اور زیتون اور انار اگائے جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور مختلف بھی جب وہ درخت پھل دار ہوں تو ان کے پھلوں سے کھاؤ اور جب ان کی کٹائی کا دن آئے تو ان کا حق ادا کرو اور بے جا خرچ نہ کرو' بیشک اللہ تعالیٰ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (الانعام: ۱۴۱)

مشکل الفاظ کے معانی:

معروشات: یہ لفظ عرش سے بنا ہے' عرش کا معنی ہے چھت۔ جس چیز پر بادشاہ بیٹھتا ہے' اس کو بھی بلندی کی وجہ سے عرش (تخت) کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں عرشت الکرم میں نے انگور کی چھت بنادی' یعنی انگور کی بیلیں اس طرح پھیلا دیں کہ ان سے چھت بن گئی۔ اس آیت میں "جنات معروشات" سے مراد وہ باغ ہیں جن میں پھلوں کی بیلیں ہوں' مثلاً انگور کی یا خربوزہ اور تربوز کی۔

غیر معروشات: جن پھلوں کے درختوں کو زمین پر چھوڑ دیا گیا ہو' جو اپنے تنے اور شاخوں کی وجہ سے کسی چھت پر ڈالے جانے سے مستغنی ہوں۔

حصاد: یہ لفظ حصد سے بنا ہے' اس کا معنی ہے فصل کاٹنا۔ درختوں سے پھلوں کے توڑنے کو بھی حصاد کہتے ہیں۔

وجود باری اور توحید پر دلیل:

قرآن مجید کا موضوع توحید' رسالت' احکام شرعیہ' معاد اور جزاء وسزا کو بیان کرنا ہے۔ اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کفار کو سرزنش کی تھی جو شرک کرتے تھے اور از خود احکام بنا لیتے تھے' اس کے بعد اب پھر اصل مقصود کی طرف متوجہ ہوا اور وجود باری اور توحید پر دلائل دیئے۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیلوں اور درختوں والے باغات پیدا کیے اور کھجور کے درخت اور کھیت پیدا کیے۔ ان پھلوں کی شکل وصورت' ان کا رنگ' ان کی خوشبو اور ان کا ذائقہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح کھیتوں سے جو غلہ پیدا ہوتا ہے ان کی ہیئت ان کا ذائقہ ان کے فوائد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ چیزیں از خود تو پیدا نہیں ہوئیں' اور نہ یہ چیزیں سورج' چاند اور ستاروں نے پیدا کی ہیں۔ کیونکہ جب وہ غروب ہو جاتے ہیں تب بھی یہ چیزیں اسی طرح برقرار رہتی ہیں۔ پھر دنیا بھر کے لوگ جو اللہ کے سوا اور چیزوں کی خدائی کے قائل ہیں' ان چیزوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ان باغوں اور کھیتوں کے پیدا کرنے والے ہیں۔ بلکہ اللہ کے سوا کوئی بھی ان کے پیدا کرنے کا دعوی دار نہیں ہے تو پھر ہم کیوں نہ مانیں کہ اللہ ہی دنیا بھر کے باغوں' کھیتوں اور ہرے بھرے جنگلوں کا خالق ہے اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ نباتات کا خالق ہے تو جمادات' حیوانات' انسانوں' جنوں اور فرشتوں اور ساری کائنات کا بھی وہی خالق ہے اور وہی عبادت کا مستحق ہے۔

فصل کی کٹائی کے حق سے مراد عشر ہے یا عام صدقہ؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جب فصل کی کٹائی کا دن آئے تو اس کا حق ادا کرو۔

امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض)، جابر بن زید، محمد بن حنیفہ، حسن بصری، سعید بن مسیب، طاؤس، زید بن اسلم، قتادہ اور ضحاک کا یہ قول ہے کہ اس حق سے مراد عشر (پیداوار کا دسواں حصہ) اور نصف العشر (پیداوار کا بیسواں حصہ) ہے اور حضرت ابن عباس (رض) سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس حق کو اس حدیث نے منسوخ کر دیا جس میں عشر اور نصف عشر کو فرض کیا گیا، اور یہ قول اس اصول پر مبنی ہے کہ قرآن کے حکم کو سنت سے منسوخ کرنا جائز ہے، حسن بصری سے روایت ہے کہ اس حکم کو زکوۃ نے منسوخ کر دیا ضحاک نے کہا ہے کہ قرآن میں مذکور ہر صدقہ کو زکوۃ نے منسوخ کر دیا، اور حضرت ابن عمر اور مجاہد سے روایت ہے کہ یہ آیت محکمہ (غیر منسوخ) ہے اور فصل کی کٹائی کے وقت اس حق کو ادا کرنا واجب ہے اور یہ حق زکوۃ کے علاوہ ہے اور روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رات کے وقت کھجور توڑنے اور فصل کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا کہ یہ ممانعت اس لیے ہے تاکہ دن میں کٹائی کے وقت مساکین آسکیں۔ مجاہد نے کہا جب فصل کاٹی جائے تو اس میں سے کچھ حصہ مساکین کو دیا جائے اس طرح جب درخت سے کھجوریں توڑی جائیں تو کچھ کھجوریں ان کو دی جائیں۔ اسی طرح جب ان کو صاع کے حساب سے ماپا جائے تو ان کو کچھ کھجوریں دی جائیں۔

(احکام القرآن ج ۳، ص ۹، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس (رض) کے نزدیک اس آیت میں فصل کی کٹائی کے حق سے مراد عشر یا نصف عشر ہے اور حضرت ابن عمر (رض) کے نزدیک اس حق سے مراد عام صدقہ ہے اور یہ حق زکوۃ کے علاوہ ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) کا قول اس لیے راجح ہے کہ احادیث میں بھی ارضی پیداوار کی زکوۃ، عشر یا نصف عشر بیان کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو باغ یا کھیت بارش سے یا چشموں سے یا بارش کے جمع شدہ پانی سے سیراب کیا گیا ہو اس میں عشر ہے اور جن کو کنوئیں سے پانی حاصل کر کے سراب کیا گیا ہو اس میں نصف عشر ہے۔

(صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۹۱، سنن الترمذی ج ۲، رقم الحدیث: ۶۴۰، صحیح مسلم زکوۃ ۷، (۹۸۱) ۲۲۳۶، سنن ابوداؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۵۹۷، سنن النسائی، ج ۵، رقم الحدیث: ۲۴۸۹)

عشر کے نصاب میں مذاہب فقہاء:

امام ابوحنیفہ کے نزدیک زمین کی پیداوار قلیل ہو یا کثیر، اس میں عشر یا نصف عشر واجب ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک پانچ وسق (تقریباً تیس من) سے کم کی مقدار میں عشر واجب نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں ہے اور نہ پانچ اونٹوں سے کم میں صدقہ ہے اور نہ پانچ اواق دو سو درھم، ۶۱۲،۳۶ گرام ساڑھے باون تولہ چاندی سے کم میں صدقہ ہے۔

(صحیح البخاری ج ۲، رقم الحدیث: ۱۴۴۷، صحیح مسلم، زکوۃ ۱، (۹۷۹) ۲۲۲۶، سنن ابوداؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۵۵۸، سنن الترمذی، ج ۲، رقم الحدیث: ۶۱۲۶، سنن النسائی، ج ۵، رقم الحدیث: ۲۴۴۵، سنن ابن ماجہ، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۷۹۳)

امام ابوحنیفہ (رح) کے موقف پر دلائل:

امام ابوحنیفہ (رح) کی دلیل قرآن مجید کی زیر تفسیر آیت ہے۔ امام فخرالدین رازی نے اس کی یہ تقریر کی ہے۔
امام ابوحنیفہ (رح) نے فرمایا قلیل اور کثیر میں عشر واجب ہے اور جمہور نے کہا جب زمین کی پیداوار پانچ وسق کو پہنچ جائے۔ امام ابوحنیفہ (رح) نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(آیت) "واتوا حقه يوم حصاده" (الانعام: ۱۴۱)

ترجمہ: اور فصل کی کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو۔

یہ آیت قلیل اور کثیر میں حق کے ثبوت پر دلیل ہے اور جب یہ حق زکوۃ (عشر) ہے تو قلیل اور کثیر میں وجوب زکوۃ کا قول کرنا واجب ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۱۶۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

نیز امام ابوحنیفہ (رح) نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس زمین کو بارش، چشمے یا بارش کا جمع شدہ پانی سیراب کرے، اس میں عشر ہے اور جو زمین کنوئیں کے پانی سے سیراب کی جائے، اس میں نصف عشر ہے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: رقم الحدیث: ۱۴۸۳، سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۱۵۹۶، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۶۴۰، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۴۸۷، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۸۱۷، سنن دارقطنی، رقم الحدیث: ۲۰۱۳، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۱۲۸۵، ۳۲۸۶، ۳۲۸۷)

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زمین کی پیداوار پر بر سبیل عموم عشر یا نصف عشر واجب کیا ہے اور اس کو پانچ وسق کے ساتھ خاص نہیں کیا اور عام خاص پر مقدم ہوتا ہے، لہٰذا جس حدیث میں آپ نے پانچ وسق پر وجوب زکوۃ کا حکم فرمایا ہے، وہ مال تجارت پر محمول ہے، یعنی جس شخص کے پاس پانچ وسق سے کم مال تجارت ہو، اس پر زکوۃ فرض نہیں ہوگی اور اس وقت پانچ وسق دو سو درہم کے برابر ہوتے تھے۔

نیز امام ابوحنیفہ (رح) کا استدلال اس آیت سے بھی ہے:

(آیت) "یایها الذین امنوا انفقوا من طیبت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض"۔

(البقرہ: ۲۶۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی کمائی ہوئی پسندیدہ چیزوں کو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کی ہیں۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بر سبیل عموم فرمایا ہے کہ زمین سے ہم نے جو کچھ پیدا کیا ہے، اس میں سے خرچ کرو اور اس کو اللہ تعالیٰ نے کسی مقدار اور نصاب کے ساتھ مقید نہیں فرمایا اور اس میں امام ابوحنیفہ کے موقف کی تائید ہے کہ زمین کی پیداوار خواہ قلیل ہو یا کثیر اس میں عشر واجب ہے۔

نفلی صدقہ کرنے میں کیا چیز اسراف ہے اور کیا نہیں:

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اور بے جا خرچ نہ کرو بیشک بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اہل لغت کے اسراف میں دو قول ہیں۔ ابن الاعرابی نے کہا حد سے تجاوز کرنا اسراف ہے اور شمر نے کہا مال کو لغو اور بے فائدہ کاموں میں خرچ کرنا اسراف ہے۔

(لسان العرب، ج ۹، ص ۱۴۸، مطبوعہ ایران)

انسان جب اپنا مال صدقہ کر دے اور اپنے اہل وعیال کے لیے کچھ نہ چھوڑے تو یہ بھی اسراف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(آیت) "ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا"۔ (الاسراء: ۲۹)

ترجمہ: اور نہ اپنا ہاتھ پوری طرح کھول دے کہ بیٹھا رہے ملامت کیا ہوا تھکا ہارا۔

ابن جریج نے کہا یہ آیت ثابت بن قیس بن شماس کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے درخت سے کھجوریں توڑیں اور کہا آج جو شخص بھی آئے گا میں اس کو کھلاؤں گا پھر وہ لوگوں کو کھجوریں کھلاتے رہے حتیٰ کہ شام ہوگئی اور ان کے پاس ایک کھجور بھی باقی نہیں بچی۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ بے جا خرچ نہ کرو، بیشک اللہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۸۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

حضرت حکیم بن حزام (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بہترین صدقہ وہ ہے جو خوشحالی کی حالت میں دیا جائے اور اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اور صدقہ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو۔

(صحیح مسلم، الزکوۃ ۹۵، (۱۰۳۴) ۲۳۴۸، سنن النسائی، ج ۵، رقم الحدیث: ۲۵۴۳، صحیح البخاری، ج ۶، رقم الحدیث: ۵۳۵۶)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: افضل صدقہ وہ ہے جو خوشحال چھوڑے، اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔ صدقہ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو، بیوی کہے گی مجھے کھلاؤ یا مجھے طلاق دو، نوکر کہے گا مجھے کھلاؤ اور مجھ سے کام لو، بیٹا کہے گا مجھے کھلاؤ مجھے کس پر چھوڑتے ہو؟

(صحیح البخاری ج ۶، رقم الحدیث: ۵۳۵۵، مسند احمد ج ۲، ص ۲۴۵، المنتقی، رقم الحدیث: ۷۵۱، مسند القضاعی، رقم الحدیث: ۱۲۳۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب سے فرمایا صدقہ کرو، ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے پاس ایک دینار ہے آپ نے فرمایا اس کو اپنے نفس پر خرچ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے آپ نے فرمایا اس کو اپنی بیوی پر خرچ کرو اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو اپنی اولاد پر خرچ کرو۔ اس نے کہا میرے پاس ایک اور دینار ہے۔ آپ نے فرمایا تم کو زیادہ معلوم ہے یعنی تم کو زیادہ معلوم ہے تمہارے رشتہ داروں میں کون زیادہ ضرورت مند ہے؟ اس کو دو۔

(سنن ابو داؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۶۹۱، سنن النسائی ج ۵، رقم الحدیث: ۲۵۳۴، مسند الشافعی، ج ۲، ص ۶۳-۶۴، مسند احمد، ج ۲، ص ۴۷۱، ۲۵۱، صحیح ابن حبان، ج ۸، رقم الحدیث: ۳۳۳۸، المستدرک، ج ۱ ص ۴۱۵، سنن کبری للبیہقی، ج ۷ ص ۴۶۶)

حضرت طارق محاربی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا

دینے والے کا ہاتھ بلند ہوتا ہے اور صدقہ کی ابتداء اپنے عیال سے کرو۔ اپنی ماں' اپنے باپ' اپنی بہن اور اپنی بھائی کو دو۔ پھر جو تمہارے زیادہ قریب ہوں اور جو ان سے قریب ہوں۔

(سنن النسائی' ج ۵' رقم الحدیث: ۲۵۳۱' صحیح ابن حبان' ج ۸' رقم الحدیث: ۳۳٤۱' سنن دارقطنی' ج ۳' رقم الحدیث: ۲۹۵۷' مصنف ابن ابی شیبہ' ج ۳ ص ۲۱۲' المعجم الکبیر' ج ۸' رقم الحدیث: ۸۱۷۵' سنن کبریٰ للبیہقی' ج ۸ ص ۳٤۵' مسند احمد' ج ۳ ص ٦٤)

ان احادیث میں ماں باپ اور بیوی بچوں پر جو صدقہ کی ابتداء کرنے کا حکم ہے اس سے مراد صدقہ نفلیہ ہے' کیونکہ صدقہ واجبہ کو ان پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ جس شخص کا دل مضبوط ہو اور اس کا نفس مستغنی ہو' اور وہ اللہ تعالیٰ پر متوکل ہو اور وہ اکیلا ہو' اس پر ماں باپ' بیوی' بچوں اور بہن بھائیوں کی ذمہ داری اور ان کی پرورش کا بار نہ ہو اور وہ مالی حقوق سے متعلق اللہ تعالیٰ کے تمام فرائض ادا کر چکا ہو تو وہ اگر اللہ کی راہ میں اپنا سارا مال خرچ کر دے تو یہ جائز ہے اور اسراف نہیں ہے۔

امام عبدالرحمن بن محمد بن ادریس رازی ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مجاہد نے کہا اگر تم ابوقیس (ایک پہاڑ) کے برابر سونا بھی اللہ کی اطاعت میں خیرات کر دو تو یہ اسراف نہیں ہے اور اگر تم ایک صاع (چار کلو) بھی اللہ کی معصیت میں خرچ کرو تو یہ اسراف ہے۔ (رقم الحدیث: ۷۹٦٤)

(تفسیر امام ابن ابی حاتم' ج ۵' ص ۱۳۹۹' مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الریاض' ۱٤۱۷ھ)

امام ابوالشیخ نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ ابو بشر نے بیان کیا کہ لوگوں نے ایاس بن معاویہ سے پوچھا اسراف کیا ہے؟ انھوں نے کہا جب تم اللہ کے حکم سے تجاوز کرو تو یہ اسراف ہے۔ سفیان بن حسین نے کہا جب تم اللہ کے حکم میں کمی کرو تو یہ اسراف ہے۔

(در منثور' ج ۳' ص ۳٦۹' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱٤۱٤ھ)

مالِ غنیمت کے بیان میں

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

﴿سورۃ انفال ۱﴾

''یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں (۱) آپ فرما دیجئے! کہ غنیمتیں اللہ کی ہیں اور رسول کی ہیں (۲) سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو''۔

مال غنیمت اور اس کے احکام:

ابو بکر جصاص کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) مجاہد، ضحاک، قتادہ، عکرمہ اور عطاء کا قول ہے کہ انفال غنائم کو کہتے ہیں۔ عطاء نے حضرت ابن عباس (رض) سے ایک اور روایت کی ہے کہ انفال ان تمام چیزوں کا نام ہے جو مشرکین سے قتال کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ لگیں خواہ وہ کوئی سواری ہو غلام یا مال ومتاع۔ اسی لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ اختیار تھا کہ آپ ان چیزوں کو جہاں چاہیں کھپا دیں۔ مجاہد سے ایک روایت ہے کہ انفال خمس یعنی مال غنیمت کے پانچویں حصے کو کہتے ہیں جو ان لوگوں کا حق ہوتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کا حق دار ٹھہرایا ہے جن کا قول ہے کہ انفال کا تعلق ان فوجی دستوں سے تھا جو اصل فوج کے آگے آگے ہوتے تھے۔ لغت میں نفل اس چیز کو کہتے ہیں جو اصل حق سے زائد ہوتی ہے۔ اسی سے نافلہ کا لفظ بنا ہے جو تطوع کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ہمارے نزدیک نفل مال غنیمت محفوظ کر لینے سے پہلے دیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد یہ صرف پانچویں حصے سے دیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ سپہ سالار یا امام کسی سریہ یعنی فوجی دستے سے کہہ دے کہ خمس نکالنے کے بعد تمہارے لیے چوتھائی حصہ ہوگا۔ یا خمس نکالنے سے پہلے پورے مال غنیمت میں سے چوتھائی حصہ ہوگا یا یوں اعلان کر دے کہ جس شخص کو جو چیز ہاتھ لگے وہ اس کی ہوگی، یہ بات قتال پر ابھارنے اور دشمن کے خلاف بھڑکانے کی خاطر کہی جائے۔ یا یوں کہے کہ جس شخص نے کسی دشمن کو قتل کر دیا اسے اس کا سارا سامان یعنی سلب مل جائے گا لیکن جب مال غنیمت محفوظ کر لیا جائے تو پھر امام کے لیے لشکر کے حصے میں سے کسی کو بطور نفل کچھ دینا جائز نہیں ہوگا۔ تاہم اس کے لیے پانچویں حصے میں سے کسی کو بطور نفل کچھ دے دینا بھی جائز ہوگا۔ اس آیت کے نزول کے سبب کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ حضرت سعد (رض) سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: جنگ بدر میں ایک تلوار میرے ہاتھ لگی میں اسے لے کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آگیا اور عرض کیا کہ یہ تلوار مجھے بطور نفل دے دیجئے"۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ سن کر فرمایا کہ اسے تم نے جہاں سے اٹھایا ہے وہیں لے جا کر رکھ دو"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یسئلونك عن الانفال۔ تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے بلا کر فرمایا کہ جاؤ اور جا کر اپنی تلوار لے لو"۔ معاویہ بن صالح نے علی بن ابی طلحہ سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس (رض) سے قول باری یسئلونك عن الانفال کی تفسیر میں روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: "انفال ان غنائم کا نام تھا جو صرف حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے مخصوص ہوتے تھے اور ان میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی واعلموا انما غنمتم من شئی فان اللہ خمسه وللرسول اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمات تم نے حاصل کیا ہے ان کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔ کا ہے) تا آخر آیت۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ مجھے سلیمان نے مجاہد سے یہ بات بتائی ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامت (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) اور دیگر حضرات کا قول ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معرکہ بدر کے دن مختلف انفال تقسیم کئے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص کو کوئی چیز ہاتھ لگی ہو وہ اس کی ہے"۔ اس پر صحابہ کرام کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا، کچھ لوگ تو اس بارے میں ہماری رائے رکھتے تھے جبکہ کچھ دوسرے حضرات یہ کہتے تھے کہ ہم نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حفاظت کی اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے گرد اپنی جانوں کا حلقہ باندھ دیا جب ہمارے اختلافات بڑھ گئے اور ہمارے اخلاق بگڑ گئے تو اللہ تعالیٰ نے وہ سارا مال ہمارے ہاتھوں سے

چھین کر اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حوالے کر دیا جسے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خمس نکالنے کے بعد تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں تقویٰ اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت اور آپس کے تعلقات کو درست کرنے کی بات تھی) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یسئلونك عن الانفال قل الانفال لله وللرسول) حضرت عبادہ بن الصامت فرماتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا لیرد قوی المسلمین علی ضعیفھم۔ مسلمانوں میں سے جو قوی اور طاقتور ہیں وہ کمزوروں پر اس مال کو لوٹا دیں) اعمش نے ابوصالح سے اور انھوں نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا تم سے پہلے سیاہ سر رکھنے والی کسی قوم کے لیے مال غنیمت حلال نہیں تھا۔ آسمان سے ایک آگ اترتی اور مال غنیمت کو جلا دیتی"۔ حضرت ابوہریرہ (رض) فرماتے ہیں کہ معرکہ بدر کے دن لوگوں نے مال غنیمت کے لیے بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لولا کتاب من الله سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے کیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے)۔

حضرت عبادہ (رض) اور حضرت ابن عباس (رض) کی روایت میں یہ ذکر ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معرکہ بدر کے دن جنگ شروع ہونے سے قبل اعلان فرمایا تھا "جو چیز کسی کے ہاتھ آئے وہ اس کی ہوگی"۔ نیز "جو شخص کسی کو قتل کر دے گا اس کا سامان اسے مل جائے گا"۔ اور قول کے مطابق یہ بات غلط ہے بلکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے معرکہ حنین کے روز یہ اعلان فرمایا تھا من قتل قتیلا فلہ سلبہ جو شخص کسی کو قتل کرے گا اس کا سامان اسے مل جائے گا) درج بالا بات کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا تھا لم تحل الغنائم لقوم سود الروس غیر کم۔ تمہارے سوا سیاہ سر رکھنے والی کسی قوم کے لیے مال غنیمت حلال نہیں تھا) نیز یہ کہ قول باری یسئلونک عن الانفال) کا نزول میدان بدر میں مال غنیمت سمیٹ لینے کے بعد ہوا تھا۔ اس سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ جن حضرات نے یہ نقل کیا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ شروع ہونے سے پہلے جو چیز جس کے ہاتھ لگی تھی وہ اسے بطور نفل دے دی تھی ان کی یہ روایت غلط ہے کیونکہ مال غنیمت کی اباحت جنگ کے بعد ہوئی تھی۔ اس بات کے غلط ہونے پر یہ امر بھی دلالت کرتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا من اخذ شیئاً فھو لہ) نیز فرمایا تھا من قتل قتیلاً فلہ کذا) پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مالِ غنیمت لوگوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا۔ اس روایت کے غلط ہونے کا یہیں سے پتہ چلتا ہے کیونکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات سے وعدہ خلافی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ سوچا جا سکتا ہے کہ آپ ایک شخص کے لیے کوئی چیز مخصوص کر دیں اور پھر اس سے وہ چیز لے کر کسی اور کو دے دیں اس بارے میں درست بات یہ ہے کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے مال غنیمت کے متعلق کوئی اعلان نہیں ہوا تھا۔ پھر جب مسلمان جنگ سے فارغ ہو گئے اور مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یسئلونک عن الانفال) اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کا معاملہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سپرد کر دیا کہ اس میں جس کو جتنا چاہیں دے دیں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سارا مال لوگوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا۔ پھر یہ حکم اس قول باری کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا (واعلموا انما غنمتم من شئی) تا آخر آیت جیسا کہ حضرت ابن عباس (رض) اور مجاہد سے مروی ہے کہ

آپ نے پانچواں حصہ اپنے اہل کو اور ان مسلمانوں کو دے دیا جن کا آیت میں ذکر ہے اور باقی چار حصے جنگ میں شریک ہونے والوں کے درمیان تقسیم کر دیئے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سوار اور پیدل سپاہی کے حصول کی بھی وضاحت فرما دی تھی۔ مال غنیمت اکٹھا کر لینے سے پہلے کسی کو بطور نفل کچھ دے دینے کا حکم باقی رہ گیا۔ مثلاً امام یا سالار لشکر یہ اعلان کر دے"۔ جو شخص کسی دشمن کو قتل کر دے گا اس کا سامان اسے مل جائے گا" یا" جو چیز کسی کے ہاتھ آ جائے گی وہ اس کی ہوگی"۔ اسی طرح خمس میں سے کسی کو بطور نفل کچھ دے دینے کا حکم بھی باقی رہ گیا، اسی طرح قتال کے بغیر مشرکین کا کوئی گرا پڑا مال بھی اسی حکم کے تحت رہا۔ یہ تمام مال نفل کے ذیل میں آتا تھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ اختیار تھا کہ اس میں سے جس کو جتنا چاہیں دے دیں۔ اس نفل کا حکم منسوخ ہوگیا تھا جو مال غنیمت اکٹھا ہو جانے کے بعد خمس کے ماسوا باقی ماندہ چار حصوں میں سے کسی کو دے دیا جاتا۔

غزوہ بدر میں ہاتھ آنے والے مال غنیمت کی تقسیم حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی صوابدید کے مطابق کی تھی اور وہ تقسیم اس طرح نہیں تھی جس طرح اب غنائم کی تقسیم ہوتی ہے اس پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بدر کے موقع پر سارا مال غنیمت جنگ کے شرکاء میں مساوی طور پر تقسیم کر دیا تھا اور اس میں سے خمس بھی علیحدہ نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر جو تقسیم ہوئی وہ اگر اس تقسیم کے مطابق ہوتی جس پر تقسیم غنائم کے حکم کو استقرار ہوگیا تھا تو پھر آپ خمس ضرور نکالتے اور سوار سپاہی کو پیدل سپاہی سے زیادہ حصہ دیتے۔ اس موقع پر پورے لشکر میں صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اور دوسرا حضرت مقداد (رض) بن الاسود کا۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غنائم بدر کو تمام شرکاء کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کر دیا تو ہمیں اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ قول باری قل الانفال للہ والرسول) تقسیم غنائم کا معاملہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو تفویض کرنے کا مقتضی ہے تا کہ اپنی صوابدید کے مطابق جس کو جتنا چاہیں دے دیں پھر مال غنیمت محفوظ کر لینے کے بعد کسی کو بطور نفل کچھ دینے کا حکم منسوخ ہوگیا لیکن مال غنیمت کو محفوظ کر لینے سے قبل لشکر اسلامی کو قتال پر ابھارنے اور انھیں دشمنوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کی خاطر کسی کو بطور نفل کچھ دے دینے کا حکم باقی رہ گیا۔ اسی طرح اس مال کو بطور نفل دینے کا حکم بھی باقی رہ گیا جو قتال کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آ جائے نیز اس مال کا بھی جس کی تقسیم نہ ہو سکتی ہو اور اس کے ساتھ خمس میں سے کسی کو کچھ دے دینے کا حکم بھی۔ یوم بدر کے موقع پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ اعلان نہیں کیا تھا کہ من اصاب شیئاً فھولہ جو شے کسی کے ہاتھ آ جائے وہ اس کی ہوگی) یا یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمایا تھا کہ من قتل قتیلاً فلہ سلبہ۔ جو شخص دشمن کے کسی آدمی کو قتل کر دے گا اسے مقتول کا سامان مل جائے گا۔ جس روایت میں یہ ذکر ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوم بدر کے موقع پر یہ دونوں اعلانات کیئے تھے اس کے غلط ہونے پر یہ روایت دلالت کرتی ہے جو ہمیں محمد بن بکر نے سنائی۔ انھیں ابو داؤد نے انھیں ہناد بن السری نے ابو بکر سے انھوں نے عاصم سے انھوں نے مصعب بن سعد سے انھوں نے اپنے والد سے وہ فرماتے ہیں کہ میں معرکہ بدر کے موقع پر ایک تلوار لے کر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آیا اور عرض کیا:" اللہ کے رسول، آج اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے خلاف میرے دل میں لگی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دیا ہے اس لیے یہ تلوار مجھے بطور ہبہ عطا کر دیجئے۔ یہ سن کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:" یہ تلوار نہ میری ہے اور نہ تمہاری"۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فرمایا تو میں یہ سوچتے ہوئے واپس چلا گیا کہ آج یہ تلوار اس شخص کو مل جائے گی جس کی کارکردگی مجھ سے کم تر ہوگی۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھا کہ اتنے میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قاصد مجھے بلانے آ گیا میں نے سوچا کہ جو گفتگو میں نے آپ سے کی تھی اس کے متعلق شاید میرے

بارے میں خدا کی طرف سے کوئی حکم نازل ہوا ہے چنانچہ میں حاضر ہوگیا مجھے دیکھتے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "تم نے مجھ سے یہ تلوار مانگی تھی اس وقت تک یہ تلوار نہ میری تھی نہ تمہاری، اب اللہ تعالیٰ نے اسے میری ملکیت میں دے دیا ہے اس لیے میں اسے تمہیں دیتا ہوں"۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ یسئلونك عن الانفال قل الانفال لله والرسول) حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ بات بتادی کہ سورۃ انفال کے نزول سے پہلے وہ تلوار نہ تو آپ کی ملکیت تھی نہ حضرت سعد (رض) کی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہاتھ میں دے دیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی ملکیت کے لیے حضرت سعد کو ترجیح دی۔ اس پوری روایت میں اس روایت کے فساد کی دلیل موجود ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ شروع ہونے سے پہلے لوگوں کو بطور نفل کچھ دینے کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ من اخذ شیئاً فھولہ)

فاتحہ خلف الامام کی بحث

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

﴿اعراف 204﴾

"اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی عظمت بیان فرمائی تھی کہ یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے بصیرت افروز احکام کا مجموعہ ہے اور ایمان والے والوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس کی عظمت کا یہ تقاضا ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کو غور سے سنا جائے اور خاموش رہا جائے۔

قرآن مجید پڑھنے کے آداب

علامہ طاہر بن عبد الرشید بخاری حنفی متوفی 542ھ لکھتے ہیں:

فتاویٰ میں مذکور ہے کہ جو شخص قرآن مجید پڑھنے کا ارادہ کرے اس کو چاہیے کہ وہ بہترین کپڑے پہنے، عمامہ باندھے اور قبلہ کی طرف منہ کرے، اسی طرح عالم پر علم کی تعظیم واجب ہے۔ گرمیوں میں صبح کے وقت قرآن مجید کو ختم کرے اور سردیوں میں اول شب میں۔ اگر وہ قرآن مجید پڑھنے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے اور اس کو ریاکاری کا خدشہ ہو تو اس وجہ سے قران کریم پڑھنے اور نماز پڑھنے کو ترک نہ کرے، اسی طرح باقی فرائض کو بھی خوف ریا کی وجہ سے ترک نہ کرے۔ لیٹ کر قرآن مجید پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور قراءت کے وقت اپنی ٹانگیں ملالے۔ کسی شخص نے قرآن مجید کا کچھ حصہ یاد کیا ہو پھر اس کو باقی قرآن مجید یاد کرنے کی فرصت مل جائے تو نفلی نماز پڑھنے سے قرآن مجید کو یاد کرنا افضل ہے اور فقہ کا علم حاصل کرنا باقی قرآن مجید کے حفظ کرنے سے افضل ہے، اور بغیر علم کے زہد کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ قرآن مجید خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ حضرت براء بن عازب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 1468، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1342، خلاصۃ الفتاوی ج 1 ص 102 ۔ 103، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

علامہ ابراہیم بن محمد حلبی متوفی 956ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید کی جتنی مقدار سے نماز جائز ہوتی ہے قرآن مجید کی اتنی مقدار کو حفظ کرنا ہر مکلف پر فرض عین ہے۔ اور سورۃ فاتحہ کو اور کسی ایک سورت کو حفظ کرنا واجب ہے اور پورے قرآن کو حفظ کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور سنت عین پڑھنا نفل پڑھنے سے افضل ہے اور قرآن مجید کو مصحف سے پڑھنا افضل ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید کے مصحف کو دیکھنے اور قرآن مجید کو پڑھنا دونوں عبادتوں کو جمع کرنا ہے، اور باوضو ہو کر قبلہ کی طرف منہ کر کے اچھے کپڑے پہن کر تعظیم اور اکرام کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھنا مستحب ہے۔ قراءت سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھے۔ اعوذ باللہ ایک بار پڑھنا مستحب ہے بشرطیکہ قرات کے دوران کوئی دنیاوی کام نہ کرے حتی کہ اگر اس نے سلام کا جواب دیا یا سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ کہا تو اعوذ باللہ کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فتاویٰ الحجہ میں مذکور ہے، اور النوازل میں مذکور ہے کہ محمد بن مقاتل سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے سورۃ توبہ کو بغیر بس اللہ پڑھے پڑھنا شروع کیا تو انھوں نے کہا اس نے خطا کی۔ علامہ سمرقندی نے کہا سورۃ توبہ کو اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر پڑھنا شروع کرے اور یہ قول قراء کی تصریح کے خالف ہے انھوں نے کہا سورۃ توبہ سے پہلے بسم اللہ کو اس لیے نہیں لکھا کہ بسم اللہ امت ہے اور سورۃ توبہ رفع امان کے لیے ہے۔ یہ حضرت علیل اور حضرت ابن عباس سے منقول ہے اور حضرت عثمان نے فرمایا کہ جب بھی کوئی سورت یا آیت نازل ہوتی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بتا دیتے تھے کہ اس کو فلاں جگہ رکھو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فوت ہو گئے اور آپ نے سورۃ توبہ کا مقام نہیں بتایا، اور میں نے دیکھا کہ اس کا قصہ الانفال کے قصہ کے مشابہ ہے کیونکہ الانفال میں عہود کا ذکر ہے اور اس میں رفع العہود کا ذکر ہے اس لیے میں نے ان دونوں کو ملا دیا اور ایک قول یہ ہے کہ اس میں صحابہ کا اختلاف تھا بعض نے کہا الانفال اور براءۃ (توبہ) ایک سورت ہیں جو قتال کے لیے نازل ہوئیں اور بعض نے کہا یہ الگ الگ سورتیں ہیں، اس لیے ان کے درمیان فاصلہ کو رکھا گیا اور بسم اللہ کو نہیں لکھا گیا۔ اولیٰ یہ ہے کہ چالیس دن میں ایک بار قرآن مجید ختم کیا جائے، دوسرا قول یہ ہے کہ سال میں دو بار قرآن مجید ختم کیا جائے، امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ جس نے سال میں دو بار قرآن مجید کو ختم کیا اس نے قرآن کریم کا حق ادا کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک بار ختم کرے البتہ تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم نہ کرے۔ کیونکہ سنن ابوداود ترمذی، اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے تین دن سے کم میں قرآن مجید کو ختم کیا اس نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 1394۔ سنن الترمذی رقم الحدیث: 2949)

بستر پر لیٹ کر قرآن مجید پڑھنا جائز ہے۔ سنن ترمذی میں شداد بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص بستر پر لیٹ کر قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے لیے ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس کی ہر موذی چیز سے حفاظت کرتا ہے البتہ ادباً ٹانگیں ملائے، غسل خانہ میں اور مواضع نجاست میں قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ دفن کے بعد قبر پر سورۃ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھنا مستحب ہے۔

(سنن کبریٰ ج4ص 56۔57، مطبوعہ بیروت، غنیۃ المستملی ص 496۔497، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، 1412ھ)

قران مجید سننے کا حکم آیا نماز کے ساتھ مخصوص ہے یا خارج از نماز کو بھی شامل ہے

امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی 310ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے بعض، بعض کو نماز میں سلام کیا کرتے تھے کہ سلام علی فلاں، سلام علی فلاں۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی واذا قرء القرآن فاستعموا له وانصتوا۔

بشیر بن جابر (رض) روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود نے نماز پڑھائی۔ انھوں نے لوگوں کو امام کے ساتھ نماز میں قرآن پڑھتے ہوئے سنا، جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے کہا ابھی تک تمہاری سمجھ داری کا وقت نہیں آیا؟ کیا ابھی تک تمہیں عقل نہیں آئی؟ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو، جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔

یہ حدیث فقہاء احناف کی دلیل ہے کہ نماز میں امام کے پیچھے قراءت نہیں کرنی چاہیے۔ اس حدیث کو امام ابن جریر کے علاوہ امام ابن ابی حاتم متوفی 327ھ نے بھی روایت کیا ہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج 5، رقم الحدیث: 830)

انکے علاوہ حافظ ابن کثیر اور حافظ سیوطی نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج 3 ص 271، الدر المنثور ج 3 ص 635)

طلحہ بن عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک واعظ وعظ کر رہا تھا اور عبید بن عمیر اور عطا بن ابی رباح باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا آپ دونوں وعظ نہیں سن رہے اور وعید کے مستحق ہو رہے ہیں، ان دونوں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر اپنی نصیحت دہرائی، انھوں نے میری طرف دیکھا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئے، جب میں نے تیسری بار کہا تو انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا یہ حکم صرف نماز کے متعلق ہے۔

مجاہد، سعید بن جبیر اور ضحاک سے بھی روایت ہے کہ قرآن مجید کو غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم اس وقت ہے جب قرآن مجید کو نماز میں پڑھا جائے۔

حضرت ابن عباس، ابراہیم نخعی، عامر، قتادہ، ابن زید اور زہری سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ حکم نماز کے ساتھ مخصوص ہے۔ صحابہ نے کہا نماز کے علاوہ تلاوت کے دوران قراءت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا نماز کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت نفل ہے خواہ وعظ میں ہو، اس تلاوت کے دوران خاموش رہنا فرض نہیں ہے۔

مجاہد اور عطا بن ابی رباح سے یہ روایت بھی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے دوران سننے اور خاموش رہنے کا حکم نماز اور خطبہ میں ہے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ یہ حکم جمعہ کے خطبہ کے متعلق ہے۔ نیز مجاہد سے روایت ہے کہ یہ حکم نماز اور خطبہ کے متعلق ہے۔ عطا بن ابی رباح سے روایت ہے کہ دو وقتوں میں خاموش رہنا واجب ہے جب امام نماز میں قرآن پڑھ رہا ہو یا وہ خطبہ دے رہا ہو۔

حسن بصری، سعید بن جبیر اور عطا بن ابی رباح سے بھی یہ روایت ہے کہ یہ حکم نماز اور خطبہ دونوں کے متعلق ہے۔

(جامع البیان جز 9 ص 216۔220، ملخصاً مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

قرآن مجید کی اس ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید کو خواہ نماز میں پڑھا جائے یا خطبہ اور وعظ میں یا اس کی عام تلاوت کی جائے ہر صورت میں قرآن مجید جب پڑھا جائے تو اس کا سننا فرض ہے اور تلاوت اور قراءت کے وقت خاموش رہنا بھی فرض ہے۔

علامہ ابو البرکات عبداللہ بن احمد نسفی حنفی متوفی 710ھ لکھتے ہیں:

ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید کی قراءت کے وقت اس کو سننا اور خاموش رہنا لازم ہے خواہ یہ قراءت نماز میں ہو یا غیر نماز میں۔

آیا قرآن مجید سننا فرض عین ہے یا فرض کفایہ

علامہ طاہر بن عبد الرشید بخاری متوفی 542ھ لکھتے ہیں:

ایک شخص فقہ لکھ رہا ہو اور اس کے پہلو میں دوسرا شخص قرآن مجید پڑھ رہا ہو، اور فقہ میں مشغول شخص کے لیے قرآن مجید سننا ممکن نہ ہو تو نہ سننے والے کا گناہ قرآن مجید پڑھنے والے کو ہوگا، اسی اصل پر اگر کوئی شخص رات کو چھت پر بلند آواز سے قرآن مجید پڑھے اور لوگ سوئے ہوں تو وہ شخص گناہ گار ہوگا۔

(خلاصۃ الفتاویٰ ج 1،ص 103، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

نماز اور خارج نماز میں قرآن مجید کو سننا مطلقاً واجب ہے، کیونکہ یہ آیت ہر چند کہ نماز کے متعلق وارد ہے، لیکن اعتبار خصوصیت سبب کا نہیں عموم الفاظ کا ہوتا ہے، اور یہ حکم اس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو۔ قنیتہ میں مذکورہ ہے کہ گھر میں بچہ قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام کاج میں مشغول ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہوں گے بشرطیکہ انھوں نے اس کے پڑھنے سے پہلے کام شروع کیا ہو، ورنہ وہ معذور نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد علامہ شامی نے خلاصہ الفتاویٰ کی عبارت نقل کی ہے کہ اگر فقہ میں مشغول شخص کے پاس کوئی قرآن پڑھے یا رات کو چھت پر پڑھے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں تو ان کے نہ سننے کا گناہ پڑھنے والے پر ہوگا۔ کیونکہ ان کے نہ سننے کا سبب پڑھنے والا ہے۔ یا وہ سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کر کے اذیت پہنچا رہا ہے، اس میں غور کرنا چاہیے، اور شرح المنیہ میں یہ مذکور ہے کہ اصل میں قرآن کریم کا سننا فرض کفایہ ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی تلاوت کو ضائع نہ کیا جائے اور بعض کے خاموش ہو جانے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے، جیسے سلام کا جواب دینا واجب ہے تاکہ مسلمان کے حق کی رعایت ہو اور بعض کے جواب دینے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے اور باقی مسلمانوں سے یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ البتہ قرآن کریم پڑھنے والے پر اس کا احترام کرنا واجب ہے بایں طور کہ وہ بازاروں میں قرآن مجید نہ پڑھے اور نہ ان مقامات پر قرآن کریم پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں اور اگر اس نے وہاں پڑھا تو قرآن مجید کی حرمت کو ضائع کرنے والا وہی شخص ہوگا، سو وہی گناہ گار ہوگا نہ کہ مشغول لوگ، تاکہ لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے میں حرج نہ ہو۔ (غنیۃ المستملی ص 97، مطبوعہ لاہور، 1412ھ) قاضی القضاۃ یحییٰ منقاری زادہ نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا سنن فرض عین ہے۔

(رد المحتار ج 1،ص 366۔367، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1407ھ)

علامہ سید احمد طحطاوی حنفی متوفی 1231ھ نے غنیۃ المستملی کے حوالے سے یہی لکھا ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض کفایہ ہے۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار، ج 1،ص 237، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، 1395ھ)

علامہ ابراہیم حلبی صاحب غنیۃ المستملی متوفی 956ھ نے قرآن مجید سننے کے حکم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور علامہ شامی اور علامہ طحطاوی نے ان کی اتباع کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں مسلمانوں کے لیے آسانی ہے، لیکن ان کی دلیل دو وجہ سے صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ انھوں نے قرآن مجید سننے کے حکم کو سلام کا جواب دینے کے حکم پر قیاس کیا ہے حالانکہ سلام کا جواب دینے کا

حکم خبر واحد سے ثابت ہے اور اس کا وجوب ظنی ہے اور قرآن مجید سننے کا حکم خود قرآن کریم سے ثابت ہے اور اس کی فرضیت قطعی ہے، سو یہ اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کرنا ہے، اور ثانیاً اس لیے کہ سلام کا جواب دینے میں مسلمان کے حق کی رعایت ہے اور قرآن مجید سننے میں اور تلاوت کے وقت خاموش رہنے میں اللہ کے کلام کے حق کی رعایت ہے اور اللہ کے کلام کے حق کی رعایت بندہ کے حق کی رعایت سے کئی درجہ افضل ہے۔ نیز اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک محفل میں تلاوت کی جا رہی ہو اور ایک آدمی خاموش ہو کر سنے اور باقی شرکاء محفل تلاوت کی طرف توجہ نہ کریں اور آپس میں باتیں کرتے رہیں تو یہ امر جائز ہو حالانکہ اس میں قرآن مجید کی صریح بے حرمتی ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک قاضی منقاری زادہ کا یہ قول صحیح ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض عین ہے۔

قرآن مجید سننے کے حکم میں مذاہب فقہاء

اس سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ فقہاء احناف میں سے علامہ منقاری زادہ کے نزدیک قرآن مجید سننا فرض عین ہے اور یہی صحیح ہے اور علامہ حلبی کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔

امام مالک کے نزدیک قرآن مجید نماز میں پڑھا جائے یا خارج از نماز، اس کا سننا واجب ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز7 ص316، مطبوعہ دارالفکر بیروت، 1415ھ)

امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ واذا قرء فانصتوا (صحیح مسلم رقم الحدیث: 404) جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو

حافظ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی 656ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: یہ حدیث امام مالک کی اور ان فقہاء کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب امام بلند آواز سے قراءت کرے تو مقتدی قراءت نہ کرے، اور امام دارقطنی کا اس حدیث پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ اس حدیث کی صحت پر حفاظ کا اجماع نہیں ہے۔ کیونکہ امام مسلم نے اس حدیث کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے۔

(المفہم ج2 ص39، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، 1417ھ)

امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی قرآن مجید کا سننا فرض ہے کیونکہ علامہ موفق الدین عبد اللہ بن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے واذا قرء القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الاعراف: 204) اور حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس نماز سے فارغ ہوئے، جس میں آپ نے بلند آواز سے قراءت کی تھی۔ پھر فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قراءت کی تھی؟ ایک شخص نے کہا ہاں! یا رسول اللہ! میں نے قراءت کی تھی۔ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تب ہی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے قرآن پڑھنے میں دشواری کیوں ہو رہی ہے۔ پھر لوگ ان نمازوں میں قراءت کرنے سے رک گئے جن نمازوں میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلند آواز سے قراءت کرتے تھے۔ جب انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد سنا۔

(الموطا رقم الحدیث: 194۔ سنن النسائی رقم الحدیث: 918۔ سنن ابوداود، رقم الحدیث: 312۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 348۔ 349۔ مسند احمد ج2 ص240۔ 487، ج5 ص345۔ الکافی ج1 ص246، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1414ھ)

فقہاء شافعیہ کے نزدیک جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کا سننا مستحب ہے۔ قاضی عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی 685ھ لکھتے ہیں: اس آیت کے ظاہر الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی قرآن پڑھا جائے تو اس کا سننا مطلقاً واجب ہو اور عامۃ العلماء کے نزدیک

خارج از نماز قرآن مجید کا سننا مستحب ہے اور جو علماء امام کے پیچھے مقتدی کی قراءت کو واجب نہیں کہتے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اور یہ استدلال ضعیف ہے۔

(انوار التنزیل واسرار التاویل مع حاشیۃ الکازرونی، ج3،ص86)

ڈاکٹر وھبہ زحیلی مصر لکھتے ہیں: جن محفلوں میں قرآن مجید کی قرآت کی جائے ان میں قرآن کریم سننے اور خاموش رہنے کو ترک کرنا بہت سخت مکروہ ہے مومن پر لازم ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اس کے سننے پر حریص ہو، جیسا کہ وہ مجلس میں قرآن مجید کی تلاوت پر حریص ہوتا ہے۔

(التفسیر المنیر ج9،ص229۔230،مطبوعہ دار الفکر، بیروت 1411ھ)

صحیح یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کا سنن اور خاموش رہنا ہر حال میں اور ہر کیفیت میں واجب ہے خواہ نماز ہو یا غیر نماز ہو۔

(التفسیر المنیر ج9،ص232،مطبوعہ بیروت)

حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اللہ کی کتاب کی کسی ایک آیت کو بھی غور سے سنا ہے اس کے لیے دگنی چوگنی نیکی لکھی جائے گی اور جس نے اس آیت کی تلاوت کی وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور ہوگی۔(اس حدیث کی سند ضعیف ہے)۔

(مسند احمد ج2،ص 341۔مسند احمد ج8،رقم الحدیث:8475،طبع قاہرہ۔الجامع الصغیر رقم الحدیث:8425)

امام کے پیچھے قرآن سننے میں مذاہب اربعہ

امام ابو اسحاق ابراہیم بن علی الفیروزآبادی الشیرازی الشافعی المتوفی 455ھ لکھتے ہیں:

آیا مقتدی پر بھی سورۃ فاتحہ کی قراءت واجب ہے اس میں غور کیا جائے گا اگر وہ ایسی نماز ہے جس میں آہستہ قرآت کی جاتی ہے تو مقتدی پر سورۃ فاتحہ کی قراءت واجب ہے اور اگر وہ ایسی نماز ہے جس میں بلند آواز سے قراءت کی جاتی ہے تو اس میں دو قول ہیں، کتاب الام اور البویطی میں مذکور ہے کہ اس میں مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، کیونکہ حضرت عبادہ بن الصامت (رض) سے مروی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہم کو صبح کی نماز پڑھائی آپ پر قرآت دشوار ہوگئی، آپ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا میں دیکھ رہا تھا کہ تم اپنے امام کے پیچھے قرآت کر رہے تھے! ہم نے کہا اللہ کی قسم ہاں ہم ایسا کر رہے تھے، آپ نے فرمایا سورۃ فاتحہ کے سوا ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ جو شخص سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں آپ نے بلند آواز سے قرآت کی تھی آپ نے پوچھا: کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرآت کی تھی۔ ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا (تبھی) میں یہ سوچ رہا تھا کہ میری تلاوت میں دشواری کیوں ہو رہی ہے، جب مسلمانوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ سنا تو جن نمازوں میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بلند آواز سے قراءت کرتے تھے، ان نمازوں میں انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ قراءت کرنا ترک کر دیا۔

(المہذب ج1،ص72،مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

فقہاء حنابلہ کے اس مسئلہ میں مختلف اور متضاد اقوال ہیں

علامہ شمس الدین محمد بن مفلح المقدسی الحنبلی المتوفی 763ھ لکھتے ہیں:

اثرم نے نقل کیا ہے کہ مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، ابن الزاغوانی نے شرح الخرقی میں اسی طرح ذکر کیا ہے، اور ہمارے اکثر اصحاب اس کے وجوب کو نہیں پہچانتے، اس کو نوادر میں نقل کیا ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ جس نماز میں آہستہ قراءت ہوتی ہے اس میں مقتدی سورۃ فاتحہ پڑھے۔ ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ ہر رکعت میں جب امام بلند آواز سے قرأت کرے تو مقتدی اس کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے اور انھوں نے کہا کہ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھنا کفایت کرے گا اور سری نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے اور سکتا تا میں پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

(کتاب الفروع ج 1 ص 427، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، 1405ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ نے لکھا ہے کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **واذا قرء القرآن فاستعموا وانصتوا**۔ (الاعراف: 204)۔

(الکافی ج 1 ص 246، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1414ھ)

علامہ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن علی الخرشی المالکی المتوفی 1101ھ لکھتے ہیں: فرض نماز اور نفل نماز میں امام پر سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور مقتدی پر واجب نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے خواہ نماز سری ہو یا جہری۔ البتہ سری نماز میں امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے۔

(حاشیۃ الخرشی علی مختصر سیدی خلیل ج 1 ص 269، مطبوعہ دار صادر بیروت)

فقہاء احناف کے نزدیک نماز سری ہو یا جہری، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے

علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی 587ھ لکھتے ہیں:

ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **واذا قرء القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون**: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے (الاعراف: 204)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے اور جن نمازوں میں آہستہ قراءت کی جاتی ہے ان میں اگرچہ سننا ممکن نہیں ہے لیکن خاموش رہنا ممکن ہے۔ پس اس سے ظاہر نص کے اعتبار سے ان نمازوں میں خاموش رہنا واجب ہے۔ حضرت ابی بن کعب (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے امام کے پیچھے قراءت کرنے کو ترک کر دیا اور ان کے امام رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔ پس ظاہر ہے کہ انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے امر سے قراءت کو ترک کیا تھا اور حدیث مشہور میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے امام کو اس لیے امام بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے سو تم اس سے اختلاف نہ کرو جب وہ تکبیر پڑھے تو تم تکبیر پڑھو اور جب وہ قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو۔ اس حدیث میں امام کی قراءت کے وقت خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: 404)

ہمارے نزدیک بغیر قراءت کے کوئی نماز صحیح نہیں ہوتی اور مقتدی کی نماز بغیر قراءت کے نہیں ہے بلکہ یہ نماز قراءت کے ساتھ ہے اور وہ امام کی قراءت ہے کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے جس شخص کا امام ہو تو امام کی قراءت اس شخص کی قراءت ہے۔

(یہ حدیث حضرت جابر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت انس اور حضرت علی ابن ابی طالب (رض) سے مروی ہے۔سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:850،شرح معانی الآثار ج1 ص128،سنن دارقطنی رقم الحدیث:1250،حلیۃ الاولیاء ج7 ص389،رقم الحدیث:10957طبع جدید، زوائد البوصیری ج2 ص434،رقم الحدیث:1440۔المعجم الاوسط ج8،رقم الحدیث:7575۔مجمع الزوائد ج2، ص111،مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:2797،مسند احمد ج3 ص339،السنن الکبری للبیہقی ج2 ص160۔161۔کامل ابن عدی ج6 ص2107۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج1 ص377۔کتاب الآثار للامام محمد ص17۔کتاب الآثار لابی یوس ص24،رقم الحدیث:113۔بدائع الصنائع ج1 ص524،دار الکتب العلمیہ بیروت،1418ھ)

اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے اس لیے تعدد اسانید کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہ ہے اور اسی (80) کبار صحابہ سے امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت منقول ہے جن میں حضرت علی مرتضی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہیں اور کئی صحابہ سے یہ منقول ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، جبکہ صحیح یہ ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

امام کے پیچھے قرأۃ نہ کرنے کے متعلق احادیث

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) سے جب یہ سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قراءت کرے تو وہ فرماتے جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کے لیے کافی ہے۔اور جب وہ اکیلا نماز پڑھے تو قراءت کرے۔نافع نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔(یہ صحیح حدیث ہے)۔

(الموطا رقم الحدیث:193،سنن دارقطنی رقم الحدیث:1488۔سنن کبری ج2 ص161،موطا امام محمد ص94۔شرح معانی الآثار ص129)

امام بوجعفر احمد بن محمد طحاوی متوفی 321ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا قراءت کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں صرف ایک شغل ہے اور تمہیں امام کی قراءت کافی ہے۔حضرت ابن مسعود (رض) نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے کاش اس کے منہ میں مٹی بھر دی جاتی۔

عبیداللہ بن مقسم نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر بن عبداللہ سے سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ کسی نماز میں بھی امام کے پیچھے قراءت نہ کرو۔

ابوحمزہ نے حضرت ابن عباس سے سوال کیا کہ کیا وہ امام کے پیچھے قراءت کریں، حضرت ابن عباس نے فرمایا نہیں۔

(شرح معانی الآثار ص129 مطبوعہ مجتبائی پاکستان، لاہور)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی 852ھ لکھتے ہیں: حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود سے امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت ثابت ہے اور حضرت ابوسعید، حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے بھی روایات وارد ہیں۔

(الدرایہ مع الہدایہ الاولین ص121، مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ، ملتان)

جریر از سلیمان از قتادہ از حضرت عبداللہ بن مسعود روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب امام قراءت کرے تو خاموش رہو۔ (امام مسلم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے)۔

(صحیح مسلم صلوۃ:63(404)880۔مسند احمد ج4ص396۔سنن ابوداؤد رقم الحدیث:972۔973)

سجدہ تلاوت کتنے ہیں اور اُن کے احکامات

اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ [۩]

﴿اعراف 206﴾

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"بیشک جو آپ کے رب کی بارگاہ کے مقربین ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں"۔

فرشتوں کی کثرت عبادت سے انسان کو عبادت پر ابھارنا

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کی تلقین کی تھی اور دائماً ذکر کرنے کی ترغیب دی تھی اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ذکر کے محرکات اور بواعث کو مزید تقویت دی ہے اور فرمایا جو آپ کے رب کی بارگاہ کے مقربین ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ فرشتے بہت مکرم اور مشرف ہیں اور طاہر اور معصوم ہیں وہ شہوت اور غضب کے محرکات سے بری ہیں اور کینہ اور حسد کے بواعث سے منزہ ہیں، ان اوصاف اور کمالات کے باوجود جب وہ دائماً اللہ عزوجل کی عبادت کرتے ہیں اور خضوع اور خشوع سے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور انسان جو کہ جسمانی ظلمتوں اور بشری کثافتوں کا مرقع ہے اور شہوت اور غضب کے تقاضوں کی آماجگاہ ہے تو وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ عبادت کرے۔ فرشتوں کی اطاعت اور عبادت کے متعلق قرآن مجید کی اور بھی آیات ہیں: "لایعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یومرون: وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے" (التحریم:6)

وما منا الا لہ مقام معلوم۔ وانا لنحن الصافون۔ وانا لنحن المسبحون: اور ہم (فرشتوں) میں سے ہر ایک کے لیے اس کے قیام کی جگہ مقرر ہے۔ اور بیشک ہم ہی صف باندھنے والے ہیں۔ اور بیشک ہم ہی تسبیح کرنے والے ہیں۔ (الصافات:164۔166)

وتری الملائکۃ حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربھم: اور آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ وہ عرش الٰہی کے گرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہوں گے۔

فرشتوں کی کثرت عبادت ان کی افضیلت کو مستلزم نہیں

قرآن مجید کی اس آیت میں فرشتوں کی طہارت اور عصمت اور قدر و منزلت کے باوجود ان کی اطاعت اور عبادت کو بیان کر کے عام مسلمانوں کو اللہ کی اطاعت اور عبادت پر برانگیختہ فرمایا ہے۔ ان آیات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرشتے انبیاء (علیہم السلام) سے افضل ہیں کیونکہ ان آیات میں خطاب عام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہے اور جہاں تک افضیلت کا تعلق ہے تو ہمارے متکلمین نے تصریح کی ہے کہ رسل بشر رسل ملائکہ سے افضل ہیں اور رسل ملائکہ عامۃ البشر سے افضل ہیں اور عامۃ البشر (نیک مسلمان) عامۃ الملائکہ سے افضل ہیں اور جہاں تک فرشتوں کی کثرت عبادت اور اطاعت کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ فرشتوں میں شہوت اور غضب کا مادہ نہیں رکھا گیا اور ان میں بھوک اور پیاس اور دیگر انسانی اور بشری تقاضے نہیں رکھے گئے، اور ان کو اطاعت اور عبادت سے روکنے اور منع کرنے والی کوئی چیز نہیں، نہ ان پر کسی کی کفالت کی ذمہ داری ہے، اور انسان کے ساتھ یہ تمام عوارض ہیں سو ان عوارض اور ان تقاضوں کے باوجود انسان کا گناہوں سے رکنا اور اللہ کی عبادت کرنا فرشتوں کی عبادت سے کہیں افضل ہے جو ان عوارض اور موانع کے بغیر عبادت کرتے ہیں۔

حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے ولہ یسجدون کا تعارض اور اس کے جوابات

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے اور فرشتے اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے حالانکہ فرشتوں نے حضرت ادم (علیہ السلام) کو سجدہ کیا تھا امام رازی نے امام غزالی سے اس سوال کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ زمین کے فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور آسمان کے عظیم فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے اثبات اور نفی کے محل الگ الگ ہیں۔ پھر امام رازی نے خود اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت میں نفی عموم ہے اور حضرت آدم کے قصہ میں خاص فرشتوں کے سجدہ کا ذکر ہے اور خاص عام پر مقدم ہوتا ہے۔

(تفسیر کبیر ج 5 ص 446، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

امام غزالی اور امام رازی کی عظمتیں مسلم ہیں لیکن میرے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں سجدہ عبودیت کی نفی ہے یعنی فرشتے اللہ کے سوا کسی کو عبادت کا سجدہ نہیں کرتے اور حضرت آدم (علیہ السلام) کو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے سجدہ تعظیم کیا تھا، اور اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت آدم کو صرف زمینی کے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا جب کہ قرآن مجید میں یہ تصریح ہے کہ حضرت آدم کو سب فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ فسجد الملائکۃ کلھم اجمعون الا ابلیس (الحجر:30) تو ابلیس کے سوا سب کے سب فرشتوں کے اکٹھے ہو کر آدم کو سجدہ کیا نیز البقرہ:34 کی تفسیر میں خود امام رازی نے یہ تصریح کی ہے کہ اکثرین کا مذہب یہ ہے کہ سب فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور اس پر دو دلیلیں ہیں ایک یہ کہ سورۃ الحجر کی آیت میں جمع کا صیغہ ہے پھر اس کو کل اور اجمعون کی تاکیدات سے موکد کیا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں صرف ابلیس کا استثناء کیا ہے، اور پھر لکھا ہے کہ البتہ بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ صرف زمین کے فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور انھوں نے اس کو مستبعد جانا کہ اکابر ملائکہ کو حضرت آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے۔

(تفسیر کبیر ج 1 ص 448، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، 1415ھ)

اس لیے محفوظ جواب یہی ہے کہ سب فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ تعظیم ادا کیا تھا اور اللہ تعالی کے سوا کسی کو فرشتے سجدہ عبادت نہیں کرتے اور سیاق کلام بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تلقین کی جا رہی ہے کہ فرشتے اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں اس کے غیر کو سجدہ عبادت نہیں کرتے۔

سجدہ تلاوت کی تحقیق

سورۃ الاعراف کی یہ آخری آیت ہے اور قرآن مجید میں یہ پہلی آیت سجدہ ہے اور آخری آیت سجدہ سورۃ العلق کی آخری آیت ہے واسجد واقترب (العلق: 19)۔ آیات سجدہ کے متعلق فقہاء کے دو قسم کے اختلاف ہیں، ایک اختلاف اس میں ہے کہ آیت سجدہ کا حکم کیا ہے آیا اس آیت کو پڑھنے یا سننے کے بعد اس آیت پر سجدہ کرنا سنت ہے و یا واجب؟ اور دوسرا اختلاف آیات سجدہ کی تعداد میں ہے۔ ہم پہلے آیات سجدہ کے حکم میں فقہاء کا اختلاف بیان کریں گے اور پھر ان کی تعداد میں فقہاء کے مذاہب بیان کریں گے۔

سجدہ تلاوت کے حکم میں مذاہب فقہاء

امام مالک بن انس اصبحی متوفی 179ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب (رض) نے جمعہ کے دن منبر کے اوپر سجدہ کی آیت تلات کی پھر منبر سے اتر کر سجدہ کیا اور مسلمانوں نے بھی ان کے ساتھ سجدہ کیا، دوسرے جمعہ کو پھر اس آیت کو پڑھا تو مسلمان سجدہ کے لیے تیار ہوئے، حضرت عمر نے کہا اپنی جگہ بیٹھے رہو، بیشک اللہ نے ہم پر اس سجدہ کو فرض نہیں کیا مگر یہ کہ ہم سجدہ کرنا چاہیں پھر حضرت عمر نے سجدہ نہیں کیا اور لوگوں کو سجدہ کرنے سے منع کیا۔

(موطا امام مالک رقم الحدیث: 482، مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1409)

امام ابو اسحاق ابراہیم بن علی فیروز آبادی شیرازی شافعی متوفی 455ھ لکھتے ہیں: قرآن کی تلاوت کرنے والے اور اس کو غور سننے والے دونوں کے لیے سجدہ تلاوت مشروع ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور جب سجدہ کی ایت سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ کرتے، اور اگر قرآن پڑھنے والا سجدہ تلاوت ادا نہ کرے تو اس کو غور سے سننے والا سجدہ کرے، کیونکہ سجدہ دونوں کی طرف متوجہ ہوا ہے تو ایک کے سجدہ ترک کرنے کی وجہ سے دوسرا سجدہ کو ترک نہ کرے، اور جس شخص نے کسی شخص سے تلاوت سنی لیکن وہ اس کو غور سے نہیں سن رہا تھا (آیت سجدہ کی طرف متوجہ نہ تھا) تو اس کے متعلق امام شافعی نے کہا میں اس پر سجدہ کرنے کی ایسی تاکید نہیں کرتا جیسے میں غور سے سننے والے کو سجدہ کرنے کی تاکید کرتا ہوں۔ کیونکہ حضرت عمر اور حضرت عمران بن حصین (رض) نے فرمایا سجدہ اس پر ہے جو غور سے سنے اور حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا سجدہ اس پر ہے جو اس کے لیے بیٹھے۔ اور سجدہ تلاوت کرنا سنت ہے واجب نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت زید بن ثابت (رض) نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے سورۃ والنجم پڑھی تو ہم میں سے کسی شخص نے سجدہ نہیں کیا۔

(المہذب ج 1 ص 85، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ موفق الدین عبداللہ بن قدامہ مقدسی حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے کیونکہ حضرت زید بن ثابت (رض) نے کہا میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے سورۃ النجم پڑھی تو ہم میں سے کسی نے بھی سجدہ نہیں کیا۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم) اور حضرت عمر نے کہا اے لوگو! ہم آیات سجدہ کے ساتھ گزرتے تھے تو جو سجدہ کر لیتا وہ درست کرتا اور جو سجدہ نہیں کرتا اس پر کوئی گناہ نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدہ تلاوت فرض نہیں کیا۔

(الکافی ج1ص 271۔272، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، 1414ھ)

علامہ علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی متوفی 593ھ لکھتے ہیں۔

تلاوت کرنے والے پر اور سننے والے پر سجدہ تلاوت ادا کرنا واجب ہے خواہ اس نے سننے کا قصد کیا ہو یا نہیں۔ کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: سجدہ اس پر ہے جو اس کو سنے اور جو اس کی تلاوت کرے۔ لفظ "علی" وجوب کے لیے آتا ہے اور حدیث میں قصد کی قید نہیں ہے۔

(ہدایہ اولین ص163، مطبوعہ شرکۃ علمیہ ملتان)

علامہ المرغینانی نے جو حدیث نقل کی ہے وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر (رض) کا قول ہے۔ امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ العبسی المتوفی 235ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ سجدہ صرف اس شخص پر ہے جو آیت سجدہ کو سنتا ہے۔

(المصنف ج2ص6، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، 1406ھ)

حفص نے بیان کیا کہ ابراہیم نخعی، نافع اور سعید بن جبیر نے یہ کہا کہ جس شخص نے آیت سجدہ کو سنا اس پر سجدہ کرنا لازم ہے۔

(المصنف ج2ص5، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، 1406ھ)

سجدہ تلاوت کے وجوب پر امام ابوحنیفہ (رح) نے ان آیات سے بھی استدلال کیا ہے: "واذا قرء علیہم القرآن لا یسجدون: اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے" (الانشقاق: 21)

اس آیت میں سجدہ نہ کرنے پر مذمت کی گئی ہے اور مذمت واجب کے ترک کرنے پر ہوتی ہے۔

فاسجدوا للہ واعبدوا: پس اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔ (النجم: 62)

واسجد واقترب: آپ سجدہ کریں اور (ہم سے مزید) قریب ہوں۔ (العلق)

ان دونوں آیتوں میں سجدہ کا امر کیا ہے اور امر وجوب کے لیے آتا ہے سو ان آیات سے ثابت ہوا کہ سجدہ تلاوت ادا کرنا واجب ہے۔

سجدہ تلاوت کی تعداد میں مذاہب فقہاء:

امام مالک بن انس اصبحی متوفی 179ھ لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک عزائم سجود القرآن گیارہ سجدے ہیں ان میں سے مفصل (الحجرات سے آخرت قرآن تک) میں کوئی سجدہ

نہیں ہے۔

(یعنی النجم، الانشقاق اور العلق کے سجدات) (الموطا ص 127 مطبوعہ دار الفکر بیروت، 1409)

علامہ ابو الولید سلیمان بن خلف باجی اندلسی مالکی متوفی 494ھ لکھتے ہیں:

امام مالک (رح) اور ان کے جمہور اصحاب کا یہی مذہب ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر (رض) کا بھی یہی قول ہے اور ابن وہب نے کہا عزائم سجود القرآن چودہ سجدے ہیں اور یہی امام ابو حنیفہ (رح) کا قول ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا عزائم السجود پندرہ سجدے ہیں انھوں نے سورۃ حج کا دوسرا سجدہ بھی شامل کرلیا۔

(المنتقی ج 1 ص 351 مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)

علامہ ابو بکر محمد بن عبداللہ المعروف بابن العربی المالکی متوفی 543ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں پندرہ سجدے ہیں۔ پہلا سجدہ سورۃ الاعراف کی آخری آیت میں ہے وله يسجدون (الاعراف: 206)۔ دوسرا سجدہ وظلا لهم بالغدو والاصال (الرعد: 15)۔ تیسرا سجدہ ويفعلون ما يومرون (النحل: 50)۔ چوتھا سجدہ ويزيدهم خشوعا (بنی اسرائیل: 109)۔ پانچواں سجدہ خروا سجدا وب کیا (مریم: 58)۔ چھٹا سجدہ يفعل ما يشاء (الحج: 18)۔ ساتواں سجدہ تفلحون (الحج: 77)۔ آٹھواں سجدہ نفورا (الفرقان: 60)۔ نواں سجدہ رب العرش العظيم (النمل: 26)۔ دسواں سجدہ وهم لايستكبرون (السجدہ: 15)۔ گیارہواں سجدہ۔ خر راكعا واناب (ص: 24)۔ بارھواں سجدہ ان كنتم اياه تعبدون (حم السجدہ: 15)۔ تیرھواں سجدہ واعبدوا (النجم: 62) چودھواں سجدہ لا يسجدون (الانشقاق: 21)۔ پندرھواں سجدہ، واسجد واقترب (العلق: 19)۔

(احکام القرآن ج 4 ص 368۔ 369، دار الکتب العلمیہ بیروت، 1408ھ)

امام ابو اسحاق ابراہیم بن علی فیروز آبادی شافعی متوفی 455ھ لکھتے ہیں:

امام شافعی کا قول جدید یہ ہے کہ سجدات التلاوات چودہ سجدے ہیں (علامہ ابن العربی مالکی کے حوالے سے جو ہم نے پندرہ ایات سجدہ ذکر کی ہیں ان میں سورۃ ص 24، کے علاوہ باقی وہی ایات سجدہ ہیں) اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے قرآن مجید میں پندرہ سجدوں کی تعلیم دی۔ ان میں سے تین مفصل میں ہیں، دو حج میں ہیں اور امام شافعی کا قول قدیم یہ ہے کہ سجود تلاوت گیارہ سجدے ہیں۔ اور انھوں نے مفصل کے تین سجدے ساقط کردیے کیونکہ حضرت ابن عباس (رض) نے بیان کیا کہ جب سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ میں ہجرت فرمائی آپ نے مفصل کی کسی آیت پر سجدہ نہیں کیا۔ (مفصل کے سجدات سے مراد النجم، الانشقاق اور العلق کے سجدات ہیں)۔

(المہذب ج 1 ص 85 مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

علامہ موفق الدین عبداللہ بن قدامہ مقدسی حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

سجدات القرآن چودہ سجدے ہیں (سورۃ ص کے سجدہ کے علاوہ باقی مذکورہ سجدات) ان میں سے دو سجدے الحج میں ہیں اور تین مفصل میں ہیں۔ امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ پندرہ سجدے ہیں، ان میں سے ایک ص کا سجدہ ہے، کیونکہ حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو پندرہ سجدوں کی تعلیم دی، ان میں سے تین مفصل میں ہیں اور دو

سجدے الحج میں ہیں۔(سنن ابو داود) اور صحیح یہ ہے کہ سورۃ ص کا سجدہ عزائم سجود میں سے نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا سورۃ ص عزائم سجود میں سے نہیں ہے۔(سنن ابو داود)

تمام آیات سجدات اجماع سے ثابت ہیں سوائے مفصل کے سجدات کے اور الحج کے دوسرے سجدہ کے اور یہ سجدے حضرت عمرو بن العاص کی حدیث سے ثابت ہیں، اور حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ انھوں نے پوچھا: یارسول اللہ کیا الحج میں دو سجدے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں اور جس نے یہ دو سجدے نہیں کیے اس نے ان کو نہیں پڑھا۔(ابو داود)۔

(الکافی ج 1 ص 272، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1414ھ)

علامہ علاء الدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی 587ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں چودہ سجدے ہیں۔وہ یہ ہیں۔1، الاعراف۔2، الرعد۔3، النحل۔4، بنی اسرائیل۔5، مریم۔6، الحج کا پہلا سجدہ۔7، الفرقان۔8، النمل۔9، الم تنزیل السجدہ۔10، ص۔11 حم السجدہ۔12، النجم۔13، الانشقاق۔14، اقراء۔اس کی تعداد میں دیگر فقہاء سے ہمارے تین اختلاف ہیں، پہلا اختلاف یہ ہے امام شافعی، امام احمد اور بعض فقہاء مالکیہ کے نزدیک سورۃ الحج کا دوسرا سجدہ (ارکعوا واسجدوا (الحج: 77) بھی سجدہ تلاوت ہے اور ہمارے نزدیک وہ نماز کا سجدہ ہے۔(جن احادیث سے ان ائمہ نے استدلال کیا ہے وہ ضعیف ہیں۔فتح القدیر میں تفصیل کے ساتھ ان کی وجہ ضعف بیان کی گئی ہے) ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب (رض) نے ان سجدات کو شمار کیا جو انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنے تھے اور سورۃ الحج کا ایک سجدہ شمار کیا اور حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نے فرمایا سجدہ تلاوت الحج میں پہلا سجدہ ہے اور دوسرا نماز کا سجدہ ہے۔نیز جب سجدہ کا رکوع کے ساتھ ذکر ہو تو اس سے مراد نماز کا سجدہ ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے واسجدی وارکعی۔(آل عمران: 43)

دوسرا اختلاف اس میں ہے کہ سورۃ ص کا سجدہ ہمارے نزدیک سجدہ تلاوت ہے اور امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک وہ سجدہ شکر ہے۔ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان (رض) نے نماز میں سورۃ ص پڑھی اور سجدہ تلاوت کیا اور لوگوں نے بھی ان کے ساتھ سجدہ تلاوت کیا، صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ یہ سجدہ ہوا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا، اگر یہ سجدہ واجب نہ ہوتا تو اس کو نماز میں داخل کرنا جائز نہ ہوتا۔نیز روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا یارسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں سورۃ ص پڑھ رہا ہوں جب میں سجدہ کی جگہ پر پہنچا تو دوات اور قلم نے سجدہ کیا، تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہم دوات اور قلم کی بہ نسبت سجدہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں پھر آپ نے اس مجلس میں سورۃ ص کو پڑھنے کا حکم دیا پھر آپ نے اور آپ کے اصحاب نے اس آیت پر سجدہ کیا۔(اس حدیث کا امام ترمذی اور امام حاکم نے ذکر کیا ہے اور اس میں دوات اور قلم کی جگہ درخت کا ذکر ہے اور اس میں درخت کی اس دعا کا ذکر ہے۔اے اللہ! مجھ سے اس سجدہ کو اس طرح قبول فرما جس طرح تو نے اس سجدہ کو اپنے بندہ داؤد سے قبول کیا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: 579، المستدرک ج 1 ص 219۔220)

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مفصل (النجم، الانشقاق، العلق) میں تین سجدے ہیں، اس میں امام مالک کا اختلاف ہے۔ہماری دلیل حضرت عمران بن حصین کی حدیث ہے، جس میں یہ تصریح ہے کہ مفصل میں تین سجدے ہیں۔

(بدائع الصنائع ج 2 ص 3۔6، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ)

مشرکین کا مسجدِ حرم میں داخلہ منع ہے

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٨﴾ (سورۃ التوبہ آیت 28)

''اے ایمان والو! بیشک مشرک بالکل ہی ناپاک ہیں (۱) وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائیں (۲) اگر تمہیں مفلسی کا خوف ہے تو اللہ تمہیں دولت مند کر دے گا اپنے فضل سے اگر چاہے (۳) اللہ علم و حکمت والا ہے''۔

یاایھا الذین امنوا انما المشرکون نجس اے ایمان والو! مشرک تو ناپاک ہی ہیں۔نَجَسٌ باب سَمِعَ اور کَرُمَ سے مصدر ہے' اسی لیے اس کا تثنیہ آتا ہے نہ جمع۔ مذکر اور مونث دونوں کیلئے ایک ہی لفظ مستعمل ہے (مصدر' غیر مصدر پر محمول نہیں ہوتا اور خبر کا ثبوت مبتداء کیلئے ہوتا ہے اور خبر ہونے کی وجہ سے اس جگہ باوجود مصدر ہونے کے نَجَسٌ کا ثبوت المشرکون کیلئے ہو رہا ہے تو یہ حمل) یا بطور مبالغہ کے ہے (یعنی مشرک اتنے ناپاک ہیں کہ بعینہٖ نجاست بن گئے ہیں کہ جو ان کو چھوئے' اس کا ہاتھ بھی ناپاک ہو جائے' یا مصدر سے مراد ہے صفت (یعنی نجاست سے مراد ہے نجاست والے)۔

نَجْسٌ' نَجِسٌ' نَجُسٌ سب کے معنی ہیں ناپاک (قاموس) میں کہتا ہوں: نجس وہ چیز ہے جس کو سلیم الطبع آدمی گندگی سمجھتے ہیں' جیسے پیشاب' خون' پاخانہ۔ یہی حقیقی نجاست ہے' شریعت نے اسی کے حکم میں حکمی نجاست کو بھی داخل کر دیا ہے: بے وضو ہو جانا' جنابت' حیض اور نفاس کا خاتمہ۔ گویا نجاست حکمی وہ ہے جو شریعت کے نزدیک نجاست ہے (اور نجاست حقیقی وہ ہے جس کو سلیم الطبع غیر مسلم بھی گندگی سمجھتے ہیں) چونکہ کافر کا باطن ناپاک ہے' اس لیے شرعاً وہ ناپاک ہے' اس سے اجتناب لازم ہے۔ جس طرح حقیقی نجاست سے اجتناب نمازی کیلئے ضروری ہے' اسی طرح کافر سے اجتناب لازم ہے' اسی لیے کفار سے گہرا دلی تعاون درست نہیں۔ ضحاک اور ابوعبیدہ نے نَجَسٌ کا ترجمہ کیا ہے قذرٌ یعنی نجاست غلیظہ۔ بغوی نے لکھا ہے: یہاں بدن کی نجاست مراد نہیں بلکہ نجاست حکمی مراد ہے' بطور مذمت کافروں کو نجس فرمایا ہے۔ قتادہ نے کہا: مشرک اس لیے نجس ہیں کہ وہ جنابت کا غسل نہیں کرتے' وضو نہیں کرتے' نجاستوں سے اجتناب نہیں کرتے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس کا قول آیا ہے کہ کتوں کی طرح کافروں کی نجاست جسمانی ہے' ان کے بدن نجس ہیں۔ ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر مشرک سے کوئی مصافحہ کرلے تو وضو کرلے۔ یا فرمایا: اپنے دونوں ہاتھ دھولے۔ یہ قول باجماع علماء متروک ہے (گویا باجماع علماء یہ روایت ہی صحیح نہیں ہے)۔

فلا یقربوا المسجد الحرام لہٰذا یہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ آئیں۔ احناف کا قول ہے کہ مسجد حرام کے قریب آنے سے ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ حج و عمرہ نہ کریں' ویسے مسجد حرام میں داخلہ کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی کو موسم حج میں اعلان کرنے کیلئے بھیجا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے۔ اس اعلان سے مراد ہے حج و عمرہ کی ممانعت کرنا'

مسجد حرام میں کافر کے داخلہ کی ممانعت مقصود نہیں۔ لہٰذا دوسری مساجد میں کافروں کا داخلہ تو بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔

قریب جانے کی ممانعت صرف کلام میں زور پیدا کرنے (اور حج وعمرہ کی سختی کے ساتھ ممانعت کرنے) کیلئے کی گئی ہے۔

امام شافعی کے نزدیک حرم میں داخل ہونے کی ممانعت مقصود ہے کیونکہ حرم میں داخل ہونے کے بعد مسجد حرام کے قریب پہنچنا ضروری ہے۔ مسجد حرام سے حرم اس جگہ اسی طرح مراد ہے جس طرح آیت سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں مسجد حرام سے حرم مراد ہے کیونکہ (شب معراج میں) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حضرت ام ہانی کے مکان سے (جو حرم میں تھا) لے جایا گیا تھا (کعبہ سے نہیں لے جایا گیا تھا)۔

بغوی نے لکھا ہے:

(۱) حرم کے اندر کسی کافر کا داخلہ جائز نہیں، ذمی ہو، حربی ہو یا مستامن۔ اس آیت کا بظاہر یہی مطلب ہے۔ اگر امام (امیر المسلمین) حرم کے اندر ہو اور کافروں کی طرف سے دار الکفر سے کوئی (غیر مسلم) قاصد آئے تو حرم کے اندر داخل ہونے کی اجازت اس کو نہیں دی جاسکتی۔ امیر المسلمین اپنے کسی آدمی کو حرم کے باہر بھیج کر اس کا پیام معلوم کرالے۔

(۲) حجاز کے اندر تجارت وغیرہ کی غرض سے کافروں کا داخلہ تو ہوسکتا ہے مگر تین روز یعنی مدت سفر سے زائد قیام نہیں ہوسکتا۔ حضرت عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ارشاد فرمایا تھا: اگر میں زندہ رہا تو انشاء اللہ جزیرہ عرب سے یہودیوں اور عیسائیوں کو نکال دوں گا، کسی کو سوائے مسلمان کے یہاں نہیں چھوڑوں گا۔ مگر اس کام کی تکمیل سے پہلے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات ہوگئی لیکن آپ نے اس کی وصیت فرمادی۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکر کو بھی اس کا موقع نہیں ملا۔ آخر حضرت عمر نے سب غیر مسلموں کو جزیرہ عرب سے باہر نکال دیا۔ البتہ تاجروں کو تجارت کیلئے حجاز میں آنے اور تین دن ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ جزیرہ عرب کی حدود اربعہ اس طرح ہیں: طول میں عدن کے آخری کنارہ سے عراق کے سبزہ زار تک اور عرض میں جدہ اور ساحل سمندر سے شام تک۔

(۳) باقی تمام بلاد اسلام میں غیر مسلم ذمی بن کر یا ویزا لے کر رہ سکتے ہیں، مگر مسجدوں کے اندر مسلمانوں کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہوسکتے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے: امام شافعی کا جو قول روایت میں آیا ہے، اس میں کعبہ اور دوسری مساجد کے حکم میں فرق منقول ہے، مسجد حرام کے اندر تو داخلہ ممنوع ہے اور دوسری مساجد میں جائز ہے۔ فقہاء مالکیہ اور مزنی کے نزدیک مسجد حرام اور دوسری مساجد کا ایک ہی حکم ہے۔ جس طرح مسجد حرام میں کافروں کا داخلہ ممنوع ہے، اسی طرح دوسری مسجدوں میں بھی ناجائز ہے۔ امام بخاری نے مسجد میں مشرکوں کے داخلہ کے جواز کیلئے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، اس میں حضرت ابوہریرہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کچھ سوار نجد کی طرف بھیجے۔ وہاں سے وہ بنی حنیفہ کے ایک شخص کو جس کا نام ثمامہ بن اثال تھا، پکڑ کر لائے اور مسجد کے ستون سے لا کر باندھ دیا۔ ہم نے ثمامہ کا پورا قصہ سورۃ انفال میں ذکر کردیا ہے، لیکن اس قصہ سے مسجد میں داخل ہونے کے جواز پر دلیل قائم کرنا ضعیف ہے، کیونکہ ثمامہ کا واقعہ تو فتح مکہ سے پہلے ہوا تھا اور کافروں کو حج کرنے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے باز داشت ۹ھ میں ہوئی۔

بعد عامهم هذا ان کے اس سال کے بعد۔ یعنی اس سال کے بعد جس میں سورۃ توبہ اتری تھی اور حضرت ابوبکر

نے سب کو حج کرایا تھا اور حضرت علی نے کافروں سے برأت کا اعلان کیا تھا۔ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اہل کتاب کو خصوصیت کے ساتھ مسجد (حرام) میں داخل ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں "باب دخول المشرک المسجد" میں لکھا ہے کہ اس باب میں جو حدیث مذکور ہے، وہ خیال مذکور کی تردید کر رہی ہے کیونکہ ثمامہ اہل کتاب میں سے نہ تھا۔

بیضاوی نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اسلام کے فروعی احکام کے مخاطب کفار بھی ہیں، کیونکہ مسجد حرام کے قریب جانے کی ممانعت کافروں کیلئے ہوئی ہے۔ مگر بیضاوی کا یہ استدلال غلط ہے، کیونکہ آیت میں اگرچہ ممانعت کا تعلق کافروں سے ہے مگر مخاطب مومن ہی ہیں، انہی کو خطاب کر کے فرمایا: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۔

اگر کفار کو فروع کا مخاطب قرار دیا جائے گا تو چونکہ حج بھی فروع میں داخل ہے (کیونکہ اصل بنیاد توحید و رسالت کا اقرار ہے) اس لیے کفار حج پر مامور ہوں گے اور اس آیت میں ان کو حج کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس طرح دونوں حکموں میں تضاد پیدا ہو جائے گا۔ پھر اگر کفار کعبہ کو نہ جائیں اور حج نہ کریں تو فلا یقربوا کے حکم کی تعمیل ہو جائے گی اور حکم خداوندی کی تعمیل موجب ثواب و اجر ہے، لہٰذا کافروں کو ترک حج کا ثواب ملنا چاہیے، جو سراسر باطل ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس کا قول اور ابن جریر اور ابو الشیخ نے سعید بن جبیر، عکرمہ، عطیہ، عوفی، ضحاک اور قتادہ وغیرہم کا بیان نقل کیا ہے کہ مشرک کعبہ کو آتے تو (اطراف ملک سے) اپنے ساتھ غلہ، پھل وغیرہ بھی لاتے تھے (اور مکہ میں لا کر فروخت کرتے تھے) جب ان کو حج کی ممانعت کر دی گئی اور آیت إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا نازل ہوگئی تو مسلمانوں پر بڑی دشواری آپڑی، کہنے لگے: اب غلہ اور سامان (خوراک) ہم کو کون لا کر دے گا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی اور اللہ نے فرمایا:

وان خفتم عیلۃً (اے مکہ کے مسلمانوں!) اگر تم کو فقر و فاقہ کا اندیشہ ہے۔ عَيْلَةً (بَاعَ يَبِيعُ کے باب سے) مصدر ہے، عَالَ يَعِيلُ کہا جاتا ہے۔

فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ ان شاء

تو (اندیشہ نہ کرو) اگر اللہ نے چاہا تو وہ اپنے فضل سے تم کو ضرور غنی بنا دے گا۔

مشیت سے غنا کو وابستہ کرنے کی غرض یہ ہے کہ اللہ کی مشیت کو امید گاہ سمجھا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ اللہ کی طرف سے غنی بنانا محض اس کا فضل ہے (جو عمومی حیثیت رکھتا ہے) اور موجودہ غنا (عمومی نہیں) کسی کو حاصل ہے، کسی کو حاصل نہیں۔ کسی سال ہوتی ہے، کسی سال نہیں ہوتی۔ ان اللہ علیم حکیم۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے بندوں کے احوال کو) جاننے والا اور حکمت والا ہے (جس کسی کو جتنا دیتا ہے، مصلحت و حکمت کے زیر اثر دیتا ہے)۔

عکرمہ نے کہا: (بموجب وعدہ) اللہ نے ان کو غنی کر دیا، جس کی صورت یہ ہوئی کہ بارش خوب ہوئی اور پیداوار کی کثرت ہوگئی۔

مقاتل نے کہا: جدہ اور صنعاء اور جرش والے مسلمان ہو گئے اور بکثرت بقدر ضرورت غلہ اپنے ملک سے مکہ میں لے آئے جس سے اہل مکہ کو فقر و فاقہ کا خوف نہیں رہا۔

ضحاک اور قتادہ نے کہا: اللہ نے کافروں سے ان کا جزیہ دلوا دیا اور اس طرح مکہ کے مسلمانوں کو غنی کر دیا۔

زکوٰۃ کے مصارف کی تفصیل

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡعٰمِلِيۡنَ عَلَيۡهَا وَالۡمُؤَلَّـفَةِ قُلُوۡبُهُمۡ وَفِى الرِّقَابِ وَالۡغٰرِمِيۡنَ وَفِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ‌ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۶۰﴾

(سورۃ التوبہ آیت 60)

صدقے صرف فقیروں (۱) کے لیے ہیں اور مسکینوں کے لیے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لیے اور ان کے لیے جن کے دل پر چائے جاتے ہوں اور گردن چھڑانے میں اور قرضداروں کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے (۱) فرض ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زکوٰۃ کے مصارف صرف فقراء اور مساکین ہیں اور زکوٰۃ کی وصولیابی پر مامور لوگ، اور جن کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو اور جن غلاموں کو آزاد کرنا ہو، اور مقروض لوگ اور اللہ کی راہ میں اور مسافرین، یہ اللہ کی جانب سے ایک فریضہ ہے اور اللہ بہت علم والا بے حد حکمت والا ہے۔

(التوبہ: ۶۰)

آیاتِ سابقہ کے ساتھ ارتباط اس سے پہلی آیتوں میں یہ بتایا تھا کہ منافقین زکوٰۃ اور صدقات کی تقسیم میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اعتراض کرتے تھے تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف کا بیان فرمایا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زکوٰۃ کو اس کے مصارف میں تقسیم فرماتے ہیں اور زکوٰۃ اور صدقات میں سے اپنے نفس کے لیے کوئی چیز نہیں رکھتے، اس لیے زکوٰۃ کی تقسیم میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر طعن اور اعتراض کا کوئی جواز نہیں ہے۔ زکوٰۃ کا لغوی اور شرعی معنی، زکوٰۃ کا نصاب اور وجوب زکوٰۃ کی شرائط ہم البقرہ: ۴۳ میں بیان کر چکے ہیں۔ اس مقام پر ہم زکوٰۃ کی حکمتیں، زکوٰۃ کی مصلحتیں اور زکوٰۃ کے فوائد بیان کر رہے ہیں، ان میں سے بعض حکمتوں کا تعلق زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ ہے اور بعض حکمتوں کا تعلق زکوٰۃ لینے والے کے ساتھ ہے۔

زکوٰۃ دینے والے کے حق میں زکوٰۃ کی حکمتیں اور مصلحتیں امام ابو حامد محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ ھ نے زکوٰۃ کے حسب ذیل اسرار اور فوائد بیان فرمائے ہیں: (۱) انسان جب کلمہ شہادت پڑھ لیتا ہے تو گویا وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: والذین اٰمنو آ اشد حبا للہ۔ (البقرہ: ۱۶۵) اور جو لوگ ایمان لائے وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ یعنی مومن اپنی جان اور اپنے مال سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے۔ تو مسلمانوں پر جہاد فرض کر کے ان کی جان سے زیادہ محبت کو آزمایا گیا اور زکوٰۃ کو فرض کر کے ان کی مال سے زیادہ اللہ سے محبت کو آزمایا گیا، اور اللہ کی محبت میں مال خرچ کرنے والے مسلمانوں کے تین درجات ہیں: (الف) وہ لوگ جو اللہ کی محبت میں سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں اور اپنے پاس ایک درہم اور ایک

دینار بھی نہیں رکھتے۔ اس لیے جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ دوسو درہم پر کتنی زکوۃ تو وہ کہتے ہیں کہ عوام پر تو پانچ درہم زکوۃ ہے اور ہم پر تمام مال کو خرچ کرنا واجب ہے۔ حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اس دن اتفاق سے میرے پاس مال تھا۔ میں نے دل میں کہا اگر میں کسی دن حضرت ابوبکر (رض) پر سبقت کرسکتا ہوں تو وہ آج کا دن ہے۔ میں اپنا آدھا مال لے کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں پہنچا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟ میں نے عرض کیا، اتنا ہی مال ہے۔ حضرت عمر (رض) نے کہا پھر حضرت ابوبکر (رض) اپنے گھر کا تمام مال ومتاع لے کر آپہنچے۔ ان سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا: تم نے اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ حضرت ابوبکر نے کہا: میں نے ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو چھوڑا ہے۔ تب میں نے دل میں کہا میں حضرت ابوبکر پر کبھی سبقت نہیں کرسکتا۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱٦٧٨، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳٦٧٥، المستدرک ج ۱ ص ٤١٤، سنن بیہقی ج ٤ ص ۱۸۱، کنز العمال رقم الحدیث: ۳٥٦۱۱، مشکوۃ رقم الحدیث: ٦٠٢١) حضرت ابوبکر صدیق (رض) مکمل صدق کے مقام پر فائز تھے۔ انھوں نے اپنے پاس صرف اسی چیز کو رکھا جو انھیں سب سے زیادہ محبوب تھی اور وہ ان کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ (ب) دوسرا درجہ اس پہلے درجہ والوں سے کم ہے۔ یہ اپنے پاس مال کو بچا کر رکھتے ہیں تا کہ ان کی ضروریات کے موقع پر کام آئے اور جب نیک کاموں پر خرچ کرنے کے مواقع آئیں تو وہ مال کو خرچ کرسکیں۔ پس وہ مال کو اس لیے جمع کر کے رکھتے ہیں تا کہ ضرورت کے مواقع پر خرچ کرسکیں نہ کہ عیش وعشرت پر خرچ کرنے کے لیے اور یہ ضرورت ہے زائد مال کو نیکی کے راستوں پر خرچ کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ صرف زکوۃ کی مقدار پر اقتصار نہیں کرتے، اور تابعین میں سے نخعی، شعبی، عطا اور مجاہد کا یہ نظریہ ہے کہ مال میں زکوۃ کے علاوہ اور حقوق بھی ہیں۔ ان کا استدلال قرآن مجید کی درج ذیل آیتوں سے ہے: **واٰتی المال علی حبہٖ ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والمسٰکین وابن السبیل والسآئلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوۃ۔** (البقرہ: ۱۷۷) ترجمہ: اور مال سے (طبعی) محبت کے باوجود (اللہ کی محبت میں) اپنا مال رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں اور غلام آزاد کرانے کے لیے دے، اور نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔ **وانفقوا مما رزقنٰکم۔** (المنافقون: ۱۰) اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے تم (ہماری راہ میں) خرچ کرو۔ **ومما رزقنٰھم ینفقون۔** (الانفال: ۳) اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے وہ اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ (ج) اور تیسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو صرف مقدار واجب ادا کرنے پر اقتصار کرتے ہیں۔ ان پر جتنی زکوۃ فرض ہے وہ صرف اتنی ہی ادا کرتے ہیں، اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اور یہ سب سے کم مرتبہ ہے اور تمام عام لوگوں کا یہی طریقہ ہے۔ کیونکہ وہ مال کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مال خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں اور آخرت کے ساتھ ان کی محبت کمزور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **ان یسئلکموھا فیحفکم تبخلوا ویخرج اضغانکم ھٰانتم ھٰؤلآء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ فمنکم من یبخل ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہٖ۔** (محمد: ۳۸-۳۷) ترجمہ: اگر اللہ تم سے تمہارا مال طلب کرے تو تم بخل کروگے اور وہ تمہارے دلوں کے زنگ کو ظاہر کردے گا ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جن کو اللہ کی راہ میں خرچ کے لیے بلایا جاتا ہے تو تم میں سے کوئی بخل کرتا ہے اور جو بخل کرتا ہے وہ صرف اپنی جان سے ہی بخل کرتا ہے۔

(۲) زکوۃ ادا کرنے کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ زکوۃ ادا کرنے سے انسان سے بخل کی صفت زائل ہو جاتی ہے اور بخل سے نجات کی اللہ تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے: ومن یوق شح نفسہ فاولٰئک ھم المفلحون ۔(الحشر:۹) ترجمہ: اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچائے گئے سو وہی لوگ کامیاب ہیں۔ نیز حدیث صحیح میں بھی بخل کی مذمت کی گئی ہے۔حضرت ابوثعلبہ خشنی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب تم یہ دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جارہی ہے اور خواہش نفس کی اتباع کی جارہی ہے اور دنیا کو ترجیح دی جارہی ہے اور ہر شخص اپنی رائے کو اچھا سمجھ رہا ہے، تو تم عام لوگوں سے الگ ہو کر عزلت نشین ہو جاؤ۔(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۳۴۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۵۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۱۴)۔

(۳) زکوۃ ادا کرنے کا تیسرا فائدہ یہ ہے زکوۃ ادا کر کے انسان اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے بدن اور مال کی نعمت عطا فرمائی، عباداتِ بدنیہ انجام دے کر وہ نعمت بدن کا شکر ادا کرتا ہے اور زکوۃ ادا کر کے وہ نعمت مال کا شکر ادا کرتا ہے۔اور یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ ایک فقیر کو دیکھے جس پر رزق کی تنگی ہو اور وہ اس سے سوال کرنے کا محتاج ہو۔ پھر اس کے دل میں رحم نہ آئے اور وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا نہ کرے کہ اللہ نے اس کو سوال کرنے سے اور دوسرے کی طرف محتاج ہونے سے مستغنی کر دیا ہے اور وہ اس ضرورت مند فقیر کو زکوۃ، عشر اور صدقہ وخیرات دے کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کرے۔(احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۲۰۳۔ ۲۰۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)۔اور امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

(۴) جب انسان کے پاس مال اس کی ضروریات سے بہت زیادہ ہوگا تو وہ اس مال سے اپنے عیش وعشرت کے ذرائع اور وسائل مہیا کرے گا اور یوں اس کا دل دنیا کی رنگینیوں میں اور دنیا کی مرغوب چیزوں اور لذتوں میں لگا رہے گا اور آخرت کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوگا یا کم متوجہ ہوگا۔اور وہ سوچے گا کہ عبادات اور نیک کاموں اور زکوۃ، عشر اور صدقہ وخیرات ادا کرنے سے اس کے مال میں کمی ہوگی اور اس وجہ سے وہ نیک کاموں میں اپنے مال کو بالکل خرچ نہیں کرے گا یا کم کرے گا۔

(۵) مال کی کثرت سے انسان میں غرور اور تکبر پیدا ہوگا اور سرکشی اور بغاوت پیدا ہوگی اور زکوۃ اور صدقات ادا کرنے سے اس کے تکبر اور سرکشی میں کمی ہوگی اور اس کا دل اللہ سے مغفرت طلب کرنے اور اس کی رضا جوئی کی طرف متوجہ ہوگا۔

(۶) جب انسان زکوۃ اور عشر ادا کرے گا اور صدقہ وخیرات کرے گا تو ضرورت مند لوگ اس کے لیے دعائیں کریں گے اور اس کی دعاؤں سے اس کا مال نقصان اور بربادی سے محفوظ رہے گا۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** ۔(الرعد:۱۷) ترجمہ: اور رہی وہ چیز جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہے تو وہ زمین میں برقرار رہتی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: زکوۃ سے اپنے اموال کی حفاظت کرو، اور صدقات سے اپنے بیماروں کی دوا کرو اور مصائب کے لیے دعا کو تیار رکھو۔(المعجم الکبیر ج ۱۰ رقم الحدیث: ۱۰۱۹۶، حلیۃ الاولیاء ج ۲ ص ۱۰۴، ج ۴ ص ۲۳۷، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۱۷، تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۴، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کا ایک راوی متروک الحدیث ہے، مجمع الزوائد ج ۳ ص ۶۴، حافظ سیوطی نے کہا یہ حدیث ضعیف ہے، الجامع الصغیر ج ۱ رقم الحدیث: ۳۷۲۸)۔

(۷) مال بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔لیکن جب انسان اس مال کو نیکی کی راہ میں خرچ کرے گا تو وہ نیکیاں باقی رہیں گی۔دنیا میں ان کی تعریف کی جائے گی اور آخرت میں اجر ملے گا۔ایک شخص نے کہا: کاش! میں اپنے تمام مال کو قبر میں لے جا سکتا! میں نے کہا: یہ ممکن ہے، تم اپنے تمام مال کو اللہ کی راہ میں اور اس کی رضا میں خرچ کر دو، تم کو یہ مال قبر میں ملے گا اور آخرت میں بھی۔

(۸) مال داروں کے پاس بہت زیادہ مال ان کی ضروریات سے زائد ان کی تجوریوں اور بینکوں میں معطل پڑا رہتا ہے اور فقراء اور ضرورت مندوں کے پاس اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی مال نہیں ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کی متقاضی ہوئی کہ زکوۃ اور صدقات کے ذریعہ مال داروں کے زائد مال میں سے بقدر ضرورت زکوۃ اور صدقات کے ذریعہ ضرورت مندوں تک پہنچایا جائے۔

(۹) اگر مال دار ضرورت مندوں اور فقیروں کی مالی امداد نہ کریں تو ہو سکتا ہے کہ ضرورت مند فقراء اپنی تنگی اور فقر سے تنگ آ کر بغاوت پر اتر آئیں اور چوریاں، ڈاکے اور لوٹ مار اور بھتہ خوری شروع کر دیں اور زکوۃ اور صدقات کی ادائیگی کے ذریعہ اس بغاوت کا سدباب ہو سکتا ہے۔

(۱۰) زکوۃ اور صدقات کی ادائیگی کر کے انسان اللہ کی مخلوق پر شفقت کرتا ہے اور ان کی پرورش کرتا ہے۔ان کے لیے رزق فراہم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت سے متصف ہوتا ہے اور انبیاء (علیہم السلام) اور صالحین کے اخلاق سے متخلق ہوتا ہے۔

زکوۃ لینے والے کے حق میں زکوۃ کی حکمتیں اور مصلحتیں:

(۱) مغیرہ بن عامر نے کہا: شکر نصف ایمان ہے اور صبر نصف ایمان ہے اور یقین مکمل ایمان ہے۔(موسوعہ رسائل ابن ابی الدنیا ج ۳ ص ۳۰، موسۃ الثقافیہ بیروت ۱۴۱۴ھ، شعب الایمان ج ٤ ص ۱۰۹، رقم الحدیث: ٤٤٤٨)۔زکوۃ دینے والا اپنے مال کے کم ہونے پر صبر کرتا ہے اور ضرورت مند فقیر زکوۃ کی صورت میں مال لے کر شکر ادا کرتا ہے۔یا یوں کہا جائے کہ مال دار نے پہلے مال ملنے پر اللہ کا شکر ادا کیا، پھر زکوۃ کی ادائیگی سے جو مال میں کمی ہوئی اس پر صبر کیا تو زکوۃ کی وجہ سے اس کا ایمان مکمل ہو گیا۔اسی طرح حاجت مند فقیر نے پہلے مال نہ ہونے پر صبر کیا اور زکوۃ کی شکل میں مال ملنے پر اللہ کا شکر ادا کیا تو زکوۃ کی وجہ سے اس کا ایمان بھی مکمل ہو گیا۔نیز حضرت سمرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص مصیبت میں مبتلا ہو تو اس نے صبر کیا اور اس کو نعمت دی گئی تو اس نے شکر ادا کیا۔اس پر ظلم کیا گیا تو اس نے معاف کر دیا اور اس نے خود ظلم کیا تو اس پر استغفار کیا۔پوچھا گیا اس کے لیے کیا اجر ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہی لوگ عذاب سے مامون ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

(۲) ہر چند کہ اللہ تعالیٰ نے غنی کو بہت مال دیا ہے اور فقیر کو مال نہیں دیا۔لیکن اللہ تعالیٰ نے غنی کو اس بات کا مکلف کیا ہے کہ وہ فقیر کو زکوۃ ادا کرے اور فقیر کا غنی پر احسان ہے کہ وہ اس سے زکوۃ قبول کر کے اس کو دوزخ کے عذاب سے چھڑاتا ہے۔غنی کا فقیر کو زکوۃ دینے کی وجہ سے اس کی دنیا پر احسان ہے اور فقیر کا غنی کی آخرت پر احسان ہے اور اخروی احسان دنیاوی

احسان سے زیادہ بڑا ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے فقیر کو اس بات کا مکلف نہیں کیا کہ وہ غنی کے پاس جا کر اس سے زکوۃ مانگے۔بلکہ غنی کو اس بات کا مکلف کیا ہے کہ وہ فقیر کے پاس جا کر زکوۃ ادا کرے۔فقیر اپنی دنیا میں غنی کا محتاج ہے تو غنی اپنی آخرت میں فقیر کا محتاج ہے۔

فقیر کا معنی فقیر کا لفظ چار معانی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) حاجتِ ضروریہ کا وجود مثلاً جن کو غذا، لباس اور مکان کی حاجت ہو اور اس معنی میں ہر شخص فقیر ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰایہا الناس انتم الفقرآء الی اللہ۔(فاطر:۱۵) ترجمہ: اے لوگو! تم سب اللہ کی طرف محتاج ہو۔

(۲) جس شخص کے پاس مال جمع نہ ہو۔فقہی اصطلاح میں جو شخص دو سو درہم (باون اعشاریہ ۵ تولہ چاندی) کا مالک نہ ہو یا اس کے پاس اس کی حاجت اصلیہ سے زائد دو سو درہم کے مساوی رقم نہ ہو اور وہ مستحق زکوۃ ہو،فقہاء احناف کے نزدیک فقیر کا یہی معنی ہے اور سورۃ توبہ:۶۰ میں یہی معنی مراد ہے۔اسی طرح یہ آیت بھی ہے: للفقرآء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض یحسبہم الجاہل اغنیآء من التعفف۔(البقرہ: ۲۷۳) ترجمہ: (یہ خیرات) ان فقراء کا حق ہے جو خود کو اللہ کی راہ میں وقف کیے ہوئے ہیں جو (اس میں شدت اشغال کی وجہ سے) زمین میں سفر کی طاقت نہیں رکھتے،ناواقفِ حال ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان کو غنی سمجھتا ہے۔

(۳) نفس کا بہت زیادہ حریص ہونا،اس حدیث میں فقراء اسی معنی میں ہے۔یزید بن ابان رقاشی حضرت انس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قریب ہے کہ فقر (زیادہ حرص) کفر ہو جائے اور قریب ہے کہ حسد تقدیر پر غالب ہو جائے۔(حلیتہ الاولیاء ج ۳ ص ۵۳ طبع قدیم، ج ۳ ص ۶۲۔۶۱،رقم:۳۱۶۹،طبع جدید، تاریخ اصفہان ج ۱ ص ۹۰،الضعفاء للعقیلی ج ۴ ص ۲۰۶،کنز العمال رقم الحدیث:۱۶۶۸۲،مشکوٰۃ المصابیح رقم الحدیث:۵۰۵۱،العلل المتناہیہ ج ۲ ص ۳۲۰) اور اس فقر کے مقابل غنی کا یہ معنی ہے: "غنی وہ شخص ہے جس کا دل غنی ہو"۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہونا،قرآن مجید میں ہے: فقال رب انی لمآ انزلت الی من خیرٍ فقیرٌ۔(القصص: ۲۴) ترجمہ: موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں اس خیر و برکت کا محتاج ہوں جو تو نے میری طرف نازل کی ہے۔اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی ہے: اے اللہ! مجھے اپنی طرف محتاج کر کے (دنیا سے) مستغنی کر دے اور اپنے آپ سے (یعنی اللہ سے) مستغنی کر کے مجھے (دنیا کا) محتاج نہ کر۔(المفردات ج ۲ ص ۴۹۶۔۴۹۵،مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز،۱۴۱۸ھ)

مسکین کا معنی: مسکین کا معنی ہے جس کے پاس کوئی چیز نہ ہو اور یہ فقیر کی بہ نسبت زیادہ تنگ دست ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ہے: اما السفینۃ فکانت لمساکین۔(الکہف: ۷۹) ترجمہ: رہی کشتی تو وہ مسکینوں کے لیے تھی۔اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکین کے پاس کوئی چیز ہوتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ کشتی چھن جانے کے بعد ان کو مسکین فرمایا ہے۔دوسرا جواب یہ ہے کہ ان پر اس قدر زیادہ غربت اور مسکینی تھی کہ اس کے مقابلہ میں اس کشتی کا ہونا لائق شمار نہ تھا۔(المفردات ج ۱ ص ۳۱۲) اور علامہ طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے لکھا ہے کہ مسکین کا معنی ہے جس کے پاس کوئی چیز نہ ہو اور ایک قول یہ ہے کہ اس

کے پاس تھوڑی سی چیز ہو۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی ہے کہ اے اللہ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مجھے مسکینی کی حالت میں موت عطا فرما۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۵۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٤١٢٦، سنن بیہقی ج ۷ ص ١٢، المستدرک ج ٤ ص ۳۲۲) آپ نے اس سے تواضع کا ارادہ فرمایا اور یہ کہ آپ جبارین اور متکبرین میں سے نہ ہوں۔ (مجمع بحار الانوار ج ۳ ص ۹۶، مطبوعہ مدینہ منورہ، ١٤١٥ھ)

فقیر اور مسکین کے معنی میں مذاہب ائمہ اور تحقیق مقام:

حسن بصری نے کہا: فقیر وہ ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور مسکین وہ ہے جو سعی کرتا رہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: مساکین گھومنے پھرنے والے ہیں اور فقراء مسلمین ہیں۔ جابر بن زید نے کہا: فقیر اپاہج ہے اور مسکین وہ ہے جو تندرست اور محتاج ہو۔ اور عکرمہ نے کہا کہ فقراء کا اطلاق فقراء مسلمین پر ہوتا ہے اور مساکین کا اطلاق، اہل کتاب کے مساکین پر ہوتا ہے۔ امام ابوجعفر طبری کا مختار یہ ہے کہ جو سوال نہیں کرتے وہ فقراء ہیں اور جو سوال کرتے ہیں وہ مساکین ہیں۔ (جامع البیان جز١٠ ص ٢٠٥۔ ٢٠٢، ملخصاً مطبوعہ بیروت) ۔امام ابوحنیفہ کے نزدیک فقیر وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ مال ہو لیکن وہ نصاب زکوۃ سے کم ہو۔ اور مسکین وہ شخص ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ اور امام شافعی کا قول اس کے برعکس ہے اور امام مالک کے نزدیک فقیر اور مسکین مساوی ہیں۔ اور امام احمد کا مذہب بھی امام شافعی کی مثل ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز٨ ص ٩٨۔ ٩٦، عنایت القاضی ج ٤ ص ٥٨٦۔ ٥٨٥، زاد المسیر ج ۳ ص ٤٥٦)۔

امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ مسکین کے متعلق قرآن مجید میں ہے: رہی کشتی تو وہ مسکینوں کے لیے تھی۔ (الکھف: ۷۹) اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسکین کے پاس کچھ مال ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ کشتی ان کی ملکیت نہیں تھی۔ وہ اس کو کرائے پر چلاتے تھے یا انھوں نے اس کشتی کو عاریتاً لیا ہوا تھا۔ یا دراصل وہ فقیر تھے۔ ان کو از راہ ترحم مجازاً مسکین فرمایا: امام شافعی کا دوسرا استدلال اس حدیث سے ہے: حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دعا کی: اے اللہ! مجھے بحالت مسکین زندہ رکھ اور بحالت مسکین مجھے موت عطا فرما۔ اور قیامت کے دن مساکین کی جماعت میں میرا حشر فرما۔ حضرت عائشہ (رض) نے پوچھا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ دعا کیوں کی ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مساکین اغنیاء سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اے عائشہ! مسکین کو رد نہ کرو۔ خواہ کھجور کا ایک ٹکڑا ہی دو۔ اے عائشہ! مساکین سے محبت رکھو اور ان کو قریب رکھو۔ قیامت کے دن اللہ تمہیں قریب رکھے گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۵۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٤١٢٦، المستدرک ج ٤ ص ۳۲۲، سنن بیہقی ج ۷ ص ١٢) اس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسکین کے حال میں رہنے کی دعا کی ہے اور ایک اور حدیث میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فقر سے پناہ مانگی ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں فقر قلت اور ذلت سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔ اے اللہ! میں ظلم کرنے یا ظلم سہنے سے تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔

(سنن ابوداوٗد رقم الحدیث: ١٥٤٤، سنن النسائی رقم الحدیث: ٥٤٧٥، صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٣٦٨)۔

امام شافعی کی دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسکین مالی طور پر فقیر سے کم ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فقر سے

پناہ مانگیں اور مسکین ہونے کی دعا فرمائیں جو کہ فقیر سے زیادہ ابتر حال ہے اور یہ تناقص کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ جس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فقر سے پناہ مانگی ہے اس حدیث میں فقر سے مراد قلت مال نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فقر النفس ہے۔یعنی وہ شخص جو مال پر بہت حریص ہو۔اور اس فقر سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پناہ مانگی ہے کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا بھی فرماتے تھے: حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ، سوال سے بچنے اور غناء کا سوال کرتا ہوں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۷۲۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۴۳۸۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۳۲، الادب المفرد رقم الحدیث: ۶۷۴، مسند احمد ج ۱ ص ۴۱۱)

اور اس حدیث میں غنیٰ سے مراد کثرت مال نہیں ہے بلکہ اس سے غنی النفس مراد ہے۔یعنی نفس کا مستغنی ہونا۔اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مسکین کے حلا میں رہنے کی جو دعا کی ہے اس سے مراد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تواضع اور انکسار ہے۔امام شافعی کی طرف سے یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ سورۃ توبہ کی اس آیت میں فقیر کو مسکین پر مقدم کیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ فقیر کا حال مسکین سے زیادہ برا ہوتا ہے اور فقیر وہ ہے جس کے پاس بالکل مال نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ کچھ مال ہو۔اس کا یہ جواب ہے کہ تقدم کے کئی اعتبار ہوتے ہیں اور یہاں تقدم ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کے طور پر ہے۔پہلے فقیر کا ذکر کیا جس کے پاس کچھ مالیت ہوتی ہے۔اس کے بعد مسکین کا ذکر کیا جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا اور مسکین کے اس معنی پر امام ابوحنیفہ کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی ہے: مسکینا ذا متربۃ: (البلد: ۱۶) یعنی مسکین وہ شخص ہے جس نے بھوک کی شدت سے اپنا پیٹ زمین سے چمٹایا ہوا ہے۔

والعاملین علیھا کا معنی اور اس کے شرعی احکام یعنی جو لوگ زکوۃ اور صدقات کو وصول کر کے لاتے ہیں۔ان کو ان کی محنت اور مشقت کے مطابق مال زکوۃ سے اجرت دی جائے لیکن یہ اجرت اتنی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ زکوۃ کی وصول کردہ تمام رقم یا اس کے نصف پر محیط ہو۔

(عنایت القاضی ج ۴ ص ۵۸۷)

اگر عامل کو اس مہم کے دوران کوئی شخص ذاتی طور پر کچھ ہدیہ اور تحفہ دے تو وہ اس کے لیے جائز نہیں ہے۔وہ اس کو بھی وصول شدہ زکوۃ کی مد میں شامل کر دے۔حضرت ابوحمید الساعدی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ابن اللتبیہ کو بنو سلیم کے صدقات وصول کرنے کا عامل بنایا۔جب وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے حساب لیا تو اس نے کہا: یہ وہ مال ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے دیا گیا ہے اور یہ وہ ہدیہ ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھے رہے حتیٰ کہ تمہارے پاس ہدیے آتے اگر تم سچے ہو۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا: میں تم میں سے کسی شخص کو کسی کام پر عامل بناتا ہوں جس کام کا اللہ نے مجھے ولی بنایا ہے۔پھر تم میں سے کوئی شخص میرے پاس آ کر کہتا ہے یہ حصہ تمہارے لیے ہے اور یہ حصہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے۔پس وہ شخص کیوں نہ اپنے باپ کے گھر میں یا اپنی ماں کے گھر میں جا کر بیٹھا۔حتیٰ کہ اس کے پاس ہدیہ آتا۔اگر وہ سچا ہے۔اللہ کی قسم! تم اس مال میں سے جو چیز بھی ناحق لو گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس چیز کو اس کے اوپر لاد دے گا۔سنو! میں اس شخص کو قیامت کے دن ضرور پہچان لوں گا۔پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ہاتھ بلند کیے حتیٰ کہ میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم) کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دیکھی۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سنو! کیا میں نے پیغام پہنچا دیا ہے!

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۱۹۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۳۲، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۹۴۶، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۶۶۹)۔

حضرت عدی بن عمیر کندی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے جس شخص نے ہمارے لیے کوئی عمل کیا پھر اس میں سے کوئی چیز چھپا لی خواہ وہ سوئی ہو یا اس سے بھی کمتر چیز تو وہ خیانت ہے اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو لے کر آئے گا۔ تب ایک سیاہ فام انصاری اٹھا اور کہنے لگا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اپنا عمل مجھ سے لے لیجئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس اس طرح فرماتے سنا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے یہ کہا ہے کہ جس کو ہم کوئی کام سونپیں تو وہ قلیل اور کثیر ہر چیز لے کر آئے۔ پھر اس کو جو دے دیا جائے، وہ لے لے۔ اور جو نہ دیا جائے وہ نہ لے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۳۳، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۵۸۱)

مولفتہ القلوب کی تعریف اور ان کو زکوۃ میں سے دینے کے متعلق مذاہب فقہاء ادائیگی زکوۃ کا چوتھا مصرف مولفتہ القلوب ہیں۔ یعنی وہ لوگ جن کے دلوں کو اسلام کی طرف راغب کرنا مقصود ہو۔ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: یہ وہ آزاد اور معزز لوگ ہیں جن کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جنگ حنین میں عطا فرمایا تھا۔ یہ پندرہ آدمی تھے: ابوسفنیا، اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن، حویطب عب عبد العزیٰ، سہل بن عمرو، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو الجہنی، ابو السنابل، حکیم بن حزام، مالک بن عوف، صفوان بن امیہ، عبد الرحمن بن یربوع، جد بن قیس، عمرو بن مرداس اور العلاء بن الحارث۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان میں سے ہر شخص کو سو اونٹ دیئے اور ان کو اسلام کی ترغیب دی۔ ماسوا عبد الرحمن بن بربوع کے۔ اس کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پچاس اونٹ دیئے اور حکیم بن حزام کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ستر اونٹ دیئے۔ انھوں نے کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میرے خیال میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عطاء کا مجھ سے زیادہ کوئی اور مستحق نہیں ہے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو بھی سو اونٹ پورے کر دیئے۔ مولفتہ القلوب کی دو قسمیں ہیں: مسلمان اور کفار۔ مسلمانوں کو صدقات میں سے اس لیے دیا جاتا ہے کہ ان کا ایمان قوی رہے۔ یا ان کے مماثل لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے اور کفار کو اسلام کی ترغیب دینے کے لیے یا ان کے شر سے بچنے کے لیے ان کو زکوۃ اور صدقات سے دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صفوان بن امیہ کو عطا فرمایا ہے۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کا اسلام کی طرف میلان دیکھا۔ علامہ واحدی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشرکین کے قلوب کی تالیف سے مستغنی کر دیا ہے۔ اگر مسلمانوں کا سربراہ یہ دیکھے کہ اس میں مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہے اور ان کے مسلمان ہو جانے سے مسلمانوں کو نفع پہنچے گا تو ان کو مال فئے سے عطا کرے، زکوۃ نہ دے۔ حضرت عمر (رض) سے یہ مروی ہے کہ مولفتہ القلوب کا مصرف، مصارف زکوۃ سے اب ساقط ہو چکا ہے اور یہی شعبی کا قول ہے۔ امام مالک، ثوری، امام ابوحنیفہ اور اسحاق بن راہویہ کا یہی مذہب ہے اور حسن بصری سے یہ مروی ہے کہ ان کا حصہ اب بھی ثابت ہے۔ زہری، ابوجعفر محمد بن علی اور ابوثور کا یہی مذہب ہے اور امام احمد نے یہ کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کو ان کی ضرورت ہو تو ان کو زکوۃ سے دیا جائے گا ورنہ نہیں۔

(اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰ ص ۱۲۶۔ ۱۲۵، دار الکتاب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)۔

قاضی بیضاوی شافعی نے کہا: مولفتہ القلوب وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کرلیا اور اسلام قبول کرنے میں ان کی نیت ضعیف تھی۔ تو ان کے قلوب کو اسلام پر قائم اور برقرار رکھنے کے لیے ان کو عطا کیا جاتا ہے۔ یا ایسے معز زلوگ کہ اگر ان کو عطا کیا جائے تو ان کو دیکھ کر ان جیسے دوسرے معز زلوگ اسلام لے آئیں۔ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عیینہ بن حصین، اقراع بن حابس اور عباس بن مرداس کو اسی وجہ سے عطا فرمایا تھا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ معز زلوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے ان کو خمس کے اس پانچویں حصہ سے عطا فرماتے تھے جو خالص آپ کا حصہ تھا، اور کفار اور مانعین زکوۃ سے قتال کرنے کی طرف مائل کرنے کے لیے جن کو عطا کیا جائے وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مولفتہ القلوب کو اس لیے دیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی تعداد میں کثرت ہو اور اب جبکہ اللہ نے مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمادیا ہے اور مسلمانوں کی کثرت ہوگئی ہے تو ان کا حصہ ساقط ہوگیا۔

(انوار التنزیل مع عنایت القاضی ج ٤ ص ٥٨٧، مطبوعہ دار الکتاب العلمیہ بیروت، ١٤١٧ھ)۔

علامہ برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی المتوفی ٥٩٣ھ لکھتے ہیں: مصارفِ زکوۃ میں سے مولفتہ القلوب کا حصہ اب ساقط ہو چکا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمادیا ہے اور ان سے مستغنی کردیا ہے اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ (ہدایہ اولین ص ٢٠٤، مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)۔ علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الہمام الحنفی المتوفی ٨٦١ھ لکھتے ہیں: اس پر حضرت ابوبکر صدیق (رض) کی خلافت میں صحابہ کرام (رض) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ حضرت عمر (رض) نے ان کو رد کیا تھا۔ عیینیہ اور قراع نے حضرت ابوبکر سے ایک زمین کو طلب کیا۔

حضرت ابوبکر نے ان کو خط لکھ دیا۔ حضرت عمر نے اس خط کو پھاڑ دیا اور کہا: یہ وہ چیز ہے جو تم کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عطا کرتے تھے، تاکہ تم کو اسلام پر راغب کریں لیکن اب اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا کردیا ہے اور تم سے مستغنی کردیا ہے۔ اب اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہتے ہو تو فبہا ورنہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار ہے۔ پھر وہ حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور کہا: خلیفہ آپ ہیں یا عمر؟ حضرت ابوبکر کی رائے حضرت عمر کے موافق ہوگئی اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ اگر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی رائے برحق نہ ہوتی تو صحابہ اس پر ضرور انکار کرتے اور یقیناً ان کے پاس کوئی ایسی دلیل ہوگی جس سے ان کو علم ہوگا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی وفات سے پہلے اس حکم کو منسوخ کردیا تھا۔ یا یہ حکم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات کے ساتھ مقید تھا۔ یا یہ حکم کسی علت کے ساتھ معلل تھا اور اب وہ علت نہیں تھی، اور حضرت عمر نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی تھی: **وقل الحق من ربکم فمن شآء فلیؤمن ومن شآء فلیکفر۔** (الکھف: ٢٩) ترجمہ: آپ کہیے کہ حق تمہارے رب کی جانب سے ہے سو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

(فتح القدیر ج ٢ ص ٢٦٥، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

علامہ محمد بن محمود بابرتی حنفی متوفی ٧٨٦ھ لکھتے ہیں: علامہ علاء الدین عبد العزیز نے کہا: ان کی تالیف قلوب سے مقصود دین کا اعزاز و غلبہ تھا۔ کیونکہ غلبہ کفر کے زمانہ میں اسلام کمزور تھا۔ اس وقت تالیف قلوب کے لیے عطا کرنے میں دین کا اعزاز تھا اور جب حال بدل گیا اور اللہ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمادیا تو اب دین کا اعزاز ان کو نہ دینے میں ہے اور اصل مقصود دین کا اعزاز ہے۔ وہ اپنے حال پر باقی ہے اور منسوخ نہیں ہوا۔ اس کی مثال یہ ہے جب پانی نہ ہو تو طہارت کے حصول کے لیے مٹی سے تیمم کرنا ضروری ہے۔ اور جب حال

بدل جائے اور پانی مل جائے تو اب مٹی سے تیمم کرنے کا حکم ساقط ہو جائے گا اور پانی کا استعمال کرنا ضروری ہوگا۔ کیونکہ اب طہارت کے حصول کے لیے پانی کا استعمال کرنا متعین ہے۔ اسی طرح دین کا اعزاز پہلے مولفۃ القلوب کو دینے میں تھا اب نہ دینے میں ہے اور اصل حکم دین کا اعزاز ہے۔ وہ منسوخ نہیں ہوا۔

(العنایہ ج ۲ ص ۲۶۶۔۲۶۵، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے زکوۃ میں حصہ جس غلام کے متعلق اس کے مالک نے یہ کہا ہو کہ اگر اس نے اتنے روپے مجھے ادا کر دیئے تو یہ آزاد ہے۔ اس غلام کو مکاتب کہتے ہیں اور اس کی آزادی میں تعاون کرنے کے لیے زکوۃ میں سے اس کو حصہ دینا مشروع کیا گیا ہے۔ حسین بیان کرتے ہیں کہ ایک مکاتب حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) کے پاس گیا، وہ اس وقت جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ اس نے حضرت ابوموسیٰ سے کہا: اے امیر! لوگوں کو میرے لیے برانگیختہ کیجئے۔ تو حضرت ابوموسیٰ نے مسلمانوں کو برانگیختہ کیا۔ پس لوگوں نے اس کو کپڑے اور انگوٹھیاں دیں۔ حتیٰ کہ بہت مال جمع ہو گیا۔ حضرت ابوموسیٰ نے اس مال کو جمع کر کے فروخت کیا اور اس کی مکاتبت ادا کر دی اور باقی مال بھی غلاموں کو آزاد کرانے میں صرف کر دیا۔ اور لوگوں کو یہ رقم واپس نہیں کی اور یہ کہا کہ لوگوں نے یہ رقم غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے دی ہے۔

(جامع البیان جز ۱۰ ص ۲۱۰، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)۔

علامہ ابوحفص عمر بن علی الدمشقی الحنبلی المتوفی ۸۸۰ھ لکھتے ہیں: الرقاب (غلاموں کو آزاد کرانے) کی تفسیر میں کئی اقوال ہیں:

(۱) اس سے مراد مکاتب ہیں تا کہ ان کو زکوۃ کے مال سے آزاد کرایا جائے۔

(۲) امام مالک وغیرہ نے یہ کہا کہ مال زکوۃ سے غلام خرید کر ان کو آزاد کرایا جائے۔

(۳) امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے یہ کہا ہے کہ مال زکوۃ سے مکمل غلام آزاد نہ کرایا جائے بلکہ مال زکوۃ سے کچھ رقم غلام کے لیے دی جائے اور اس سے مکاتب کی گردن آزاد کرانے میں مدد کی جائے۔ کیونکہ وفی الرقاب فرمانے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا مال زکوۃ میں کچھ دخل ہونا چاہیے۔ اور یہ اس کے منافی ہے کہ مال زکوۃ سے مکمل غلام آزاد کیا جائے۔

غلاموں، مقروضوں، اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر زکوۃ کی رقم خرچ کرنے کے لیے تملیک ضروری نہیں بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ احتیاط اس میں ہے کہ مکاتب کی اجازت سے زکوۃ میں اس کا حصہ اس کے مالک کو دے دیا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے چار مصارف کا ذکر لام تملیک کے ساتھ کیا ہے۔ اور جب رقاب کا ذکر کیا تو لام کے بجائے "فی" کا ذکر کیا اور فرمایا وفی الرقاب اور اس فرق کا کوئی فائدہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں زکوۃ میں سے ان کا حصہ ان کو دے کر ان کو ان حصص کا مالک بنا دیا جائے اور باقی مصارف میں زکوۃ میں ان کا حصہ ان کے مصالح اور ان کی بہتری اور ان کے فوائد میں خرچ کیا جائے اور ان کو ان کا مالک نہ بنایا جائے۔ زمخشری نے کہا ہے کہ آخری چار مصارف میں لام کی بجائے "فی" کا ذکر کیا ہے اور اس میں یہ بتانا ہے کہ آخری چار مصارف پہلے چار مصارف سے صدقہ اور زکوۃ دیئے جانے کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ "فی" ظرفیت کے لیے آتا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ وہ صدقات کا ظرف اور محل ہیں اور وفی سبیل اللہ وابن السبیل میں جو "فی" کا تکرار کیا ہے اس میں اس میں یہ تنبیہ ہے کہ ان دو مصرفوں کو یعنی فی سبیل اللہ اور ابن السبیل کو پہلے دو مصرفوں پر زیادہ ترجیح ہے اور غلام آزاد کرانے اور مقروض کا قرض ادا کرنے کی بہ نسبت مال زکوۃ کو اللہ کے راستہ

میں اور مسافروں پر خرچ کرنا زیادہ راجح ہے۔

(اللباب فی علوم الکتاب ج ۱۰ ص ۱۲۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)۔

قاضی شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں: پہلے چار مصارف کے ساتھ لام اور آخری چار مصارف کے ساتھ "فی" ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کو زکوۃ سے ان کا حصہ ادا کر کے ان کو ان حصوں کا مالک بنا دیا جائے اور آخری چار مصارف میں ان کو زکوۃ میں سے ان کے حصہ کا مالک نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کا حصہ ان کی فلاح اور ان کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا۔ مکاتب کا مال اس کے مالک کو دیا جائے گا اور مقروض کا مال (اس کے حصہ کی زکوۃ) اس کے قرض خواہ کو دیا جائے گا اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا بالکل واضح ہے۔ اور مسافر بھی اللہ کے راستے میں داخل ہے۔ اس کو علیحدہ اس لیے ذکر کیا ہے تاکہ اس کی خصوصیت پر تنبیہ ہو۔

(عنایت القاضی ج ٤ ص ٥٨٨، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ٦٠٦ھ پہلے چار مصارف میں لام اور آخری چار مصارف میں "فی" کو ذکر کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: پہلے چار مصارف میں ان کو زکوۃ سے ان کا حصہ دے کر ان کو مالک بنا دیا جائے گا کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے ان کا حصہ ان کو نہیں دیا جائے گا اور نہ ان کو اس پر تصرف کی قدرت دی جائے گی کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں بلکہ ان کی طرف سے ان کی قیمت ادا کر دی جائے گی۔ اسی طرح مقروضوں کی زکوۃ کا حصہ ان کے قرض خواہوں کو دے دیا جائے گا۔ اسی طرح مجاہدین کی زکوۃ کا حصہ ان کی ضرورت اسلحہ خریدنے میں خرچ کیا جائے گا اور اسی طرح مسافروں کی ضرورت کی چیزوں میں ان کا حصہ خرچ کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلے چار مصارف میں ان کے حصص ان کو دے دیئے جائیں گے کہ وہ جس طرح چاہیں خرچ کریں اور آخری چار مصارف میں ان کو ان کے حصص نہیں دیئے جائیں گے بلکہ جس جہت سے وہ زکوۃ کے مستحق ہیں اس جہت میں ان کے حصہ کی زکوۃ کو خرچ کیا جائے گا۔

(تفسیر کبیر ج ٦ ص ٨٧-٨٦، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)۔

مفسرین حنبلیہ میں سے علامہ عمر بن علی الدمشقی حنبلی نے اور مفسرین شافعیہ میں سے امام رازی کے علاوہ، علامہ خازن شافعی متوفی ۷۲۵ھ نے یہی لکھا ہے کہ زکوۃ کے پہلے چار مصارف میں تملیک ضروری ہے اور آخری چار مصارف میں تملیک کے بجائے ان کی ضروریات اور مصالح میں زکوۃ خرچ کی جائے۔

(تفسیر خازن ج ۲ ص ۲۵۳)

اور مفسرین احناف میں سے علامہ خفاجی کے علاوہ علامہ محی الدین شیخ زادہ حنفی متوفی ۹۵۱ھ اور علامہ ابو السعود محمد بن عمادی حنفی متوفی ۹۸۲ھ اور علامہ آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی یہی لکھا ہے۔

(حاشیہ محی الدین شیخ زادہ ج ٤ ص ٤٧٨، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ، تفسیر ابو السعود ج ۳ ص ۱٦٢، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ، تفسیر روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۲٤، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

غیر مقلدین میں سے نواب صدیق حسن خاں بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ نے بھی یہی لکھا ہے۔

(فتح البیان ج ٥ ص ۳۳۲)

جن مفسرین نے ژرف نگاہی سے کام لیا اور اس پر غور کیا کہ پہلی چار اصناف کے لیے اللہ تعالیٰ نے لام کا لفظ استعمال فرمایا

ہے اور باقی چار اصناف کے لیے" فی " کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔انھوں نے اس سے یہ مستنبط کیا کہ پہلی چار قسموں میں سے جس کو زکوۃ ادا کی جائے اس کو اس مال زکوۃ کا مالک بنانا ضروری ہے اور دوسری چار قسموں کے شروع میں چونکہ لام تملیک نہیں ہے بلکہ" فی " کا ذکر ہے اس لیے ان میں ان کو مال زکوۃ کا مالک نہیں بنایا جائے گا بلکہ ان کے حصہ کی زکوۃ کو ان کی ضروریات اوران کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا۔حنبلی، شافعی اور حنفی مفسرین کی تصریحات اس مسئلہ میں گزر چکی ہیں اور فقہاء مالکیہ کا بھی یہی موقف ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ غلام کو زکوۃ کا حصہ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زکوۃ کے حصہ سے غلام کو خرید کر آزاد کر دیا جائے۔

علامہ ابو عبداللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

امام مالک نے فرمایا کہ غلام کو آزاد کر دیا جائے اوراس کی ولاء مسلمانوں کے لیے ہوگی، (الی قولہ) اس میں اختلاف ہے کہ آیا مکاتب کو آزاد کرانے میں اس کی معاونت کی جائے یا نہیں۔کیونکہ جب اللہ تعالیٰ رقبہ (غلام) کا ذکر فرماتا ہے تو اس سے مکمل غلام آزاد کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اور رہا مکاتب تو وہ غارمین (مقروضوں) کے کلمہ میں داخل ہے کیونکہ اس کے اوپر مکاتبت کا قرض ہوتا ہے اس لیے وہ رقاب میں داخل نہیں ہوگا۔

(الجامع لاحکام القرآن: جز۸ ص ۱۰۹)

زکوۃ کے تمام مصارف میں تملیک ضروری ہونے پر فقہاء احناف کے دلائل:

ہر چند کہ علامہ خفاجی، علامہ ابو سعود حنفی، علامہ شیخ زادہ حنفی اور علامہ آلوسی حنفی نے یہ تصریح کی ہے کہ ادائیگی زکوۃ میں مالک بنانے کا تعلق اصناف زکوۃ میں سے صرف پہلی چار اصناف کے ساتھ ہے اور باقی چار اقسام میں تملیک نہیں کی جائے گی بلکہ مال زکوۃ کو ان کی ضروریات اور مصالح میں خرچ کیا جائے گا لیکن جمہور فقہاء احناف تملیک کو ادائیگی زکوۃ کا رکن قرار دیتے ہیں اور یہ زکوۃ کی تمام اصناف کے لیے رکن ہے۔

علامہ ابو بکر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

زکوۃ کا رکن یہ ہے کہ نصاب میں سے ایک جز کو اللہ کی طرف نکالا جائے اوراس کو اللہ کے سپرد کر دیا جائے اور فقیر کو مالک بنا کر اس کے سپرد وہ مال کر کے مالک کا قبضہ اس جز سے منقطع ہو جائے۔یا فقیر کے نائب کے سپرد کر دے جو زکوۃ وصول کرنے والا ہے اور ملک فقیر کے لیے اللہ کی طرف سے ثابت ہوگی اور صاحب مال فقیر کو مالک بنانے اور اس کے سپرد کرنے میں اللہ کی طرف سے نائب ہوگا۔اس پر دلیل یہ آیت ہے۔

الم یعلموآ ان اللہ ھو یقبل التوبۃ عن عبادہ ویاخذ الصدقات۔

(التوبہ:۱۰۴)

ترجمہ: کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات لیتا ہے۔

اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: فقیر کی ہتھیلی پر آنے سے پہلے صدقہ رحمٰن کے ہاتھ میں آتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے فقیر کو مالک بنانے کا حکم دیا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اتوا الزکوۃ۔ (البقرہ:۴۳)

زکوۃ دو، اور الآیت اء (دینا) تملیک ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کو صدقہ فرمایا ہے۔

انما الصدقات للفقراء۔ (التوبہ:٦٠)

اور تصدق کا معنی تملیک ہے۔پس نصاب کا مالک زکوۃ کی مقدار کو اللہ کی طرف نکالنے والا ہوتا ہے۔ہم نے یہ کہا ہے کہ فقیر کو زکوۃ سپرد کرتے وقت اس سے زکوۃ کی نسبت منقطع ہو جائے گی اور یہ خالص اللہ کے لیے ہو جائے گی۔اور اللہ کی طرف زکوۃ نکالنے کا معنی عبادت اس وقت بنے گا جب فقیر کو مالک بنا کر وہ اس سے اپنی ملک کو باطل کر دے۔بلکہ حقیقت میں مالک اللہ بناتا ہے اور صاحب مال تو اللہ کی طرف سے نائب ہے۔اس قاعدہ کے مطابق مساجد، سرائے اور پانی کی سبیلیں بنانے، پلوں کی مرمت کرنے، مردوں کو دفن کرنے اور دیگر نیکی کے کاموں میں زکوۃ کو صرف کرنا جائز نہیں ہے۔کیونکہ ان میں تملیک (کسی کو مالک بنانا) بالکل نہیں پائی جاتی (کیونکہ یہ چیزیں وقف ہوتی ہیں اور وقف کا کوئی مالک نہیں ہوتا)۔اسی طرح اگر کسی شخص نے مال زکوۃ سے طعام خریدا اور فقراء کو صبح اور شام کھانا کھلایا اور ان کو بعینہ طعام نہیں دیا تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔کیونکہ اس صورت میں تملیک نہیں ہوئی۔اور اگر اس نے مال زکوۃ سے کسی زندہ فقیر کا قرض اس کے حکم کے بغیر ادا کر دیا تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔کیونکہ اس صورت میں بھی فقیر کو مالک نہیں بنایا گیا اور اگر فقیر کے حکم سے اس کا قرض ادا کیا گیا ہے تو جائز ہے۔کیونکہ اب فقیر کے لیے تملیک پائی گئی۔گویا کہ فقیر نے مال زکوۃ پر قبضہ کیا اور اس کو قرض کی ادائیگی کے لیے وکیل بنا دیا۔اسی طرح اگر کسی شخص نے مال زکوۃ سے غلام خرید کر آزاد کر دیا تو یہ جائز نہیں ہے اور امام مالک کے نزدیک یہ جائز ہے اور قرآن مجید میں جو ہے:

وفی الرقاب۔ (التوبہ:٦٠)

ان کے نزدیک اس کا یہی معنی ہے کہ مال زکوۃ سے غلام خرید کر آزاد کر دیا جائے۔اور ہمارے نزدیک تملیک واجب ہے اور آزاد کرنا ملک کو زائل کرنا ہے اور ہمارے نزدیک وفی الرقاب کا معنی یہ ہے کہ مال زکوۃ سے مکاتبین کی امداد کی جائے۔

(بدائع الصنائع ج٢ ص ٤٥٧۔٤٥٦، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤١٨ھ)

اسی طرح علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن ہمام حنفی متوفی ٨٦١ھ لکھتے ہیں:

مالِ زکوۃ سے مسجد بنائی جائے گی اور نہ میت کو کفن دیا جائے گا کیونکہ اس صورت میں تملیک نہیں ہے اور وہ رکن ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کو صدقہ فرمایا ہے اور صدقہ کی حقیقت یہ ہے کہ فقیر کو مال کا مالک بنا دیا جائے۔

(فتح القدیر ج٢ ص ٢٧٢، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

تملیک کی رکنیت کے دلائل کا تجزیہ:

علامہ کاسانی نے تملیک پر یہ دلیل دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

واتوا الزکوۃ اور الآیتاء کا معنی ہے کسی کو کسی چیز کا مالک بنانا۔

ہم اب کتب لغت میں الآیتاء کا معنی دیکھتے ہیں۔علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی ٨١٧ھ لکھتے ہیں:

الآیتاء کا معنی ہے کسی کو کوئی چیز عطا کرنا۔

(قاموس ج٤ ص ٤٣٠)

علامہ راغب اصفہانی متوفی ٥٠٢ھ نے لکھا ہے: الآیتاء کا معنی ہے: الاعطاء۔

(المفردات ج١ ص١٠)

علامہ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے لکھا ہے کہ کشاف میں ہے: الآیت اء کا معنی الاعطاء میں مشہور ہو گیا۔ اس کا اصل معنی ہے کسی چیز کو حاضر کرنا۔

(تاج العروس ج ۱۰ ص ۸، مطبوعہ المطبعتہ المیمنہ مصر، ۱۳۰۶ھ)

کتب لغت سے یہ ثابت نہیں ہے کہ الآیت اء کا معنی تملیک ہے، اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے اور وہاں اس کا معنی مالک بنانا متصور نہیں ہو سکتا۔

قال یٰقوم ارئیتم ان کنت علیٰ بینۃٍ من ربی واٰتنی رحمۃً من عندہٖ فعمیت علیکم۔

(ھود: ۲۸)

ترجمہ: (نوح نے) کہا: اے میری قوم! یہ بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت دی ہو سو وہ تم پر مخفی کر دی گئی۔

فلما اثقلت دعوا اللہ ربھما لئن اٰتیتنا صالحاً لنکونن من الشٰکرین۔

(الاعراف: ۱۸۹)

ترجمہ: پھر جب وہ حاملہ ہو گئی تو ان دونوں نے اپنے رب سے دعا کی اگر تو نے ہمیں نیک بیٹا دیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہو جائیں گے۔

فلما اٰتٰھما صالحاً۔ (الاعراج: ۱۹۰)

ترجمہ: پس اللہ نے جب انھیں بہترین بچہ دیا۔

فاٰتت اکلھا ضعفین۔ (البقرہ: ۲۶۵)

ترجمہ: تو اس باغ نے دگنا پھل دیا۔

اٰتونی زبر الحدید۔ (الکھف: ۹۶)

ترجمہ: مجھے لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لا کر دو۔

اس لفظ کے تمام صیغوں اور قرآن مجید اور احادیث میں اس کے اطلاقات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ الآیت اء کا معنی حاضر کرنا اور کسی چیز کو دینا اور مہیاں کرنا ہے اور اس کے مفہوم میں تملیک داخل نہیں ہے۔ علامہ کاسانی اور علامہ ابن ہمام نے یہ بھی لکھا ہے کہ صدقہ کا معنی تملیک ہے۔ علامہ فیروز آبادی نے لکھا ہے: صدقہ وہ چیز ہے جس کو تم اللہ عزوجل کی ذات کے لیے دو۔

(قاموس ج ۳ ص ۳۶۸)

علامہ زبیدی نے لکھا ہے کہ صحاح میں مذکور ہے: جس چیز کو تم فقراء پر صدقہ کرو اور مفردات میں مذکور ہے: جس چیز کو انسان اپنے مال سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے زکوۃ، لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کو کہتے ہیں اور زکوۃ خیرات واجبہ کو۔

(المفردات ج ۲ ص ۳۶۵، تاج العروس ج ۶ ص ۴۰۵)

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ صدقہ کے لغوی معنی میں تملیک کا مفہوم داخل نہیں ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ادائیگی زکوۃ میں تملیک کا رکن نہ ہونا: ائمہ ثلاثہ نے زکوۃ کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں تملیک کا ذکر

نہیں کیا۔ ان کے نزدیک تملیک زکوۃ کا رکن ہے نہ شرط۔ علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی الشافعی المتوفی ٤٥٠ھ لکھتے ہیں: کسی مخصوص چیز کو مخصوص مال سے اوصاف مخصوصہ کے ساتھ جماعت مخصوصہ کے لیے لینا شرعاً زکوۃ ہے۔

(الحاوی الکبیر ج ٤ ص ٣، مطبوعہ دارالفکر بیروت)

علامہ محمد بن عبدالباقی بن یوسف الزرقانی المالکی المتوفی ١١٢٢ھ لکھتے ہیں: علامہ ابن العربی نے کہا ہے کہ زکوۃ کا اطلاق صدقہ واجبہ پر، صدقہ مستحبہ پر، نفقہ پر، عفو پر اور حق پر کیا جاتا ہے اور اس کی شرعی تعریف یہ ہے: سال گزرنے کے بعد نصاب کے ایک جز کو فقیر اور اس کی مثل کو دینا وہ فقیر غیر ہاشمی اور غیر مطلبی ہو، اس کا رکن اخلاص ہے۔ اس کا سبب ایک سال تک نصاب کا مالک ہونا ہے۔ اس کی شرط عقل، بلوغ اور حریت ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ دنیا میں واجب ساقط ہو جاتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے اور اس کی حکمت مال کو میل کچیل سے پاک کرنا ہے۔

(شرح الزرقانی علی الموطا امام مالک ج ٤ ص ١٣٥۔١٣٤، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ١٤١٧ھ)

حافظ احمد بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ٨٥٢ھ نے بھی ابن عربی مالکی کی اس تعریف کو ذکر کر کے لکھا ہے۔ یہ بہت عمدہ تعریف ہے لیکن وجوب کی شرط میں اختلاف ہے۔

(فتح الباری ج ٣ ص ٢٦٤، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور، ١٤٠١ھ)

علامہ منصور بن یونس بہوتی متوفی ١٠٤٦ھ لکھتے ہیں: زکوۃ کا شرعی معنی یہ ہے کہ یہ وہ حق ہے جو مال مخصوص میں جماعت مخصوصہ (فقراء وغیرہ) کے لیے وقت مخصوص میں واجب ہے۔ یعنی نصاب پر سال گزرنے کے بعد، اور مال مخصوص سے مراد مویشی، سونا چاندی، (درہم، دینار) اور مال تجارت ہے۔

(کشاف القناع ج ٢ ص ٦۔٥، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، ١٤١٧ھ)

آخری چار مصارف میں تملیک کا اعتبار نہ کرنے کا ثمرہ: فقہاء احناف نے تملیک کے ثبوت میں جو دلیل دی ہے کہ آتوا اور صدقہ کرنے کا معنی فقیر کو مالک بنانا ہے وہ کتب لغت اور قرآن مجید کی آیات سے ثابت نہیں ہے، اور ائمہ ثلاثہ نے زکوۃ میں تملیک کو رکن یا شرط قرار نہیں دیا۔ البتہ سورۃ توبہ کی اس آیت میں مذاہب اربعہ کے مفسرین نے للفقراء والمساکین والعملین علیہا والمؤلفة ولبھم میں لام کو تملیك کے لیے قرار دیا ہے اور وفی الرقاب والغرمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل میں لام کی جگہ "فی" لانے کی وجہ ان مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ غلام آزاد کرنے اور مقروضوں کے قرض ادا کرنے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر خرچ کرنے کے لیے زکوۃ کی رقم کا ان کو مالک بنانا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ زکوۃ کی رقم کو ان کی ضروریات اور مصلحتوں میں بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً حنفی مفسرین میں سے علامہ خفاجی، علامہ شیخ زادہ، علامہ ابوسعود اور علامہ آلوسی کا یہی مختار ہے۔ سو اگر ہمارے علماء احناف اس نظریہ سے اتفاق کریں تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دینی مدارس، مساجد، ہسپتالوں اور دیگر فلاحی کاموں پر زکوۃ کی رقم خرچ کی جا سکے گی اور حیلہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہمارے اہل علم اور اہل فتویٰ حضرات کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

زکوۃ میں مقروضوں کا حصہ:

مقروض سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی جائز ضروریات میں مقروض ہوں، نہ کہ وہ لوگ جنہوں نے کسی گناہ کے ارتکاب کے لیے

قرض لیا ہو۔ مثلاً کسی نے سنیما ہاؤ، وڈیو شاپ یا شراب کی دکان کھولنے کے لیے قرض لیا ہو یا مثلاً کسی نے بے جا خرچ اور اسراف کے لیے قرض لیا ہو۔ مثلاً کسی نے اپنے بچوں کی شادی کے سلسلہ میں مروجہ رسومات بڑے پیمانہ پر منعقد کی ہوں اور مقروض ہوگیا ہو اور اس قرض کو ادا کرنے کے لیے اس کے پاس رقم نہ ہو تو اس کو زکوۃ کی رقم نہیں دینی چاہیے۔ البتہ علامہ نووی شافعی نے "الروضۃ" میں یہ لکھا ہے کہ اگر وہ توبہ کرلے تو پھر اس کو بھی زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ مقروض خواہ غنی ہو لیکن اگر اس کے پاس قرض اتارنے کے لیے رقم نہیں ہے تو اس کو زکوۃ دی جاسکتی ہے۔ حدیث میں ہے: عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی غنی کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں ہے، مگر پانچ کے لیے: جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو، یا وہ صدقہ وصول کرنے والا عامل ہو، یا مقروض ہو یا جس شخص نے صدقہ کو اپنے مال سے خرید لیا ہو، یا جس شخص کا کوئی مسکین پڑوسی ہو اور اس پر کوئی چیز صدقہ کی گئی اور وہ مسکین غنی کو وہ چیز ہدیہ کردے۔ (یہ روایت مرسل ہے)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱٦۳۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸٤۱، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۳۰۷)

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کسی غنی کے لیے صدقہ لینا جائز نہیں ہے۔ مگر اس غنی کے لیے جو اللہ کی راہ میں ہو، یا مسافر ہو، یا وہ کسی فقیر کا پڑوسی ہو اس فقیر پر صدقہ کیا جائے اور وہ غنی کو ہدیہ دے یا اس کی دعوت کرے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱٦۳۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸٤۱، فردوس بماثور الخطاب رقم الحدیث: ۷٦٤٦، مسند احمد ج ۳ ص ۵٦، المستدرک ج ۱ ص ٤۰۷۔ اس حدیث کی سند حسن ہے اور اس کے راوی ثقہ اور مشہور ہیں)۔

زکوۃ میں فی سبیل اللہ کا حصہ:

اس سے مراد یہ ہے کہ جہاد کرنے والوں پر زکوۃ کی رقم خرچ کی جائے اور ان کے لیے اسلحہ، گھوڑے اور کھانے پینے کی چیزیں خریدی جائیں۔ امام شافعی اور امام ابویوسف کا یہی مذہب ہے اور امام محمد کے نزدیک جو مسلمان حج کے لیے جائیں وہ بھی اللہ کی راہ میں ہیں اور ان کو بھی زکوۃ کی رقم دینا جائز ہے۔ اس پر یہ اشکال ہے کہ اگر مجاہد یا حاجی کے پاس اس کے وطن میں نصاب کے برابر مال ہے اور سفر میں نہیں ہے تو وہ مسافر میں داخل ہے اور اگر سفر اور حضر دونوں میں وہ صاحب نصاب نہیں ہے تو پھر وہ فقیر میں داخل ہے۔ تو پھر فی سبیل اللہ ایک مستقل اور الگ مصرف نہ ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ شخص اپنے وطن میں مال دار ہے لیکن جب وہ جہاد کے لیے روانہ ہوتا ہے تو اس کو اسلحہ اور سواری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف مسافر کو اسلحہ اور سواری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک غازی اور مجاہد کو اسی وقت زکوۃ دی جاسکتی ہے جب وہ محتاج ہو۔ باقی ائمہ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے۔ امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ٦۰٦ھ لکھتے ہیں:

فی سبیل اللہ کے الفاظ صرف غازیوں اور مجاہدین میں منحصر نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء سے یہ نقل کیا ہے کہ فقہاء نے زکوۃ کو نیکی کے تمام راستوں میں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے۔ مثلاً مردوں کو کفن دیا جائے، قلعے بنائے جائیں اور مساجد بنائی جائیں۔ ان تمام امور میں زکوۃ کو خرچ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ فی سبیل اللہ کا لفظ ان سب کو شامل ہے۔

(تفسیر کبیر ج ٦ ص ۸۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱٤۱۵ھ)

زکوۃ میں مسافروں کا حصہ: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس سفر میں مال اور اسباب نہ ہوں اور اس کو مدد کی ضرورت ہو۔ اس کو زکوۃ کی رقم دی جاسکتی ہے۔ علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں: مسافر سے مراد وہ مسافر ہے جس کے پاس مال نہ ہو۔ وہ زکوۃ قبول کرنے کے بجائے قرض مانگ لے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ "فتح القدیر" میں مذکور ہے کہ مسافر کے لیے اپنی ضرورت سے زیادہ لینا جائز نہیں ہے اور مسافر کے ساتھ ہر وہ شخص لاحق ہے جس کے پاس مال نہ ہو۔ خواہ اس کے شہر میں اس کے پاس مال ہو اور "محیط" میں مذکور ہے کہ اگر تاجر کی رقوم لوگوں کے پاس قرض ہوں اور وہ ان سے قرض وصول کرنے پر قادر نہ ہو اور اس کے پاس مال نہ ہو تو اس کے لیے زکوۃ لینا جائز ہے۔ کیونکہ وہ مسافر کی طرح اس حال میں فقیر ہے۔ اور "خانیہ" میں اس کی تفصیل ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ اگر تاجر کا لوگوں پر میعادی قرض ہو اور وہ کھانے پینے میں محتاج ہو تو اس کے لیے قرض وصول ہونے کی مدت تک زکوۃ وصول کرنا جائز ہے۔ اور اگر قرض غیر میعادی ہو لیکن مقروض تنگ دست ہو تب بھی اس کے لیے زکوۃ لینا جائز ہے۔ کیونکہ وہ مسافر کی طرح ہے اور اگر مقروض امیر ہو تو پھر اس کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر گواہ عادل نہیں ہیں پھر بھی زکوۃ لینا جائز نہیں۔ الا یہ کہ مقروض قاضی کے سامنے حلف اٹھائے کہ اس نے اس تاجر کو قرض نہیں دینا۔ پھر وہ زکوۃ لے سکتا ہے۔ اس مسئلہ میں قرض کی رقم نصاب سے کم نہیں ہونی چاہیے۔

(روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۲٤، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

کسی ایک صنف کے ایک فرد پر زکوۃ کرنے کا جواز:

مشہور یہ ہے کہ شافعیہ کے نزدیک لام تملیک کے لیے ہے اور یہی ان کے مذہب کا مقتضیٰ ہے کیونکہ انھوں نے کہا کہ جب یہ تمام اصناف موجود ہوں تو ان تمام اصناف پر زکوۃ کو تقسیم کرنا واجب ہے اور چونکہ اس آیت میں ہر صنف کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا ہے اس لیے ہر صنف کے تین افراد پر تقسیم کرنا واجب ہے اور ہمارے اور مالکیہ اور حنبلیہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ زکوۃ دینے والا ہر صنف پر زکوۃ تقسیم کرے یا کسی ایک صنف پر زکوۃ کی رقم صرف کرے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر صنف کے تین افراد پر زکوۃ کو تقسیم کرے۔ وہ کسی ایک فرد کو بھی پوری زکوۃ کی رقم دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ کن لوگوں کو زکوۃ دی جاسکتی ہے۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ ان سب کو زکوۃ دینا ضروری ہے۔ اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

وان تخفوھا وتوتوھا الفقرآء فھو خیرٌ لکم۔ (البقرہ: ۲۷۱)

ترجمہ: اگر تم صدقات خفیہ طریقہ سے دو اور وہ صدقات فقراء کو دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔

اس آیت میں فقراء کو زکوۃ دینے کو زیادہ بہتر فرمایا ہے اور فقراء ایک صنف ہیں۔ اور ایک مرتبہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس صدقہ کا مال آیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرف ایک صنف میں دیا اور وہ مولفۃ القلوب تھے۔ پھر دوسری مرتبہ مال آیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرف مقروضوں کو دیا۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ صرف ایک صنف پر اقتصار کرنا جائز ہے۔ اور اس آیت میں جمع کے صیغوں پر الف لام جنس کا ہے۔ کیونکہ عہد اور استغراق کا الف لام متصور نہیں ہے۔ اور جنس صدقہ کو کسی صنف کی جنس پر خرچ کرنے کو بیان فرمایا ہے۔ اس لیے کسی صنف کے ایک فرد پر بھی زکوۃ کی پوری رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔

(روح المعانی جز ۱۰، ص ۱۲۵۔۱۲٤، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، الجامع لاحکام القرآن جز ۸ ص ۹۵، زاد المسیر ج ۳ ص ٤۵۹)

مسجدِ ضرار

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱۰۷

(سورۃ التوبہ آیت 107)

''اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے اغراض کے لیے مسجد بنائی ہے کہ ضرر پہنچائیں اور کفر کی باتیں کریں اور ایمانداروں میں تفریق ڈالیں اور اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس پہلے سے اللہ اور رسول کا مخالف ہے(۱) اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں، اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بالکل جھوٹے ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اور وہ لوگ جنہوں نے ضرر پہنچانے کے لیے مسجد بنائی اور کفر کرنے کے لیے اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے لیے اور اس شخص کی کمین گاہ بنانے کے لیے جو پہلے سے ہی اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر رہا ہے اور وہ ضرور یہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے صرف بھلائی کا ارادہ کیا ہے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بیشک وہ ضرور جھوٹے ہیں۔

(التوبہ:۱۰۷)

مسجد ضرار کا پس منظر و پیش منظر حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے، مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک شخص رہتا تھا جس کا نام ابو عامر راہب تھا یہ شخص ایام جاہلیت میں نصرانی ہوگیا تھا اور اہل کتاب کا علم حاصل کر چکا تھا۔ ایام جاہلیت میں یہ ایک عبادت گزار شخص تھا اور اس کو اپنے قبیلہ میں بہت فضیلت حاصل تھی۔ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے اور مسلمان آپ کے گرد جمع ہونے لگے اور اسلام کی مقبولیت ہونے لگی اور غزوہ بدر میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایا تو ابو عامر پر یہ تمام امور بہت شاق گزرے اور وہ برملا مسلمانوں سے عداوت ظاہر کرنے لگا اور مدینہ سے بھاگ کر کفار مکہ اور مشرکین سے جا ملا یہ ان کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف جنگ پر مائل کرتا تھا، سو عرب کے سارے قبیلے اکٹھے ہو گئے اور جنگ احد کے لیے پیش قدمی کی۔ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آزمائش میں مبتلا کیا اور مسلمانوں کو اس جنگ میں نقصان ہوا۔

اس فاسق نے دونوں طرف کی صفوں کے درمیان کئی گڑھے کھود رکھے تھے، ان میں سے ایک میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گر پڑے اور آپ کو چوٹ لگی، آپ کا چہرہ زخمی ہوگیا نیچے کی طرف سے سامنے کے چار دانتوں میں سے دائیں جانب کا ایک دانت شہید ہوگیا اور اس کا ایک کنارہ جھڑ گیا تھا) اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سر بھی زخمی ہوگیا تھا۔ ابو عامر نے جنگ شروع ہونے

سے پہلے اپنی قوم انصار کی طرف بڑھ کر انھیں مخاطب کیا اور ان کو اپنی موافقت کی دعوت دی، جب انصار نے ابو عامر کی یہ حرکت دیکھی تو انھوں نے کہا: اے فاسق! اے دشمن خدا! اللہ تجھ کو برباد کرے اور اس کو بہت برا کہا اور اس کی مذمت کی۔ ابو عامر یہ کہتا ہوا واپس گیا کہ میرے بعد میری قوم بہت بگڑ گئی ہے۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے بھاگنے سے پہلے اس کو اسلام کی دعوت دی تھی اور اس کو قرآن پڑھ کر سنایا تھا لیکن اس نے سرکشی کی اور انکار کیا، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے لیے دعاء ضرر فرمائی کہ وہ جلاوطنی کی حالت میں مرے۔ اس دعاء ضرر کا اثر اس طرح ہوا کہ جب ابو عامر نے دیکھا کہ جنگ احد میں مسلمانوں کے نقصان اٹھانے کے باوجود نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی تو وہ روم کے بادشاہ ہرقل کے پاس گیا اور اپنی قوم میں سے منافقین کو مکہ بھیجا کہ میں لشکر لے کر آرہا ہوں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خوب جنگ ہوگی اور میں ان پر غالب آجاؤں گا اور منافقین کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اس کے لیے ایک پناہ کی جگہ بنائیں اور جو لوگ میرا پیغام اور احکام لے کر آئیں ان کے لیے امن کی ایک پناہ گاہ بناؤ تاکہ جب وہ خود مدینہ آئے تو وہ جگہ اس کے لیے کمین گاہ کا کام دے، چنانچہ ان منافقین نے مسجد قبا کے قریب ہی ایک اور مسجد بنا ڈالی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تبوک روانگی سے پہلے وہ اس کام سے فارغ بھی ہوگئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس یہ درخواست لے کر آئے کہ آپ ہمارے پاس آئیے اور ہماری مسجد میں نماز پڑھئے تاکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ مسجد مستند ہوجائے۔

انہوں نے آپ سے کہا کہ ہم نے کمزوروں اور بیماروں کی خاطر یہ مسجد بنائی ہے اور جو ضعیف لوگ سردیوں کی راتوں میں دور کی مساجد میں نہیں جاسکتے ان کے لیے آسانی ہو لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس مسجد میں نماز پڑھنے سے بچانا چاہتا تھا، اس لیے آپ نے فرمایا: ہمیں تو اس وقت غزوہ تبوک کا سفر درپیش ہے، جب ہم واپس ہوں گے تو انشاء اللہ دیکھا جائے گا اور جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غزوہ تبوک سے فارغ ہوکر مدینہ کی طرف واپس ہوئے اور ایک دن یا اس سے کچھ کم مدینہ کی مسافت رہ گئی تو حضرت جبرائیل (علیہ السلام) وحی لے کر آئے اور بتایا کہ منافقوں نے یہ مسجد ضرار بنائی ہے اور مسجد قبا کے قریب ایک اور مسجد بنانے سے ان کا مقصد مسلمانوں کی جماعت میں تفریق پیدا کرنا ہے اور اس سے ان کا مقصود ابو عامر راہب کی کمین گاہ بنانا ہے۔ اس وحی کے نازل ہونے کے بعد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی چند مسلمانوں کو اس مسجد ضرار کی طرف بھیج دیا تاکہ وہ اس کو منہدم کردیں اور اس کو جلا ڈالیں۔ آپ نے بنو سالم کے بھائی مالک بن دخشم اور معن بن عدی یا اس کے بھائی عامر بن عدی کو بلایا اور فرمایا: تم دونوں ان ظالموں کی مسجد کی طرف جاؤ اور اس کو منہدم کردو اور جلا ڈالو۔

ان دونوں نے اس مسجد کو گرایا اور جلا ڈالا۔ اس وقت اس مسجد میں یہ کفار موجود تھے اور مسجد کے جلنے سے یہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسجد ضرار کو بنانے والے یہ بارہ افراد تھے: خذام بن خالد، ثعلبہ بن حاطب (یہ وہ نہیں جو بدری صحابی ہیں) معتب بن قشیر، ابو حبیبہ بن الازعر، عباد بن حنیف، حارثہ بن عامر اور اس کے دو بیٹے مجمع اور زید، نبتل الحارث، مخزج، بجاد بن عمران اور ودیعہ بن ثابت۔۔ یہ لوگ قسمیں کھا کھا کر کہہ رہے تھے کہ ہم نے تو نیک ارادے سے یہ مسجد بنائی تھی، ہمارے پیش نظر صرف مسلمانوں کی خیر خواہی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹ بولتے ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۴۳۵۔ ۴۳۲ ملخصًا، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۹ھ، البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۶۱۹۔ ۶۱۸، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۸ھ

تبرکات کی اہمیت

اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِىۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ اَبِىۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا‌ ۚ وَاۡتُوۡنِىۡ بِاَهۡلِكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ۝۹۳

﴿سورۃ یوسف آیت ۹۳﴾

''میرا یہ کرتا تم لے جاؤ اور اسے میرے والد کے منہ پر ڈال دو کہ وہ دیکھنے لگیں (۱) اور آجائیں اور اپنے تمام خاندان کو میرے پاس لے آؤ جب حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف کو پہچان لیا تو حضرت یوسف نے ان سے اپنے باپ کا حال پوچھا، بھائیوں نے بتایا کہ ان کی بینائی جاتی رہی ہے، تب حضرت یوسف نے ان کو اپنی قمیص دی اور کہا: یہ قمیص میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی''۔

امام عبدالرحمن بن محمد رازی المعروف بابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:

مطلب بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالا گیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت کی قمیصوں میں سے ایک قمیص پہنائی تھی، حضرت ابراہیم نے یہ قمیص حضرت اسحاق کو پہنائی اور حضرت اسحاق نے وہ قمیص حضرت یعقوب کو پہنائی اور حضرت یعقوب نے وہ قمیص حضرت یوسف کو پہنائی، پھر انھوں نے اس قمیص کو لپیٹ کر ایک چاندی کی نلکی میں رکھا اور اس کو حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا، جس وقت حضرت یوسف کو کنوئیں میں ڈالا گیا اور جب ان کو قید میں رکھا گیا اور جس وقت ان کے پاس ان کے بھائی آئے، ان تمام اوقات میں وہ نلکی ان کے گلے میں تھی اور اس وقت حضرت یوسف نے اس نلکی سے یہ قمیص نکال کر بھائیوں کے حوالے کی اور کہا: میری اس قمیص کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی، ابھی وہ قمیص فلسطین کے علاقہ کنعان میں تھی کہ حضرت یعقوب نے فرمایا: مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔

یہوذا نے کہا: پہلے حضرت یعقوب کے پاس میں خون آلود قمیص لے کر گیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ یوسف کو بھیڑیے نے کھالیا، اب اس قمیص کو بھی میں لے کر آؤں گا اور یہ بتاؤں گا کہ یوسف زندہ ہیں، جس طرح پہلے میں نے ان کو رنجیدہ کیا تھا اسی طرح اب میں جا کر ان کو خوشخبری دوں گا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۷ ص ۲۱۹۶، مطبوعہ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

ہمارے نبی ﷺ کے کپڑوں اور آپ کے بالوں سے بیماروں کا شفایاب ہونا اور دیگر برکتیں:

حضرت اسماء کے آزاد کردہ غلام عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت اسماء کو بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر مطلقاً ریشم کو حرام کہتے ہیں تو انھوں نے کہا: یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جبہ ہے، انھوں نے ایک طیالیسہ کسروانیہ جبکہ نکالا جس میں ریشم کے پیوند لگے ہوئے تھے اور اس کے سامنے اور پیچھے کے چاک پر یا آستینوں پر ریشم کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ حضرت اسماء

نے کہا: یہ جبہ حضرت عائشہ کے پاس تھا، جب وہ فوت ہوگئیں تو میں نے اس پر قبضہ کرلیا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو پہنا کرتے تھے، ہم بیماروں کے لیے اس کو دھوتے اور اس (کے غسالہ، دھوون) سے ان کے لیے شفا طلب کی جاتی ہے۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۰۶۹، مسند احمد ج ٦ ص ۳٤۷، ۳٤۸ طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۷٤۸۱ طبع عالم الکتب بیروت)

علامہ شہاب الدین احمد خفاجی متوفی ۱۰٦۹ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ہم آپ کے جبہ کو دھو کر اس کا دھوون بیماروں کو پلاتے تھے اور ان کے بدنوں پر ملتے تھے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آثار سے برکت حاصل کرتے تھے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی برکت سے اللہ تعالیٰ بیماروں کو شفا عطا فرماتا تھا۔
(نسیم الریاض ج ۳ ص ۱۳٤، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

قاضی عیاض بن موسیٰ متوفی ٥٤٤ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابو القاسم بن میمون بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیالوں میں سے ایک پیالہ تھا، ہم بیماروں کے لیے اس میں پانی ڈالتے تھے اور وہ اس سے شفا حاصل کرتے تھے۔
(الشفاء ج ۱ ص ۲٤٦، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱٤۱٥ھ)

علامہ خفاجی نے لکھا ہے: بیمار اس پیالہ میں پانی ڈال کر پیتے تھے اور شفا طلب کرتے تھے اور اس کو پینے سے آپ کے آثار کی برکت سے ان کو شفا حاصل ہوتی تھی۔
(نسیم الریاض ج ۳ ص ۱۳٤، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

عثمان بن عبد اللہ بن موہب بیان کرتے ہیں کہ میرے گھر والوں نے ایک برتن میں پانی ڈال کر مجھے حضرت ام سلمہ کے پاس بھیجا، اسرائیل نے تین انگلیوں کو ملایا یعنی وہ چاندی سے ملمع کی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈبیا تھی تین انگل جتنی، اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مبارک بالوں میں سے کچھ بال تھے، جب کسی انسان کو نظر لگ جاتی یا اس کو اور کوئی بیماری ہو جاتی تو وہ آپ کے پاس ایک برتن بھیج دیتا۔ میں نے گھنٹی کی شکل کی ایک ڈبیا دیکھی اس میں سرخ رنگ کے بال تھے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٥۸۹٦، مشکوۃ رقم الحدیث: ٤٥٦۸)

حافظ شہاب الدین احمد ابن حجر عسقلانی متوفی ۸٥۲ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ جو شخص بیمار ہو جاتا وہ حضرت ام سلمہ کے پاس ایک برتن بھیجتا وہ اس برتن میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ان مبارک بالوں کو رکھتیں پھر اس برتن میں پانی ڈالتیں اور ان کا دھوون اس بیمار کو پلاتیں، یا وہ آدمی شفا طلب کرنے کے لیے اس پانی سے غسل کرتا اور اس کو اس پانی کی برکت حاصل ہوتی۔
(فتح الباری ج ۱۰ ص ۳٥۳، مطبوعہ لاہور، ۱٤۰۱ھ)

امام حافظ احمد بن علی بن مثنی تمیمی متوفی ۳۰۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عبد الحمید بن جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید نے کہا کہ ہم نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک عمرہ کیا، آپ نے اپنے سر کے بال منڈوائے، لوگ آپ کے بال لینے کی طرف جھپٹے، میں نے آپ کی پیشانی کے بالوں کی طرف سبقت کی، میں نے آپ کے بال لے کر ان کو اپنی ٹوپی میں رکھ لیا اور میں نے ان بالوں کو اپنی ٹوپی کے اگلے حصہ میں رکھا، اس

کے بعد میں جس جنگ میں بھی گیا مجھے فتح حاصل ہوئی۔

(مسند ابویعلی ج ۱۳، رقم الحدیث: ۷۱۸۳، مطبوعہ دار الثقافۃ العربیہ دمشق، ۱۴۱۲ھ)

امام ابو العباس احمد بن ابوبکر بوصیری متوفی ۸۴۰ھ نے اس حدیث کو امام ابو یعلی کے حوالے سے ذکر کر کے کہا ہے کہ امام ابو یعلی نے اس حدیث کو سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(مختصر اتحاف السادۃ المہرۃ بزوائد المسانید العشرۃ ج ۹، رقم الحدیث: ۷۶۶۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۷ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے بھی امام ابو یعلی کی سند سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ (المطالب العالیہ ج ۴ رقم الحدیث: ۴۰۴۴) نیز حافظ عسقلانی نے اس حدیث کو امام سعید بن منصور سے تفصیلا ذکر کیا ہے۔ (اس تفصیل کو ہم امام طبرانی کے حوالے سے ذکر کریں گے) اور امام ابو یعلی کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے۔

(الاصابہ ج ۱ ص ۴۱۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ، الاصابہ ج ۲ ص ۲۱۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عبد الحمید بن جعفر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ یرموک کے دن حضرت خالد بن ولید کی ٹوپی گم ہوگئی، حضرت خالد نے کہا: اس ٹوپی کو ڈھونڈو، لوگوں کو وہ ٹوپی نہیں ملی۔ حضرت خالد نے پھر کہا: اس ٹوپی کو تلاش کرو، تو لوگوں کو وہ ٹوپی مل گئی، وہ ایک پرانی ٹوپی تھی، حضرت خالد نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عمرہ کیا اور اپنا سر منڈوایا، مسلمان آپ کے بالوں کی طرف جھپٹے، میں نے آپ کی پیشانی کے بالوں کی طرف سبقت کی اور ان بالوں کو میں نے اس ٹوپی میں رکھ لیا، پھر میں جس جنگ میں بھی گیا یہ ٹوپی میرے ساتھ رہی اور مجھے فتح عطا کی گئی۔

(المعجم الکبیر ج ۴، رقم الحدیث: ۳۸۰۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حافظ نور الدین الہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ نے لکھا ہے: اس حدیث کو امام ابو یعلی اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور ان دونوں کے راوی صحیح ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۹ ص ۳۴۸) امام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (المستدرک ج ۳، ص ۲۹۹) امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (دلائل النبوۃ ج ۶، ص ۲۴۹) امام ابن الاثیر علی بن محمد الجزری المتوفی ۶۳۰ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۴۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔

(الشفا ج ۱ ص ۲۴۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ اور علامہ خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (شرح الشفا علی ہامش نسیم الریاض ج ۳، ص ۱۳۳) علامہ بدر الدین عینی متوفی ۸۵۵ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۳ ص ۳۷، مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ) اور خاتم الحفاظ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے اس حدیث کا امام سعید بن منصور، امام ابن سعد، امام ابو یعلی، امام حاکم اور امام ابو نعیم کے حوالوں سے ذکر کیا ہے۔

(الخصائص الکبری ج ۱ ص ۱۱۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۰۵ھ)

حضرت یوسف (علیہ السلام) کی قمیص سے حضرت یعقوب کی آنکھوں کی شفایابی کا تو ایک واقعہ ہے اور ہمارے نبی سیدنا محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کپڑوں، آپ کے برتنوں اور آپ کے بالوں سے حصول شفا کے متعدد واقعات ہیں اور یہ آپ کے مبارک بالوں کی برکت تھی کہ حضرت خالد بن ولید کو ہر جنگ میں فتح حاصل ہوتی تھی۔

جانوروں کی حلّت وحرمت کا بیان

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۞ (سورۃ النحل: آیت 8)

''اور گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری اور زیبائش کے لیے پیدا کیے اور وہ ان چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے''۔

گھوڑوں، خچرون اور گدھوں کو اونٹوں، گایوں اور بھیڑوں سے علیحدہ ذکر کرنے کی توجیہ:

اللہ تعالیٰ نے مویشی اور چوپائے ہماری ملکیت میں دے دیے اور ان کو ہمارے لیے مسخر کر دیا اور ہمارے تابع بنا دیا، اور جو شخص جائز اور شرعی طریقہ سے ان جانوروں کا مالک ہو جائے اس کے لیے ان جانوروں کو فروخت کرنا اور ان کو بار برداری کے لیے کرایہ پر دینا جائز ہے، اس سے پہلی آیت میں انعام یعنی اونٹوں، بکریوں اور گایوں کا ذکر فرمایا تھا اور یہ فرمایا تھا ان سے تم گرم کپڑے حاصل کرتے ہو، ان کو کھاتے ہو اور ان پر تم بار برداری کرتے ہو یعنی بوجھ لادتے ہو، اس کے بعد گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا ان سے الگ ایک آیت میں ذکر کیا، اور یہ فرمایا کہ تم ان پر سواری کرتے ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ گھوڑے اور خچر اور گدھے زیادہ تر سواری کے کام آتے ہیں، ان کے جسموں پر اون نہیں ہوتا جس سے لباس بنا جاسکے، نہ ان کا دودھ پیا جاتا ہے، نہ ان کو کھایا جاتا ہے، یہ صرف سواری کے کام آتے ہیں یا بعض اوقات ان پر سامان لاد لیا جاتا ہے، اس کے برخلاف اونٹوں، گایوں اور بھیڑوں سے اون بھی حاصل کیا جاتا ہے، اونٹوں پر سواری بھی کی جاتی ہے، ان پر بوجھ بھی لادا جاتا ہے اور ان کو کھایا بھی جاتا ہے، اس وجہ سے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو ان سے علیحدہ دوسری آیت میں ذکر فرمایا ہے۔

گھوڑوں کا گوشت حرام ہونے کے دلائل:

فقہاء مالکیہ کے نزدیک گھوڑوں کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیت میں انعام یعنی اونٹوں، گایوں اور بھیڑوں کا ذکر کر کے فرمایا ان کو تم کھاتے ہو، اور اس کے بعد گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کا ذکر کر کے فرمایا تا کہ تم ان پر سواری کرو اور ان کے ساتھ کھانے کا ذکر نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو کھانا جائز نہیں ہے۔

امام علی بن عمر الدارقطنی المتوفی 385ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت خالد بن ولید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے پالتو گدھوں، گھوڑوں اور خچروں کو کھانے سے منع فرمایا۔

(سنن الدارقطنی ج4، ص287، رقم الحدیث: 4728، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1417ھ)

واقدی نے کہا یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ حضرت خالد فتح خیبر کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔

امام ابو داوٗد اپنی سند کے ساتھ حضرت خالد بن ولید سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو کھانے سے منع فرمایا اور حیوۃ بن شریح نے یہ اضافہ کیا کہ ہر کچلیوں والے درندے کے گوشت کو کھانے سے منع فرمایا۔

(سنن ابو داوٗد رقم الحدیث:3790،سنن النسائی رقم الحدیث:4342،سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:3198)

امام ابو داوٗد متوفی 275ھ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں: گھوڑوں کا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس حدیث پر عمل نہیں ہے۔ نیز امام ابو داوٗد نے کہا یہ حدیث منسوخ ہے، رسول اللہ کے اصحاب کی ایک جماعت نے گھوڑوں کا گوشت کھایا ہے، ان میں سے حضرت عبداللہ بن الزبیر ہیں، فضالہ بن عبید ہیں، انس بن مالک ہیں، اسماء بنت ابی بکر ہیں، سوید بن غفلہ ہیں، اور رسول اللہ کے عہد میں قریش گھوڑوں کو ذبح کیا کرتے تھے۔

مذکورہ دلائل کے جوابات اور گھوڑوں کا گوشت کھانے کے حلال ہونے کے دلائل:

صحیح یہ ہے کہ گھوڑوں کا گوشت کھانا جائز ہے اور اس آیت سے گھوڑوں کے گوشت کے کھانے کی حرمت پر استدلال کرنا درست نہیں ہے، اور فقہاء مالکیہ نے جو کہا ہے کہ اونٹوں، بکریوں اور گایوں کے بعد فرمایا ہے اور ان کو تم کھاتے ہو اور گھوڑوں اور خچروں کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ تم ان کو کھاتے ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کا کھانا جائز نہیں ہے کیونکہ اس آیت سے پہلے اونٹوں وغیرہ کے بعد ذکر ہے اور تم ان پر سامان لادتے ہو اور گھوڑوں وغیرہ کے ذکر کے بعد سامان لادنے کا ذکر نہیں ہے سو اس طریقہ استدلال سے یہ لازم آئے گا کہ گھوڑوں، خچروں اور گدھوں پر سامان لادنا بھی جائز نہ ہوگا، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، نیز سورۃ النحل مکی ہے اور فتح خیبر تک پالتو گدھوں کا گوشت کھانا حلال تھا اس لیے اس سورت کی آیت سے اس کی حرمت پر استدلال صحیح نہیں ہے، اور گھوڑے کے گوشت کھانے کی حرمت میں جو احادیث پیش کی گئی ہیں وہ سب ضعیف ہیں یا منسوخ ہیں، گھوڑوں کے گوشت کھانے کے جواز پر حسب ذیل احادیث ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ خیبر کے دن نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمادیا اور گھوڑوں کا گوشت کھانے کی رخصت دی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:5520،صحیح مسلم رقم الحدیث 1941،سنن ابو داوٗد رقم الحدیث:3788،سنن الترمذی رقم الحدیث:1793،سنن النسائی رقم الحدیث:4327،سنن الکبری للنسائی رقم الحدیث:14839)

حضرت اسما بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ کے عہد میں ہم نے ایک گھوڑے کو نحر کیا (ذبح کیا) پھر ہم نے اس کو کھالیا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:1942،صحیح البخاری رقم الحدیث:5510،5511،سنن النسائی رقم الحدیث 4406،سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:3190،السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث:6644)

حضرت اسما بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ کے عہد میں ہمارے پاس ایک گھوڑی تھی وہ مرنے لگی تو ہم نے اس کو ذبح کر کے کھالیا۔ (سنن دارقطنی ج ۴،ص 289،رقم الحدیث 4739،دار الکتب العلمیہ بیروت،1417ھ) اس کی سند حسن ہے۔

حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے ہمیں گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور رسول اللہ نے ہمیں

گھوڑوں کا گوشت کھانے کا حکم دیا۔

(سنن دار قطنی ج4،ص289،رقم الحدیث:4737،مطبوعہ بیروت)

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ جس طرح گدھے کے سم ہوتے ہیں اسی طرح گھوڑے کے بھی سم ہوتے ہیں اس لیے اس کو بھی گدھے کی طرح حرام ہونا چاہیے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس نص صریح کے مقابلہ میں ہے اس لیے مردود ہے، جس طرح کوئی یہ کہے کہ گائے اور بیل کی طرح خنزیر کے بھی کھر ہوتے ہیں تو اس کو بھی حلال ہونا چاہیے اس سے بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ قیاس نص کے مقابلہ میں ہے اس لیے مردود ہے۔

گھوڑوں کا گوشت کھانے کے متعلق مذاہب فقہاء

علامہ عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

تمام قسم کے گھوڑوں کا گوشت کھانا حلال ہے، خواہ وہ عربی ہوں یا غیر عربی، امام احمد نے اس کی تصریح کی ہے اور یہی ابن سیرین کا قول ہے، حضرت ابن الزبیر، حسن بصری، عطا اور اسود بن یزید سے بھی یہی منقول ہے، حماد بن زید، ابن المبارک، امام شافعی اور ابوثور کا بھی یہی قول ہے، سعید بن جبیر نے کہا میں نے گھوڑے سے زیادہ پاکیزہ اور لذیذ کوئی گوشت نہیں کھایا، اس کو امام ابوحنیفہ نے حرام کہا ہے اور امام مالک نے مکروہ کہا ہے، اسی طرح اوزاعی اور ابوعبید کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا(النحل:8) اور خالد سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: تم پر پالتو گدھے، گھوڑے اور خچر حرام ہیں، نیز یہ سم والا جانور ہے اس لیے گدھوں کے مشابہ ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت جابر نے کہا کہ رسول اللہ نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کے گوشت سے منع فرما دیا، اور گھوڑوں کے گوشت کی اجازت دے دی، اور حضرت اسما بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ کے عہد میں ہم نے ایک گھوڑے کو ذبح کر کے کھا لیا تھا ہم اس وقت مدینہ میں تھے۔(صحیح بخاری و مسلم) اور اس لیے بھی کہ وہ ایک پاک اور لذیذ گوشت والا جانور ہے نہ کچلیوں سے کھانے والا ہے نہ ناخنوں اور پنجوں سے شکار کر کے کھانے والا ہے تو وہ اونٹ، گائے اور بکری کی طرح ہے، اور وہ ان آیات اور احادیث کے عموم میں داخل ہے جن میں کچلیوں اور پنجوں سے شکار کرنے والے جانوروں کے غیر کو کھانے کی اجازت دی ہے اور آیت سے استدلال اس طرح ہے کہ گھوڑے، خچر اور گدھے تمہاری سواری کرنے کے لیے ہیں نہ کہ کھانے کے لیے اور یہ مفہوم مخالف سے استدلال ہے اور وہ اس کے قائل نہیں ہیں اور حضرت خالد کی حدیث ضعیف ہے۔(المغنی ج9،ص327،328،مطبوعہ دار الفکر بیروت،1405ھ)

گھوڑوں کا گوشت کھانے کے متعلق فقہاء احناف کا موقف:

علامہ محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی 1088ھ لکھتے ہیں:

امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک گھوڑے حلال ہیں، اور امام شافعی (اور اسی طرح امام احمد) کے نزدیک بھی حلال ہیں اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک گھوڑے حلال نہیں ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ وفات سے تین دن پہلے امام ابوحنیفہ نے گھوڑوں کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا، اور اسی پر فتویٰ ہے۔(عمادیہ) اور گھوڑ کا دودھ پینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

الاختیار، قدوری اور ہدایہ میں مذکور ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت کھانا مکروہ ہے، اور مکروہ تحریمی کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو حلال نہ ہو، (شرنبلالیہ) اس سے معلوم ہوا کہ گھوڑا انجاست کی وجہ سے حرام نہیں ہے، اس لیے غایۃ البیان میں ظاہر الروایہ سے نقل کر کے لکھا ہے کہ گھوڑے کا جھوٹا پاک ہے اور اس کا کھانا اس کے احترام کی وجہ سے حرام ہے، کیونکہ گھوڑوں سے اللہ کے دشمنوں کو ڈرایا جاتا ہے، اور نجاست کی وجہ سے اس کا کھانا حرام نہیں ہے، اسی وجہ سے اس کا جھوٹا بھی نجس نہیں ہے جیسے آدمی کا حال ہے، مصنف نے لکھا ہے اسی پر فتوی ہے لہٰذا اس کا کھانا مکروہ تنزیہی ہے اور یہی ظاہر الروایہ ہے جیسا کہ کفایۃ البیہقی میں مذکور ہے، اور یہی صحیح ہے جیسا کہ فخر الاسلام وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ (قہستانی) اور الخلاصہ، الہدایہ، المحیط، المغنی، قاضی خاں اور العمادی اور دیگر متون میں لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اس کا کھانا مکروہ تحریمی ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا کھانا مکروہ تنزیہی ہے تو پھر امام اعظم اور صاحبین میں کوئی اختلاف نہیں رہتا کیونکہ صاحبین اگرچہ گھوڑا کھانے کو حلال کہتے ہیں لیکن وہ اس کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں شرنبلالیہ میں برھان سے اسی طرح منقول ہے اور یہ اختلاف خشکی کے گھوڑے میں ہے اور دریائی گھوڑا بالاتفاق حرام ہے۔

(ردالمختار مع الدرالمختار ج 9 ص 369، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، 1419ھ)

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک گھوڑا کھانے کی کراہت اجتہادی ہے، قرآن اور حدیث کی کسی نص کی بنا پر نہیں ہے، اور کراہت کی وجہ گھوڑے کی تکریم ہے کیونکہ وہ جہاد میں استعمال ہوتا ہے، یعنی اگر لوگوں نے گھوڑوں کو کھا کھا کر ختم کر دیا تو جہاد کس پر بیٹھ کر کریں گے لیکن اب چونکہ جہاد میں گھوڑوں کا استعمال کلیتاً متروک ہو چکا ہے اور جیپ، ٹرک، بکتر بند گاڑی، ٹینک اور توپ وغیرہ کو لڑائی میں استعمال کیا جاتا ہے اس لیے اب گھوڑوں کے گوشت کا کھانا کسی قسم کی کراہت کے بغیر جائز ہے، یہ اور بات ہے کہ ہمارے علاقوں میں گھوڑے کا گوشت کھانے کا رواج نہیں ہے۔

پالتو گدھوں اور خچروں کا گوشت کھانے کے متعلق مذاہب فقہاء

علامہ علاؤ الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی متوفی 1088ھ لکھتے ہیں:

پالتو گدھوں کا کھانا حلال نہیں ہے اس کے برخلاف جنگلی گدھوں کو کھانا جائز ہے ان کا دودھ بھی حلال ہے، اگر خچر کی ماں گدھی ہو تو اس کا کھانا بھی جائز نہیں ہے، اور اگر اس کی ماں گائے ہو تو اس کا کھانا بالاتفاق جائز ہے، اور اگر اس کی ماں گھوڑی ہو تو پھر وہ اپنی ماں کی طرح حلال ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے جانوروں میں حلت اور حرمت کا مدار ماں پر ہوتا ہے، گھوڑی کا گوشت کھانے میں اختلاف ہے، آیا اس کا گوشت کھانا مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی ہے یا بلا کراہت جائز ہے تو گر خچر کی ماں گھوڑی ہو تو خچر کا گوشت کھانے کا بھی وہی حکم ہے جو اس کی ماں کا ہے۔

(الدرالمختار مع ردالمختار ج 9 ص 369، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، 1419ھ)

پالتو گدھوں کی حرمت پر احادیث:

حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خیبر کے دن پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع فرما دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 5521، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 3825، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 561)

حضرت ابوثعلبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے پالتو گدھوں کے گوشت کو حرام فرمادیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 5527، صحیح مسلم رقم الحدیث: 1936، سنن النسائی رقم الحدیث: 4334)

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ کے پاس ایک آنے والا آیا اور کہا گدھوں کا گوشت کھایا گیا، پھر ایک اور آنے والا آیا اور کہا گدھوں کا گوشت کھایا گیا، پھر ایک اور آنے والا آیا اور کہا گدھے ختم ہوگئے۔ تب آپ نے ایک منادی کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں یہ اعلان کرے کہ بیشک اللہ اور اس کا رسول تم کو پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع کرتے ہیں کیونکہ یہ ناپاک ہے، پھر دیگچیاں الٹ دی گئیں حالانکہ اس وقت ان میں گوشت ابل رہا تھا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: 5528، سنن الترمذی رقم الحدیث: 3920، مسند احمد رقم الحدیث: 13171، عالم الکتب موطا رقم الحدیث: 290)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں اس حدیث سے یہ واضح ہوگیا کہ گدھوں کے گوشت کو اس لیے نہیں حرام کیا گیا کہ سواریوں اور مال لادنے میں کمی کا خطرہ تھا، بلکہ آپ نے اس کو اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ گدھے نجس ہیں۔

(فتح الباری ج 9 ص 655 مطبوعہ لاہور، 1401ھ)

گھوڑوں میں زکوۃ کے متعلق احادیث:

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مسلمان کے گھوڑے اور اس کے غلام میں زکوۃ نہیں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 1463، صحیح مسلم رقم الحدیث: 982، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 1595، 1594،
سنن الترمذی رقم الحدیث: 628، سنن النسائی رقم الحدیث: 2467، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1812)

حضرت علی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا میں نے گھوڑے اور غلام میں (زکوۃ کو) معاف کردیا ہے، پس تم چاندی کی زکوۃ ادا کرو ہر چالیس درہم سے ایک درہم، اور ایک سو نوے درہم تک کوئی چیز لازم نہیں ہے، اور جب دو سو درہم ہوجائیں تو ان پر پانچ درہم زکوۃ ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 1693، سنن الترمذی رقم الحدیث: 620، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 1790)

حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا جنگلوں کی گھاس چرنے والوں گھوڑوں میں سے ہر گھوڑے پر ایک دینار ادا کیا جائے گا۔

(سنن الدارقطنی ج 2 ص 109، رقم الحدیث: 2000 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، 1417ھ)

اس کی سند میں غورک بن جعفر منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔

حارثہ بن مضرب بیان کرتے ہیں کہ مصر کے لوگ حضرت عمر بن خطاب کے پاس آئے اور کہا ہمیں گھوڑے اور غلام ملے ہیں اور ہم ان کی زکوۃ ادا کرنا چاہتے ہیں، حضرت عمر نے کہا مجھ سے پہلے دو صاحبوں نے ایسا نہیں کیا، اور میں بغیر مشورہ کے زکوۃ نہیں لوں گا، پھر انھوں نے سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب سے مشورہ کیا، انھوں نے کہا یہ اچھا کام ہے، اور حضرت علی خاموش رہے، حضرت عمر نے کہا اے ابوالحسن! آپ نے کچھ نہیں کہا، حضرت علی نے کہا آپ کو اصحاب نے یہ مشورہ دے دیا ہے کہ یہ اچھا کام

ہے، بشرطیکہ یہ ایسا جزیہ لازمہ نہ بن جائے جو آپ کے بعد وصول کیا جائے، پھر حضرت عمر نے ایک غلام سے دس درہم لیے اور ان کو ہر مہینہ دو جریب (آٹھ بوری) گندم وظیفہ دیا، اور ایک گھوڑے سے دس درہم لیئے اور ان کو ہر مہینہ دس جریب (چالیس بوری) جو دیے اور معمولی گھوڑوں سے آٹھ درہم لیے اور ان کو ہر مہینہ آٹھ جریب (بتیس بوری) جو دیے، اور خچروں سے پانچ درہم فی خچر لیے اور ان کو ہر مہینہ پانچ جریب (بیس بوری) جو دیے ۔ (سنن دارقطنی ج 2، ص 110، رقم الحدیث : 2001، مجمع الزوائد ج 2، ص 69) اس حدیث کی سند صحیح ہے ۔

گھوڑوں میں زکوۃ کے متعلق مذاہب فقہاء

علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں :

اکثر اہل علم کے نزدیک اونٹوں، گایوں اور بکریوں کے علاوہ اور کسی مویشی پر زکوۃ واجب نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ نے کہا اگر گھوڑے نر اور مادہ ہوں تو ان پر زکوۃ ہے اور اگر وہ صرف نر ہوں یا صرف مادہ ہوں تو ان میں دو قول ہیں، اور ان کی زکوۃ یہ ہے کہ ہر گھوڑے کی طرف سے ایک دینار دیا جائے، یا اس کی قیمت کا چالیسواں حصہ دیا جائے، اور یہ مالک کی مرضی ہے کہ وہ جو زکوۃ چاہے ادا کرے، کیونکہ حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے جنگلوں کی خود رو گھاس چرنے والے گھوڑوں میں سے ہر ایک گھوڑے میں ایک دینار ہے اور حضرت عمر سے مروی ہے کہ وہ ہر غلام سے دس درہم لیتے اور ہر گھوڑے سے دس درہم لیتے اور ہر خچر سے پانچ درہم لیتے، نیز گھوڑا ایک ایسا حیوان ہے جس کو جنگلوں کی خود رو گھاس کھلا کر اس سے بڑھوتری اور افزائش کو طلب کیا جاتا ہے لہذا وہ بکریوں کے مشابہ ہے ۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا : مسلمان کے گھوڑے اور اس کے غلام میں زکوۃ نہیں ہے، اور حضرت علی بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے تمہارے لیے گھوڑوں اور غلام کا صدقہ معاف کر دیا، یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے ۔

(المغنی ج 2، ص 255، 254، مطبوعہ دارالفکر بیروت، 1405ھ)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی 855ھ لکھتے ہیں :

امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد یہ کہتے ہیں کہ گھوڑوں میں بالکل زکوۃ نہیں ہے، اور ان کا استدلال اس حدیث سے ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میں نے گھوڑوں کی زکوۃ کو معاف کر دیا ہے، اور امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ جب جنگلوں کی گھاس کھانے والے گھوڑے نر اور مادہ ہوں تو ان کے مالک کو اختیار ہے اگر وہ چاہے تو ہر گھوڑے کی طرف سے ایک دینار دے اور اگر وہ چاہے تو ان کی قیمت نکال کر ان کا چالیسواں حصہ زکوۃ نکال دے ہر دو سو درہم سے پانچ درہم ادا کرے ۔ امام ابوحنیفہ کا استدلال امام دارقطنی کی روایت سے ہے جس میں مذکور ہے کہ حضرت عمر نے صحابہ کے مشورہ سے ہر گھوڑے سے دس درہم لیے ۔ (سنن دارقطنی رقم الحدیث : 2001) نیز امام ابوحنیفہ کا استدلال اس حدیث سے ہے :

امام محمد کتاب الآثار میں اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ ابراہیم نخعی نے کہا کہ وہ گھوڑے جو جنگلوں کی خود رو گھاس کھاتے ہوں اور ان کی نسل میں افزائش مقصود ہو تو اگر تم چاہو تو ہر گھوڑے سے ایک دینار لو، یا دس درہم لو، اور اگر تم چاہو تو ان کی قیمت

سے چالیسواں حصہ لے لو، (کتاب الآثار ص 47) اور حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جنگلوں کی خود رو گھاس کھانے والے گھوڑوں میں سے ہر گھوڑے میں ایک دینار ہے، امام بیہقی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے کیونکہ اس کی سند میں ابو یوسف ہیں اور وہ مجہول ہیں، علامہ عینی فرماتے ہیں یہ ابو یوسف قاضی یعقوب ہیں جو امام اعظم کے مشہور شاگرد ہیں ان کو مجہول قرار دینا امام بیہقی کا پرلے درجہ کا تعصب ہے۔

اور علامہ عینی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے گھوڑوں کا ذکر کر کے فرمایا ایک وہ شخص جس نے گھوڑے کو غنا کے لیے اور سوال سے بچنے کے لیے باندھا پھر وہ اس گھوڑے کی گردن اور اس کی پشت میں اللہ کے حق کو نہیں بھولا تو وہ گھوڑا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کا موجب ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 2860، صحیح مسلم رقم الحدیث: 987، مسند احمد رقم الحدیث: 9865، عالم الکتب) اس حدیث میں اللہ کے حق سے مراد زکوۃ ہے۔ (شرح ابو داؤد ج 6 ص 258، 255، مکتبہ الریاض، 1420ھ)

جن احادیث میں ہے کہ گھوڑے میں زکوۃ نہیں ہے یا فرمایا میں نے گھوڑوں کی زکوۃ کو معاف کر دیا اس گھوڑے سے، مراد غازی فی سبیل اللہ اور مجاہد کا گھوڑا ہے ان سے مراد وہ گھوڑے نہیں جن کو افزائش نسل کے لیے رکھا جاتا ہے اور ان کو جنگلوں کی خود رو گھاس کھلائی جاتی ہے۔ (شرح ابو داؤد ج 6 ص 295، مکتبہ الریاض، 1420ھ)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٤﴾ (سورۃ النحل: 14)

”اور وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تم اس میں سے زیور نکالتے ہو جن کو تم پہنتے ہو، اور تم اس میں کشتیوں کو دیکھتے ہو جو پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں، تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر ادا کرو“۔ (النحل: 14)

سمندر میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

اس سورت کی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت اور اپنی توحید پر مختلف طریقوں سے استدلال فرمایا ہے، پہلے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کے اجسام سے اپنی الوہیت اور اپنی توحید پر استدلال فرمایا، پھر انسان کے بدن اور اس کی روح سے استدلال فرمایا، پھر تیسری بار حیوانات کی مختلف قسموں اور ان کے عجائب وغرائب سے استدلال فرمایا، اور چوتھی بار نباتات سے استدلال فرمایا اور اس کے ضمن میں سورج اور چاند اور دن اور رات سے استدلال فرمایا اور اب سمندر سے استدلال فرمایا ہے۔ سمندر کے بیشمار منافع اور فوائد ہیں اللہ

تعالیٰ نے ان میں سے یہاں تین منافع اور فوائد کا ذکر فرمایا ہے۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ تم سمندر سے تر و تازہ گوشت کھاتے ہو، اس سے مراد مچھلیاں ہیں اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تم سمندر سے موتی، یاقوت اور مونگے وغیرہ نکالتے ہو اور ان سے خواتین کے زیورات بناتے ہو، اور تیسرا فائدہ یہ ہے کہ تم سمندر میں کشتیاں چلاتے ہو اور ان میں بیٹھ کر سفر کرتے ہو اور اپنا مال و متاع ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے ہو۔

سمندر کی تسخیر کا معنی

سمندر کو مسخر کرنے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سمندر میں تصرف کرنے پر قادر کر دیا وہ اس میں تیر سکتے ہیں، کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت عظیم نعمت ہے، وہ وا گر چاہتا تو سمندر کو انسانوں کے اوپر مسلط کر دیتا اور سمندر لوگوں کو غرق کر دیتا اور ان کے لیے سمندر میں تیرنا، کشتیوں کے ذریعہ اس میں سفر کرنا کچھ بھی ممکن نہ ہوتا، اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام اور اس کا احسان ہے کہ اس نے سمندر کو ایسا بنا دیا کہ انسان آسانی کے ساتھ اس سے فوائد کو حاصل کر سکتا ہے۔

کڑوے پانی میں لذیذ مچھلی کا پیدا کرنا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ، تر و تازہ فرمانے میں یہ اشارہ ہے کہ اس کو جلدی کھا لینا چاہیے، ورنہ یہ گوشت سڑ کر خراب ہو جائے گا، نیز تر و تازہ فرمانے میں یہ اشارہ ہے کہ انسان اس کو کھانے میں رغبت کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا اظہار ہے کیونکہ سمندر کا پانی سخت کھاری اور کڑوا ہوتا ہے، انسان اس کا ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتا، اور اس کھاری اور کڑوے پانی میں پیدا ہونے والی اور پلنے بڑھنے والی مچھلی کے گوشت میں کھاری پن اور کڑواہٹ کا ذائقہ بھی نہیں ہوتا اور اس کا گوشت بہت خوش ذائقہ اور لذیذ ہوتا ہے، پس سبحان ہے وہ ذات جو ایک چیز میں اس کی ضد پیدا کر دیتا ہے۔

مچھلی پر گوشت کے اطلاق کی بحث

اس آیت میں مچھلی کو لحماً طریاً یعنی تر و تازہ گوشت فرمایا ہے، لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک مچھلی پر گوشت کا اطلاق نہیں ہوتا، امام ابو بکر جصاص متوفی 370ھ لکھتے ہیں: اس میں فقہا کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر کسی شخص نے قسم کھائی کہ وہ لحم (گوشت) نہیں کھائے گا اور اس نے مچھلی کھالی تو وہ حانث نہیں ہوگا یعنی اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو لحماً طریاً (تر و تازہ گوشت) فرمایا ہے۔(احکام القرآن ج 3، ص 184، مطبوعہ لاہور، 1400) امام اعظم کی دلیل یہ ہے کہ مچھلی میں خون نہیں ہوتا اور عرف میں گوشت اس کو کہتے ہیں جو خون سے بنتا ہے، نیز مچھلی کے گوشت میں گائے، بکری اور مرغی کے گوشت کی طرح قوت نہیں ہوتی، لیکن دوسرے فقہا نے اس مسئلہ میں امام اعظم سے اختلاف کیا ہے اور وہ مچھلی کے گوشت پر بھی گوشت کا اطلاق کرتے ہیں، امام رازی شافعی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صراحت سے مچھلی پر لحم کا اطلاق فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بیان کے اوپر کس کا بیان ہو سکتا ہے، نیز امام رازی فرماتے ہیں: لغت اور عرف میں مچھلی پر گوشت کا اطلاق کرنا حقیقت ہے مجاز نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر، ج 7، ص 188، مطبوعہ بیروت 1415ھ)

سمندری جانوروں کے کھانے کے متعلق مذاہب فقہا

اس آیت میں چونکہ سمندر کے تروتازہ گوشت کا ذکر آگیا ہے، اس لیے ہم یہاں مچھلی اور سمندر کے دیگر جانوروں کا حکم بیان کرنا چاہتے ہیں:

علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

جو جانور پانی کے بغیر زندہ نہیں رہتے جیسے مچھلی اور اس کے مشابہ دیگر جانور، ان کو بغیر ذبح کیے ہوئے کھانا جائز ہے، ہم کو اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہے اور روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: ہمارے لیے دو مردہ جانور اور دو خون حلال کیے گئے ہیں، رہے وہ مردہ جانور تو وہ مچھلی اور ٹڈی ہیں۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 3218) اور صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہ اور ان کے اصحاب نے ساحل سمندر پر ایک مرا ہوا جانور پڑا دیکھا جس کو عنبر کہا جاتا تھا، وہ ایک ماہ تک اس مچھلی کو کھاتے رہے، حتیٰ کہ خوب موٹے ہو گئے، اور جب وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچے اور اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ کا رزق تھا جو اس نے تمہیں دیا تھا کیا تمہارے پاس اس کے گوشت میں سے کچھ ہے تو تم ہمیں وہ کھلاؤ۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 5494۔ 5493، سنن الترمذی رقم الحدیث 435)

امام شافعی کے نزدیک مینڈک کے سوا سمندر کے تمام جانوروں کا شکار حلال ہے اور حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا: سمندر میں جتنے جانور ہیں ان کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

احل لکم صید البحر وطعامہ۔

(تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا طعام حلال کر دیا گیا) المائدہ: 96

سمندر کے تمام جانوروں کے حلال ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے، عطا اور عمرو بن دینار بیان کرتے ہیں کہ ان کو یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بیشک اللہ نے ابن آدم کے لیے سمندر میں ہر چیز کو ذبح کر دیا ہے، رہا مینڈک تو امام نسائی نے راویت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے، سو یہ حدیث مینڈک کی تحریم پر دلالت کرتی ہے اور رہا مگرمچھ تو آپ سے ایسی حدیث منقول ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس کو نہ کھایا جائے، اور امام اوزاعی نے یہ کہا ہے کہ جس شخص کو مگرمچھ کھانے کی خواہش ہو وہ اس کو کھا سکتا ہے، اور ابن ماجہ نے یہ کہا ہے کہ مگرمچھ اور شارک مچھلی کو نہیں کھایا جائے گا کیونکہ وہ انسانوں کو کھا جاتے ہیں اور ابراہیم نخعی نے کہا ہے کہ سمندری درندوں کو کھانا مکروہ تحریمی ہے جس طرح خشکی کے درندوں کو کھانا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہر کچلیوں سے پھاڑنے والے درندے کو کھانے سے منع فرمایا ہے، اور ابو علی النجار نے کہا ہے کہ جس جانور کی نظیر خشکی میں حرام ہے اس کی نظیر سمندر میں بھی حرام ہے، جیسے سمندری کتا، سمندری خنزیر اور سمندری انسان، اور امام ابوحنیفہ نے کہا: مچھلی کے سوا کوئی سمندری جانور حلال نہیں ہے اور امام مالک نے کہا کہ سمندر کا ہر جانور حلال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا ہے: تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا طعام حلال کر دیا گیا۔

(علامہ ابن قدامہ حنبلی فرماتے ہیں) ہم اس آیت کے عموم اور حدیث سے استدلال کرتے ہیں، عبداللہ نے کہا میں نے اپنے

والد سے سمندری کتے کے متعلق پوچھا تو انھوں نے عمرو بن دینار اور ابی الزبیر سے روایت کیا کہ ایک شخص نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ سمندر کی ہر چیز ذبح کی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں میں نے اس کا عطا سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا رہے پرندے تو ہم ان کو ذبح کرتے ہیں۔ ابو عبداللہ نے کہا ہم سمندری کتے کو ذبح کریں گے۔

(المغنی ج9ص239،مطبوعہ دار الفکر بیروت،1405ھ)

سمندری جانوروں کو کھانے کے متعلق مذہب احناف:

امام علاء الدین ابو بکیر بن مسعود کاسانی حنفی متوفی 587ھ لکھتے ہیں:

حیوان کی اصل میں دو قسمیں ہیں: ایک وہ قسم ہے جو سمندر میں زندہ رہتی ہے اور ایک وہ قسم ہے جو خشکی میں زندہ رہتی ہے، رہے وہ جانور جو سمندر میں زندہ رہتے ہیں تو مچھلی کے سوا سمندر کے تمام جانوروں کا کھانا حرام ہے، مچھلی کا کھانا حلال ہے البتہ جو مچھلی طبعی موت مر کر سطح آب پر ابھرے آئے اس کا کھانا حلال نہیں ہے، یہ ہمارے اصحاب کا قول ہے اور ابن ابی لیلی نے کہا کہ مچھلی کے علاوہ مینڈک، کیکڑے، سمندری سانپ، سمندری کتے اور سمندری خنزیر وغیرہ کو بھی کھانا جائز ہے لیکن ذبح کر کے اور لیث بن سعد کا بھی یہی قول ہے لیکن انھوں نے کہا کہ سمندری انسان اور سمندری خنزیر کا کھانا جائز نہیں ہے، اور امام شافعی نے کہا یہ تمام جانور بغیر ذبح کے حلال ہیں، ان کو پکڑنا ہی ان کو ذبح کرنا ہے اور جو مچھلی مر کر سطح آب پر آجائے وہ بھی حلال ہے۔

ائمہ ثلاثہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ تمہارے لیے سمندری شکار اور اس کا طعام حلال کر دیا گیا ہے۔ (المائدہ: 96) اور شکار کا اطلاق مچھلی کے علاوہ سمندر کے دوسرے جانوروں پر بھی ہوتا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ سمندر کے تمام جانور حلال ہوں، اور جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سمندر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اس کا پانی پاک کرنے والا ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: 69،سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: 83،سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 386،سنن دارمی رقم الحدیث 735،مسند احمد ج2ص237)

اس حدیث میں آپ نے مطلقاً سمندر کے مردار کو حلال فرمایا ہے خواہ وہ مچھلی ہو یا کوئی اور جانور ہو۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

حرمت علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر۔

(تم پر مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت حرام کیا گیا ہے۔ (المائدہ: 3)

اس آیت میں مطلقاً مردہ جانور کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے خواہ خشکی کا مردہ جانور ہو یا سمندر کا۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ویحرم علیھم الخبائث۔ (وہ نبی پر خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں) الاعراف: 157۔

اور مینڈک، کیکڑا، سانپ وغیرہ خبیث جانور ہیں، اور روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا گیا کہ مینڈک کی چربی کو دوا میں استعمال کیا جاتا ہے تو آپ (علیہ السلام) نے فرمایا وہ خبائث میں سے ایک خبیث جانور ہے (یہ جزئیات سے قاعدہ کلیہ پر استدلال ہے) اور انھوں نے جو اس آیت سے استدلال کیا ہے: احل لکم صید البحر وطعامہ، المائدہ 96۔ اس آیت میں صید سے مراد مصید

ہے یعنی شکار کیا ہوا اور یہ اطلاق مجازی ہے اور شکار اس کو کہتے ہیں جو جانور گھبرا کر بھاگ رہا ہو اور بغیر حیلہ کے اس کو پکڑا نہ جا سکتا ہو، یا تو وہ اڑ جائے یا بھاگ جائے اور یہ حالت شکار کے وقت ہوتی ہے پکڑنے کے بعد نہیں ہوتی کیونکہ اس کے بعد تو وہ گوشت ہو جاتا ہے اور حقیقتاً شکار نہیں رہتا اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کا عطف اس آیت پر ہے:

وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرما۔

اور تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا ہے جب تک محرم ہو۔(المائدہ:96)

اور اس سے مراد محرم کا شکار کرنا ہے نہ کہ اس کا کھانا کیونکہ محرم اگر خود شکار نہ کرے اور نہ شکار کا حکم دے تو اس کے لیے غیر محرم کا کیا ہوا شکار کھانا جائز ہے، اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ اس آیت میں کھانے کی اباحت نہیں ہے، بلکہ یہ آیت اس لیے ذکر کی گئی ہے تا کہ محرم کو بتایا جائے کہ خشکی کے شکار اور سمندر کے شکار میں فرق ہے اول الذکر محرم کے لیے ممنوع ہے اور ثانی الذکر جائز ہے (علامہ کاسانی کی یہ دلیل بے سود ہے کیونکہ جب محرم ہر قسم کے سمندری جانور کا شکار کر سکتا ہے تو اس کو کھا بھی سکتا ہے کیونکہ محرم کے لیے صرف خشکی کے جانور کو شکار کر کے کھانا ممنوع ہے اور سمندری جانور کو شکار کر کے کھانا ممنوع ہے)

اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو فرمایا ہے اور سمندر کا مردار حلال ہے اس سے آپ کی مراد خصوصیت کے ساتھ مچھلی ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا ہے ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں دو مردار مچھلی اور ٹڈی اور دو خون جگر اور تلی ہیں، اس حدیث میں آپ نے مردار کی تفسیر مچھلی اور ٹڈی سے کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ سمندری مردار سے آپ کی مراد مچھلی ہے۔

رہا دوسرا مسئلہ کہ مچھلی طبعی موت سے مر کر پانی پر ابھر آئے تو وہ امام شافعی کے نزدیک حلال ہے، انھوں نے اس پر وطعامہ سے استدلال کیا ہے یعنی تمہارے لیے سمندر کا شکار کیا ہوا جانور بھی حلال ہے اور جس کا شکار نہ کیا گیا ہو وہ بھی حلال ہے اور جو مچھلی طبعی موت مر کر پانی کے اوپر آ جائے وہ شکار نہیں کی گئی اور وہ طعامہ میں داخل ہے اور نیز آپ نے فرمایا سمندری مردار حلال ہے اور اس میں آپ نے اس مچھلی کا استثنا نہیں کیا جو مر کر سطح آب پر آ جائے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو مچھلی مر کر پانی کے اوپر آ جائے اس کو مت کھاؤ۔(مصنف ابن ابی شیبہ ج4ص248) اور حدیث میں جو آپ نے فرمایا ہے کہ سمندری مردار حلال ہے اس سے آپ کی مراد اس مچھلی کا غیر ہے جو طبعی موت سے مر کر سطح آب پر آ جائے۔

(بدائع الصنائع ج6ص178۔173، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، 1418ھ)

فقہا احناف نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ قرآن مجید میں ہے کہ وہ ان پر خبیث چیزیں حرام کرتے ہیں اور مچھلی کے سوا تمام سمندری جانور خبیث ہیں یعنی طبائع سلیمہ اس سے متنفر ہوتی ہیں، اس دلیل پر یہ اعتراض ہے کہ طبائع سلیمہ کا تنفر ایک اضافی چیز ہے، ہم چوہے، چھپکلی، سانپ اور گرگٹ وغیرہ سے متنفر ہوتے ہیں لیکن چینی اور جاپانی ان کو بڑے شوق سے اور رغبت سے کھاتے ہیں، اسی طرح ائمہ ثلاثہ اور ان کے مقلدین تمام سمندری جانوروں کو بڑے شوق اور رغبت سے کھاتے ہیں، پھر دیکھیے امام ابوحنیفہ کے نزدیک مچھلی کے سوا تمام سمندری جانور حرام ہیں اور ان کے مقلدین زیادہ تر خشکی کے علاقوں میں رہتے ہیں جیسے ہندوستان، پاکستان، افغانستان، وسط ایشیا کی ریاستیں اور ترکی وغیرہ اور ائمہ ثلاثہ کے مقلدین زیادہ تر سمندری جزائر میں رہتے ہیں جیسے انڈونیشیا، ملیشیا، جزائر مالدیپ وغیرہ

اور وہاں ائمہ ثلاثہ کے فیضان سے مستفید ہوتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی نہایت حکمت بالغہ ہے۔

گوشت کو کمی اور زیادتی کے ساتھ فروخت کرنے میں مذاہب فقہاء:

اس آیت میں تر و تازہ گوشت کا ذکر ہے اس لیے ہم نے مچھلی اور سمندر کے دیگر جانوروں کے متعلق مذاہب فقہا بیان کیے ہیں، اس مناسبت سے اب ہم گوشت کی خرید و فروخت کے متعلق بھی مذاہب فقہا بیان کرنا چاہتے ہیں، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک تمام جانوروں کا گوشت ایک جنس ہے، اس لیے ہر قسم کے گوشت کی دوسرے گوشت کے ساتھ مساوی بیع ضروری ہے اور کمی اور زیادتی کے ساتھ بیع جائز نہیں ہے، مثلاً ایک کلو بکری کے گوشت کی اگر گائے یا اونٹ کے گوشت کے بدلہ میں بیع کی جائے تو ضروری ہے کہ گائے یا اونٹ کا گوشت بھی ایک کلو ہو، اگر ایک کلو بکری کے گوشت کے مقابلہ میں دو کلو گائے کا گوشت ہو تو یہ ان کے نزدیک سود ہوگا، اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک جس طرح بکری، گائے اور اونٹ الگ الگ جنس ہیں اسی طرح ان کے گوشت بھی الگ الگ اجناس ہیں اور ایک جنس کے گوشت کو دوسری جنس کے ساتھ کمی اور زیادتی کے ساتھ فروخت کیا جاسکتا ہے، البتہ بکری اور بھیڑ، گائے اور بھینس، عربی اونٹ اور بختی اونٹ ایک جنس کی اصناف ہیں اور ان کے گوشت کی بیع مساوی گوشت کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔

علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوجہ 620ھ لکھتے ہیں:

تمام گوشت ایک جنس ہیں اور ان کی انواع مختلف ہیں، اس سلسلہ میں امام احمد سے دو روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ گوشت کی چار اجناس ہیں، ایک جنس اونٹ، گائے اور بکری ہیں، دوسری جنس وحشی جانور ہیں (مثلاً نیل گائے، ہرن بارہ سنگھا وغیرہ) تیسری جنس پرندے ہیں اور چوتھی جنس پانی کے جانور ہیں اسی طرح ان کے گوشت کی چار اجناس ہیں، البتہ امام مالک اونٹ، گائے، بکری اور وحشی جانوروں کو ایک جنس قرار دیتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک گوشت کی تین اجناس ہیں، امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ گوشت کا مختلف اجناس ہونا ان کی اجناس کے تابع ہے مثلاً اونٹ، گائے اور بکری الگ الگ اجناس ہیں تو ان کا گوشت بھی الگ الگ جنس ہے اور یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔

(المغنی ج4 ص40 مطبوعہ دارالفکر بیروت 1405ھ)

گوشت کو کمی اور زیادتی کے ساتھ فروخت کرنے میں مذہب احناف۔

علامہ عبدالواحد کمال ابن ہمام حنفی متوفی 861ھ لکھتے ہیں:

مختلف اجناس کے گوشت کو ایک دوسرے کے ساتھ کمی اور زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، اور مصنف کی مراد یہ ہے کہ اونٹ، گائے اور بکری کے گوشت کو ایک دوسرے کے ساتھ کمی اور زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ گوشت مختلف اجناس ہیں جس طرح ان کے اصول مختلف اجناس ہیں، لیکن گائے اور بھینس ایک جنس ہے، اس لیے گائے کے گوشت کو بھینس کے گوشت کے ساتھ کمی اور زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح بکرا اور دنبہ اور عربی اونٹ اور بختی اونٹ ایک جنس ہے، اس لیے ایک کے گوشت کو دوسرے کے گوشت کے ساتھ کمی اور زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ ان کی ایک جنس ہے۔

(فتح القدیر ج7 ص34۔ مطبوعہ دارالفکر بیروت، 1415ھ)

زیورات کے متعلق احادیث

اللہ تعالیٰ نے سمندر کی دوسری نعمت یہ بتائی اور تم اس میں سے زیورات نکالتے ہو جن کو تم پہنتے ہو، اس سے مراد موتی اور مرجان ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یخرج منھما اللولو والمرجان۔ (ان سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں) الرحمن: 22۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی 256ھ روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمن بن ابی لیلی بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت حذیفہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے پانی مانگا تو ایک مجوسی پانی لایا، جب اس نے پیالہ ان کے ہاتھ میں رکھا تو انھوں نے وہ پیالہ اٹھا کر پھینک دیا اور کہا میں نے اس کو کئی مرتبہ منع کیا ہے کہ چاندی کے پیالہ میں پانی مت دیا کرو، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ریشم اور دیباج مت پہنو اور سونے اور چاندی کے پیالوں میں مت پیو، اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھاؤ، کیونکہ یہ ان کے لیے دنیا میں ہیں اور ہمارے لیے آخرت میں ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 5426، صحیح مسلم رقم الحدیث: 2067، سنن النسائی رقم الحدیث 5301)

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے بعض عجمیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا، آپ کو بتایا گیا کہ وہ اسی خط کو قبول کرتے ہیں جس پر مہر لگی ہوئی ہو، تو آپ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: 5872، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4214، سنن الترمذی رقم الحدیث 2718، سنن النسائی رقم الحدیث: 5216، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 3641)

حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے سونے کی انگوٹھی بنائی اور اس کا نگینہ ہتھیلی کے باطن کی طرف رکھا، اور اس میں محمد رسول اللہ نقش کرایا، جب صحابہ نے یہ دیکھا تو انھوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوالیں، جب رسول اللہ نے یہ دیکھا کہ انھوں نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوالیں ہیں تو آپ نے اس انگوٹھی کو اتار دیا، اور فرمایا میں اس کو کبھی نہیں پہنوں گا، پھر آپ نے ایک چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں محمد رسول اللہ نقش تھا، پھر اس کے بعد حضرت ابوبکر نے وہ انگوٹھی پہنی، اور ان کے بعد حضرت عمر نے، پھر حضرت عثمان نے اس انگوٹھی کو پہنا حتی کہ وہ انگوٹھی اریس نامی کنوئیں میں گرگئی۔

(صحیح بخاری رقم الحدیث: 5866، صحیح مسلم رقم الحدیث: 2092، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4218، سنن الترمذی رقم الحدیث: 1741، سنن النسائی رقم الحدیث: 5305)

حضرت بریدہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک شخص آیا اور اس نے پیتل کی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، آپ نے اس سے فرمایا کیا وجہ ہے کہ مجھے تم سے بتوں کی بو آرہی ہے اس نے اس انگوٹھی کو پھینک دیا، وہ پھر آیا تو اس کے ہاتھ میں لوہے کی انگوٹھی تھی، آپ نے فرمایا کیا وجہ ہے میں تمہارے اوپر دوزخیوں کا زیور دیکھ رہا ہوں، اس نے اس انگوٹھی کو بھی پھینک دیا پھر کہا یا رسول اللہ میں کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟ آپ نے فرمایا ایک مثقال سے کم چاندی کی انگوٹھی بناؤ۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4223، سنن الترمذی رقم الحدیث: 1785، سنن النسائی، رقم الحدیث 5210)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس نجاشی کی طرف سے وہ زیورات آئے جو اس نے آپ کو

ہدیہ کیے تھے، ان میں سونے کی ایک انگوٹھی تھی جس میں حبشی نگینہ تھا، رسول اللہ نے ان سے اعراض کرتے ہوئے ایک چھڑی یا اپنی انگلیوں سے ایک انگوٹھی اٹھائی پھر حضرت زینب کی صاحبزادی حضرت امامہ بنت ابی العاص کو بلا کر فرمایا: اے بیٹا تم یہ انگوٹھی پہن لو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4235، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 3644، مسند ابویعلی رقم الحدیث: 4470)

حضرت ابوموسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا: میری امت کے مردوں پر ریشم اور سونا پہننا حرام کر دیا گیا ہے اور میری امت کی عورتوں پر حلال کر دیا گیا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: 1720، مصنف ابن ابی شیبہ ج 8 ص 832، مسند احمد ج 4 ص 394، سنن النسائی رقم الحدیث: 5163)

زیورات کے متعلق فقہی احکام:

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی المتوفی 593ھ لکھتے ہیں:

مردوں کے لیے سونے کے زیورات پہننا جائز نہیں ہے جیسا کہ حدیث میں گزر چکا ہے اور چاندی کے زیورات پہننا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ وہ بھی اسی کے حکم میں ہیں، البتہ چاندی کی انگوٹھی اور منطقہ (کمر کی پیٹی) اور تلوار کا زیور چاندی کا بنانا جائز ہے، اور چاندی نے سونے سے مستغنی کر دیا کیونکہ وہ دونوں ایک جنس سے ہیں، اور الجامع الصغیر میں ہے کہ صرف چاندی کی انگوٹھی بنائی جائے اور اس میں یہ تصریح ہے کہ پتھر، لوہے اور پیتل کی انگوٹھی بنانا جائز نہیں ہے، اور مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھی پہننا حرام ہے اور عورتوں کے لیے جائز ہے کیونکہ زینت ان کا حق ہے، صرف قاضی اور سلطان کے لیے انگوٹھی بنائی جائے کیونکہ ان کو مہر لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے غیر کے لیے انگوٹھی نہ پہننا افضل ہے، کیونکہ ان کو ضرورت نہیں ہے، سونے سے دانت نہ باندھا جائے چاندی سے باندھا جائے، یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے اور امام محمد کے نزدیک سونے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور امام ابو یوسف کے اس میں دو قول ہیں۔

صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عرفجہ بن اسعد الکنانی کی جنگ کلاب میں ناک کٹ گئی، انھوں نے چاندی کی ناک بنالی تو اس میں بدبو ہوگئی تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انھیں یہ حکم دیا کہ وہ سونے کی ناک بنا کر لگالیں۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: 4232۔ سنن الترمذی رقم الحدیث 1770، سنن النسائی رقم الحدیث 5176، مسند احمد ج 5 ص 133، مصنف ابن ابی شیبہ ج 8 ص 499، مسند ابویعلی رقم الحدیث 1501، المعجم الکبیر ج 17 ص 457، صحیح ابن حبان رقم الحدیث 5462، سنن بیہقی ج 2 ص 425) نابالغ لڑکوں کو سونا اور ریشم پہنانا مکروہ ہے۔ (ہدایہ اخیرین ص 457، مطبوعہ مکتبہ شرکت علمیہ ملتان)

زیورات کی زکوٰۃ کے متعلق احادیث اور آثار:

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آئی اور اس کے ساتھ اس کی بیٹی تھی اور اس کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے موٹے موٹے کنگن تھے، آپ نے اس عورت سے فرمایا: کیا تم ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس عورت نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا کیا تم اس سے خوش ہوگی کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے بجائے آگ کے کنگن پہنا دے، پھر اس عورت نے ان کنگنوں کو اتار کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے رکھ دیا، اور کہا یہ اللہ

اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث 1563، سنن الترمذی رقم الحدیث 637، سنن النسائی رقم الحدیث 2325، مسند احمد ج 2 ص 278، مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث 7065، مصنف ابن ابی شیبہ ج 3 ص 153، حلیۃ الاولیاء ج 9 ص 232، سنن بیہقی ج 9 ص 199، 198، شرح السنہ رقم الحدیث 2753)

امام ابن القطان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے، امام منذری نے مختصر سنن ابو داؤد میں لکھا ہے اس حدیث کی سند میں کوئی مقال نہیں ہے کیونکہ امام ابو داؤد نے ابو کامل حجدری اور حمید بن مسعدہ سے روایت کیا ہے اور وہ ثقات سے ہیں۔

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس رسول اللہ تشریف لائے آپ نے میرے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھیاں دیکھیں، آپ نے فرمایا اے عائشہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یا رسول اللہ میں نے ان انگوٹھیوں کو زیب و زینت کے لیے پہنا ہے، آپ نے پوچھا کیا تم ان کی زکوۃ ادا کرتی ہو، میں نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا تمہیں دوزخ کے عذاب کے لیے یہ کافی ہیں۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث 1565، حاکم نے کہا شیخین کی شرط کے مطابق یہ حدیث صحیح ہے، المستدرک ج 1 ص 390، 389، سنن دارقطنی رقم الحدیث 1934، سنن بیہقی ج 4 ص 139)

حضرت ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کا زیور پہنے ہوئے تھی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ کنز ہے؟ (وہ جمع کیا ہوا سونا جس پر دوزخ کے عذاب کی وعید ہے) آپ نے فرمایا جو زیور زکوۃ کے نصاب کو پہنچ گیا اور اس کی زکوۃ ادا کر دی گئی تو وہ کنز نہیں ہے۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث 1564، حاکم نے کہا یہ حدیث امام بخاری کی شرط کے مطابق صحیح ہے، المستدرک ج 1 ص 390، سنن بیہقی ج 4 ص 140)

حضرت اسماء بنت یزید بیان کرتی ہیں کہ میں اور میری خالہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے سونے کے کنگن پہنے ہوئے تھے آپ نے پوچھا کیا تم دونوں ان کی زکوۃ ادا کرتی ہو؟ ہم نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا کیا تم کو اس کا خوف نہیں ہے کہ اللہ تم دونوں کو آگ کے کنگن پہناوے، تم دونوں ان کی زکوۃ ادا کرو۔

(مسند احمد ج 6 ص 461، حمزہ احمد زین نے کہا اس کی سند حسن ہے، مسند احمد رقم الحدیث 27486، دار الحدیث قاہرہ، مسند احمد رقم الحدیث 28166۔ عالم الکتب)

حضرت عمر بن خطاب نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ تمہاری طرف جو مسلمان عورتیں ہیں ان کو حکم دو کہ وہ اپنے زیورات کی زکوۃ ادا کریں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج 3 ص 27، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، 1406ھ)

حضرت ابن مسعود نے فرمایا: زیورات میں زکوۃ ہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث 7056، المعجم الکبیر رقم الحدیث 9594، مجمع الزوائد ج 3 ص 67)

زیورات کی زکوۃ میں مذاہب فقہاء اور بحث و نظر:

امام مالک، امام احمد بن حنبل اور ایک قول میں امام شافعی کے نزدیک زیورات پر زکوۃ نہیں ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک زیورات پر زکوۃ ہے اور امام شافعی کا راجح قول بھی یہی ہے۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفی 620ھ لکھتے ہیں:

ظاہر مذہب یہ ہے کہ عورت کے زیورات پر زکوۃ نہیں ہے، امام مالک اور امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے اور حضرت عمر،

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رض) اور تابعین میں سے سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، عطاء، مجاہد، عبداللہ بن شداد، جابر بن زید، ابن سیرین، میمون بن مہران، زہری، ثوری اور اصحاب رائے کا نظریہ یہ ہے کہ زیورات میں زکوۃ ہے۔
(المغنی ج 2ص 322، مطبوعہ دار الفکر بیرو، 1405ھ)

ائمہ ثلاثہ کی طرف سے دلائل دیتے ہوئے علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پانچ صحابہ کہتے تھے کہ زیورات میں زکوۃ نہیں ہے اور زیورات کو عاریتاً دینا ہی ان کی زکوۃ ہے، نیز عافیہ بن ایوب لیث بن سعد سے وہ ابوزبیر سے اور وہ حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: زیورات میں زکوۃ نہیں ہے علاوہ ازیں زیورات کو مباح استعمال کے لیے رکھا جاتا ہے اس لیے اس میں زکوۃ واجب نہیں ہے جس طرح کام کاج کی چیزوں میں اور استعمال کے کپڑوں میں زکوۃ نہیں ہے۔

علامہ ابن قدامہ نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ہماری پیش کردہ صحیح السند ابوداؤد کی روایت بھی ذکر کی ہے لیکن اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور اگر پانچ صحابہ اس مسئلہ میں زکوۃ کے قائل نہیں تو پانچ سے زیادہ صحابہ اس مسئلہ میں وجوب زکوۃ کے قائل ہیں، مثلاً حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت زینب زوجہ ابن مسعود (رض) اور ان کی فقاہت ان صحابہ سے زیادہ مسلم ہے جو زکوۃ کے قائل نہیں ہیں۔ علامہ ابن قدامہ نے اس سلسلے میں جن صحابہ کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں: حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت عائشہ اور حضرت اسماء، نیز یہ بھی قاعدہ ہے کہ جب حلت اور حرمت میں تعارض ہو تو ترجیح تحریم کو ہوتی ہے۔

ائمہ ثلاثہ کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت جابر سے مروی ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی 458ھ لکھتے ہیں:

حضرت جابر سے مروی ہے زیورات میں زکوۃ نہیں ہے، یہ صرف حضرت جابر کا قول ہے، حدیث مرفوع نہیں ہے۔ عافیہ بن ایوب نے از لیث از ابی الزبیر از جابر اس کو مرفوعاً روایت کیا ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔
(معرفۃ السنن والآثار ج 3ص 298،299، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیرو، 1412ھ)

علامہ ابن قدامہ نے اس مسئلہ میں جو کام کاج کی چیزوں پر قیاس کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ احادیث صحیحہ کے مقابلہ میں متروک ہے۔

مواخر کا معنیٰ:

اور تم اس میں کشتیوں کو دیکھتے ہو جو پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانی کو چیرنے والی کشتیوں کو مواخر فرمایا ہے اور مواخر کے معنی حسب ذیل ہیں:

مواخر، ماخرہ کی جمع ہے، ماخرہ کا معنی ہے پانی کو پھاڑنے والی کشتی، آواز دینے والی کشتی، ہوا کے ایک جھونکے سے آگے بڑھنے والی کشتی، اس کا مصدر مخیر اور مخور ہے، اس کا معنی ہے کشتی کا چلنا، پانی کو پھاڑنا، چلنے میں آواز پیدا ہونا، پانی کو ہاتھوں سے چیرنا، زمین کو نرم کرنے کے لیے اس کو پانی سے سیراب کرنا۔ حدیث میں ہے:

اذا بال احدکم فلیتمخر الریح۔ جب تم پیشاب کروتو ہوا کا رخ دیکھو (یعنی یہ دیکھو کہ ہوا کس رخ سے آرہی ہے اور ہوا کے رخ کی طرف پیشاب نہ کرو ورنہ تم پر چھینٹیں پڑیں گی)

(النہایہ ج4 ص260، کتاب العین ج3 ص1682، المفردات ج2 ص600 قاموس ج2 ص185)

اھلالذکر کون؟

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝٤٣

اور ہم نے آپ سے پہلے صرف مردوں ہی کو رسول بنایا تھا جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، اگر تم لوگ نہیں جانتے تو اہل ذکر (اہل کتاب) سے پوچھ لو۔ (ان رسولوں کو) واضح دلائل اور کتابوں کے ساتھ بھیجا تھا۔

[1](سورۃ النحل: آیت 43)

انسان اور بشر کو نبی اور رسول بنانے کی تحقیق

سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت میں مشرکین مکہ کا یہ پانچواں شبہ ہے جس کا یہاں ذکر کر کے اس کا رد کیا جارہا ہے، مشرکین یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند اور بالا ہے کہ وہ کسی بشر اور انسان کو رسول بنائے اور اپنا پیغام دے کر بھیجے، اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو اپنا رسول بنا کر بھیجنا ہوتا تو وہ فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا جو انسان کی بہ نسبت بہت معزز اور مکرم مخلوق ہے، اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اس اعتراض کا قرآن مجید میں کئی جگہ ذکر فرمایا ہے، اور اس کا ازالہ فرمایا ہے:

وقالوا لولا انزل علیہ ملك، ولا انزلنا ملکا لقضی الامر ثم لا ینظرون۔ ولو جعلنہ ملکا لجعلنہ رجلا وللبسنا علیھم ما یلبسون۔ (الانعام: ۸،۹)

اور انھوں نے کہا اس رسول پر فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا، اور اگر ہم فرشتہ نازل کرتے تو ان کا کام پورا ہو چکا ہوتا پھر انھیں مہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم رسول کو فرشتہ بنا دیتے تب بھی اسکو (صورتا) مرد بناتے اور ان پر وہی اشتباہ ڈال دیتے جو اشتباہ وہ اب کر رہے ہیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تو وہ نہ اس کا کلام سن سکتے، نہ اس کو دیکھ سکتے اور نہ اس کو چھو سکتے تو اس کو اصلی شکل میں بھیجنا بالکل عبث ہوتا، اور اگر ہم اس کو انسانی پیکر اور بشر کی صورت اور مرد کے لباس میں بھیجتے وہ اس پر یقین نہ کرتے کہ یہ فرشتہ ہے اور ہر گز نہ مانتے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، سو جو شبہ ان کو لاحق ہے وہ پھر بھی لاحق ہوتا ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اکان للناس عجبا ان اوحینا الی رجل منھم ان انذر الناس۔ (یونس: ۲)

کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک مرد پر وحی کی ہے کہ آپ لوگوں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈرائیں۔

و قال الملا من قومه الذین کفروا و کذبوا بلقاء الاخرة و اترفنهم فی الحیوة الدنیا ماهذا الا بشر مثلکم یاکل مما تاکلون منه و یشرب مما تشربون۔ و لئن اطعتم بشرا مثلکم انك اذا لخسرون۔ (المومنون: ۳۳، ۳۴)

اور نبی کی قوم کے ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا تھا، اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تھی، اور ہم نے ان کو دنیاوی زندگی میں خوشحالی عطا فرمائی تھی، یہ رسول تو تم جیسا بشر ہے یہ ان چیزوں میں سے کھاتا ہے جن سے تم کھاتے ہو اور ان چیزوں سے پیتا ہے جن سے تم پیتے ہو۔ اور اگر تم نے اپنے جیسے بشر کی اطاعت کرلی تو اس وقت تم ضرور نقصان اٹھانے والے لوگوں میں سے ہوگے۔

سو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بھی ان کے اس اعتراض کا جواب دیا اور ہم نے آپ سے پہلے بھی صرف مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا تھا، جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق کی آفرینش کی ابتدا سے اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاریہ رہی ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے صرف انسان اور بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور ظاہر ہے کہ بشر اور انسان کی ہدایت کے لیے اس کی جنس سے ہی رسول بھیجا جائے گا۔ چونکہ اس زمین پر انسان رہتے ہیں اس لیے ان کی ہدایت کے لیے بشر اور انسان کو رسول بنا کر بھیجا گیا، اگر یہاں فرشتے رہتے ہوتے تو ان کی ہدایت کے لیے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجا جاتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قل لو کان فی الارض ملئكة یمشون مطمئنین لنزلنا علیهم من السماء ملكا رسولا۔

(بنی اسرائی: ۹۵)

آپ کہیے اگر زمین میں (رہنے والے) فرشتے ہوتے جو اس میں اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے۔

اس لیے کفار مکہ کا سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت پر یہ اعتراض لا یعنی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام دے کر کسی کو بھیجنا تھا تو چاہیے تھا کہ وہ کسی فرشتے کو پیغام دے کر اور اپنا رسول بنا کر بھیجتا، امام رازی اور علامہ قرطبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور بالبینات والزبر آیت کے پہلے اجزا کے ساتھ مربوط ہے اور معنی یوں ہے: اور ہم نے آپ سے پہلے واضح دلائل اور کتابوں کے ساتھ صرف مردوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، سو اگر تم کو یقین نہ ہو تو اہل ذکر یعنی اہل کتاب سے پوچھ لو، نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی صرف مرد کو بنایا جاتا ہے عورت کو نہیں بنایا جاتا۔

اھل الذکر کا مصداق:

امام عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

اہل الذکر کی تفسیر میں چار قول ہیں:

(۱) ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد اہل التوراۃ والانجیل ہیں۔

(۲) مجاہد نے کہا اس سے مراد اہل توراۃ ہیں۔

(۳) ابن زید نے کہا اس سے مراد اہل قرآن ہیں۔

(٤) الماوردی نے بیان کیا اس سے مراد ہے پہلے لوگوں کی خبر رکھنے والے۔

اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: اگر تم نہیں جانتے ہو تو اس کی تفسیر میں بھی دو قول ہیں:

(۱) اگر تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے بشر میں سے کسی کو رسول بنایا ہے اس بنا پر معنی یہ ہے کہ اگر تم یہ نہیں جانتے تو علم والوں سے پوچھ لو خواہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں، کیونکہ اہل کتاب اور تاریخ کا علم رکھنے والے سب اس پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء (علیہم السلام) بشر سے مبعوث کیے گئے۔

(۲) اگر تم یہ نہیں جانتے کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں تو اہل کتاب سے جو ایمان لائے ہیں ان سے پوچھ لو اور مجاہد سے روایت ہے کہ اہل الذکر سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہیں اور قتادہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد حضرت سلمان فارسی ہیں۔

(زاد المسیر ج ٤ ص ٤٤٩، ٤٥٠، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ١٤٠٧ھ)

میرے نزدیک امام ابن جوزی کی ذکر کی ہوئی یہ دوسری تفسیر صحیح نہیں ہے کیونکہ سورۃ النحل مکی ہے اور اس آیت میں مکہ کے مشرکین سے یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ نے کسی بشر کو رسول بنایا ہے تو اہل کتاب سے پوچھ لو، اور حضرت عبداللہ بن سلام تو ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلام لائے تھے، اس لیے اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے مشرکو! اگر تم کو اس بات میں شک ہے کہ بشر رسول ہوتا ہے تو اہل کتاب سے پوچھ لو، کیونکہ تمام اہل کتاب اس کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کو نہیں چھپاتے۔

مسئلہ تقلید پر فسئلوا اھل الذکر سے استدلال:

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ١٢٧٠ھ لکھتے ہیں:

علامہ جلال الدین سیوطی نے الاکلیل میں لکھا ہے کہ اس آیت سے عام آدمی کی فروعی مسائل میں تقلید پر استدلال کیا گیا ہے، علامہ سیوطی نے فروعی مسائل کی جو قید لگائی ہے اس پر غور کرنا چاہیے، کیونکہ اس آیت کا ظاہر عموم ہے، خاص طور پر جب ہم یہ کہیں کہ اس آیت میں جس چیز کے متعلق سوال کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق اصول سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ انسان اور بشر سے رسول بناتا ہے، اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جلال الدین محلی سے منقول ہے کہ غیر المجتہد عام ہو یا خاص اس کو مجتہد کی تقلید کرنا لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اگر تم لوگ نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو، اور صحیح یہ ہے کہ مسائل اعتقادیہ اور غیر اعتقادیہ میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی فرق ہے کہ مجتہد زندہ ہو یا مردہ۔

علامہ سیوطی اور دیگر علماء نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے وکہ مجتہد کے لیے تقلید کرنا منع ہے، خواہ اس کے پاس کوئی قطعی دلیل ہو یا نہ ہو اور خواہ وہ بالفعل مجتہد ہو یا اس کے پاس اجتہاد کی اہلیت ہو، اور ان کے اس کلام کا تقاضا یہ ہے کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کرنے میں یا ان کے علاوہ کسی اور کی تقلید کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں علامہ ابن حجر وغیرہ نے یہ لکھا ہے کہ غیر کی تقلید کرنے میں یہ شرط ہے کہ اس کا مذہب مدون ہو اور اس کی شرائط اور معتبرات محفوظ ہوں، اور علامہ سبکی نے جو کہا ہے کہ جو ائمہ اربعہ کا مخالف ہو وہ اجماع

کے مخالف کی مثل ہے یہ ان مجتہدین پر محمول ہے جن کے مسائل محفوظ اور مدون نہیں ہیں اور ان کی شرائط معروف نہیں ہیں اور ان کی کتابیں گم ہو چکی ہیں جیسے ثوری، اوزاعی، ابن ابی لیلیٰ وغیر ہم کے مذاہب (یعنی ان لوگوں کی تقلید نہیں کرنی چاہیے، ائمہ اربعہ کے غیر کی تقلید کا جواز صرف عمل میں ہے، اور افتاء اور قضا کے لیے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مذہب کا متعین کرنا ضروری ہے۔

(روح المعانی ج ۱۴ص ۲۱۹ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

آیت مذکورہ سے استدلال پر نواب صدیق حسن خان کے اعتراضات:

مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ تقلید کے رد میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں اہل ذکر سے مطلقاً سوال کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ ایک خاص چیز کے متعلق سوال کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ ہے کہ کسی بشر اور انسان کو رسول بنانا۔ امام ابن جریر، امام بغوی اور اکثر مفسرین کا یہی مختار ہے، علامہ سیوطی نے ان تمام اقوال کو الدر المنثور میں جمع کیا ہے اور سیاق اور سباق سے بھی یہی معنیٰ متعین ہے اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ یہاں کسی بھی چیز کے متعلق اہل ذکر سے سوال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تب بھی یہاں کتاب اللہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کے متعلق سوال کرنے کا حکم مراد ہے اور ان کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق سوال کرنے کا حکم مراد نہیں ہے، اور میں مخالف کے متعلق یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ اس سے اختلاف کرے گا، اس لیے کہ شریعت مطہرہ یا تو اللہ عزوجل کی طرف سے ہے اور وہ قرآن کریم ہے اور یا اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے ہے اور وہ آپ کی سنت مطہرہ ہے، ان کے علاوہ کوئی تیسری چیز شریعت نہیں ہے۔ اور جبکہ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اہل قرآن اور حدیث سے سوال کریں، تو یہ آیت کریمہ مقلدین کے خلاف ہے، ان کے حق میں نہیں ہے کیونکہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ اہل الذکر سے سوال کرتے تھے اور وہ ان کو جواب دیتے تھے، پس جن سے سوال کیا جاتا تھا ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں کہ اللہ اس طرح فرماتا ہے، اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس طرح فرماتے ہیں، پھر سوال کرنے والے اس پر عمل کرتے ہیں اور یہ وہ چیز نہیں ہے جو مقلدین کی مراد ہے اور جس کا وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ وہ اس آیت سے لوگوں کے اقوال پر عمل کرنے کے جواب پر استدلال کرتے ہیں اور ان کے اقوال کی دلیل کے متعلق سوال نہیں کرتے، اور اسی چیز کو تقلید کہتے ہیں کیونکہ انھوں نے تقلید کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ بغیر دلیل کے غیر کے قول کو قبول کرنا ہے۔

تقلید کا خلاصہ یہ ہے کہ مقلد کتاب اللہ سے سوال کرتا ہے اور نہ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سے بلکہ وہ فقط اپنے امام کے مذہب کو معلوم کرتا ہے اور جب وہ امام کے مذہب سے متجاوز ہو کر کتاب اور سنت کے متعلق سوال کرے تو پھر وہ مقلد نہیں ہے اور اس بات کو ہر مقلد تسلیم کرتا ہے اور اس کا انکار نہیں کرتا، اور جب یہ ثابت ہو گئی کہ جب مقلد اہل ذکر سے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت کے متعلق سوال کرے گا تو وہ مقلد نہیں ہوگا، تو تم نے جان لیا کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس آیت میں کسی خاص چیز کے سوال کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ شریعت سے متعلق ہر چیز کے سوال کرنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ مقلد کا زعم ہے تو اس کا قول اس کے منہ پر مار دیا جائے گا اور اس کی ناک خاک آلودہ کی جائے گی اور اس کی کمر توڑ دی جائے گی، کیونکہ جس سوال کرنے کو اللہ تعالیٰ نے مشروع کیا ہے وہ یہ ہے کہ عالم سے حجت شرعیہ کا سوال کیا جائے اور اس کو معلوم کیا جائے، پس وہ عالم حدیث کا

راوی ہوگا اور وہ سائل روایت کا طالب ہوگا اور مقلد خود اس کا اقرار کر رہا ہے کہ وہ عالم کے قول کو قبول کرتا ہے اور حجت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ پس یہ آیت اتباع کی دلیل ہے تقلید کی دلیل نہیں ہے، پس اس تقریر سے تم پر ظاہر ہوگیا ہوگا کہ مقلد اس آیت کو جو اپنی حجت کے طور پر پیش کرتا ہے تو یہ حجت ساقط ہے، جبکہ اس آیت کا مفہوم خاص چیز کے متعلق سوال کرنے کا حکم دینا ہے نہ کہ عام چیزوں کے متعلق، تو یہ آیت مقلد کے خلاف ہے نہ کہ اس کے حق میں۔

(فتح البیان، ج ۷ ص ۲۴۶، ۲۴۷، مطبوعہ المکتبۃ العصریہ، ۱۴۱۰ھ)

اعتراضات مذکورہ کے جوابات اور اس پر دلائل کے اعتبار خصوصیت مورد کا نہیں عموم الفاظ کا ہوتا ہے:

نواب صدیق حسن خان نے پہلی بات یہ کہی ہے کہ اس آیت کا مورد اور شان نزول خاص ہے یعنی اس چیز کے متعلق سوال کرنا کہ پہلی امتوں میں انسان اور بشر سے رسولوں کو بھیجا جاتا رہا ہے، اور اس کو عموم پر محمول کرنا جائز نہیں ہے یعنی جس چیز کا بھی علم نہ ہو اس کے متعلق سوال کیا جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ قاعدہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں کسی آیت کے مورد کی خصوصیت کا اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جاتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

یا ایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ۔(الحجرات:۱) اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔

نواب صدیق حسن خان نے اس آیت کے دو شان نزول ذکر کیے ہیں:

حضرت عبداللہ بن الزبیر بیان کرتے ہیں کہ بنو تمیم کے کچھ سوار نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت ابو بکر نے کہا ان پر قعقاع بن معبد بن زرارہ کو امیر بنا دیں، حضرت عمر نے کہا بلکہ ان پر اقرع بن حابس کو امیر مقرر کر دیں، حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے کہا تم نے صرف میری مخالفت کرنے کا ارادہ کیا ہے، حضرت عمر نے کہا میں نے آپ کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا، دونوں بحث کرنے لگے حتیٰ کہ ان کی آوازیں بلند ہوگئیں۔ اس واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: یا ایھا الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللہ ورسولہ۔ اس حدیث کو امام بخاری اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۶۷، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۲۶۶، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۶۲۳۲) حضرت ابن عباس نے کہا مسلمانوں کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے بحث کرنے سے منع کر دیا گیا، یہ ممانعت رائے کے ساتھ کتاب وسنت کے معارضہ کو بھی شامل ہے اور تقلید سے ممانعت کو بھی شامل ہے۔

(فتح البیان، ج ۱۳ ص ۱۳۰، مطبوعہ المکتبہ العصریہ، بیروت، ۱۴۱۰ھ)

دیکھئے اس آیت کا شان نزول نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے حضرت ابو بکر اور عمر کے ساتھ خاص ہے، لیکن حضرت ابن عباس نے اس آیت کے الفاظ کے عموم کی وجہ سے فرمایا: یہ ممانعت تمام مسلمانوں کو شامل ہے اور خود نواب صاحب نے تو اس کو اور بھی عام کر دیا کہ یہ ممانعت رائے کے ساتھ کتب وسنت کے معارضہ کی ممانعت اور تقلید کی ممانعت کو بھی شامل ہے، حالانکہ تقلید کی ممانعت کا تو اس آیت میں دور کا اشارہ بھی نہیں ہے کیونکہ مقلدین جن مسائل میں اپنے ائمہ کی تقلید کرتے ہیں وہ کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہیں بلکہ کتاب وسنت کے موافق ہیں، اور مذاہب اربعہ کی فقہی کتابیں اس پر شاہد عادل ہیں۔ بہر حال نواب صاحب کے خود اپنے بیان سے ثابت ہوگیا کہ خصوصیت مورد کا اعتبار نہیں ہوتا بلکہ عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے اور اسی قاعدہ کے مطابق انھوں نے یہ تفسیر کی ہے۔

اور اس آیت کا دوسرا شان نزول انھوں نے یہ بیان کیا ہے:

امام بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ مسلمان رمضان سے ایک یا دو دن پہلے روزہ رکھنا شروع کر دیتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (فتح البیان ج ۱۳، ص ۱۳۱، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نواب صاحب نے اس مورد اور شان نزول کے ساتھ اس آیت کو خاص نہیں کیا بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں اس آیت میں مومنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کتاب اور سنت کے خلاف نہ کہیں اور یہی زیادہ ظاہر ہے، یا اللہ اور رسول کی اجازت کے بغیر کوئی قطعی حکم نہ دیں یا جس طرح علامہ خازن نے کہا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرمانے سے پہلے کوئی بات نہ کہو یا آپ کے فعل کرنے سے پہلے کوئی فعل نہ کرو اور علامہ بیضاوی نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم دینے سے پہلے کسی چیز کا قطعی فیصلہ نہ کرو۔

(فتح البیان ج ۱۳، ص ۱۲۹، ۱۳۰، ملخصا مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

بہر حال یہ واضح ہو گیا کہ خود نواب صاحب کی تفسیر اسی قاعدہ پر مبنی ہے کہ قرآن عظیم کی آیات میں خصوصیت مورد کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ عموم الفاظ کا لحاظ ہوتا ہے لہٰذا ان کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ فاسئلوا اھل الذکران کنتم لا تعلمون۔ (النحل: ۴۳) کا تعلق ایک خاص سوال سے ہے یعنی یہ معلوم کرو کہ بشر اور انسان سے رسول مبعوث ہوتے ہیں اور اس میں عام نامعلوم چیزوں کے متعلق سوال کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

آیت مذکورہ کا تمام مسائل کے لیے عام ہونا خواہ ان کا علم ہو یا نہ ہو:

دوسری بات جو نواب صاحب نے کہی وہ یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہاں پر عموم مراد ہے یعنی جو چیز بھی معلوم نہ ہو اس کے متعلق سوال کرو تو اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کا شرعی حکم تم کو معلوم نہ ہو تم اس کے متعلق اللہ عزوجل کا ارشاد اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حکم معلوم کرو اور یہ بات مقلدین کے حق میں نہیں ہے کیونکہ وہ اس آیت سے یہ مراد لیتے ہیں کہ جس چیز کے متعلق تمہیں شرعی حکم معلوم نہیں اس چیز کے متعلق اپنے امام کا قول معلوم کرو۔

نواب صاحب نے جو یہ لکھا ہے یہ واقع کے خلاف ہے مقلدین علماء اس آیت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ جس چیز یا جس کام کا تمہیں شرعی حکم معلوم نہیں ہے اس کے متعلق اہل علم سے سوال کرو پھر وہ جو کہیں اس پر عمل کرو خواہ وہ تمہیں اس کی دلیل بتائیں یا نہ بتائیں۔

امام علی بن محمد آمدی مالکی متوفی ۶۳۱ھ اس آیت (النحل: ۴۳) سے تقلید کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فسئلوا اھل الذکران کنتم لا تعلمون۔ (النحل: ۴۳) اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے سوال کرو۔

یہ آیت تمام مخاطبین کے لیے عام ہے اور واجب ہے کہ ہر اس چیز کے سوال کے لیے عام ہو جس کا مخاطب کو علم نہ ہو اور تخصیص خلاف اصل اور بلا دلیل ہے اور جب یہ آیت تمام اشخاص اور تمام نامعلوم مسائل کے لیے عام ہے تو اس آیت میں جو سوال کرنے کا حکم ہے اس کا ادنی درجہ جواز ہے۔

(الاحکام فی اصول الاحکام ج ۴ ص ۲۳۴، مطبوعہ دار الکتب العربی، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

علامہ آمدی نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہیں یہ نہیں لکھا کہ مقلد اپنے امام کا قول معلوم کرے بلکہ یہ استدلال کیا

ہے کہ جس شخص کو کوئی مسئلہ معلوم نہ ہو وہ اہل علم سے اس کے متعلق سوال کرے۔

علامہ ابن ہمام حنفی متوفی ۸٦۱ھ اور ان کی عبارت کی شرح میں علامہ ابن امیر الحاج حنفی متوفی ۸۷۹ھ تقلید کے جواز پر استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہماری دلیل اس آیت کا عموم ہے:

فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ (النحل: ۴۳)

یہ آیت اس شخص کے متعلق عام ہے جو کسی چیز کا شرعی حکم نہ ہو جانتا ہو خواہ وہ محض عام شخص ہو، یا بعض مسائل کا عالم ہو اور کسی ایک مسئلہ کا شرعی حکم نہ جانتا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ پیش آمدہ مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کے لیے اہل علم سے سوال کرے، سوال کرنے کی علت علم نہ ہونا ہے، پس جب بھی علم کا نہ ہونا ثابت ہوگا تو اس کے متعلق سوال کرنے کا وجوب متحقق ہوگا، لہٰذا جو شخص کسی مسئلہ کا عالم نہ ہو اس پر اس مسئلہ کے متعلق سوال کرنا واجب ہے اور ہمیشہ سوال کرنے والے مفتیوں کی اتباع کرتے رہے ہیں خواہ مفتیوں نے اس شرعی حکم کی دلیل نہ بتائی ہو اور یہ ہر دور میں رائج رہا ہے اور اس پر کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ لہٰذا عالم مجتہد کے اقوال کی اتباع پر اجماع سکوتی ہو گیا اور بلا دلیل علماء کے اقوال کی اتباع کا عدم جواز ان علما کے لیے ہے جو اجتہاد کے اہل ہوں، ہاں اگر سوال کرنے والا ان کے قول کی دلیل کا سوال کرے تو ان پر دلیل کا بیان کرنا واجب ہے الا یہ کہ اس مسئلہ دلیل بہت غامض اور دقیق ہو اس وقت سائل پر اس دلیل کو ظاہر کرنے سے تھکاوٹ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا، ایسی صورت میں علما اس دلیل کو ظاہر نہ کرنے میں معذور ہیں۔

(التقریر والتحریر ج ۳ ص ۴۵۷، ۴۵۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

مقلدین تقلد کے جواز پر فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ (النحل: ۴۳) سے استدلال کرتے ہیں، مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے اس استدلال پر جو اعتراضات کیے تھے ہم ان کے جوابات سے فارغ ہو گئے، اب ہم پہلے تقلید کی تعریف کریں گے پھر تقلید کے ثبوت پر قرآن مجید، احادیث، آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے استدلال کریں گے اور پھر علماء متقدمین نے تقلید کے جواز پر جو دلائل پیش کیے ہیں ان کو پیش کریں گے، فنقول و باللہ التوفیق۔

تقلید کا لغوی اور اصطلاحی معنی اور اس کی وضاحت:

علامہ محمد یعقوب فیروز آبادی متوفی ۸۱۷ھ تقلید کا لغوی معنی لکھتے ہیں:

کسی کے گلے میں ہار ڈالنا، حاکموں کا کسی کے ذمہ کوئی کام سپرد کرنا، اونٹنیوں کے گلے میں کوئی ایسی چیز لٹکانا جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ ھدی ہیں۔

(القاموس ج ۱ ص ٦۲۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۲ھ)

علامہ سید علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱٦ھ تقلید کا اصطلاحی معنی لکھتے ہیں:

انسان اپنے غیر کی اس کے قول اور فعل میں اتباع کرے اس اعتقاد کے ساتھ کہ وہ برحق ہے، دلیل میں غور و فکر اور تامل کیے بغیر گویا کہ اتباع کرنے والے نے اپنے غیر کے قول اور فعل کا قلادہ (ہار) اپنے گلے میں لٹکا لیا اور بلا دلیل غیر کے قول کو قبول کرنا تقلید ہے۔

(التعریفات ص ۴۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۸ھ)

علامہ بحر العلوم عبد العلی بن نظام الدین متوفی ۱۲۲۵ھ لکھتے ہیں:

بغیر حجت اور دلیل کے غیر کے قول کو قبول کرنا تقلید ہے، حجت مراد ہے کتاب، سنت، اجماع اور قیاس، ورنہ مجتہد کا قول مقلد کی دلیل ہے جیسے عام آدمیں مفتی اور مجتہد سے مسئلہ معلوم کرے۔

(فواتح الرحموت ج ۲ ص ۴۰۰، مطبوعہ امیریہ کبری بولاق مصر ۱۳۲۴ھ)

امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ فرماتے ہیں:

عام آدمی پر لازم ہے کہ وہ اسی شخص سے مسئلہ معلوم کرے جو علم اور پرہیز گاری میں معروف اور مشہور ہو، اور جو شخص جہل میں مشہور ہو اس سے بالکل سوال نہ کرے اور جو آدمی فسق وفجور میں معروف ہو اس سے بھی بالکل سوال نہ کرے۔

(المستصفی ج ۲ ص ۳۹۰، مطبوعہ امیریہ کبری بولاق مصر ۱۳۲۴ھ)

قرآن کریم سے تقلید پر استدلال:

ہم اس سے پہلے النحل: ۴۳ سے تقلید کے جواز پر استدلال اور مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کے اعتراضات اور ان کے جوابات لکھ چکے ہیں، اس سلسلہ میں دوسرا استدلال اس آیت کریمہ سے ہے:

فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ (التوبہ: ۱۲۲)

ایسا کیوں نہ ہوا کہ ہر گروہ میں سے ایک جماعت علم دین کے حصول کے لیے نکلتی تا کہ جب وہ واپس آتی تو اپنے گروہ کو (اللہ کے عذاب سے) ڈراتی تا کہ وہ گناہوں سے بچتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف بعض مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ علم حاصل کرنے کے بعد اپنی پوری قوم کو احکام پہنچائیں یعنی صرف بعض مسلمان دین کا علم اور فقہ کو حاصل کریں اور ان کی قوم کے باقی مسلمان ان کے اقوال پر عمل کریں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ فقہا کے اقوال کو واجب العمل قرار دیا ہے کیونکہ ان پر عمل کر کے اللہ کے عذاب سے بچا جا سکتا ہے اور اسی کا نام تقلید ہے۔

احادیث سے تقلید پر استدلال:

ابو جمرہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس اور لوگوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض ادا کیا کرتا تھا، حضرت ابن عباس نے کہا کہ عبد القیس کا وفد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا، آپ نے فرمایا یہ کونسا وفد ہے یا فرمایا یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا ہم ربیعہ ہیں آپ نے فرمایا اس قوم کو یا اس وفد کو خوش آمدید ہو، یہ رسوا ہوں گے نہ شرمندہ ہوں گے، انھوں نے کہا آپ کے پاس بہت دور سے آئے ہیں اور ہمارے اور آپ کے درمیان کفر مضر کا قبیلہ حائل ہے اور ہم سوا حرمت والے مہینوں کے آپ کے پاس آنے کی طاقت نہیں رکھتے، آپ ہمیں ایسے احکام بتایئے جن کی ہم ان کو خبر دیں جو ہمارے پیچھے ہیں اور اس وجہ سے جنت میں داخل ہو جائیں، سو آپ نے ان کو چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے روکا، آپ نے ان کو صرف عزوجل وحدہ پر ایمان لانے کا حکم دیا، پھر

فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ وحدہ پر ایمان لانے کا کیا معنی ہے؟ انھوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے فرمایا اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکوۃ ادا کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا، اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا اور ان کو خشک کھوکھلے کدو، سبز گھڑے اور تارکول ملے ہوئے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا اور بسا اوقات آپ نے ان کو کھوکھلی لکڑی کے برتن کے استعمال سے بھی منع فرمایا۔ آپ نے فرمایا ان احکام کو یاد کرلو اور جب لوگ تمہارے پیچھے ہیں ان کو ان احکام کی خبر دو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۸۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۶۹۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۱۱، ۱۵۹۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷)

حضرت مالک بن الحویرث بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہم سب نوجوان اور ہم عمر تھے، ہم آپ کے پاس بیس راتیں ٹھہرے، پھر آپ نے یہ گمان فرمایا کہ ہمیں اپنے گھر والوں کی یاد آرہی ہے، آپ نے ہم سے سوال کیا کہ ہم اپنے گھروں میں کس کس کو چھوڑ کر آئے ہیں، ہم نے آپ کو بتایا آپ بہت رفیق اور رحیم تھے آپ نے فرمایا اپنے گھر والوں کے پاس واپس جاؤ اور ان کو تعلیم دو اور ان کو (نیک کاموں کا) حکم دو، اور تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ الحدیث۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۰۸، مسند احمد رقم الحدیث: ۹۹۳۳، عالم الکتب بیروت)

یہ صحابہ کرام جو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے دین سیکھ کر گئے تھے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر دین کی تبلیغ کریں اور اپنی قوم کو دین کی تعلیم دیں اور نیک کاموں کے احکام دیں اور اب ان کے علاقہ کے لوگ ان کے اقوال پر عمل کریں گے اس اعتماد پر کہ یہ لوگ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے دین سیکھ کر آئے ہیں، اور جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں وہ کتاب اور سنت کے مطابق کہہ رہے ہیں اور کسی شخص کے قول پر اس اعماد سے عمل کرنا کہ وہ کتاب اور سنت کے مطابق کہہ رہا ہے یہی تقلید ہے۔

آثار صحابہ اور اقوال تابعین سے تقلید پر استدلال:

عن عکرمة ان اهل المدینة سالوا ابن عباس عن امرة طافت ثم حاضت قال لهم تنفر قالوا لا نأخذ بقولك وندع قول زید قال اذا قدمتم المدینة فاسئلوا فقدموا المدینة فکان فی من سالوا ام سلیم فذکرت حدیث صفیة۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۷۵۹، ۱۷۵۱)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ نے حضرت ابن عباس سے یہ سوال کیا کہ جس عورت نے طواف (زیارت) کرلیا ہو پھر اس کو حیض آجائے (تو آیا وہ طواف وداع کے بغیر واپس جاسکتی ہے؟) حضرت ابن عباس نے فرمایا: جاسکتی ہے، اہل مدینہ نے کہا: ہم آپ کے قول کی وجہ سے حضرت زید بن ثابت کے قول کو ترک نہیں کریں گے، (حضرت زید کہتے تھے کہ وہ طواف وداع کیے بغیر نہیں جاسکتی) حضرت ابن عباس نے فرمایا جب تم مدینہ جاؤ تو اس مسئلہ کی تحقیق کرلینا، جب وہ مدینہ گئے تو انھوں نے اس کی تحقیق کی، اور حضرت ام سلیم سے بھی پوچھا انھوں نے حضرت صفیہ کی (یہ) حدیث بیان کی: (کہ ایسی صورت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

نے حضرت صفیہ کو طواف وداع کیے بغیر جانے کی اجازت دی تھی)

جب اہل مدینہ کو حضرت صفیہ کی حدیث مل گئی تو انھوں نے حضرت ابن عباس کے پاس جا کر حق کا اعتراف کرلیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

فرجعوا الی ابن عباس فقالوا وجدنا الحدیث کما حدثنا۔ پھر اہل مدینہ حضرت ابن عباس کے پاس گئے اور کہا جس طرح آپ نے ہمیں حدیث سنائی تھی ہمیں اسی طرح حدیث مل گئی۔

(فتح الباری ج ۳ ص ۵۸۸، طبع لاہور)

اور حضرت زید بن ثابت کو جب یہ حدیث مل گئی تو انھوں نے بھی رجوع فرمالیا۔

حافظ ابن عسقلانی، امام مسلم اور امام نسائی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قال فرجع الیه: فقال ما اراك الاقد صدقت لفظ مسلم وللنسائی كنت عند ابن عباس فقال له زيد بن ثابت انت الذی تفتی وقال فيه فسالها جم رجع وهو يضحك فقال: الحديث كما حدثتنی۔

(فتح الباری ج ۳ ص ۵۸۸، طبع لاہور)

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ پھر حضرت زید بن ثابت نے رجوع کرلیا اور حضرت ابن عباس سے فرمایا مجھے یہ یقین ہے کہ آپ نے سچ کے سوا کچھ نہیں کہا، یہ صحیح مسلم کی عبارت ہے اور سنن نسائی سے یہ عبارت ہے، عکرمہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس کے پاس بیٹھا تھا، ان سے حضرت زید بن ثابت نے پوچھا آپ یہ فتوی دیتے ہیں؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس انصاری خاتون سے اس کے متعلق حدیث معلوم کرلو، حضرت زید نے ان سے حدیث پوچھی اور ہنستے ہوئے (اپنے قول سے) رجوع کرلیا اور کہا جس طرح آپ نے بیان کیا تھا، اسی طرح حدیث ہے۔

اس حدیث میں تقلید شخصی کا بھی ثبوت ہے کہ اہل مدینہ حضرت زید بن ثابت کے فتوی کی تقلید کرتے تھے اور یہ بھی دلیل ہے کہ اگر امام کے قول کے خلاف دلیل مل جائے تو حدیث پر عمل کرنا تقلید شخصی کے خلاف نہیں ہے۔

اب ہم صحابہ اور تابعین کے ایک سو آثار پیش کر رہے ہیں، لوگوں نے ان سے متعدد معاملات اور مختلف مسائل میں سوالات کیے اور انھوں نے ان کے جوابات میں قرآن مجید اور احادیث کی تصریحات کی بجائے اپنے اقوال پیش کیے ہر چند کہ ان کے اقوال قرآن اور سنت پر ہی مبنی تھے اور سائلین کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ یہ لوگ کتاب اور سنت کے ماہر ہیں اور ہمیں اس کے خلاف نہیں بتائیں گے اور اسی کا نام تقلید ہے اور مقلدین بھی اپنے ائمہ کی اسی معنی میں تقلید کرتے ہیں۔

۱۔ عبدالرحمن الاعرج بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب سے سوال کیا گیا کہ محرم اپنی چادر میں بٹن لٹکا سکتا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱٤٦٦٦، مطبوعہ دار الکتب العربیہ، ۱٤۱٦ھ)

حضرت ابی بن کعب نے سائل کو قرآن اور حدیث بیان کرنے کے بجائے صرف اپنا قول بیان کیا اور سائل نے اس پر عمل

کیااور یہی تقلید ہے۔

۲۔عمرو بن ھمر بیان کرتے ہیں کہ جابر بن زید سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہے اور دوسرا شخص اس کے قریب کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا ہے اس نے آیت سجدہ پڑھی تو پہلے شخص نے اس آیت کو سن لیا تو کیا وہ سجدہ کرے گا؟ انہوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ٤٣٠٨)

۳۔عمرو بن ھرم کہتے ہیں کہ جابر بن زید سے سوال کیا گیا کہ حائضہ عورت کے کپڑے پر خون لگ جائے وہ اس کو دھولے اور اس میں خون کا نشان باقی رہے تو وہ اس میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ انھوں نے کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۰۲۰)

٤۔عمرو بیان کرتے ہیں کہ جابر بن زید سے سوال کیا گیا کہ طلوع آفتاب کے وقت یا غروب آفتاب کے وقت یا جب سورج کچھ غروب ہوا ہو اس وقت جنازہ دفن کیا جاسکتا ہے؟ کہا نہیں۔ (ہمارے نزدیک اس وقت نماز جنازہ نہیں پڑھی جاسکتی البتہ دفن کیا جاسکتا ہے۔)

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۱۳۲٥)

٥۔ یونس بیان کرتے ہیں کہ حسن سے سوال کیا گیا کہ سفر میں دو نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے؟ وہ اس کو بغیر عذر کے مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۸۲٤۹)

٦۔عبدالملک بیان کرتے ہیں کہ سعید بن جبیر سے سوال کیا گیا کہ کیا عمرہ واجب ہے؟ انھوں نے کہا ہاں، (ہمارے نزدیک عمرہ کرنا سنت ہے،)

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۳٦٥٤)

۷۔قتادہ بیان کرتے ہیں کہ ابراہیم نے کہا جس شخص پر رمضان کے قضا روزے ہوں وہ نفلی روزے نہ رکھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۹۸۲٦)

۸۔مالک بن انس بیان کرتے ہیں کہ سلیمان بن یسار اور سعید بن المسیب سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نفلی روزے رکھتا ہے اور اس پر رمضان کے روزوں کی قضا ہے؟ ان دونوں نے اس کو مکروہ قرار دیا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۹۲۸۹)

۹۔عمرو بن الحریث بیان کرتے ہیں کہ مردہ بھینسوں کی کھالوں کی بیع کے متعلق شعبی سے سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا دباغت (رنگ) سے پہلے ان کی بیع مکروہ ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۲۰۳۷٥)

۱۰۔الصلت بن راشد بیان کرتے ہیں کہ طاؤس سے نماز میں پانی پینے کے متعلق سوال کیا گیا، انھوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۸۳٥۹)

۱۱۔عبدالملک بیان کرتے ہیں کہ عطا سے سوال کیا گیا کہ کیا محرمہ شلوار پہن سکتی ہے، انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۵۷۱۶)

۱۲۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطا سے سوال کیا گیا کہ ایک عورت مر جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ ہو اور مرد اس کو پیٹ سے نکال لے؟ انھوں نے کہا یہ مکروہ ہے۔(ہمارے نزدیک مردہ عورت سے زندہ بچہ کو نکالنا ضروری ہے۔)

(مصنف ابن ابی شعیبہ رقم الحدیث:۲۳۷۰٤)

۱۳۔حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی سے سوال کیا گیا کہ کیا اہل ایلہ پر جمعہ ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۵۰٦۲)

۱٤۔سعید بن المسیب بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر سے سوال کیا گیا کہ فصل اچھی ہونے تک کے ادھار پر ایک بکری کی دو بکریوں کے عوض بیع کی جائے، آیا یہ جائز ہے، حضرت عمر نے اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲۰٤۳۸)

۱۵۔سلیمان بن مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حسن سے پوچھا ایک آدمی قل ھو اللہ احد اچھی طرح نہیں پڑھ سکتا، کیا وہ اپنی قوم کو نماز پڑھائے اور پھر دہرالے؟ انھوں نے کہا ہاں (ایسی صورت میں ہمارے نزدیک صحیح قاری کو امام بنانا ضروری ہے۔)

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۸۷٦٦)

۱٦۔حصین بیان کرتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے سوال کیا آیا میں حج کے چھ دن بعد عمرہ کرسکتا ہوں؟ انھوں نے کہا اگر تم چاہو تو عمرہ کرلو۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۳۰۱۸)

۱۷۔جعفر بن نجیح بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے طاؤس سے سوال کیا میں نے عجلت سے دو دن میں حج کرلیا، کیا میں عمرہ کرسکتا ہوں؟ انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث:۱۳۰۱۹)

۱۸۔عبید اللہ بن ابی یزید بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عبید بن عمیر سے سوال کیا آیا کوئی شخص جہاد پر جاسکتا ہے جبکہ اس کے ماں باپ یا دونوں میں سے ایک ناپسند کرتے ہوں؟ انھوں نے کہا نہیں

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۳۳٤۵۱)

۱۹۔ یونس بن خباب بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر سے سوال کیا آیا بچوں کے گلوں میں تعویذ لٹکانا جائز ہے، انھوں نے اس کی اجازت ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲۳۵٤۱)

۲۰۔بسام بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوجعفر سے سوال کیا آیا نرد (ایک قسم کا کھیل) کھیلنا جائز ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔(یہ اس صورت میں ہے جب اس میں ہار جیت پر شرط لگائی جائے)

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲٦۱٤٦)

۲۱۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ اہل واسط کے ایک بوڑھے نے ابوعیاض سے سوال کیا، آیا چوپائے کے زخم پر خنزیر کے بال رکھنا جائز ہے؟ انھوں نے اس کو مکروہ کہا

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۳٦۸۸)

۲۲۔خالد حذا بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابوقلابہ سے بیان کیا کہ ایک معلم تعلیم دیتا ہے اور اس پر اجرت لیتا ہے۔انھوں نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۰۸۲٤)

۲۳۔منصور بیان کرتے ہیں میں نے ابراہیم سے سوال کیا آیا میں دوسجدوں کے درمیان کچھ قرآت کروں؟ انھوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۸۸٤۳)

۲٤۔حماد بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے سوال کیا کہ آیا سوئے ہوئے شخص کو نماز کا سترہ قرار دیا جاسکتا ہے انھوں نے کہا نہیں، میں نے سوال کیا اور بیٹھے ہوئے شخص کو، کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۸۸۲)

۲۵۔زید بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے سوال کیا بہن کو زکوۃ دی جاسکتی ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۰۵۳۸)

۲٦۔مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے سوال کیا ایک شخص نے دوسرے شخص کو بکری فروخت کی پھر اس سے پہلے کہ وہ بکری پر قبضہ کرتا اس نے کہا اس بیع کو واپس کرلو، خریدار نے انکار کیا اور کہا مجھے ایک درہم دو تو میں بیع فسخ کرلوں گا، آیا یہ جائز ہے؟ تو ابراہیم نے اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۲۰٤۰۹)

۲۷۔حماد بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابراہیم سے سوال کیا آیا محرم چوہے کو مار سکتا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱٤۸۲۲)

۲۸۔الصباح بن ثابت بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابن جبیر سے سوال کیا آیا محرم کپڑے فروخت کرسکتا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱٤۷۸٤)

۲۹۔ثابت بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر سے سوال کیا آیا معصیت کی نذر کو پورا کیا جائے گا؟ انھوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۲۱۵٤)

۳۰۔طاؤس بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر سے مغرب کے بعد دو رکعت نماز پڑھنے کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے منع نہیں کیا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۷۳۸٦)

۳۱۔ہشام معیطی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ام الدرداء سے حج کے بعد عمرہ کرنے کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے حج کے بعد عمرہ کرنے کا حکم دیا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۳۰۱٤)

۳۲۔الصباح بن عبداللہ البجلی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک سے سوال کیا آیا محرم ذبح کرسکتا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱٤٥۱۸)

۳۳۔ابوالزبیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر سے پوچھا آیا محرم خوشبو سونگھ سکتا ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱٤٦۰۰)

۳٤۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا آیا گندم کی آٹے کے بدلہ میں بیع جائز ہے تو دونوں نے اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲۰۲٥۹)

۳٥۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا کہ ایک شخص دشمن کے علاقہ میں چلا جائے تو آیا وہ ان کی عورت سے نکاح کرسکتا ہے؟ ایک نے کہا ہاں، دوسرے نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۷٦۸۷)

۳٦۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا آیا پیتل کو لوہے کے بدلہ میں ادھار فروخت کرنا جائز ہے؟ حماد نے کہا مکروہ ہے، اور حکم نے کہا کوئی حرج نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲۲٥۳۸)

۳۷۔ابو المنبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حسن سے پوچھا ایک شخص کو بارش یا سخت سردی کی وجہ سے اہل ذمہ کے ہاں جانے کی ضرورت پیش آجائے تو آیا وہ ان سے اجازت طلب کرے انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲٥۹۷۸)

۳۸۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا آیا خنزیر کے بالوں کو استعمال کرنا جائز ہے تو دونوں نے اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲٥۲۷۰)

۳۹۔سلیمان بن مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حسن سے سوال کیا کہ ایک شخص نے اہل ذمہ کی ایک عورت سے بیع کی، اس عورت کی کچھ رقم اس کے پاس بچ گئی اس نے اس عورت کو تلاش کیا وہ نہیں ملی آیا وہ اس رقم کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کردے؟ انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۳۱٥۸۹)

٤۰۔شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا آیا کسی شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے اور قبلہ کے درمیان مصحف رکھ لے؟ تو دونوں نے کہا اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:٤٥۸۰)

٤۱۔شعبہ کہتے ہیں میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا جب امام جمعہ کے خطبہ کے لیے باہر نکل آئے اور خطبہ شروع کردے

اور جب منبر سے اتر آئے اور ابھی نماز شروع نہ کی ہو آیا ان دونوں وقتوں میں کلام کرنا جائز ہے؟ حکم نے کہا مکروہ ہے اور حماد نے کہا کوئی حرج نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۵۳۱۷)

۴۲۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا سر پر کتنی بار مسح کیا جائے دونوں نے کہا ایک مرتبہ۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۴۳)

۴۳۔شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا آیا حائضہ عورت تسبیح تہلیل اور تکبیر پڑھ سکتی ہے؟ تو ان دونوں نے اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۷۲۶۸)

۴۴۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا آیا نماز میں ناک کو ڈھانپنا جائز ہے؟ تو ان دونوں نے اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۷۳۱۴)

۴۵۔یعقوب بن قیس کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے سوال کیا کہ ایک شخص کو روزے میں قے آجائے تو آیا وہ اس روزے کی قضا کرے گا؟ انھوں نے کہا نہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۹۱۹۴)

۴۶۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حماد اور منصور سے سوال کیا آیا بغیر وضو کے بیت اللہ کا طواف کرنا جائز ہے؟ تو انھوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۴۳۴۹)

۴۷۔شعبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حکم اور حماد سے سوال کیا کہ ایک عورت کسی شخص سے خلع کرے اور اس نے جو کچھ اس عورت کو دیا ہے وہ خلع کے عوض اس سے زیادہ طلب کرے تو آیا یہ جائز ہے، تو دونوں نے اس کو مکروہ کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۸۵۱۵)

۴۸۔زیاد ابن اسلم بیان کرتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے سوال کیا آیا زمین کو دراہم اور طعام کے عوض کرایہ پر دینا جائز ہے تو انھوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۲۱۴۶۲)

۴۹۔خصیف بیان کرتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیب سے سوال کیا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہوگیا ہو آیا وہ (عدت سے پہلے) گھر سے نکل سکتی ہے؟ انھوں نے کہا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۸۸۶۱)

۵۰۔حجاج بیان کرتے ہیں کہ میں نے عطا سے پوچھا آیا بیت اللہ کے گرد طواف کرتے ہوئے قرآن عظیم پڑھنا جائز ہے تو انھوں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۱۵۱۹۰)

۵۱۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ ایک انسان نے عطا سے سوال کیا کہ ایک روزہ دار نے سحری کی پھر نماز سے پہلے اس کو معلوم ہوا کہ اس کے دانتوں میں کوئی چیز ہے عطا نے اس میں اس پر کوئی تاوان نہیں ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:۷۰۰٤)

۵۲۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عطا سے سوال کیا کہ میں مسجد میں آیا اور امام فرض پڑھا چکا تھا، آیا میں اس وقت فرض پڑھنے سے پہلے دو رکعت پڑھ لوں، انھوں نے کہا نہیں، بلکہ پہلے فرض پڑھو، حق پہلے ادا کرو، پھر جو چاہو پڑھو میں نے کہا اگر میں جنگل میں ہوں؟ انھوں نے کہا جنگل میں فرض سے پہلے جو چاہو پڑھ لو۔

(مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث:٣٤٣٧)

۵۳۔ابن طاؤس بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابن عمر سے پوچھا آیا ایک اونٹ کو دو اُونٹوں کے عوض ادھار خریدنا جائز ہے؟ انھوں نے کہ انھیں اور اس بیع کو مکروہ کہا، پھر میرے والد نے حضرت ابن عباس سے سوال کیا انہوں نے کہا کبھی ایک اونٹ دو اونٹوں سے بہتر ہوتا ہے۔

(مصنف عبدالرزق رقم الحدیث:۱٤۱٤۰، سنن کبری للبیھقی ج۵ ص ۲۸۷)

۵٤۔ایوب بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ابن المسیب سے سوال کیا کہ ایک آدمی نے معصیت کی نذر مانی آیا وہ اس نذر کو پورا کرے؟ ابن المسیب نے کہا وہ اس نذر کو پورا کرے، اس شخص نے پھر عکرمہ سے سوال کیا، انھوں نے کہا وہ اپنی قسم کا کفارہ دے اور اپنی اس نذر کو پورا نہ کرے، وہ شخص دوبارہ ابن المسیب کے پاس گیا اور عکرمہ کے قول کی خبر دی، ابن المسیب نے کہا عکرمہ سے کہو کہ باز آجائے ورنہ میں اس کی پیٹھ پر کوڑے ماروں گا، وہ شخص پھر عکرمہ پاس گیا اور بتایا کہ ابن المسیب نے کیا کہا ہے، تب عکرمہ نے کہا جب تم نے اس کی بات مجھے پہنچائی ہے تو میرا جواب بھی اس کو پہنچا دو، اسے کہو اس کو تو مدینہ کے امراء دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے مار چکے ہیں، پھر اس کو اپنی نذر بیان کر کے پوچھو کہ آیا یہ اللہ کی اطاعت ہے یا اس کی معصیت ہے؟ اگر وہ کہے کہ یہ معصیت ہے تو اس سے کہو کہ تم نے اللہ کی معصیت کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر وہ کہے کہ یہ اللہ کی اطاعت ہے تو اس سے کہو کہ تم نے اللہ پر جھوٹ باندھا کہ اللہ کی معصیت کو اللہ کی اطاعت گمان کیا۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۱۵۸۲٦)

۵۵۔اسود بیان کرتے ہیں کے کعب کے پاس وحشی گدھے کے شکار کا گوشت لایا گیا انھوں نے اس کو کھانے کے متعلق حضرت عمر سے سوال کیا کہ وہ لوگ محرم تھے اور اس کو غیر محرم نے شکار کیا تھا کعب نے کہا ہم لوگوں نے اس کو کھالیا، حضرت عمر نے فرمایا اگر تم لوگ اس کو چھوڑ دیتے تو میں یہ سمجھتا کہ تم لوگوں میں تفقہ بالکل نہیں ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۸۳٤۱)

۵٦۔سالم بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ میرے والد (حضرت ابن عمر) سے کہہ رہے تھے مجھ سے محرم لوگوں نے سوال کیا کہ غیر محرم لوگوں نے ان کو شکار کا گوشت ہدیہ کیا میں نے ان کو حکم دیا کہ وہ اس کو کھالیں، پھر میری حضرت عمر سے ملاقات ہوئی تو میں تو ان سے اس کے متعلق سوال کیا، حضرت عمر نے فرمایا تم نے ان کو کیا فتوی دیا تھا میں نے ان کو بتایا حضرت عمر نے فرمایا اگر تم اس کے علاوہ کوئی اور فتوی دیتے تو میں تم کو کوڑے مارتا۔ابو مجلز بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر

سے پوچھا آپ کی اس میں کیا رائے ہے، حضرت ابن عمر نے کہا میں اس میں کیا کہوں عمر مجھ سے بہتر ہیں اور ابو ہریرہ مجھ سے بہتر ہیں، عمرو بن دینار کہتے ہیں حضرت ابن عمر کی رائے یہ تھی کہ محرم کے لیے شکار کا گوشت کھانا مکروہ ہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۸۳٤۲، السنن الکبری ج ۵ ص ۱۸۹)

۵۷۔ حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ شام کے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ وہ محرم ہو اور اس کو شکار کا گوشت دیا جائے تو آیا وہ اس کو کھا سکتا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ نے اس کو فتوی دیا کہ تم اس کو کھا سکتے ہو، پھر میری حضرت عمر سے ملاقات ہوئی میں نے ان کو اس کا سوال اور اپنا جواب بتایا، حضرت عمر نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ وقدرت میں میری جان ہے اگر تم اس کے علاوہ کوئی اور فتوی دیتے تو میں تمہیں کوڑے مارتا۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۸۳٤٤، السنن الکبری ج ۵ ص ۱۸۸)

۵۸۔ حیات بن عمیر بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے سحری کے متعلق سوال کیا کہ ابھی رات تھی اور اس نے فجر کی اذان سنی حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ کھاتا رہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۷۳۷۰)

۵۹۔ مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ابراہیم سے سوال کیا گیا کہ اہل ذمہ کو دشمن نے قید کرلیا پھر مسلمانوں نے ان کو حاصل کرلیا، ان کا اب کیا حکم ہے، ابراہیم نے کہا ان کو غلام نہیں بنایا جائے گا۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۹۳٦٤)

٦۰۔ ابن ابی نجیح بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے مسلمانوں سے سوال کیا کہ جب تم حبشیوں کے علاقے میں گئے تو وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے، مسلمانوں نے کہا وہ ہم سے ہماری چیزوں کا دسواں حصہ وصول کرتے تھے، فرمایا جتنا وہ تم سے وصول کرتے تھے تم بھی ان سے اتنا وصول کرو۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۰۱۲۱)

٦۱۔ ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ آیا خصی آزاد عورت سے نکاح کرسکتا، ابن شہاب نے کہا کہ اگر عورت راضی ہو تو اس نکاح میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۰۷۱۸)

٦۲۔ ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ ابن شہاب سے سوال کیا گیا کہ ایک نصرانی کے پاس باندی تھی اس سے اولاد ہوگئی پھر وہ مسلمان ہوگئی، ابن شہاب نے کہا اسلام کی وجہ سے ان کے درمیان علیحدگی ہوجائے گی اور اس کو اور اس کی اولاد کو آزاد قرار دیا جائے گا۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۹۹۵۸)

٦۳۔ مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس سے الصائبین کے متعلق سوال کیا گیا، انھوں نے کہا وہ یہود اور نصاری کی ایک درمیان قوم ہے، ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ ان سے نکاح کرنا حلال ہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۰۲۰۸)

٦٤۔زہری بیان کرتے ہیں کہ ابن مسیب سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص پر حد لگائی گئی پھر کسی شخص نے اس حد کی وجہ سے اس کی مذمت کی انھوں نے کہا اگر اس نے سچی توبہ کی تھی تو اس مذمت کرنے والے کو تعزیر لگائی جائے گی۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ١٣٧٥٧)

٦٥۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ ابن شہاب سے سوال کیا گیا کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہو گیا اور وہ اس وقت حاملہ تھی اس کا نفقہ (کھانے پینے کا خرچ) کس پر ہو گا؟ ابن شہاب نے کہا حضرت ابن عمر کی رائے یہ تھی کہ اس کا خرچ اس کے خاوند کے ترکہ سے لیا جائے گا خواہ وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ لیکن ائمہ نے اس کا انکار کیا اور کہا اس کا خرچ اس کے ذمہ نہیں ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ١٢٠٩٤، المحلی ج ١٠ ص ٢٨٩)

٦٦۔مورق العجلی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے سفر میں نماز پڑھنے کے متعلق سوال کیا گیا، انھوں نے کہا دو، دو رکعت نماز پڑھو جس نے سنت کے خلاف کیا اس نے کفران نعمت کیا۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ٤٢٨١)

٦٧۔قتادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے سوال کیا گیا آیا ٹڈی کا کھانا جائز ہے، انھوں نے کہا وہ مکمل ذبح شدہ ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ٨٧٥٣)

٦٨۔نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے پنیر کے متعلق سوال کیا گیا جس کو مجوس بناتے ہیں، انھوں نے کہا میں نے اس کو مسلمانوں کے بازار میں نہیں پایا، میں نے اس کو خرید لیا اور اس کے متعلق سوال نہیں کیا۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ٨٧٨٥)

٦٩۔ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے میت پر مشک لگانے کے متعلق سوال کیا گیا، انھوں نے کہا کیا وہ تمہاری بہترین خوشبو نہیں ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ٦١٣٩)

٧٠۔ابو اسحاق بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے سوال کیا گیا کہ اگر نا تمام مردہ بچہ ساقط ہو جائے تو کیا اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، انھوں نے کہا نہیں حتیٰ کہ وہ آواز سے روئے جب وہ آواز سے روئے گا تو اس پر نماز بھی پڑھی جائے گی اور اس کو وارث بھی بنایا جائے گا۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ٦٥٩٩، سنن کبری للبیہقی ج ٤ ص ٩)

٧١۔عبدالملک بن مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے سوال کیا گیا کہ کوئی شخص کسی عورت کو اس کے خاوند کے لیے حلال کرنے کے قصد سے حلال کرے اس کا کیا حکم ہے فرمایا یہ زنا ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ١٠٧٧٦، سنن کبری للبیہقی ج ٧ ص ٢٠٨)

٧٢۔حضرت ابن عمر سے متعہ کے متعلق سوال کیا گیا انھوں نے کہا یہ زنا ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ١٤٠٤٢)

٧٣۔شعبی سے سوال کیا گیا آیا عورت نماز جنازہ پڑھ سکتی ہے؟ انھوں نے کہا عورت نماز جنازہ نہ پڑھے خواہ وہ حائضہ ہو یا

پاک ہو۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٦٢٩٧)

٧٤۔ابن طاؤس بیان کرتے ہیں کہ میرے والد سے بچہ کے ذبیحہ کے متعلق سوال کیا گیا انھوں نے کہا اگر وہ چھری پکڑ سکتا ہے تو جائز ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٨٠٠٠)

٧٥۔مجاہد بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر سے استمناء کے متعلق سوال کیا گیا انھوں نے کہا وہ شخص اپنے نفس سے زنا کرنے والا ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:١٣٥٨٧)

٧٦۔عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا پھر اس نے اس عورت سے نکاح کا ارادہ کیا، آیا یہ جائز ہے؟ حضرت ابو بکر نے فرمایا اس کے لیے اس سے افضل توبہ نہیں ہے کہ وہ اس عورت سے نکاح کرلے، وہ دونوں زنا سے نکل کر نکاح کی طرف آگئے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:١٢٧٩٥)

٧٧۔موسیٰ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر سے زمین کو کرائے پر دینے کے متعلق سوال کیا گیا، انھوں نے کہا میری زمین اور میرا اونٹ برابر ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:١٤٤٥٨، سنن کبری للبیہقی ج٦ ص ١٣٣)

٧٨۔معمر بیان کرتے ہیں کہ حسن سے سوال کیا گیا آیا صراف کا طعام کھانا جائز ہے؟ انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہود اور نصاریٰ کے بعد مبعوث کیا ہے، وہ سود کھاتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان کا طعام حلال کر دیا ہے۔ (ہمارے نزدیک اس سے بچنا چاہیے کیونکہ صراف سونے چاندی کی ادھار بیع بھی کرتے ہیں اور یہ ممنوع ہے۔)

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:١٤٦٨١)

٧٩۔صاعد بیان کرتے ہیں کہ شعبی سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص ایک جماعت کو نماز پڑھا رہا تھا، اس نے ایک یا دو رکعت نماز پڑھائی پھر وہ کسی چیز کو دیکھ کر ڈر گیا اور اس نے اپنی نماز توڑ دی۔ شعبی نے کہا وہ از سر نو نماز پڑھیں۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٣٦٥٨)

٨٠۔معمر بیان کرتے ہیں کہ زہری سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی تلوار سے ذبح کیا اور اس نے ذبیحہ کا سر کاٹ ڈالا۔ زہری نے کہا اس نے برا کام کیا، اس شخص نے پوچھا آیا وہ ذبیحہ کو کھالے؟ انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٨٦٠٠)

٨١۔معمر بیان کرتے ہیں کہ زہری سے سوال کیا گیا کہ یتیم کے مال کے ساتھ کیا کیا جائے، زہری نے کہا اس کے مال میں سب صورتیں جائز ہیں، بعض لوگ اس کے مال سے قرض لے کر اس کی حفاظت کرتے تھے، تاکہ وہ مال ضائع نہ ہو اور بعض یہ کہتے کہ اس کا مال امانت ہے میں اس مال کو صرف اس کے مالک کو ادا کروں گا، اور بعض اس کے مال کو

مضاربت میں لگا دیتے، ان میں سے ہر صورت نیت پر موقوف ہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۷۰۰۰)

۸۲۔ علی بن حاکم بیان کرتے ہیں کہ شعبی سے سوال کیا کہ ایک شخص نے تکیہ کے او پر اپنی بیوی کو طلاق لکھ دی؟ انھوں نے کہا یہ جائز ہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۱۴۴۰)

۸۳۔ ابو خالد بیان کرتے ہیں کہ شعبی سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق واقع کرنے کا اختیار دیا وہ خاموش رہی، اس نے دوسری مرتبہ اختیار دیا وہ خاموش رہی اس نے تیسری بار اختیار دیا تو اس عورت نے اپنے نفس کو اختیار کر لیا، شعبی نے کہا اب وہ عورت اس کے او پر حلال نہیں ہے حتی کہ وہ شوہر کے علاوہ کسی اور شخص سے نکاح کر لے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۱۹۹۰)

۸۴۔ ثوری بیان کرتے ہیں کہ شعبی سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے ایک معین جگہ تک کے لیے سواری کو کرایہ پر لیا، پھر اس جگہ کے آنے سے پہلے اس کا کام ہو گیا، شعبی نے کہا وہ اس جگہ کے حساب سے اجرت دے گا۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۴۹۳۶)

۸۵۔ معمر بیان کرتے ہیں کہ زہری سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کسی کے ہاں مہمان ہوا اس نے ان کے ہاں خیانت کی، زہری نے کہا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۸۸۶۵)

۸۶۔ عبید اللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ قاسم بن محمد اور سالم بن عبد اللہ سے سوال کیا گیا کہ بچہ کو حد کب لگائی جائے گی انھوں نے کہا جب اس کے زیر ناف بال نکل آئیں۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۸۷۳۶)

۸۷۔ ثوری بیان کرتے ہیں کہ حماد سے سوال کیا گیا کہ آیا میت کے ناخن کاٹنا جائز ہے، انھوں نے کہا یہ بتاؤ کہ اگر وہ غیر مختون ہو تو کیا تم اس کا ختنہ کرو گے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۶۲۳۳)

۸۸۔ ہمام بن منبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبد اللہ سے نشرہ (افسوں، منتر) کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا یہ شیطان کے عمل سے ہے۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۱۹۷۶۲)

۸۹۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے سوال کیا گیا کہ آدمی نے جس جگہ فرض نماز پڑھی ہو آیا وہیں نفل پڑھ سکتا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔

(مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۳۹۲۴)

۹۰۔ ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطاء سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص اپنے منہ کو ڈھانپ کر نماز پڑھتا ہے؟ انھوں نے کہا میرے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ وہ منہ کھول کر نماز پڑھے، کیونکہ میں نے حضرت ابو ہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم

نماز پڑھتے ہوتو اپنے رب سے سرگوشی کرتے ہو۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٤٠٥٩)

٩١۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطاء سے سوال کیا گیا کہ آیا نابینا شخص لوگوں کی امامت کرا سکتا ہے؟ عطاء نے کہا اگر وہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ فقیہ ہوتو وہ کیوں نہ نماز پڑھائے،ایک شخص نے عطاء سے کہا کہ الا یہ کہ وہ قبلہ میں خطا کرے،عطاء نے کہا اگر وہ خطاء کرے تو تم اس کو درست کر دو، جب وہ زیادہ فقیہ ہوتو اسی کو نماز پڑھانی چاہیے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٣٨٣١)

٩٢۔ابن حرملہ بیان کرتے ہیں کہ سعید بن المسیب سے سوال کیا گیا اگر محرم چچڑی کو قتل کر دے تو اس پر کیا تاوان ہے،انھوں نے کہا ایک یا دو کھجور صدقہ کر دے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٨٤٠٤)

٩٣۔ابوعبداللہ بیان کرتے ہیں کہ سلمان سے سوال کیا گیا کہ آیا پنیر،جنگلی گدھے اور گھی کو کھانا جائز ہے،انھوں نے کہا کہ اللہ کا حلال وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے قرآن عظیم میں حلال کر دیا اور اللہ کا حرام وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے قرآن مجید میں حرام کر دیا،ان کے ماسوا جو چیزیں ہیں وہ مباح ہیں۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٨٧٦٥)

٩٤۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطاء سے سوال کیا گیا کہ جو عورت اعتکاف میں بیٹھی ہو آیا وہ بناؤ سنگھار کرے؟ انھوں نے کہا نہیں کیا وہ ارادہ کرتی ہے کہ اس کا خاوند اس کے ساتھ مباشرت کرے،انھوں نے کہا وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔اعتکاف تو عبادت ہے اور عورت اپنے خاوند کے لیے بناؤ سنگھار کرتی ہے اور خوشبو لگاتی ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٨١٠٤)

٩٥۔بکر بیان کرتے ہیں کہ طاؤس سے سوال کیا گیا کہ فریضہ حج ادا کرنے کے بعد مزید حج کرنا افضل ہے یا صدقہ کرنا؟ انھوں نے کہا،کہاں احرام باندھنا،سفر کرنا،شب بیداری کرنا،اللہ کی راہ میں تھکنا،بیت اللہ کا طواف کرنا،حرم میں نماز پڑھنا،میدان عرفات میں وقوف کرنا،مزدلفہ میں وقوف کرنا،رمی جمار کرنا،گویا وہ کہتے تھے حج افضل ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٨٨٢٢)

٩٦۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطاء سے سوال کیا گیا کہ اگر کوئی مشرک کسی مسلمان کے پاس بغیر کسی معاہدہ کے آجائے؟ انھوں نے کہا اس کو اختیار ہے چاہے اسے اپنے پاس رکھ لے اور چاہے اس کو اس کے ٹھکانے پر پہنچا دے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:٩٦٥٢)

٩٧۔علقمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے عزل کے متعلق سوال کیا گیا انھوں نے کہا اگر اللہ نے آدم کی پشت میں کسی روح سے میثاق لے لیا ہے تو اگر وہ اپنے نطفہ کو پتھر پر گرا دے تو اللہ تعالیٰ اس پتھر سے بچہ پیدا کر دے گا،تم عزل کرو یا نہ کرو۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:١٢٥٦٨)

۹۸۔ابوالضحی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن معقل سے سوال کیا گیا کہ کسی شخص نے کسی کانے کی کانی آنکھ نکال دی؟ انھوں نے کہا اس میں نصف دیت ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۱۷٤۳٥)

۹۹۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطاء سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ ایک ماہ تک اپنی بیوی کے قریب نہیں جائے گا، پھر وہ پانچ ماہ تک اس کے قریب نہیں گیا؟ انھوں نے کہا یہ ایلاء نہیں ہے۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۱۱٦۲۰)

۱۰۰۔ابن جریج بیان کرتے ہیں کہ عطاء سے سوال کیا گیا کہ کسی شخص کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنے نوکر کو رمضان میں روزے نہ رکھنے پر مجبور کرے؟ انھوں نے کہا نہیں، اس نے کہا کیا بکریاں چرانے والے کے لیے روزہ رکھنے کی رخصت ہے؟ انھوں نے کہا میں نے اس کے لیے رخصت نہیں سنی۔

(مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث:۷٥٦۹)

غیر مقلد علماء کی عبارات سے تقلید پر استدلال:

ہم نے فسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون۔(النحل:٤۳) سے تقلید پر استدلال کیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تمہیں کوئی مسئلہ معلوم نہ ہو تو اس کے متعلق اہل علم سے سوال کرو اور ہم نے جو ایک سو آثار صحابہ اور اقوال تابعین پیش کیے ہیں ان میں اسی چیز کا بیان ہے اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور ان کے اتباع سب یہی سمجھتے تھے کہ اس آیت کا یہی معنی ہے اس کے برخلاف غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس آیت میں مطلق سوال کرنے کا حکم ہے یا عام چیزوں کے متعلق سوال کرنے کا حکم ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ تم پیش آمدہ مسائل میں اہل علم سے کتاب اور سنت کے دلائل یا کتاب اور سنت کی تصریحات کا سوال کرو، حالانکہ ان مذکور الصدر آثار سے واضح ہو گیا ہے کہ تابعین اور تبع تابعین ان سے اپنے پیش آمدہ مسائل میں رجوع کرتے تھے اور ان سے کتاب اور سنت سے دلائل دینے کا مطالبہ نہیں کرتے تھے کیونکہ انھیں ان پر اعتماد تھا کہ وہ اپنے اجتہاد سے جو بھی فتویٰ دیں گے وہ کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا اور اسی معنی میں مقلدین اپنے ائمہ کی تقلید کرتے ہیں۔

حافظ عبداللہ روپڑی متوفی ۱۳۸٤ھ تقلید کے خلاف بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور تقلید فی نفسہ بھی بدعت ہے محدث ہے کیونکہ ہم قطعاً جانتے ہیں کہ صحابہ کے زمانہ میں کسی شخص کا مذہب معین نہیں تھا، جو اس کو حاصل کیا جائے یا اس کی تقلید کی جائے اور سوا اس کے نہیں کہ حادثوں میں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے تھے جبکہ کتاب و سنت میں دلیل نہ ملتی، اور اسی طرح تابعین کی حالت تھی وہ بھی کتاب وسنت کی طرف رجوع کرتے تھے، پس اگر کوئی مسئلہ کتاب وسنت میں نہ پاتے تو اس بات کو دیکھتے جس پر صحابہ کا اجماع ہے، اگر اجماع بھی نہ پاتے تو اپنے طور پر اجتہاد کرتے اور بعض صحابی کے قول کو لیتے اور اس کو اللہ کے دین میں قوی سمجھتے۔

(فتاوی اہل حدیث ج۱ ص٦۱۔مطبوعہ ادارہ احیاء السنۃ النبویہ سرگودھا،۱٤۰٤ھ)

حافظ روپڑی نے لکھا ہے پیش آمدہ مسائل میں صحابہ اور تابعین کا عام اور غالب طریقہ یہ تھا کہ وہ کتاب وسنت کی طرف رجوع

کرتے تھے یعنی کسی کے قول پر عمل نہیں کرتے تھے اور ہم نے جو ایک سو آثار صحابہ اور اقوال تابعین پیش کیے ہیں ان سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ حافظ روپڑی کا یہ کہنا خلاف واقع ہے۔

ظاہر ہے کہ غیر مقلدین عوام میں سے ہر شخص قرآن وسنت سے براہ راست مسائل کا استخراج نہیں کر سکتا اور وہ پیش آمدہ مسائل میں اپنے علماء کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان سے فتوے طلب کرتا ہے اور وہ بھی ہر فتوی میں قرآن وحدیث سے دلائل پیش نہیں کرتے بلکہ اس مسئلہ کا حکم بتاتے ہیں، سو غیر مقلدین بھی اپنے علماء کی تقلید کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان علماء کا علم امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کے پائے کا نہیں ہوتا تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان عام علماء کی بجائے ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک تقلید کر لی جائے۔

ہم نے ابھی حافظ روپڑی کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ حادثوں (پیش آمدہ مسائل) میں کتاب وسنت یا اجماع کی طرف رجوع کرنا چاہیے، حافظ روپڑی کا فتاوی اہل حدیث کے نام سے ایک مجموع فتاوی ہے ہم نے یہ دیکھا ہے کہ حافظ روپڑی نے بہت سے سوالات کے جوابات میں صرف اپنا قول نقل کیا ہے اور قرآن وسنت سے دلائل نہیں دیے، اور سائلین نے ان کے اقوال پر ہی عمل کیا ہوگا۔ علماء غیر مقلدین کے دیگر مجموع ہائے فتاوی کا بھی یہی حال ہے تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ حافظ روپڑی، شیخ نذیر حسین دہلوی اور شیخ عبدالستار کے اقوال کی تقلید کرنے کی بجائے عوام غیر مقلدین ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی تقلید کریں جن کے اقوال پر کتاب وسنت سے دلائل موجود ہیں اور اس موضوع پر بیسیوں کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔

اب ہم فتاوی اہل حدیث سے چند مثالیں پیش کر رہے ہیں جن میں حافظ روپڑی نے کتاب وسنت سے دلائل پیش کرنے کی بجائے صرف اپنے اقوال پیش کیے ہیں:

۱۔سوال: پانی میں پاک شے پڑ جائے اور اس کا رنگ، بو، مزا بدل جائے کیا اس پانی سے غسل و وضو ہو سکتا ہے؟

جواب: پانی میں پاک شے پڑنے سے بعض دفعہ اس کا نام کچھ اور ہو جاتا ہے۔ مثلاً شربت یا عرق یا لسی وغیرہ تو اس سے وضو اور غسل نہیں ہوگا، ہاں اگر پانی کا نام نہ بدلے جیسے کنویں میں پتے گرنے سے رنگ بو، مزا بدل جاتا ہے مگر اس کا نام پانی ہی رہتا ہے، دوسرا نام اس پر نہیں بولا جاتا اس لیے اس سے وضو یا غسل وغیرہ بالاتفاق درست ہے۔

(فتاوی اہل حدیث: ج۱ص ۲۳۵، مطبوعہ سرگودھا)

۲۔سوال: کوئی شخص اپنی دکان کا سامان خریدنے کے لیے دوسرے شہروں کو جاتا ہے کیا وہ دوگانہ پڑھ سکتا ہے۔ اگر پڑھ سکتا ہے تو اپنے شہر سے کتنے فاصلے پر جا کر دوگانہ پڑھے؟

جواب: دکان کے لیے سامان خریدنے کے لیے یا کسی اور ضرورت کے تحت سفر پر روانہ ہو تو وہ دوگانہ پڑھ سکتا ہے۔ سفر خواہ ریل کا ہو یا لاری کا، جب اپنے گاؤں یا شہر کی حدود سے نکل جائے تو وہ دوگانہ شروع کر دے کیونکہ حدود سے نکلتے ہی دوگانہ شروع ہو جاتا ہے۔

(فتاوی اہل حدیث۔ ج۱ص ۵۹۰، مطبوعہ سرگودھا)

۳۔سوال: جن گھڑوں اور برتنوں کی مٹی لید یا گوبر کے ساتھ گوندھی گئی ہو تو ان کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جن گھڑوں اور برتنوں کی مٹی لید اور گوبر سے گوندھی جائے تو وہ برتن پاک ہیں اول تو پکنے سے وہ چیز جل جاتی ہے، صرف مٹی رہ

جاتی ہے دوسرے گوبر وغیرہ کو ماکول اللحم جانور کا پاک ہے۔

(فتاوی اہل حدیث: ج۱ص ۵۹۰، مطبوعہ سرگودھا)

۴۔سوال: کارخانہ یا مشین پر زکوۃ ہے؟

جواب: کارخانہ یا مشین جس میں مال تیار ہو کر نکلتا ہے، اس کی قیمت مال تجارت میں نہیں لگائی جائے گی، کیونکہ یہ ذریعہ کسب ہے جیسے اوزار ہوتے ہیں، پس اس میں صرف تیار شدہ مال اور غیر تیار شدہ مال کی قیمت لگائی جائے گی۔

(فتاوی اہل حدیث: ج۱ص ۱۸۷، مطبوعہ سرگودھا)

۵۔سوال: جو شخص مقروض ہو کیا اس پر زکوۃ ہے؟

جواب: اگر اور جائیداد ہو جس سے قرض ادا ہو سکتا ہو تو زکوۃ دینی پڑے گی ورنہ نہیں۔

(فتاوی اہل حدیث: ج۲ص ۱۹۰، مطبوعہ سرگودھا)

۶۔سوال: بیر بہوٹی، کچھوا، جونک، قضیب گاؤ (بیل کا آلہ تناسل) قضیب ریچھ، چربی شیر مذکور بالا اشیاء کا استعمال بطور دوائی جائز ہے؟

جواب: بیر بوٹی، کیچوے، جونکیں اور اسی قسم کی دوسری اشیاء جن میں دم سائل (وہ خون جو ذبح کے وقت بہہ جاتا ہے) نہیں وہ سب پاک ہیں اس لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب مکھی برتن میں یا کھانے میں گر جائے تو اس کو ڈبو دے کیونکہ اس کے ایک پر میں شفا ہے دوسرے میں بیماری ہے۔ (الی قولہ) سانڈھا گوہ کی قسم ہے اس کا استعمال بھی ہر طرح سے جائز ہے، نیز کچھوے کا کھانے کے علاوہ استعمال میں کوئی حرج نہیں، قضیب گاؤ، حنفیہ کے نزدیک مکروہ ہے مگر یہ مذہب صحیح نہیں ہے بلکہ ماکول اللحم کا گوبر پیشاب تک پاک اور حلال ہے، ریچھ اور شیر چونکہ قطعاً حرام ہیں اس لیے ریچھ کی قضیب (آلت) اور شیر کی چربی وغیرہ بھی اسی حکم میں ہیں، ہاں کھانے کے علاوہ کسی اور طریق سے استعمال منع نہیں کیا جاتا۔

(فتاوی اہل حدیث: ج۱ص ۵۶۶، مطبوعہ سرگودھا)

فتاوی اہل حدیث سے جوابات نقل کیے گئے ہیں ان میں جوابات پر کتاب وسنت سے تصریحات پیش نہیں کی گئیں اور نہ ان پر اجماع صحابہ سے استدلال کیا گیا ہے یہ محض غیر مقلدین علماء کے اقوال ہیں۔ سو ان اقوال پر جو لوگ عمل کریں گے وہ بھی مقلد ہی ہوں گے، غیر مقلد نہیں ہوں گے، یہ اور بات ہے کہ ہم ائمہ مجتہدین کی تقلید کرتے ہیں اور یہ اس زمانہ کے مولویوں کی تقلید کرتے ہیں جن کے علم و فضل اور زہد وتقوی کی ائمہ اربعہ کے علم وفضل اور زہد وتقوی کے مقابلہ میں کوئی نسبت نہیں ہے اور کوئی صاحب انصاف اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکے گا۔

اب ہم پہلے تقلید کی ضرورت کو بیان کریں گے، پھر تقلید شخصی پر دلائل دیں گے اور اس کے بعد تقلید کے جواز پر مستند علماء کی تصریحات اور تقریرات کو بیان کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق و بہ الاستعانۃ یلیق۔

تقلید کی ضرورت:

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اصولی طور پر تمام احکام بیان کر دیئے ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہر شخص کے لیے یہ عادتاً ممکن نہیں ہے کہ وہ بذات خود تمام احکام شرعیہ قرآن مجید کی آیات سے مستنبط کر سکے، کیونکہ اول تو

قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے لغت عربی، صرف ونحو اور علم بلاغت کو حاصل کرنا ایک طویل اور صبر آزما کام ہے، پھر قرآن مجید میں بعض جگہ تو احکام صراحتاً امر اور نہی کے صیغہ سے بیان کیے گئے ہیں اور بعض جگہ امر اور نہی کا صیغہ نہیں استعمال کیا گیا بلکہ مختلف اسالیب سے کسی چیز کا وجوب یا تحریم سمجھ میں آتی ہے، جس کو جاننے کے لیے بہت باریک بینی اور دقت نظری کی ضرورت ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں شراب اور جوئے کو صراحتاً حرام نہیں فرمایا بلکہ ایک خاص اسلوب سے فرمایا:

یا ایھا الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاف والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلم تفلحون۔ انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصد کم عن ذکر اللہ وعن الصلوۃ فھل انتم منتھون۔

(المائدہ: ۹۰، ۹۱)

اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں پر جانوروں کی بھینٹ اور پانسے پھینکنا یہ سب محض ناپاک اور شیطانی کام ہیں ان سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو۔ شیطان صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے درمیان بغض اور عداوت پیدا کرے اور تم کو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکے، کیا اب تم باز آجاؤ گے؟

قرآن مجید بعض اوقات کسی مسئلہ کی لم اور علت بیان کر دیتا ہے اس کی شرائط اور موانع ذکر نہیں کرتا، نہ اس کی تمام جزئیات بیان کرتا ہے۔ مثلاً خمر (انگور کی شراب) کے بیان میں اس کے نشہ آور ہونے کا ذکر فرمایا ہے لیکن یہ نہیں فرمایا کہ ہر نشہ آور چیز حرام ہے نہ یہ فرمایا ہے کہ نشہ آور چیز کو مقدار نشہ تک پینا حرام ہے یا اس کا مطلقاً پینا حرام ہے؟ نشہ آور چیز پر حد ہے یا نہیں؟ اگر حد ہے تو کتنی ہے؟ ان تمام جزئیات اور تفصیلات کو جاننا ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔

قرآن مجید میں کبھی کوئی حکم اجمالاً بیان کیا جاتا ہے جس کی تفصیل متعین کرنے کے لیے دلائل کی چھان بین کرنا عام آدمی کی استطاعت سے باہر ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وامسحوا بروسکم۔ (المائدہ: ۶)

اپنے سروں کا مسح کرو۔

اس آیت سے یہ پتا نہیں چلتا کہ پورے سر کا مسح کرنا فرض ہے یا چوتھائی سر کا مسح کرنا فرض ہے یا ایک بال پر مسح کرنے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید میں کہیں ایک حکم کو مطلقاً بیان کیا جاتا ہے اور کہیں وہی حکم مقید کا ذکر ہوتا ہے، مثلاً قرآن مجید میں ہے:

انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ۔ (البقرہ: ۱۷۳)

تم پر صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جس جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے حرام کیا گیا ہے۔

اس آیت میں مطلقاً خون کو حرام قرار دیا ہے اور ایک جگہ یوں ہے:

الا ان یکون میتۃ او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانہ رجس۔ (الانعام: ۱۴۵)

مگر یہ کہ مردار ہو یا بہنے والا خون ہو یا خنزیر کا گوشت کیونکہ یہ ناپاک ہیں۔

اس آیت میں مطلقاً خون نہیں بلکہ بہنے والا خون حرام فرمایا ہے، اسی طرح کفارہ ظہار میں غلام آزاد کرنے اور دو ماہ تک مسلسل روزوں کے ساتھ قبل از مباشرت کی قید ہے اور کھانا کھلانے کے ساتھ یہ قید نہیں ہے، ان صورتوں میں کیا مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا یا نہیں، یہ ایک بہت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔

قرآن مجید کی بعض آیات کا حکم منسوخ ہو گیا مثلاً بیوہ عورت کی عدت اس آیت میں ایک سال بیان کی گئی ہے:

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا وصیة لازواجھم متاعا الی الحول غیر اخراج۔ (البقرہ: ۲۴۰)

جو لوگ تم میں فوت ہو جائیں اور اپنی بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ اپنی بیویوں کے لیے نکالے بغیر ایک سال کی وصیت کر جائیں۔

اور ایک اور آیت میں بیوہ عورت کی عدت چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے:

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر عشرا۔ (البقرہ: ۲۳۴)

اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ان میں کون سی آیت ناسخ ہے اور کونسی منسوخ ہے، یہ عام آدمی کے بس سے باہر ہے، اس قسم کی علمی باریکیاں اور فقہی پیچیدگیاں بہت زیادہ ہیں۔ ان چند مثالوں سے باقی مشکلات کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

احادیث سے احکام مستنبط کرنے میں ایک دشواری یہ ہے کہ احادیث مختلف اسانید سے مروی ہیں جن میں سند متواتر سے لے کر سند غریب تک اور سند صحیح سے لے کر سند ضعیف تک احادیث ذخیرہ کتب میں موجود ہیں، بلکہ موضوع روایات بھی ہیں جس طرح ایک جیسی شیشیوں میں ایک جیسا سفید رنگ کا مائع مادہ ہو اور ہر مادہ کی تاثیر الگ الگ ہو، کوئی مادہ کسی مرض میں مفید ہو اور دوسرا مادہ اس میں مضر ہو تو ان مادوں اور دواؤں کو باہم متمیز کرنے کے لیے کیمسٹری کے کسی بہت بڑے ماہر کی ضرورت ہو گی جو مختلف کیمیائی تجربات کے بعد یہ فیصلہ کرے گا کہ کون سی شیشی میں کون سی دوا ہے اسی طرح جب کوئی شخص علم حدیث میں مہارت حاصل کیے بغیر احادیث پر عمل کرے گا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ صحیح حدیث کے مقابلہ میں کسی ضعیف یا منسوخ روایت پر عمل کرے گا۔

احادیث سے احکام مستنبط کرنے میں ایک ضرورت یہ ہے کہ احادیث سے احکام شرعیہ حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ احکام سے متعلق احادیث پر اس کو عبور ہو کیونکہ جس حدیث پر وہ عمل کر رہا ہے ہو سکتا ہے دوسری جگہ اس کے خلاف حدیث ہو جس سے وہ حکم منسوخ ہو گیا ہو یا اس حدیث کے حکم کی تفصیل دوسری حدیث میں موجود ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلہ میں حدیث نہ ملنے کی بناء پر وہ قیاس کر رہا ہو حالانکہ اس مسئلہ میں حدیث موجود ہے، اس لیے احادیث سے احکام حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ احکام سے متعلق تمام احادیث اس کی نظر میں ہوں، اور یہی حال قرآن مجید سے احکام حاصل کرنے کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث سے احکام حاصل کرنے کے لیے جس وسعت علم اور دقت نظری کی ضرورت ہے یہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور صرف ائمہ مجتہدین ہی اس پر آشوب گھاٹی کے پار اتر سکتے ہیں۔ اس لیے عام آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید کرے۔

سبع مثانی کسے کہتے ہیں

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾

(سورۃ الحجر: آیت 87)

ولقد اتینک سبعا من المثانی والقران العظیم

اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔

اَلۡمَثَانِیۡ، مَثۡنَاۃٌ کی جمع ہے اور مَثۡنَاۃٌ اسم ظرف ہے۔ یا مُثۡنِیَۃٌ کی جمع ہے اور مُثۡنِیَۃٌ اسم فاعل ہے، بہر حال اس کا موصوف محذوف ہے، یعنی آیات یا سُوَر (سورتیں)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود نے فرمایا: سات مثانی سے مراد ہے: سورۃ فاتحہ جس کی سات آیات ہیں۔ قتادہ، حسن بصری، عطاء اور سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اُمّ القرآن (سورۃ فاتحہ) سات (آیات) ہیں، مثانی (نماز میں بار بار پڑھی جانے والی) اور (یہی) قرآن عظیم ہے۔ مثانی کہنے کی وجوہ متعدد بیان کی گئی ہیں۔ حضرت ابن عباس، حسن اور قتادہ کے نزدیک نماز میں بار بار یعنی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے، اس لیے مثانی کہا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے دو حصے ہیں: نصف تو اللہ کیلئے ہے جس میں اللہ کی ثنا کی گئی ہے اور نصف دعا ہے جو بندہ کیلئے ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ فرماتا ہے: میں نے (سورۃ) صلوٰۃ (یعنی سورۃ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کیلئے آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے۔ الی آخر الحدیث۔ سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

حسین بن فضل نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ سورۃ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی، ایک بار مکہ شریف میں اور دوسری بار مدینہ پاک میں۔ ہر مرتبہ ستر ہزار فرشتے سورۃ فاتحہ کے جلو میں تھے۔ مجاہد نے کہا: مثانی کا معنی ہے: منتخب، چھانٹی ہوئی۔ اللہ نے یہ سورۃ اس امت کیلئے چھانٹ کر رکھ لی تھی، کسی دوسری امت کو عطا نہیں فرمائی۔ ابو زید بلخی نے کہا: ثَنَیۡتُ الۡعِنَانَ کا معنی ہے: میں نے لگام کو پھیر دیا، موڑ دیا۔ یہ سورۃ بھی شریروں اور بدکاروں کو بدکاری سے پھیر دیتی ہے۔ بعض نے کہا: مثانی، ثناء سے ہے۔ اس سورۃ میں اللہ کی ثناء کی گئی ہے، یعنی اللہ کی عظیم صفات کا بیان ہے۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ سبعاً سے مراد ہیں: سات سورتیں اور مِنَ الۡمَثَانِیۡ میں مِن بیانیہ ہے (سات سورتیں یعنی مثانی) اور سات سورتوں سے مراد سبع طوال ہیں جن میں سب سے اوّل سورۃ بقرہ ہے اور سورۃ انفال و سورۃ توبہ کا مجموعہ ہے۔ یہ دونوں سورتیں ایک سورت کے حکم میں ہیں، اسی لیے دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی جاتی، سطر خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ بعض نے کہا: سبع طوال میں آخری سورت صرف سورۃ توبہ ہے۔ بعض کے نزدیک آخری سورت سورۃ یونس ہے۔

حضرت ابن عباس نے مثانی کہنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ ان ساتوں سورتوں میں فرائض، حدود، امثال، خیر و شر اور عبرت

آفریں الفاظ (وقصص) کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔(۱)[حضرت عمر بن خطاب نے آیت لَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي کے ذیل میں فرمایا: یہ یعنی سبع مثانی، سبع طوال (سات طویل سورتیں) ہیں۔حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن عباسؓ مجاہد اور سفیان وغیرہم کی طرف بھی یہ قول منسوب ہے۔میں کہتا ہوں: مثانی (بایں معنی) تو سارا قرآن ہے، پورے قرآن میں ایک ہی قصہ بار بار ذکر کیا گیا ہے۔مفسر (رح)]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ مثانی، ثناء سے مشتق ہے۔قرآن، بلاغت اور اعجاز کے لحاظ سے ثنا کردہ بھی ہے اور اللہ کی صفات کو اس نے بیان بھی کیا ہے، اس لیے ثناء کرنے والا بھی ہے۔

محمد بن نصر نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ نے توراۃ کی جگہ مجھے سبع طوال عطا فرمائی ہیں اور انجیل کی جگہ الٓر والی سورتیں طٰسٓ والی سورتوں تک عطا فرمائی ہیں اور زبور کی جگہ طٰسٓ سے حٰمٓ والی سورتوں تک عنایت کی ہیں اور حٰمٓ والی سورتیں مزید عطا فرمائی ہیں اور مُفَصَّلات کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا (یعنی مجھے خاص طور پر مفصلات عطا فرمائی ہیں) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سبع طوال عطا کی گئیں (سات طویل سورتیں عطا کی گئیں) اور حضرت موسیٰ کو چھ عطا کی گئیں، پھر جب حضرت موسیٰ نے تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں تو دو سورتیں اٹھالی گئیں، چار باقی رہ گئیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبع مثانی سے حٰمٓ والی سات سورتیں مراد ہیں۔بغوی نے اپنی سند سے حضرت ثوبان کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ نے توراۃ کی جگہ مجھے سبع طوال عطا فرمائیں اور انجیل کی جگہ مِٔین عطا فرمائیں اور زبور کی جگہ مثانی اور میرے رب نے مفصلات مزید عنایت کیں۔

طاؤس کا قول ہے کہ مثال سے مراد پورا قرآن ہے۔آیت میں آیا ہے: اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ قرآن کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں واقعات وقصص کا بیان لوٹ لوٹ کر بار بار کیا گیا ہے۔اس قول پر مِنَ الْمَثَانِي میں مِن تبعیض کیلئے ہوگا اور سبع سے مراد سات سورتیں ہوں گی (یعنی قرآن کی سات سورتیں ہم نے تم کو دیں)۔

بعض کے نزدیک مثانی سے مراد پورا قرآن ہے اور سبعہ سے مراد ہیں: ساتوں اجزاء یعنی قرآن کو سات حصوں پر تقسیم کیا جائے تو ساتوں حصے یعنی پورا قرآن مراد ہے۔اس قول پر والقُرآنَ العَظِيم کا عطف صرف اختلاف صفت کی وجہ سے ہوگا (جیسے کہا جاتا ہے: زید عالم ہے اور نیک ہے اور مالدار ہے اور شریف النسب ہے)۔بہر حال اقوال مذکورہ بالا کے لحاظ سے القرآن العظیم کا عطف ایسا ہوگا جیسا کل کا اس کے جزء پر کر دیا جاتا ہے۔یا ایسا ہوگا جیسا عام کا خاص پر عطف ہوتا ہے۔

صدقہ کن پہ خرچ کریں

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور رشتہ داروں، اور مسکینوں اور مسافروں کا حق ان کو دیتے رہو، اور اسراف اور فضول خرچ کرنے سے بچو۔ (بنی اسرائیل:۲۶)

جن لوگوں پر خرچ کرنا انسان پر واجب ہے اس کے متعلق مذاہب فقہاء:

اس آیت میں کس سے خطاب کیا گیا ہے اس میں بھی دو قول ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ مال فی اور مال غنیمت میں سے جو مال آپ کو حاصل ہو اس میں سے آپ اپنے قرابت داروں کے حقوق ادا کریں اور مسکینوں اور مسافروں کو بھی عطا کریں، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس آیت میں تمام انسانوں سے خطاب ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ جب تم ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے سے فارغ ہو گئے تو اب تم پر واجب ہے کہ تم باقی اقارب سے بھی نیک سلوک کرو اور جو زیادہ قریب ہو اس کا حق پہلے ادا کرو، پھر درجہ بہ درجہ اور پھر مسکینوں اور مسافروں کی اصلاح میں مال خرچ کرو۔

علامہ عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور قرابت داروں کو ان کا حق دیتے رہو، اس کی تفسیر میں دو قول ہیں؛

۱۔ اس سے انسان کے قرابت دار مراد ہیں خواہ وہ باپ کی طرف سے قرابت دار ہوں یا ماں کی طرف سے، یہ حضرت ابن عباس اور حسن کا قول ہے اور اس بنا پر ان کے حق کی تین تفسیریں ہیں: (ا) ان کے ساتھ نیکی اور صلہ رحم کیا جائے۔ (ب) ضرور کے وقت ان کے جو اخراجات واجب ہیں وہ ادا کیے جائیں۔ (ج) وفات کے وقت ان کے متعلق وصیت کی جائے۔

۲۔ حضرت علی بن حسین نے کہا اس سے مراد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قرابت دار ہیں اور اس بنا پر ان کا حق یہ ہے کہ ان کو خمس دیا جائے اور یہ خطاب حکام کی طرف متوجہ ہے۔

اور مسکینوں اور مسافروں کے متعلق قاضی ابو یعلی نے کہا اس سے مراد صدقات واجبہ ہیں یعنی ان کی زکوۃ ادا کی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حق سے مراد یہ ہو کہ جب ان کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ ان کو دی جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسکین کا حق صدقہ ہے اور مسافر کا حق اس کو کھانا کھلانا ہے۔

(زاد المسیر ج ۵ص ۲۷، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۷ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے قرابت داروں کو ان کا حق ادا کرو، یہ آیت مجمل ہے اس میں یہ بیان نہیں ہے کہ وہ حق کیا ہے؟ امام شافعی کے نزدیک صرف اولاد اور والدین پر خرچ کرنا واجب ہے، اور بعض علماء نے کہا کہ محارم پر بھی بقدر ضرورت خرچ کرنا واجب ہے اور اس پر اتفاق ہے کہ جو رشتہ دار محارم نہیں ہیں جیسے چچا زاد ماموں زاد وغیرہ ان کا صرف یہ حق ہے کہ ان سے تعلق رکھا جائے اور ان سے ملاقات کی جائے، اور ان سے حسن معاشرت رکھی جائے اور تنگی اور خوشی میں ان سے میل جول برقرار رکھا جائے، اور مسکینوں اور مسافروں کو زکوۃ میں سے حصہ دیا جائے، مسکینوں کو اتنا دینا واجب ہے جو ان کی اور ان کے بچوں کی خوارک کے لیے کافی ہو اور مسافر کو اتنا دینا واجب ہے جو اس کی سفر کی دیگر ضروریات کے لیے کافی ہو۔

(تفسیر کبیر ج ۷ص ۳۲۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابو البرکات نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ لکھتے ہیں:

اپنے ان قرابت داروں کو ان کا خرچ دو جو تمہارے محرم ہوں اور فقراء ہوں اور مسکینوں اور مسافروں کو زکوٰۃ سے ان کا حق ادا کرو۔
(مدارک التنزیل علی ہامش الخازن ج ۳ ص ۱۷۳، مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور)

قاضی ابوسعود محمد بن محمد حنفی متوفی ۹۸۲ھ لکھتے ہیں:

قرابت دار سے مراد محارم ہیں اور ان کے حق سے مراد ان کا خرچ ہے۔
(تفسیر ابوسعود ج ٤ ص ۱۲۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

علامہ محمد بن مصلح الدین مصطفیٰ القوجوی الحنفی المتوفی ۹۵۱ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم والدین کے ساتھ نیکی کرنے سے فارغ ہو گئے تو اب تم پر واجب ہے کہ باقی رشتہ داروں کے ساتھ درجہ بہ درجہ نیکی کرو پھر مسکینوں اور مسافروں کے احوال کی اصلاح کرو اور قرابت داروں کو دو بشرطیکہ وہ محرم ہوں تنگ دست ہوں اور کمانے سے عاجز ہوں، اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک امیر اور خوشحال پر واجب ہے کہ وہ اپنے تنگ دست قرابت داروں پر بقدر ضرورت خرچ کرے۔

(حاشیہ شیخ زادہ علی البیضاوی ج ٥ ص ۳۷۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ)

فقہاء احناف کے نزدیک انسان پر جن لوگوں کا خرچ واجب ہے اس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے، علامہ عبداللہ بن محمود حنفی متوفی ۶۸۳ھ نے جو اس کی تفصیل لکھی ہے میں اس کو اختصار کے ساتھ لکھ رہا ہوں:

انسان پر اس کی بیوی کے کھانے، کپڑوں اور رہائش کا خرچ واجب ہے، اسی طرح نابالغ بچوں کے بھی کھانے، کپڑوں اور رہائش کا خرچ اس پر واجب ہے، اور آباؤ اجداد کا خرچ بھی اس پر واجب ہے، بشرطیکہ وہ ضرورت مند ہوں اور ماں باپ اولاد کے علاوہ دیگر قرابت داروں کا خرچ بھی اس پر واجب ہے، بشرطیکہ وہ محارم ہوں اور تنگ دست ہوں اور کمانے پر قادر نہ ہوں یا کوئی محرم عورت ہو جو تنگ دست ہو۔
(الاختیار جز ٤، ص ۱۲۔ ۳، ملخصاً، مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع)

تبذیر کا معنی:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور تبذیر نہ کرو۔

تبذیر کا معنی ہے تفریق، اس کی اصل ہے زمین میں بذر (بیج) کو پھینک دینا اور پھر اس کا استعارہ ہر اس شخص کے لیے کیا گیا جو اپنے مال جو ضائع کرنے والا ہو، بظاہر بذر (بیج) کو زمین میں متفرق جگہ پھینک دینا بھی اس شخص کے نزدیک مال کو ضائع کرنا ہے جو بیجوں کو زمین میں ڈالنے کے نتیجہ سے ناواقف ہو۔

(المفردات ج ۱ ص ۵۱، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں: تبذیر کے متعلق دو قول ہیں:

۱۔ حضرت ابن مسعود نے کہا اس کا معنی ہے مال کو باطل اور ناجائز جگہوں میں خرچ کرنا، مجاہد نے کہا اگر کوئی شخص اپنے تمام مال کو حق کی راہ میں خرچ کرے تو وہ مبذر نہیں ہے اور اگر وہ ایک کلو چیز بھی ناحق جگہ میں خرچ کرے تو وہ مبذر ہے، زجاج نے کہا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے علاوہ میں خرچ کرنا تبذیر ہے، زمانہ جاہلیت میں لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لیے اونٹوں کو ذبح کیا جاتا تھا اور

مالوں کو خرچ کیا جاتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ صرف اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مال کو خرچ کیا جائے۔

ماوردی نے ذکر کیا ہے کہ مال کو بے فائدہ اور فضول خرچ کرنا اور مال کو ضائع کرنا تبذیر ہے۔

(زادالمسیر ج ۵ ص ۲۷،۲۸، مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

امام فخرالدین محمد بن عمر رازی لکھتے ہیں:

مال کو ضائع کرنا اور اس کو فضول اور بے فائدہ خرچ کرنا تبذیر ہے، عثمان بن اسود نے کہا میں مجاہد کے ساتھ کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا، انھوں نے ابو قبیس پہاڑ کی طرف دیکھ کر کہا اگر کوئی شخص اس پہاڑ کے برابر بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرے تو وہ مسرفین میں سے نہیں ہے اور اگر وہ ایک درہم بھی اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کرے تو وہ مسرفین میں سے ہے، ایک شخص نے کسی نیک کام میں بہت زیادہ مال خرچ کیا تو اس سے کہا گیا کہ اسراف میں کوئی خیر نہیں ہے اس نے کہا خیر میں کوئی اسراف نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۳۲۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۵ھ)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حضرت سعد کے پاس سے گزر ہوا وہ اس وقت وضو کر رہے تھے، آپ نے فرمایا: اے سعد یہ کیا اسراف کر رہے ہو؟ انھوں نے کہا کیا وضو میں بھی اسراف ہے، آپ نے فرمایا ہاں خواہ تم دریا کے بہتے ہوئے پانی سے وضو کر رہے ہو۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۵، مسند احمد ج ۲ ص ۲۲۱، مسند احمد رقم الحدیث: ۷۰۶۵، عالم الکتب بیروت)

اس صورت میں اگرچہ پانی ضائع نہیں ہو رہا، لیکن تین بار سے زیادہ اعضاء وضو کو دھونے میں مومن کے عمل اور وقت کا ضیاع ہو رہا ہے۔

اسراف وتبذیر ومیانہ روی کا بیان

وَلَا تَجۡعَلۡ يَدَكَ مَغۡلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ ٱلۡبَسۡطِ فَتَقۡعُدَ مَلُومًا مَّحۡسُورًا ۝٢٩ ﴿سورۃ اسراء ۲۹﴾

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اپنا ہاتھ اپنی گردن تک بندھا ہوا نہ رکھو اور نہ اس کو بالکل کھول دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ بیٹھے رہو"۔

(بنی اسرائیل: ۲۹)

خرچ میں اعتدال کا واجب ہونا:

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے پر برانگیختہ فرمایا تھا اور اس آیت میں خرچ کرنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کا حال بیان فرمایا ہے:

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک قواما ۔ (الفرقان: ۶۷)

اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں اور ان دونوں کے درمیان معتدل راہ اختیار کرتے ہیں ۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس وصف کے حصول کا حکم فرمایا ہے، یعنی ایسا نہ ہو کہ تم اپنے اوپر، اپنے اہل وعیال اور دیگر ضرورت مندوں پر خرچ کرنے سے کڑھنے لگو، اور نیکی کے راستوں میں خرچ نہ کرنے سے یہ ظاہر ہو کہ تمہارے ہاتھ گردن تک بندھے ہوئے ہیں اور نہ بے تحاشا خرچ کرو کہ لوگوں کو دے دے کر اپنا سارا مال ختم کردو، اور تمہارے ہاتھ میں کچھ نہ رہے ۔

خرچ کرنے کی فضیلت اور خرچ نہ کرنے کی مذمت میں احادیث:

اس آیت میں فرمایا ہے کہ اپنا ہاتھ گردن تک بندھا ہوا نہ رکھو اس کا معنی یہ ہے کہ بخل نہ کرو اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے تنگ دل نہ ہو، بخل کی مذمت میں بہت احادیث ہیں:

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بخیل اور مال خرچ کرنے والوں کی مثال ان دو آدمیوں جیسی ہے جنہوں نے چھاتی سے حلق تک لوہے کے دو جبے پہنے ہوئے ہوں، خرچ کرنے والا جب مال خرچ کرے تو جبہ وسیع ہو کر اس کے جسم پر پھیل جاتا ہے، حتیٰ کہ اس کی انگلیوں اور نشانیوں کو بھی چھپا لیتا ہے اور بخیل جب خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ہر حلقہ اپنی جگہ سے چمٹ جاتا ہے وہ اسے کھولنا چاہتا ہے لیکن کھول نہیں سکتا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۴۴۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۵۴۷، مسند احمد رقم الحدیث: ۹۰۴۵، عالم الکتب بیروت)

حضرت اسماء بنت ابی بکر بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا خرچ کرو اور گن گن کر نہ دو ورنہ اللہ بھی تم کو گن گن کر دے گا اور جمع کرکے نہ رکھو ورنہ اللہ بھی تمہارا حصہ جمع کرکے رکھے گا۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۰۲۹، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۴۳۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۵۴۹)

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

اے ابن آدم خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۹۳)

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہر روز جب بندے صبح اٹھتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ایک فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ خرچ کرنے والے کو عطا فرما اور دوسرا فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ خرچ نہ کرنے والے کا مال ضائع کر۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۱۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۴۴۲، السنن الکبری للنسائی، رقم الحدیث: ۹۱۷۸)

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان عبادات، مکارم اخلاق، اہل وعیال، مہمانوں اور صدقات وغیرہ پر خرچ کرے، ان مصارف پر خرچ کرنا مطلوب ہے اور ان مصارف پر خرچ نہ کرنا مذموم ہے۔

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا، اور جب بندہ کسی کو معاف کردے تو اس کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے اور جو شخص اللہ کے لیے تواضع کرتا ہے اللہ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۸۸)

زیادہ خرچ کرنے اور اسراف کی مذمت میں احادیث:

نیز اس آیت میں فرمایا ہے اور نہ اس (ہاتھ) کو بالکل کھول دو کہ ملامت زدہ اور درماندہ بیٹھے رہو، اس آیت کا معنی ہے جتنی ضرورت ہو اتنا خرچ کیا جائے، ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کیا جائے اور یہ بھی جائز محل کے متعلق ہے، ناجائز محل میں بالکل خرچ نہ کیا جائے اسی طرح صدقہ اور خیرات بھی میانہ روی سے کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ آج سارا مال خیرات کر دو اور کل بھیک مانگتے نظر آؤ۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ کام حرام کر دیئے ہیں، ماؤں کی نافرمانی کرنا، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا، حق نہ دینا ناحق مانگنا، اور تین کام مکروہ کیے ہیں، فضول بحث کرنا، بکثرت سوال کرنا، اور مال ضائع کرنا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۴۷۷، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۷۱۵، السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۰۳۶)

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بغیر اسراف اور تکبر کے کھاؤ اور پیو اور صدقہ کرو، اور حضرت ابن عباس نے فرمایا جو چاہے کھاؤ اور جو چاہے پہنو، جب تک اسراف اور تکبر نہ ہو۔

(صحیح البخاری، کتاب اللباس باب: ۱)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: کھاؤ اور پیو اور صدقہ کرو اور لباس پہنو، بغیر تکبر اور اسراف کے۔

(مسند احمد رقم الحدیث: ۶۶۹۵، مصنف بنابی شیبہ ج ۸ ص ۳۱۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۶۰۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۸۱۹)

حضرت حمزہ بن صہیب بیان کرتے ہیں کہ حضرت صہیب کی کنیت ابویحییٰ تھی اور وہ اپنے آپ کو عرب کہتے تھے اور وہ لوگوں کو بہت زیادہ طعام کھلاتے تھے، ان سے ایک دن حضرت عمر نے کہا اے صہیب تم نے ابویحییٰ کنیت کیوں رکھی ہے، حالانکہ تمہارا کوئی بیٹا نہیں ہے اور تم اپنے آپ کو عرب کہتے ہو اور تم بہت زیادہ طعام کھلاتے ہو اور یہ مال میں اسراف ہے۔ حضرت صہیب نے کہا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میری کنیت ابویحییٰ رکھی تھی، اور رہا نسب کے متعلق آپ کا اعتراض تو میں اہل موصل کے نمر بن قاسط خاندان سے ہوں، جب میں کم عمر تھا تو مجھے قیدی بنا دیا گیا لیکن مجھے اپنے گھر والوں کا اور اپنی قوم کا شعور تھا اور رہا آپ کا یہ اعتراض کہ تم کھانا زیادہ کھلاتے ہو تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے: تم میں بہتر شخص وہ ہے جو کھانا کھلائے اور سلام کا جواب دے تو اس ارشاد نے مجھ کو اس پر ابھارا کہ میں زیادہ کھانا کھلاؤں۔

(مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۴۴۲۲، عالم الکتب بیروت، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۳۸)

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم اپنی ہر پسندیدہ چیز کھاؤ یہ بھی اسراف ہے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۳۵۲، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۲۷۶۵، حلیۃ الاولیاء، ج ۱۰ ص ۲۱۳، اس حدیث کی سند بہت ضعیف ہے اور یہ حدیث صحیح سے معارض ہے)

ان احادیث میں چونکہ زیادہ خرچ کرنے اور اسراف کی ممانعت اور مذمت آ گئی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ یہ بیان کر دیں کہ کونسا زیادہ خرچ ممنوع ہے۔

زیادہ خرچ کرنے کی تفصیل اور تحقیق:

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: زیادہ خرچ کرنے کی تین صورتیں ہیں؛

(الف) جو کام شرعاً مذموم ہیں ان میں مال خرچ کرنا ناجائز ہے،

(ب) جو کام شرعاً محمود ہیں ان میں زیادہ مال خرچ کرنا محمود ہے، بشرطیکہ اس میں زیادہ خرچ کرنے اس سے زیادہ اہم دینی کام متاثر نہ ہو۔

(ج) مباح کاموں میں زیادہ خرچ کرنا مثلاً نفس کے آرام اور آسائش اور اس کے التذاذ کے لیے خرچ کرنا، اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ خرچ کرنے والا اپنے مال اور اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے تو یہ اسراف نہیں ہے۔

۲۔ خرچ کرنے والا اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرے، اس کی پھر دو قسمیں ہیں: اگر وہ کسی موجود یا متوقع ضرر اور خطرہ کو دور کرنے کے لیے زیادہ خرچ کرتا ہے تو جائز ہے اور اگر دفع ضرر کے بغیر اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے تو جمہور کے نزدیک یہ اسراف ہے۔ اور بعض شافعیہ نے یہ کہا ہے کہ یہ اسراف نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے بدن کے آرام اور آسائش کے حصول کا قصد کرتا ہے اور یہ غرض صحیح ہے اور جبکہ یہ کسی معصیت میں خرچ نہیں ہے تو مباح ہے۔ ابن دقیق العید، قاضی حسین، امام غزالی، اور علامہ رافعی نے کہا ہے کہ یہ تبذیر ہے اور ناجائز ہے۔ محرر میں ہے کہ یہ تبذیر نہیں ہے، علامہ نووی کی بھی یہی رائے ہے اور زیادہ راجح ہے کہ اگر زیادہ خرچ کرنے سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی مثلاً لوگوں سے سوال کرنے کی نوبت نہیں آتی تو پھر زیادہ خرچ کرنا جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔

اپنے تمام مال کو راہ خدا میں صدقہ کرنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو تنگی اور فقر میں صبر کرسکتا ہو، علامہ باجی مالکی نے لکھا ہے کہ تمام مال کو صدقہ کرنا ممنوع ہے اور دنیاوی مصلحتوں میں زیادہ مال خرچ کرنا مکروہ ہے، البتہ کبھی کبھی زیادہ خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسے عید یا ولیمہ کے موقع پر، اور اس پر اتفاق ہے کہ قدر ضرورت سے زیادہ مکانوں پر خرچ کرنا مکرو ہے، اسی طرح آرائش اور زیبائش پر زیادہ خرچ کرنا بھی مکروہ ہے اور مال کو ضائع کرنا گناہ کے کاموں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مال ناتجربہ کار کے حوالہ کردینا اور جواہر نفسیہ پر خرچ کردینا بھی اس میں داخل ہے۔

علامہ سبکی نے لکھا ہے کہ مال کو ضائع کرنے کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر مال خرچ کرنے سے کوئی دینی اور دنیاوی غرض نہ ہو تو اس میں مال خرچ کرنا حرام قطعی ہے اور اگر دینی یا دنیوی غرض ہو اور اس جگہ مال خرچ کرنا معصیت نہ ہو اور خرچ اس کی حیثیت کے مطابق ہو تو یہ قطعاً جائز ہے، اور ان دونوں مرتبوں کے درمیان بہت ساری صورتیں ہیں جو کسی ضابطہ کے تحت داخل نہیں ہیں۔ بہرحال معصیت میں خرچ کرنا حرام ہے اور آرام اور آسائش اور نفسانی لذتوں کے حصول کے لیے مال خرچ کرنے میں تفصیل اور اختلاف ہے۔

(فتح الباری ج۱۰ ص۴۰۸، ۴۰۹، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۲ھ)

جائز اور صحیح مقاصد میں مال خرچ کرنے میں بخل نہیں کرنا چاہیے، تاہم ان میں بے تحاشا اور بے دریغ مال خرچ کرنا نہیں

چاہیے مال خرچ کرنے اور خرچ نہ کرنے میں میانہ روی سے کام لینا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے جوفرمایا ہے: اور اپنا ہاتھ گردن تک بندھا ہوا نہ رکھو اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ ملامت زدہ اور درماندہ بیٹھے رہو۔ اس کا منشا بھی یہی ہے کہ خرچ کرنے میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لیا جائے، اب ہم میانہ روی اور اعتدال کے سلسلہ میں چند احادیث بیان کر رہے ہیں۔

اعتدال اور میانہ روی کے متعلق احادیث:

حضرت ابوعبداللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا نیک سیرت، اطمینان اور اعتدال نبوت کے چوبیس اجزا میں سے ایک جز ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۱۰، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۰۲۱، تاریخ بغداد ج ۳ ص ٦٦)

حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ایک شخص کے پاس سے گزر ہوا جو ایک چٹان پر نماز پڑھ رہا تھا، آپ مکہ مکرمہ کی طرف گئے وہاں کچھ دیر ٹھہرے پھر واپس آئے تو وہ شخص اسی طرح نماز پڑھ رہا تھا آپ نے اپنے ہاتھ اکٹھے کیے اور کھڑے ہو کر تین بار فرمایا اے لوگو! اعتدال اور میانہ روی کو لازم رکھو کیونکہ اللہ تعالیٰ (اجر دینے سے) نہیں اکتاتا حتیٰ کہ تم (عبادت کرنے سے) اکتا جاؤ۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ٤٢٤١، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۱۷۹۷، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۵۷)

حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دے گا، صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں، فرمایا مجھ کو بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ کی رحمت مجھے ڈھانپ لے، درست عمل کرو اور صحت کے قریب عمل کرو، صبح اور شام کو اور رات کے آخری حصہ میں عمل کرو اور اعتدال اور اعتدال کو لازم رکھو تم منزل پر پہنچ جاؤ گے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ٦٤٦٣، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۸۱٦، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۵۰٤۹، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۰٤۹۵)

حضرت جابر بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں گئے آپ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے بال گرد و غبار سے اٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کیا اس شخص کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کر سکے، پھر ایک اور شخص کو دیکھا جو میلے کپڑے پہنے ہوئے تھا، آپ نے فرمایا کیا اس شخص کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ اپنے کپڑے دھو سکے۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ٤٠٦٢، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۲۵۱)

ابوالاحوص اپنے والد سے روایت کرتے ہیں میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں معمولی کپڑے پہنے ہوئے حاضر ہوا آپ نے پوچھا کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے کہا جی ہاں، آپ نے پوچھا کون کونسا مال ہے؟ میں نے عرض کیا مجھے اللہ تعالیٰ نے اونٹ، بکریاں، گھوڑے اور غلام سب کچھ دیئے ہیں، آپ نے فرمایا جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت اور عزت کا اثر تم پر ظاہر ہونا چاہیے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٠٦٣، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۱۰۰)

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس شخص نے اعتدال اور میانہ روی

اختیار کی وہ تنگ دست نہیں ہوگا۔

(مسند احمد ج۱ ص ۴۴۷، طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۴۲۶۹، عالم الکتب بیروت)

امام بیہقی حضرت ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا خرچ کرنے میں اعتدال اور میانہ روی نصف معشیت ہے۔

(الدر المنثور ج ۵ ص ۲۷۷، مطبوعہ دار الکفر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

خلاصہ یہی ہے کہ ہر خلق اور ہر وصف کی دو جانبیں ہیں افراط اور تفریط اور یہ دونوں مذموم ہیں خرچ نہ کرنے میں زیادتی ہو تو یہ تفریط اور بخل ہے اور خرچ کرنے میں زیادتی ہو تو یہ افراط اور اسراف ہے، خرچ کرنے کے محل میں انسان خرچ نہ کرے اور خرچ نہ کرنے کے محل میں بھی خرچ نہ کرے یہ بخل ہے اور خرچ کرنے کے محل میں بھی خرچ کرے اور خرچ نہ کرنے کے محل میں بھی خرچ کرے یہ افراط اور تبذیر ہے اور یہ دونوں مذموم ہیں۔ مستحسن یہ ہے کہ خرچ کرنے کے محل میں خرچ کرے اور خرچ نہ کرنے کے محل میں خرچ نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تم بے تحاشا خرچ کروگے تو ملامت زدہ اور تھکے ہارے بیٹھے رہ جاؤ گے۔ مثلا ایک آدمی کو ہر ماہ خرچ کے لیے تنخواہ ملتی ہے اگر وہ پوری تنخواہ مہینے کے ابتدائی دس دنوں میں کھا پی لے اور لوگوں کو دے دلا کر اڑا دے تو مہینہ کے باقی بیس دن مصیبت میں گزارے گا لوگ اس کو ملامت کریں گے کہ تم نے پہلے اتنا زیادہ خرچہ کیوں کیا تھا کہ اب لوگوں سے مانگتے پھر رہے ہو۔

جن کا توکل کامل ہو ان کے لیے اپنا تمام مال صدقہ کرنے کا جواز:

ان تمام آیتوں میں خطاب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے اور اس خطاب سے مراد آپ کی امت ہے، اور قرآن مجید میں بہت جگہ یہ اسلوب ہے، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی امت کے قائد اور سید ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں واسطہ عظمٰی ہیں اور عرب میں یہ دستور ہے کہ قوم سے جو خطاب کرنا ہو وہ اس کے سید کی طرف کر دیتے ہیں۔ نیز سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کثرت فتوحات سے پہلے کل کے لیے کوئی چیز ذخیرہ کر کے نہیں رکھتے تھے، آپ اکثر بھوکے رہتے تھے، اور بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے، اور بعض صحابہ اپنا تمام مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اس پر کبھی ملامت نہیں کی تھی، اور ان کو منع نہیں کیا کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رزاقی پر صحیح یقین تھا اور زبردست بصیرت تھی، جیسے حضرت ابوبکر نے اپنا سارا مال لا کر آپ کو پیش کر دیا تھا، اور اللہ سبحانہ وتعالی نے ان لوگوں کو اللہ کی راہ میں تمام مال خرچ کرنے سے منع فرمایا جن کے متعلق اللہ کو علم تھا کہ یہ لوگ تمام مال ہاتھ سے نکلنے کے بعد افسوس کریں گے اور ان کا یقین اور ان کا توکل اس پایہ کا نہ تھا، اور جن لوگوں کا یقین اور توکل اعلی درجہ کا تھا اور جو دنیا کی بجائے آخرت کی فکر کرتے تھے وہ لوگ اس آیت کے مصداق نہیں ہیں ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خطاب ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو خرچ کرنے کے طریقہ کی تعلیم دی ہے اور اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیا ہے۔

حافظ جلال الدین سیوطی اس آیت کی تفسیر میں امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم کے حوالوں سے لکھتے ہیں:

حضرت ابن مسعود بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک لڑکا آیا اور اس نے کہا میری ماں نے آپ سے فلاں فلاں چیز کا سوال کیا ہے، آپ نے فرمایا آج ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے، اس نے کہا میری ماں کہتی ہے کہ آپ یہ قمیص دے دیجیے، آپ نے وہ قمیص اتار کر اس کو دے دی اور آپ بغیر قمیص کے افسوس سے بیٹھے رہے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

(الدر المنثور ج ۵ ص ۲۷٤، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱٤۱٤ھ)

لیکن تفسیر ابن جریر اور تفسیر امام ابن ابی حاتم میں یہ حدیث نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے اور قرطبی کے مخرج نے سنن کبری، مجمع الزوائد اور مصنف عبد الرزاق کا حوالہ دیا ہے، لیکن ان تینوں کتابوں میں یہ حدیث نہیں ہے، البتہ اس مضمون کی ایک اور حدیث مستند کتابوں میں موجود ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے حصول تبرک کا جواز:

حضرت سہل بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس حاشیہ والی بنی ہوئی ایک چادر لے کر آئی، اس عورت نے کہا میں نے اس چادر کو اپنے ہاتھ سے بنا ہے تاکہ میں آپ کو پہناؤں، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس عورت سے وہ چادر لے لی اور آپ کو اس وقت اس چادر کی ضرورت بھی تھی، آپ وہ چادر پہن کر ہمارے پاس آئے، ایک شخص نے اس چادر کی تعریف کی، اور کہنے لگا یا رسول اللہ یہ بہت خوبصورت چادر ہے، آپ یہ مجھے دے دیجیے، حاضرین نے کہا تم نے اچھا نہیں کیا، اس چادر کو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پہن لیا تھا درآنحالیکہ آپ کو اس کی ضرورت بھی تھی پھر بھی تم نے اس کو مانگ لیا اور تم کو معلوم ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی کا سوال رد نہیں فرماتے، اس شخص نے کہا اللہ کی قسم! میں نے پہننے کے لیے اس چادر کا سوال نہیں کیا تھا بلکہ میں نے اس چادر کا اس لیے سوال کیا تھا کہ یہ میرا کفن ہو جائے، سہل نے کہا پھر وہ چادر اس شخص کا کفن ہوگئی۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۲۷۷)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۰۰ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ابو غسان کی روایت میں ہے چونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس چادر کو پہن لیا ہے اس لیے مجھے اس چادر سے حصول برکت کی امید ہے اس حدیث کے فوائد میں سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حسن خلق ہے اور آپ کی جود وسخا ہے اور آپ کا ہدیہ قبول فرمانا ہے، آپ عموماً ہدیہ کے جواب میں ہدیہ عطا فرماتے تھے، آپ نے فرمایا ہے ایک دوسرے کو ہدیہ دو، ایک دوسرے سے محبت بڑھے گی، اس موقع پر آپ نے اس عورت کو ہدیہ نہیں دیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ جوابا ہدیہ دینا واجب نہیں ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعد میں آپ نے اس کو ہدیہ دیا ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی عمدہ لباس پہننے پر اس کی تحسین کرنی چاہیے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص ایسا کام کرے، جو بظاہر خلاف ادب ہو تو اس کو ملامت کرنا چاہیے، اور اس حدیث میں صالحین کے آثار سے تبرک حاصل کرنے کا جواز ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی چیز کو وقت ضرورت سے پہلے تیار کر کے رکھنا چاہیے اور کفن کو وقت سے پہلے تیار کرنا جائز ہے بلکہ قبر کھدوانا بھی جائز ہے۔

(فتح الباری ج ۳ ص ۱٤٤، مطبوعہ لاہور، ۱٤۰۱ھ)

عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

"اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے"۔(الانبیاء:107)

وما ارسلنك الا رحمة للعلمين کے مختلف متراجم

محمود الحسن دیوبندی اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر کے جہان کے لوگوں پر۔ اشرف علی تھانوی متوفی نے لکھا

اور ہم نے آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگوں پر مہربانی کرنے کے لیے پھر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں یعنی مکلفین پر مہربانی کرنے کے لئے۔

(بیان القرآن ج ۲ ص 651 مطبوعہ تاج کمپنی لاہور)

ابو الاعلیٰ مودودی متوفی 1399ھ لکھتے ہیں:

اے محمد! ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔

(تفہیم القرآن ج و ص 189)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی 1340ھ لکھتے ہیں: اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لئے۔

رحمۃ للعالمین کی تفسیر صدر الافاضل سے

صدر الافضال مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی 1367ھ لکھتے ہیں:

کوئی ہو جن ہو یا انس، مومن ہو یا کافر، حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا کہ حضور کا رحمت ہونا عام ہے، ایمان والے کے لیے بھی اور اس کے لیے بھی جو ایمان نہ لایا ہو۔ مومن کے لیے تو آپ دنیا اور آخرت دونوں میں رحمت ہیں اور جو ایمان نہ لایا اس کے لیے آپ دنیا میں رحمت ہیں کہ آپ کی بدولت تاخیرِ عذاب ہوئی اور خسف (زمین میں دھنسانے کا عذاب) ومسخ (شکل بدل دینے کا عذاب) اور استیصال (کسی قوم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا) کے عذاب اٹھا دیئے گئے۔ تفسیر روح البیان میں اس آیت کی تفسیر میں اکابر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر رحمت مطلقہ تامہ کاملہ، عامہ، شاملہ، جامعہ محیطہ، بہ جمیع مقیدات، رحمت، غیبیہ وشہادت علمیہ، وعینیہ ووجودیہ وشہودیہ وسابقہ ولاحقہ وغیرہ ذالک تمام جہانوں کے لیے عالم ارواح ہوں یا عالم اجسام، ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول اور جو تمام عالموں کے لیے رحمت ہو لازم ہے کہ وہ تمام جہانوں سے افضل ہو۔

(حاشیہ بر کنز الایمان ص 531، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

رحمۃ للعلمین کی تفسیر امام رازی سے

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ لکھتے ہیں:

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دین میں بھی رحمت ہیں اور دنیا میں بھی رحمت ہیں۔ دین میں اس لیے رحمت ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جس وقت بھیجا گیا لوگ جہالت اور گمراہی میں تھے، اور اہل کتاب میں سے یہود و نصاریٰ اپنے دین کے معاملہ میں زحمت میں تھے ان کا اپنی کتابوں میں بہت اختلاف تھا، اللہ تعالیٰ نے اس وقت سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رسول بنا کر بھیجا جب طالب حق کے سامنے نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا، اس وقت آپ نے لوگوں کو حق کی دعوت دی اور نجات کا راستہ دکھایا اور ان کے لیے احکام شرعیہ بیان کئے اور حلال اور حرام میں تمیز دی۔

(آل عمران:164) بیشک اللہ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا جب ان میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج دیا جو ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتا ہے ان کا باطن صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور بیشک اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اور آپ دنیا میں اس لیے رحمت ہیں کہ آپ کی وجہ سے ان کو ذلت، قتال اور مختلف جنگوں سے نجات ملی اور آپ کے دین کی برکت سے انھیں فتح حاصل ہوئی، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپ رحمت کیسے ہوں گے جب کہ آپ تلوار اور مال غنیمت کے احکام لے کر آئے؟ اس کے حسب ذیل جواب ہیں:

(۱) آپ ان منکرین اور متکبرین کے لیے تلوار لے کر آئے جنہوں نے تفکر اور تدبر نہیں کیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان اور رحیم ہے اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نافرمانوں سے انتقام لیتا ہے۔ پانی اور بارش بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے:

(الشوریٰ:28) اور وہی ہے جو لوگوں کے ناامید ہونے کے بعد بارش نازل فرماتا ہے اور اپنی رحمت کھول دیتا ہے۔

حالانکہ بارش سے بعض اوقات فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں، مکان گر جاتے ہیں، مال اور مویشی بہہ کر ڈوب جاتے ہیں سمندری طوفان اور سائیکلون آتے ہیں تو شہر کے شہر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور ہزاروں اور لاکھوں لوگ مر جاتے ہیں۔

(۲) ہمارے نبی کی آنے سے پہلے جب بھی کوئی قوم اپنے نبی کی تکذیب کرتی تھی تو اللہ تعالیٰ مکذبین کو غرق کر کے یا زمین میں دھنسا کر یا ان کی شکلیں مسخ کر کے ان کو ہلاک کر دیتا تھا اور ہمارے رسول کی جس نے تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے عذاب کو اس کی موت یا قیامت تک کے لیے موخر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(الانفال:33) اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ آپ ان میں ہوں اور وہ ان پر عذاب بھیج دے۔

رحمۃ للعالمین کی تفسیر علامہ آلوسی سے

علامہ سید محمود آلوسی متوفی 1270ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو صرف اس سبب سے بھیجا ہے کہ آپ تمام جہانوں پر رحم کریں یا ہم نے آپ کو صرف اس حال میں بھیجا ہے کہ آپ تمام جانوں پر رحم کرنے والے ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ تمام جہانوں میں کفار بھی شامل ہیں کیونکہ آپ کو جو دین دے کر بھیجا ہے اس میں دنیا اور آخرت کی سعادت اور مصلحت ہے یہ اور بات ہے کہ کافروں میں آپ سے استفادہ کی صلاحیت نہ تھی تو انھوں نے اپنے حصہ کی رحمت کو ضائع کر دیا، جیسے کوئی پیاسا شخص دریا کے کنارے کھڑا ہو اور پانی کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے یا کوئی شخص دھوپ میں آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو تو اس سے دریا کی فیاضی اور سورج کے روشنی پہنچانے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور ان کا ہے جنہوں نے پانی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا یا روشنی کے باوجود آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے رحمت ہونا اس اعتبار سے ہے کہ آپ تمام ممکنات پر ان کی صلاحیت کے اعتبار سے فیضا الٰہی کے لیے واسطہ ہیں اسی لیے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نور اول المخلوقات ہے اور حدیث میں ہے اے جابر سب سے پہلے اللہ نے تمہارے نبی کے نور کو پیدا کیا، اور حدیث میں ہے اللہ عطا کرنے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں اور ابن القیم نے مفتاح السعادۃ میں لکھا ہے اگر نبی نہ ہوتے تو جہان میں کوئی چیز کسی کو نفع نہ دیتی، نہ کوئی نیک عمل ہوتا، نہ روزی حاصل کرنے کا کوئی جائز طریقہ ہوتا اور نہ کسی حکومت کا قیام ہوتا اور تمام لوگ جانوروں اور درندوں کی طرح ہوتے، ایک دوسرے پر حملہ کرتے اور ایک دوسرے سے چھین کر کھا جاتے۔ سو دنیا میں جو بھی خیر اور نیکی ہے وہ آثار نبوت سے ہے اور جو شر اور برائی ہے وہ آثار نبوت کے مٹ جانے یا چھپ جانے کی وجہ سے ہے۔ پس یہ عالم ایک جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے اور جب زمین پر نبوت کے آثار میں سے کوئی اثر باقی نہیں رہے گا تو آسمان پھٹ جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے، سورج کو لپیٹ دیا جائے گا، چاند تاریک ہو جائے گا، پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ کر روئی کے گالوں کی طرح منتشر کر دیا جائے گا، زمین میں زلزلہ آجائے گا اور جو لوگ زمین کے اوپر ہیں وہ سب ہلاک ہو جائیں گے۔ پس اس جہان کا قیام آثار نبوت کی وجہ سے ہے اور جب نبوت کا کوئی اور شیخ تھانوی وغیرہم) میرے نزدیک یہ لوگ اس حق پر مطلع نہیں ہو سکے جس کی اتباع واجب ہے اور حقائق پر مطلع ہو کر ان لوگوں کا رد کرنا بہت آسان ہے اور میرا یہ نظریہ کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عالمین کے ہر فرد کے لیے رحمت ہیں خواہ وہ فرشتوں کا عالم ہو یا انسانوں کا عالم ہو یا جنات کا عالم ہو، اور انسانوں میں بھی آپ مومنوں اور کافروں سب کے لیے رحمت ہیں، اسی طرح جنات میں بھی سب کے لیے رحمت ہیں، البتہ رحمت کا فیضان ہر فرد پر اس کی صلاحیت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

(روح المعانی جز17 ص155 ملخصاً مطبوعہ دارالفکر بیروت، 1417ھ)

اس آیت کریمہ کا مصداق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کی ذات گرامی ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو سراپا اور مجسم رحمت بنا کر بھیجا ہے اور ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے: اے محمد! ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔ اس آیت کا یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے اور تواتر اور اجماع سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو رحمتہ للعالمین کا مصداق قرار دیا گیا ہے اس کے خلاف ہے۔ اسی طرح مفسرین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ہر عالم کے لیے رحمت ہیں خواہ فرشتوں کا عالم ہو، جنات کا عالم ہو، انسانوں کا عالم ہو اور خواہ انسانوں میں سے کافر ہوں، مسلمان ہوں، اولیاء ہوں یا انبیاء (علیہم السلام) ہوں، آپ سب کے لیے رحمت ہیں اور خواہ حیوانوں کا عالم ہو، یا نباتات کا عالم ہو یا جمادات کا عالم ہو، آپ ہر ہر عالم کے لیے رحمت ہیں، اس لیے شیخ محمود الحسن کا یہ لکھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ صرف لوگوں کے لیے رحمت ہیں اور نہ تھانوی کا یہ ترجمہ اور تفسیر صحیح ہے کہ آپ صرف مکلفین کے لیے رحمت ہیں۔ مکلف ہو یا غیر مکلف انسان ہو، جن ہو یا فرشتہ ہو، حیوان ہو یا شجر و حجر ہو آپ سب کے لیے رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ رب العلمین ہے اور آپ رحمتہ اللعالمین ہیں جس جس چیز کے لیے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے اس اس چیز کے لیے آپ رحمت ہیں، وجود عین جود ہے اور ہر چیز کو وجود آپ کے واسطہ سے ملا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو عطا کرنے والا ہے اور آپ ہر چیز کو تقسیم کرنے والے ہیں۔ آپ کی کنیت ابو القاسم صرف اس لیے نہیں تھی کہ آپ کے فرزندارجمند کا نام قاسم تھا، بلکہ ابوالقاسم کا معنی ہے سب سے زیادہ تقسیم کرنے والے اور ابتداء آفرینش عالم سے لے کر قیامت تک جس کو بھی جو نعمت ملتی ہے وہ آپ کی تقسیم سے ملتی ہے۔ تمام دینی اور دنیاوی امور میں آپ ابتداء آفرینش عالم سے تقسیم کرنے والے ہیں۔

رسول اللہ کی رحمت کے متعلق دیگر آیات اور ان کی تفسیر میں احادیث

اس آیت کے علاوہ قرآن مجید کی اور آیات میں بھی ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحمت کا ذکر فرمایا ہے:

(آل عمران:159) سو اللہ کی عظیم رحمت سے آپ مسلمانوں کے لیے نرم ہو گئے اور اگر آپ بد مزاج اور سخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔

حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آکر ایک شخص نے اپنے قرض کا سختی سے تقاضا کیا آپ کے اصحاب نے اس کو ڈانٹنے یا مارنے کا قصد کیا۔ آپ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو کیونکہ جس کا حق ہوتا ہے، اس کو بات کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:2401 سنن النسائی رقم الحدیث:4417، سنن الترمذی رقم الحدیث:1316، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث، 2423)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ غزوہ حنین میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے کچھ لوگوں کو زیادہ دیا، آپ نے اقرع بن حابس کو سو اونٹ دیئے اور عیینہ کو بھی اتنے ہی دیئے اور عرب سرداروں کے لوگوں کو بھی کچھ عطا فرمایا اور اس دن آپ نے تقسیم میں (بعض لوگوں کو) ترجیح دی۔ ایک شخص نے کہا اس تقسیم میں عدل نہیں کیا گیا اور نہ اس میں اللہ کی رضا کا ارادہ کیا گیا ہے۔ میں نے کہا اللہ کی قسم! میں ضرور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس بات کی خبر دوں گا۔ میں نے جا کر آپ کو خبر دی، آپ نے فرمایا: جب اللہ اور اس کا رسول عدل نہیں کریں گے تو پھر اور کون عدل کرے گا۔ اللہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر رحم فرمائے ان کو اس سے زیادہ ایذاء دی گئی تھی تو انھوں نے صبر کیا تھا۔ (نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تالیف قلب کے لیے بعض نو مسلموں کو دوسروں سے زیادہ حصہ دیتے تھے)

(صحیح البخاری رقم الحدیث:3150 صحیح مسلم رقم الحدیث:1068، مسند احمد رقم الحدیث:3608، مسند حمیدی رقم الحدیث 110)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ فطرتاً بدگو تھے، نہ تکلفاً بدگوئی کرتے تھے اور نہ بازاروں میں بلند آواز سے بات کرتے تھے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے لیکن معاف کر دیتے تھے اور درگزر کرتے تھے۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث:348، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص 330 صحیح ابن حبان رقم الحدیث:6409 سنن بیہقی ج ۷ ص 45)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جہاد کے سوا کبھی کسی کو نہیں مارا نہ کبھی کسی عورت پر ہاتھ اٹھایا اور نہ کبھی کسی خادم کو مارا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:2328 شمائل ترمذی رقم الحدیث:349، مسند احمد ج ٦ ص 31 مصنف ابن شیبہ ج ۸ ص 368)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کبھی کسی زیادتی کا بدلہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا سوا اس کے کہ اللہ کی حدود کو پامال کیا جائے جب اللہ کی حد توڑی جاتی تو آپ سب سے زیادہ غضب ناک ہوتے اور آپ کو جب بھی دو چیزوں میں کسی ایک کا اختیار دیا جاتا تو آپ آسان چیز کو اختیار کرتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:3560، 6126، صحیح مسلم رقم الحدیث:2327، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:4785 شمائل ترمذی رقم الحدیث:350 مسند احمد ج ٦ ص 85 مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث 17924)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب بھی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کسی چیز کا سوال کیا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں "نہ" نہیں فرمایا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 6034 صحیح مسلم رقم الحدیث: 2311 شمائل ترمذی رقم الحدیث: 353 مسند حمد ج ۳ ص 307)

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور آپ سے سوال کیا کہ آپ اس کو کچھ عطا فرمائیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اس وقت میرے پاس نہیں ہے، تم اس کو میری طرف سے ادھار خرید لو جب میرے پاس رقم آئے گی تو میں ادا کر دوں گا۔ حضرت عمر نے کہا یا رسول اللہ! آپ اس کو عطا کر چکے ہیں اور جس چیز پر آپ قادر نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف نہیں کیا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عمر کی بات کو ناپسند فرمایا پھر انصار میں سے ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ خرچ کیجیے اور عرش والے سے تنگی کا خوف نہ کیجیے، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تبسم فرمایا اور آپ کے چہرے پر انصاری کی بات سے خوشی کے آثار دکھائی دیئے پھر آپ نے فرمایا: مجھے اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: 356 مسند البزاور رقم الحدیث: 3662 البحر الزخار رقم الحدیث: 273 مجمع الزوائد ج 10 ص 242)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی توراۃ اور انجیل میں بعض یہ صفات مذکور ہیں:

ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم (الاعراف: 157)

جو ان سے ان کے (مشکل احکام کے) بوجھ اتارے گا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے (سختیوں کے) طوق اتار کر پھینک دے گا۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بیشک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے۔ فرمایا میں اپنا عذاب تو جسے چاہے اسے پہنچاتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے تو عنقریب میں اس (دنیا اور آخرت کی بھلائی) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو گناہوں سے بچیں گے اور زکوۃ دیں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔

(الاعراف: 156)

اس آیت میں دنیا کی بھلائی سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں احکام شرعیہ آسان ہوں کیونکہ بنو اسرائیل پر بہت مشکل احکام تھے۔ ان کی توبہ یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں، ان کو تیمم کی سہولت حاصل نہ تھی، مال غنیمت حلال نہیں تھا، قربانی کو کھانے کی اجازت نہیں تھی، قصاص لازم تھا، دیت کی رخصت نہیں تھی، ہفتہ کے دن شکار کی اجازت نہیں تھی روزے کا دورانیہ رات اور دن کو محیط تھا، غرض بہت سخت احکام تھے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے چاہا کہ ان کے یہ سخت احکام آسان ہو جائیں اور آخرت کی بھلائی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کم عمل پر زیادہ اجر عطا فرمائے، ان کو ایک نیکی پر ایک ہی اجر ملتا تھا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) چاہتے تھے کہ ایک نیکی پر دس گنا یا سات سو گنا اجر عطا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت کی یہ خیر اور رحمت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی امت کی بجائے ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کے لیے لکھ دی فرمایا میں ان لوگوں کے لیے یہ خیر اور رحمت لکھ دوں گا:

(الاعراف: 157) جو لوگ اس عظیم رسول نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے

ہیں، جو ان کو نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا جو ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرے گا اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرے گا اور جو ان سے (مشکل احکام کے) بوجھ اتارے گا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے سختیوں کے طوق اتار کر پھینک دے گا۔

نبی صلی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحمت کا ذکر اس آیت میں بھی ہے:

(التوبۃ:128) بیشک تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم رسول آگئے ہیں، تمہارا مشقت میں پڑنا ان پر بہت شاق ہے، تمہاری فلاح پر بہت حریص ہیں اور مومنوں پر بہت شفیق، نہایت مہربان ہیں۔

امت کے سخت اور مشقت والے احکام کون سے تھے اور آپ نے ان کو کیسے دور فرمایا اور دنیا اور آخرت کی فلاح آپ نے کیسے عطا فرمائی۔

آپ کی رحمت کے عموم کے متعلق احادیث

امام ابن جریر حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ جو اللہ پر اور آخرت پر ایمان لایا اس کے لیے دنیا اور آخرت میں رحمت لکھ دی جاتی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لایا اس کو دنیا میں زمین میں دھنسانے اور اس پر پتھر برسانے کے اس عذاب سے محفوظ رکھا جاتا ہے جس عذاب میں پہلی امتیں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث:8820، الدر المنثور ج ۵ ص 687)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا گیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مشرکین کے خلاف دعا کیجیے آپ نے فرمایا: مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، مجھے صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث:2599، الوفاء رقم الحدیث:754)

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ نے مجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت اور تمام متقین کے لیے ہدایت بنا کر بھیجا ہے۔

(مسند احمد ج ۵ ص 257 المعجم الکبیر رقم الحدیث:7803 مجمع الزوائد ج ۵ ص 72)

حضرت سلمان بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے اپنی امت کے جس شخص کو بھی غصہ میں برا کہا یا اس پر لعنت کی تو میں بنو آدم کا ایک فرد ہوں، مجھے بھی اس طرح غصہ آتا ہے جس طرح انھیں غصہ آتا ہے اور اللہ نے تو مجھے صرف تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اے اللہ! قیامت کے دن اس برا کہنے کو اس کے لیے دعائے خیر بنا دے۔

(مسند احمد ج ۵ ص 1437، المعجم الکبیر رقم الحدیث:6156)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، میں صرف رحمت ہوں، اللہ کی طرف سے ہدایت۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۱ ص 158 المعجم الصغیر رقم الحدیث:264 المستدرک ج ۱ ص 35 کامل ابن عدی ج ۴ ص 231)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا یا رسول اللہ! کیا غزوہ احد کے دن سے بھی کوئی سخت دن آپ پر آیا تھا؟ آپ نے فرمایا: مجھے تمہاری قوم کی طرف سے جن سختیوں کا سامنا ہوا سو ہوا اور ان کی طرف سے سب سے

زیادہ سخت دن وہ تھا جو یوم العقبہ (جب آپ طائف کی گھاٹیوں میں تبلیغ کے لیے جاتے تھے) کو پیش آیا جب میں نے ابن عبدالیل بن عبدکلال کو اسلام کی دعوت دی، اس نے میری دعوت کو قبول نہیں کیا۔ میں اپنے غمزدہ چہرے کے ساتھ واپس آیا، ابھی میں قرن الثعالب میں پہنچا تھا کہ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو مجھ پر ایک بادل نے سایہ کیا ہوا تھا میں نے دیکھا اس بادل میں جبرائیل (علیہ السلام) تھے۔ انھوں نے مجھے آواز دی اور کہا بیشک اللہ نے سن لیا کہ آپ کی قوم نے کیا کہا اور آپ کو کیا جواب دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ بھیجا ہے، آپ ان کافروں کے متعلق اس کو جو چاہیں حکم دیں، پہاڑوں کے فرشتے نے آپ کو سلام کر کے کہا اے محمد! آپ جو چاہیں میں وہ کر دوں! اگر آپ چاہیں تو میں ان کے اوپر مکہ کے دو پہاڑوں کو گرا کر انھیں زمین میں پیس دوں؟ تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بلکہ میں یہ امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی پیٹھوں سے ایسے لوگوں کو نکالے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 3231 صحیح مسلم رقم الحدیث: 1795، السنن الکبری للنسائی 7706)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لای، ہاں اگر اللہ کی حدود کو توڑا جاتا تو آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: 68530 سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 4785 شمائل ترمذی رقم الحدیث: 349، موطا امام مالک رقم الحدیث: 563 اور ایک نجرانی (یمنی) چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک اعرابی (دیہاتی) ملا، اس نے بہت زور سے آپ کی چادر کھینچی۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دو کندھوں کے درمیان نشان پڑ گیا تھا پھر اس نے کہا اے محمد! آپ کے پاس جو اللہ کا مال ہے، اس میں سے مجھے دینے کا حکم دیجیے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی طرف متوجہ ہو کر مسکرائے پھر اس کو مال دینے کا حکم دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 3149، صحیح مسلم رقم الحدیث: 1057، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 3553)

سراقہ بن مالک آپ کا سر اتارنے کے لیے آپ کا پیچھا کر رہا تھا، آپ نے اس پر قابو پا کر اسے معاف کر دیا۔ صفوان بن امیہ نے عمیر بن وہب کو زہر میں بجھی ہوئی تلوار دے کر آپ کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا جب وہ آپ کی دسترس میں آیا تو آپ نے اس کو معاف کر دیا، بعد میں صفوان کو بھی معاف کر دیا۔ ابوسفیان نے متعدد بار مدینہ پر حملے کئے۔ وحشی نے آپ کے عزیز چچا کو قتل کیا، ہند نے حضرت حمزہ کا کلیجہ نکال کر چاچبایا۔ ہبار بن اسود نے آپ کی صاحبزادی کو سواری سے گرا دیا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا اور جب ان سب کی گردنیں آپ کی تلوار کے نیچے تھیں، آپ نے ان سب کو معاف کر دیا۔ عبداللہ بن ابی نے بہت ایذائیں پہنچائی تھیں لیکن جب اس نے مرتے وقت درخواست کی کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں تو آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی۔

مسلمانوں پر آپ کی رحمت کے متعلق احادیث

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا، اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے سو تم حج کرو۔ ایک شخص نے کہا کیا ہر سال؟ یا رسول اللہ! آپ خاموش رہے حتیٰ کہ اس نے تین بار سوال کیا۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جاتا اور تم اس کی طاقت نہ رکھتے پھر فرمایا جس چیز میں میں تم کو (بیان کرنا) چھوڑ دوں اس چیز میں تم مجھ کو چھوڑ دیا کرو تم سے پہلی امتیں زیادہ سوال کرنے اور اپنے نبیوں سے اختلاف کرنے کی وجہ سے

ہلاک ہوگئیں جب میں تم کوکسی چیز کا حکم دوں تو تم اس کو بہ قدر استطاعت کرلو اور میں جب تم کوکسی چیز سے منع کروں تو اس کو چھوڑ دو۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث:1337، سنن النسائی رقم الحدیث:2619)

حضرت زید بن خالد (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر مجھے اپنی امت پر دشوار نہ ہوتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا اور عشاء کی نماز کو تہائی رات تک موخر کر کے پڑھنے کا حکم دیتا۔
(سنن الترمذی رقم الحدیث:23، سنن ابو داؤد رقم الحدیث:47، شرح السنۃ رقم الحدیث:198، مسند احمد ج ۴ ص116 المسند الجامع رقم الحدیث 3908)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آدھی رات کو باہر آئے اور مسجد میں نماز پڑھی لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ نماز پڑھی پھر لوگوں نے ایک دوسرے سے اس کا ذکر کیا، پھر (دوسری رات) اس سے بہت زیادہ لوگ جمع ہو گئے پھر صبح انھوں نے (دوسرے لوگوں کو) بتایا، پھر تیسری رات کو مسجد میں بہت زیادہ لوگ جمع ہو گئے پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر ائے اور آپ نے نماز پڑھی اور لوگوں نے بھی نماز پڑھی، چوتھی رات کو اتنے زیادہ لوگ آگئے کہ مسجد تنگ پڑگئی حتیٰ کہ آپ صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آئے جب آپ نے صبح کی نماز پڑھا دی تو آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے آپ نے کلمہ شہادت پڑھا پھر فرمایا: حمد وصلوۃ کے بعد مجھ پر تمہارا اشتیاق مخفی نہیں تھا لیکن مجھے یہ خوف تھا کہ تم پر یہ نماز فرض کر دی جائے گی پھر تم اس کو پڑھنے سے عاجز ہو جاؤ گے، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات ہوگئی اور لوگوں کا عمل اسی طرح رہا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث:2012 سنن ابو داؤد رقم الحدیث:710 سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:956 سنن النسائی رقم الحدیث:758 مسند احمد رقم الحدیث 25069 عالم الکتب)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اس قول کو پڑھا: رب انھن اضللن کثیراً من الناس فمن تبغنی فانہ منی (ابراہیم:36) اے میرے رب! ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے سو جس نے میری پیروی کی، وہ میرے طریقہ پر ہے۔ اور عیسیٰ (علیہ السلام) نے کہا:

ان تعذبھم فانھم عبادك وان تغفر لھم فانك انت العزیز الحکیم (المائدہ:118)

اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو بیشک تو بہت غلبہ والا بہت حکمت والا ہے۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ بلند کئے اور دعا کی اے اللہ! میری امت، میری امت اور آپ روئے، تب اللہ عزوجل نے فرمایا: اے جبرائیل! محمد کے پاس جاؤ اور تمہارا رب خوب جانتا ہے، ان سے سوال کرو، انھیں کیا رلاتی ہے؟ پھر آپ کے پاس عزوجل نے فرمایا، اے جبرائیل! محمد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو ہم آپ کو آپ کی امت کے بارے میں راضی کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ ہونے نہیں دیں گے۔
(صحیح مسلم رقم الحدیث:202، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:11269)

حیوانات اور جمادات پر رحمت کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن جعفر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سواری پر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا پھر مجھے چپکے سے ایک بات بتائی جو میں کبھی بھی کسی کو نہیں بتاؤں گا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قضاء حاجت کے لیے کسی ٹیلہ یا گنجان اور گھنے کھجور کے درختوں کی اوٹ میں جانا پسند کرتے تھے۔ آپ انصار کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہوئے وہاں

ایک اونٹ آیا اور اس نے بڑبڑ کر کے آپ سے کچھ کہا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے کان کی ہڈی کے پیچھے ہاتھ پھیرا تو وہ پرسکون ہو گیا پھر آپ نے فرمایا یہ اونٹ کس کا ہے؟ انصار کا ایک جوان آیا اور اس نے کہا یا رسول اللہ یہ اونٹ میرا ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم ان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے نہیں ڈرتے؟ جن کا اللہ نے تمہیں مالک بنا دیا ہے۔ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ اس کو تم بھوکا رکھتے ہو اور کام لے لے کر اس کو تھکا دیتے ہو۔

(مسند احمد ج۱ ص436 طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث:1745 دار الفکر، جدید، البدایہ والنہایہ ج٤ ص531 دار الفکر جدید)

حضرت یعلیٰ بن مرہ الثقفی (رض) بیان کرتے ہیں میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں تین چیزیں دیکھیں ایک دن ہم آپ کے ساتھ ایک سفر میں جا رہے تھے، ہمارا ایک اونٹ کے پاس سے گزر ہوا جب اونٹ نے آپ کو دیکھا تو بڑبڑ کرنے لگا اور اپنی گردن آگے بڑھائی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے پاس ٹھہر گئے اور فرمایا اس کا مالک کون ہے وہ شخص آ گیا۔ آپ نے فرمایا اس اونٹ کو مجھے بیچ دو۔ اس نے کہا نہیں میں آپ کو ہبہ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں مجھ کو فرخت کر دو۔ اس نے کہا نہیں، میں آپ کو ہبہ کرتا ہوں، ہمارے گھر والوں کی گزراوقات کے لیے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: جب تم نے یہ کہا ہے تو سنو، اس اونٹ مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس سے کام زیادہ لیتے ہو اور اس کو چارہ کم ڈالتے ہو، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

(مسند احمد رقم الحدیث:17570، دار الفکر، البدایہ والنہایہ ج٤ ص532، دار الفکر بیروت،1418ھ)

حضرت ابوسعید (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک ہرنی کے پاس سے گزرے جو ایک خیمہ میں بندھی ہوئی تھی، اس ہرنی نے کہا یا رسول اللہ! مجھے کھول دیجیے تاکہ میں اپنے بچوں کو جا کر دودھ پلا آؤں پھر میں واپس آجاؤں گی تو آپ مجھے باندھ دیں۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: یہ ایک قوم کا شکار ہے اور اس کی باندھی ہوئی ہے پھر آپ نے اس سے عہد لیا کہ وہ ضرور واپس آئے گی پھر اس کو کھول دیا۔ وہ تھوڑی دیر میں واپس آ گئی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو باندھ دیا پھر خیمہ والے آئے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو ان سے مانگ لیا۔ انھوں نے وہ ہرنی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہبہ کر دی، آپ نے اس کو کھول دیا۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج٦ ص34، البدایہ والنہایہ ج٤ ص543، الخصائص الکبریٰ ج٢ ص61)

امام بیہقی کی ایک اور روایت میں ہے:

حضرت زید بن ارقم نے کہا اللہ کی قسم! میں نے دیکھا، وہ ہرنی جنگل میں چلاتی ہوئی جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج٦ ص35، البدایہ والنہایہ ج٤ ص543 الخصائص الکبریٰ ج٢ ص61 دلائل النبوۃ ابی نعیم رقم الحدیث:320)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں تھے، ہمارا درختوں کے پاس سے گزر ہوا ایک شخص ان میں گیا اور سرخ پرندہ کے انڈے نکال لایا، وہ سرخ پرندے آ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے اصحاب کے اوپر اپنے بازو پھیلانے لگے۔ آپ نے فرمایا ان کے انڈے کس نے جمع کیئے ہیں؟ ایک شخص نے کہا میں نے ان کے انڈے لیے ہیں۔ آپ نے ان پرندوں پر رحمت فرماتے ہوئے فرمایا ان کے انڈے واپس کرو۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی ج٦ ص32)

ایک اور سند سے امام بیہقی نے حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے کہ ہم نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ ایک سفر میں تھے ہمارا ایک درخت کے پاس سے گزر ہوا، اس میں سرخ پرندہ کے دو چوزے تھے ہم نے وہ اٹھا لیے وہ سرخ پرندہ آ کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کرنے لگا، آپ نے فرمایا: ان کو واپس رکھ دو۔ سو ہم نے ان کو واپس رکھ دیا۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: 5268-2675 دلائل النبوۃ للبیہقی ج 6 ص 32-33 البدایہ والنہایہ ج 4 ص 546-547 الخصائص الکبری ج 2 ص 63)

ان احادیث میں حیوانوں اور پرندوں پر آپ کی رحمت کا ذکر ہے اور درختوں اور جمادات پر رحمت کا ذکر درج ذیل احادیث میں ہے: حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جمعہ کے دن ایک درخت یا کھجور (کے تنے) کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے، انصار کی کسی عورت یا مرد نے کہا یا رسول اللہ! کیا ہم آپ کے لیے منبر نہ بنا دیں آپ نے فرمایا اگر تم چاہو چ انھوں نے منبر بنا دیا جب جمعہ کا دن آیا تو آپ منبر کی طرف گئے تو وہ کھجور کا تنا بچے کی طرح زور زور سے رونے لگا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منبر سے اتر کر اس کو اپنے ساتھ لپٹایا تو وہ سسکیاں لینے لگا پھر سکون ہو گیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 3584)

امام بخاری کی ایک اور روایت میں ہے وہ کھجور کا تنا اس طرح چلا رہا تھا جیسے دس ماہ کی حاملہ اونٹنی اپنے بچے کے فراق میں چلاتی ہے پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ پرسکون ہو گیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 3585 سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: 495 صحیح ابن حبان رقم الحدیث: 1124، مسند احمد رقم الحدیث: 21295، عالم الکتب بیروت)

حافظ ابن کثیر متوفی 774ھ نے اس حدیث کو متعدد اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے:

امام ابو یعلی اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر بیٹھ گئے تو وہ کھجور کا تنا بیل کی طرح آواز نکال کر چلا رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ (کے فراق) کے غم کی وجہ سے اس کی آواز میں لرزش تھی پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر سے اترے اور اس کو لپٹا لیا پھر وہ پرسکون ہو گیا پھر آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ وقدرت میں محمد کی جان ہے اگر میں اس کو نہ لپٹاتا تو وہ قیامت تک رسول اللہ ﷺ کے (فراق کے) غم میں روتا رہتا پھر اس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے زمین میں دفن کر دیا گیا۔

امام بزار نے اپنی سند کے ساتھ حسن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو اپنے ساتھ چمٹایا تو وہ پرسکون ہو گیا۔ آپ نے فرمایا اگر میں اس کو نہ چمٹاتا تو یہ قیامت تک روتا رہتا۔

امام بغوی نے اس حدیث کو حسن سے روایت کر کے کہا حسن جب اس حدیث کو بیان کرتے تو روتے اور کہتے اے اللہ کے بندو! درخت کا تنا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے شوق میں روتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آپ کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا مقام ہے تو تم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کا شوق رکھنے کے زیادہ حق دار ہو۔

(البدایہ والنہایہ ج ر ص 518-519 مطبوعہ دار الفکر بیروت طبع جدید، 1418ھ)

امام ابو نعیم اصفہانی متوفی 430ھ نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت جابر (رض) سے ایک حدیث کو روایت کیا ہے جس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ ارشاد ہے کہ اگر میں اس کو اپنے ساتھ نہ لپٹاتا تو یہ قیامت تک روتا اور چلاتا رہتا۔

(دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: 302-305، سنن الدارمی رقم الحدیث: 39 حافظ الہیثمی نے کہا اس کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد ج 1 ص 182)

نیز حافظ ابونعیم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابی بن کعب (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس درخت کے ستون سے فرمایا: تو پرسکون ہوجا، پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب سے فرمایا یہ میری محبت میں رو رہا ہے پھر آپ نے اس سے فرمایا تو پرسکون ہوجا اگر تو چاہے تو میں تجھ کو جنت میں اگادوں، تیرا پھل نیک لوگ کھائیں گے اور اگر تو چاہے تو میں تجھے دنیا میں پہلے کی طرح تروتازہ درخت اگادوں تو اس درخت نے آخرت کو دنیا پر اختیار کرلیا۔ (دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: 306 سنن الدارمی رقم الحدیث: 36 الخصائص الکبریٰ ج ۲ ص 307 مجمع الزوائد ج ۹ ص 180) ان احادیث میں درختوں اور جمادات پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رحمت کا ذکر ہے۔

آپ کی رسالت کا ہر چیز کو علم ہے

ہم نے حیوانات پر رحمت کے سلسلہ میں جو احادیث ذکر کی ہیں اس میں اونٹ کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کلام کرنے کا ذکر ہے، اس حدیث میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

لیس شی بین السماء والارض الایعلم انی رسول اللہ الا عاصی الجن والانس کفار جن اور انس کے سوا آسمان اور زمین کے درمیان ہر چیز یہ جانتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

(مسند احمد ج ۳ ص 110، قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: 14385، عالم الکتب، مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: 1123، سنن الدارمی رقم الحدیث: 18 دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم الحدیث: 279 مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص 473 مجمع الزوائد ج 9 ص، مسند البزار رقم الحدیث: 2452)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر (رض) نے کہا یا رسول اللہ! گویا یہ اونٹ جانتا تھا کہ آپ نبی ہیں ڈ تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا،

مابین لابتیھا احد الا یعلم انی نبی الا کفرۃ الجن والانس۔ مدینہ کے دو سروں کے درمیان ہر چیز کو علم ہے کہ میں نبی ہوں، سوا کافر جن اور کافر انس کے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: 12003 مجمع الزوائد رقم الحدیث: 14154، دلائل النبوۃ للبیہقی ج ٦ ص 30)

حضرت یعلی (رض) کی حدیث میں ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

مامن شیء الا یعلم انی رسول اللہ الا کفرۃ اوفسقۃ الجن والانس۔ ہر شے کو علم ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوا کافر یا فاسق جن اور انس کے۔

(المعجم الکبیر ج 22 ص 262، البدایہ والنہایہ ج ٤ ص 534 مجمع الزوائد رقم الحدیث: 14159)

رسول اللہ ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے پر اعتراضات

بعض اوقات رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بعض کفار اور مشرکین کے لیے ہلاکت اور ضرر کی دعا فرمائی۔ اس وجہ سے آپ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جب آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں تو آپ نے ان کافروں کے لیے ہلاکت اور ضرر کی کیوں دعائی فرمائی؟ وہ احادیث حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کو اپنا مکتوب

دے کرعظیم البحرین کی طرف بھیجا،عظیم البحرین نے وہ مکتوب کسریٰ کو دے دیا جب کسریٰ نے آپ کے مکتوب کو پڑھا تو اس کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔میرا گمان ہے کہ ابن مسیب نے کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کے خلاف دعا کی کہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:4939-64)

علامہ بدرالدین عینی حفنی متوفی 855ھ لکھتے ہیں:

جس شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مکتوب پھاڑا تھا،اس کا نام پرویز بن ہرمز تھا جب اس نے آپ کے مکتوب کے ٹکڑے ٹکڑے کئے تو آپ نے فرمایا:اس کا ملک ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور آپ نے فرمایا:جب کسریٰ مرجائے گا تو پھر کسریٰ (نام کا کوئی) بادشاہ نہیں ہوگا۔علامہ واقدی نے کہا کسریٰ کے اوپر اس کا بیٹا شرویہ مسلط ہوگیا اور اس نے سات ہجری میں کسریٰ کو قتل کر دیا اور اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو اس کے خلاف دعا کی تھی،وہ پوری ہوگئی۔

(عمدۃ القاری جز۲ ص28 مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ،1348ھ)

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بیت اللہ میں نماز پڑھ رہے تھے اور ابوجہل اور اس کے ساتھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔اس وقت ان میں سے کسی نے کہا بنو فلاں کے ہاں اونٹنی ذبح ہوئی ہے،تم میں سے کون جا کر اس کی اوجھڑی لے کر آئے اور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب سجدہ میں جائیں تو اس کو ان کی پشت پر رکھ دے تو ان میں جو سب سے بدبخت شخص تھا (عقبہ بن ابی معیط) وہ اٹھا اور اوجھڑی لے کر آیا اور دیکھتا رہا حتیٰ کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سجدہ میں گئے تو اس نے وہ اوجھڑی آپ کے کندھوں کے درمیان آپ کی پشت پر رکھ دی۔(حضرت ابن مسعود کہتے ہیں) میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا کاش کہ میرے پاس مددگار ہوتے۔وہ کافر ہنس رہے تھے اور بعض بعض کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہے تھے کہ تم نے یہ کیا ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (تقاضائے بشری سے) سجدہ سے سر نہیں اٹھا سکے حتیٰ کہ حضرت سیدتنا فاطمہ (رض) آئیں اور انھوں نے اس اوجھڑی کو اٹھا کر آپ کی پشت سے پھینکا۔آپ نے سجدہ سے سر اٹھا کر تین بار فرمایا اے اللہ! قریش کو پکڑ لے،ان کو یہ دعا بہت سخت معلوم ہوئی کیونکہ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ اس شہر میں دعا قبول ہوتی ہے پھر آپ نے نام لے لے کر فرمایا اے اللہ! ابوجہل کو پکڑ لے،عتبہ بن ربیعہ کو پکڑ لے،شیبہ بن ربیعہ کو پکڑ لے اور ولید بن عتبہ کو پکڑ لے اور امیہ بن خلف کو پکڑ لے اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ لے اور ساتویں کا نام بھی لیا،وہ راوی کو یاد نہیں رہا۔(امام بخاری نے ایک اور جگہ ذکر کیا ہے کہ وہ ساتواں شخص عمارہ بن الولید بن مغیرہ تھا۔عمدۃ القاری جز۳ ص174) حضرت ابن مسعود نے کہا اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے،جن جن کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نام لیے تھے وہ ساتوں بدر کے کنوئیں میں اوندھے منہ پڑے ہوئے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث:240،صحیح مسلم رقم الحدیث:1794،السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث:8669)

حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ (قبیلہ) رمل،ذکوان،عصیہ اور بنولحیان نے اپنے دشمنوں کے خلاف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مدد طلب کی (ان کے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان معاہدہ تھا) آپ نے ستر انصاریوں کو ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ہم ان کو اپنے زمانہ میں قراء کہتے تھے،وہ دن میں لکڑیاں چنتے تھے اور رات کو نماز پڑھتے تھے

جب وہ قراء بیر معونہ پہنچے تو ان کو بلانے والوں نے ان کو قتل کر دیا اور عہد شکنی کی۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ خبر پہنچی تو آپ ایک مہینہ تک صبح کی نماز میں عرب کے ان قبیلوں کے خلاف دعا کرتے رہے۔ رمل، ذکوان، عصیہ اور بنولحیان کے خلاف۔

(صحیح البخاری رقم الدیث:4088,409)

(۳) حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غزوہ الاحزاب کے دن فرمایا اللہ تعالیٰ کفار کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے، ہم ان کی وجہ سے غروب آفتاب تک عصر کی نماز نہیں پڑھ سکے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث،2939،صحیح مسلم رقم الحدیث:627،سنن ابوداؤد رقم الحدیث:409،سنن الترمذی رقم الحدیث:2984سنن النسائی رقم الحدیث:472-473)

اعتراضات مذکورہ کے جوابات

ان احادیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کفار کے خلاف دعائے ضرر کی، ان پر اعتراض ہے کہ آپ تو رحمتہ للعلمین ہیں۔ کفار کے لیے عذاب کی دعا کرنا آپ کی شان اور منصب کے خلاف ہے، اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہے اس کے باوجود وہ کفار کو عذاب دے گا تو جب اللہ تعالیٰ کا رحمٰن اور رحیم ہونا، اس کے عذاب دینے کے خلاف نہیں ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رحمتہ للعالمین ہونا، عذاب کی دعا کے خلاف کیسے ہوگا۔

باقی رہا یہ شبہ کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم ہو کر کفار کو عذاب کیسے دے گا۔ اس کا جواب رحمت کے معنی سمجھنے پر موقوف ہے۔

امام شعرانی نے ابن عربی (رح) کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ سہل بن عبداللہ تستری کے پاس شیطان آیا اور کہنے لگا بتاؤ میری بخشش ہوگی یا نہیں سہل نے کہا نہیں۔ شیطان نے کہا اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے" **ورحمتی وسعت کل شی** "(الاعراف 156)" میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے" اور ہر شے کے عموم میں میں بھی داخل ہوں تو میری مغفرت بھی ہونی چاہیے۔ سہل نے کہا یہ مومنین کے ساتھ خاص ہے تم اس کے عموم سے خارج ہے۔ شیطان نے کہا پہلے تو میں تم کو عالم سمجھتا تھا آج تمہارا جہل مجھ پر آشکار ہو گیا تم اللہ تعالیٰ کی صفت (یعنی رحمت کے شمول) میں تقید کر رہے ہو حالانکہ تقید اور تحدید مخلوق کی صفات میں ہوتی ہے اس کی صفات غیر مقید اور لامحدود ہوتی ہیں۔ شیطان کا یہ جواب سن کر سہل بالکل لاجواب اور مبہوت ہو گئے۔

(الکبریت الاحمر علی ہامش الیواقت ج۱ص3,2)

علامہ عبدالوہاب شعرانی (رح) نے بھی اس سوال کا کوئی جواب ذکر نہیں کیا۔ میں نے اس حکایت کو پڑھ کر غور کیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ جواب منکشف فرمایا کہ ضرورت کے وقت کسی کو کوئی چیز دینا بھی رحمت ہے اور اس چیز کے اسباب فراہم کر دینا بھی رحمت ہے۔ مثلاً بھوکے کو آپ کھانا کھلا دیں یہ اس کے حق میں رحمت ہے اور اگر اسی کھانے کے پیسے دے دیں تو یہ بھی اس کے لیے رحمت ہے۔ اسی طرح جنت کا معاملہ ہے بنفسہ جنت عطا کر دینا بھی رحمت ہے اور جنت کے اسباب مہیا کر دینا بھی رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت، مغفرت اور رضامندی کے حصول کا سبب اپنے احکام کی اطاعت مقرر کیا ہے۔

یہ احکام فرشتوں کے ساتھ شیطان کو بھی دیئے گئے تھے اور فرشتوں کے ساتھ اسے بھی حضرت آدم کی تعظیم کا حکم دیا گیا لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے خود منہ موڑ لیا، بلکہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے کہا آدم (علیہ السلام) کی قبر کو سجدہ کر لے، تیرا گناہ معاف کر دیا جائے گا اور تیری توبہ قبول کر لی جائے گی۔ اس لعین نے اللہ تعالیٰ سے

کہا جب میں نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تو اب ان کی قبر کو کب سجدہ کروں گا۔(روح البیان ج ۃ ص 105) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اسے کل بھی شامل تھی، آج بھی شامل ہے۔اس لعین نے خود اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بیکراں رحمت سے دور رکھا ہوا ہے۔ دریا کے ساحل پر کھڑا ہو کر کوئی شخص کہے دریا میری پیاس نہیں بجھاتا تو یہ دریا کی سیرابی میں کمی نہیں ہے، خود اس شخص کے ظرف میں کمی ہے جو دریا کے قریب آکر پانی نہیں پی رہا۔اسی طرح رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رحمۃ للعالمین ہیں بایں معنیٰ کہ آپ نے تمام جہان والوں کو توحید و رسالت کی دعوت دی اور ابدی رحمت کے حصول کا دروازہ دکھایا جو لوگ جان کے دشمن اور خون کے پیاسے تھے، ان میں سے ایک ایک کے گھر جا کر پیغام حق سنایا جو راستہ میں کانٹے بچھاتے تھے اور غلاظت بکھیرتے تھے، ان کے دروازوں پر دستک دے کر جنت اور دائمی سلامتی کی دعوت دی۔اس کے باوجود جن لوگوں نے آپ کی دعوت کو مسترد کر کے جنت اور رحمت سے منہ موڑ لیا تو اس میں آپ کی رحمت کے عموم اور شمول کا قصور جن لوگوں نے آپ کی دعوت کو مسترد کر کے جنت اور رحمت سے منہ موڑ لیا۔قصور ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اپنے آپ کو آپ کی رحمت سے دور رکھا۔جب نصف النہار کے وقت آفتاب روئے زمین پر نور افگن ہو اور کوئی شخص آنکھیں بند کر کے کھڑا ہو جائے تو قصور آفتاب کے فیض کا نہیں، قصور اس شخص کا ہے جس نے آفتاب کے سامنے ہوتے ہوئے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

کفار کے لیے عذاب کی دعا کرنے کی دوسری توجیہ یہ ہے کہ کفار اور مشرکین نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات کو تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں آپ نے ان کے خلاف دعا نہیں کی۔طائف کی وادیوں میں آپ پیغام توحید سنانے گئے جواب میں انھوں نے پتھر مار مار کر آپ کو لہولہان کر دیا دل آزار باتیں کیں، آوازے کسے، آپ نے اف نہ کی۔ان کا ظلم دیکھ کر جبرائیل (علیہ السلام) سے بھی یارائے ضبط نہ رہا، پہاڑوں کے فرشتہ نے حاضر ہو کر کہا آپ حکم دیں تو طائف کے لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں لیکن آپ نے کہا تو یہی کہا، بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی پیٹھوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا۔جو اللہ کی عبادت کریں گے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: 3231)

جبل احد کی گھاٹیوں پر ابوسفیان کی قیادت میں مشرکین حملہ آور ہوئے، کسی شقی نے پتھر مارا اور آپ کا چہرہ خون آلود ہو گیا، دانت کا ایک کنارہ شہید ہو گیا پھر بھی آپ نے ان کے خلاف دعا نہیں کی۔اسی غزوہ میں آپ کے پیارے اور محبوب چچا سیدنا حمزہ کو وحشی نے قتل کر دیا، ان کے جسم کو گھائل کیا گیا، جسم کے نازک حصے کاٹ ڈالے گئے۔ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے ان کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے کچا چبایا۔آپ نے یہ سارے ظلم وستم دیکھے اور کچھ نہ کہا بلکہ فتح مکہ کے بعد جب یہ سارے اشقیاء مغلوب ہو کر پیش خدمت ہوئے جب عربوں کے روایتی انتقام کی آگ کے خوف سے ڈر کے یہ سارے سہمے ہوئے تھے آپ نے قادر اور غالب ہونے کے باوجود بدلہ نہیں لیا۔بار بار حملہ آور ہونے والے ابوسفیان کو معاف کر دیا۔حضرت حمزہ کے قاتل وحشی کو بخش دیا۔حمزہ (رضی اللہ عنہ) کا کلیجہ چبانے والی ہندہ سے درگزر کر لیا۔وحشی نے قبول اسلام کے لیے شرائط پیش کیں اس کی ایک ایک شرط پوری کر کے اسے آغوش رحمت میں لے لیا۔قاتل حمزہ کا ایک ایک نخرہ برداشت کر کے اسے مشرف بہ اسلام کیا۔ایسے بے عدیل، رحیم و کریم اور بے مثیل مہربان آقا کو ہم دیکھتے ہیں کہ غزوہ خندق میں مشرکوں سے جنگ کی وجہ سے نماز عصر رہ گئی تو ان کے خلاف دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔جس صابر و شاکر شخص نے طائف کے ظلم سہہ کر کسی ظالم کے خلاف دعا نہیں کی، ابوسفیان، وحشی اور ہندہ کو کچھ نہ کہا، بڑی سے

بڑی زیادتی کے بعد جس کا پیمانہ صبر لبریز نہیں ہوا، وہ نماز میں خلل ڈالنے، تبلیغ دین کو سبوتاژ کرنے اور مسلمانوں کو قتل کرنے کی وجہ سے کفار کے خلاف دعائے ضرر کرتا ہے۔ اس سے یہی بتلانا مقصود تھا کہ اپنی جان، اپنی عزت، آبرو اور اپنے عزیزوں کے خون کی بہ نسبت دین کی تبلیغ نماز اور مسلمانوں کا خوف مجھے پیارا ہے۔ میں اپنی جان پر زیادتی برداشت کرسکتا ہوں، اپنے عزیزوں کا خون معاف کرسکتا ہوں لیکن تم مجھے تبلیغ نہ کرنے دو، اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کرنے دو یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ سوچیے ہم اسی نبی کے نام لیوا ہیں جو اپنی ذات پر زیادتیوں سے درگزر کرلیتا ہے مگر دین کی کسی بات سے صرف نظر نہیں کرتا۔ آج ہمارا یہ حال ہے کہ اسلام کے خلاف جو شخص جو چاہے کہتا رہے، ہمیں غیرت نہیں آتی اور ہماری ذات کے معاملے میں ذرا سی زیادتی ہو تو ہم سلگ اٹھتے ہیں۔

طائف میں جب آپ گئے تو انھوں نے بھی آپ کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا اور دل آزار باتیں کیں لیکن آپ نے ان کے لیے دعائے ضرر نہیں فرمائی کیونکہ آپ کو علم تھا کہ اہل طائف اسلام قبول کرلیں گے اور پھر نو ہجری وہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

زنا کی تعریف اور اس کی سزا کے بیان میں

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾

”زانیہ عورت اور زانی مرد ان میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو، اور ان پر شرعی حکم نافذ کرنے میں تم کو ان پر رحم نہ آئے، اگر تم اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت حاضر ہونی چاہیے“۔ (النور:۲)

اس آیت کی تفسیر میں ہم زنا کا معنی بیان کریں گے، زنا کی حد میں کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی کا فقہی اختلاف بیان کریں گے، زنا کی حد میں رجم کے دلائل کا ذکر کریں گے۔ زنا کی حد میں عورتوں کے ذکر کو مقدم کرنے کی وجہ بیان کریں گے، زنا کی حد میں کوڑوں کی کیفیت اور کوڑے مارنے کی تفصیل بیان کریں گے اور زنا کی ممانعت اور مذمت اور دنیا اور آخرت میں اس کی سزا کے متعلق احادیث بیان کریں گے۔ فنقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانۃ یلیق۔

زنا کا لغوی معنی

زنا کا لغوی معنی ہے پہاڑ پر چڑھنا، سائے کا سکڑنا، پیشاب کو روک لینا، حدیث میں ہے:

لا یصلی احدکم وھو زناء تم میں سے کوئی شخص پیشاب روکنے کی حالت میں نماز نہ پڑھے۔

(مسند الربیع بن حبیب، ج ا ص ۶۰، مکتبۃ الثقافۃ العربیہ بیروت)

اسی طرح حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس حال میں نماز نہ پڑھے کہ وہ پیشاب اور پاخانے کو روک رہا ہو۔اس حدیث کی سند قوی ہے۔

(صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۲۰۷۲، موارد الظمآن رقم الحدیث: ۱۹۵، تلخیص الحبیر رقم الحدیث: ۵۶۶، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۷۷۱،۷۶۶)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب کھانا آجائے تو نماز (کامل) نہیں ہوتی اور نہ اس وقت جب نمازی پیشاب اور پاخانے کو روک رہا ہو۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۵۶۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۸۹، شرح السنۃ رقم الحدیث: ۸۰۲، تاریخ دمشق لابن عساکر ج ۳۴ ص ۱۶۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۱ھ)۔

علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ زنا کا معنی ہے کسی عورت کے ساتھ بغیر شرعی کے وطی (مباشرت) کرنا۔

(مختار الصحاح ۱۷۰، النہایہ ج ۲ ص ۲۸۴، المفردات ج ۱ ص ۲۸۴)

قاضی عبدالنبی بن عبدالرسول احمد نگری لکھتے ہیں:

الزنا: اس اندام نہانی میں وطی (مباشرت، جماع) کرنا جو وطی کرنے والے کی ملکیت یا ملکیت کے شبہ سے خالی ہو۔

(دستور العلماء ج ۲ ص ۱۱۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)

سید مرتضی حسین زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

لغت میں زنا کا معنی کسی چیز پر چڑھنا ہے اور اس کا شرعی معنی ہے کسی ایسی شہوت انگیز اندام نہانی میں حشفہ (آلہ تناسل کے سر) کو داخل کرنا جس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہ ہو۔

(تاج العروس ج ۱۰ ص ۱۶۵، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر، ۱۳۰۶ھ)۔

فقہاء حنابلہ کے نزدیک زنا کی تعریف:

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

اہل علم کا اس شخص کے زانی ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جو کسی ایسی عورت کی قبل (اندام نہانی) میں وطی کرے جو حرام ہو اور وطی کسی شبہ سے نہ ہو اور دبر (سرین) میں وطی کرنا بھی اس کی مثل زنا ہے کیونکہ یہ بھی اس عورت کی فرج (شرمگاہ) میں وطی کرنا ہے جو اس کی ملکیت میں نہیں ہے اور نہ ملکیت کا شبہ ہے۔لہٰذا یہ قبل (اندام نہانی) میں وطی کی طرح ہے۔نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۔۔۔(النساء: ۱۵) تمہاری وہ عورتیں جو بے حیائی کا کام کرتی ہیں۔

اور دبر میں وطی کرنا بھی بے حیائی کا کام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کے متعلق فرمایا:

۔۔۔(الاعراف: ۸۰) کیا تم بے حیائی کا کام کرتے ہو؟

یعنی مرد، مردوں کی دبر میں وطی کرتے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ پہلے قوم لوط کے لوگ عورتوں کی دبر میں وطی کرتے تھے پھر مردوں کی دبر میں وطی کرنے لگے۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص مردہ عورت سے وطی کرے تو اس میں دو قول ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ اس پر حد ہے اور یہی امام اوزاعی کا قول ہے، کیونکہ اس نے آدم زاد کی فرج میں وطی کی ہے پس یہ زندہ عورت سے وطی کے مشابہ ہے، نیز اس لیے کہ

یہ بہت عظیم گناہ ہے کیونکہ اس میں بے حیائی کے ارتکاب کے علاوہ مردہ کی عزت کو بھی پامال کرنا ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر حد نہیں ہے اور یہ حسن کا قول ہے۔ ابو بکر نے کہا میرا بھی یہی قول ہے مردہ سے وطی کرنا وطی نہ کرنے کی مثل ہے، کیونکہ اس پر شہوت نہیں آتی اور لوگ اس سے کراہت محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے اس سے زجر کو مشروع کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور حد کو زجر کے لیے مشروع کیا گیا ہے۔ اور نابالغ لڑکی سے زنا کرنے کا حکم یہ ہے کہ اگر اس سے وطی کرنا ممکن ہو تو اس سے وطی کرنا زنا ہے اور اس سے وطی کرنے پر بالغہ سے وطی کی طرح حد واجب ہوگی۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: اگر کسی شخص نے محرم سے نکاح کر لیا تو یہ نکاح بالا جماع باطل ہے، اور اگر اس سے وطی کر لی تو اکثر اہل علم کے قول کے مطابق اس پر حد واجب ہے۔ حسن، جابر بن زید، امام مالک، امام شافعی، امام ابو یوسف، امام محمد، اسحاق، ابو ایوب، ابن ابی خیثمہ کا یہی قول ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ثوری کا قول یہ ہے کہ اس پر حد نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسی وطی ہے جس (کے جواز) میں شبہ پیدا ہو گیا ہے اس لیے اس وطی سے حد واجب نہیں ہوگی، جیسے کوئی شخص اپنی رضائی بہن کو خرید کر اس سے وطی کرے۔ اور شبہ کا بیان یہ ہے کہ اس نے محرم سے نکاح کر لیا اور نکاح اباحت وطی کا سبب ہے (اور حضرت آدم کی شریعت میں محارم مثلاً بہن سے نکاح جائز تھا) اس شبہ کی وجہ سے اس پر حد لازم نہیں ہوگی۔ (لیکن ایسے شخص کو تعزیراً قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ ایک شخص نے اپنی سوتیلی ماں سے شادی کر لی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کا سر قلم کرنے کا حکم دیا۔ (یعنی اس پر حد جاری نہیں کی)۔ نیز حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص محرم سے وطی کرے اس کو قتل کر دو۔

(جامع ترمذی ص ۲۳۱ مطبوعہ نور محمد کراچی، اور یہی امام ابو حنیفہ کی دلیل ہے۔ سعیدی غفرلہ)۔

علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں کہ امام احمد کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس پر حد واجب ہے، کیونکہ اس نے ایسی عورت کے ساتھ وطی کی ہے جس کے حرام ہونے پر اجماع ہے اور اس میں ملکیت کا کوئی شبہ نہیں ہے، اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر حد نہیں ہے جیسا کہ جامع ترمذی، سنن ابو داؤد اور سنن ابن ماجہ میں ہے۔ حضرت براء کہتے ہیں میری اپنے چچا سے ملاقات ہوئی درآں حالیکہ ان کے ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ میں نے کہا کہاں جا رہے ہیں، انھوں نے کہا ایک شخص نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے اس کی گردن مارنے اور اس کا مال ضبط کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ نیز جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "جو شخص محرم سے وطی کرے اس کو قتل کر دو۔"

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ امام احمد کا یہ قول راجح ہے کیونکہ یہ حدیث کے مطابق ہے۔ نیز علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ جو شخص بغیر نکاح کے محرم سے زنا کرے اس میں بھی وہی اختلاف ہے جو نکاح کے بعد وطی کرنے میں اختلاف ہے۔ (المغنی لابن قدامہ ج ۹ ص ۵۵۔ ۵۳، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

فقہاء شافعیہ کے نزدیک زنا کی تعریف

علامہ یحییٰ بن شرف نووی لکھتے ہیں: مراد اپنی حشفہ (سپاری) کو کسی ایسی فرج (اندام نہانی) میں داخل کر دے جو طبعاً مشتہیٰ ہو اور

اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہ ہو تو اس وطی پر حد واجب ہوتی ہے اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہو تو اس کی حد رجم ہے اور اس کے ساتھ اس کو کوڑے نہیں لگائے جائیں گے، اور اگر غیر محصن (غیر شادی شدہ) ہو تو اس کی حد کوڑے اور شہر بدر کرنا ہے، اس میں مرد اور عورت برابر ہیں۔

محصن ہونے کی تین شرطیں ہیں: پہلی شرط مکلف ہونا ہے، اس لیے بچہ اور مجنون پر حد نہیں لگے گی لیکن ان کو زجر و توبیخ کی جائے گی، دوسری شرط ہے حریت پس غلام، ام ولد اور جس کا بعض حصہ غلام ہو محصن نہیں ہیں، اور تیسری شرط ہے نکاح صحیح ہونا۔

(روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین ج ۱۰ ص ۸۶، مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۵ھ)

فقہاء مالکیہ کے نزدیک زنا کی تعریف

علامہ ابوعبداللہ شتانی مالکی لکھتے ہیں:

علامہ ابن حاجب مالکی نے زنا کی یہ تعریف کی ہے، ''کسی ایسے فرد کی فرج میں عمداً وطی کرے جو اس کی ملک میں بالاتفاق نہ ہو'' فرج کی قید سے وطی خارج ہوگئی جو غیر فرج میں ہو، اور آدمی کی قید سے وہ وطی خارج ہوگئی جو جانور کے ساتھ وطی ہو، کیونکہ جانور کے ساتھ وطی کرنے میں حد نہیں، تعزیر ہے۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۴ ص ۴۴۰، دارالکتب العلمیہ بیروت، طبع قدیم)۔

فقہاء احناف کے نزدیک زنا کی تعریف

ملک العلماء علامہ کاسانی حنفی لکھتے ہیں جو شخص دارالعدل میں احکام اسلام کا التزام کرنے کے بعد اپنے اختیار سے زندہ مشتہاۃ عورت کی قبل (اندامِ نہانی) میں وطی کرے دراں حالیکہ وقبل حقیقتاً ملکیت اور ملکیت کے شبہ اور حق ملک اور حقیقتاً نکاح اور شبہ نکاح اور نکاح اور ملک کے موضع اشتباہ کے شبہ سے خالی ہو۔ (بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳۳) علامہ ابن ہمام نے بھی یہی تعریف کی ہے۔

(فتح القدیر ج ۷ ص ۳۳ سکھر)۔

اس تعریف کی قیود کی وضاحت حسب ذیل ہے:

وطی: عورت کی اندام نہانی میں بقدر سپاری آلہ تناسل کو داخل کرنا، پس جس وطی سے حد واجب ہوگی اس میں بقدر سپاری داخل ہونا ضروری ہے اور اس سے کم میں حد واجب نہیں ہوگی۔

حرام: کسی مکلف شخص نے اجنبی عورت سے وطی کی ہو تو اس کو حرام کہا جائے گا، اگر چہ بچہ یا مجنون نے وطی کی تو اس پر حرام کا حکم نہیں لگے گا، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے تین شخصوں سے قلم تکلیف اٹھا لیا گیا، بچہ سے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے، سوئے ہوئے سے حتیٰ کہ وہ بیدار ہو جائے اور مجنون سے حتیٰ کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس حدیث کو امام ترمذی (رقم: ۱۴۲۳) اور امام ابوداؤد (رقم: ۱۴۴۰۱) نے روایت کیا ہے۔

قبل:

عورت کی اندام نہانی کو کہتے ہیں اس قید کی وجہ سے مرد یا عورت کی دبر (سرین) میں وطی امام ابوحنیفہ کے نزدیک زنا کی تعریف سے خارج ہوگئی، اس کے برخلاف امام ابو یوسف، امام محمد اور فقہاء مالکیہ، اور فقہاء حنبلیہ عورت کی دبر میں وطی کو بھی زنا قرار

دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ دبر میں وطی کو لواطت کہتے ہیں اور اس کی حد میں صحابہ کا اختلاف تھا اگر یہ زنا ہوتا تو اختلاف نہ ہوتا، نیز زنا اس لیے حرام ہے کہ اس سے نسبت مشتبہ ہوتا ہے اور بچہ ضائع ہوتا ہے اور لواطت میں صرف نطفہ ضائع ہوتا ہے جیسا کہ عزل میں ہے۔

عورت:

اس قید کی وجہ سے جانور کے ساتھ وطی، زنا کی تعریف سے خارج ہوگئی، کیونکہ یہ ایک نادر چیز ہے اور طبیعت سلیمہ اس سے نفرت کرتی ہے۔

زندہ:

اس قید کی وجہ سے مردہ کے ساتھ وطی، زنا کی تعریف سے خارج ہوگئی، کیونکہ یہ بھی ایک نادر امر ہے اور طبیعت سلیمہ اس سے نفرت کرتی ہے۔

مشتہاۃ:

یعنی اس عورت سے وطی کی جائے جس پر شہوت آتی ہو اتنی چھوٹی لڑکی جس پر شہوت نہ آتی ہو اس سے وطی کرنا زنا نہیں ہے۔ (ہر چند کہ اتنی چھوٹی لڑکی سے وطی کرنے والے پر تعزیر ہوگی)۔

حالتِ اختیار:

یعنی وطی کرنے والے کو اختیار ہو، اسی طرح حد کے وجوب کے لیے وطی کرانے والی عورت کا مختار ہونا بھی ضروری ہے، اس لیے مکرہ (جس پر جبر کیا گیا ہو) پر حد نہیں ہے، کیونکہ حافظ الہیثمی نے امام طبرانی کی متعدد اسانید کے ساتھ یہ حدیث ذکر کی ہے: حضرت عقبہ بن عامر، حضرت عمران بن حصین، حضرت ثوبان، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر (رض) سے روایت ہے: نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت سے خطاء، نسیان اور جس کام پر جبر کیا گیا ہو (کے گناہ کو) اٹھا لیا گیا۔

(مجمع الزوائد ج ۷ ص ۲۵۰، دار الکتاب العربی)

اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ اگر عورت پر جبر کر کے اس کے ساتھ وطی کی جائے تو اس پر حد نہیں ہے، لیکن مرد میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور محققین مالکیہ کے نزدیک اگر مرد پر جبر کر کے اس سے وطی کرائی جائے تو اس پر حد ہے نہ تعزیر۔ فقہاء حنابلہ کے نزدیک اس پر حد لگائی جائے گی کیونکہ اس کے آلہ کا منتشر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اکراہ نہیں ہے۔ اور وہ اپنے اختیار سے وطی کر رہا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مرد پر بھی حد نہیں ہے کیونکہ انتشار اس کے مرد ہونے کی دلیل ہے، اختیار کی دلیل نہیں ہے۔ امام ابو یوسف، اور امام محمد کا بھی یہی نظریہ ہے۔

دار العدل:

دار العدل سے مراد دار اسلام ہے، کیونکہ دار الحرب اور دار الکفر میں قاضی کو حد جاری کرنے کی قدرت نہیں ہے یعنی اگر کوئی شخص دار الحرب میں یا دار الکفر میں زنا کرے گا تو بھی وہ اسلامی سزا سو کوڑوں یا رجم کا مستحق ہے، لیکن چونکہ قاضی اسلام، دار الکفر

یا دارالحرب میں اسلام سزائیں نافذ کرنے پر قادر نہیں ہے اس لیے اس پر حد جاری نہیں ہوگی، دارالکفر میں بھی زانی سزا کا مستحق ہے اور اس کا یہ فعل گناہ ہے جیسا کہ سود، چوری، ڈاکہ، قتل اور دیگر جرائم اور دارالحرب میں ناجائز اور گناہ ہیں، اسی طرح زنا بھی وہاں ناجائز اور گناہ ہے۔

احکام اسلام کا التزام:

اس قید کی وجہ سے حربی متامن خارج ہے، کیونکہ اس نے احکام اسلام کا التزام نہیں کیا، مسلمان اور ذمی اور زنا کریں گے تو ان پر حد ی جاری کی جائے گی۔

حقیقت ملک سے خالہ ہونا:

اگر کسی شخص نے ایسی باندی سے وطی کرلی جو مشترکہ ہے اس کی اور کسی کی ملکیت میں ہے، یا اس نے ایسی باندی سے وطی کی جو اس کی محرم تھی تو چونکہ وہ حقیقتاً اس کی ملکیت میں تھی اس لیے اس کا یہ فعل ہر چند کہ ناجائز ہے لیکن زنا نہیں ہے اور اس پر حد نہیں ہے۔

حقیقتِ نکاح سے خالی ہونا:

اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے حالت حیض یا نفاس میں وطی کرلی یا روزہ دار یا محرمہ بیوی سے وطی کرلی یا ایلاء یا ظہار کے بعد وطی کرلی تو ہر چند کہ یہ فعل گناہ ہے لیکن زنا نہیں ہے، کیونکہ عورت حقیقتاً اس کے نکاح میں موجود ہے۔

شبہ ملک سے خالی ہونا: جب ملک یا نکاح میں شبہ ہو جائے تو حد نہیں ہے کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

۔۔۔(سنن الترمذی رقم الحدیث: ١٤٢٤) شبہات کی بناء پر حدود ساقط کردو۔

مثلاً اگر کسی شخص نے بیٹے کی باندی سے وطی کرلی تو اس پر حد نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کو یہ شبہ ہوا ہو کہ بیٹے کے مال کا میں مالک ہوں۔ امام ابن ماجہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ! میرا مال بھی ہے اور اولاد بھی اور میرا باپ میرا مال ہڑپ کرنا چاہتا ہے آپ نے فرمایا:

۔۔۔(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٢٢٩١) تو اور تیرا مال تیرے باپ کی ملکیت ہے۔

اسی طرح مکاتب کی باندی سے وطی کرنا بھی زنا نہیں ہے، کیونکہ مکاتب جب تک پوری رقم ادا نہ کرے مالک کا غلام ہے سو اس کی باندی بھی اس کی ملکیت ہے۔

شبہ نکاح سے خالی ہونا:

یعنی عقد نکاح میں شبہ نہ ہو۔ مثلاً کسی شخص نے بغیر ولی یا بغیر گواہ کے نکاح کر کے وطی کرلی، یا نکاح متعہ کر کے وطی کرلی تو اس کا یہ فعل زنا نہیں ہے خواہ وہ اس نکاح کے عدم جواز کا اعتقاد رکھتا ہو کیونکہ اس نکاح کے جواز اور عدم جواز میں علماء کے اختلاف کی وجہ سے اس نکاح میں شبہ آگیا۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے نسبی، رضاعی یا سسرالی کے رشتہ سے کسی محرم سے نکاح کرلیا یا دو بہنوں کو نکاح

میں جمع کرلیا یا کسی عورت سے اس کی عدت میں نکاح کرلیا اور اس عقد نکاح کی وجہ سے وطی کرلی تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر حد نہیں ہوگی خواہ اس کو نکاح کی حرمت کا علم ہو، کیونکہ اس وطی میں اس کو شبہ لاحق ہوگیا ہے۔ لہٰذا یہ وطی زنا نہیں ہے البتہ اس پر تعزیز ہے۔

فقہاء مالکیہ، فقہاء شافعیہ، فقہاء حنبلیہ، امام ابو یوسف اور امام محمد نے یہ کہا ہے کہ جو وطی ابداً حرام ہو اس سے حد لازم آتی ہے اور یہ نکاح باطل ہے اور اس کے شبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ البتہ جو وطی ابداً حرام نہ ہو جیسے بیوی کی بہن یا جس نکاح میں اختلاف ہو جیسے بغیر ولی یا بغیر گواہوں کے نکاح، اس وطی کی وجہ سے حد لازم نہیں آتی۔

امام ابوحنیفہ اور جمہور فقہاء کے درمیان منشاء اختلاف یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ جب نکاح کا اہل شخص اس محل میں نکاح کرے جو مقاصد نکاح کے قابل ہو تو وہ نکاح وجوب حد سے مانع ہے، خواہ وہ نکاح حلال ہو یا حرام اور خواہ وہ تحریم متفق علیہ ہو یا مختلف فیہ اور خواہ اس کو حرمت کا علم ہو یا نہ ہو۔ جمہور فقہاء اور صاحبین کے نزدیک قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس عورت سے نکاح کرے جس سے نکاح کرنا ابداً حرام ہو یا اس کی تحریم پر اتفاق ہو تو اس نکاح سے وطی پر حد لازم آتی ہے اور اگر وہ نکاح ابداً حرام نہ ہو یا اس کی حرمت میں اختلاف ہو تو پھر اس نکاح سے وطی پر حد لازم نہیں آتی۔

(بدائع صنائع ج ۷ ص ۳۰، مغنی المحتاج ج ٤ ص ١٤٥، المہذب ج ۲ ص ۲٦۸، المیزان الکبری ج ۲ ص ١٥٧، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ج ۳ ص ۲٥١، المغنی ج ۸ ص ١٧٤، رحمۃ الامۃ ج ۲ ص ١٣٦)

حد زنا کی شرائط:

حد زنا جاری کرنے کے لیے جن شرائط پر فقہاء کا اتفاق ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

١۔ زنا کرنے والا بالغ ہو، نابالغ پر بالاتفاق حد جاری نہیں ہوتی۔

۲۔ زنا کرنے والا عاقل ہو، پاگل اور مجنون پر بالاتفاق حد جاری نہیں ہوتی۔

۳۔ جمہور فقہاء کے نزدیک زانی کا مسلمان ہونا بھی شرط ہے، شادی شدہ کافر پر فقہاء حنفیہ کے نزدیک حد جاری نہیں ہوتی، البتہ اس کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ فقہاء شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک زنا اور شراب خوری کی کافر پر کوئی حد نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ کا حق ہے اور اس نے حقوق الٰہیہ کا التزام نہیں کیا، فقہاء مالکیہ کے نزدیک اگر کافر نے کافرہ کے ساتھ زنا کیا تو اس پر حد نہیں ہے، البتہ تادیباً اس کو سزا دی جائے گی اور اگر اس نے مسلمان عورت سے جبراً زنا کیا تو اس کو قتل کردیا جائے گا اور اگر باہمی رضامندی سے زنا کیا تو عبرتناک سزا دی جائے گی۔

٤۔ زانی مختار ہو اگر اس پر جبر کیا گیا ہے تو جمہور کے نزدیک اس پر حد نہیں ہے اور فقہاء حنابلہ کے نزدیک اس پر حد ہے اور اگر عورت پر جبر کیا گیا تو اس پر بالاتفاق حد نہیں ہے۔

٥۔ عورت سے زنا کرے، اگر جانور سے وطی کی ہے تو مذاہب اربعہ میں بالاتفاق اس پر حد نہیں ہے، البتہ تعزیر ہے اور جمہور کے نزدیک جانور کو بالاتفاق قتل نہیں کیا جائے گا اور اس کو کھانا جائز ہے۔ فقہاء حنابلہ کے نزدیک اس کا کھانا حرام ہے۔

٦۔ ایسی لڑکی سے زنا کیا ہو جس کے ساتھ عادتاً وطی ہوسکتی ہو اگر بہت چھوٹی لڑکی سے زنا کیا ہے تو اس پر حد نہیں ہے نابالغ لڑکی پر حد نہیں ہوتی۔

۷۔ زنا کرنے میں کوئی شبہ نہ ہو اگر اس نے کسی اجنبی عورت کو یہ گمان کیا کہ وہ اس کی بیوی یا باندی ہے، اور زنا کر لیا تو جمہور کے نزدیک اس پر حد نہیں ہے اور امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک اس پر حد ہے، جس عقد نکاح کے جواز یا عدم جواز میں اختلاف ہو اس نکاح کے بعد وطی کرنے پر حد نہیں ہے، مثلاً بغیر ولی یا بغیر گواہوں کے نکاح ہو، اور جو نکاح بالاتفاق ناجائز ہے جیسے محارم سے نکاح یا دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس نکاح کے بعد وطی کرنے پر حد نہیں ہے اور جمہور کے نزدیک حد ہے۔

۸۔ اس کو زنا کی حرمت کا علم ہو اگر وہ جہل کا دعویٰ کرے اور اس سے جہل متصور ہو تو اس میں فقہاء مالکیہ کے دو قول ہیں۔

۹۔ عورت غیر حربی ہو اگر وہ حربیہ ہے تو اس میں فقہاء مالکیہ کے دو قول ہیں۔

۱۰۔ عورت زندہ ہو اگر وہ مردہ ہے تو اس سے وطی کرنے پر جمہور کے نزدیک حد نہیں ہے اور فقہاء مالکیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ اس پر حد ہے۔

۱۱۔ مرد کا حشفہ (آلہ تناسل کا سر) عورت کی قبل (اندام نہانی) میں غائب ہو جائے اگر عورت کی دبر میں وطی کرلے تو جمہور کے نزدیک اس پر حد نہیں ہے، اسی طرح لواطت (اغلام) پر بھی حد نہیں ہے، اگر اجنبی عورت کے پیٹ یا رانوں سے لذت حاصل کی تو اس پر بھی تعزیر ہے۔

۱۲۔ زنا دار السلام میں کیا جائے، دار الکفر یا دار الحرب میں زنا کرنے پر حد نہیں ہے، کیونکہ قاضی اسلام کو وہاں حد جاری کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ (لفظ الاسلامی بیروت، ۱۴۰۵ھ)

احصان کی تحقیق:

فقہاء اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہو تو اس کو رجم کیا جائے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور اگر وہ غیر محصن ہے تو اس کو کوڑے مارے جائیں گے اس لیے احصان کا معنی سمجھنا ضروری ہے۔

سید محمد مرتضیٰ زبیدی حنفی لکھتے ہیں:

احصان کا اصل میں معنی ہے منع کرنا، عورت اسلام، پاکدامنی، حریت اور نکاح سے محصنہ ہوتی ہے، جوہری نے ثعلب سے نقل کیا ہے ہر پاک دامن عورت محصنہ ہے اور ہر شادی شدہ عورت محصنہ ہے۔ حاملہ عورت کو بھی محصنہ کہتے ہیں کیونکہ حمل نے اس کو دخول سے ممنوع کر دیا۔ مرد جب شادی شدہ ہو تو محصن ہے۔ حضرت ابن مسعود نے "فاذا احصن فان اتین بفاحشۃ" کی تفسیر میں کہا باندی کا احصان اس کا مسلمان ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا باندی کا احصان اس کا شادی شدہ ہونا ہے۔ زجاج نے محصنین غیر مسافحین کی تفسیر میں کہا مرد کا احصان اس کا شادی شدہ ہونا اور پاک دامن (غیر زانی) ہونا ہے اور فرج کا احصان، زنا سے رکنا ہے، اور احصنت فرجھا کا معنی پاکدامن رہنا اور زنا سے باز رہنا ہے اور والمحصنت من النساء کا معنی شادی شدہ خواتین ہے۔

(تاج العروس ج ۹ ص ۱۷۹، ۱۳۰۶ھ)

(۱) عقل (۲) بلوغ (۳) حریت (۴) اسلام (۵) نکاح صحیح (۶) خاوند اور بیوی دونوں کا ان صفات پر ہونا (۷) نکاح صحیح کے

بعد خاوند کا بیوی سے وطی کرنا لہذا بچہ، مجنون، غلام، کافر نکاح فاسد، عدم وطی اور زوجین کے ان صفات پر نہ ہونے سے احصان ثابت نہیں ہوگا۔
(بدائع الصنائع ج ۷ ص ۳۸۔ مطبوعہ کراچی ۱۴۰۰ھ)

زنا کی ممانعت، اور دنیا اور آخرت میں اس کی سزا کے متعلق قرآن مجید کی آیات:

۔۔۔(بنی اسرائیل: ۳۲) اور زنا کے قریب بھی مت جاؤ، بیشک وہ بے حیائی کا کام ہے اور برا راستہ ہے۔

۔۔۔(النور: ۲) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو تم سو کوڑے مارو، اور ان پر شرعی حکم نافذ کرنے میں تم کو ان پر رحم نہ آئے، اگر تم اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہو، اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت حاضر ہونی چاہیے۔

۔۔۔(الفرقان: ۲۹۔ ۲۸) اور جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو ناحق قتل نہیں کرتے، اور زنا نہیں کرتے، اور جو شخص یہ کام کرے گا وہ سخت عذاب کا سامنا کرے گا قیامت کے دن اس کے عذاب کو دگنا کر دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ ذلت والے عذاب میں رہے گا۔

اے نبی جب آپ کے پاس مومن عورتیں ان چیزوں پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، نہ چوری کریں گی نہ زنا کریں گی نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ کوئی ایسا بہتان باندھیں گی جس کو وہ خود اپنے ہاتھوں اور پیروں کے سامنے گھڑلیں اور نہ کسی نیک کام میں آپ کی حکم عدولی کریں گی تو آپ ان کو بیعت کرلیں اور ان کے لیے استغفار کریں۔ بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

زنا کی ممانعت، مذمت اور دنیا اور آخرت میں اس کی سزا کے متعلق احادیث اور آثار

(۱) حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا قیامت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھالیا جائے گا، جہل برقرار رہے گا، شراب پی جائے گی اور زنا کا ظہور ہوگا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۸۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۷۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۲۰۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۴۵، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۵۰۴۵، مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۱۹۹۰)

(۲) حضرت ابوموسیٰ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو عورت خوشبو لگا کر لوگوں کے سامنے سے گزرتی ہے تاکہ لوگوں کو اس کی خوشبو آئے وہ عورت زانیہ ہے۔ (یعنی وہ عورت لوگوں کے دلوں میں زنا کی تحریک پیدا کرتی ہے)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۱۷۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۷۸۶، مسند احمد ج ۴ ص ۳۹۴، مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۵۵۷، مسند البزار رقم الحدیث: ۱۵۵۱، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۴۲۴، المستدرک ج ۲ ص ۳۹۶، سنن بیہقی ج ۳ ص ۲۴۶)

(۳) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تین آدمیوں سے اللہ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر رحمت فرمائے گا اور ان کے لے دردناک عذاب ہوگا، بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ (سردار یا حاکم) اور متکبر فقیر۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۷، السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: ۷۱۳۸، شعب الایمان رقم الحدیث: ۵۴۰۵)

(٤) حضرت ابو ذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تین آدمیوں سے اللہ محبت رکھتا ہے اور تین آدمیوں سے اللہ بغض رکھتا ہے۔ جن تین آدمیوں سے اللہ محبت رکھتا ہے وہ یہ ہیں: ایک شخص لوگوں کے پاس جا کر سوال کرے، اس کا سوال ان کے ساتھ کسی رشتہ داری کی بناء پر نہ ہو، اور وہ لوگ اس کو منع کر دیں، پھر ایک شخص ان کے پیچھے سے جائے اور چپکے سے اس کو دے دے، اور اس کے عطیہ کو اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا ہو، یا وہ شخص جس کو اس نے عطیہ دیا تھا اور وہ لوگ جو رات کو سفر کریں حتیٰ کہ نیند ان کو بہت زیادہ مرغوب ہو جائے پھر وہ ٹھہر جائیں اور اپنے سر رکھ کر سو جائیں پھر ان میں سے ایک شخص بیدار ہو کر نماز میں قیام کرے اور میری حمد و ثنا کرے اور میری آیت کی تلاوت کرے، اور وہ شخص جو کسی لشکر میں ہو اس کا دشمن سے مقابلہ ہو وہ لشکر شکست کھا جائے اور وہ شخص آگے بڑھ کر حملہ کرے حتیٰ کہ وہ شخص شہید ہو جائے یا فتح یاب ہو، اور جن تین آدمیوں سے اللہ بغض رکھتا ہے وہ یہ ہیں: بوڑھا زانی، متکبر فقیر اور مالدار ظالم۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٥٦٨، سنن النسائی رقم الحدیث: ١٦١٤، السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث ١٢٢٣، مصنف ابن ابی شیبہ ج ٥ ص ٢٨٩، مسند احمد ج ٥ ص ١٥٣، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ٢٤٥٦، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٣٣٤٩، المستدرک ج ٢ س ١١٣)۔

(٥) حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں سورج کو گہن لگ گیا۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، ان کو کسی کی موت کی وجہ سے گہن لگتا ہے نہ کسی کی حیات کی وجہ سے۔ پس جب تم ان نشانیوں کو دیکھو تو اللہ سے دعا کرو، اللہ اکبر کہو اور نماز پڑھو، اور صدقہ کرو پھر فرمایا: اے امت! اللہ کی قسم! کسی شخص کو اللہ سے زیادہ اس پر غیرت نہیں آتی کہ اس کا بندہ زنا کرے یا اس کی بندی زنا کرے۔ اے اُمتِ! اگر تم ان چیزوں کو جان لو جن کو میں جانتا ہوں تو تم ضرور کم ہنسو اور تم ضرور زیادہ روؤ۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ١٠٤٤، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٩٠١، سنن ابو داؤد رقم الحدیث ١٧٧، سنن النسائی رقم الحدیث: ١٤٧١، ١٤٧٠)

(٦) حضرت سمرہ بن جندب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب سے اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کیا تم میں سے کسی شخص نے خواب دیکھا ہے، پھر کوئی شخص جو اللہ چاہتا وہ خواب بیان کرتا۔ ایک دن صبح کے وقت آپ نے فرمایا بیشک آج رات (خواب میں) دو فرشتے آئے اور وہ مجھے اٹھا کر لے گئے، انھوں نے مجھ سے کہا آپ چلئے میں ان کے ساتھ چلتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ ننگے مرد اور ننگی عورتیں ایک تنور کی مثل میں تھے اس کا بالائی حصہ تنگ تھا اور نچلا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے سے آگ جل رہی تھی جب آگ کے شعلے بھڑکتے تو وہ لوگ اوپر اٹھ جاتے اور جب آگ کم ہوتی تو وہ نیچے گر جاتے۔ فرشتوں نے بتایا وہ زانی مرد اور زانی عورتیں تھیں۔ الحدیث۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٧٠٤٧، ١٣٨٦، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٢٧٥، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٢٩٤، السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: ٧٦٥٨)

(٧) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے زنا کیا یا شراب پی اللہ اس سے ایمان کو نکال لیتا ہے جیسے انسان اپنے سر سے قمیص اتارتا ہے۔ (المستدرک ج اص ٢٢، شعب الایمان رقم الحدیث: ٥٣٦٦، الکبائر لذھبی ص ٨٣۔ ٨٢، الترغیب والترہیب للمنذری ج ٣ ص ٢٥٢، دار الحدیث قاہرہ)۔

(٨) حضرت ام المومنین میمونہ بنت الحارث (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میری امت اس وقت تک اچھے حال میں رہے گی جب تک ان کی اولاد زنا کی کثرت سے نہو، اور جب ان کی اولاد زنا کی کثرت سے ہوگی تو

عنقریب اللہ ان میں عام عذاب نازل فرمائے گا۔

(مسند احمد ج ٦ ص ٣٣٣، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ٧٠٩١، مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٧)

(٩) امام طبرانی نے حضرت شریک، ایک صحابی سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص زنا کرتا ہے اس سے ایمان نکل جاتا ہے، پس اگر وہ توبہ کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ٧٢٢٤، شعب الایمان رقم الحدیث: ٥٣٦٦، مجمع الزوائد ج ١ ص ١٠١، الترغیب والترہیب للمنذری رقم الحدیث: ٣٥٢٩، حافظ عسقلانی نے کہا اس کی سند جید ہے ج ١٢ ص ٦١، الاصابہ ج ٣ ص ٣٤٩، قدیم)۔

(١٠) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس وقت زانی زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جس وقت شرابی شراب پیتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا اور جس وقت چور چوری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا، اور جس وقت کوئی لٹیرا کسی شریف آدمی کو لوٹتا ہے اور لوگ اس کو نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو وہ مومن نہیں ہوتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث (رح) ٥٥٧٨، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٥٧، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٤٨٧٠، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٣٩٣٦، شعب الایمان رقم الحدیث: ٥٣٦٣، تاریخ ودمشق الکبیر جز ٥٦ ص ٨٦، ٨٥، رقم الحدیث: ١٢٢٤١، ١٢٢٤٠، مطلوبہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ١٤٢١ھ)

(١١) حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس قوم میں خیانت کا ظہور ہوتا ہے اس قوم کے دلوں میں رعب ڈال دیا جاتا ہے اور جس قوم میں زنا بہ کثرت ہوتا ہے ان میں موت بہ کثرت ہوتی ہے اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے ان سے رزق منقطع ہوجاتا ہے اور جو قوم ناحق فیصلے کرتی ہے ان میں خون ریزی زیادہ ہوتی ہے اور جو قوم عہد شکنی کرتی ہے ان پر اللہ دشمن کو مسلط کردیتا ہے۔

(سنن کبریٰ للبیہقی ج ٣ ص ٣٤٦، الموطا رقم الحدیث: ١٠٢٠، الاستذکار ج ١٤ ص ٢١١۔ ٢١٠، رقم الحدیث: ٢٠٠٩٠)

(١٢) حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا یارسول اللہ! اللہ کے نزدیک کونسا گناہ سب سے زیادہ بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا تم اللہ کو شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے، اس نے پوچھا پھر کونسا ہے؟ فرمایا تم کھانے کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کردو، اس نے پوچھا پھر کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو، پھر اللہ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی:

آیت ۔۔۔ (الفرقان: ٦٨)

اور جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی عبادت نہیں کرتے اور نہ کسی ایسے شخص کو قتل کرتے ہیں جس کے قتل کو اللہ نے حرام کردیا ہو اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو شخص یہ کام کرے گا اس کو عذاب کا سامنا ہوگا۔

(صحیح البخاری رقم (رح) الحدیث: ٦٨٦١، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٨٦، سنن الترمذی رقم (رح) الحدیث: ٣١٨٢، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٢٣١٠، سنن النسائی رقم الحدیث: ١٣٤٠، السنن الکبری للنسائی رقم الحدیث: ١٠٩٨٧)

(١٣) حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم زنا سے بچتے رہو، کیونکہ اس میں چار خصلتیں ہیں:

(١) اس سے چہرے کی رونق چلی جاتی ہے۔

(٢) رزق منقطع ہوجاتا ہے۔

(٣) رحمان ناراض ہوتا ہے۔
(٤) اور دوزخ میں دخول ہوتا ہے۔ (یعنی بہت دیر تک رہنا)
(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٧٠٩٢، مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٤، اس کی سند میں عمرو بن جمیع متروک ہے)

(١٤) حضرت عبداللہ بن یزید (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اے عرب کی ہلاک ہونے والی عورتو! مجھے سب سے زیادہ تم پر زنا کا اور شہوت خفیہ (ریاکاری) کا خوف ہے۔
(حلیۃ الاولیاء ج ٧ ص ١٢٢)

(١٥) حضرت سلمان (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تین آدمی جنت میں داخل نہیں ہوں گے، بوڑھا زانی، امام کذاب اور متکبر فقیر۔
(مسند البزار رقم الحدیث: ١٣٠٨، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ٣٠٣٤، مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٥)

(١٦) حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب اہل ذمہ پر ظلم کیا جائے تو دشمنوں کی حکومت ہو جائے گی اور جب کثرت کے ساتھ زنا کیا جائے گا تو لوگ بہ کثرت قید ہوں گے اور جب قوم لوط کا عمل بہ کثرت کیا جائے گا تو اللہ مخلوق کے اوپر سے اپنا ہاتھ اٹھائے گا، پھر یہ پروا نہیں کرے گا کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتے ہیں۔
(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ١٧٥٢، حافظ الہیثمی نے کہا اس کی سند میں عبدالخالق بن زید بن واقد ضعیب ہے، مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٥)

(١٧) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بوڑھے زانی اور بوڑھی زانیہ کی طرف نہیں دیکھے گا۔
(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٨٣٩٦، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ٣٥٣،
حافظ الہیثمی نے کہا اس کی سند میں ایک رواوی ہے موسیٰ بن سہل اس کو میں نہیں جانتا اور اس کے باقی راوی ثقافت ہیں)

(١٨) حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ تعالیٰ معمر زانی اور متکبر فقیر کی طرف نہیں دیکھے گا۔
(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ١٣١٩٥، حافظ الہیثمی نے کہا اس کا ایک روای ابن لہیعہ ہے اس کی حدیث حسن بھی ہوتی ہے اور ضعیف بھی مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٥)۔

(١٩) حضرت نافع (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا متکبر مسکین، بوڑھا زانی اور اپنے عمل سے اللہ پر احسان جتانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ٣٥٣٦، حافظ الہیثمی نے کہا اس کے ایک راوی الصباح بن خالد کو میں نہیں جانتا اور اس کے باقی راوی ثقہ ہیں مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٥)

(٢٠) حضرت بریدہ (رض) نے کہا سات آسمان اور سات زمینیں بوڑھے زانی پر لعنت کرتی ہیں اور زانیوں کی فروج کی بدبو سے اہل دوزخ کو بھی ایذا ہوگی۔
(مسند البزار رقم الحدیث: ١٥٤٨، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ٣٥٣٧، مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٥)۔

(٢١) حضرت عثمان بن ابی العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا آدھی رات کو آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پھر ایک منادی نداء کرتا ہے کہ کوئی دعا کرنے والا ہو تو اس کی دعا قبول کی جائے، کوئی

سائل ہو تو اس کو عطا کیا جائے، کوئی مصیبت زدہ ہو تو اس کی مصیبت دور کر دی جائے پس ہر دعا کرنے والے مسلمان کی دعا قبول کر لی جائے گی سوا اس عورت کے جو پیسے لے کر زنا کراتی ہے اور سوا اس شخص کے جو ظالمانہ ٹیکس لیتا ہے۔

(مسند احمد ج ٤ ص ٢٢، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٢٧٩٠، حافظ منذری نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے الترغیب والترہیب ج ا رقم الحدیث: ١١٦٣، مجمع الزوائد ج ٣ ص ٨٨)

(٢٢) حضرت عبد اللہ بن بسر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا زانیوں کے چہروں میں آگ بھڑک رہی ہو گی۔

(الترغیب والترہیب ج ٣ رقم الحدیث: ٣٥٢٤، مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٥، اس کی سند پر اعتراض ہے)

(٢٣) حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا زنا فقر پیدا کرتا ہے۔

(شعب الایمان رقم الحدیث: ٥٤١٨، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ٣٥٢٥)

(٢٤) حضرت ابو امامہ باہلی (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں سویا ہوا تھا میرے پاس دو شخص آئے ان دونوں نے مجھے میری بغلوں سے پکڑ کر اٹھایا اور مجھے ایک سخت چڑھائی والے پہاڑ پر لے گئے، اور مجھ سے کہا اس پر چڑھیے میں نے کہا اس میں کی طاقت نہیں رکھتا، انھوں نے کہا ہم آپ کے لیے چڑھنا آسان کر دیں گے، پھر میں چڑھا حتیٰ کہ میں اس پہاڑ کے وسط میں پہنچ گیا، ناگاہ میں نے بہت زور کی آوازیں سنیں۔ میں نے پوچھا یہ کیسی آوازیں ہیں؟ انھوں نے کہا یہ دوزخ کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ہیں، (الی قولہ) ہم چلتے رہے حتیٰ کہ میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے بدن بہت پھولے ہوئے تھے اور ان سے سخت بدبو آرہی تھی، میں نے پوچھا یہ کون ہیں؟ انھوں نے کہا یہ مقتولین کفار ہیں، وہ پھر مجھے آگے لیے گئے وہاں ایسے لوگ تھے جن کے بدن بہت پھولے ہوئے تھے اور ان سے سخت بدبو آرہی تھی گویا کہ وہ پاخانے کی بدبو تھی میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا یہ زنا کرنے والے مرد اور زنا کرنے والی عورتیں ہیں: الحدیث

(صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ١٩٨٦، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ١٤٨٥)

(٢٥) حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب کوئی شخص زنا کرتا ہے تو اس کا ایمان نکل جاتا ہے گویا کہ وہ اس کے اوپر سائبان ہو اور جب وہ اس سے توبہ کرتا ہے تو اس کا ایمان لوٹ آتا ہے۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ٤٦٩٠، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٢٦٢٧، المستدرک ج ١ ص ٢٢، سنن بیہقی ج ١ ص ٥٣٦٦)

(٢٦) حضرت جابر بن عبد اللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آئے اور ہم اکٹھے جاتے۔ آپ نے فرمایا: اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو اور رشتہ داروں سے ملاپ رکھو، رشتہ داروں سے میل جول سے زیادہ جلد پہنچنے والا اور کوئی ثواب نہیں ہے اور بغاوت سے (یا زنا سے) بچو کیونکہ اس سے زیادہ جلد پہنچنے والا اور کوئی عذاب نہیں ہے، اور تم ماں باپ کی نافرمانی سے بچو کیونکہ ایک ہزار سال کی مسافت سے جنت کی خوشبو آتی ہے اور ماں کبریائی صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

(الترغیب والترہیب ج ٣ رقم الحدیث: ٣٥١٩، مجمع الزوائد ج ٥ ص ١٢٥)

(٢٧) راشد بن سعد المقرائی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جب مجھے معراج کرائی گئی تو میرا ایسے

لوگوں کے پاس سے گزرہوا جن کی کھال آگے کی قینچیوں سے کاٹی جا رہی تھی۔ میں نے کہا اے جبرائیل جہاں سے گزرے جس سے سخت بد بو آرہی تھی میں نے پوچھا اے جبرائیل یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا یہ وہ عورتیں ہیں جو زنا کرانے کے لیے خود کو مزین کرتی تھیں اور وہ کام کرتی تھیں جو ان کے لیے جائز نہ تھے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔

(شعب الایمان رقم الحدیث: ۶۷۵۰، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۳۵۴۰)

(۲۸) حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا عادتاً زنا کرنے والا بت پرست کی مثل ہے۔

(مساوی الاخلاق للخرائطی رقم الحدیث: ۴۷۷، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۳۵۴۱، تاریخ دمشق الکبیر لابن عساکر جز ۲۳ ص ۱۷۳ رقم الحدیث: ۴۹۳۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۱ھ)

حافظ منذری نے کہا صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ عادی شرابی بت پرست کی طرح اللہ سے ملاقات کرے گا اور اس میں شک نہیں کہ زنا شراب نوشی سے بڑا گناہ ہے۔

(الترغیب والترہیب ج ۳ ص ۲۳۷، بیروت، ۱۴۱۴ھ)

(۲۹) حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس بستی میں زنا اور سود کا ظہور ہو انھوں نے اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو حلال کرلیا۔ (یہ حدیث صحیح ہے) (المستدرک ج ۲ ص ۳۷، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۳۵۴۳، شعب الایمان رقم الحدیث: ۵۴۱۷)

(۳۰) حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ جس قوم میں زنا اور سود کا ظہور ہوا انھوں نے اپنے اوپر اللہ کے عذاب کو حلال کرلیا۔

(مسند ابو یعلی رقم الحدیث: ۴۹۸۱، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۳۵۴۴، ۲۷۷۰، مجمع الزوائد ج ۴ ص ۱۱۸)

(۳۱) حضرت مقداد بن اسود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ تم زنا کے متعلق کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا یہ حرام ہے اس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔ یہ قیامت تک کے لیے حرام ہے، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے اصحاب سے فرمایا اگر کوئی شخص دس عورتوں سے زنا کرے تو یہ اس کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے (یعنی ان کی اس کی سزا اس سے کم ہے) کہ وہ اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔

(مسند احمد ج ۶ ص ۸، اس کے راوی ثقات ہیں، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۳۵۴۷)

(۳۲) حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے گا، اس کی طرف اللہ قیامت کے دن نہیں دیکھے گا اور نہ اس کو پاک کرے گا اور فرمائے گا دوزخ میں دوزخیوں کے ساتھ داخل ہوجاؤ۔

(مساوی الاخلاق للخرائطی رقم الحدیث: ۴۸۵، مسند الفردوس الدیلمی رقم الحدیث: ۳۳۷۱، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۳۵۴۸)۔

(۳۳) حضرت ابو قتادہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص اس عورت کے بستر پر بیٹھا جس کا شوہر غائب ہو، قیامت کے دن اللہ ایک اژدھے کو اس کے اوپر قادر کر دے گا۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۳۲۷۸، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۳۲۳۷، الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ۳۵۳۹، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۲۵۸)۔

(٣٤) حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ جو شخص اس عورت کے بستر پر بیٹھتا ہے جس کا شوہر غائب ہو، اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کو قیامت کے اژدھوں میں سے کوئی سیاہ اژدھا بھنبھوڑ رہا ہو۔

(الترغیب والترہیب رقم الحدیث: ٣٥٥٥، حافظ الہیثمی نے کہا اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی ثقات ہیں، مجمع الزوائد ج ٦ ص ٢٥٨)۔

(٣٥) حضرت بریدہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجاہدین کی بیویوں کی حرمت، جہاد پر نہ جانے والوں کے لیے ان کی ماؤں کی مثل ہے اور مجاہد جس شخص کے اوپر اپنی اہلیہ کو چھوڑ کر جائے اور وہ اس میں خیانت کرے تو اس کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا اور مجاہد اس کی نیکیوں میں سے جس قدر چاہے گا، لے لے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ اس کی نیکی چھوڑ دے گا؟

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٨٧، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ٢٤٩٦، سنن نسائی رقم الحدیث: ٣١٨٩)

(٣٦) حضرت ابو ذر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا بنی اسرائیل کے ایک عابد نے ساٹھ سال اپنے گرجے میں اللہ کی عبادت کی، پھر بارش ہوئی اور زمین سرسبز ہوگئی۔ راہب نے اپنے گرجے سے باہر جھانکا اور سوچا کہ میں گرجے سے باہر نکل کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کروں اور زیادہ نیکی حاصل کروں۔ وہ گرجے سے اترا، اس کے ہاتھ میں ایک روٹی یا روٹیاں بھی تھیں، جس وقت وہ باہر کھڑا تھا تو ایک عورت آ کر اس سے ملی وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ اس عابد نے اس سے اپنی خواہش پوری کرلی، پھر اس پر بے ہوشی طاری ہوگئی پھر وہ ایک تر م تالاب میں نہایا، اس کے بعد ایک سائل آیا تو اس نے ان دو روٹیوں کی طرف اشارہ کیا، پھر اس کی ساٹھ سال کی عبادت کا زنا کے گناہ کے ساتھ وزن کیا گیا تو گناہ کا پلڑہ بھاری نکلا، پھر ان روٹیوں کی نیکی کا وزن کیا گیا تو نیکیوں کا پلڑہ بھاری نکلا سو اس کو بخش دیا گیا۔ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا بیان ہے ساٹھ سال کی عبادت ایک زنا کے گناہ سے ضائع کردی اور دو روٹیوں کو صدقہ کرنے کی نیکی سے اس کے گناہ بخش دیئے، وہ جس گناہ پر چاہے پکڑ لیتا ہے اور جس نیکی کو چاہتا ہے نواز دیتا ہے۔

(صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٣٧، الترگیب والترہیب رقم الحدیث: ٣٥٣١، ١٣٨٧، ١٢٩٩)

(٣٧) شعبی بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت علی (رض) نے جمعہ کے دن ایک عورت کو رجم (سنگسار) کیا تو کہا میں نے اس کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت سے رجم کیا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٨١٢)

(٣٧) شیبانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ (رض) سے سوال کیا کہ کیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رجم (سنگسار) کیا ہے؟ انھوں نے کہا ہاں، میں نے سوچا سورۃ نور کے نزول سے پہلے یا اس کے بعد؟ انھوں نے کہا مجھے معلوم نہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٢٨١٣، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٧٠٢)

اس سوال کا منشاء یہ ہے کہ اگر رجم سورۃ نور کے نازل ہونے سے پہلے ہوا ہے تو ہوسکتا ہے کہ سورۃ نور کے نازل ہونے کے بعد وہ منسوخ ہوگیا ہو کیونکہ سورۃ نور میں زانیوں کو کوڑے مارنے کا حکم ہے اور اگر سورۃ نور کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رجم کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سو کوڑے مارنے کا حکم رجم کرنے کے منافی نہیں ہے یعنی کنوارے اگر زنا کریں تو ان کو سو

کوڑے مارے جائیں اور اگر شادی شدہ زنا کریں تو ان کو رجم (سنگ سار) کیا جائے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ سورۃ نور کے نزول کے بعد رجم کیا گیا ہے کیونکہ سورۃ نور کے نزول کے متعلق ہم بیان کرچکے ہیں کہ تین قول ہیں، ٤ ہجری، ٥ ہجری اور ٦ ہجری اور صحیح یہ ہے کہ سورۃ نور شعبان ٥ ہجری میں نازل ہوئی ہے اور رجم اس کے بعد کیا گیا ہے کیونکہ رجم کے موقع پر حضرت ابوہریرہ (رض) موجود تھے اور وہ ٧ ہجری میں اسلام لائے تھے، اور حضرت ابن عباس (رض) بھی موجود تھے اور حضرت ابن عباس (رض) اپنی والدہ کے ساتھ ٩ ہجری میں مدینہ آئے تھے۔

(فتح الباری ج ٤ ص ٧٩، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤٢٠ھ)

(٣٩) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ زنا کرچکا ہے اور اس نے چار مرتبہ قسم کھا کر اپنے متعلق زنا کرنے کا اقرار کیا اور وہ شخص شادی شدہ تھا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو رجم (پتھر مار مار کر ہلاک) کردیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٤١٨، سنن الترمذی رقم الحدیث: ١٤٣٢، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ٧١٥٨، مسند احمد رقم الحدیث: ١٥١٥٥، عالم الکتب بیروت)۔

(٤٠) حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا مجھ سے حکم لو، مجھ سے حکم لو، اللہ نے زنا کرنے والیوں کی سزا کی راہ بیان فرمادی اگر کنواری کنوارے کے ساتھ زنا کرے تو ان کو سو کوڑے مارو، اور ایک سال کے لیے شہر بدر کردو، اور اگر شادی شدہ، شادی شدہ کے ساتھ زنا کرے تو ان کو رجم (سنگسار) کردو۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٢٩٠، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٤١٦، ٤٤١٥، سنن الترمذی رقم الحدیث: ١٤٣٤، سنن الترمذی رقم الحدیث: ١٤٣٤، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ١١٠٩٣، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٢٥٥٠)

سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے زانیہ عورتوں کے متعلق فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی سزا کی سبیل بیان فرمائے گا اس حدیث میں آپ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی سزا کی راہ بیان کردی ہے اور اپنا وعدہ پورا فرمادیا ہے، سورۃ النساء کی وہ آیت یہ ہے:

۔۔۔ (النساء: ١٥)

تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں ان کے خلاف تم اپنوں میں سے چار گواہ طلب کرو، پس اگر وہ شہادت دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں قید رکھو حتیٰ کہ موت ان کی زندگیاں پوری کردے یا اللہ ان کو کوئی اور سزا مقرر فرمادے۔

سو جس سزا کے مقرر کرنے کا سورۃ نساء میں ذکر کیا گیا تھا وہ کنواری عورت کو کوڑے مارنے اور شادی شدہ کا رجم کرنے کا حکم ہے۔ کوڑے مارنے کا حکم سورۃ نور میں ہے اور رجم کرنے کا ذکر ان احادیث میں ہے، ہم نے رجم کے ثبوت میں ٥٣ احادیث مرفوعہ، ٤٠ آثار صحابہ اور ٥ فتاویٰ تابعین ذکر کیے ہیں۔

حضرت ابوامامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

جس شخص کی نظر کسی عورت کے حسن کی طرف (بلاقصد) پڑ جائے پھر وہ اپنی نظیر پھیر لے اللہ اس کے دل میں اس کی عبادت میں حلاوت اور لذت پیدا کردیتا ہے۔

(شعب الایمان رقم الحدیث: ٥٤٣١، مطلبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ١٤١٠ھ)

زنا کی حد میں عورت کے ذکر کو مقدم کرنے کی توجیہ

قرآن مجید میں احکام بیان کرنے کا عام اسلوب یہ ہے کہ صرف مردوں پر کسی حکم کو فرض کیا جاتا ہے اور عورتیں اس حکم میں بالتبع داخل ہو جاتی ہیں لیکن اس آیت میں زنا کرنے والی عورتوں اور مردوں دونوں کا ذکر کیا گیا ہے، نہ صرف یہ بلکہ عورتوں کے ذکر کو مقدم کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل میں زنا کا سبب اور اس کا محرک عورت ہوتی ہے، عورت سے جنسی لذت حاصل کرنے کے لیے مرد فعل زنا کا مرتکب ہوتا ہے اور

۔۔۔(المائدہ: ۳۸) چور مرد اور چور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔

اس آیت میں چور مرد کا ذکر چور عورت سے پہلے فرمایا کیونکہ اکثر و بیشتر اس فعل کو صدور مرد سے ہوتا ہے۔

کوڑے مارنے کے مسائل اور فقہی احکام

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جس چیز کے ساتھ کوڑے لگائے جائیں گے، وہ چابک ہو یا درخت کی شاخ اور وہ چابک یا شاخ متوسط ہو نہ بہت سخت ہو، نہ بہت نرم ہو۔ حدیث میں ہے:

امام مالک، زید بن اسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد میں ایک شخص نے اپنے اوپر زنا کا اعتراف کرلیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو مارنے کے لیے ایک چابک منگوایا تو ایک ٹوٹا ہوا چابک لایا گیا، آپ نے فرمایا اس سے سخت لاؤ تو درخت کی ایک نئی شاخ لائی گئی جس کے پھل بھی نہیں اتارے گئے تھے۔ آپ نے فرمایا اس سے ذرا کم لاؤ، پھر ایک استعمال شدہ اور نرم شاخ لائی گئی، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے کوڑے مارنے کا حکم دیا، پھر آپ نے فرمایا: اے لوگو! اب وقت آگیا ہے کہ تم اللہ کی حدود کے ارتکاب سے باز آجاؤ اور جس شخص نے ان ناپاک کاموں میں سے کوئی کام کرلیا اس کو چاہیے کہ وہ اللہ کے ستر کے ساتھ اپنا پردہ رکھے، کیونکہ جس کا جرم ہم پر ظاہر ہوگا اس کے اوپر اللہ کی کتاب کو جاری کردیں گے۔

(موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۵۸۸، مطبوعہ دارالمعرفتہ بیروت، ۱۴۲۰ھ)

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ جس شخص پر کوڑے لگائے جائیں اس کے کپڑے اتارے جائیں یا نہیں، امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے یہ کہا کہ اس کے کپڑے اور عورت کے کپڑے نہ اتارے جائیں البتہ وہ کپڑے اتار دیئے جائیں جو ضرب سے بچاتے ہوں۔ امام اوزاعی نے کہا مرد کے کپڑے اتروانے میں امام کو اختیار ہے چاہے اس کے کپڑے اتروائے جائیں یا نہیں۔ شعبی اور نخعی نے کپڑے اتارنے سے منع کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا کہ اس کے کپڑے اتارے جائیں غالباً ان کی مراد یہ ہے۔ ثوری بھی یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے جو کہا ہے کہ اس کے کپڑے اتارے جائیں غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ مرد کے ستر کے علاوہ اس کے کپڑے اتار دیئے جائیں۔

اس میں بھی اختلاف ہے کہ حد جاری کرتے وقت انسان کے کن اعضاء پر کوڑے مارے جائیں؟ امام مالک نے کہا کہ حدود اور تعزیرات میں صرف پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں۔ امام شافعی اور ان کے اصحاب نے کہا کہ چہرے اور نازک اعضاء کے سوا تمام جسم پر کوڑے مارے جائیں، سر پر مارنے میں اختلاف ہے۔ جمہور نے کہا کہ سر کو بچایا جائے اور امام ابو یوسف نے کہا کہ سر پر

ضرب لگائی جائے، حضرت عمر اور حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ سر پر ضرب لگائی جائے، امام مالک کی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ھلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سمحاء کے ساتھ زنا کی تہمت لگائی اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اس کو پیش کیا، تب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تم گواہ پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد قذف کے کوڑے لگائے جائیں گے، اس نے کہا یا رسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے اوپر کسی مرد کو دیکھے تو کیا وہ گواہوں کو تلاش کرنے جائے گا؟ آپ نے پھر یہی فرمایا کہ تم گواہوں کو پیش کرو ورنہ تمہاری پیٹھ پر حد قذف لگائی جائے گی، پھر لعان کے احکام نازل ہوئے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲٦٧١، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۲۵٤، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۷۸، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۲٤۷۷، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۲۸۲٤، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٤٤۵۱)

کوڑوں کے ساتھ ایسی ضرب لگائی جائے، جس سے چوٹ لگے، درد ہو لیکن زخم نہ آئے۔ امام مالک اور ان کے اصحاب نے کہا ہے کہ تمام قسم کی حدود میں ضرب مساوی ہو اس سے کوئی زخم نہ پڑے۔ امام شافعی (رض) کا بھی یہی قول ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب (رض) نے یہ کہا ہے کہ تعزیر میں سخت ضرب لگانی چاہیے، زنا کی ضرب شراب نوشی کی ضرب سے زیادہ شدید ہے اور شراب نوشی کی ضرب قذف (تہمت) کی ضرب سے زیادہ شدید ہے۔

پہلے شراب نوشی کی حد میں اختلاف تھا۔ عبد الرحمن بن ازھر بیان کرتے ہیں کہ میں نے غزوہ حنین کے دن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا آپ لوگوں کے درمیان کھڑے ہوئے تھے، آپ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جو نشہ میں تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان لوگوں سے کہا جو آپ کے پاس تھے، تمہارے ہاتھ میں جو چیز آئے اس سے اس کو مارو، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مٹی اٹھا کر اس پر ماری، حضرت ابوبکر (رض) کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جو نشہ میں تھا، انھوں نے اس کو چالیس کوڑے مارے۔

ابن وبرہ کلبی بیان کرتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید (رض) نے مجھے حضرت عمر (رض) کے پاس بھیجا میں جب ان کے پاس پہنچا تو وہاں حضرت عثمان بن عفان، حضرت عبد الرحمن بن عوف، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا حضرت خالد بن ولید نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے، انھوں نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ لوگ اب شراب بہت پینے لگے ہیں اور اس کی سزا معمولی سمجھتے ہیں۔ حضرت عمر نے کہا یہ کبار اصحاب تمہارے سامنے بیٹھے ہیں ان سے پوچھو۔ حضرت علی (رض) نے فرمایا ہماری رائے یہ ہے کہ جب آدمی نشہ میں ہوتا ہے تو ہذیان بکتا ہے اور جب ہذیان بکتا ہے تو لوگوں پر تہمت لگاتا ہے اور تہمت لگانے والے کی حد اسی (۸۰) کوڑے ہیں۔ حضرت عمر نے مجھ سے کہا حضرت علی نے جو کہا ہے وہ حضرت خالد کو پہنچا دو پھر انھوں نے اسی (۸۰) کوڑے مارے اور حضرت عمر نے بھی اسی (۸۰) کوڑے مارے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱۲ ص ۱۵٤ مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱٤۱۵ھ)

زانی کو کوڑے مارنے کے بعد شہر بدر کرنے میں مذاہب فقہا:

اگر زانی مرد یا زانیہ عورت محصن نہ ہو تو قرآن مجید میں اس کی سزا سو کوڑے مارنا بیان فرمائی ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

۔۔۔(النور: ۲) زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارو۔

بعض احادیث میں سو کوڑے مارنے کے علاوہ ایک سال کے لیے شہر بدر کرنے کا بھی حکم ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث نمبر ٤٣٠١ میں ہے۔ فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا غیر شادی کے زنا کی حد میں سو کوڑوں کے علاوہ شہر بدر کرنا بھی داخل ہے یا نہیں؟

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کے زنا کرنے کی حد میں جمہور کا یہ نظریہ ہے کہ اس کو سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لے شہر بدر بھی کیا جائے۔ خلفاء راشدین سے بھی یہی مروی ہے، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن مسعود (رض) سے بھی یہی منقول ہے، فقہ تابعین میں سے عطاء، طاؤس، ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور ابو ثور کا بھی یہی نظریہ ہے۔ امام اشافعی اور امام مالک کا بھی یہی قول ہے اور یہی امام احمد کا مذہب ہے، اور امام ابو حنیفہ اور امام محمد بن حسن یہ کہتے ہیں کہ شہر بدر کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ حضرت علی (رض) نے فرمایا ان دونوں کو شہر بدر کرنا انھیں فتنہ میں ڈالنے کے لیے کافی ہے، اور ابن مسیب سے یہ روایت ہے کہ حضرت عمر (رض) نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شراب نوشی کی بناء پر خیبر میں جلاوطن کر دیا۔ وہ ہرقل کے پاس جا کر نصرانی ہوگیا تب حضرت عمر نے فرمایا: اس کے بعد میں کبھی کسی کو شہر بدر نہیں کروں گا۔ نیز اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف کوڑے لگانے کا حکم دیا ہے اور اگر شہر بدر کرنے کو واجب قرار دیا جائے تو نص قرآن پر زیادتی لازم آئے گی۔

(المغنی مع الشرح الکبیر ١٠ ص ١٣٠، دار الفکر یہ بیروت، ١٤٠٤ھ)

زانی اور زانیہ کو شہر بدر کرنے میں فقہاء احناف کا موقف اور دلائل:

علامہ ابو الحسن مرغینانی حنفی (صاحب ہدایہ) لکھتے ہیں: غیر شادی شدہ کی حد میں کوڑوں اور شہر بدر کرنے کو جمع نہیں کیا جائے گا امام شافعی حد میں ان دونوں سزاؤں کو جمع کرتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

۔۔۔(صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی)

کنوارہ کنواری کے ساتھ زنا کرے تو اس کو سو کوڑے مارو اور ایک سال کے لیے شہر بدر کر دو۔

نیز اس سے زنا کا دروازہ بند ہو جائے گا، کیونکہ دوسرے شہر میں ان کے جان پہچان والے کم ہوں گے۔

علامہ مرغینانی حنفی لکھتے ہیں: ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فاجلدوا پس کوڑے مارو، اللہ تعالیٰ نے کل سزا سو کوڑے بیان کی ہے اور اس کے علاوہ کنوارے شخص کی اور کوئی سزا بیان نہیں کی (پس اگر ایک سال شہر بدر کرنے کو زنا کی حد کا جز قرار دیا جائے تو اخبار آحاد سے نص قرآن پر زیادتی لازم آئے گی اور یہ جائز نہیں ہے، اس کے برخلاف شادی شدہ کو رجم کرنا اخبار آحاد سے نہیں بلکہ احادیث متواترہ سے ثابت ہے اور احادیث متواترہ سے قرآن مجید کے عام کو خاص کرنا جائز ہے، اس لیے یہ کہا جائے گا کہ قرآن مجید میں الزانی سے مراد کنوارہ زانی ہے اور کوڑے مارنے کا حکم کنواروں کے بارے میں ہے اور شادی زدہ زانی کی سزا یعنی اس کو رجم کرنا احادیث متواترہ سے ثابت ہے

علامہ مرغینانی لکھتے ہیں: زانی کو شہر بدر کرنا زنا کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے کیونکہ اپنے شہر میں تو خاندان والوں سے حیاء آئے گی اور دوسرے شہر میں اس کو زنا کرنے سے کوئی حجاب نہیں ہوگا۔ نیز دوسرے شہرے میں اس کے کھانے، پینے، رہائش، کپڑوں اور علاج معالجہ کی ضروریات کا کوئی کفیل نہیں ہوگا اس وجہ سے یہ خطرہ ہے کہ شہر بدر کی ہوئی عورتیں اپنی ضروریات کو پورا

کرنے کے لیے زنا کو کسب معاش بنالیں اور یہ زنا کی بدترین قسم ہے، اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت علی نے فرمایا: فتنہ میں مبتلا کرنے کے لیے شہر بدر کرنا کافی ہے۔ اور جس حدیث میں کنوارے کی حد میں کوڑوں اور شہر بدر کرنے کو جمع کیا ہے وہ اسی طرح منسوخ ہے جس طرح اس حدیث کا وہ حصہ منسوخ ہے جس میں شادی شدہ کی حد میں رجم اور کوڑوں کو جمع کیا گیا ہے، کیونکہ پوری حدیث اس طرح ہے کنوارہ، کنواری کے ساتھ زنا کرے تو اس کو سو کوڑے مارو اور ایک سال کے لیے شہر بدر کردو۔ اور شادی شدہ، شادی شدہ کے ساتھ زنا کرے تو اس کو سو کوڑے مارو اور پتھروں سے رجم کردو۔

(صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد)۔

علامہ ابوالحسن کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ جس حدیث میں کوڑے مارنے کے ساتھ شہر بدر کرنے کا حکم ہے اسی حدیث میں رجم کے ساتھ کوڑے مارنے کا بھی ذکر ہے اور جب جمہور فقہاء باوجود اس حدیث کے رجم کی سزا کے ساتھ کوڑے مارنے کا اضافہ نہیں کرتے تو کنوارے کی سزا میں کوڑے مارنے کے ساتھ شہر بدر کرنے کا اضافہ کیوں کرتے ہیں۔ یہ صراحتاً ترجیح بلا مرجح ہے بلکہ ترجیح یا بالمرجوع ہے کیونکہ اس سے قرآن مجید کی ذکر کردہ حد پر زیادتی لازم آتی ہے۔ علامہ یحییٰ بن شرف نواسی زیر بحث حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: شادی شدہ کی حد میں رجم کے ساتھ کوڑوں کو جمع کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا ان کو جمع کرنا واجب ہے پہلے کوڑے لگائے جائیں پھر رجم کیا جائے۔ حضرت علی، حسن بصری، اسحاق بن راہویہ، داؤد، اہل ظاہر اور بعض اصحاب شافعی کا یہی قول ہے، اور جمہور فقہاء نے یہ کہا ہے کہ صرف رجم کرنا واجب ہے۔ قاضی عیاض نے بعض محدثین سے نقل کیا ہے کہ جب شادی شدہ زانی بوڑھا ہو تو کوڑے لگا کر رجم کیا جائے اور اگر جوان ہو تو صرف رجم کیا جائے۔ یہ مذہب باطل اور بے اصل ہے۔ اور جمہور کی دلیل یہ ہے کہ احادیث کثیرہ میں ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے شادی شدہ کو صرف رجم کرنے پر اقتصار کیا جیسا کہ حضرت ماعز اور غامدیہ کے قصہ سے ظاہر ہے (رح صحیح مسلم ج ۲ ص ۶۵ مطبوعہ نور محمد) نیز احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غیر شادی شدہ کو صرف کوڑے مارے اور شہر بدر نہیں کیا اور کثیر آثار صحابہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

علامہ ابوالحسن مرغینانی حنفی (صاحب ہدایہ) لکھتے ہیں: ہاں! اگر امام کے نزدیک شہر بدر کرنے میں مصلحت ہو تو وہ جس قدر عرصہ مناسب سمجھے شہر بدر کرسکتا ہے، یہ تعزیر اور سیاست ہے کیونکہ بعض اوقات اس کا فائدہ ہوتا ہے اس لیے یہ امر امام کی رائے پر موقوف ہے اور بعض صحابہ سے جو شہر بدر کرنے کی روایت ہے وہ بھی تعزیر اور سیاست پر محمول ہے۔

(ہدایہ اولین ص ۴۹۳۔۴۹۲، مکتبہ امدادیہ ملتان)

ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات اور فقہاء احناف کے دلائل:

ائمہ ثلاثہ نے شہر بدر کرنے کی جن روایات سے استدلال کیا ہے وہ صرف تین صحابہ کی روایات ہیں حضرت عبادہ بن صامت، حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن خالد (رض)، اور جو روایت صرف تین صحابہ سے مروی ہو وہ خبر متواتر یا خبر مشہور نہیں ہے صرف خبر واحد ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ احادیث خبر مشہور ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوگا کہ نبی نے کسی غیر شادی شدہ زانی کو شہر بدر کیا یا شہر بدر کرنے کا حکم دیا اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ فعل بطور حد کیا ہو بلکہ یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے یہ فعل بطور تعزیر کیا ہو لہٰذا ان احادیث سے شہر بدر کرنے کا حد ہونا ثابت نہیں ہوا۔

غیر شادی شدہ زانی کو صرف کوڑے مارنے کے ثبوت میں احادیث

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت سہل بن سعد (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص نے آکر یہ اقرار کیا کہ اس نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا ہے جس کا اس نے نام بھی لیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس عورت کے پاس کسی شخص کو بھیج کر اس سے اس کے متعلق پوچھا اس عورت نے زنا کرنے سے انکار کیا تو آپ نے اس شخص کو کوڑے مارے اور اس عورت کو چھوڑ دیا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٤٦٦، بیروت)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ بنو بکر بن لیث کا ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے چار بار یہ اقرار کیا کہ اس نے ایک عورت سے زنا کیا ہے، آپ نے اس کو سو کوڑے لگائے پھر آپ نے فرمایا: اس عورت کے خلاف گواہ لاؤ، عورت نے کہا خدا کی قسم یا رسول اللہ! یہ شخص جھوٹا ہے، پھر آپ نے اسی کو اسی کوڑے حد قذف لگائی۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٤٦٧)

حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن خالد (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ پوچھا گیا کہ اگر غیر شادی شدہ باندی زنا کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا جب وہ زنا کرے تو اس کو سو کوڑے مارو، اور اگر پھر زنا کرے تو پھر کوڑے مارو اور اگر پھر زنا کرے تو پھر کوڑے مارو، پھر اس کو بیچ دو خواہ رسی کے ایک ٹکڑے کے عوض بیچنا پڑے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٢٨٣٧، صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٧٠٤، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٤٦٩، سنن الترمذی رقم الحدیث: ١٤٣٣)۔

ان دونوں حدیثوں میں اس کی تصریح ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے غیر محصن کو حد میں سو کوڑے مارے یا سو کوڑے مارنے کا حکم دیا اور ایک سال کے لیے شہر بدر کیا نہ شہر بدر کرنے کا حکم دیا اس لیے جن احادیث میں شہر بدر کرنے کا حکم ہے وہ سیاست پر محمول ہیں۔

رجم کی تحقیق:

تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ شادی شدہ مسلمان مرد یا عورت زنا کرے تو اس کی حد رجم ہے اور فقہاء اسلام میں سے کسی مستند شخص نے اس اجماع کی مخالفت نہیں کی۔ بعض خارجیوں نے اس اجماع کی اگر مخالفت کی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ ہمارے زمانے میں منکرین حدیث کی ایک جماعت پیدا ہوئی جنہوں نے سنت کی حجیت کا انکار کیا اور مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو کچھ زہر اگلا اس کو انھوں نے قبول کرلیا۔ ان لوگوں نے جہاں اسلام کے اور بہت سے اجماعی اور مسلمہ عقائد کا انکار کیا ہے ان میں سے ایک رجم کا مسئلہ ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں زانی کی سزا صرف کوڑے مارنا ہے اور جن احادیث میں رجم کا ذکر ہے وہ اخبار آحاد ہیں اور خبر واحد سے قرآن مجید کو منسوخ کرنا جائز نہیں ہے۔

منکرین سنت کا یہ قول قطعاً باطل اور مردود ہے اوّل تو یہ غلط ہے کہ قرآن مجید میں رجم کا اصلاً ذکر نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید میں

ارشاد رجم کا ذکر موجود ہے جیسا کہ انشاء اللہ عنقریب ہم واضح کریں گے اور ثانیاً یہ مفروضہ بھی غلط ہے کہ رجم کا حکم اخبار آحاد سے ثابت ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رجم کا حکم پچاس سے زیادہ صحابہ سے مروی ہے اور یہ احادیث معناً اخبار متواترہ ہیں جیسا کہ ہم انشاء اللہ اس پر تفصیلاً گفتگو کریں گے اور اخیر میں ہم منکرین سنت کے مشہور اور اہم اعتراضات کے جوابات ذکر کریں گے۔ فنقول و باللہ التوفیق و بہ الاستعانۃ یلیق۔

قرآن مجید سے رجم کا ثبوت:

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

۔۔۔(المائدۃ: ٤٣)

اور وہ کیسے آپ کو منصف بنائیں گے حالانکہ ان کے پاس توراۃ ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے!

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ (جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث نمبر ٤٣٢٥ میں ہے) یہود زنا کرنے والوں سے یہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جاؤ اگر وہ منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کا حکم دیں تو اس پر عمل کرنا اور اگر رجم کا حکم دیں تو ان سے دور رہنا۔ علامہ ابن کثیر نے ان آیات کے شان نزول میں لکھا ہے کہ سنن ابو داؤد میں ہے حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک مرد اور ایک عورت کا مقدمہ لایا گیا جنہوں نے زنا کیا تھا، آپ نے فرمایا تم اپنے مذہب کے دو سب سے بڑے عالموں کو لاؤ وہ صوریا کے دو بیٹوں کو لائے آپ نے ان کو قسم دے کر پوچھا ان زنا کرنے والوں کا حکم توراۃ میں کیا لکھا ہے؟ انھوں نے کہا توراۃ میں ہے کہ جب چار آدمی یہ گواہی دیں کہ انھوں نے ان کو اس طرح زنا کرتے دیکھا ہے جیسے سلائی سرمہ دانی میں جاتی ہے تو ان کو رجم کر دیا جائے، آپ نے فرمایا تم ان کو رجم کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا ہماری حکومت چلی گئی اور ہم قتل کو ناپسند کرتے ہیں پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے گواہوں کو بلایا اور چار آدمیوں نے آکر یہ گواہی دی کہ انھوں نے اس طرح دیکھا ہے جیسے سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے، تب رسول اللہ ﷺ نے انھیں رجم کرنے کا حکم دیا۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے توراۃ کے حکم کے مطابق انھیں رجم کرنے کا حکم دیا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ٢ ص ٢٩۔ ٢٨، دار الفکر بیروت، ١٤١٩ھ)

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

۔۔۔(تفسیر کبیر ج ٤ ص ٣٦٢)

اس آیت میں حکم اللہ سے مراد بالخصوص رجم ہے کیونکہ یہودیوں نے رخصت حاصل کرنے کے لیے آپ کو حاکم بنایا تھا۔

قرآن مجید اور احادیث میں جو یہ ذکر ہے کہ توراۃ میں حکم اللہ یعنی رجم موجود ہو، اس کی تفصیل توراۃ میں حسب ذیل ہے:

پر اگر یہ بات سچ ہو کہ لڑکی میں کنوارے پن کے نشان نہیں پائے گئے۔ تو وہ اس لڑکی کو اس کے باپ کے گھر کے دروازہ پر نکال لائیں اور اس کے شہر کے لوگ اسے سنگسار کریں کہ وہ مر جائے کیونکہ اس نے اسرائیل کے درمیان شرارت کی کہ اپنے باپ کے گھر میں فاحشہ پن کیا۔ یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا (استثناء: ٢٢۔ ٢١)

اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہوگئی اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنی ہمسایہ کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ یوں تو ایسی برائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا (استثناء:۲۴۔۲۳)

یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے کہ توراۃ میں آج تک یہ آیت موجود ہے حالانکہ ہر دور میں توراۃ میں تحریف ہوتی رہی، بلکہ قدرت خداوندی دیکھئے کہ یہ آیت انجیل میں بھی موجود ہے، یوحنا کی انجیل میں ہے:

اور فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا اے استاد! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے۔ توراۃ میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں۔ پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے؟ انھوں نے اسے آزمانے کے لیے یہ کہا تا کہ اس پر الزام لگانے کا کوئی سبب نکالیں مگر یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگا جب وہ اس سے سوال کرتے ہی رہے تو اس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا کہ جو تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اس کو پتھر مارے

(یوحنا: باب ۸ آیت: ۸۔۳)

توراۃ اور انجیل کے ان اقتباسات سے یہ واضح ہوگیا کہ شادی شدہ زانی کو رجم کرنے کا حکم پچھلی آسمانی کتابوں میں موجود تھا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اس وقت (نزولِ قرآن کے وقت) کی موجودہ کتابوں کا جو مصدق قرار دیا ہے وہ اسی حکم کے اعتبار سے ہے اور اللہ کی قدرت ہے کہ ہزارہا تحریفات کے باوجود رجم کا یہ حکم توراۃ اور انجیل میں آج بھی موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دو زانی یہودیوں کے متعلق جو رجم کا فیصلہ فرمایا تھا اس کے متعلق سورۃ مائدہ میں جو آیات نازل ہوئی تھیں، اسی سیاق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۔۔۔(المائدہ:۴۸)

ہم نے حق کے ساتھ یہ کتاب آپ پر نازل کی ہے اور آنحالیکہ یہ ان آسمانی کتابوں کی مصدق اور نگہبان ہے جو اس کے سامنے ہیں سو آپ ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کیجئے اور جو حق کے پاس آیا ہے، اس سے دور ہو کر ان کی خواہشات کے پیچھے نہ لگیے۔

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے آسمانی کتابیں توراۃ اور انجیل موجود تھیں اور خود قرآن مجید ناطق اور شاہد ہے کہ ان کتابوں میں تحریف کی جا چکی ہے، ان کے باوجود قرآن مجید فرماتا ہے کہ قرآن کا مصدق اور نگہبان ہے اور جس چیز کا قرآن مجید مصدق ہے وہ رجم کا حکم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم اللہ قرار دیا ہے اور اسی کا قرآن مجید نگہبان ہے اور یہ وجہ ہے کہ آئے دن کی تحریفات کے باوجود توراۃ اور انجیل میں رجم کا حکم آج بھی موجود ہے اور یہ قرآن مجید کا معجزہ اور اس کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔

رجم کی منسوخ التلاوت آیت

اما بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

زر بن جبیش کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب (رض) نے فرمایا تم سورۃ احزاب میں کتنی آیات شمار کرتے ہو؟ میں نے

کہا: تہتر (۷۳) آیتیں! حالانکہ ہم دیکھتے تھے کہ یہ سورۃ، سورۃ البقرہ کے برابر تھی اور اسمیں یہ آیت تھی (ترجمہ) جب بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت زنا کرے تو ان کو ضرور رجم کر دو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے اور اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والا ہے۔

"سورۃ احزاب ابتداء سورۃ البقرہ کے برابر تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں اس کی بعض آیات کی تلاوت منسوخ کر دیا گیا، قرآن مجید میں ہے:

جس آیت کو ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو ان سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔

جیسا کہ آیت رجم کو منسوخ کر دیا گیا، بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ اس سورت میں قرآن مجید کی آیات کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام تفسیر بھی لکھ لیتے تھے جس کو بعد میں حذف کر دیا۔

نیز امام بیہقی روایت کرتے ہیں:

کثیر بن صلت کہتے ہیں کہ ہم مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور ہم میں حضرت زید بن ثابت (رض) بھی تشریف فرما تھے، حضرت زید نے کہا، یہ آیت ہم پڑھتے تھے جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کریں تو ان کو ضرور رجم کرو، مروان نے کہا ہم اس آیات کو قرآن مجید میں کیوں نہ داخلکریں؟ حضرت زید نے فرمایا نہیں! کیا تم نہیں دیکھتے کہ شادی شدہ جوان آدمیوں کو بھی رجم کیا جاتا ہے۔ حضرت زید نے کہا کہ صحابہ اس پر بحث کر رہے تھے اور اس وقت ہم میں حضرت عمر بن خطاب بھی تھے۔ انھوں نے کہا اس مسئلہ میں میں تمہاری تسلی کروں گا اور کہا کہ میں نبی ﷺ کے پاس جا کر اس کا ذکر کروں گا اور جب آپ رجم کا ذکر کریں گے تو میں کہوں گا یا رسول اللہ! آیر رجم لکھوا دیجئے حضرت عمر کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا اور آپ سے اس کا ذکر کیا، جب آپ نے آیت رجم کا ذکر کیا تو میں نے کہا یا رسول اللہ! آیت رجم لکھوا دیجئے آپ نے فرمایا مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اور اس سے پہلی حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ آیت رجم کا حکم ثابت ہے اور اس کی تلاوت منسوخ ہے اور میرے علم کے مطابق اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

(سنن کبریٰ ج ۸ ص ۲۱۱، ملتان)

امام حاکم متوفی ۴۰۵ھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا جس شخص نے رجم کا انکار کیا اس نے قرآن کا انکار کیا، حالانکہ اس کو گمان بھی نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے رسول آچکے ہیں اور وہ ان بہت سی باتوں کو بیان کرتے ہیں جن کو تم چھپاتے تھے، اور رجم کو بھی یہود چھپاتے تھے۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور بخاری اور مسلم نے اس کو بیان نہیں کیا۔

(المستدرک ج ۴ ص ۳۵۹، مکہ مکرمہ)

کثیر بن صلت بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرو بن العاص اور حضرت زید بن ثابت (رض) قرآن مجید کے نسخے لکھ رہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے تو حضرت زید نے کہا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے کہ جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کریں تو ان کو ضرور رجم کرو۔ حضرت عمرو نے کہا یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جا کر عرض کیا: اس آیت کو لکھ دیجئے تو آپ نے اس بات کو ناپسند کیا، اور جب غیر شادی شدہ بوڑھا زنا کرے تو اس کو صرف کوڑے لگائے

جاتے ہیں اور جب شادی شدہ شخص زنا کرے تو اس کو رجم کیا جاتا ہے، اس حدیث کی سند صحیح ہے اور بخاری اور مسلم نے اس کو روایت کیا۔
(المستدرک ج ٤ ص ٣٦٠، مکہ مکرمہ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے متعدد طریق اور اسانید سے اس حدیث کو بیان کیا ہے اور انھوں نے اس کے منسوخ التلاوت ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کے الفاظ میں اختلاف ہے بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں:

انہوں نے جو لذت حاصل کی ہے (اس وجہ سے رجم کرو)

نیز اس آیت کے الفاظ کے عموم پر عمل نہیں ہوتا کیونکہ مطلقاً بوڑھے شخص کو رجم نہیں کیا جاتا بلکہ اس بوڑھے شخص کو رجم کیا جاتا ہے جو شادی شدہ ہو اور اگر غیر شادی شدہ ہو تو اس کو کوڑے لگائے جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت عمرو بن العاص نے واضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ (فتح الباری ج ١٢ ص ١٤٣، لاہور)

اس آیت کے منسوخ التلاوت ہونے پر ایک دفعہ ایک فاضل شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ حدیث میں ہے:

۔۔ (مشکوٰۃ ص ٣٢)

میرا کلام، کلام اللہ کو منسوخ نہیں کرتا

پھر حدیث سے یہ آیت کیسی منسوخ ہوگئی؟ میں نے اس کے جواب میں کہا کلام اللہ سے مراد قرآن مجید ہے اور قرآن مجید کے الفاظ منضبط ہیں اور وہ الفاظ تواتر سے ثابت ہیں اور اس آیت کے الفاظ غیر منضبط ہیں اور ان الفاظ کا ثبوت تواتر سے نہیں ہے اس لیے یہ الفاظ قرآن مجید نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے منسوخ التلاوت ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

آیت رجم کی بحث

علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز لکھتے ہیں:

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمر فاروق (رض) نے منبر پر بیٹھ کر فرمایا: لوگو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کا کہنا میرے لیے مقدر کر دیا گیا ہے، میں نہیں جانتا شاید میری موت میرے سامنے ہو، جو شخص میری بات کو سمجھ کر اسے یاد رکھے اسے چاہیے کہ جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہو وہاں تک میری بات لوگوں کو بتادے اور جسے خوف ہو کہ اس بات کو نہ سمجھ سکے گا تو میں اسے اپنے اوپر جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دیتا وہ بات یہ ہے کہ "بیشک اللہ تعالیٰ نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب نازل فرمائی اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اس میں رجم کی آیت بھی تھی، ہم نے وہ آیت پڑھی اور اسے سمجھا اور اسے یاد رکھا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رجم کیا اور حضور کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ مجھے خوف ہے کہ طویل زمانہ گزر جانے کے بعد کوئی کہنے والا کہہ دے کہ خدا کی قسم اللہ کی کتاب میں ہم رجم کی آیت نہیں پاتے تو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے فریضہ کو ترک کر کے گمراہ ہو جائیں۔ اللہ کی کتاب میں رجم برحق ہے ہر اس آزاد مرد اور عورت پر جس نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کیا، بشرطیکہ شرعی گواہ قائم ہو جائیں یا (عورت کا) حمل ظاہر ہو جائے یا اقرار ہو۔
(بخاری شریف جلد ثانی ص ١٠٠٩، صحیح مسلم ج ٢ ص ٦٥، موطا امام الملک میں ٦٨٥)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن مجید کی آیت الزانیۃ والزانی میں سو کوڑوں کی سزا کا ذکر آزاد غیر شادی شدہ زانی اور

زانیہ کے لے ہی ہے اور رجم کی سزا کا تعلق غیر شادی شدہ سے نہیں بلکہ وہ شادی شدہ کے لیے مخصوص ہے۔صرف اتنی بات میں وارد ہے اور ہم بار ہا بتا چکے ہیں کہ وہ احادیث جن میں رجم کی سزا مذکور ہے وہ متواتر المعنی ہونے کی وجہ سے قطعی الثبوت ہیں جس طرح قرآن کی آیات وحی الٰہی ہیں اسی طرح سنت اور حدیث نبوی بھی وحی الٰہی ہے اور اسی بناء پر اس کا دلیل شرعی ہونا ہم قرآن مجید سے ثابت کر چکے ہیں، جو چیز قرآن سے ثابت ہو، اس سے جس حکم کا ثبوت ہو جائے وہ عین قرآن کے مطابق ہے، اسے خلاف قرآن کہنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

دیکھئے قبلہ اولیٰ کے قبلہ ہونے کا حکم قرآن میں وارد نہیں بلکہ حدیث سے ثابت ہے، اسی طرح پانچ نمازیں، ان کی تعداد رکعات اور ادا کرنے کی ترتیب مثلاً نماز میں رکوع، سجود، قیام اور قعود اور ان سب ارکان کی ترتیب سب سنت نبوی سے ثابت ہے، اگر سنت اور حدیث کو نظر انداز کر کے صرف **اقیمو الصلوٰ اور اتو الزکوۃ** کو سامنے رکھ لیا جائے تو نہ اقامت صلوٰۃ کے حکم پر عمل ہو سکتا ہے نہ ہی ایتاء زکوٰۃ کے فریضہ سے سبکدوش ہونا ممکن ہے اس لیے سنت اور حدیث کو لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑے گا تاکہ قرآن کے معنی سمجھ میں آجائیں اور مراد الٰہی کے مطابق احکام قرآنیہ پر عمل کرنا ممکن ہو۔

آیت رجم کا نزول اور اس کا منسوخ التلاوت ہونا احادیث صحیحہ کی روشنی میں واضح ہو چکا ہے۔اس کے باوجود ہم نزول الفاظ اور نسخ تلاوت کے قطعی اور متواترہ کا قول نہیں کرتے لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ رجم کے معنی تواتر اور قطعیت کے ساتھ قرآن پاک میں موجود ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

۔۔۔(المائدہ:۴۳)

اور اے رسول وہ یہود کس طرح آپ کو اپنا حاکم بناتے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات ہے، جس میں اللہ کا حکم پایا جاتا ہے۔

(مقالات کاظمی ج ۳ ص ۴۰۰۔۳۹۹، مکتبہ فریدیہ ساہیوال، ۱۴۰۷ھ)

رجم کی احادیث متواترہ

رجم کی صحیح مرفوع متصل احادیث ترپین (۵۳) صحابہ سے مروی ہیں جن کو مسلم اور مستند جلیل القدر محدثین نے اپنی تصانیف میں متعدد اسانید کے ساتھ بیان کیا ہے۔ان کے علاوہ ثقہ تابعین کی چودہ (۱۴) مرسل روایات ہیں چودہ (۱۴) آثار صحابہ اور پانچ (۵) فتاویٰ تابعین ہیں جن کو اکابر محدثین اسانید کثیرہ کے ساتھ اپنی مصنفات میں درج کیا ہے یہ کل چھیاسی (۸۶) احادیث ہیں۔ہم نے جن اعداد و شمار کا ذکر کیا ہے، یہ ان کتب احادیث سے حاصل کئے گئے ہیں جو ہمارے پاس موجود اور دستیاب ہیں۔ان کے علاوہ بیشمار کتب احادیث ہیں جو ہماری دسترس سے باہر ہیں اس لیے حتمی اور قطعی طور پر انھیں کہا جا سکتا ہے کہ رجم کے سلسلہ میں کتنی احادیث مرفوعہ، مرسلہ، آثار صحابہ اور فتاویٰ تابعین موجود ہیں۔بہرحال ہم نے جو اعداد و شمار تتبع اور تلاش سے حاصل کئے ہیں ان کی بناء پر یہ اطمیان اور یقین ہو جاتا ہے کہ رجم کا ثبوت جن احادیث سے ہے وہ معناً متواتر ہیں اور اس حد سے اس بات پر شرح صدر ہو جاتا ہے کہ یہ احادیث اس قوت میں ہیں کہ ان سے قرآن مجید کی وضاحت کی جا سکتی ہے اور ان احادیث متواترہ کی بناء پر یہ قول صحیح اور برحق ہے کہ قرآن مجید میں جس زانیہ اور زانی کو سزا سو کوڑے مارنا بیان ہے اس سے آزاد اور غیر محصن (غیر شادی شدہ) زانی اور زانیہ مراد ہیں۔رہے آزاد اور محصن (شادی شدہ) زانیہ اور زانی تو ان کی حد رجم کرنا ہے جیسا کہ احادیث متواترہ میں اس کا بیان ہے۔

منکرین رجم یہ شبہ وارد کرتے ہیں کہ سنت سے قرآن مجید کے عموم قطعی کی تخصیص کیسے کی جا سکتی ہے؟ اس کا جواب اولاً یہ ہے کہ

الزانیۃ والزانی میں عموم قطعی نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید میں باندیوں کے زنا کی سزا کے متعلق ہے:

۔۔۔(النساء:۲۵) یعنی باندیوں کی سزا آزاد عورتوں کی سزا کا نصف ہے۔

یعنی باندیوں کی سزا پچاس کوڑے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آیت نور میں جو زانیوں کی سزا سو کوڑے بیان کی گئی ہے اس سے ہر زانی اور زانیہ مراد نہیں ہے بلکہ آزاد زانیہ اور زانی مراد ہے کیونکہ باندیوں کی سزا سورۃ نساء میں اس کی نصف بیان کی گئی ہے اور جب اس آیت میں خود قرآن مجید سے تخصیص ہوگئی تو اس کا عموم قطعی نہ رہا اور یہ ہر زانیہ اور زانی کو شامل نہیں ہے، اس لیے اگر سنت متواترہ سے اس میں تخصیص کی جائے اور اس بناء پر اس کو غیر شادی شدہ زانیوں کے ساتھ مختص قرار دیا جائے تو اس میں کیا استبعاد ہے!

رہے آزاد اور شادی شدہ زانی تو ان کی سزا رجم ہے جیسا کہ احادیث متواترہ میں اس کا بیان ہے۔

(شرح صحیح مسلم ج۴ ص ۸۱۶۔۸۰۴)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: زانی مرد صرف زانیہ عورت یا مشرکہ عورت سے نکاح کرے گا اور زانیہ عورت صرف زانی مرد یا مشرک مرد سے نکاح کرے گی اور مومنوں پر اس (نکاح) کو حرام کر دیا گیا ہے۔(النور:۳)

زانیہ کے لیے صرف زانی سے نکاح کی اجازت کی احادیث

حضرت عبداللہ بن عمرو (رض) بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے ام مھزول نامی ایک عورت سے نکاح کرنے کی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت طلب کی وہ عورت زنا کرتی تھی اور اس پر اجرت لیتی تھی تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس شخص کے سامنے یہ آیت پڑھی: ۔۔۔(النور:۳)

(مسند احمد ج۲ ص ۵۹ قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۶۴۸۰، ۷۰۹۹، ۷۱۰۰، شیخ احمد محمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند ضعیب ہے اور اس کے راویوں کی توثیق بھی کی گئی ہے۔حاشیہ مسند احمد ج۶ ص ۳۵۔۳۴، دار الحدیث قاہرہ، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۱۸۱۹، حافظ الہیثمی نے کہا امام احمد کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد ج۷ ص ۷۴، سنن بیہقی ج۷ ص ۱۵۳، المستدرک ج۲ س ۳۹۶)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ مرثد بن ابی مرثد ایک ایسا شخص تھا جو مکہ سے قیدیوں کو لا کر انھیں مدینہ پہنچاتا تھا، مکہ میں ایک زانیہ عورت تھی جس کا نام عناق تھا وہ مرثد کی دوست تھی، اس نے مکہ کے کسی قیدی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو مدینہ پہنچائے گا، اس نے کہا میں مکہ گیا حتیٰ کہ ایک چاندی رات میں، میں مکہ کی دیواروں میں سے ایک دیوار کے سائے پہنچا پس عناق آ گئی۔میں نے دیوار کے ساتھ کسی شخص کا سایا دیکھا تھا میں جب وہاں پہنچا تو میں نے اس کو پہچان لیا، اس نے کہا مرثد ہے؟ میں نے کہا مرثد ہوں، اس نے کہا خوش آمدید، میرے پاس آؤ، میں اس رات اس کے پاس ٹھہرا۔میں نے اسے کہا اے عناق! اللہ نے زنا کو حرام کر دیا ہے، اس عورت نے (مکہ کے لوگوں سے) کہا اے خیمے والو! یہ شخص تمہارے قیدیوں کو چھڑا کر لے جاتا ہے، سو آٹھ آدمیوں نے میرا پیچھا کیا میں الخندمہ (مکہ کا ایک پہاڑ) کی طرف گیا اور کسی غار میں گھس گیا وہ غار کے سر پر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے وہاں پیشاب کیا اور ان کا پیشاب میرے سر پر پڑا، اور اللہ تعالیٰ نے انھیں مجھ سے اندھا کر دیا، میں اپنے اس • قیدی) ساتھی کے پاس پلٹا وہ بہت بھاری جسم کا تھا حتیٰ کہ اذ کر گھاس کے پاس پہنچا اور میں نے اس کی بیڑیاں کھولیں، پھر میں اس کو اٹھا کر لے گیا اور وہ بھی میری مدد کرتا رہا، حتیٰ کہ میں اسے لے کر مدینہ پہنچ گیا، پھر میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں

حاضر ہوا اور میں نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا میں عناق سے نکاح کرلوں؟ میں نے یہ سوال دو مرتبہ کیا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خاموش رہے اور مجھ کوئی جواب نہیں دیا حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوگئی: زانی مرد صرف زانیہ عورت یا مشرک عورت سے نکاح کرے گا، اور زانیہ عورت صرف زانی مرد یا مشرک مرد سے نکاح کرے گی اور مومنوں پر اس (نکاح) کو حرام کردیا گیا ہے۔ (النور: ۳)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۷۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۰۵۱، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۲۲۸، المستدرک ج ۲ ص ۱۶۶، سنن کبری للبیہقی ج ۷ ص ۱۵۳)

زانیہ سے مومن کے نکاح کی ممانعت کی توجیہات

سورۃ النور: ۳، اور مذکور الصدر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان مرد زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرسکتا اور کوئی مسلمان عورت زانی مرد سے نکاح نہیں کرسکتی، اس مسئلہ میں فقہاء کے مسالک حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ ممانعت عام نہیں ہے بلکہ ام مہزول اور عناق کے ساتھ مخصوص ہے جیسا کہ ابھی احادیث کے حوالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۲) ابوصالح نے کہا یہ ممانعت اہل الصفہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۳) حسن بصری نے کہا یہ ممانعت ہر زانی اور ہر زانیہ کے لیے عام نہیں ہے بلکہ اس زانی اور زانیہ کے ساتھ مخصوص ہے جس کو حد میں کوڑے لگ چکے ہوں اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس زانی کو کوڑے مارے جاچکے ہوں، وہ صرف اپنی مثل کے ساتھ نکاح کرے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۰۵۲، المستدرک ج ۲ ص ۲۶۶، مسند احمد ج ۲ ص ۳۲۴، کنز العمال رقم الحدیث: ۴۴۲۹۷)

(۴) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اکثر اور غالب زنا کرنے والے اپنی مثل زانیہ سے ہی نکاح کرنے میں رغبت رکھتے ہیں۔ کرخی نے کہا ہے کہ فاسق خبیث جو زنا کرتا ہے وہ کسی نیک خاتون سے نکاح کرنے کو پسند نہیں کرتا، وہ اپنی مثل فاسقہ یا مشرکہ سے نکاح کرنے کو پسند کرتا ہے، اسی طرح فاسقہ خبیثہ عورت کسی نیک باشرع اور متقی مرد سے نکاح کرنے کو پسند نہیں کرتی بلکہ اس سے متنفر ہوتی ہے (جیسا کہ اس دور میں آزاد اور فیشن ایبل الٹرا ماڈرن لڑکیاں کسی نمازی داڑھی رکھنے والے شخص سے نکاح کرنے سے نفرت کرتی ہیں) بلکہ وہ اپنے جیسے فاسق (آزاد فیشن زدہ) مرد سے نکاح کرنے کو پسند کرتی ہیں اور یہ حکم عام، اکثر اور غالب افراد کے اعتبار سے ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ نیک کام تو صرف پرہیزگار لوگ کرتے ہیں حالانکہ بعض اوقات فاسق لوگ بھی نیک کام کرلیتے ہیں، اسی طرح اس آیت کا محمل یہ ہے کہ زنا کرنے والا مرد اور زنا کرنے والی عورت صرف اپنے جیسے شخص سے نکاح کرنا پسند کرتے ہیں۔

زانیہ سے مومن کے نکاح کی ممانعت کا منسوخ ہونا

(۵) علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۷ھ لکھتے ہیں:

۔۔۔(النور:۳۲)

تم میں سے جو مرد اور عورت بے نکاح ہوں، ان کا نکاح کر دو اور اپنے نیک غلاموں اور باندیوں کا بھی۔

اس آیت میں مطلقاً بے نکاح مردوں اور عورتوں کا نکاح کرنے کا حکم دیا ہے خواہ وہ زنا کار ہوں یا نہ ہوں اور جن سے ان کا نکاح کیا جائے خواہ وہ زنا کار ہوں یا نہ ہوں۔

ابو جعفر النحاس نے کہا یہ اکثر فقہاء اور اہل فتویٰ کا قول ہے کہ جس شخص نے کسی عورت سے زنا کیا ہو اس کے لیے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہے اور اس کے علاوہ دوسرے شخص کے لیے بھی اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہے۔ حضرت ابن عمر، سالم، جابر بن زید، عطا، طاؤس، امام مالک بن انس اور امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی قول ہے، امام شافعی نے کہا سعید بن مسیب کا قول صحیح ہے کہ یہ آیت انشاء اللہ منسوخ ہے۔

روایت ہے کہ حضرت ابو بکر (رض) کے زمانہ میں ایک مرد نے ایک عورت سے زنا کیا اور دونوں کو سو سو کوڑے مارے پھر ان کا ایک دوسرے کے ساتھ نکاح کر دیا اور ان کو ایک سال کے لیے شہر بدر کر دیا۔ حضرت عمر، ابن مسعود اور حضرت جابر (رض) سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا اول زنا ہے اور اس کا آخر نکاح ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کسی کے باغ سے پھل چوری کرے پھر اس کے مالک سے اس باغ کے پھل خرید لے، اس نے جو چوری کی تھی وہ حرام ہے اور جو مال خریدا ہے وہ حلال ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے اسی اثر سے استدلال کیا ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن جز۱۲ ص ۱۵۷۔۱۵۶، ملخصاً مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حدِّ قذف کی وضاحت کے بارے میں

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴﴾

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر (اس کے ثبوت میں) چار گواہ نہ پیش کر سکیں تو تم ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کو کبھی بھی قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں سوا ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بے حد مہربان ہے''۔(النور:۵۔۴)

قذف کا لغوی معنی:

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ قذف کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قذف بالحجارۃ کا معنی ہے پتھر پھینکنا اور

قذف المحصنۃ کا معنی ہے پاک دامن عورت کو زنا کی تہمت لگانا اور یہ مجاز ہے اور ایک قول یہ ہے کہ قذف کا معنی ہے گالی دینا اور حدیث میں ہے کہ ہلال بن امیہ نے اپنی بیوی کو شریک کے ساتھ تہمت لگائی، اصل میں قذف کا معنی ہے پھینکنا پھر یہ لفظ گالی دینے اور زنا کی تہمت میں استعمال ہوا۔

(تاج العروس ٦ ص ٢١٧، مصر)

قذف کا شرعی معنی:

علامہ زین الدین ابن نجیم متوفی ٩٧٠ ھ قذف کا اصلاحی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قذف کا شرعی معنی ہے کسی محصن (مسلمان پاک دامن) کو زنا کی تہمت لگانا اور فتح القدیر میں ہے: اس پر اجماع ہے کہ حد کا تعلق اس کے ساتھ ہے کیونکہ قرآن مجید ہے: " جو لوگ محصنات (مسلمان اور پاک دامن) عورتوں کو زنا کی تہمت لگائیں اور پھر اس پر چار مرد گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی (٨٠) کوڑے مارو " اسی آیت میں لفظ رمی سے زنا کی تہمت مراد ہے حتیٰ کہ اگر کسی شخص کو دیگر گناہوں کی تہمت لگائی تو اس پر حد قذف واجب نہیں ہوگی بلکہ تعزیر واجب ہوگی، اور اس آیت میں جو چار گواہ نہ لانے کی شرط لگائی ہے اس سے زنا کی تہمت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ صرف زنا کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی ضرورت ہے۔ ہر چند کہ اس آیت میں محصنات کا لفظ ہے جو مونث کا صیغہ ہے لیکن یہ حکم مردوں کو بھی شامل ہے اور یہ بات نہیں کہ صرف عورت کو زنا کی تہمت لگانے سے حد قذف واجب ہوتی ہے بلکہ مسلمان اور پاک دامن عورت یا مرد جس کو بھی زنا کی تہمت لگائی گئی اور اس کے ثبوت میں چار گواہ نہ لائے جا سکیں تو تہمت لگانے والے پر حد قذف واجب ہوگی۔

(البحر الرائق ج ٥ س ٣٠۔ ٢٩، مطلبوعہ مصر ١٣١١ھ)

قرآن مجید کی روشنی میں قذف کا حکم:

اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے:

۔۔۔(النور: ٤) اور جو لوگ مسلمان پاک دامن عورتوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں پھر چار مرد گواہ نہ لائیں ان کو اسی (٨٠) کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کو قبول نہ کرو اور یہی لوگ فاسق ہیں۔

۔۔۔(النور: ٢٣) بے شک جو لوگ پاک دامن بے خبر مسلمان عورتوں کو (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

احادیث کی روشنی میں قذف کا حکم:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، جس شخص کے قتل کو حق کے سوا اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے دن پیٹھ موڑنا اور پاک دامن مسلمان بے خبر عورت کو زنا کی تہمت لگانا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٢٧٦٦، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٨٩، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٢٨٧٤، سنن النسائی رقم الحدیث: ٣٦٧١، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ١١٣٦١)

امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ جب میری براءت نازل ہوگئی تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) منبر پر کھڑے ہوئے اور قرآن مجید کی تلاوت کی اور منبر سے اترنے کے بعد آپ نے دو مردوں اور ایک عورت پر حد لگانے کا حکم دیا سو ان کو حد لگائی گئی۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ٤٤٧٤، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣١٨٠، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٢٥٦٧)

۔۔۔(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ٤٤٧٥)

محمد بن اسحاق نے بھی اس حدیث کو روایت کیا اور کہا جن دو مردوں اور ایک عورت نے تہمت لگائی تھی آپ نے ان کو حد قذف لگانے کا حکم دیا، حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ اور عورت حمنہ بنت جحش تھیں۔

احصان کی شرائط میں مذاہب فقہاء:

علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں: فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب کوئی مکلف شخص محصن کو زنا کی تہمت لگائے تو اس پر حد قذف واجب ہوتی ہے اور احصان کی پانچ شرائط ہیں:

(١) عقل (٢) حریت (٣) اسلام (٤) زنا سے پاک دامن ہونا (٥) وہ شخص اتنا بڑا ہو کہ جماعت کر سکتا ہو یا اس سے جماع کیا جا سکتا ہو۔

تمام متقدمین اور متاخرین علماء نے احصان میں ان شرائط کا اعتبار کیا ہے۔ البتہ داؤد ظاہری نے یہ کہا ہے کہ غلام کو تہمت لگانے سے بھی حد واجب ہوگی۔ امام احمد سے بلوغ کے متعلق مختلف روایات منقول ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ شرط ہے، امام شافعی، ابو ثور اور فقہاء احناف کا بھی یہی قول ہے کیونکہ بلوغ مکلف ہونے کی ایک شرط ہے اس لیے عقل کے مشابہ ہے اور اس لیے کہ بچہ کے زنا سے حد واجب نہیں ہوتی اس لیے اگر بچہ کسی کو زنا کی تہمت لگائے تو اس پر حد بھی نہیں ہونی چاہیے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ بلوغ کی شرط نہیں ہے کیونکہ وہ آزاد، صاحب عقل اور پاک دامن ہے اور اس تہمت سے اس کو عار لاحق ہوتا ہے اور اس قول کا صدق ممکن ہے اس لیے وہ بڑے شخص کے مشابہ ہے یہ امام مالک اور اسحاق کا قول ہے، اس روایت کی بناء پر اس کو کم از کم اتنا بڑا ہونا چاہیے جو جماع کر سکتا ہو اور لڑکا کم از کم دس سال کا اور لڑکی نو سال کی ہو۔

(المغنی مع الشرح الکبیر ج ١٠ ص ١٩٤، دار الفکر بیروت، ١٤٠٤ھ)

احصان کی شرائط میں مذہب احناف:

علامہ ابو الحسن مرغینانی حنفی لکھتے ہیں:

احصان یہ ہے کہ جس شخص کو تہمت لگائی گئی ہے وہ (١) آزاد، (٢) عاقل (٣) بالغ (٤) مسلمان اور (٥) زنا کے فعل سے پاک دامن ہو۔ آزاد ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ قرآن مجید میں آزاد پر احصان کا اطلاق ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

۔۔۔(النساء: ٢٥)

ان لونڈیوں کی سزا آزاد عورتوں کی نصف ہے۔

اور عقل و بلوغ کی شرط اس لیے ہے کہ بچہ اور مجنون کو زنا کی تہمت سے عار لاحق نہیں ہوتا کیونکہ ان سے فعل زنا کا تحقق نہیں ہوتا اور اسلام کی شرط اس لیے ہے کہ حضرت ابن عمر (رض) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

۔۔۔(سنن دار قطنی)

جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا وہ محصن نہیں ہے۔

اور زنا سے پاک دامن ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ جو پاک دامن نہ ہو اس کو عار لاحق نہیں ہوگا اور تہمت لگانے والا اس تہمت میں سچا ہوگا۔

کوڑے مارنے کا حکم:

علامہ المرغینانی لکھتے ہیں: امام کو ایسے کوڑے کے ساتھ مارنے کا حکم دینا چاہیے جس میں گرہ یا پھل نہ ہوں (یعنی درخت کی ایسی شاخ سے مارا جائے جس میں گرہ نہ ہو اور نہ پھل ہوں) اور متوسط ضرب کے ساتھ مارنا چاہیے، کیونکہ حضرت علی (رض) جب کورے مارنے لگے تو انھوں نے درخت کی شاخ سے پھل کاٹ دیئے اور متوسط ضرب وہ ہوتی ہے کہ نہ تو اس سے چوٹ کا نشان پڑے اور نہ ایسی ضرب ہو جس سے بالکل تکلیف نہ ہو، کیونکہ پہلی صورت میں ہلاکت کا خدشہ ہے اور دوسری صورت میں کوڑے لگانے کا مقصد فوت ہوجائے گا، مجرم جس کے کوڑے لگائے جائیں اس کے کپڑے اتار لیے جائیں اور صرف چادر (تہبند) باقی رہے اور اس کے جسم کے تفرق اعضاء پر کوڑے مارے جائیں کیونکہ ایک جگہ کوڑے مارنے سے اس کی ہلاکت کا خدشہ ہے اور اس کے سر، چہرہ اور شرمگاہ پر کوڑے نہ مارے جائیں، کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حد لگانے والے سے فرمایا اس کے چہرے اور شرمگاہ سے اجتناب کرو، تمام حدود میں مجرم کو کھڑا کر کے کوڑے مارے جائیں کیونکہ حضرت علی نے فرمایا: مردوں کو کھڑا کر کے کوڑے ماریں، کوڑے مارتے وقت کوڑے مارنے والا کوڑے کو اپنے سر سے اوپر نہ اٹھائے۔ کوڑے مارے جانے میں مرد اور عورت کے مساوی احکام ہیں۔ البتہ عورت کے صرف فالتو کپڑے اتارے جائیں گے سارے کپڑے اتار کر یا صرف تہبند میں حد نہیں لگائی جائے گی اور اس کو بٹھا کر حد لگائی جائے گی۔

(ہدایہ اولین ۴۹۰۔ ۴۸۹، ملتان)

علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں کہ کوڑے مارنے کے لیے درخت کی ایسی شاخ لی جائے جس میں کوئی گرہ ہو نہ کوئی پھل ہو، نہ وہ سوکھی ہوئی خشک شاخ ہو، اگر وہ خشک شاخ ہو تو اس کو چھیل کر نرم کرلیا جائے۔ کیونکہ امام ابن ابی شیبہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک (رض) سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ حکم کیا جاتا تھا کہ درخت کی شاخ سے پھل کاٹ لیے جائیں پھر اس کو دو پتھروں کے درمیان رکھ کے کوٹ کر نرم کیا جائے پھر اس سے کوڑے لگائے جاتے۔ علامہ بن ہمام کہتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی شاخ میں کوئی گرہ یا پھل ہو، کیونکہ امام عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے لائق حد جرم کیا ہے مجھ پر حد جاری کیجئے، نبی (صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم) نیکوڑا منگوایا تو ایک سخت ٹہنی لائی گئی جس میں پھل تھے آپ نے فرمایا اس سے کم لاؤ پھر ایک نرم شاخ لائی گئی آپ نے فرمایا اس سے کچھ زیادہ لاؤ، پھر ایک درمیانی شاخ لائی گئی۔آپ نے فرمایا یہ ٹھیک ہے پھر آپ نے اس سے کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ متوسط شاخ سے کوڑے لگائے جائیں۔

(فتح القدیر ج ۵ ص ۱۶۔۱۵،سکھر)

خلاصہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان اور پاک دامن مرد یا عورت پر کسی مکلف نے زنا کی تہمت لگائی اور اس پر چار گواہ نہیں پیش کئے تو اس پر اسی (۸۰) کوڑے حد لازم ہوگی۔

جس پر حد قذف لگ چکی ہو اس کی شہادت قبول کرنے میں اختلاف فقہاء:

جو شخص کسی پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگائے پھر اس پر چار گواہ نہ پیش کر سکے اس کے متعلق تین حکم بیان فرمائے۔ ایک یہ کہ اس کو اسی (۸۰) کوڑے مارو، دوسرا یہ کہ ان کی شہادت کو کبھی قبول نہ کرو اور تیسرا یہ کہ وہی فاسق ہیں۔اس کے بعد فرمایا سوا ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا بہت مہربان ہے۔

اس پر اجماع ہے کہ اس استثناء کا تعلق کوڑے مارنے کی سزا کے ساتھ نہیں ہے یعنی اگر کسی شخص نے تہمت لگانے کے بعد اس تہمت سے رجوع کرلیا اور یہ کہا کہ میں نے جھوٹ بولا تھا تو اس کو پھر بھی اسی (۸۰) کوڑے مارے جائیں گے۔البتہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اس توبہ کے بعد اس کی شہادت قبول کی جائے گی یا نہیں۔قاضی شریح، ابراہیم نخعی، حسن بصری، سفیان ثوری اور امام اعظم ابوحنیفہ (رح) کا مسلک یہ ہے کہ اس کی توبہ اب بھی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان کی شہادت کو کبھی بھی قبول نہ کرو اور اس سے استثناء کا تعلق توبہ قبول نہ کرنے کے ساتھ ہے یعنی تہمت لگانے کے بعد اس نے توبہ کرلی اور اپنی اصلاح کرلی تو پھر اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔

(الجامع الاحکام القرآن جز ۱۲ ص ۱۶۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

ائمہ ثلاثہ کا استدلال:

صحیح بخاری میں ہے:

حضرت ابوبکرہ، شب بن معبد اور نافع نے حضرت مغیرہ بن شعبہ پر زنا کی تہمت لگائی تھی، حضرت عمر (رض) نے ان تینوں کو اسی، اسی (۸۰،۸۰) کوڑے مارے کیونکہ یہ چار گواہ نہیں پیش کر سکے تھے۔ پھر فرمایا کہ جو ان میں سے توبہ کرلے گا اس کی شہادت قبول کرلی جائے گی۔شبل اور نافع نے اپنے آپ کو جھوٹا قرار دیا اور حضرت ابوبکرہ (رض) اپنے قول پر قائم رہے۔

(صحیح البخاری کتاب الشہادات)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۰۲ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

زہری نے عید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکرہ، نافع اور شبل نے حضرت مغیرہ کے خلاف زنا کی شہادت

دی اور زیادہ ابن ابوسفیان نے ان کی شہادت کے خلاف شہادت دی، حضرت عمر نے ان تینوں کو کوڑے مارے اور فرمایا تم میں سے جس نے اپنی شہادت سے رجوع کرلیا اس کی شہادت قبول کرلی جائے گی۔حضرت ابوبکرہ نے اپنی شہادت سے رجوع کرنے سے انکار کردیا۔

ان چاروں نے حضرت مغیرہ کو الرقطاء ام جمیل بنت عمرو الھلالیہ کے پیٹ کے اوپر دیکھا، انھوں نے جا کر حضرت عمر سے شکایت کی حضرت عمر نے حضرت مغیرہ کو معزول کردیا اور ان کی جگہ حضرت ابوموسیٰ کا بصرہ کا گورنر بنادیا، اور حضرت مغیرہ کو حاضر کیا گیا۔ اول الذکر تینوں نے ان کے خلاف زنا کی شہادت دی اور زیاد بن ابوسفیان نے قطعی شہادت نہیں دی اور کہا میں نے بہت قبیح منظر دیکھا تھا اور میں نہیں جانتا کہ انھوں نے یہ فعل کیا تھا یا نہیں، تب حضرت عمر نے ان تینوں پر حد قذف جاری کی۔حاکم نے المستدرک میں روایت کیا ہے کہ زیاد نے کہا کہ میں نے ان دونوں کو ایک لحاف میں دیکھا میں نے ان کا زور زور سے سانس سنا اور اس کے بعد کیا ہوا اس کا مجھے پتہ نہیں۔

(فتح الباری ج ٥ ص ٥٨٤۔ ٥٨٣، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤٢٠ھ)

گھروں میں جانے کے آداب

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَاؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۲۷

”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ کرلو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ اور اگر تم ان گھروں میں کسی کو نہ پاؤ تو ان میں داخل نہ ہو حتیٰ کہ تمہیں اجازت دے دی جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو تم لوٹ جاؤ یہ لوٹ جانا تمہارے لیے بہت پاکیزہ ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کا خوب جاننے والا ہے“۔ (النور: ٢٨۔ ٢٧)

بغیر اجازت گھروں میں داخلہ کی اور دیگر آداب کے متعلق احادیث اور آثار

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر یہ کرم فرمایا کہ ان کے دلوں میں رہنے کے لیے گھر بنانے کا خیال القا کیا اور یہ کہ وہ اپنے گھروں کو لوگوں سے مستور رکھیں اور ان کو اپنے گھروں میں رہائش کا سامان فراہم کرنے کی توفیق دی اور ایسے احکام شرعیہ نافذ کیے کہ کوئی شخص دوسرے کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہوتا کہ اس کی مستور خواتین اور اس کا قیمتی ساز و سامان اور اس کی پوشیدہ چیزیں اور مخفی خزانے دوسروں سے محفوظ رہ سکیں۔

اس آیت میں تَسْتَاْنِسُوْا کا لفظ ہے اس کا لغوی معنی ہے حتی کہ تم مانوس ہو جاؤ اور اس آیت میں یہ لفظ تستاذنوا کے معنی میں

ہے کیونکہ جب کوئی شخص اجازت لینے کے بعد کسی کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہ گھر والوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عدی بن ثابت (رض) بیان کرتے ہیں کہ انصار کی ایک عورت نے کہا یا رسول اللہ میں اپنے گھر میں اس حال میں ہوتی ہوں کہ اس حال میں میں یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے دیکھے خواہ میرا والد ہو یا میرا بیٹا ہو اور ہمارے گھر میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور میں ایسے حال میں ہوتی ہوں تب یہ آیت نازل ہوئی۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ١٩٦٢٠)

عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ جب تمہارے بچے بالغ ہو جائیں تو وہ اجازت طلب کریں ابن جریج نے کہا میں نے عطاء سے پوچھا کیا کسی شخص پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنی ماں اور محارم کے پاس جانے کے لیے بھی اجازت طلب کرے، انھوں نے کہاں ہاں عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا کیا کوئی شخص اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کرے؟ آپ نے فرمایا: اس نے کہا میرے علاوہ اس کا اور کوئی خدمت گار نہیں ہے، کیا میں پھر بھی داخل ہونے کے لیے اجازت طلب کروں؟ آپ نے اس سے پوچھا کیا تم اس کو برہنہ دیکھنا پسند کرو گے اس نے کہا نہیں آپ نے فرمایا پھر تم اس سے اجازت لے کر داخل ہو۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ١٩٦٢٤)

حضرت ابو سعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں انصار کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رض) خوف زدہ حالت میں آئے انھوں نے کہا میں نے حضرت عمر (رض) سے تین مرتبہ اجازت طلب کی مجھے اجازت نہیں دی گئی تو میں واپس آگیا، حضرت عمر نے کہا تم کیوں چلے گئے تھے میں نے کہا میں نے تین مرتبہ اجازت طلب کی تھی مجھے اجازت نہیں دی گئی تو میں واپس چلا گیا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے جب تم میں سے کوئی شخص تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اس کو اجازت نہ دی جائے تو وہ واپس چلا جائے حضرت عمر نے کہا اللہ کی قسم تم ضرور اس حدیث پر کوئی گواہی پیش کرو گے، پس کیا تم میں سے کوئی شخص ہے جس نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ حدیث سنی؟ حضرت ابی بن کعب نے کہا اللہ کی قسم مسلمانوں میں سے سب سے کم عمر شخص اس حدیث کی شہادت دے گا، حضرت ابو سعید خدری نے کہا میں سب سے کم عمر تھا ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور میں نے حضرت عمر کو خبر دی کہ بیشک نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس طرح فرمایا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٢٤٥، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢١٥٣، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ٥١٨٠، سنن الترمذی رقم الحدیث: ٦٢٩٠، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٣٧٠٦، مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ١٩٤٢٣، مسند احمد رقم الحدیث: ١٩٨٤٠، سنن دارمی رقم الحدیث: ٢٦٣٢، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٤٨١٠)

تین دفعہ سلام کرنے کا اس لیے حکم دیا ہے کہ جب تین مرتبہ سلام کرنے کے بعد گھر والا اندر آنے کے لیے نہ کہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر والا اس کو بلانا نہیں چاہتا یا ممکن ہے اس کو کوئی ایسا عذر ہو جس کی وجہ سے وہ سلام کا جواب نہ دے سکے اور اس کو بلا نہ سکے۔ ربعی بیان کرتے ہیں کہ بنو عامر کے ایک شخص نے بتایا کہ اس نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گھر میں آنے کی اجازت طلب کی اور یہ کہا کہ میں اندر آجاؤں؟ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے خادم سے فرمایا جاؤ اس کو اجازت طلب کرنے کا طریقہ سکھاؤ، اور اس سے کہو کہ یوں کہے: السلام علیکم کیا میں داخل ہو جاؤں؟ اس شخص نے یہ سن کر کہا: السلام علیکم کیا میں داخل ہو جاؤں؟ پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو اجازت دی اور وہ داخل ہو گیا۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۱۷۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۴ھ)

قیس بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کے لیے آئے اور آپ نے فرمایا: السلام علیکم و رحمۃ اللہ حضرت سعد (رض) نے بہت آہستہ سے جواب دیا، قیس کہتے ہیں میں نے حضرت سعد سے پوچھا کیا آپ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اجازت نہیں دیتے! انھوں نے کہا رہنے دو وہ ہم کو زیادہ دفعہ سلام کریں گے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھر فرمایا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ حضرت سعد نے پھر بہت آہستہ جواب دیا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پھر فرمایا: السلام علیکم ورحمتہ اللہ پھر رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوٹ گئے اور سعد آپ کے پیچھے گئے، اور کہا یا رسول اللہ میں نے آپ کا سلام سن لیا تھا اور آپ کو قصداً آہستہ جواب دیا تھا تاکہ آپ زیادہ بار سلام کریں تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے ساتھ چلے گئے۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۱۸۵، بیروت ۱۴۱۴ھ)

جب کوئی شخص کسی کا دروازہ کھٹکھٹائے اور پوچھا جائے کہ کون ہے؟ تو یہ نہ کہے کہ میں ہوں بلکہ اپنا نام بتائے۔

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد کے قرض کے سلسلہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا پس میں نے دروازہ کھٹکھٹایا آپ نے فرمایا کون ہے؟ میں نے کہا میں ہوں، آپ نے فرمایا میں میں گویا آپ نے اس کا جواب کو مکروہ قرار دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۲۵۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۵۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۶۳۸، مسند احمد رقم الحدیث: ۱۴۴۱۱)

حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ حضرت عمر بن خطاب کے پاس گئے اور کہا السلام علیکم یہ عبداللہ بن قیس ہیں حضرت عمر نے اجازت نہیں دی، انھوں نے دوبارہ کہا السلام علیکم یہ ابوموسیٰ ہے پھر کہا السلام علیکم یہ الاشعری ہے! پھر واپس چلے گئے حضرت عمر نے کہا ان کو میرے پاس واپس لاؤ ان کو واپس لایا گیا وہ آگئے، پوچھا اے ابوموسیٰ تم کیوں واپس چلے گئے؟ ہم کام میں مشغول تھے، انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے تم تین مرتبہ اجازت طلب کرو، اگر اجازت مل جائے تو فبہا ورنہ واپس چلے جاؤ، حضرت عمر نے کہا تم اس حدیث پر گواہ پیش کرو ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث بلا تکرار: ۲۱۵۳، الرقم المسلسل: ۵۵۲۶، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۱۸۱)

اگر کسی کے گھر کا دروازہ بند ہو تو اس کی جھریوں سے جھانکنا ممنوع ہے:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر کوئی شخص بغیر اجازت کے تمہارے گھر میں جھانکے اور تم لاٹھی سے اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۰۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۵۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۸۶۱، مسند احمد رقم الحدیث: ۷۳۱۱)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر گھر کا دروازہ بند ہو تو اس کی جھریوں سے اندر جھانکنا ممنوع ہے اور اگر گھر والے نے جھانکنے والے کی آنکھ تیر یا کسی لکڑی سے پھوڑ دی تو اس پر قصاص یا دیت نہیں ہے، فقہاء مالکیہ نے اس صورت میں قصاص لازم کیا ہے اور کہا ہے کہ جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑنا جائز نہیں ہے اور اس حدیث کو انھوں نے تغلیظ اور ترہیب پر محمول کیا ہے انھوں نے کہا ہے کہ معصیت کو معصیت سے دفع کرنا جائز نہیں ہے، جمہور نے اس کے جواب میں کہا کسی کے گھر میں جھانکنا معصیت ہے اور جھانکنے والے

کی آنکھ پھوڑنا معصیت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی اجازت دی ہے، جیسے کوئی شخص کسی کو قتل کرنے کے لیے اس پر حملہ کرے تو مدافعت میں اس کو قتل کرنا جائز ہے اور معصیت نہیں ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں جھانک کر کسی کی بیوی یا بیٹی کا چہرہ دیکھے تو وہ اس پر سخت مشتعل ہوتا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی سے مباشرت کر رہا ہو وہ یا اس کی بیوی برہنہ ہو اس لیے جھانکنے والا اس سزا کا مستحق ہے، اور اگر گھر والے کی اپنی تقصیر ہو کہ اس نے دروازہ بند نہیں کیا، کھلا چھوڑ دیا پھر کسی نے ان کی طرف دیکھا تو پھر اس کی آنکھ پھوڑنا جائز نہیں اور اگر اس نے کھلے دروازے سے قصداً دیکھا تو اس میں دو قول ہیں صحیح یہ ہے کہ اب بھی دیکھنے والے کی آنکھ پھوڑنا جائز نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اپنے گھر کی چھت سے دوسروں کے گھروں میں جھانکے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اور اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔

(فتح الباری ج ۱۴ ص ۲۳۹ ۔ ۲۳۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۲۰ھ)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑنے کی اجازت اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب وہ قصداً جھانکے، اور اگر اس کی اتفاقاً نظر پڑ جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس حدیث سے ان فقہاء نے استدلال کیا ہے جو اس صورت میں آنکھ پھوڑنے پر قصاص لازم نہیں کرتے اور اس کے خون کو ضائع قرار دیتے ہیں اور اس حدیث میں اس کا جواز ہے اور کسی ہلکی چیز سے اس کو مارنا چاہیے، ایک قول یہ ہے کہ یہ حدیث تہدید دھمکانے اور تغلیظ پر محمول ہے اس میں اختلاف ہے کہ آیا خبردار کرنے سے پہلے آنکھ پھوڑنا جائز ہے یا نہیں؟ صحیح یہ ہے کہ پھر بھی جائز ہے۔

(عمدۃ القاری جز ۲۲ ص ۲۳۹، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر ۱۳۴۸ھ)

بغیر رہائش والے گھروں میں جانے کے آداب

لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتًا غَیۡرَ مَسۡکُوۡنَۃٍ فِیۡہَا مَتَاعٌ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۲۹﴾ (سورت النور ۲۹)

ہاں غیر آباد گھروں میں جہاں تمہارا کوئی فائدہ یا اسباب ہو، جانے میں تم پر کوئی گناہ نہیں (۱) تم جو کچھ بھی ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر تم ایسے گھروں میں داخل ہو جن میں کوئی رہتا نہ ہو اور ان میں تمہارا سامان ہو تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے، اور اللہ اس کو خوب جاننے والا ہے جس کو تم ظاہر کرتے ہو یا جس کو تم چھپاتے ہو'' ۔ (النور: ۲۹)

بیوت غیر مسکونہ (غیر رہائشی) عمارات کی تعیین:

جب بغیر اجازت کے گھروں میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی تو مسلمانوں کو یہ مشکل پیش آئی کہ مدینہ سے مکہ کے

راستے میں اور دوسرے راستوں میں رفاہ عام کے لیے مکان بنے ہوئے تھے جن میں لوگ عارضی قیام کرتے تھے، اس طرح وہاں دکانیں، سرائے، ہوٹل، سبیل اور بیت الخلاء وغیرہ بنے ہوئے تھے جن کا کوئی مالک نہیں ہوتا تھا نہ وہ شخصی ملکیت ہوتے تھے اور ان میں بغیر اجازت داخلہ کی ممانعت میں عام مسافروں اور مسلمانوں کے لیے بڑی دشواری تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آسانی کے لیے یہ آیات نازل فرمائی۔

امام عبدالرحمن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے بیوت غیر مسکونہ (غیر رہائشی مکانات) کے مصداق میں حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں:

(۱) قتادہ نے کہا اس سے مراد سرائے، بیت الخلاء اور گودام وغیرہ ہیں جن میں ساز و سامان رکھا جاتا ہے۔

(۲) عطاء نے کہا اس سے مراد ویران مکان، کھنڈرات اور بیت الخلاء ہیں۔

(۳) محمد بن حنیفہ نے کہا اس سے مراد مکہ کے مکان ہیں کیونکہ وہ وقف عام ہیں ان کا کوئی مالک نہیں، (یہ صرف امام مالک کا مذہب ہے، جمہور کے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ الحج: ۲۵ میں ہم اس پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں)

(۴) ابن زید نے کہا اس سے مراد تاجروں کی دکانیں ہیں جو راستوں میں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔

(۵) ابن جریج نے کہا اس سے مراد تمام غیر رہائشی مکانات ہیں کیونکہ داخل ہونے کے لیے اجازت کی شرط مکان میں رہنے والوں کے اعتبار سے ہے اور جب وہاں کوئی رہنے والا نہ ہو تو پھر یہ شرط بھی نہیں ہے۔

(زاد المسیر ج ٦ ص ۲۹ مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اس آیت کے عموم سے معلوم ہوا جو عمارتیں کسی خاص شخص یا قوم کی ذاتی ملکیت نہ ہوں اور وہاں عام افراد کو آنے جانے کی ممانعت نہ ہو، اور وہاں ٹھہرنے اور ان کا استعمال کرنے کی عام اجازت ہو جیسے ہوٹل، مسافر خانے، سرائے، اسٹیشن اور ہوائی اڈے کی عمارت، مسجدیں، خانقاہیں، دینی مدارس، ہسپتال، ڈاک خانے اور اس طرح کی دوسری عمارتیں، اور جس جگہ داخلہ کی پابندی ہو وہاں داخل ہونے کی جو شرائط مقرر کی گئی ہوں ان کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

گھروں میں جانے کے آداب اور اوقات

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۚ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۸﴾ ﴿سورۃ النور ۵۸﴾

"ایمان والو! تم سے تمہاری ملکیت کے غلاموں کو اور انھیں بھی جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں (اپنے آنے کی) تین وقتوں میں اجازت حاصل کرنی ضروری ہے۔ نماز فجر سے پہلے

اور ظہر کے وقت جب کہ تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور عشا کی نماز کے بعد، یہ تینوں وقت تمہاری (خلوت) اور پردہ کے ہیں، ان وقتوں کے ماسوا نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان پر(۱)، تم سب آپس میں ایک دوسرے کے پاس بکثرت آنے جانے والے ہو (ہی)، اللہ اس طرح کھول کھول کر اپنے احکام سے بیان فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمت والا ہے"۔ (النور: ۵۸)

تین اوقات میں گھر میں دخول کے لیے نوکروں اور نابالغ لڑکوں کو اجازت لینے کا حکم:

امام عبدالرحمٰن بن محمد ابن ابی حاتم المتوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس (رض) سے دو آدمیوں نے اس آیت کے متعلق سوال کیا جس میں اللہ تعالیٰ نے پردے کے ان تین اوقات میں اجازت طلب کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ ستر کرنے والا ہے اور ستر کو پسند کرتا ہے لوگوں کے گھروں کے دروازوں پر پردے نہیں ہوتے تھے اور نہ ان کے گھروں پر حجاب ہوتا تھا، بسا اوقات اچانک اس کے گھر میں اس کا خادم یا اس کا بیٹا یا اس کی لے پالک بیٹی آجاتی اور وہ اس وقت اپنی بیوی کے ساتھ مشغول ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ ان اوقات میں اجازت طلب کر کے گھر میں داخل ہوں، پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر وسعت اور کشادگی کر دی اور انھوں نے اپنے گھروں میں پردے ڈال لیے اور لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کا پردے ڈال دینا کافی ہے اور اب اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: 14787)

موسیٰ بن ابی عائشہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے شعبی سے اس آیت کے متعلق سوال کیا، انھوں نے کہا یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی لیکن لوگوں نے اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔

(تفسیر امام ابن اپنی حاتم رقم الحدیث 14790)

حسن بصری نے کہا جب کوئی شخص اپنے خادم کو رات میں اپنے پاس ٹھہرائے تو وہ اس کی طرف سے اجازت ہے اور اگر وہ اس کو رات میں اپنے پاس ٹھہراتا تو وہ ان تین اوقات میں اجازت طلب کر کے اندر آئے۔

(تفسیر امام ابنی حاتم رقم الحدیث: 14791)

مقاتل بن حیان اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ ایک انصاری اور اس کی بیوی اسماء بنت مرشدہ دونوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے کھانا تیار کیا اور لوگ ان سے اجازت لیے بغیر ان کے گھر میں داخل ہو گئے تو حضرت اسماء نے کہا یا رسول اللہ! یہ کتنی بری بات ہے! کہ ایک عورت اور اس کا خاوند ایک کپڑا اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا خادم بغیر اجازت لیے ہوئے گھر میں داخل ہو جاتا ہے اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: 14795)

سدی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب ان اوقات میں اپنی ازواج سے جماع کرنے کو پسند کرتے تھے، پھر وہ غسل کر کے نماز پڑھنے کے لئے لے آتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے غلاموں اور نابالغ لڑکوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ان

اوقات میں بغیر اجازت کے گھروں میں داخل نہ ہوں۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث:14796)

اجازت مذکورہ کا حکم منسوخ ہو چکا ہے یا باقی ہے۔

علامہ ابوعبداللہ قرطبی مالکی متوفی 668ھ نے اس آیت کے منسوخ ہونے نہ ہونے کے متعلق حسب ذیل اقوال ذکر کئے ہیں۔

(۱) ابن المسیب اور ابن جبیر نے کہا یہ آیت منسوخ ہے۔

(۲) ابوقلابہ نے کہا یہ حکم مستحب ہے واجب نہیں ہے، ان کی مصلحت کے اعتبار سے یہ حکم دیا گیا تھا۔

(۳) ابوعبدالرحمٰن اسلمی نے کہا اس حکم کی مخاطب خواتین ہیں۔

(٤) حضرت ابن عمر نے کہا اس حکم کے مخاطب مرد ہیں۔

(٥) یہ حکم پہلے واجب تھا کیونکہ پہلے گھروں کے نہ کواڑ تھے نہ دروازے، اور اگر پھر ایسے گھر ہوں تو یہ حکم پھر واجب ہوگا۔

(٦) قاسم، جابر بن زید، شعبی اور اکثر اہل علم کا یہ مذہب ہے کہ یہ حکم واجب اور ثابت ہے، مردوں اور عورتوں دونوں پر۔

اس مسئلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ جب لوگوں کے گھروں میں دروازے اور پردے نہیں تھے اس وقت اس آیت کے حکم پر عمل کرنا واجب تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر وسعت عطا کر دی تو اب اس حکم پر عمل کرنا واجب نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس (رض) اسی طرح فرماتے تھے جیسا کہ ہم نے تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث:14787 کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور امام ابو داؤد نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث:٥١٢٢)

اس آیت میں جو ثلاث مرات فرمایا ہے اس کا معنی تین اوقات ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر وقت میں تین مرتبہ اجازت لینا ضروری ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز۱۲ ص ۲۸۲، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱٤۱٥ھ)

اولیاء کی طاقت

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾

(سورت النمل 38)

''حضرت (سلیمان علیہ السلام) نے فرمایا اے سردارو! تم میں سے کوئی ہے جو ان کے مسلمان ہو کر پہنچنے سے پہلے ہی اس کا تخت مجھے لا دے''؟

سلیمان نے کہا: اے سردارو! تم میں سے کون ان کے اطاعت گزار ہو کر آنے سے پہلے اس کا تخت میرے پاس لا سکتا ہے؟ ایک بہت بڑے جن نے کہا میں آپ کے مجلس برخاست کرنے سے پہلے اس تخت کو آپ کے پاس حاضر کر دوں گا، اور میں اس پر ضرور

قادر اور امین ہوں۔ جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اس تخت کو آپ کے پاس حاضر کر دوں گا سو جب سلیمان نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا یہ میرے رب کے فضل سے ہے تاکہ وہ میرا عمل ظاہر کرے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری، اور جو شکر کرتا ہے تو وہ اپنے فائدہ ہی کے لیے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا رب بے پروا بزرگ ہے۔
(النمل: ۴۰۔۳۸)

بلقیس کا حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی خدمت میں روانہ ہونا

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اس آیت سے پہلے ایک عبارت مقدر ہے، یعنی بلقیس کا سفیر واپس بلقیس کے پاس گیا اور بتایا کہ حضرت سلیمان نے اس پر حملہ کرنے کی قسم کھالی ہے، تب بلقیس نے اطاعت شعاری کی نیت سے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہونے کی تیاری کی اور اس کو یقین ہو گیا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) اللہ کے نبی ہیں اور وہ ان سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ روایت ہے کہ اس نے شہر سے نکلتے وقت اپنے تخت کو محفوظ کر دیا، اس کے ہاں سات کمرے تھے ہر کمرے کے پیچھے ایک کمرہ تھا۔ اس نے ساتویں کمرے میں تخت کو بند کر دیا اور کمرے میں قفل ڈال دیا، بلکہ ساتوں کمروں میں تالے لگائے اور اس کی حفاظت کے لیے چوکیدار مقرر کر دیئے، پھر اپنے خدام اور متعبین کے ساتھ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی طرف روانہ ہوئی، اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی طرف پیغام بھیجا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہی ہوں تاکہ آپ کے احکام کو سمجھوں اور جس دین کی آپ مجھے دعوت دے رہے ہیں اس میں غور کروں۔

تخت بلقیس منگوانے کی وجوہات

عبداللہ بن شداد نے کہا جب بلقیس حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے ملک سے ایک فرسخ (تین شرعی میل جو ساڑھے چار انگریزی میل کے برابر ہیں) کے فاصلہ پر رہ گئی تو حضرت سلیمان نے اپنے اہل دربار سے کہا: اے سردارو! تم میں سے کون ان کے اطاعت گزار ہو کر آنے سے پہلے اس کا تخت میرے پاس لا سکتا ہے؟

حضرت سلیمان علیہ اسللا م بلقیس کے پہنچنے سے پہلے جو اس کا تخت منگوانا چاہتے تھے اس سے آپ کا مقصود کیا تھا، اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابن زید سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) بلقیس کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عجیب و غریب اور حیرت انگیز کاموں پر قدرت عطا کی ہے تاکہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی یہ قدرت ان کی نبوت پر دلالت کرے اور یہ جو فرمایا کہ ان کے پہنچنے سے پہلے وہ تخت لایا جائے تاکہ اس سے خلاف عادت کام پر اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت ظاہر ہو اور ان کی نبوت پر دلیل قائم ہو اور بلقیس جب یہاں پہنچے تو پہنچتے ہی پہلی ساعت میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر مطلع ہو جائے۔

امام ابن جریر طبری نے کہا کہ آپ نے تخت اس لیے منگوایا کہ آپ ہدہد کی خبر کے صدق کی آزمائش اور امتحان لیں کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اس کا تخت عظیم ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ نے وہ تخت اس لیے منگوایا تھا کہ آپ اس تخت میں کچھ تغیر اور تبدل کر دیں پھر بلقیس کی عقل کا امتحان لیں کہ وہ اپنے تخت کو پہچانتی ہے یا نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ نے حربی کے مال پر اس کی

رضا کے بغیر قبضہ کرنا چاہا تھا اور آپ یہ اقدام اللہ تعالیٰ کی وحی سے کر رہے تھے اور یہ آپ کی خصوصیات میں سے تھا، ورنہ شرائع سابقہ میں تو مال غنیمت کو بھی لینا حلال نہ تھا اور یہ تو مال غنیمت بھی نہ تھا، جو بات دل کو زیادہ لگتی ہے وہ یہی ہے کہ آپ بلقیس کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اپنا معجزہ دکھانے کے لیے اور اس میں تغیر اور تبدل کر کے اس کا امتحان لینے کے لیے اس کے پہنچنے سے پہلے اس کا تخت منگوا رہے تھے۔

(روح المعانی جز19 ص300-301 مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

عفریت کا معنی

اس آیت میں ہے عفریت من الجن نے کہا، عفریت کا معنی ہے بہت بڑا جن، قوی ہیکل دیو، علامہ راغب اصفہانی نے کہا جنات میں سے عفریت اس کو کہتے ہیں جو موذی اور خبیث ہو، جیسے بہت بدکار اور سازشی انسان کو شیطان کہا جاتا ہے اسی طرح بہت خبیث جن کو عفریت کہا جاتا ہے (المفردات ج ۲ ص ۴۴۱) امام ابن جریر نے کہا عفریت کا معنی سرکش اور قوی ہے اور اس جن کا نام کوزن تھا۔ (جامع البیان جز19 ص197) علامہ آلوسی نے کہا ہے حضرت ابن عباس سے مروی ہے اس کا نام صخر تھا۔

عفریت من الجن کی پیشکش کہ وہ دربار برخواست ہونے سے پہلے تخت کو حاضر کر دے گا۔

حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس (رض) نے بیان فرمایا اس عفریت من الجن نے کہا میں آپ کی مجلس برخواست کرنے سے پہلے اس تخت کو لا کر حاضر کر دوں گا۔ مجاہد، سدی اور دیگر مفسرین نے کہا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے درمیان مقدمات کا فیصلہ کرنے اور دیگر کاروائی کے لیے صبح کے اول وقت سے لے کر زوال تک بیٹھتے تھے۔ اس جن نے کہا میں اس تخت کے لانے پر قوی ہوں اور اس میں جو قیمتی ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے ہیں ان پر میں امین ہوں۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے کہا میں اس سے بھی زیادہ جلدی چاہتا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) اس تخت کو اس لیے منگوانا چاہتے تھے کہ اس سے یہ ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتنی عظیم سلطنت عطا کی ہے اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لیے ان لشکروں کو مسخر کر دیا جن کو ان سے پہلے کسی اور کے لیے مسخر نہیں کیا تھا اور نہ ان کے بعد کسی اور کے لیے ایسی سلطنت فرماں روائی ہوگی اور تاکہ آپ کی یہ سلطنت بلقیس کے سامنے آپ کی نبوت پر دلیل اور معجزہ ہو کیونکہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) شام میں تھے اور بلقیس یمن کے شہر صنعا میں تھی اور ان کے درمیان بہت فاصلہ تھا اور وہ تخت نو کوٹھڑیوں میں سے نویں کوٹھڑی میں تالوں میں بند تھا اور اس کے گرد محافظ اور چوکیدار مستعد بیٹھے تھے۔

(تفسیر کثیر ج ۳ ص ۴۰۰، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں:

حضرت سلیمان کے دربار کی نشست زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹے کی ہوگی اور بیت المقدس سبا کے پایہ تخت تارب کا فاصلہ پرندہ کی اڑان سے بھی کم از کم ڈیڑھ ہزار میل کا تھا، اتنے فاصلہ سے ایک ملکہ کا عظیم الشان تخت اتنی کم مدت میں اٹھا لانا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا تھا خواہ وہ عمالقہ میں سے کتنا ہی موٹا تازہ آدمی کیوں نہ ہو، یہ کام تو آج کل کا جٹ طیارہ بھی انجام دینے پر قادر نہیں ہے۔ مسئلہ اتنا ہی نہیں ہے کہ تخت کہیں جنگل میں رکھا ہوا اور اسے اٹھا لایا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تخت ایک ملکہ کے محل میں تھا جس پر یقیناً پہرہ دار متعین ہوں گے اور وہ ملکہ کی غیر موجودگی میں ضرور محفوظ جگہ رکھا گیا ہوگا۔ انسان جا کر اٹھا لانا چاہتا تو اس کے ساتھ ایک چھاپہ مار دستہ ہونا چاہیے تھا

کہ لڑ بھڑ کر اسے پہرہ داروں سے چھین لائے یہ سب کچھ آخر دربار برخاست ہونے سے پہلے کیسے ہوسکتا تھا اس چیز کا اگر تصور کیا جا سکتا ہے تو ایک حقیقی جن ہی کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۵۷۶ مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور مارچ 1983ئ)

حضرت سلیمان کے ولی کا پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو حاضر کر دینا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا اس نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اس تخت کو آپ کے پاس حاضر کر دوں گا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں:

وہ شخص بہر حال جن کی نوع میں سے نہ تھا اور بعید نہیں کہ وہ کوئی انسان ہی ہو، اس کے پاس کوئی غیر معمولی علم تھا، اور وہ اللہ کی کسی کتاب الکتب سے ماخوذ تھا۔ جن اپنے وجود کی طاقت سے اس تخت کو چند گھنٹوں میں اٹھالانے کا دعویٰ کر رہا تھا یہ شخص علم کی طاقت سے اس کو ایک لحظہ میں اٹھا لایا۔

اس دیوہیکل جن کے دعوے کی طرح اس شخص کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی نہ رہا بلکہ فی الواقع جس وقت اس نے دعویٰ کیا اسی وقت ایک ہی لحظہ میں وہ تخت حضرت سلیمان کے سامنے رکھا نظر آیا۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۵۷۷، مطبوعہ لاہور، 1983ئ)

جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا اس کا مصداق کون تھا

علامہ سید آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس، زید بن رومان، حسن بصری اور جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ شخص آصف بن برخیا بن شمعیا بن منکیل تھا وہ بنی اسرائیل میں سے تھا مشہور قول کے مطابق وہ حضرت سلیمان کا وزیر تھا۔ مجمع البیان میں مذکور ہے کہ وہ ان کا وزیر تھا وہ ان کا بھانجا تھا اور ان کا سچا خیر خواہ تھا اس کو اسم اعظم کا علم تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ان کا کاتب (سیکریٹری) تھا۔

(روح المعانی ج ۱۹ ص ۳۰۲، مطبوعہ دار الفکر، ۱۴۱۷ھ)

اس شخص کے متعلق دیگر اقوال یہ ہیں: علامہ علی بن محمد ماوردی متوفی ۴۵۰ھ لکھتے ہیں۔

۱) یہ وہ فرشتہ تھا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے ملک کو طاقت دی۔

(۲) حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جو جن اور انس پر مشتمل تھا یہ اس کا کوئی فرد تھا۔

(و) یہ خود حضرت سلیمان تھے اور انھوں نے عفریت من الجن سے فرمایا تھا۔ میں اس تخت کو تیری پلک جھپکنے سے پہلے لے آتا ہوں۔ (امام رازی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔)

(٤) یہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے علاوہ کوئی اور انسان تھا، اور اس میں پھر پانچ قول ہیں۔ (۱) قتادہ نے کہا اس کا نام ملیخا تھا (ب) مجاہد نے کہا اس کا نام اسطوم تھا (ج) ابن رومان نے کہا وہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کا دوست تھا اور

اس کا نام آصف بن برخیا تھا(د) زبیر نے کہا اس کا نام ذوالنور تھا وہ مصری تھا(ہ) ابن لھیعہ نے کہا وہ خضر تھے۔
(النکت والیعون ج٤ ص ٢١٣، دارالکتب العلمیہ بیروت)

امام عبدالرحمٰن بن محمد بن ادریس ابن ابی حاتم متوفی ٣٢٧ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ وہ شخص آصف بن برخیا تھے جو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے خالہ زاد بھائی تھے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم تھا۔
(الجامع لا حکام القرآن جز ۱۳ ص ١٩٠ مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی حنفی متوفی ٧١٠ھ علامہ ابوالحیان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ٧٥٤ھ، حافظ ابن کثیر شافعی متوفی ٧٧٤ھ علامہ ابراہیم بن عمر البقاعی المتوفی ٨٢٥ھ حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ٩١١ھ علامہ محمد بن مصلح الدین القوجوی الحنفی المتوفی ٩٥١ھ علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ١١٣٧ھ علامہ سلیمان الجمل المتوی ١٢٠٤ھ علامہ احمد بن محمد صاوی مالکی متوفی ١٢٤١ھ، علامہ محمد بن علی بن محمد شو کانی متوفی ١٢٥٠ھ، عالمہ سید محمود آلوسی متوفی ١٢٧٠ھ غیر مقلد مفسر صدیق بن حسن قنوجی متوفی ١٣٠٧ھ صدر لافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ١٣٦٧ھ غیر مقلد مفسر صدیق بن حسن قنوجی متوفی ١٣٠٧ھ صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد ابادی متوفی ١٣٦٧ھ شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ١٣٦٩ھ مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ١٣٩٦ھ کی بھی یہی تحقیق ہے اور ان حضرات نے اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ ان کی کتب کے حوالہ جات حسب ذیل ہیں:

(مدارک التنزیل علی ھامش الخازن ج ٣ ص ٢٤١، پشاور، البحر المحیط ج ٨ ص ٢٤٠، بیروت تفسیر ابن کثیر ج ٣ ص ٢٠٠ بیروت نظم الدرج ٥ ص ٤٢٧، دارالکتب العلمیہ بیروت، جلالین ص ٣٨٠ بیرت، حاشیۃ شیخ زادہ علی البیضاوی ج ٦ ص 398 بیروت روح البیان ج ٦ ص 448 بیروت، حاشیۃ الجمل علی الجلاین ج وص 315 حاشیۃ الصاوی علی الجلاین ج ٤ ص ٤٩٩ بیروت فتح القدیر ج ص ١٨٤ بیروت، روح المعانی جز ١٩ ص ٣٠٢ فتح البیان ج ٥ ص ١٣٧ بیرت، خزائن العرفان علی کنزالایمان ص 608 کراچی تفسیر عثمانی ص ٥٠٦ متعارف القرآن، ج ٦ ص ٥٨٠، کراچی)

تخت بلقیس کو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے سامنے حاضر کرنے کی کفیت

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ٦٨٨ھ لکھتے ہیں:

امام مالک نے کہا کہ بلقیس یمن میں تھی اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) شام میں تھے اور تفاسیر میں ہے کہ وہ تخت جس جگہ تھا وہ جگہ پھٹ گئی اور تخت وہاں سے نکل کر حضرت سلیمان کے سامنے نکل آیا۔
(الجامع لا حکام القرآن جز ١٣ ص ١٩٢ مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١٥ھ)

حافظ عماد الدین عمر بن اسماعیل بن کثیر شافعی دمشقی ٧٧٤ھ لکھتے ہیں:

مفسرین نے کہا ہے کہ آصف بن برخیاء نے حضرت سلیمان سے کہا آپ یمن کی طرف دیکھئے جہاں آپ کا مطلوب عرش ہے پھر اللہ سے دعا کی تو وہ عرش زمین میں گھس کر غائب ہو گیا اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے سامنے نکل آیا۔
(تفسیر ابن کثیر ج ٣ ص ٤٠٠، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ١٤١٩ھ)

علامہ ابوالحسن ابراہیم بن عمر البقاعی المتوفی ٨٠٥ھ لکھتے ہیں:

جس طرح ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ اپنے ولی کی آنکھ ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ اور پیر ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کی صفات

کا مظہر ہو کر تصرف کرتا ہے، اس طرح آصف بن برخیا نے بھی اس تخت پر تصرف کیا۔
(نظم الدرر ج ٥ ص 426-427 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤١٥ھ)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ٩١١ھ لکھتے ہیں:

حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے کاتب نے کہا اپنی نظر اٹھایئے، انھوں نے نظر اٹھائی پھر نظر لوٹائی تو تخت سامنے موجود تھا۔
(الدر المنثور ج ٦ ص 319 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت: ١٤٢١ھ)

علامہ السید محمود آلوسی حنفی متوفی ١٢٧٠ھ لکھتے ہیں:

شیخ اکبر قدس سرہ نے کہا ہے کہ آصف نے عین عرش میں تصرف کیا تھا اس نے اس جگہ اس عرش کو معدوم کر دیا اور حضرت سلیمان کے سامنے موجود کر دیا کیونکہ مرد کامل کا قول اللہ تعالیٰ کے لفظ "کن" کی طرح ہوتا ہے۔
(روح المعانی جز 19 ص 306 مطبوعہ دار الفکر بیروت، ١٤١٧ھ)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفت "کن" کے مظاہر

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت "کن" کا مظہر بنایا۔ آپ نے کئی چیزوں کے متعلق فرمایا "ہو" سو وہ ہو گئیں۔

حضرت کعب بن مالک (رض) کی طویل حدیث میں ہے کہ ایک سفید ہیئت والا شخص ریگستان سے آرہا تھا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کن یا خیثمہ "تو ابو خیثمہ ہو جا" تو وہ ابو خیثمہ ہو گیا۔
(صحیح مسلم الحدیث: 2769 المعجم الکبیر رقم الحدیث: ١٩٠٤٤ مجمع الزوائد ج ٦ ص 193 دلائل النبوۃ ج ٥ ص 226-223)

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ٥٤٤ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

حق کے مشابہ یہ ہے کہ "کن" یہاں پر تحقیق اور وجود کے لیے ہے یعنی تو تحقیقی طور پر ابو خیثمہ ہو جا۔
(اکمال المعلم بفوائد مسلم ج ٨ ص 278 مطبوعہ دار الوفاء، 1419ھ)

علامہ نووی نے لکھا ہے تو جو کوئی بھی ہے حقیقتاً ابو خیثمہ ہو جا۔
(صحیح مسلم بشرح النوادی ج ١١ ص 6910 مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ١٤١٧ھ)

اسی طرح امام حاکم نیشاپوری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ غزوہ تبوک میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک شخص کے متعلق فرمایا کن اباذر "تو ابوذر ہو جا" سو وہ شخص ابوذر ہو گیا۔
(المستدرک ج ٣ ص 50-51 المستدرک رقم الحدیث: ٤٣٧٣، جدید کنز العمال ١١ ص ٦٦٨ دلائل النبوۃ ج ٥ ٢٢٢، دار الکتب العلمیہ بیروت)

امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ٤٥٨ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مجلس میں آکر بیٹھتا تھا اور جب آپ بات کرتے تو وہ آپ کو چڑانے کے لیے اپنا منہ بگاڑ لیتا تھا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کن کذلک تم اسی طرح ہو جاؤ "پھر ہمیشہ اس کا منہ بگڑا رہا حتیٰ کہ وہ مر گیا۔

(دلائل النبوۃ ج٦ ص 329 المستدرک ج ص 261، قدیم المستدرک رقم الحدیث: ٤٢٤١ جدید الخصائص الکبریٰ ج ٢ ص 71-72 البدایہ والنہایہ ج ٤ ص 568 طبع جدید)

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دروازہ پر کھڑے ہوئے تھے، آپ باہر نکلے تو ہم آپ کے ساتھ چلنے لگے آپ نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص بازار میں تلقین نہ کرے اور مہاجر دیہاتی سے بیع نہ کرے اور جو شخص ایسی گائے یا اونٹنی خریدے جس کے تھن باندھ کر اس کا دودھ روکا ہوا تھا اس کو اختیار ہے وہ چاہے تو اس کو واپس کردے اور جتنا دودھ پیا ہے اس کا دگنا گندم بھی ساتھ دے۔ ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ چل رہا تھا اور آپ کی نقل اتار رہا تھا۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کذلک فکن" تو اسی طرح ہو جا" وہ شخص بے ہوش ہو کر گر گیا اس شخص کو اس کے گھر اٹھا کر لے جایا گیا۔ وہ دو ماہ بے ہوش رہا اس کو جب بھی ہوش آتا تو اس کا منہ اسی طرح بگڑا ہوا ہوتا جس طرح نقل کے وقت تھا حتیٰ کہ وہ مر گیا۔ (دلائل النبوۃ ج٦ ص 239-240)

ولی اور اس کی کرامت کی تعریفیں اور کرامت کے واقعہ پر دلائل

اس آیت کے سیاق میں یہ بات آ گئی ہے کہ آصف بن برخیا اللہ تعالیٰ کے ولی تھے اور انھوں نے تخت بلقیس کو مسافت بعیدہ سے پلک جھپکنے سے پہلے حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے سامنے لا کر حاضر کر دیا۔ اس آیت سے ہمارے علماء نے کرامت کو ثابت کیا ہے اور یہ بتایا کہ اولیاء اللہ سے کرامت ثابت ہوتی ہے۔

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ٧٩٣ ھ لکھتے ہیں:

اولیاء اللہ کی کرامات برحق ہیں، ولی اس کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا حسب امکان عارف ہو، اور اللہ تعالیٰ کی دائما عبادت کرتا ہو اور ہر قسم کے گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور لذات اور شہوات میں انہماک اور استغراق سے اعراض کرتا ہو اور کرامت کی یہ تعریف ہے کہ ولی سے کوئی ایسا کام صادر ہو جو خرق عادت (خلاف معمول) ہو اور اس کے ساتھ دعویٰ نبوت مقارن اور متصل نہ ہو، پس جو خرق عادت اس شخص سے صادر ہو جو مومن اور صالح نہ ہو اس کو استدراج کہتے ہیں اور جو خرق عادت مومن اور صالح سے صادر ہو اور اس کے ساتھ دعویٰ نبوت بھی مقارن اور متصل ہو اس کو معجزہ کہتے ہیں، اور کرامت کے حق ہونے پر دلیل یہ ہے کہ اس قسم کے خرق عادت افعال صحابہ کرام سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں خصوصاً ان میں خرق عادت کی قدر مشترک تواتر سے ثابت ہے اگرچہ الگ الگ وہ افعال خبر واحد سے ثابت ہیں، نیز قرآن مجید میں ذکر ہے کہ حضرت مریم کے پاس بے موسمی پھل آتے تھے، اور حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے سامنے تخت بلقیس کو لا کر حاضر کیا۔

نیز لکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے صاحب آصف بن برخیاء نے مسافت بعیدہ سے پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس الکر حاضر کر دیا اور حضرت مریم کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

(آل عمران: ٣٧) جب بھی زکریا ان کے حجرے میں جاتے تو ان کے پاس (بے موسمی) رزق پاتے، وہ پوچھتے اے مریم! تمہارے پاس یہ (بے موسمی) رزق کہاں سے آیا تو وہ کہتیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے۔

اسی طرح بہ کثرت اولیاء سے پانی پر چلنا منقول ہے اور حضرت جعفر بن ابی طالب اور لقمان سرخسی سے ہوا میں اڑنا منقول

ہے اور حضرت سلمان اور حضرت ابوالدرداء (رض) نے پتھر کی تسبیح کو سنا، اور اصحاب کہف کے کتے نے اصحاب کہف سے کلام کیا، اور روایت ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ایک شخص گائے کو لے جارہا تھا پھر وہ اس پر سوار ہوگیا تو گائے نے اس کی طرف مڑ کر دیکھ کر کہا میں اس کے لیے نہیں پیدا کی گئی میں تو کھیت میں ہل چلانے کے لیے پیدا کی گئی ہوں، لوگوں نے کہا سبحان اللہ گائے نے کلام کیا! تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں اس پر ایمان لایا، اسی طرح روایت ہے کہ حضرت عمر نے مدینہ میں منبر پر کہا اور ان کا لشکر اس وقت نہاوند (ایران میں ہمدان اور کرمان کے درمیان ایک مشہور شہر) میں تھا۔ انھوں نے لشکر کے امیر سے کہا اے ساریہ! پہاڑ کی اوٹ میں ہوجا، پہاڑ کی اوٹ میں ہوجا، کیونکہ جس جگہ وہ تھے وہاں دشمن کا خطرہ تھا، اور اتنی دور سے حضرت ساریہ کا یہ کلام سننا ان کی کرامت ہے، اسی طرح حضرت خالد بن ولید نے زہر پی لیا اور ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور حضرت عمر کے خط ڈالنے سے دریائے نیل جاری ہوگیا۔

(شرح عقائد نسفی ص ۱۰۶۔ ۱۰۵، مطبوعہ کراچی)

علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد ج ۵ ص ۷۹۔ ۷۲، میں ولی کی تعریف، کرامت، اس کے وقوع پر دلائل اور مخالفین کے شبہات کے جوابات میں زیادہ بحث کی ہے۔

شکر کا بیان

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ؕ وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾

”اور ہم نے یقیناً لقمان کو حکمت دی (۱) تھی کہ تو اللہ تعالیٰ کا شکر کر (۲) ہر شکر کرنے والا اپنے ہی نفع کے لیے شکر کرتا ہے جو بھی ناشکری کرے وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز اور تعریفوں والا ہے“۔

(سورۃ لقمان: آیت 12)

ولقد اتینا لقمن الحکمۃ۔ اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔

بغوی نے لکھا ہے:

لقمان بن باعور بن ناخور بن تارخ۔ تارخ ہی کو آزر کہا جاتا ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: لقمان حضرت ایوب کے بھانجے تھے۔ مقاتل نے کہا: خالہ کے بیٹے تھے۔ بیضاوی نے لکھا ہے: لقمان حضرت داؤد کے زمانہ تک زندہ تھے اور فتویٰ دیا کرتے تھے لیکن حضرت داؤد کی بعثت کے بعد فتویٰ دینا چھوڑ دیا اور فرمایا: اب میری ضرورت نہیں پھر کیوں فتویٰ دینے سے باز نہ رہوں۔ واقدی نے کہا: لقمان بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ تفسیر درمنثور میں ہے کہ ابن ابی شیبہ کی روایت ہے اور امام احمد نے الزہد میں بھی اس کو بیان کیا ہے اور کتاب المملوکین میں ابن ابی الدنیا نے بھی یہی لکھا ہے۔ نزی ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کا بھی بیان ہے کہ حضرت ابن

عباس نے فرمایا: لقمان ایک حبشی غلام تھے، جو بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے۔ بغوی نے خالد ربعی کی روایت سے بھی یہ ہی لکھا ہے۔ مجاہد نے کہا: لقمان حبشی غلام تھے، ہونٹ بڑے بڑے تھے اور قدم پھٹے ہوئے تھے۔ سعید بن مسیب نے کہا: درزی تھے۔ بعض کا قول ہے کہ بھیڑیں بکریاں چرایا کرتے تھے۔

حکمت کا اطلاق انصاف، علم، حلم، نبوت، قرآن اور انجیل سب پر ہوتا ہے، کذا فی القاموس۔ حدیث ان من الشعر الحکمۃ میں حکمت سے مراد ہے علم۔ اور حدیث الاوفی راسہ حکمۃ میں حکمت سے مراد عقل ہے۔ آیت مذکورہ میں سب معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

عکرمہ تنہا لقمان کی نبوت کے قائل تھے۔ ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ وہب بن منبہ سے دریافت کیا گیا۔ کیا لقمان نبی تھے؟ وہب نے کہا: نہیں۔ ان کے پاس وحی نہیں آئی تھی، ہاں دانشمند آدمی تھے۔ ابن جریر نے مجاہد کا بھی یہی قول بیان کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت لقمان کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ نبوت پسند کریں یا حکمت۔ لقمان نے حکمت کو پسند کرلیا۔ بغوی نے لکھا ہے: لقمان دوپہر کو سورہے تھے، خواب میں ہاتف نے ندا دی: لقمان! کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنادے اور لوگوں پر تم صحیح حکومت کرتے رہو؟ خواب ہی میں لقمان نے ہاتف کو جواب دیا: اگر میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے تو مجھے عافیت پسند ہے (میں حکومت کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا) اور اگر یہ اللہ کا قطعی حکم ہے تو بسر وچشم کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ جب اللہ کا یہ قطعی حکم میرے لیے ہوگا تو وہی فیصلہ کرنے میں میری مدد بھی کرے گا اور غلطی سے مجھے محفوظ رکھے گا۔ ہاتف نے پردہ غیب سے آواز دی: لقمان! ایسا تم نے کیوں اختیار کیا؟ (یعنی عافیت کو کیوں پسند کیا) لقمان نے کہا: سخت ترین اور الجھے ہوئے غیر واضح مقامات میں فیصلہ پر ہر طرف سے تاریکی چھائی ہوتی ہے، ایسے مقام پر اگر لقمان کا فیصلہ صحیح پڑ گیا تو وہ نجات کا مستحق ہے اور اس سے فیصلہ میں غلطی ہوگئی تو جنت کا راستہ کھو گیا۔ دنیا میں نیچا رہنا، سردار ہونے سے بہتر ہے۔ جو شخص آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتا ہے، اس کے ہاتھ سے دنیا بھی جاتی ہے اور آخرت بھی ہاتھ نہیں آتی۔ ملائکہ کو لقمان کی خوش گفتاری پر تعجب ہوا۔ اس کے بعد لقمان کو کسی روز سوتے میں اللہ نے حکمت عطا فرمادی اور بیدار ہونے کے بعد آپ ہر بات پر حکمت کرنے لگے۔

حضرت داؤد کو اس کے بعد (عطاء حکمت یا اختیار حکمت کی) غیبی ہاتف نے ندا دی تو حضرت داؤد نے بلاشرط اس کو قبول کرلیا۔ اسی کا نتیجہ ہوا کہ آپ کئی مرتبہ غلطی میں پڑ گئے مگر ہر مرتبہ اللہ نے معاف فرمادیا۔ حضرت لقمان اپنی حکمت سے حضرت داؤد کی مدد کرتے تھے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں حکمت سے مراد عدل اور انصاف کے ساتھ کا فیصلہ کرنا نہیں ہے (کیونکہ حضرت لقمان نے اس بار کو اٹھانے سے تو انکار ہی کردیا تھا)۔

جرید نے نہایہ میں کیا خوب کہا ہے کہ سب سے اعلیٰ چیز کا سب سے اعلیٰ علم حکمت ہے۔ میں کہتا ہوں: سب سے اعلیٰ اور افضل چیز اللہ کی ذات ہے، کوئی چیز اس کی طرح نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ دوسری جگہ فرمایا: اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ (یعنی شئی کا اطلاق اللہ کی ذات پر ہوتا ہے۔ اللہ سب سے بڑی شئے ہے۔ گویا شئی بمعنی موجود کے ہے اور موجود دو طرح کا ہے۔ مخلوق اور خالق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شئی مصدر ہے شاء یشاء شیاء مستعمل ہے اور مصدر کبھی اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے، کبھی اسم مفعول کے معنی میں۔ اول صورت میں شئی کا اطلاق اللہ پر ہوگا اور دوسری صورت میں تمام ممکنات پر۔ بعض علماء نے شئی کی تعریف میں کہا ہے: ما یمکن ان یعلم ویخبر عنہ۔ شئی وہ ہے جس کو جاننا اور اس کی حالت بیان کرنا ممکن ہو) اور سب سے اعلیٰ علم جس پر غفلت کا پردہ نہیں پڑ سکتا، علم

حضوری ہے۔علم حصولی غفلت سے خالی نہیں ہوتا۔علاوہ ازیں اللہ کی ذات کا علم حصولی ممکن بھی نہیں ہے‘علم حصولی نام ہے کسی چیز کی تصور کا ذہن میں آجانے کا۔اور اللہ کی نہ کوئی صورت ہے‘نہ وہ کسی چیز اور ہیت میں آسکتا ہے بلکہ اللہ کی ذات کا علم تو علم حضوری سے بھی بالا تر ہے۔ علم حضوری جو کسی عالم کو ہوتا ہے اس کی نسبت ذات الٰہی کے علم کی طرف تو ایسی ہے جیسے علم حضوری سے علم حصولی کی نسبت۔حصولی علم میں ذہن کے آئینہ میں صرف صورت ہوتی ہے اور حضوری علم میں ذہن کے سامنے نفس شئی ہوتی ہے۔مبدء انکشاف نفس شئی ہوتی ہے عکس اور صورت کا حصول علم کا ناقص درجہ ہے اور نفس شئی اگر ذہن کے سامنے حاضر ہو جیسے ہر شخص اپنی ذات کو جانتا ہے اور سمجھتا ہے میں! میں ہوں‘یہ علم کا کامل درجہ ہے لیکن اللہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے‘اس کا علم تو علم حضور کے مقابلہ میں کامل نہیں‘اکمل ہے‘اعلیٰ اور افضل ہے کیونکہ علم حصولی ہو یا حضوری دونوں کا تعلق دماغ اور ذہن سے ہے اور ذات خداوندی کو جاننے کا تعلق قلب سے ہے۔اسی لیے ایک حدیث قدسی میں آیا ہے کہ مجھے زمین وآسمان اپنے اندر نہیں سما سکتے‘مگر مومن بندے کا دل مجھے اپنے اندر سما لیتا ہے۔

ذات الٰہی کا علم بہت ہی خاص خاص لوگوں کو ہوتا ہے۔حاکم نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ لقمان حضرت داؤد کے غلام تھے۔حضرت داؤد زرہیں بناتے تھے لیکن حضرت لقمان حضرت داؤد سے اس کی بابت کوئی سوال نہیں کرتے۔جب حضرت داؤد نے زرہ بنا لی اور اس کو پہن لیا تو فرمایا: یہ بہترین جنگی لباس ہے۔اس پر حضرت لقمان نے فرمایا: خاموش رہنا حکمت ہے (بغیر دریافت کئے زرہ بنانے کی حکمت اور غرض حضرت لقمان کو معلوم ہوگئی) لیکن ایسا کرنے والے کم ہیں۔ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت لقمان سے دریافت کیا گیا: سب سے برا کون آدمی ہے؟ فرمایا: وہ آدمی سب سے برا ہے جو اس بات کی پروا بھی نہیں کرتا کہ لوگ مجھے گناہ کرتے دیکھ رہے ہیں (یعنی علی الاعلان بدکار)۔

ابن ابی شیبہ‘امام احمد اور ابن جریر نے خالد ربعی کا قول نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے‘بڑھئی تھے۔ایک بار آقا نے حکم دیا کہ ایک بکری ذبح کر کے اس کی بہترین دو بوٹیاں لے آ۔حضرت لقمان نے زبان اور دل لے جا کر حاضر کر دیا۔کچھ دنوں کے بعد آقا نے دوبارہ حکم دیا کہ ایک بکری کو ذبح کر کے اس کے دو بدترین پارچے لے آ۔حضرت لقمان نے پھر زبان اور دل لا کر حاضر کر دیئے۔آقا نے اس کی وجہ دریافت کی تو حضرت لقمان نے فرمایا: اگر یہ دونوں پاکیزہ رہیں تو سارے اعضاء سے بہتر ہیں اور اگر گندے ہوں تو سب سے زیادہ برے بھی یہی ہیں۔

ان اشکر اللہ۔کہ اللہ کا شکر کر۔یعنی ہم نے لقمان کو حکمت دی اور کہا کہ اس عطیہ حکمت کا شکر ادا کر۔اکثر اہل تفسیر نے اَن کو مفسرہ قرار دیا ہے‘ کیونکہ عطائے حکمت میں قول کا معنی آجاتا ہے۔میں کہتا ہوں: عطائے حکمت کا مطلب ہے حکمت سکھانا اور تعلیم حکمت۔اکثر قول ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے‘اس صورت میں حکمت دینے کا معنی ہوگا شکر گزاری کا حکم دینا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمت ہی شکر ہے اور حکمت ادا کرنے کا معنی ہی شکر ادا کرنے کا حکم دینا ہے۔

آیت میں امر سے مراد ہے تکوینی (تخلیقی‘فطری) حکم۔کیونکہ تکلیفی (اور تشریعی) حکم تو سب ہی لوگوں کو دیا گیا ہے‘لقمان ہی کی خصوصیت نہیں پھر شکر گزاری کا حکم دینا (یعنی تکلیفی حکم دینا اس بات کا قطعاً موجب نہیں کہ ہر شخص ادا کرنے پر مجبور ہو اور ضرور ہی شکر کرے۔البتہ تکوینی امر کے لیے مامور بہ کا وجود ضروری ہے‘اگر امر تکوینی مراد ہو تو پھر شکر گزاری لازم ہوگی۔جس طرح عطائے حکمت کے بعد حصول حکمت لازم ہے‘اسی طرح شکر کے امر تکوینی کے بعد لقمان کا شکر گزار ہو جانا ضروری ہے۔

حکمت سے مراد لینا بطور مجاز ہے کیونکہ شکر حکمت کے لیے لازم ہے اور ملزوم سے لازم یا لازم سے ملزوم مراد ہو سکتا ہے۔

شکر کا معنی ہے منعم کی نعمت کا (اقرار) اظہار اور کفران کا معنی ہے منعم کی نعمت پر پردہ ڈال دینا 'چھپا دینا (منعم کو منعم نہ قرار دینا)۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے: شکر کا معنی ہے احسان شناسی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لفظ شکر اصل میں کشر تھا۔ کشر کے حرف کو مقدم موخر کر کے شکر کر دیا گیا۔ کشر کا معنی ہے کھول دینا 'شکر کا معنی بھی نعمت کو ظاہر کرنا ہے۔

شکر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دل سے شکر کرنا یعنی منعم کے انعام کا تصور کرنا۔

(۲) زبان سے شکر کرنا یعنی منعم کی نعمت پر اس کی ثناء کرنا۔

(۳) اعضاء جسم سے شکر کرنا یعنی نعمت کے بدلہ میں منعم کی اطاعت کرنا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ لفظ شکر عینٌ شَکْرٌ (بھرہوا چشمہ) سے ماخوذ ہے 'اس قول پر شکر کا معنی ہوگا منعم کی نعمتوں کی یاد سے بھر جانا۔ اسی بنیاد پر اللہ نے فرمایا ہے: وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۔ قرآن مجید میں اللہ نے دو شخصوں کو شکر گزار بندہ فرمایا ہے 'ایک حضرت ابراہیم جن کے متلق فرمایا ہے:

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ دوسرے حضرت نوح جن کے متعلق فرمایا ہے: اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۔

نہایہ میں جزری نے لکھا ہے: نعمت کے مقابلہ میں شکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور عمل سے بھی اور نیت سے بھی۔ زبان سے بھی منعم کی تعریف کرنی چاہیے اور اپنے اعضاء کو بھی ہمیشہ اس کی اطاعت میں لگا دیا جائے اور یقین رکھا جائے کہ منعم ہی میرا مولیٰ ہے۔ لفظ شکر شَكَرَ الاِبِلُ شكرًا (اونٹ خوب چر کر موٹے ہو گئے) سے ماخوذ ہے۔

ومن يشكر فانما يشكر لنفسه. جو شکر کرے گا وہ صرف اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرے گا۔

شکر کرنے سے موجودہ اور حاصل شدہ نعمت زوال سے محفوظ ہو جاتی ہے اور آئندہ مزید نعمت حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ کے قرب اور دوامی جنت کا حصول ہو جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ۔

ومن كفر فان الله غني حميد. اور جو (ان کی نعمت کی) ناشکری کے گا تو (ناشکری کا وبال اسی پر پڑے گا) اللہ تو کسی کے شکر کا ضرورت مند اور محتاج نہیں ہے اور (بہر حال) وہ مستحق ستائش ہے 'خواہ ناشکرا اس کی حمد نہ کرے۔ تمام مخلوق بزبان حال اس کی شکر گزار ہے۔

شِرک کا بیان اور والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۖ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿١٣﴾ (سورۃ لقمان: آیت 13)

''اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے میرے پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا 'بیشک شرک کرنا ضرور سب سے بڑا ظلم ہے اور ہم نے انسان کو اس کے

والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا'اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے
اس کو پیٹ میں رکھا' اور اس کا دودھ چھڑانا دو برس میں ہے (اور یہ کہ تم میرا شکر ادا کرو اور اپنے
والدین کا (تو نے) میری ہی طرف لوٹنا ہے''۔

حکیم لقمان کے بیٹے کا نام اور اس کا دین:

علامہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی المتوفی ۴۵۰ھ لکھتے ہیں:

حکیم لقمان کے بیٹے کے متعلق تین قول ہیں کلبی نے کہا ان کے بیٹے کا نام مشکم تھا' نقاش نے کہا ان کے بیٹے کا نام انعم تھا' اور ایک قول یہ ہے کہ اس کے بیٹے کا نام بابان تھا' حکیم لقمان نے جس وقت اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی اس وقت وہ مشرک تھا۔

(النکت والعیون ج ۴ ص ۳۳۳' مطبوعہ دار الکتب العملیہ بیروت)

علامہ اسماعیل حقی متوفی ۱۱۳۷ھ لکھتے ہیں:

حکیم لقمان کا بیٹا اور اس کی بیوی دونوں کافر تھے' حکیم لقمان ان دونوں کو مسلسل نصیحت کرتے رہے حتیٰ کہ وہ دونوں مسلمان ہو گئے' اس کے برخلاف حضرت نوح (علیہ السلام) کا بیٹا اور ان کی بیوی مسلمان نہیں ہوئے تھے اور حضرت لوط (علیہ السلام) کی بیٹیاں مسلمان ہو گئیں تھیں اور ان کی بیوی مسلمان نہیں ہوئی تھی۔

(روح البیان ج ۷ ص ۹۴' مطبوعہ دار احیاء لتراث العربی بیروت' ۱۴۲۱ھ)

علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی حکیم لقمان کے بیٹے اور بیوی کے متعلق قول کو نقل کیا ہے۔

(روح المعانی جز ۲۱ ص ۱۲۸ ذ مطبوعہ دار الفکر بیروت' ۱۴۱۷ھ)

شرک کے ظلم عظیم ہونے کی توجیہ

نیز فرمایا بیشک شرک کرنا ضرور سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یا حکیم القمان کا قول ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے۔ شرک کو سب بڑا ظلم اس لیے فرمایا کہ ظلم کا معنی ہے کسی کا حق دوسرے کو دے دینا جو اس حق کا مستحق نہ ہو' اور مستحق عبادت ماننا اللہ تعالیٰ کا حق ہے' اسی طرح اللہ ہی کا یہ حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے' پس اگر مخلوق میں سے کسی کا حق دوسرے غیر مستحق کو دے دیا جائے تو یہ بھی ظلم ہے' لیکن سب سے بڑا ظلم تو یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے وہ کسی غیر مستحق کو دے دیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی معصیت اور اس کی حکم عدولی کر کے انسان اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور اس وجہ سے انسان عذاب کا مستحق ہوتا ہے لیکن دائمی عذاب کا مستحق نہیں ہوتا سو یہ انسان کا اپنی جان پر ظلم ہے لیکن سب سے بڑا ظلم نہیں ہے' اور جب انسان شرک کرتا ہے تو وہ دائمی عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے' لہٰذا شرک کرنا انسان کا اپنی جان پر سب سے بڑا ظلم کرنا ہے۔ حدیث میں ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئك لھم الامن وھم مھتدون (الانعام:۸۲)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا ان ہی کے لیے (عذاب سے) امن ہے اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اصحاب نے کہا ہم میں سے کون ہے جو ظلم نہیں کرتا' تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

ان الشرك لظلم عظيم (لقمان: ١٣) بیشک شرک ضرور سب سے بڑا ظلم ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٣٢' صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٢٤' سنن الترمذی رقم الحدیث: ٣٠٦٨' السنن الکبریٰ رقم الحدیث: ١١٣٩٠)

لفظ عام سے عموم اور خصوص مراد لینے کا ضابطہ

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

صحابہ نے الانعام: ٨٢' میں عام کو اپنے عموم پر قرار دیا تھا' اور ظلم سے ظلم کی تمام انواع کو مراد لیا تھا حتی کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں معمولی سی کمی کو بھی ظلم قرار دیا تھا اس لیے انھوں نے کہا ہم میں سے کون ظلم نہیں کرتا' اور اس پر قرینہ یہ تھا کہ اس آیت میں نکرہ حیز نفی ہے' اور نفی کے بعد نکرہ مفید عموم ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس آیت میں ظلم سے مراد اس کی خاص نوع ہے اور وہ شرک ہے کیونکہ وہ ظلمِ عظیم ہے' اور اس پر دلیل ہے کہ ظلم پر تنوین تعظیم کے لیے ہے اور اس سے مراد ظلم عظیم ہے۔

(عمدۃ القاری ج ١ ص ٣٤٢-٣٤١' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت' ١٤٢١ھ)

ماں کے ساتھ زیادہ نیکی کرنے کی وجوہات

اس کے بعد فرمایا: اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا۔ (لقمان: ١٤)

اس سے پہلی آیت میں شرک کی ممانعت فرمائی تھی' اور عبادت کے قریب اطاعت ہے' تو بتایا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد والدین کی اطاعت ہے' اور اگر والدین مشرک بھی ہوں پھر بھی ان کی خدمت اور اطاعت کی جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی میں والدین یا کسی کی بھی اطاعت نہیں کی جائے گی اس وقت ان کے احکام کی خلاف ورزی کرنا واجب ہے۔

نیز فرمایا: اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے اس کو پیٹ میں رکھا' اور اس کا دودھ چھڑانا دو برس میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے تین درجے بیان فرمائے' اس نے کمزوری پر کمزوری برداشت کی' اس کو پیٹ میں رکھا' اور اس کو دودھ پلایا' اس وجہ سے ماں کو باپ پر تین درجہ فضیلت حاصل ہے' اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی ماں کی تین درجہ زیادہ فضیلت بیان فرمائی ہے۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آ کر عرض کیا میرے حسن خدمت کا سب سے زیادہ کون مستحق ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہاری ماں' کہا پھر کون ہے؟ فرمایا تمہاری ماں' کہا پھر کون ہے؟ فرمایا تمہاری ماں' کہا پھر کون ہے فرمایا تمہارا باپ۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٥٩٧١' صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٥٤٨' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٢٧٠٦)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا میں نے جہاد کی خواہش رکھتا ہوں لیکن اس پر قدرت نہیں رکھتا' آپ نے پوچھا کیا تمہارے والدین میں سے کوئی ایک زندہ ہے؟ اس نے کہا میری ماں زندہ ہے! آپ نے فرمایا تم ماں کے ساتھ نیکی کرو یہی اللہ کی راہ میں قتال ہے' جب تم یہ کرلو گے حج کرنے والے' عمرہ

کرنے والے ہو اور جہاد کرنے والے ہو۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٤٤٦٣، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض، ١٤١٦ھ)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا یا رسول اللہ! میں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے آپ کے لیے مکہ فتح کر دیا تو میں بیت اللہ میں جا کر اس کی نچلی چوکھٹ کو بوسہ دوں گا، آپ نے فرمایا: تم اپنی ماں کے قدم کو بوسہ دے دو، تمہاری نذر پوری ہو جائے گی۔

(اس حدیث کو تمام نے روایت کیا ہے، عمدۃ القاری ج ٢٢ ص ١٢٩، دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤٢١ھ)

حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا یارسول اللہ! میرے اہل وعیال بھی ہیں، میرا باپ ہے، میری ماں ہے، میرے حسن سلوک کا ان میں سے کون سب سے زیادہ مستحق ہے؟ آپ نے فرمایا تمہاری ماں اور تمہارا باپ اور تمہاری بہن اور تمہارا بھائی، پھر جو تمہارے زیادہ قریب ہو پھر جو تمہارے زیادہ قریب ہو۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٥٧٢٤، مکتبہ المعارف ریاض ١٤١٦ھ)

حضرت معاویہ بن جاہمہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آ کر پوچھا یا رسول اللہ! میں اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کے اجر وثواب کی طلب کے لیے آپ کے ساتھ جہاد کرنا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا تم پر افسوس ہے! کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ میں نے کہا جی ہاں! آپ نے فرمایا واپس جاؤ اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرو، میں آپ کے پاس پھر دوسری جانب سے آیا اور میں نے آپ سے دوبارہ وہی سوال کیا، آپ نے فرمایا واپس جاؤ اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرو، جب تیسری بار اسی طرح سوال کیا تو آپ نے فرمایا تم پر افسوس ہے اپنی ماں کے پیروں کے پاس لازم رہو۔ اس حدیث کی سند صحیح یا حسن ہے۔

(سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٢٧٨١، سنن النسائی رقم الحدیث: ٣١٠٤، مسند احمد ج ٣ ص ٤٢٩، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ٨١٦٢، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ٥٧٢٤، جامع الاصول رقم الحدیث: ١٩٧، مجمع الزوائد ج ٨ ص ١٣٨)

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(القضاعی ج ١ ص ١١٩، الجامع للخطیب ج ٢ ص ٢٨٩، جمع الجوامع رقم الحدیث: ١١١٢٢، الجامع الصغیر رقم الحدیث: ٣٦٤٢، کنز العمال رقم الحدیث: ٤٥٤٣٩، ج ١٦ ص ٤٦١)

علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ٨٥٥ھ لکھتے ہیں:

ماں کا حق باپ کے حق پر مقدم ہے، کیونکہ حمل، وضع حمل اور دودھ پلانے کی مشقت اور صعوبت صرف ماں اٹھاتی ہے باپ نہیں اٹھاتا، اسی وجہ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ماں کے تین درجہ کے بعد باپ کا ذکر کیا، اس پر علماء کا اجماع ہے کہ نیکی کرنے میں اور اطاعت کرنے میں ماں کا مرتبہ اور حق باپ سے زیادہ ہے، ماں اگر بلائے تو نفل نماز توڑ دینا مستحب ہے، فرض نماز کو نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ماں، باپ یا کسی بھی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

(عمدۃ القاری ج ٢٢ ص ١٢٩، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ١٤٢١ھ)

والدین کے ساتھ نیکی کرنے کی وجوہات

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میرا شکر ادا کرو کیونکہ میں نے تم کو وجود عطا کیا اور خلق' اور اللہ کا شکر ادا کرنا اس کی تعظیم' تکبیر اور عبادت اور اطاعت سے ہوگا' اور ماں باپ کا شکر ادا کرو کیونکہ وہ اس دنیا میں تمہارے ظہور کا سبب ہیں اور ان کا شکر ان کی توقیر ان کی خدمت اور ان پر شفقت سے ہوگا' اللہ تعالیٰ نے اپنے شکر کو انسان کے والدین کے شکر کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے کیونکہ انسان کے وجود کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے وجود کا مجازی سبب اس کے والدین ہیں' اور انسان کو جس واسطے سے نعمت ملی ہے جب تک اس کا شکر ادا نہ کیا جائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں ہوتا۔

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۵٤' سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٨١١' مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۸' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳٤۰۷)

سفیان بن عیینہ نے کہا جس نے پانچ وقت کی نماز پڑھیں اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دیا اور جس نے نمازوں کے بعد ماں باپ کے لیے دعا کی اس نے ماں باپ کا شکر ادا کر دیا' علامہ آلوسی نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتوں کا شکر ہے اسی طرح ماں باپ کے احسانات کا شکر ہے۔

(روح المعانی جز ۲۲ ص ۱۳۱' دارالفکر بیروت' ۱٤۱۷ھ)

حضرت ابوبردہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو میرے پاس حضرت عبداللہ بن عمر (رض) آئے' انھوں نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟ میں نے کہا نہیں! انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جو شخص اپنے باپ کے ساتھ اس کی قبر میں صلہ رحمی کرنا چاہتا ہو وہ اپنے باپ کے بعد اس کے بھائیوں کے ساتھ صلہ رحم کرے' اور بات یہ ہے کہ میرے باپ حضرت عمر (رض) اور تمہارے باپ کے درمیان اخوت اور دوستی تھی اس لیے میں نے صلہ رحم کرنا پسند کیا۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور امام بخاری کی شرط کے موافق ہے۔

(صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ٤٣٢' المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۲۵۱۸)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے جمعہ کی شب بارہ رکعات نماز پڑھی اور اس میں ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ پڑھی اور پانچ بار آیت الکرسی پڑھی اور پانچ بار سورۃ اخلاص پڑھی اور پانچ پانچ بار سورۃ فلق اور سورۃ الناس پڑھی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد پندرہ بار استغفار کیا' اور اس کا ثواب اپنے والدین کو پہنچا دیا تو اس نے اپنے والدین کا حق ادا کر دیا خواہ ان کا نافرمان ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو صدیقین اور شہداء کا ثواب عطا فرمائے گا۔

(احیاء علوم الدین ج ١ ص ١٨٩' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت' ۱٤۱۹ھ)

حافظ عراقی نے اس کے حاشیہ میں لکھا ہے اس حدیث کو ابوموسیٰ المدینی اور ابومنصور الدیلمی نے مسند الفردوس میں روایت کیا ہے اور اس کی سند بہت ضعیف ہے۔

سید محمد بن محمد الزبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

یہ حدیث قوت القلوب اور مسند الفردوس میں ہے اور اس کی سند بہت ضعیف ہے۔

(اتحاف السادۃ المتقین ج ۳ ص ۳۸۱ ، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۴ھ)

ہر چند کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے لیکن فضائل اعمال میں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے اس حدیث میں فوت شدہ رشتہ داروں کو ایصال ثواب کا بھی ثبوت ہے۔

اساتذہ اور علماء کی تعظیم اور ان کے حقوق کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

ان اشکرلی ولوالدیک (لقمان: ۱۴) یہ کہ تو میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

پیر و استاد علم دین کا مرتبہ ماں باپ سے زیادہ ہے وہ مربی بدن ہیں اور یہ مربی روح، جو نسبت روح سے بدن کو ہے، وہ نسبت استاذ و پیر سے ماں باپ کو ہے جیسا کہ علامہ شرنبلالی نے غنیۃ ذوی الاحکام میں اس کی تصریح کی ہے، قرآن عظیم میں ماں باپ کا ذکر فرمایا یہ نہیں فرمایا کہ ان کے برابر کسی کا حق نہیں بلکہ وہ آیہ کریمہ (ان اشکرلی ولوالدیک) جس میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو فرمایا، مربیان دین کا مرتبہ ماں باپ سے بہت زائد ہونے کی طرف اشارہ فرماتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تربیت دین نعمت عظمیٰ ہے اور اس کا شکر قطعاً فرض مگر ان کا شکر بعینہ شکر الٰہی عزوجل ہے اس واسطے انھیں ان اشکرلی (میرا شکر ادا کرو) میں داخل فرمایا ان کے بعد والدین کا ذکر ارشاد ہوا، ورنہ والدین کا حق نبی سے بھی بڑھ جائے گا کہ یہاں جس طرح استاذ و پیر کا ذکر نہیں نبی کا بھی ذکر نہیں۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰-۲ ص ۱۴۱، دار العلوم امجدیہ، کتبہ رضویہ کراچی ۱۴۱۲ھ)

حضرت موسیٰ کا حضرت خضر سے حصول تعلیم کے لیے ادب سے درخواست کرنا

قال له موسىٰ هل اتبعك على ان تعلمن مما علمت رشدا قال انك لن تستطيع معي صبرا و كيف تصبر على ما لم تحط به خبرا قال ستجدني ان شآء الله صابرا ولآ اعصي لك امرا قال فان اتبعتني فلا تسئلني عن شيء حتى احدث لك منه ذكرا (الكهف: ۶۶-۷۰)

موسیٰ نے کہا آیا میں اس شرط پر آپ کی پیروی کروں کہ آپ کو جو رشد و ہدایت کا علم دیا گیا ہے آپ اس علم میں سے مجھے بھی کچھ تعلیم دیں اس بندہ نے کہا آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکیں گے اور آپ اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہیں جس کا آپ کے علم نے احاطہ نہیں کیا موسیٰ نے کہا آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا اس بندہ نے کہا اگر تم میری پیروی کرو گے تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق اس وقت تک سوال نہ کرنا جب تک میں خود اس کا ذکر نہ کروں (الکہف: ۷۰-۶۶)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے انتہائی لطیف پیرائے میں کہا آیا میں آپ کی پیروی کروں، اس طریقہ سے سوال کرنے میں انتہائی ادب احترام ہے اور استاذ کو اپنے سے بہت بلند مقام پر فائز کرنا ہے، جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ یحییٰ نے حضرت عبداللہ بن زید (رض) سے کہا کیا آپ مجھے دکھا سکتے ہیں کہ رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کس طرح وضو کرتے تھے؟ الحدیث

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۸۵، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۵، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۱۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۹۸۔ ۹۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۳۴، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۱۵۵، شرح السنہ رقم الحدیث: ۲۲۴)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی درخواست میں ادب کی وجوہ

حضرت موسیٰ نے جو یہ کہا تھا: آیا میں اس شرط پر آپ کی پیروی کروں کہ آپ کو جو رشد و ہدایت کا علم دیا گیا ہے آپ اس علم سے مجھے بھی تعلیم دیں، اس قول میں ادب کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے آپ کو حضرت خضر (علیہ السلام) کا تابع قرار دیا، کیونکہ انھوں نے کہا آیا میں آپ کی اتباع کروں۔

(۲) حضرت خضر کی اتباع کرنے میں حضرت موسیٰ نے ان سے اجازت طلب کی گویا کہ انھوں نے یوں کہا کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ کی اتباع کروں، اور اس میں بہت زیادہ تواضع ہے۔

(۳) کیا میں حصول تعلیم کے لیے آپ کی اتباع کروں، اس قول میں اپنے لیے عدم علم کا اور اپنے استاذ کے لیے علم کا اعتراف ہے۔

(۴) انھوں نے کہا آپ کو جو رشد و ہدایت کا علم دیا گیا ہے آپ اس میں سے مجھے بھی (کچھ) تعلیم دیں، یہ من تبعیض کے لیے ہے یعنی انھوں نے یہ طلب کیا آپ کو جو علم دیا گیا ہے آپ اس میں سے مجھے بعض کی تعلیم دیں گویا کہ انھوں نے کہا میرا یہ سوال نہیں ہے کہ آپ مجھے علم میں اپنے برابر کر دیں، بلکہ میرا مطالبہ یہ ہے کہ آپ اپنے علم کے اجزاء میں سے چند اجزاء مجھے بھی عطا کر دیں جیسا کہ فقیر غنی سے کہتا ہے کہ تم اپنے مال کے اجزاء میں سے چند اجزاء مجھے عطا کر دو۔

(۵) انھوں نے کہا آپ کو جو اللہ کا علم دیا گیا ہے آپ اس میں سے مجھے عطا کر دیں گویا کہ وہ اللہ کے طلب گار تھے۔

(۶) حضرت موسیٰ نے کہا آپ کو جو اللہ کا علم دیا گیا ہے، اس میں یہ اعتراف ہے کہ آپ کو اللہ نے علم عطا کیا ہے۔

(۷) انھوں نے یہ کہا آپ کو جو علم دیا گیا ہے آپ اس میں سے مجھے علم دیں یعنی آپ میرے ساتھ وہ معاملہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ مجھے تعلیم دینے سے آپ کا مجھ پر اسی طرح انعام ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ پر انعام کیا ہے، اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ جس شخص نے مجھ کو ایک حرف کی بھی تعلیم دی میں اس کا بندہ اور غلام ہوں۔

(۸) متابعت کا معنی یہ ہے کہ تابع اس وجہ سے وہ کام کرے کہ متبوع نے وہ کام کیا ہے اگر متبوع وہ کام نہ کرتا تو وہ اس کام کو نہ کرتا جیسے ہم کعبہ کی طرف منہ کر کے صرف اس لیے نماز پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے اگر آپ اس کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھتے تو ہم بھی اس کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھتے، اسی طرح استاذ کی اتباہ کرنے کا معنی یہ ہے کہ تلمیذ استاذ کے کیے ہوئے کام کو صرف اس وجہ سے کرے گا کہ وہ کام اس کے استاذ نے کیا ہے اس طرح اتباع کرنے میں اول امر سے اس بات کا اقرار ہے کہ وہ استاذ کے کسی کام پر اعتراض نہیں کرے گا۔

(۹) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے مطلقاً کہا آیا میں آپ کی پیروی کروں اس کا مطالب یہ ہے کہ انھوں نے تمام کاموں میں

حضرت خضر کی اتباع کرنے کی درخواست کی کسی خاص کام کے ساتھ اتباع کو مقید نہیں کیا۔

(۱۰) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو حضرت خضر نے ابتداءً پہچان لیا تھا کیونکہ انھوں نے کہا آپ بنی اسرائیل کے موسیٰ ہیں گویا انھوں نے جان لیا تھا یہ وہی نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بلاواسطہ شرف کلام سے نوازا ہے اور ان کو کثیر معجزات عطا فرمائے اس کے باوجود حضرت موسیٰ نے اتنی وجوہ سے تواضع کی اس سے معلوم ہوا کہ جس کا مرتبہ جتنا زیادہ ہوتا ہے وہ اہل علم کے سامنے اتنی زیادہ تواضع کرتا ہے اور ان کا اتنا زیادہ ادب اور احترام کرتا ہے۔

(۱۱) حضرت موسیٰ نے کہا آیا میں آپ کی اتباع کروں کہ آپ مجھے تعلیم دیں، پہلے انھوں نے اپنی اتباع پیش کی اس کے بعد انھوں نے ان سے حصول تعلیم کو طلب کیا' گویا ادب کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے استاذ کی خدمت کرو پھر اس سے علم طلب کرو۔

(۱۲) انھوں نے کہا آیا میں اس بناء پر آپ کی اتباع کروں کہ آپ مجھے تعلیم دیں۔ یعنی انھوں نے اس اتباع کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا بجز اس کے وہ ان کو تعلیم دیں۔

حضرت خضر کے تعلیم دینے سے احتراز کی توجیہ

اس کے بعد فرمایا: اس بندہ نے کہا آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکیں گے اور آپ اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہیں جس کا آپ کے علم نے احاطہ نہیں کیا

متعلم کی دو قسمیں ہیں ایک وہ ہے جس نے پہلے بالکل کچھ نہ پڑھا ہو' ظاہر ہے استاذ اس کے سامنے مسئلہ کی جو بھی تقریر کرے گا اس کا شاگرد اس کو بلا چون و چرا تسلیم کرے گا' دوسری قسم وہ ہے جس نے پہلے کچھ پڑھا ہوا ہو اور اس کو اپنے پڑھے لکھے ہوئے پر مکمل اعتماد اور یقین ہو' یہ شخص استاذ کی اس بات کو تسلیم کرے گا جو اس کے پڑھے ہوئے کے مطابق ہوگی اور جو اس کے مخالف ہوگا اس کے قبول کرنے میں اس کو تامل ہوگا اور اس پر وہ اعتراض کرے گا' حضرت خضر (علیہ السلام) کو علم تھا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تشریع کے نبی ہیں اور جو بات ظاہر شرع کے مخالف ہوگی اس پر وہ اعتراض کریں گے' جب کہ حضرت خضر (علیہ السلام) تکوین کے نبی تھے اور ان کو معلوم تھا کہ ان کے کئی کام ظاہر شریعت کے خلاف ہوں گے اور ان پر حضرت موسیٰ اعتراض کریں گے اور اس طرح تعلیم اور تعلم کا یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکے گا' اس لیے انھوں نے پیش بندی کے طور پر پہلے ہی کہہ دیا کہ آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکیں گے اور آپ اس چیز پر کیسے صبر کر سکتے ہیں جس کا آپ کے علم نے احاطہ نہیں کیا۔

حضرت موسیٰ نے کہا آپ ان شاء اللہ عنقریب مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے حکم کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

اس پر یہ اعتراض ہے کہ صبر کا تعلق تو مستقبل کے ساتھ ہے اور ان کو معلوم نہیں تھا کہ مستقبل میں صبر ہو سکے گا یا نہیں اس لیے اس کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا صحیح ہے' لیکن حضرت خضر کی نافرمانی نہ کرنے کا عزم تو انھوں نے اسی وقت کر لیا تھا اس کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا صحیح نہ تھا' کیونکہ اسی چیز کے ساتھ ان شاء اللہ کہا جاتا ہے جس کا حصول غیر یقینی ہو' اس سے معلوم ہوا کہ ان کا اس وقت معصیت نہ کرنے کا عزم نہیں تھا ورنہ وہ اس کے ساتھ ان شاء اللہ نہ ملاتے' اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت بھی ان کا عزم تھا کہ وہ معصیت نہیں کریں گے یعنی اپنے مقصد اور ارادہ سے ان کی معصیت نہیں کریں گے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ بھول جائیں یا ان سے خطا سرزد ہو جائے اور اس پر وہ قادر نہیں

تھے کہ وہ نسیان اور خطا کو روک لیں اور انھوں نے حضرت خضر پر جو اعتراضات بھی کیئے تھے وہ نسیان ہی کی وجہ سے کیے تھے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امر کا تقاضا وجوب ہے کیونکہ حضرت موسیٰ نے فرمایا میں آپ کے امر کی معصیت نہیں کروں گا۔قرآن مجید میں ہے:

ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم ۔ (الجن: ۲۳)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے۔

اور یہ حضرت موسیٰ کی طرف سے بہت زیادہ تواضع ہے اور بہت بڑے تحمل اور حوصلہ کا اظہار ہے۔

تعلیم اور تعلم کے آداب

یہ تمام آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ تلمیذ اور متعلم پر واجب ہے کہ استاذ کے سامنے انتہائی ادب اور احترام کا اظہار کرے اور اگر استاذ کو ہی اندازہ ہو کہ متعلم پر تشدد اور سختی کرنا اس کے حق میں مفید ہوگا تو وہ ضرور اس کے اوپر تشدید اور سختی کرے ورنہ ہوسکتا ہے کہ تشدید نہ کرنے کی وجہ سے متعلم غرور اور تکبر میں مبتلا ہو جائے اور یہ اس کے حق میں مضر ہے۔

اس کے بعد حضرت خضر نے کہا پس اگر تم میری پیروی کر رہے ہو تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق اس وقت تک سوال نہ کرنا جب تک کہ میں خود اس کا ذکر نہ کروں۔

یعنی جب آپ کے نزدیک میرا کوئی کام قابل اعتراض ہو تو جب تک میں خود اس کی توجیہ نہ کروں آپ اس کے اوپر اعتراض نہ کریں اور یہی تعلیم اور تعلم کا ادب ہے، سبق میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی آگے چل کر خود بخود وضاحت ہو جاتی ہے اس لیے متعلم پر لازم ہے کہ وہ صبر سے کام لے اور جو بات بظاہر غلط معلوم ہو اس پر نہ ٹوکے حتیٰ کہ آگے چل کر استاذ خود اس کی وضاحت کردے گا۔ اگر حضرت موسیٰ حضرت خضر کی نصیحت پر کاربند رہتے تو ان کی صحبت طویل ہوتی اور اور بھی کئی عجیب وغریب واقعات پیش آتے، لیکن وہ اپنے شرعی منصب پر فائز ہونے کی وجہ سے خاموش نہ رہ سکے اور جب بھی کوئی بات بظاہر خلاف شرع ہوتی تو اس پر ضرور ٹوکتے اور یوں یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

اساتذہ اور علماء کی تعظیم اور ان کے حقوق کے متعلق احادیث اور آثار

حضرت عبادہ بن الصامت (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے اور ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے وہ میری امت سے نہیں ہے۔اس حدیث کی سند حسن ہے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۸۱۹، المستدرک ج۱ ص ۱۲۲، جمع الجوامع رقم الحدیث: ۱۸۰۹۹، مجمع الزوائد ج۱ ص ۱۲۷، مسند احمد ج ۵ ص ۳۲۳، الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۷۶۹۴)

حضرت ابو امامہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تین شخصوں کی تخفیف صرف منافق کرتا ہے، جو شخص اسلام میں سفید ریش ہو، عالم اور امام عادل۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۳۴۴۲، جمع الجوامع رقم الحدیث: ۱۰۸۵۸، الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۳۵۳۳، مجمع الزوائد ج ص ۱۲۷)

حضرت ابو امامہ باہلی (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے کسی بندہ کو کتاب اللہ کی ایک آیت کی تعلیم دی تو وہ اس بندہ کا مولیٰ ہے، وہ بندہ اس استاذ کو ناامید کرے نہ اس پر اپنے آپ کو ترجیح دے اگر اس نے ایسا

کیا تو اس نے اسلام کی گرہوں میں سے ایک گرہ کھول دی۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۵۲۸، الکامل لابن عدی ج۱ ص ۴۷۸، مجمع الزوائد ج۱ ص ۱۲۸، تذکرۃ الموضوعات رقم الحدیث: ۱۸، جمع الجوامع رقم الحدیث: ۲۲۴۶۳، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۳۸۴، فتح الباری ج۸ ص ۲۴۸، لاہور ۱۴۰۱ھ)

حضرت حماد انصاری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص نے کسی کو قرآن کی تعلیم دی تو وہ اس کا مولا ہے، وہ اس کو نامراد کرے نہ اس پر اپنے آپ کو فضیلت دے۔

(جمع الجوامع رقم الحدیث: ۲۴۶۱، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۳۸۲)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: علم سیکھو اور علم کے لیے طمانیت اور وقار حاصل کرو اور جس سے علم حاصل کیا ہے ان کے سامنے تواضع اور انکسار کرو۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۶۱۸۴، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۰ھ، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۶۱۸۰، مکتبہ المعارف ریاض، ۱۴۱۵، مجمع الزوائد ج۱ ص ۱۳۰)

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: علم سیکھو اور علم کے لیے طمانیت اور وقار حاصل کرو اور جس سے علم حاصل کرو اس کے سامنے مت اکڑو۔

(حلیۃ الاولیاء ج۶ ص ۳۴۲، کتاب الزہد لوکیع رقم الحدیث: ۲۷۵، جامع بیان العلم ج۱ ص ۵۰۱، رقم الحدیث: ۸۰۳، دار ابن الجوزیہ سعودیہ ۱۴۱۹ھ)

حضرت عمر (رض) نے فرمایا جن سے تم علم حاصل کرتے ہو ان کے سامنے عاجزی کرو اور جو تم سے علم حاصل کرتے ہیں وہ تمہارے سامنے عاجزی کریں اور تم اساتذہ پر حکم نہ چلاؤ اور تمہارے علم کے ساتھ جہالت کے کام نہ ہوں۔

(حاشیہ جامع بیان العلم وفضلہ ج۱ ص ۵۰۲، المدخل الی السنن للبیہقی ص ۳۳۳)

حضرت علی (رض) نے فرمایا عالم کا تم پر یہ حق ہے کہ تم مجلس میں لوگوں کو بالعموم سلام کرو اور عالم کو خصوصیت کے ساتھ علیحدہ سلام کرو، تم ان کے سامنے بیٹھو، ان کے سامنے ہاتھ سے اشارہ کرو اور آنکھوں سے اشارے کرو، جب وہ کوئی مسئلہ بتائے تو یہ نہ کہو کہ فلاں نے اس کے خلاف کہا ہے۔ اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرو نہ اس کی مجلس میں کسی سے سرگوشی کرو، اس کے کپڑے کو نہ پکڑو، جب وہ اکتا جائے تو اس کے پاس نہ جاؤ، اس کی لمبی معیت سے احتراز نہ کرو، کیونکہ وہ کھجور کے درخت کی طرح ہے، تم منتظر رہو کہ تم پر کب اس سے کوئی پھل گرتا ہے، کیونکہ مومن عالم کا اجر روزہ دار اور قیام کرنے والے عابد اور اللہ کی راہ میں مجاہد سے زیادہ ہے، اور جب عالم مرتا ہے تو اسلام میں ایسا سوراخ ہو جاتا ہے جس کو قیامت تک کوئی چیز بند نہیں کر سکتی۔

(جامع بیان العلم وفضلہ رقم الحدیث: ۹۹۴، ج۱ ص ۵۸۰، الجامع للخطیب رقم الحدیث: ۳۴۷، کنز العمال ج۱۰ ص ۲۰۰، احیاء العلوم ج۱ ص ۵۳)

طاؤس بیان کرتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ چار آدمیوں کی تعظیم اور توقیر کی جائے، عالم کی، سفید ریش کی، سلطان کی اور والد کی اور یہ جفا سے ہے کہ کوئی شخص اپنے والد کو اس کا نام لے کر بلائے۔

(مصنف عبدالرزاق ج۱۱ ص ۱۳۷، طبع قدیم، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۳۰۲، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)

ایوب بن الفریۃ نے کہا سب سے زیادہ تعظیم کے مستحق تین ہیں، علماء، بھائی اور سلطان، جس نے علماء کی بے ادبی کی اس کا دین فاسد ہو جاتا ہے اور بھائیوں کی توہین سے اس کی مروت فاسد ہو جاتی ہے اور سلطان کے استخفاف سے اس کا دین فاسد ہو جاتا ہے اور

عاقل ان میں سے کسی کی توقیر میں کمی نہیں کرتا۔

(جامع بیان العلم وفضلہ رقم الحدیث: ۹۹۶، ج ۱ ص ۵۸۱، مطبوعہ دار ابن الجوزیہ السعودیہ ۱۴۱۹ھ)

اساتذہ اور علماء کی تعظیم اور توقیر کے متعلق فقہاء اور علماء کے اقاویل

امام محمد بن غزالی متوفی ۵۰۵ھ لکھتے ہیں:

شاگرد کو چاہیے کہ استاذ کو کسی چیز کا حکم نہ دے بلکہ اپنے تمام معاملات کی لگام استاذ کو بالکلیہ سونپ دے، اور جس طرح جاہل مریض مشفق اور حاذق طبیب کی خیر خواہی پر یقین رکھتا ہے اسی طرح استاذ کی خیر خواہی پر یقین رکھے۔ اور اپنے استاذ کے سامنے عاجزی کرے اور اس کی خدمت کر کے شرف اور ثواب کو حاصل کرے۔ جس طرح حضرت ابن عباس (رض) نے حضرت زید بن ثابت کی رکاب تھام لی تھی، اور استاذ کے سامنے تکبر نہ کرے، اور اس سے استفادہ کرنے کی عار نہ سمجھے، وہ جو کچھ کہے اس کو توجہ سے سنے، اس سے خوش رہے، اس کا شکر ادا کرے اور اس کا احسان مانے، استاذ کے نظریات کی تقلید کرے، اس کے سامنے اپنی رائے کو چھوڑ دے کیونکہ استاذ کی خطاء اس کی صحت سے زیادہ نفع آور ہے، کیونکہ باریک بینی اور تجربہ کی باتیں زیادہ مفید ہوتی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور حضرت خضر (علیہ السلام) کے قصہ میں متنبہ فرمایا ہے، اس لیے استاذ سے استفادہ کرنے کی شرط یہ ہے کہ اس کے سامنے خاموش رہے اور اس پر اعتراض نہ کرے، جب تک استاذ خود اس کو نہ بتائے۔ پھر امام غزالی نے حضرت علی (رض) کی نصیحت کو لکھا جس کو ہم ذکر چکے ہیں۔

(احیاء علوم الدین ج ۱ ص ۵۳۔ ۵۲، ملخصاً مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۹ھ)

امام ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن بن عبد الملک القشیری المتوفی ۴۶۵ھ لکھتے ہیں:

مرید کے لیے اپنے شیخ سے، شاگرد کے لیے اپنے استاذ سے اور عام آدمی کے لیے عالم اور مفتی سے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ مجھے آپ کے قول سے یا آپ کی رائے سے یا آپ کے فتویٰ سے اختلاف ہے۔

(لطائف الاشارات ج ۲ ص ۲۲۸، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۰ھ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

جو استاذ کامل اور متبحر ہو اس کے سامنے شاگرد کو اعتراض نہیں کرنا چاہیے اگر اس نے تین مرتبہ سے زیادہ اعتراض کیے تو پھر ان میں انقطاع ہو جائے گا جیسا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر (علیہما السلام) کے قصہ میں ہوا۔

(تفسیر کبیر ج ۷ ص ۴۸۴، مطبوعہ دار الکتب احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ بدر الدین محمود بن عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

استاذ کا سفر میں خدمت کے لیے اپنے کسی شاگرد کو ساتھ لے جانا درست ہے! اور یہ تعلیم کا عوض نہیں ہے، جیسے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اپنے ساتھ حضرت یوشع بن نون کو لے گئے تھے۔

(عمدۃ القاری ج ۲ ص ۹۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

ہر حال میں تواضع کو لازم رکھنا چاہیے، اسی وجہ سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) باوجود کلیم اللہ ہونے کے حضرت خضر (علیہ

السلام) کے پاس گئے اور ان سے علم کو طلب کیا تاکہ ان کی امت بھی ان کی سیرت پر عمل کرے۔

(فتح الباری ج۱ ص ۲۴۸، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۲۱ھ)

علامہ اسماعیل حقی حنفی متوفی ۱۱۳۷ھ لکھتے ہیں:

امام ابو منصور ماتریدی متوفی ۳۳۰ھ نے التاویلات النجمیہ میں فرمایا ہے: شاگرد اور مرید کے آداب میں سے یہ ہے کہ وہ تواضع اور انکسار کرتے ہوئے اور اپنے شیخ اور استاذ کی تعظیم کرتے ہوئے اس سے استفادہ کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے اجازت طلب کرے، اور اس کا استاذ اور شیخ جس چیز کا حکم دے اس پر عمل کرے اور جس سے منع کرے اس سے باز رہے، کیونکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے کلیم تھے، نبی اور رسول تھے، حضرت جبرائیل (علیہ السلام) ان کے پاس آتے تھے، ان پر تورات نازل کی گئی تھی وہ اللہ سے کلام کرتے تھے، بنی اسرائیل ان کی اقتداء کرتے تھے، اس کے باوجود انھوں نے حضرت خضر کی اتباع کی، اور ان کے سامنے تواضع اور انکسار کو اختیار کیا، اپنے اہل اور متبعین کو چھوڑا اور اپنے تمام مناصب اور مناقب کو ترک کیا اور حضرت خضر (علیہ السلام) کی ارادت کے دامن کو پکڑ لیا اور ان کے اوامر اور نواہی کی اطاعت کی۔

نیز امام ابو منصور ماتریدی نے فرمایا شاگردی کے آداب میں سے یہ ہے کہ اگر استاذ اس کو بار بار رد کرے اور اپنی شاگردی میں لینے سے انکار کرے پھر بھی اس کے دامن کو نہ چھوڑے کیونکہ حضرت خضر (علیہ السلام) نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے فرمایا: آپ میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکیں گے اور آپ اس چیز پر صبر کیسے کر سکتے ہیں جس کا آپ کے علم کے احاطہ نہیں کیا موسیٰ نے کہا آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے حکم کی نافرمانی نہیں کروں گے

(روح البیان ج۵ ص ۳۲۷، ۳۲۶، داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۱ھ)

نیز علامہ اسماعیل حقی حنفی لکھتے ہیں:

اسکندر سے پوچھا گیا اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ اپنے والد سے زیادہ اپنے استاذ کی تعظیم کرتے ہیں، اسکندر نے جواب دیا میرے والد مجھے آسمان سے زمین کی طرف لائے اور میرے استاذ مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان کی طرف لے گئے۔

بزرجمہر سے پوچھا گیا اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ اپنے والد سے زیادہ اپنے استاذ کی تعظیم کرتے ہیں؟ اس نے کہا کیونکہ میرے والد میری حیات فانی کے سبب ہیں اور میرے استاذ میرے حیات باقی کے سبب ہیں۔

(روح البیان ج۷ ص ۹۵، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۲۱ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

عالم اور استاذ کے ساتھ ادب کا استعمال کرنا اور مشائخ کا احترام کرنا، اور ان کے اقوال، افعال اور ان کی حرکات پر اعتراض نہ کرنا اور ان کی مناسب تاویل کرنا مستحب ہے۔

(روح المعانی جز۱۶ ص ۳۱، مطبوعہ دارالفکر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

حافظ محمد بن محمد ابن البزار الکردری الحنفی المتوفی ۸۲۷ھ لکھتے ہیں:

نوجوان عالم دین بوڑھے غیر عالم پر مقدم ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

یرفع اللہ الذین امنوا منکم لا والذین اوتوا العلم درجٰت ط۔ (المجادلہ: ۱۱)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا ہے اللہ ان کے درجات بلند کرے گا۔

پس جن کے درجات کو اللہ بلند کرنے والا ہے جو ان کو پست اور نیچا کرے گا اللہ اسکو جہنم میں گرا دے گا' اور عالم غیر عالم قرشی پر مقدم ہے' اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی پر مقدم ہیں' حالانکہ داماد کا رشتہ خسر سے زیادہ قریب ہے' اور علامہ الزندویستی نے کہا عالم کا حق جاہل پر اور استاذ کا حق شاگرد پر برابر ہے' اور وہ یہ ہے کہ شاگرد استاذ سے پہلے کلام نہ کرے اور استاذ خواہ غائب ہو اس کی جگہ پر نہ بیٹھے' اس کی بات کو رد نہ کرے' چلنے میں اس سے آگے نہ بڑھے اور شوہر کا حق بیوی پر اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر جائز کام میں اس کی اطاعت کرے۔

(فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ٦ ص ٣٥٧' مطبوعہ مطبع امیریہ کبریٰ بولاق مصر' ١٣١٠ھ)

علامہ خیر الدین رملی حنفی متوفی ١٠٨١ھ نے بھی اس عبارت کو نقل کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ فقیر کو تصغیر کے ساتھ فقیہ پڑھنا کفر ہے۔

(فتاوی خیریہ علی ہامش تنقیح الفتاوی الحامدیہ ج ٢ ص ٣٦٣' المکتبۃ الحسبیہ کوئٹہ)

علامہ عثمان بن علی الزیلعی الحنفی المتوفی ٧٤٣ھ لکھتے ہیں:

علماء کو غیر علماء پر کیوں نہیں مقدم کیا جائے گا جب کہ قرآن مجید میں علی الاطلاق وارد ہے:

قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون ط۔ (الزمر: ٩)

آپ کہیے کہ کیا علم والے اور بغیر علم والے برابر ہو سکتے ہیں۔

اسی وجہ سے نماز میں عالم کو مقدم کیا جاتا ہے حالانکہ ایمان لانے کے بعد سب سے پہلے نماز پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٣٦٤١' سنن ترمذی رقم الحدیث: ٢٦٨٢' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٢٢٣) (تبیین الحقائق ج ٦ ص ٢٢٩' مکتبہ امدادیہ ملتان)

اور علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ١٢٥٢ھ نے اور علامہ حصکفی حنفی متوفی ١٠٨٨ھ نے بھی ان عبارات کا خلاصہ لکھا ہے۔

(الدر المختار و رد المختار ج ١٠ ص ٤٠٥۔٤٠٤' دار احیاء التراث العربی بیروت' ١٤١٩ھ)

استاذ کی تعظیم و تکریم کے متعلق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی کے دلائل:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ' استاذ کے حقوق اور اس کی تعظیم و تکریم کے متعلق فرماتے ہیں:

(١) حضرت ابوہریرہ رضی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٨١١' سنن الترمذی رقم الحدیث: ١٩٥٤)

اور اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

لئن شكرتم لأزيدنكم ولئن كفرتم ان عذابي لشديد (ابراهيم: ٧)

اگر تم شکر کرو گے تو میں تم کو زیادہ (نعمتیں) دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اور استاذ نے شاگرد کو جو تعلیم کی نعمت دی ہے اس کا شکر یہ ہے کہ اس کی خدمت اور اس کی تعظیم و تکریم کی جائے اور اگر اس کے خلاف کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وعید ہے۔

(۲) استاذ کے حقوق سے انکار کرنا' نہ صرف مسلمانوں کے اجماع کے خلاف ہے بلکہ تمام عقل والوں کے اتفاق کے خلاف ہے۔

(۳) استاذ کی تعظیم اور اس کی خدمت نہ کرنا اس کے احسان کا انکار کرنا ہے' حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کسی کی نیکی کو حقیر نہ جانو خواہ وہ تم سے مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ملتا ہو (یعنی اس کی اس نیکی کو بھی معمولی نہ سمجھو)۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۶۲۶)

(٤) استاذ کی نیکیوں کو حقیر جانا قرآن' حدیث اور فقہ کو حقیر جاننا ہے جن کی اس نے تعلیم دی ہے اور ان کو حقیر جاننا کفر ہے۔

(٥) استاذ کا حق ماں باپ کے حق سے زیادہ کیونکہ ماں باپ سے بدنی حیات ملی اور استاذ سے روحانی حیات ملی۔

(٦) حضرت علی نے فرمایا جس نے مجھے ایک حرف پڑھایا اس نے مجھے اپنا غلام بنا لیا خواہ وہ مجھے فروخت کر دے یا آزاد کر دے اور استاذ کی نافرمانی کرنا غلام کے بھاگنے کے مترادف ہے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۵۲۸' مجمع الزوائد ج ۱ ص ۱۲۸' مسند الشامیین رقم الحدیث: ۸۱۸)

(۷) امام طبرانی اور امام ابن عدی نے حضرت ابو ہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: علم حاصل کرو' طمانیت اور وقار کے لیے علم حاصل کرو اور جس سے علم حاصل کرو ان سے عاجزی کرو

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۵۲۸' الکامل لابن عدی ج ۱ ص ٤۷۸)

کتنے شاگرد استاذ کی برکت اور اس کا فیض حاصل کرنے کے لیے اس کے پیروں کی خاک اپنے چہروں پر ملتے تھے۔

(۸) استاذ کا شاگرد پر حق یہ ہے کہ استاذ کی غیر موجودگی میں بھی شاگرد اس کی جگہ پر نہ بیٹھے' اس کے کلام کو رد نہ کرے اس کے آگے نہ چلے' اس کو علامہ شامی نے بزازیہ کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

(۹) جب استاذ سے آگے چلنا بھی جائز نہیں ہے تو استاذ کی نافرمانی کرنا اور اس کی تحقیر کرنا کب جائز ہوگا۔

(۱۰) استاذ کی دل آزادی کرنا اور اس کو رنج پہنچانا حرام ہے کیونکہ یہ ایک مسلمان کو ایذا دینا ہے اور مسلمانوں کو ایذا پہنچانا حرام' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[illegible] و [illegible]

[illegible] : [illegible])

جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر کسی جرم کے ایذاء پہنچاتے ہیں وہ ان پر بہتان باندھتے ہیں اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

اور حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا جس نے کسی مسلمان کو ایذاء دی اس نے مجھے ایذاء دی اور جس نے مجھے ایذاء دی اس نے اللہ کو ایذاء دی۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۳٦۳۲' ریاض)

(۱۱) استاذ کی بے توقیری کرنا ایک مسلمان کے لیے موجب تذلیل ہے اور مسلمان کی تذلیل حرام ہے' حضرت سہل بن حنیف (رض) اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کے سامنے کسی مومن کو ذلیل کیا گیا اور اس نے اس کی مدد نہیں کی جب کہ وہ اس کی مدد پر قادر تھا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سامنے ذلیل کر دے گا۔

(مسند احمد ج ۳ ص ٤۸۷)

(۱۲) عالم اور استاذ کی بے توقیری کرنے کی ایک وجہ اس سے حسد کرنا ہے اور حسد حرام ہے۔حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: حسد کرنے سے اجتناب کرو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۹۰۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۱۰، مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۳۶۵۶)

(۱۳) استاذ کی توقیری کرنا ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

الا لعنة الله علی الظلمین۔ (ھود: ۱۸)

سو ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

(۱۴) جو شخص استاذ کی عزت نہیں کرتا وہ اپنے بڑوں کی بے توقیری کرتا ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جو شخص ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے اور ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے وہ میری امت سے نہیں۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۸۱۹)

(۱۵) جو شخص بزرگ عالم دین کی عزت نہ کرے اس پر وعید فرمائی۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۷۸۱۹)

(۱۶) وہ علماء اور اساتذہ جو بالخصوص سادات ہوں ان کی تعظیم اور تکریم واجب ہے، حضرت علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس نے میرے اہل بیت، انصار اور عرب کا حق نہیں پہچانا یا تو وہ منافق ہوگا یا ولد الزنا ہوگا، یا وہ ہوگا جس کا حمل اس کی ماں کو ناپاکی کی حالت میں ہوا ہو۔

(الفردوس بماثور الخطاب رقم الحدیث: ۵۹۵۵)

(۱۷) جو عالم دین سید اور متقی ہو وہ تعظیم اور تکریم کا مستحق ہے اور اس کی بے توقیری اللہ کی حدود سے تجاوز کرنا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن یتعد حدود الله فقد ظلم نفسه۔ (الطلاق: ۱)

جس شخص نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰/۱ ص ۲۲۔۱۹ ملخصا وموضحا ومخرجاً، مطبوعہ دار العلوم امجدیہ، مکتبہ رضویہ کراچی ۱۴۱۲ھ)

ذکرِ اللہ کب

فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ﴿۱۷﴾ (سورۃ الروم: آیت 17)

پس اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھا کرو جب کہ تم شام کرو اور جب صبح کرو۔

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1:

اس میں تین قول ہیں:

(1) ان اوقات میں عبادت کے امر اور نماز پر برانگیختہ کرنے کے ساتھ مومنوں کو خطاب ہے حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: قرآن میں پانچ نمازوں کا ذکر ہے

(2) آپ سے عرض کی گئی کہاں؟ فرمایا اللہ کا فرمان ہے: اس سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز ہے۔ مراد صبح کی نماز ہے، عصر کی نماز، مراد ظہر کی نماز، یہ ضحاک اور سعید بن جبیر کا قول ہے: حضرت ابن عباس (رض) اور قتادہ کا قول ہے: آیت میں چار نمازوں پر تنبیہ ہے مغرب، صبح، عصر اور ظہر علماء نے کہا عشاء اور ایک اور آیت میں ہے۔ (ہود 114) اور پردہ کے اوقات میں ہے۔ نحاس نے کہا: اہل تفسیر کا کہنا ہے کہ یہ آیت نمازوں کے متعلق ہے میں نے حضرت علی بن سلیمان کو کہتے ہوئے سنا اس کی حقیقت میرے پاس ہے نمازوں میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو کیونکہ تسبیح نماز میں ہوتی ہے۔ یہ دوسرا قول ہے

(۳) اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو۔ ماوردی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ پہلا قول ذکر کیا ہے اس میں لفظ ہے: اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھو جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو نماز کو تسبیح کا نام دینے کی دو وجہ ہیں:

(1) نماز رکوع اور سجود میں تسبیح کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔

(2) یہ سبحہ سے ماخود ہے سبحہ کا معنی نماز ہے۔ اسی معنی میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے القیامۃ قیامت کے روز ان کی نماز نہیں ہوگی (1)۔

مسئلہ نمبر 2:

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات پر حمد کے درمیان یہ جملہ معترضہ ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے: کا معنی ہے نماز اسی کے لیے ہے کیونکہ حمد کی قرأت کے ساتھ خاص ہے پہلا قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد اللہ تعالیٰ کی ایک قسم کی تعظیم ہے اس کی عبادت پر برانگیختہ کرنا ہے اور اس کی نعمت کے دوام پر دلیل ہے یہ نماز کے علاوہ ایک قسم ہے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ نماز مغرب سے اس کا ذکر شروع کیا کیونکہ رات دن پر مقدم ہوتی ہے سورۃ اسراء میں ظہر کی نماز سے شروع کیا کیونکہ یہ پہلی نماز ہے جو جبرائیل امین نے پڑھی۔ ماوردی نے کہا: رات کی نماز کو تسبیح کے نام اور دن کی نماز کو حمد کے نام کے ساتھ خاص کیا کیونکہ انسان کو دن کے وقت میں مختلف کاموں میں ادھر ادھر جانا پڑتا ہے۔ جو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کو واجب کرتے ہیں رات میں خلوت ہوتی ہے جو تمام برائیوں سے اللہ تعالیٰ کی پاکی کو واجب کرتے ہیں اسی وجہ سے دن کے وقت حمد خاص ہوئی اس کے ساتھ دن کی نماز کا نام رکھا اور رات کے وقت تسبیح خاص ہوئی اس کے ساتھ رات کی نماز کا نام رکھا۔

مسئلہ نمبر 3:

عکرمہ نے پڑھا: اصل کلام یوں ہے تخفیف کے لیے فیہ کو حذف کر دیا اس میں گفتگو اس طرح ہے جس طرح اس ارشاد میں گفتگو ہے (البقرۃ 48) جوہری نے کہا: العش سے مراد مغرب کی نماز ہے رات کے ایک تہائی کا وقت ہے تو کہتا ہے کی تصغیر عشیان ہے یہ اپنے مکبر سے خلاف قیاس ہے گویا انھوں نے اس کی تصغیر عشیان بنائی اس کی جمع عشیانات ہے اس کی تصغیر میں عشیشان ہے جمع شیبیات ہے عشیۃ کی تصغیر عشیۃ ہے جمع عشیشیات ہے عشاء کسرہ اور مد کے ساتھ عشی کی مثل ہے عشاء ان سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز

ہے ایک قوم کا خیال ہے عشاء سے مراد سورج کے زوال سے لے کر طلوع فجر تک کا وقت ہے انھوں نے یہ شعر پڑھا۔
اس شعر میں بھی عشاء کا لفظ نصف النہار کے بعد سے لے کر اگلے دن کی صبح تک کا لیا گیا ہے۔
ماوروری نے کہا: عشاء سے مراد دن کا آخری پہر ہے جب سورج غروب ہونے کے لیے جھکے یہ عشاء العین سے ماخوذ ہے جس سے مراد آنکھ کے نور کا کم ہونا ہے جس طرح سورج کا نور کم ہو جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شاہد (گواہ) ہیں

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝٤٥

(سورۃ الأحزاب: آیت 45)

اے نبی! ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور ثواب کی بشارت دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کے حکم سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر اور مومنوں کو بشارت دیجئے کہ ان کے لیے اللہ کا بہت بڑا فضل ہوگا
(الاحزاب: ٤٦۔٤٥)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء اور آپ کی صفات

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ آیت نازل ہوئی یا یھا النبی انا ارسلنک شاھدا ومبشرا ونذیرا تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت علی اور حضرت معاذ (رض) کو بلایا آپ ان دونوں کو یمن کی طرف بھیجنے کا حکم دے چکے تھے، آپ نے فرمایا تم دونوں جا کر لوگوں کو بشارت دینا، اور ان کو متنفر نہ کرنا، اور آسان احکام بیان کرنا اور مشکل احکام نہ بیان کرنا، کیونکہ مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی ہے: اے نبی! ہم نے آپ کو آپ کی امت کے اوپر شاہد بنا کر بھیجا ہے، اور جنت کی بشارت دینے والا اور دوزخ سے ڈرانے والا اور لا الہ الا اللہ کی شہادت کی دعوت دینے والا اور قرآن کی روشنی دینے والا چراغ بنا کر۔
(المعجم الکبیر ج ١١ ص ٢٤٨، رقم الحدیث: ١١٨٤١، داراحیاء التراث العربی بیروت)

عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ میری حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) عنہما سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا مجھے بتائیے کہ تورات میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کیا صفات ہیں، انھوں نے کہا تورات میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بعض وہ صفات ہیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے:

یا یھا النبی انا ارسلنك شاهدا ومبشرا ونذیرا (الاحزاب: ٤٥)

اور آپ کو امیین کی پناہ بنایا، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے آپ بدمزاج اور سخت طبیعت نہیں ہیں اور بازاروں میں شور نہیں کرتے اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے ہیں، لیکن آپ معاف کر دیتے ہیں اور بخش دیتے ہیں، اور اللہ اس وقت تک آپ کی روح کو قبض نہیں کرے گا جب تک کہ آپ کی سبب سے ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہیں کر دیتا بایں طور کہ وہ سب کہیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اور جب تک آپ کے سبب سے اندھی آنکھوں اور بند کانوں اور مقفل دلوں کو کھول نہیں دیتا۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٤٨٣٨۔٢١٢٥، دارارقم بیروت)

علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چھ اسماء ہیں، شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ، سراج اور منیر۔

حضرت جبیر بن مطعم (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میرے پانچ اسماء ہیں، میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماحی (شرک اور کفر کو مٹانے والا) ہوں، اللہ میرے سبب سے کفر کو مٹائے گا اور میں حاشر ہوں، میرے قدموں میں لوگوں کا حشر کیا جائے گا اور میں عاقب ہوں (سب نبیوں کے بعد آنے والا)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۳۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۵۴)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام رؤف رحیم رکھا ہے۔ (التوبہ: ۱۲۸)

علام ابوبکر بن العربی نے احکام القرآن میں الاحزاب: ۱۳ کی تفسیر میں آپ کے سڑسٹھ (۶۷) اسماء ذکر کیے ہیں اور حضرت ابن عباس (رض) سے روایت ہے کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک سو اسی اسماء ہیں۔

(الجامع لا حکام القرآن جز ۱۴ ص ۱۸۲، دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

رسول اللہ ﷺ کا امت کے حق میں شاہد ہونا

اس آیت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو شاہد فرمایا ہے، اور شاہد کا معنی ہے گواہی دینے ولا، اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے شاہد ہونے کے چار محمل ہیں، ایک محمل یہ ہے کہ آپ اپنی امت کے حق میں قیامت کے دن گواہی دیں گے، دوسرا محمل یہ ہے کہ آپ لا الہ الا اللہ کی گواہی دینے والے ہیں اور تیسرا محمل یہ ہے کہ آپ دنیا میں امور آخرت کی گواہی دیں گے اور چوتھا محمل یہ ہے کہ آپ اعمال امت پر شاہد ہیں۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو اپنی امت کے حق میں گواہی دیں گے اس کا ذکر اس آیت میں ہے:

و کذلك جعلنکم امة وسطا لتکونوا شھدا آء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ (البقرہ: ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور یہ رسول تمہارے حق میں گواہ ہو جائیں۔

حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن ایک نبی آئے گا اور اس کے ساتھ ایک شخص ہوگا، اور ایک نبی آئے گا اور اس کے ساتھ دو شخص ہوں گے، اور ایک نبی آئے گا اس کے ساتھ زیادہ لوگ ہوں گے، اس سے کہا جائے گا کیا تم نے اپنی قوم کو تبلیغ کی تھی؟ وہ کہے گا ہاں! پھر اس کی قوم کو بلایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کیا انھوں نے تم کو تبلیغ کی تھی، وہ کہیں گے نہیں! پھر اس نبی سے کہا جائے گا تمہارے حق میں کون گواہی دے گا؟ وہ کہیں گے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت، پھر (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت کو بلایا جائے گا، اور کہا جائے گا: کیا انھوں نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر کہا جائے گا تم کو اس کا کیسے علم ہوا؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں یہ خبر دی تھی کہ (سب) رسولوں نے تبلیغ کی ہے، اور یہ اس آیت کی تفسیر ہے۔

(سنن کبری للنسائی ج ۶ ص ۲۹۲، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۱ھ)

اس آیت اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام امتوں کے احوال پر مطلع ہیں

اور آپ اپنی امت کے اعمال کا بھی مشاہدہ فرماتے ہیں کیونکہ آپ اپنی امت کی گواہی دیں گے اور گواہی میں اصل یہ ہے کہ مشاہدہ کر کے اور دیکھ کر گواہی دی جائے' اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷٤ھ بیان کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کے کچھ فرشتے سیاحت کرنے والے ہیں وہ مجھے میری امت کا سلام پہنچاتے ہیں' اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری حیات تمہارے لیے بہتر ہے تم باتیں کرتے ہو اور تمہارے لیے حدیث بیان کی جاتی ہے اور میری وفات (بھی) تمہارے لیے بہتر ہے' تمہارے اعمال مجھ پر پیش کیے جاتے ہیں۔ میں جو نیک عمل دیکھتا ہوں اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں' اور میں جو برا عمل دیکھتا ہوں اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔

(البدایہ والنہایہ ج ٤ ص ۲۵۷' طبع جدید' دار الفکر بیروت' ۱٤۱۹ھ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کی توحید اور ذات وصفات پر شاہد ہونا

شاہد ہونے کا دوسرا محمل یہ ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی توحید پر اور لا الہ الا اللہ پر شاہد ہیں اور آپ نے امت کو بھی یہ حکم دیا ہے کہ اللہ کی توحید اور اس کی ذات اور صفات کی شہادت دیں' اور آپ جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ذات اور صفات کی شہادت دیتے ہیں یہ آپ کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء اور رسل نے اور ان کی امتوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ذات اور صفات کی شہادت دی ہے' اور آپ کی اور باقی نبیوں اور رسولوں کی شہادت میں فرق یہ ہے کہ تمام نبیوں اور رسولوں نے اللہ کی توحید اور اس کی ذات وصفات کی شہادت فرشتوں سے سن کر دی ہے اور آپ نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی ذات وصفات کی شہادت دیکھ کر اور مشاہدہ کر کے دی ہے' بلکہ ساری کائنات اللہ کے واحد ہونے کی شہادت سن کر دیتی ہے اور آپ تنہا اور واحد ایسے شاہد ہیں جس نے اللہ کو دیکھ کر اس کے واحد ہونے کی شہادت دی ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں میں صرف آپ کو شاہد فرمایا ہے' آپ نے جس چیز کی بھی شہادت دی ہے وہ دیکھ کر اور مشاہدہ کر کے شہادت دی ہے' کرسی اور عرش ہو یا لوح وقلم ہو' فرشتے ہوں یا جنات ہوں یا جنت اور دوزخ ہو آپ نے ہر چیز کو دیکھ کر اور مشاہدہ کر کے شہادت دی ہے اور جیسے آپ شاہد ہیں کائنات میں ایسا کوئی دوسرا شاہد نہیں ہے۔

امام رازی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توحید پر شاہد بنایا ہے توحید کا مدعی نہیں بنایا کیونکہ جس چیز کا دعوی کیا جاتا ہے وہ خلاف ظاہر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید تو اس کائنات میں ظاہر ہے بلکہ اظہر من الشمس ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۹ ص ۱۷۳)

میں کہتا ہوں کہ اگر توحید ظاہر اور اظہر من الشمس ہوتی تو ساری دنیا اس کی منکر کیوں ہوتی اور اس کو منوانے کے لیے اتنے نبیوں اور رسولوں نے ظاہر کیا اور سب سے زیادہ ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی توحید کو آشکارا کیا' اللہ تو ہمیشہ سے واحد تھا لیکن اس کی توحید کے اتنے ماننے والے نہ تھے آپ نے اللہ کے واحد ہونے کی شہادت دی تو کائنات کی ہر حقیقت نے اللہ کو واحد کہا۔ آپ نے اللہ کی توحید کی شہادت دی اور اللہ نے آپ کی رسالت کی شہادت دی سو فرمایا:

فاشهدوا وانا معكم من الشهدين (آل عمران: ۸۱)

تم (بھی ان کی رسالت کے اقرار پر) گواہ ہو جاؤ اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

واللہ یعلم انک لرسولہ۔ (المنافقون: ۱)
اور اللہ خوب جانتا ہے کہ بیشک آپ ضرور اس کے رسول ہیں۔
وشاھد ومشھود۔ (البروج: ۳)
شاہد کی قسم اور مشہود کی قسم!
آپ اللہ کی توحید پر شاہد اور اللہ آپ کی رسالت پر شاہد ہے سو آپ شاہد بھی ہیں اور مشہود بھی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا دنیا میں امور آخرت پر شاہد ہونا

اور شاہد کا تیسرا محمل یہ ہے کہ آپ دنیا میں امور آخرت پر شاہد ہیں آپ جنت کے اور دوزخ کے شاہد ہیں اور میزان اور صراط کے شاہد ہیں' آپ نے جس کے جنتی ہونے کی شہادت دی اس پر جنت واجب ہوگئی اور جس کے دوزخی ہونے کی شہادت دی اس پر دوزخ واجب ہوگئی' آپ نے دس صحابہ کا نام لے کر فرمایا کہ وہ جنت میں ہیں۔اس سلسلہ میں یہ حدیث ہے:

حضرت عبدالرحمن بن عوف (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ابوبکر جنت میں ہیں' عمر جنت میں ہیں' عثمان جنت میں ہیں' سعید بن زید جنت میں ہیں' ابوعبیدہ بن الجراح جنت میں ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷٤۷' مسند احمد ج ۱ ص ۱۹۳' مسند ابویعلی رقم الحدیث: ۸۳٥' صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۷۰۰۲)

حضرت علی بن ابی طالب (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے منہ سے سنا ہے وہ فرما رہے تھے طلحہ اور زبیر دونوں جنت میں میرے پڑوس میں ہوں گے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷٤۱' المستدرک ج ۳ ص ۳٦٥' کتاب الضعفاء للعقیلی ج ٤ ص ۲۹٤' الکامل لابن عدی ج ۷ ص ۲٤۸۹)

حضرت زبیر (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا طلحہ نے اپنے لیے جنت کو واجب کرلیا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۳۸۔۱٦۹۲)

حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے جو شخص شہید کو زمین پر چلتے پھرتے دیکھنے سے خوش ہو وہ طلحہ بن عبیداللہ کو دیکھ لے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۳۹' سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱٤٥' حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۱۰۰)

اسی طرح جن لوگوں کے متعلق ہمارے نبی سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے دوزخی ہونے کی شہادت دی ان کا دوزخی ہونا واجب ہے' اس سلسلہ میں یہ احادیث ہیں:

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے دیکھا جہنم کی بعض آگ بعض کو کھا رہی تھی' اور میں نے عمرو بن لحی کو دیکھا وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹ رہا تھا اور یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے بتوں کے لیے اونٹنیوں کو نامزد کیا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٤٦۲٤' صحیح مسلم رقم الحدیث: بلاتکرار: ۹۰۱' رقم الحدیث المسلسل: ۲۰٥۷)

حضرت جابر (رض) سے ایک طویل حدیث کے آخر میں روایت ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میں نے

دوزخ میں ایک ڈھال والے شخص کو دیکھا جو اپنی ڈھال سے حجاج کے کپڑے چرایا کرتا تھا اگر کسی کو پتا چل جاتا تو وہ کہتا یہ کپڑا میری ڈھال میں اٹک گیا تھا' اور جب وہ شخص غافل ہوتا تو وہ کپڑا لے جاتا' اور میں نے دوزخ میں ایک عورت کو دیکھا جس نے بلی کو باندھ کر رکھا تھا' اس کو کچھ کھانے کو دیا اور نہ اس کو آزاد کیا کہ وہ زمین پر پڑی ہوئی کوئی چیز کھالیتی حتیٰ کہ وہ بلی بھوک سے مرگئی۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: بلا تکرار: ۹۰۴' رقم الحدیث المسلسل: ۲۰۶۷' سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۱۷۸)

رسول اللہ ﷺ کا اعمال امت پر شاہد ہونا

اور یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے شاہد ہونے کا چوتھا محمل ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا اللہ کے کچھ فرشتے سیاحت کرتے ہیں جو میری امت کی طرف سے سلام پہنچاتے ہیں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا میری زندگی تمہارے لیے بہتر ہے تم حدیث بیان کرتے ہو اور تمہارے لیے حدیث بیان کی جاتی ہے' اور وفات (بھی) تمہارے لیے بہتر ہے مجھ پر تمہارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں جو نیک عمل دیکھتا ہوں ان پر اللہ کی حمد کرتا ہوں اور میں جو برے عمل دیکھتا ہوں ان پر اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔

(مسند البزار رقم الحدیث: ۸۴۵' حافظ الھیثمی نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے' مجمع الزوائد ج ۹ ص ۲۴)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ کہا جائے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے زمانہ کے امتیوں کے اعمال پر شاہد تھے پھر تو بات بالکل واضح ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ بعد کے امتیوں کے اعمال پر بھی شاہد تھے تو اس میں یہ اشکال ہے کہ حضرت ابوبکر' حضرت انس' حضرت حذیفہ' حضرت سمرہ اور حضرت ابوبردہ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روایت کیا ہے کہ میرے اصحاب میں سے کچھ لوگ حوض پر وارد ہوں گے' حتیٰ کہ میں ان کو دیکھ کر اور پہچان کر کہوں گا اے رب میرے اصحاب! میرے اصحاب! پس مجھ سے کہا جائے گا آپ از خود نہیں جانتے کہ انھوں نے آپکے بعد دین میں کیا نئے کام نکالے ہیں! ہاں اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ کو یہ تو علم تھا کہ آپ کے بعد آپ کی امت کے لوگ کیا نیک کام کریں گے اور کیا برے کام کریں گے' لیکن آپ کو ان معین لوگوں کا علم نہیں تھا کہ کون نیک کام کرنے والے ہیں اور کون برے کام کرنے والے ہیں تاکہ اس حدیث اور مسند بزار کی عرض اعمال والی حدیث میں تطبیق ہوجائے' اس کا دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ کو نیکی کرنیوالے اور گناہ کرنے والے معین لوگوں کا بھی علم تھا لیکن قیامت کے دن آپ بھول گئے' اور بعض صوفیاء کرام نے یہ اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپکو بندوں کے اعمال پر مطلع فرمادیا تھا اور آپ نے ان کے اعمال کو دیکھا تھا اس لیے آپ کو شاہد فرمایا۔

مولانا جلال الدین رومی قدس سرہ العزیز نے مثنوی میں فرمایا:

در نظر بودش مقامات العباد زاں سبب نامش خدا شاھد نہاد

آپ کی نظر میں بندوں کے مقامات تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام شاہد رکھا

(روح المعانی جز ۲۲ ص ۶۵ ملخصاً مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۴۱۵ ھ)

ہمارے نزدیک اس اشکال کا صحیح جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں علم کی نفی نہیں ہے درایت کی نفی ہے کیونکہ فرشتے یہ نہیں کہیں گے انک لا تعلم بلکہ یہ کہیں گے انک لا تدری' اور درایت کا معنی ہے کسی چیز کو اپنی عقل اور قیاس سے جاننا یعنی آپ ان لوگوں

کے مرتد ہونے کو اپنی عقل اور اپنے قیاس سے نہیں جانتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم سے جانتے ہیں' باقی رہا یہ کہ پھر آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ یہ میرے اصحاب ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انھیں اصیحابی فرمانا عدم علم کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس لیے تھا کہ پہلے ان کو یہ امید ہو کہ ان کو پانی ملے گا اور پھر جب ان کو حوض سے دور کیا جائے گا اور ان کی امید ٹوٹے گی تو ان کو زیادہ عذاب ہوگا' دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اصحابی سے پہلے ہمزہ استفہام کا محذوف ہو' یعنی کیا یہ میرے صحابی ہیں؟ جن کے چہرے سیاہ' اعمال نامے بائیں ہاتھ میں' آنکھیں نیلی' چہرے تاریک اور مرجھائے ہوئے ہیں یہ میرے صحابہ ہیں؟ میرے اصحاب کے تو چہرے اور ہاتھ پیر سفید اور روشن ہیں ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں ہیں اور ان کے چہرے کھلے ہوئے اور شاداب ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں مومنوں اور کافروں کی جو علامتیں بیان کی گئی ہیں کہ ان کے چہرے سفید ہوں گے اور اعمال نمے دائیں ہاتھ میں ہوں گے اور کافروں کے چہرے سیاہ اور اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں ہوں گے ان علامتوں سے میدان محشر میں موجود ہر شخص کو علم ہوگا کہ مومن کون ہے اور کافر کون ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ علم نہ ہو کہ کون آپ کا صحابی ہے اور کون نہیں ہے۔ علاوہ ازیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر دنیا میں امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں سو آپ کو علم تھا کہ کون ایمان پر قائم رہا اور کون مرتد ہوگیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ تو دنیا میں امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں کہ میرے حوض پر ایسے ایسے لوگ آئیں گے سو آخرت کا علم تو دور کی بات ہے آنے دنیا میں ہی اپنے علم کی وسعت کا اظہار فرمادیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو سراج کہنے کی توجیہ

اس آیت میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سراج منیر فرمایا ہے اور سراج کا معنی ہے چراغ' اس پر یہ اعتراض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شمس کیوں نہیں فرمایا حالانکہ شمس کی روشنی چراغ سے زیادہ ہوتی ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوجاتا ہے اور ایک سورج سے دوسرا سورج نہیں بنتا' اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ہدایت سے آپ کے اصحاب بھی ھادی بن گئے' حدیث میں ہے میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاجاؤ گے۔

(مشکوۃ رقم الحدیث: ۶۰۱۸)

جنت کا حصول اللہ کا بہت بڑا فضل ہے

اسکے بعد فرمایا: اور مومنوں کو بشارت دیجئے کہ ان کے لیے اللہ کا بہت بڑا فضل ہوگا۔

بہت بڑے فضل سے مراد ہے اللہ تعالیٰ مومنوں کو جنت اور اس کی نعمتیں عطا فرمائے گا اور جنت اور اس کی نعمتیں اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے جیسا کہ اس آیت میں اس کی تصریح ہے:

والذین امنوا وعملوا الصلحت فی روضت الجنت ج لھم ما یشآؤن عند ربھم ط ذلك ھوالفضل الكبير (الشوری: ۲۲)

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے وہ جنتوں کے باغوں میں ہوں گے' وہ جو کچھ چاہیں گے وہ ان کو ان کے رب کے پاس ملے گا' یہی بہت بڑا فضل ہے۔

اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دوسری امتوں پر فضیلت اور شرف عطا فرمائے گا۔

اور اس کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جو اجر اور جنت عطا فرمائے گا اس کا سبب ان کے اعمال نہیں ہیں بلکہ یہ

محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کا احسان ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: صحیح عمل کرو اور صحت کے قریب عمل کرو اور لوگوں کو بشارت دو کیونکہ تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں! فرمایا مجھ کو بھی نہیں! سوا اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور (نیک) عمل کرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جس میں زیادہ دوام ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٤٦٧۔٦٤٦٤، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٨١٨)

اس حدیث میں اہل سنت کے مذہب پر دلیل ہے کہ کوئی شخص جنت اور ثواب کا اپنی عبادت کی وجہ سے مستحق نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت اور ثواب محض اپنے فضل سے عطا فرماتا ہے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی بعض آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنت کا سبب مسلمانوں کے اعمال ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون۔ (النحل: ٣٢)

اپنے ان (نیک) کاموں کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جاؤ جو تم کیا کرتے تھے۔

وتلك الجنة التی اور ثتموها بما کنتم تعملون۔ (الزخرف: ٧٢)

یہ وہ جنتیں ہیں جن کے تم اپنے (نیک) اعمال کی وجہ سے وارث کیے گئے ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اعمال دخول جنت کا ظاہری سبب ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فضل جنت میں دخول کا حقیقی سبب ہے، کیونکہ نیک اعمال اور ان کی ہدایت اور ان میں اخلاص اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر نہیں ہوتے اور ان نیک اعمال کو قبول کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت سے ہوتا ہے۔

سو ان آیات میں دخول جنت کی ظاہری سبب کا ذکر کیا گیا ہے اور حدیث مذکور میں دخول جنت کے سبب حقیقی کا ذکر کیا گیا ہے۔

حیض کے بیان میں

وَالّٰٓـِٔىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔىْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝٤

{سورۃ الطلاق آیت 4 پارہ 28}

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں اگر تم کو ان کی عدت میں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور وہ عورتیں جن کو حیض ابھی نہیں آیا (ان کی بھی یہی عدت ہے) اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے، اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے کام میں

آسانی کر دے گا یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اور جو اللہ سے ڈرے اللہ
اس کے گناہوں کو مٹا دے گا اور اس کے ثواب کو بڑھا دے گا"۔

(سورۃ الطلاق: ٥،٤)

جن بوڑھی عورتوں کو حیض نہیں آتا، ان کی عدت میں شک ہونے کے محامل جن عورتوں کو حیض آتا ہے ان کی عدت اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرما چکا ہے

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ (سورۃ البقرہ: ٢٢٨)
(طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔)

اور اس آیت میں بتایا ہے کہ جن عورتوں کو نابالغہ ہونے کی وجہ سے یا بڑھاپے کی وجہ سے حیض نہیں آتا ان کی عدت تین ماہ ہے۔ پھر اس آیت میں جو فرمایا ہے: اگر تم کو ان کی عدت میں شبہ ہو، اس کے تین محمل ہیں

١۔ مجاہد نے کہا: اگر تم کو معلوم نہ ہو جو عورت، حیض سے رک گئی ہے یا جس کا حیض شروع نہیں ہوا تو اس کی عدت تین ماہ ہے۔ زہری نے کہا: جو عورت بوڑھی ہے اور اس کو حیض میں شک ہے تو وہ تین ماہ عدت گزارے گی۔ اگر جوان عورت کو حیض نہ آئے تو دیکھا جائے گا، وہ حاملہ ہے یا غیر حاملہ، اگر متعین ہو جائے کہ وہ حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے، نہیں تو انتظار کیا جائے حتیٰ کہ حمل کا معاملہ صاف ہو جائے اور انتظار کی مدت ایک سال ہے۔

٢۔ ابن ابی کعب نے کہا: یا رسول اللہ! قرآن مجید میں بوڑھی عورت، نابالغہ اور حاملہ عورت کی عدت نہیں بیان کی گئی تو یہ آیت نازل ہوگئی۔

٣۔ عکرمہ نے کہا: اگر عورت کو مہینہ میں بار بار خون آتا ہے اور کئی مہینہ خون آتا رہتا ہے اور اس کو شک ہے اور یہ متعین نہیں ہوتا کہ یہ حیض کا خون ہے یا استحاضہ کا، یعنی یہ خون رحم سے آیا ہے یا بیماری کی وجہ سے کسی رگ سے آیا ہے تو پھر اس کی عدت تین ماہ ہے۔
علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری نے اسی آخری قول کو ترجیح دی ہے۔

(جامع البیان جز ٢٨ ص ١٨٠،١٧٩، دار الفکر، بیروت، ١٤١٥ھ)

نیز فرمایا ہے: اور حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے۔ علامہ ابن جریر طبری نے فرمایا: اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے۔ حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے۔

بیوہ حاملہ کی عدت میں اختلاف صحابہ

اس میں اختلاف ہے کہ جس حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے یا اس کی عدت وضع حمل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا مختار یہ ہے کہ اس کی عدت وضع حمل ہے، وہ کہتے تھے جو چاہے میں اس سے اس مسئلہ پر لعان کرنے کے لیے تیار ہوں کہ الطلاق: ٤ جس میں فرمایا: حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے، البقرہ: ٢٣٤ کے بعد نازل ہوئی ہے جس میں فرمایا ہے کہ بیوہ عورت کی عدت چار ماہ دس دن ہے اور وہ قسم کھا کر فرماتے: النساء القصریٰ (الطلاق) النساء الطولیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس یہ کہتے تھے کہ اس کی عدت زیادہ لمبی مدت ہے، یعنی اگر وضع حمل کی مدت چار ماہ سے زیادہ ہو تو وہ

اس کی عدت ہے اور اگر چاہ ماہ دس دن کی مدت وضع حمل کے عرصہ سے زیادہ ہوتو پھر وہ اس کی عدت ہے۔

(جامع البیان جز ۲۸ ص ۱۸٤، دار الفکر، بیروت، ۱٤۱۵ھ)

نابالغہ، بوڑھی اور حاملہ عورتوں کی عدت کے متعلق فقہاء احناف کی تصریحات:

علامہ علاؤ الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی حنفی لکھتے ہیں:

جس عورت کو کم عمر ہونے کی وجہ سے حیض نہیں آتا بایں طور کہ اس کی عمر نو سال سے کم ہو، اس کی عدت تین ماہ ہے یا جو عورت بوڑھی ہو اور سن ایاس کو پہنچ چکی ہو، اس کی عدت بھی تین ماہ ہے، یا جو عورت بالغہ ہو چکی ہو اور بار بار حیض آنے کے بعد اس کا طہر دائم ہو اور بوڑھی ہونے تک اس کو دوبارہ حیض نہ آیا اس کی عدت بھی تین ماہ ہے اور مہینوں کا اعتبار چاند کی تاریخوں کے حساب سے ہوگا۔

(دار مختار مع رد المختار ج ٥ ص ۱٤۹،۱٤٦ ملخصا، دار احیاء التراث العربی، بیرون، ۱٤۱۹ھ)

اور عدت وفات چاند کی تاریخوں کے اعتبار سے چار ماہ دس دن ہے اور حاملہ عورت کی عدت مطلقاً وضع حمل ہے، خواہ وہ عدت طلاق گزار رہی ہو یا عدت وفات۔

(الدر المختار مع رد المختار ج ٥ ص ۱۵۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ علاء الدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی الحنفی لکھتے ہیں:

رہی عدت حمل تو اس کی مقدار اتنی ہے جتنی مدت وضع حمل میں رہ گئی ہے، خواہ کم ہو یا زیادہ حتیٰ کہ عدت واجب ہونے کے ایک دن یا ایک گھنٹہ بعد بھی ولادت ہو جائے تو اس کی عدت پوری ہو جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا ہے:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (سورۃ الطلاق آیت ٤)

(اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔)

اور کتاب الاصل میں مذکور ہے کہ اگر میت تخت غسل پر ہو اور اس کی بیوی کے ہاں ولادت ہو جائے تو اس کی عدت پوری ہو جائے گی، پھر لکھتے ہیں:

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (سورۃ الطلاق آیت ٦)

تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ آیت مطلقہ کی عدت کے بارے میں ہے یا بیوہ کی عدت کے بارے میں؟ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا دونوں کے بارے میں ہے، اور سبیعہ بنت الحارث نے روایت کیا ہے کہ ان کے شوہر کی موت کے بیس اور کچھ دنوں کے بعد ان کو نکاح کرنے کی اجازت دے دی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٤۹۰۹، صحیح مسلم رقم الحدیث ۱٤۸۵، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۱۱۹٤)

نیز عدت سے مقصود یہ ہے کہ برأت رحم واضح ہو جائے اور تین حیض گزر جانے سے بھی برأت رحم واضح ہوتی ہے اور وضع حمل سے اس سے بھی زیادہ برأت رحم واضح ہوتی ہے، پس وضع حمل سے عدت کا پورا ہونا مہینوں کی بہ نسبت زیادہ وضح ہے اور قرآن مجید کی اس آیت میں عموم ہے۔

(بدائع الصنائع ج ٤ ص ٤۳۲،٤۳۰ ملخصا، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱٤۱۸ھ)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ کریمہ کے بیان میں

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ④

القلم ٤ میں فرمایا: بیشک آپ عظیم اخلاق پر فائز ہیں

"خلق" اور "خلق" کا معنی

"خلق" (خ پر زبر) کا معنی ہے: پیدا کرنا، عدم سے وجود میں لانا اور جسم کی ظاہری بناوٹ اور "خلق" (خ پر پیش) کا معنی ہے: انسان کی وہ جبلی اور طبعی صفات جن کا ادراک بصیرت سے کیا جاتا ہے۔

(المفردات ج ١ ص ٢١٠، مکتبہ نزار مصطفی، مکہ مکرمہ، ١٤١٨ھ)

حسن اخلاق کی تعلیم، تلقین اور تاکید کے متعلق احادیث

حضرت ابو ذر (رض) بان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو اور برا کام کرنے کے بعد نیک کام کرو جو اس برے کام کو مٹا دے، اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آؤ۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ١٩٨٧ یہ حدیث حدیث صحیح ہے)

حضرت ابو الدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن مومن کے میزان میں اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ بد اخلاق شخص سے بغض رکھتا ہے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ٢٠٠٢، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ٤٧٩٩)

حضرت ابو الدرداء (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز میزان میں نہیں رکھی جائے گی اور اچھے اخلاق والا نمازیوں اور روزہ داروں کے درجہ کو پالیتا ہے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ٢٠٠٣، اس حدیث کی سند صحیح ہے، الترغیب ج ٣ ص ٢٥٦، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ٤٧٩٨، مسند احمد ج ٦ ص ١٨٧)

حضرت ابو ہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سوال کیا گیا: وہ کونسا کام ہے جس کی وجہ سے زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: اللہ سے ڈرنا (تقویٰ) اور اچھے اخلاق، اور آپ سے سوال کیا گیا: وہ کون سے کام ہیں جن کی وجہ سے زیادہ لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: منہ اور شرم گاہ (منہ اور شرم گاہ میں حرام چیز کو داخل کرنا)

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ٢٠٠٤، اس کی سند حسن ہے، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ٤٢٤٦، المستدرک ج ٤ ص ٣٢٤، مسند احمد ج ٢ ص ٢٩١)

عبد اللہ بن المبارک نے خلق حسن کی یہ تعریف کی، لوگوں سے ہنستے مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے ملنا، نیکی کو پھیلانا اور برے کاموں سے باز رہنا۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ٢٠٠٥)

حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قیامت کے دن مجھے تم میں سب سے

زیادہ محبوب اور میری مجلس کے سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جس کے اخلاق تم میں سب سے زیادہ اچھے ہوں گے اور قیامت کے دن میرے نزدیک تم میں سے زیادہ مبغوض اور میری مجلس سے سب سے زیادہ دور وہ شخص ہوگا جو متکبر ہوگا۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۱۸، تاریخ بغداد ج ٤ ص ٦٣)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے محاسن اور اخلاق کے متعلق احادیث اور آثار

(۱) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلق عظیم کی تفسیر میں حضرت ابن عباس (رض) نے کہا: تمام ادیان میں آپ کا دین عظیم ہے اور آپ کے دین سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کوئی دین محبوب اور پسند نہیں ہے۔

(۲) ہشام بن عامر بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ (رض) سے کہا: اے ام المؤمنین! مجھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اخلاق کے متعلق بتائیں، حضرت عائشہ نے پوچھا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، حضرت عائشہ نے فرمایا: نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خلق قرآن تھا۔

(صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ ۱۳۹۔ باب۔ رقم الحدیث: ٧٤٦)

جن تمام چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، آپ ان پر عمل کرتے تھے اور جن تمام کاموں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ آپ ان سے باز رہتے تھے اور آپ کی پوری زندگی قرآن مجید کی عملی تصویر تھی، اگر آپ کی سیرت کو جامع مانع عبارت میں بیان کیا جائے تو وہ آیات قرآن ہیں اور اگر قرآن مجید کی آیات کو انسانی پیکر میں ڈھالا جائے تو وہ پیکر مصطفیٰ ہے۔

(۳) حضرت عائشہ (رض) سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلق کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے "قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ" (المؤمنون: ۱) سے لے کر دس آیتیں پڑھیں اور کہا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خلق سب سے اچھا تھا، آپ کو صحابہ اور اہل بیت میں سے جو بھی بلاتا، آپ فرماتے: لبیک، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ٤)

بیشک آپ عظیم اخلاق پر فائز ہیں

جو بھی عمدہ اخلاق تھے، وہ سب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں پائے جاتے تھے، نیز آپ کے خلق کو اس لیے عظیم کہا گیا ہے کہ آپ مکارم اخلاق کے جامع تھے۔ امام مالک نے روایت کیا ہے:

بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارم اخلاق کو مکمل کرنے کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔

(مؤطا امام مالک رقم الحدیث: ١٦٧٧)

(٤) حضرت ابن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مجھے میرے رب نے ادب سکھایا، سو اچھا ادب سکھایا۔ (الجامع الصغیر رقم الحدیث، ۱۳۰، حافظ سیوطی نے اس حدیث کو صحیح فرمایا ہے، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۱۸۹۵)

(٥) حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت کی، آپ نے کبھی مجھ سے اف نہیں کیا، اور میں نے جو کام کیا تو کبھی مجھ سے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا؟ اور میں نے جس کام کو ترک کیا تو کبھی مجھ سے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے اس کام کو کیوں ترک کیا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اخلاق سب سے اچھے

تھے اور کوئی ریشم آپ کے ہاتھوں سے زیادہ ملائم نہیں تھا، اور میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پسینہ کی خوشبو سے بڑھ کر کسی مشک اور عطر کی خوشبو نہیں سونگھی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۱۱، ۶۰۳۸، ۳۵۶۱، ۲۷۶۸، ۱۹۷۳ صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۳۰، ۲۳۱۰، ۲۳۰۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث ۴۷۷۴، ۴۷۷۳، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۰۵، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۷۹۴۶، مسند احمد ۳ ص ۱۹۵، ۱۷۴، ۱۲۴)

(۶) حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ طبعاً فحش گفتار تھے نہ تکلفاً، اور نہ بازار میں بلند آواز سے باتیں کرتے تھے، اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے تھے لیکن معاف کر دیتے تھے اور درگزر فرماتے تھے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۰۱۶، مسند احمد ج ۶ ص ۲۴۶، ۲۳۶، ۱۷۴، مصنف ابن بی شیبہ ج ۸ ص ۳۳۰)

(۷) حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، ماسوا جہاد فی سبیل اللہ کے، اور نہ آپ نے کبھی کسی خادم کو مارا اور نہ کسی عورت کو۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۲۸، مسند احمد ج ۲ ص ۲۸۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۳۶۸، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳۶۶۸، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۴۳۷۵، شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۱۳۴۹، المعجم الصغیر ج ۲ ص ۱۹)

(۸) حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کبھی کسی ظلم کا بدلہ لیتے ہوئے نہیں دیکھا، جب تک اللہ تعالیٰ کے محارم اور اس کی حدود میں سے کسی حد کو نہ توڑا جائے اور جب اللہ کے محارم میں کسی چیز کو پامال کیا جاتا تو آپ سب سے زیادہ غضب ناک ہوتے تھے، اور جب بھی آپ کو دو چیزوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ اس کو اختیار کرتے جو زیادہ آسان ہو بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۶۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۲۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۸۵، مسند احمد ج ۶ ص ۸۵، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۷۹۴۲، مسند ابویعلی رقم الحدیث ۴۳۷۵، مسند الحمیدی رقم الحدیث ۲۵۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۴۱۰، الادب المفرد رقم الحدیث: ۲۷۴، مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۱۴۸۱)

(۹) حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملنے کی اجازت طلب کی، اس وقت میں بھی آپ کے پاس تھی، آپ نے فرمایا: یہ اپنے قبیلہ کا برا شخص ہے، پھر آپ نے اس کو اجازت دے دی، جب وہ آیا تو آپ نے اس سے بہت نرمی سے بات کی، جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے اس شخص کے متعلق وہ فرمایا جو فرمایا تھا، پھر آپ نے اس سے بہت نرمی سے بات کی، آپ نے فرمایا: اے عائشہ! لوگوں میں سب سے برا شخص وہ ہے جس کو لوگ اس کی درشت کلامی (بدگفتاری) کی وجہ سے چھوڑ دیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث ۶۰۳۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۹۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۹۱، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۱۹۹۶، الادب المفرد رقم الحدیث: ۱۳۱۱، مصنف ابن بی شیبہ ج ۸ ص ۳۲۹، حلیۃ الاولیاء، ج ۶ ص ۳۳۵)

(۱۰) حضرت حسین بن علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اپنے ہم نشینوں کے ساتھ سیرت کے متعلق معلوم کیا، تو انھوں نے کہا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چہرے پر ہمیشہ بشاشت رہتی تھی، آپ بہت نرم مزاج تھے، آپ سے بات کرنا بہت سہل تھا، آپ بدمزاج اور سخت دل نہ تھے، نہ بدگفتار تھے، نہ لوگوں کے عیوب بیان کرتے تھے، نہ بخل کرتے تھے، فضول باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے، جو شخص آپ کے پاس کوئی امید لے

کر آتا آپ اس کو مایوس نہیں کرتے تھے اور کسی کو نامراد نہیں کرتے تھے، آپ نے اپنے لیے تین چیزوں کو چھوڑ دیا تھا، آپ بحث وتکرار، زیادہ باتوں اور بے مقصد کاموں میں نہیں پڑتے تھے، اور آپ نے لوگوں کے لیے بھی تین چیزیں چھوڑ دیں تھیں، آپ کسی شخص کی مذمت کرتے تھے اور نہ اس کا عیب نکالتے تھے، اور نہ کسی کی پوشیدہ چیز معلوم کرتے تھے، اور صرف اسی معاملہ میں بات کرتے تھے جس میں آپ کو ثواب کی امید ہوتی تھی، اور جب آپ گفتگو فرماتے تو آپ کے ہم مجلس اس طرح اپنے سروں کو جھکا لیتے جیسے ان کے سروں پر پرندے ہوں، اور جب آپ خاموش ہوتے وہ آپ سے کوئی بات کرتے تھے، اور وہ آپ کے سامنے کسی بات میں بحث نہیں کرتے تھے، اور جب کوئی شخص آپ سے بات کرتا تو سب اس کی بات ختم ہونے تک خاموش رہتے، جب آپ کے شرکائے مجلس ہنستے تو آپ ہنستے تھے اور جس چیز پر وہ تعجب کرتے آپ بھی اس پر تعجب کرتے تھے، جب کوئی اجنبی شخص سے بات کرتا یا سوال کرتا تو آپ صبر کرتے تھے، حتیٰ کہ اگر آپ کے اصحاب اس پر سختی کرتے تو آپ فرماتے: جب تم دیکھو کہ ضرورت مند اپنی حاجت کو طلب کر رہا ہے تو تم اس کے ساتھ نرمی کرو، آپ بغیر نوازش اور عطاء کے اپنی تعریف کو قبول نہیں کرتے تھے، ہاں! آپ کسی کو کچھ عطاء کرتے اور وہ آپ کی تعریف کرتا تو آپ قبول کر لیتے، آپ کسی کے کلام کو منقطع نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ وہ شخص حق سے تجاوز کرتا تو پھر اس کی بات کاٹ کر اس کو روکتے یا اٹھ جاتے۔ (شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳۵۲)

(۱۱) حضرت جابر بن بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی کسی شخص کے مانگنے پر "نہیں" نہیں فرمایا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۳۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۱۱، مسند احمد ج ۳ ص ۳۰۷، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱ ص ۵۱۵)

(۱۲) حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خیر کی بہت زیادہ سخاوت کرنے والے تھے، اور سب سے زیادہ سخاوت آپ رمضان کے مہینہ میں کرتے تھے حتیٰ کہ رمضان ختم ہو جاتا، آپ کے پاس حضرت جبرائیل (علیہ السلام) آتے تھے، آپ ان کے ساتھ قرآن مجید کو دہراتے تھے اور جب حضرت جبرائیل آپ سے ملتے تو آپ برسانے والی ہواؤں سے زیادہ سخاوت کرتے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶، ۱۹۰۲، ۳۳۲۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۰۸، سنن نسائی رقم الحدیث: ۲۰۹۵، مسند احمد ج ۱ ص ۲۳۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۹ ص ۱۰۱، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۱۸۸۹، حلیۃ الاولیاء ج ۵ ص ۳۶۲)

(۱۳) حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کل کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں کرتے تھے (یہ ابتدائی دور کی بات ہے ورنہ جب فتوحات کی کثرت ہوئی تو آپ ازواج مطہرات کو ایک سال کا غلہ اور چھوارے فراہم کرتے تھے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۰۵۱)

(۱۴) حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آ کر سوال کیا کہ آپ اس کو کچھ عطاء کریں، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میرے پاس اس وقت کوئی چیز نہیں ہے لیکن تم میری ضمانت پر خرید لو، میرے پاس مال آیا تو میں ادا کروں گا، حضرت عمر نے کہا: یارسول اللہ! آپ عطاء کر چکے ہیں اور جس پر آپ قادر نہیں ہیں اس کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکلف نہیں کیا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عمر کے قول کو ناپسند کیا، پھر انصار کے ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ خرچ کیجئے اور عرش والے سے مال میں کمی کا خوف نہ

کریں، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسکراتے اور آپ کے چہرے سے خوشی ظاہر ہوئی، اور آپ نے فرمایا: مجھے اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳۰۶، مسند البزار رقم الحدیث: ۳٦٦٤، کتاب العلمیہ ص ۵۳)

(۱۵) حضرت ربیع بنت معوذ ابن عفراء (رض) بیان کرتی ہیں: میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس کھجوروں کا ایک خوشا اور کچھ ککڑیاں یا جو لے کر گئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے دونوں ہاتھوں میں زیورات اور سونا دیا۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳۵۷، ۲۰٤، مسند احمد ج ٦ ص ۱۵۹ المعجم الکبیر ج ۲٤ ص ۲۷۳، رقم الحدیث: ٦۹٤)

(۱٦) حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہدیہ قبول کرتے تھے اور اس کے جواب میں ہدیہ دیتے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۵۸۵، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۵۳٦، مسند احمد ج ٦ ص ۹۰، سنن بیہقی ٦ ج ۱۸۰)

(۱۷) عمرۃ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ (رض) سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) گھر میں کیا کام کرتے تھے؟ انھوں نے کہا: آپ ایک بشر تھے، اپنے کپڑے صاف کر لیتے تھے، بکری کا دودھ دوھ لیتے تھے اور اپنے کام کرتے تھے۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳٤۳، الادب المفرد رقم الحدیث: ۵٤۱، مسند ابویعلی، رقم الحدیث: ٤۸۷۳، مسند احمد ج ٦ ص ۲۵٦)

(۱۸) حضرت عائشہ (رض) نے بیان کیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی جوتی مرمت کر لیتے تھے، اپنے کپڑے سی لیتے تھے اور جس طرح تم گھر کے کام کرتے ہو اسی طرح گھر کے کام کرتے تھے۔

(مسند احمد ج ٦ ص ۱۰۷، کتاب الزہد ج ۱ ص ۳۵، الادب المفرد رقم الحدیث: ۵۳۸، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲٤۸۹، شرح السنہ رقم الحدیث: ۳٦۷۵، الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص ۳٦٦)

(۱۹) حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر مجھے ایک پائے کی دعوت بھی دی جائے تو میں اس کو قبول کرلوں گا۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۱۳۳۸، مسند احمد ج ۳ ص ۲۰۹، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۲٦۸، ۱۰٦۵، سنن بیہقی ج ٦ ص ۱۷٦)

(۲۰) حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بڑھ کر کوئی شخص محبوب نہیں تھا اور وہ آپ کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ ان کو علم تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث ۲۷۵٤، مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۳۷۸٤، الادب المفرد الحدیث: ۹٤٦)

(۲۱) حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو کی روٹی اور پرانے گھی کی دعوت دی جاتی تو آپ اس کو قبول فرما لیتے، اور آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی اور آپ اس کو تاحیات چھڑا نہیں سکے۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳۳٤، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ٤۰۰۸، مسند احمد ص ۱۰۲، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۰٦۹، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۱۲۱۵، سنن نسائی رقم الحدیث: ٤٦۱۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲٤۳۷، مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۳)

(۲۲) حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئی اور کہنے لگی: مجھے آپ سے کام ہے، آپ نے فرمایا: تم مدینہ کے جس راستہ میں چاہو بیٹھ جاؤ، میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں گا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤۸۱۸، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۲٦، مسند احمد ج ۳ ص ۲۸۵، ۹۸، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۳٤۷۲)

(۲۳) حضرت زید بن ثابت (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی نازل ہوتی، تو آپ مجھے بلواتے

اور میں آ کر وحی لکھتا اور ہم جب دنیا کا ذکر کرتے تو آپ ہمارے ساتھ دنیا کا ذکر کرتے، اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تو آپ ہمارے ساتھ آخرت کا ذکر کرتے تو آپ ہمارے ساتھ دنیا کا ذکر کرتے تو آپ ہمارے ساتھ کھانے کا ذکر کرتے۔

(شمائل ترمذی رقم الحدیث: ۳۴۴، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۴۸۸۲، دلائل النبوۃ ج ۱ ص ۳۲۴، شرح السنۃ رقم الحدیث: ۳۶۷۹)

(۲۴) حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک شخص تھا جس کے کپڑوں پر زعفران کے رنگ کے نشان تھے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی شخص کے منہ پر ایسی بات کہتے تھے جو اس کو ناگوار ہو، آپ نے صحابہ سے فرمایا: تم اس شخص سے کہو کہ وہ ان نشانات کو دھولے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۱۸۲، مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۳، الادب المفرد رقم الحدیث: ۴۳۷، مسند ابویعلیٰ رقم الحدیث: ۴۲۷۷)

(۲۵) حضرت حسین بن علی (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے گھر کے اندر جاتے تھے تو آپ کے کیا معمولات تھے؟ انھوں نے کہا: جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے گھر میں جاتے تھے تو آپ اپنے وقت کے تین حصے کرتے تھے، ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے، ایک حصہ گھر والوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اور ایک حصہ اپنی ذات کے لیے، پھر جو حصہ اپنی ذات کے لیے تھا اس کو اپنے اور لوگوں کے درمیان تقسیم فرماتے، پس اپنے خصوصی فیوض کو خاص صحابہ کے وسیلہ سے عام مسلمانوں تک پہنچا دیتے اور ان سے کوئی چیز روک کر نہ رکھتے، اور جو وقت حصہ امت کے لیے تھا، اس میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ اصحاب فضلیت کو گھر میں آ کر ملاقات کرنے کی اجازت دیتے اور ان کی دینی فضلیت کی ترتیب کے اعتبار سے ان پر وقت کو تقسیم کرتے، ان میں سے کسی کو ایک چیز کی ضرورت ہوتی، کسی کو دو چیزوں کی ضرورت ہوتی اور کسی کو بہت ضروریات ہوتیں، آپ ان کی ضروریات پوری کرنے میں مشغول ہوتے، اور ان کو ان کی اپنی اور باقی امت کی اصلاح کے کاموں میں مصروف رکھتے اور ان سے ان کے مسائل معلوم کرتے، اور ان کے حسب حال ان کو ہدایات دیتے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فرماتے: تم میں سے حاضر، غائب تک یہ ہدایات پہنچا دے اور تم میرے پاس ایسے شخص کی حاجت بھی پہنچا دیا کرو جو اپنی حاجت خود نہیں پہنچا سکتا، کیونکہ جو شخص کسی ایسے انسان کی حاجات صاحب اختیار تک پہنچاتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو ثابت قدم رکھے گا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایسی ہی چیزوں کا ذکر کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ اور کسی (فضول) بات کو آپ قبول نہیں کرتے تھے، مسلمان آپ کے پاس علم کی طلب لے کر آتے تھے اور جب واپس جاتے تھے تو علم کا ذائقہ چکھ چکے ہوتے تھے اور نیکی کے رہنما بن چکے ہوتے تھے، پھر حضرت حسین (رض) نے اپنے والد (رض) سے پوچھا: گھر سے باہر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے کیا معمولات تھے؟ حضرت علی (رض) نے بتایا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) صرف بامقصد کلام کرتے تھے، صحابہ کی تالیف کرتے تھے اور ان سے انسیت رکھتے تھے، ان کو متنفر نہیں کرتے تھے، آپ ہر قوم کے معزز آدمی کی تکریم کرتے اور اس کو اس کی قوم کا حاکم بنا دیتے، آپ لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈراتے اور لوگوں کے شر سے خود کو محفوظ رکھتے، اپنے اصحاب کے حالات کی تفتیش کرتے اور یہ معلوم کرتے کہ عام لوگ کس حال میں ہیں، اچھی چیز کی تحسین اور تقویت کرتے اور بری چیز کی مذمت کرتے اور اس کو کم زور زیادہ کرتے، آپ ہمیشہ میانہ روی سے کام لیتے اور مسلمانوں کے احوال سے غافل نہ رہتے، مبادا وہ غافل اور سست

ہو جائیں یا اکتا جائیں، ہر حالت کے لیے آپ کے پاس مکمل تیاری ہوتی، آپ حق بات میں تقصیر کرتے نہ تجاوز کرتے، مسلمانوں میں سے بہترین لوگ آپ کے ہم مجلس ہوتے، جو شخص لوگوں کا زیادہ خیر خواہ ہوتا وہ آپ کے نزدیک افضل ہوتا، اور جو شخص لوگوں کے ساتھ زیادہ نیکی کرتا اور ان سے اچھا سلوک کرتا وہ آپ کے نزدیک بڑے درجہ والا ہوتا، حضرت حسین (رض) نے اپنے والد (رض) سے پوچھا: آپ کی مجلس کیسی ہوتی تھی؟ انھوں نے کہا: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہر نشست برخواست کرنے کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے، جب آپ کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو جس جگہ مجلس ختم ہوتی تھی وہاں بیٹھ جاتے تھے، اور مسلمانوں کو بھی اسی بات کا حکم دیتے تھے، اور اپنے ہم نشینوں میں سے ہر ایک کو اس کا حصہ دیتے تھے، اور آپ کا کوئی ہم نشین یہ گمان نہیں کرتا تھا کہ کوئی اور شخص آپ کے نزدیک اس سے زیادہ معزز ہے، جب کوئی شخص آپ کے پاس بیٹھتا یا آپ سے گفتگو کرتا تو جب تک وہ خود نہ چلا جاتا آپ بیٹھے رہتے اور جو شخص آپ کے پاس اپنی حاجت پیش کرتا آپ اس کی حاجت پوری فرماتے یا نرمی سے عذر بیان کرتے، آپ کی خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سب لوگوں کے لیے عام تھی، آپ سب مسلمانوں کے لیے بہ منزلہ باپ تھے اور آپ کی مجلس میں آپ کے نزدیک سب لوگوں کے حقوق یکساں تھے، آپ کی مجلس علم، حیا، صبر اور امانت کی مجلس تھی، اس میں نہ آوازیں بلند ہوتی تھیں اور نہ کسی پر عیب لگایا جاتا تھا، اگر بالفرض کسی سے غلطی ہو جائے تو اس کا آشکارا نہیں کیا جاتا تھا، آپ کے نزدیک تمام مجلس والے برابر تھے، بلکہ ان کو تقویٰ کی وجہ سے دوسروں پر برتری حاصل ہوتی تھی، وہ سب منکسر اور متواضع تھے، مجلس میں بڑوں کی تعظیم کرتے تھے اور چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے، ضرورت مندوں کے لیے ایثار کرتے تھے اور مسافر کے حقوق کا خیال رکھتے تھے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۷۵٤، مسند احمد ج ۳ ص ۱۳۲، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث: ۳۷۸٤، الادب المفرد رقم الحدیث: ۹٤۶)

(۲۶) حضرت سہل (رض) بیان کرتے ہیں: ایک عورت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس ایک چادر لے کر آئی جس کے کناروں پر بنائی کی ہوئی تھی، اس نے کہا: میں نے اس چادر کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہے تا کہ میں آپ کو پہناؤں، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو چادر کی ضرورت تھی، آپ نے اس عورت سے وہ چادر لے لی، پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو تہبند کے طور باندھ کر آئے، ایک شخص نے اس چادر کی تحسین کی اور کہا: یہ بہت اچھی چادر ہے آپ یہ چادر مجھے دے دیں، مسلمانوں نے اس شخص سے کہا: تم نے اچھا نہیں کیا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ضرورت کی وجہ سے اس چادر کو پہنا تھا، پھر تم نے آپ سے وہ چادر مانگ لی، حالانکہ تم کو معلوم ہے کہ آپ کسی کا سوال رد نہیں کرتے، اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے پہننے کے لیے یہ چادر نہیں مانگی، میں نے تو اپنا کفن بنانے کے لیے یہ چادر مانگی ہے، حضرت سہل نے کہا: پھر وہ چادر اس کا کفن بن گئی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۲۷۷)

(۲۷) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی (دیہاتی) نے مسجد میں پیشاب کر دیا، لوگ اس کو مارنے کے لیے جھپٹے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، اور اس کے پیشاب کے اوپر ایک یا دو ڈول پانی بہاؤ، کیونکہ تم آسانی کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦١٢٨، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸٤)

(۲۸) حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ یہودیوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آ کر کہا: السام علیکم (تم پر موت آئے)، حضرت عائشہ نے کہا: تم پر موت آئے، اور تم پر اللہ کی لعنت ہو اور تم پر اللہ کا غضب ہو۔ آپ نے فرمایا: اے عائشہ! رک جاؤ، تم نرمی کو لازم رکھو اور تم موجب عار باتوں اور بدکلامی سے اجتناب کرو۔ حضرت عائشہ نے کہا: کیا آپ نے سنا نہیں انھوں نے کیا کہا تھا؟ آپ نے فرمایا میں نے ان کی بات ان پر لوٹا دی تھی اور ان کے متعلق میری دعا قبول ہو گی اور میرے متعلق ان کی دعا قبول نہیں ہو گی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۳۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۱۶۵)

(۲۹) حضرت انس ابن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ کی باندیوں میں سے کوئی باندی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی وہاں لے جاتی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۷۲)

(۳۰) حضرت جابر بن عبداللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ نجد کی طرف ایک غزوہ میں گئے، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) واپس آئے تو وہ بھی آپ کے ساتھ واپس آ گئے، ایک وادی جس میں بہت زیادہ درخت تھے وہاں سب کو نیند آ گئی، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہاں ٹھہر گئے اور لوگ منتشر ہو کر درختوں کے سائے میں آرام کرنے لگے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایک درخت کے نیچے اترے، اور اپنی تلوار درخت پر لٹکا دی، اور ہم لوگ سو گئے۔ اچانک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں بلا رہے تھے، اور اس وقت وہ اعرابی آپ کے پاس کھڑا ہوا تھا، آپ نے فرمایا: جس وقت میں سویا ہوا تھا تو اس اعرابی نے مجھ پر تلوار سونت لی، میں بیدار ہوا تو وہ برہنہ تلوار لیے ہوئے کھڑا تھا، اس نے کہا: تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ میں نے تین بار کہا: اللہ! آپ نے اس کو سزا نہیں دی اور بیٹھ گئے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۹۱۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۴۳)

(۳۱) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حسن بن علی (رض) کو بوسہ دیا۔ اس وقت آپ کے پاس الاقرع بن حابس تمیمی بھی بیٹھا ہوا تھا، اس نے کہا: میرے دس بیٹے ہیں اور میں نے ان میں سے کسی کو بوسہ نہیں دیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا: جو شخص کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹۹۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۱۸)

(۳۲) حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جب کوئی سائل آتا یا آپ سے کوئی حاجت طلب کی جاتی تو آپ فرماتے: تم (اس کی) سفارش کرو، تم کو اجر دیا جائے گا اور اللہ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہے گا فیصلہ فرمائے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹۹۷، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۱۸)

(۳۳) حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جا رہا تھا، آپ کے اوپر ایک نجرانی چادر تھی جس کے کنارہ سخت موٹے تھے، ایک اعرابی نے اس چادر کو پکڑ کر سختی کے ساتھ کھینچا، میں نے دیکھا کہ اس چادر کو سختی

کے ساتھ کھینچنے کی وجہ سے آپ کے کندھے پر نشان پڑ گئے تھے، پھر اس اعرابی نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ کے پاس جو اللہ کا مال ہے اس میں مجھے دینے کا حکم دیجئے! نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا، آپ ہنسے، پھر آپ نے اس کو کچھ عطاء کرنے کا حکم دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٦٠٨٨ صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٠٥٧)

(٣٤) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی کسی کھانے کی مذمت نہیں کی، اگر آپ کو کوئی چیز پسند ہوتی تو آپ اس کو کھالیتے ورنہ اس کو چھوڑ دیتے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٣٥٦٣، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٠٦٤)

حضرت عائشہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ کسی بیوی کو نہ کبھی خادم کو سوا اس کے کہ آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے اور جب بھی کسی شخص نے آپ کو تکلیف پہنچائی تو آپ نے اس سے انتقام نہیں لیا۔ ہاں! اگر اللہ کی حرمات اور اس کی حدود کو کسی نے پامال کیا تو آپ اللہ عزوجل کے لیے انتقام لیتے تھے۔

(صحیح رقم الحدیث: ٢٣٢٨)

(٣٥) نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زوجہ حضرت عائشہ صدیقہ (رض) بیان کرتی ہیں کہ ایک دن انھوں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا: آپ پر جنگ احد سے بھی زیادہ کوئی سخت دن آیا تھا؟ آپ نے فرمایا: میں نے تمہاری قوم کی طرف سے جو تکلیفیں اٹھائی ہیں، وہ اٹھائی ہیں، اور سب سے زیادہ تکلیف یوم عقبہ (جس دن آپ نے طائف کی گھاٹیوں میں جا کر تبلیغ کی تھی) کو اٹھائی تھی، اس دن میں نے اپنے آپ کو ابن عبد یالیل بن عبد کلال پر پیش کیا، میں جو کچھ چاہتا تھا اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، پھر میں انتہائی افسردگی کے ساتھ چل پڑا، میں اس وقت قرن الثعالب میں تھا اور میرا غم ابھی دور نہیں ہوا تھا، میں نے سر اوپر اٹھایا تو ایک بادل نے مجھ پر سایہ کیا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا تو وہاں پر حضرت جبرائیل تھے، انھوں نے مجھے آواز دی اور کہا: بیشک اللہ نے سن لیا ہے کہ آپ نے اپنی قوم کو کیا پیغام سنایا اور انھوں نے آپ کو کیا جواب دیا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس پہاڑوں کے فرشتہ کو بھیجا ہے، تاکہ آپ جو چاہیں اس کو حکم دیں، پھر پہاڑوں کے فرشتہ نے مجھے آواز دی اور مجھے سلام کیا، پھر کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اگر آپ چاہیں تو میں ان لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالوں، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: بلکہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی پشتوں سے ایسے لوگوں کو نکالے گا جو اللہ وحدہٗ کی عبادت کریں گے، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٣٢٣١، صحیح مسلم رقم الحدیث: ٧٩٥، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ٧٧٠٦، شرح السنۃ رقم الحدیث: ٣٧٤٧

(٣٦) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ آپ سے عرض کیا گیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! مشرکین کے خلاف دعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا: مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ مجھے تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ٢٥٩٩، الادب المفرد رقم الحدیث: ٣٢٧، شرح السنہ ج ١٣ ص ٢٤٠)

(٣٧) حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں مزاح بھی کرتا ہوں لیکن میں حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا۔

(مجمع الزوائد رقم الحدیث: ٤٢٠١، مطبوعہ دارالفکر، بیروت، ١٤١٤ھ)

(۳۸) حضرت جابر (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وحی نازل ہوتی یا آپ وعظ فرماتے تو ہم دل میں کہتے کہ اب آپ لوگوں کو عذاب سے ڈرائیں گے اور جب آپ سے یہ کیفیت دور ہو جاتی تو میں دیکھتا کہ آپ سب لوگوں سے زیادہ کشادہ رو، سب سے زیادہ خوش طبع اور سب سے زیادہ حسین لگے۔

(مسند البزار رقم الحدیث: ٤٤٧٧، حافظ الہیثمی نے کہا: اس حدیث کی سند حسن ہے، مجمع الزوائد رقم: ۲٤۰۲)

(۳۹) حضرت عمران بن الحصین (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے چہرے میں کنواری لڑکی کے چہرے سے زیادہ شرم وحیاء ہوتی تھی اور جب آپ کو کوئی چیز ناگوار ہوتی تھی تو ہم آپ کے چہرے سے جان لیتے تھے۔

(المعجم الکبیر ج ۱۸ ص ۲۰٦، حافظ الہیثمی نے کہا: امام طبرانی نے اس حدیث کو دو سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے، ان میں سے ایک سند صحیح ہے، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ١٤٢٠٥)

(٤۰) حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: میرے اوپر آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا، جو مجھ سے پہلے کسی نبی پر نازل نہیں ہوا تھا اور نہ میرے بعد کسی پر نازل ہوگا اور وہ اسرافیل ہیں اور ان کے ساتھ حضرت جبرائیل (علیہ السلام) بھی تھے، انھوں نے کہا: السلام علیک یا محمد! میں آپ کے پاس آپ کے رب کا پیغام لانے والا ہوں، مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں آپ کو یہ اختیار دوں کہ آپ چاہیں تو نبی اور عبد رہیں، اور اگر آپ چاہیں تو نبی اور بادشاہ ہو جائیں، میں نے حضرت جبرائیل (علیہ السلام) کی طرف دیکھا، انھوں نے تواضع کرنے کا اشارہ کیا، پس اس وقت نبی (علیہ السلام) نے کہا: اگر میں نبی بادشاہ کہتا تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلتے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۳۳۰۹، اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند میں یحییٰ بن اللہ البابلتی ضعیف روای ہے، مجمع الزاوئد رقم الحدیث: ١٤٢١١)

(٤١) حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے کھڑا ہوا کپکپا رہا تھا، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس سے فرمایا: تم آرام اور اطمینان سے کھڑے رہو، کیونکہ میں بادشاہ نہیں ہوں، میں قریش کی ایک ایسی عورت کا بیٹا ہوں جو گوشت سکھا کر کھاتی تھی۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ١٢٨٢، المستدرک ج ۲ ص ٦٦، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ١٤٢٤۰)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آدھی رات کے وقت بھی کی روٹی کھانے کے لیے بلاتا تھا تو آپ چلے جاتے تھے۔

(المعجم الصغیر رقم الحدیث: ١٤١، المعجم الاوسط رقم الحدیث: ٢٥٧١، حافظ الہیثمی نے کہا: اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ١٤٢٢١)

حضرت حنظلہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس گیا تو آپ چار زانو پر بیٹھے ہوئے تھے۔

(المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۳٤٩٨، حافظ الہیثمی نے کہا: اس حدیث کی سند میں محمد بن عثمان القرشی ضعیف راوی ہے، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ١٤٢٣۰)

(٤٢) حضرت عامر بن ربیہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ مسجد کی طرف گیا، آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا، میں آپ کی جوتی کو ٹھیک کرنے لگا، آپ نے میرے ہاتھ سے جوتی لے لی اور فرمایا: یہ خود پسندی اور خود کو دوسرے

پر ترجیح دینا ہے اور میں خود پسندی کو پسند نہیں کرتا۔

(مسند البزار رقم الحدیث: ۲٤٦٨، حافظ الہیثمی نے کہا: اس حدیث کو سند میں ایک راوی مجہول ہے، مجمع الزوائد رقم الحدیث: ١٤٢٣٢)

(٤٣) حضرت جابر بن عبد اللہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنے اونٹ پر سفر کر رہے تھے جس نے ان کو تھکا دیا تھا (یعنی وہ تیز نہیں چل رہا تھا) حضرت جابر نے اسے چھوڑنے کا ارادہ کیا، وہ کہتے ہیں: پھر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ سے آملے، آپ نے مجھے بلایا اور اس اونٹ پر ایک ضرب لگائی، پھر وہ اس قدر تیز چلنے لگا کہ اس کی طرح کوئی اونٹ نہیں چل رہا تھا، آپ نے فرمایا: مجھے یہ اونٹ چالیس درہم کے عوض فروخت کر دو۔ میں نے کہا: نہیں! (یعنی آپ بلا قیمت لے لیں) آپ نے پھر فرمایا کہ مجھے فروخت کر دو تو میں نے چالیس درہم کے عوض اس کو آپ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور میں نے اس پر سوار ہو کر مدینہ اپنے گھر تک جانے کا استثناء کر لیا، پس جب میں اپنے گھر پہنچ گیا تو آپ کے پاس اونٹ لے آیا، آپ نے مجھے اس کی نقد قیمت ادا کر دی اور ایک قیراط زیادہ دی، پھر آپ نے کسی کو بھیج کر مجھے بلوایا اور فرمایا: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اونٹ خریدنے کے لیے تمہیں قیمت کم کر دی ہے؟ جاؤ! یہ اونٹ لے جاؤ اور یہ درہم بھی لے جاؤ۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۷۱۵)

(٤٤) حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دو پہاڑوں کے درمیان کی بکریاں مانگیں، آپ نے اس کو وہ بکریاں عطاء کر دیں پھر وہ اپنی قوم کے پاس گیا اور کہنے لگا: اے میری قوم! اسلام لے آؤ، کیونکہ خدا کی قسم! بیشک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اتنا دیتے ہیں کہ فقر وغربت کا خدشہ نہیں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۱۲)

(٤٥) حضرت ابوسعید خدری (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پردہ میں رہنے والی کنواری لڑکی سے زیادہ حیاء فرمانے والے تھے، جب آپ کو کوئی چیز ناپسند ہوتی تو ہم آپ کے چہرہ سے جان لیتے۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۲۰)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے محاسن اخلاق میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کسی سے اپنی ذات کا بدلہ نہیں لیتے تھے اور زیادتی کرنے والوں سے درگزر فرماتے تھے بلکہ جان کے دشمنوں کو بھی معاف کر دیتے، ہم آپ کی سیرت سے چند ایسی مثالیں بیان کر رہے ہیں۔

عبد اللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھانا

(٤٦) امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵٦ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب عبد اللہ بن ابی ابن سلول فوت ہو گیا تو اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بلایا گیا، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو میں دوڑ کر آپ کے پاس گیا، میں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا آپ ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ حالانکہ اس نے فلاں دن یہ اور کہا تھا (کہ مدینہ پہنچ کر عزت والے ذلت والوں کو نکال دیں گے اور یہ کہا تھا کہ جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں جب تک وہ آپ کا ساتھ چھوڑ نہ دیں اس وقت تک ان پر خرچ نہ کرو اور حضرت عائشہ (رض) پر بدکاری کی

تہمت لگائی تھی، جس سے آپ کو سخت رنج تھا اور آپ سے کہا تھا کہ اپنی سواری دُور کرو مجھے اس سے بد بو آتی ہے، جنگ احد میں عین لڑائی کے وقت اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر لشکر سے نکل گیا) میں آپ کو یہ تمام باتیں گنوا تا رہا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تبسم فرما کر کہا: اپنی رائے کو رہنے دو۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: مجھے اختیار دیا گیا ہے (کہ استغفار کروں یا نہ کروں) سو میں نے (استغفار کرنے کو) اختیار کرلیا، اور اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ اگر میں نے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کیا تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا، حضرت عمر بیان کرتے ہیں کہ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کی نماز پڑھائی۔ الحدیث۔

(صحیح بخاری ج۲ ص ۶۷۴، رقم الحدیث: ۱۳۶۶، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۷۱ھ)

(۴۷) امام ابو جعفر محمد بن طبری متوفی ۳۱۰ھ روایت کرتے ہیں:

قتادہ بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اس معاملہ میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میری قمیص اور اس پر میری نماز جنازہ اس سے اللہ کے عذاب کو دور نہیں کر سکتی اور بیشک محمد یہ امید ہے کہ میرے اس عمل سے اس کی قوم کے ایک ہزار آدمی اسلام لے آئیں گے۔

(جامع البیان ج۱۰ ص ۱۴۲، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۰۹ھ)

سو آپ کی اس نرمی اور حسن اخلاق کو دیکھ کر عبد اللہ بن ابی کی قوم کے ایک ہزار آدمی اسلام لے آئے۔

فتح مکہ کے بعد ابو سفیان اور ہندہ کو معاف کر دینا

(۴۸) امام ابو الحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المتوفی ۶۳۰ھ بیان کرتے ہیں:

جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ فتح کرلیا تو ابو سفیان بن الحارث اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی اور حضرت ام سلمہ (رض) نے ان کی سفارش کی، ابو سفیان نے کہا: اگر مجھے باز یاب ہونے کی اجازت نہیں ملی تو میں اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر زمین میں نکل جاؤں گا اور بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ سنا تو آپ کا دل نرم ہو گیا اور آپ نے ان کو اجازت دے دی اور انھوں نے آپ کی خدمت کی حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیا، ایک قول یہ ہے کہ حضرت علی نے ابو سفیان نے کہا: تم حضور کے سامنے کی طرف سے جانا اور آپ سے وہی کہنا جو حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے حضرت یوسف سے کہا تھا: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضلیت دی ہے اور بیشک ہم ہی قصور وار تھے، انھوں نے اسی طرح کہا تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے گا اور وہ سب سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے، آپ نے ان کو قریب بٹھایا اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور ابو سفیان نے اپنی پچھلی تمام زیادتیوں پر معافی مانگی، ایک اور روایت ہے کہ حضرت عباس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ابو سفیان فخر کو پسند کرتا ہے، اس کو کوئی ایسی چیز عنایت کیجئے جس کی وجہ سے یہ اپنی قوم میں فخر کرے، آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو گا اس کو امان ہے اور جو شخص حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو گا اس

کو امان ہے اور جو شخص مسجد میں داخل ہو گیا اس کو امان ہے اور جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اس کو امان ہے۔
(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۱۶۶۔ ۱۶۴ مطبوعہ دار الکتب العربیہ، بیروت)

(۴۹) جب آپ کے سامنے ہند کو پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا: کیا یہ ہندہ ہے؟ ہندہ نے کہا: میں ہندہ ہوں، اللہ مجھ کو معاف فرمائے، آپ میری پچھلی باتوں کو معاف کر دیجئے، ہند کے ساتھ اور بھی عورتیں تھیں۔ آپ نے ان سے عہد لیا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی، چوری نہیں کریں گی، بدکاری نہیں کریں گی، اولاد کو قتل نہیں کریں گی، کسی بے قصور پر بہتان نہیں باندھیں گی، کسی نیک کام میں حضور کی نافرمانی نہیں کریں گی، پھر آپ نے حضرت عمر سے فرمایا: ان سے بیعت لو، اور ان سب کے لیے مغفرت کی دعا کی۔

(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۱۷۲،۱۷۱ مطبوعہ دار الکتب العربیہ، بیروت)

ابوسفیان نے متعدد بار مدینے پر حملے کیے تھے اور ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں پیش پیش رہا تھا، آپ نے ابوسفیان پر قابو پانے کے بعد اس کو معاف کر دیا، ہند نے آپ کے محبوب چچا حمزہ (رض) کا کلیجہ نکال کر کچا چبایا تھا، مکہ فتح کرنے کے بعد آپ نے اس کو بھی معاف کر دیا۔

فتح مکہ کے بعد صفوان بن امیہ کو معاف کر دینا

(۵۰) امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ روایت کرتے ہیں:

عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ صفوان بن امیہ (یہی وہ شخص ہے جس نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو قتل کرنے کے لیے عمیر بن وہب کو مدینہ بھیجا تھا) جدہ جانے کے لیے مکہ سے نکلا تا کہ جدہ سے یمن چلا جائے، حضرت عمیر بن وہب نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عرض کیا: یارسول اللہ! صفوان بن امیہ اپنی قوم کا سردار ہے اور وہ آپ کے خوف سے بھاگ رہا ہے تا کہ اپنے آپ کو سمندر میں گرا دے، آپ اس کو امان دے دیجئے، آپ نے فرمایا: اس کو امان ہے، انھوں نے کہا: یارسول اللہ! مجھ کو کوئی ایسی چیز عنایت کیجئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ آپ نے اس کو امان دے دی ہے، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان کو اپنا وہ عمامہ عطاء فرمایا جس کو پہنچ کر آپ مکہ میں داخل ہوئے تھے، حضرت عمیر وہ عمامہ لے کر گئے اور ان کو جدہ میں پالیا، اس وقت وہ جہاز میں سوار ہونے کا ارادہ کر رہے تھے، انھوں نے کہا: اے صفوان! اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے دل میں اللہ کو یاد کرو، دیکھو یہ امان ہے جو میں تمہارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے لے کر آیا ہوں، صفوان نے کہا: تم چلے جاؤ، حضرت عمیر نے کہا: اے صفوان! وہ سب سے زیادہ افضل، سب سے زیادہ نیک، سب سے زیادہ حلیم ہے اور سب سے اچھے ہیں، حضرت عمیر (رض) صفوان کو حضور کے پاس لے آئے، صفوان نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہا: اس کا یہ کہنا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے، آپ نے فرمایا: اس نے سچ کہا، صفوان نے کہا: مجھے اسلام لانے کے لیے دو ماہ کی مہلت دیجئے، آپ نے فرمایا: میں تمہیں چار ماہ کی مہلت دیتا ہوں۔

(جامع البیان ج ۲ ص ۳۳۹،۳۳۸، مطبوعہ بیروت، کتاب المغازی للواقدی ج ۲ ص ۸۵۳ الکامل لا بن الاثیر ج ۲ ص ۱۶۸، البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۳۰۸)

فتح مکہ کے بعد عکرمہ بن ابی جہل کو معاف کر دینا:

(۵۱) امام ابن اثیر شیبانی متوفی ۶۳۰ھ لکھتے ہیں:

عکرمہ بن ابی جہل بھی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ایذاء پہنچانے، آپ سے عداوت رکھنے اور آپ کے خلاف جنگوں میں پیسہ صرف کرنے میں اپنے آپ کی مثل تھا، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ کو فتح کر لیا تو اس کو اپنی جان کا خوف ہوا اور وہ یمن کی طرف بھاگ گیا لیکن اس کی بیوی ام حکیم بن الحارث مسلمان ہوگئیں اور انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے عکرمہ کے لیے امان طلب کی، اور اپنے ساتھ ایک رومی غلام لے کر اس کو ڈھونے نکلیں، انھوں نے عرب کے بعض قبیلوں کی مدد سے عکرمہ کو پا لیا، اس وقت عکرمہ سمندر کے سفر کا ارادہ کر رہے تھے، ام حکیم نے کہا: میں تمہارے پاس اس شخص کے ہاں سے آئی ہوں، جو لوگوں میں سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے ہیں، سب سے زیادہ حلیم ہیں اور سب سے زیادہ کریم ہیں، اور انھوں نے تم کو امان دے دی ہے، جب عکرمہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس پہنچے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بہت خوش ہوئے، پھر عکرمہ مسلمان ہو گئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ درخواست کی کہ وہ اس کے لیے استغفار کریں پھر آپ نے ان کے لیے استغفار کیا۔

(الکامل فی التاریخ ج ۲ ص ۱۶۸، مطبوعہ دار الکتب العلیمہ، بیروت)

(۵۲) امام ابن عساکر متوفی ۷۵۱ھ روایت کرتے ہیں:

جب عکرمہ کشتی میں سوار ہوئے تو سخت تیز ہوا چلی، انھوں نے اس وقت لات اور عزیٰ کو پکارا، کشتی والوں نے کہا: اس موقع پر اخلاص کے ساتھ صرف اللہ وحدہٗ لا شریک کو پکارا جائے اور کسی کو پکارنا جائز نہیں، عکرمہ نے سوچا: اگر سمندر میں صرف اسی کی الوہیت ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں ہے تو پھر خشکی میں بھی وہی وحدہٗ لا شریک ہے اور انھوں نے اللہ کی قسم کھا کر دل میں عہد کیا کہ وہ ضرور (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جا کر رجوع کریں گے، سو انھوں نے آپ کے پاس جا کر آپ سے بیعت کر لی (مختصر تاریخ دمشق ج ۱۷ ص ۱۳۴)

فتح مکہ کے بعد (طائف میں) وحشی کو معاف کر دینا

وحشی بن حرب، جبیر بن مطعم کے غلام تھے، ایک قول یہ ہے کہ بنت الحارث بن عامر کے غلام تھے، حارث بن عامر کی بیٹی نے ان سے کہا: میرا باپ جنگ بدر میں قتل کر دیا گیا تھا، اگر تم نے (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حمزہ یا علی بن ابی طالب ان تینوں میں سے کسی ایک کو قتل کر دیا تو تم آزاد جنگ احد میں وحشی نے حضرت سیدنا حمزہ (رض) کو قتل کر دیا تھا اور اس قتل سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بہت اذیت پہنچی تھی، جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ فتح کیا تو یہ جان کے خوف سے طائف بھاگ کر چلے گئے تھے، پھر ایک وفد کے ساتھ آ کر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ملاقات کی اور کلمہ پڑھ لیا، حافظ ابن عساکر نے ان کے اسلام قبول کرنے کا بہت تاثر انگیز واقعہ نقل کیا ہے۔

(۵۳) حافظ ابو القاسم علی بن الحسن ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت حمزہ (رض) کے قاتل وحشی کو بلایا اور ان کو اسلام کی دعوت دی، وحشی نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ مجھے کس طرح اپنے دین کی دعوت دے رہے ہیں حالانکہ میں نے شرک کیا ہے، قتل کیا ہے اور زنا کیا ہے اور آپ یہ پڑھتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔
يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا۔ (الفرقان: ۶۹-۶۸)

اور جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر حق کے ساتھ (مثلاً قصاص میں) اور زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کرے گا وہ سزا پائے گا۔ قیامت کے دن اس کے عذاب کو دگنا کر دیا جائے گا اور وہ اس عذاب میں ہمیشہ ذلت کے ساتھ رہے گا۔

جب وحشی نے یہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر یہ آیت نازل کر دی:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ
سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (الفرقان: ۷۰)

لیکن جو (موت سے پہلے) توبہ کر لے، اور ایمان لے آئے اور نیک کام کرے تو اللہ ان لوگوں کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے گا، اور اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

وحشی نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ بہت سخت شرط ہے کیونکہ اس میں ایمان لانے سے پہلے کے گناہوں کا ذکر ہے، ہوسکتا ہے مجھ سے ایمان لانے کے بعد گناہ ہو جائیں گے تو پھر ایمان لانے کے بعد اگر میری بخشش نہ ہو تو پھر میرے ایمان لانے کا کیا فائدہ۔

تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

(النساء: ۴۸)

بے شک اللہ اپنے ساتھ شرک کیے جانے کو نہیں بخشتا، اور اس کے علاوہ جو گناہ ہو اسے جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

وحشی نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اس آیت میں تو مغفرت اللہ کے چاہیے پر موقوف ہے، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ مجھے بخشنا نہ چاہے، پھر میرے ایمان لانے کا کیا فائدہ، تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ
رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۔

(الزمر: ۵۳)

آپ کہیے کہ اے میرے بندو! جو اپنی جانوں پر زیادتیاں کر چکے ہو، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بیشک وہی بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

وحشی نے کہا: اب مجھے اطمینان ہوا، پھر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا صحابہ نے پوچھا: یہ بشارت آیا صرف وحشی کے لیے ہے یا سب کے لیے ہے؟ آپ نے فرمایا: سب کے لیے ہے۔

حضرت ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ وحشی امان طلب کر کے آیا اور پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اسلام قبول کرنے کے متعلق یہی شرائط پیش کیں اور آپ نے یہی جوابات دیئے۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲۶ ص ۲۶۳،۲۶۲، مطبوعہ دارالفکر، بیروت)

غور فرمایئے! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس شخص کی ایک ایک شرط پوری کر کے اور اس کا ایک ایک ناز اٹھا کر اس کو کلمہ پڑھا رہے ہیں اور جنت کا راستہ دکھا رہے ہیں جو آپ کے انتہائی عزیز چچا کا قاتل تھا، اگر کوئی شخص ہمارے کسی عزیز رشتہ دار کو قتل کر کے ہم سے دنیا کی کسی جگہ کا راستہ پوچھے تو ہم اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تو ان کے ظرف کی عظمت کا کیا کہنا جو ایسے شخص کا ایک ایک نخرہ پورا کر کے اسے جنت کا راستہ دکھا رہے ہیں۔

ہبار بن الاسود کو معاف کر دینا

(٥٤) ہبار بن اسود کا جرم یہ تھا کہ اس نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت سیدتنا زینب (رض) کو پشت میں نیزہ مارا تھا، اس وقت وہ حاملہ تھیں، وہ گر گئیں اور ان کا حمل ساقط ہوگیا، جس وقت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ میں بیٹھے ہوئے تھے اچانک ہبار بن آسود آ گیا، وہ بہت فصیح اللسان تھا، اس نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس نے آپ کو برا کہا اس کو برا کہا گیا۔ میں آپ کے پاس اسلام کا اقرار کرنے آیا ہوں، پھر اس نے کلمۂ شہادت پڑھا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کا اسلام قبول کرلیا، اس وقت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کنیز سلمہ آئیں اور انھوں نے ہبار سے کہا: اللہ تیری آنکھوں کو ٹھنڈا نہ کرے تو وہی ہے جس نے فلاں کام کیا تھا اور فلاں کیا تھا، آپ نے فرمایا: اسلام نے ان تمام کاموں کو مٹا دیا، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو برا کہنے اور اس کے پچھلے کام گنوانے سے منع فرمایا۔

(کتاب المغازی للواقدی ج ۲ ص ۸۵۸،۸۵۷، مطبوعہ عام الکتب، بیروت)

منافقوں اور دیہاتیوں سے درگزر کرنا

(٥٥) امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵٦ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کچھ مال تقسیم کیا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کہا: خدا کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس تقسیم سے اللہ کی رضا جوئی کا ارادہ نہیں کیا، میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس جا کر اس کی خبر دی، تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا چہرہ متغیر ہوگیا اور آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم فرمائے، ان کو اس سے زیادہ اذیت دی گئی تھی اور انھوں نے اس پر صبر کیا تھا۔

(صحیح بخاری ج ۳ ص ۸۹۵، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

امام واقدی متوفی ۲۰۷ھ نے بیان کیا ہے کہ اس شخص کا نام معتب بن قشیر تھا اور یہ منافق تھا، اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر خیر خواہی کی نیت سے کسی شخص سے اس کے متعلق کہا ہوا قول بیان کیا جائے کہ فلاں شخص آپ کے متعلق یہ کہہ رہا تھا، تو یہ چغلی نہیں ہے اور نہ ممنوع ہے، ورنہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ابن مسعود (رض) سے فرماتے: تم چغلی کیوں کر رہے ہو؟ چغلی اس وقت ہوتی ہے جب کوئی شخص فساد ڈالنے اور دو آدمیوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی نیت سے ایک کی بات دوسرے شخص تک پہنچاتا ہے، اور اس حدیث میں آپ کی نرمی اور ملائمت کا بیان بالکل واضح ہے۔

(۵۶) حضرت انس بن مالک (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جا رہا تھا، اس وقت آپ ایک نجرانی (یمنی) چادر اوڑھے ہوئے تھے، راستہ میں ایک اعرابی (دیہاتی) ملا، اس نے بہت زور سے آپ کی چادر کھینچی، حضرت انس (رض) کہتے ہیں کہ اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دو کندھوں کے درمیان چادر کا نشان پڑ گیا تھا، پھر اس نے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ کے پاس جو اللہ کا مال ہے اس میں سے مجھے دینے کا حکم دیجئے۔ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی طرف متوجہ ہو کر مسکرائے پھر اس کو مال دینے کا حکم دیا۔

(کتاب المغازی ج ۲ ص ۹۰۰، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت)

اس حدیث میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نرمی، حسن اخلاق اور برائی کا جواب اچھائی دینے کا واضح بیان ہے۔

"وانك لعلى خلق عظيم"

میں امام رازی کی نکتہ آفرینیاں

امام فخر الدین محمد عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

خلق ملکہ نفسانیہ (طبعی مہارت) ہے، جس کی وجہ سے انسان کے لیے نیک کام کرنا آسان ہو جاتا ہے، حسن خلق میں بخل، حرص اور غضب سے اجتناب کرنا داخل ہے، اسی طرح معاملات میں سختی سے احتراز کرنا بھی اس میں داخل ہے، اور اپنے قول اور فعل سے لوگوں کو مانوس کرنا بھی اس میں داخل ہے، اور لوگوں سے قطع تعلق کا ترک کرنا اور خرید و فروخت اور دیگر معاملات میں لوگوں کے حقوق سے سستی کرنا اور نسبی اور سسرالی حقوق کی ادائیگی میں کمی کرنے کو ترک کرنا بھی حسن اخلاق میں داخل ہے۔

انسان کو خلق دو قوتوں سے حاصل ہوتا ہے: قوت علمیہ اور قوت عملیہ، آپ کی قوت علمیہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۔ (النساء: ۱۱۳)

اور آپ جو کچھ بھی نہیں جانتے تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا علم عطاء کر دیا اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے۔

اور قوت عملیہ کے متعلق فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ (القلم: ۴)

اور بیشک آپ ضرور عظیم اخلاق پر فائز ہیں۔

ان دو کاموں کے کامل ہونے کے بعد انسان کو اپنے کمال کے لیے اور کسی قوت کی ضرورت نہیں ہے، سو آپ کا علم بھی عظیم ہے اور آپ کا خلق بھی عظیم ہے، پس آپ کی روح مقدس تمام ارواح بشریہ میں سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل ہے۔

نیز امام رازی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کا خلق عظیم ہے، اس میں ان کفار کا رد ہے جنہوں نے آپ کو مجنوں کہا تھا کیونکہ سب کو تسلیم تھا کہ آپ کے اخلاق سب سے عمدہ اور آپ کے افعال سب سے زیادہ پسندیدہ تھے، الصادق الامین آپ ہی کا لقب تھا اور مجنوں تو بے عقل ہوتا ہے، اس کے اقوال باطل اور افعال پراگندہ ہوتے ہیں، سو آپ مجنوں نہیں ہو سکتے۔

دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ آپ کا خلق عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام: ۹۰)

(ان (سابق نبیوں اور رسولوں) کو اللہ نے ہدایت دی ہے سو آپ ان کی ہدایت کی پیروی کیجئے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جس ہدایت کی پیروی کا حکم دیا ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی معرفت نہیں ہے، کیونکہ یہ تقلید ہے اور تقلید کرنا رسول کے لائق نہیں ہے اور نہ ہی اس سے مراد احکام شرعیہ ہیں کیونکہ آپ کی شریعت تمام انبیاء سابقین کی شریعت سے جدا ہے، پس متعین ہوگیا کہ اس ہدایت سے مراد اصول اور فروغ نہیں ہیں بلکہ آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ انبیاء سابقین کے خلق کریم کی پیروی کیجئے اور ان میں سے ہر نبی کسی ایک خلق کریم کے ساتھ خاص تھا، مثلاً حضرت ابراہیم صدق کے ساتھ خاص تھے، حضرت ایوب صبر کے ساتھ خاص تھے، حضرت یوسف (علیہ السلام) عفت کے ساتھ خاص تھے، سو آپ کو حکم دیا کہ یہ اخلاق کریمیہ جو تمام انبیاء سابقین میں متفرق ہیں، آپ ان تمام اخلاق کو اپنے اندر جمع کر لیجئے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار کم وبیش انبیاء میں جو فرداً فرداً کمالات اور اخلاق ہائے کریمہ پائے جاتے ہیں وہ تمام اخلاق تنہاء آپ اپنی ذات میں جمع کر لیں، سو اس لیے آپ کا خلق عظیم ہے۔ آپ میں جو محاسن اخلاق پائے جاتے ہیں وہ بمنزلہ متن متین ہیں اور تمام انبیاء (علیہم السلام) میں فرداً فرداً جو کمالات پائے جاتے ہیں وہ بمنزلہ شرح جمیل ہیں

(حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضاء داری آں چوں خوباں دارند تو تنہاء داری)

اور اس آیت میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔ (القلم: ٤) اور "علی" استعلاء کے لیے آتا ہے اور "علی" کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ان اخلاق پر مستعلی اور حاکم ہیں اور آپ کی نسبت اخلاق حسنہ کی طرف ایسے ہے جیسے مولیٰ کی نسبت غلام کی طرف اور امیر کی نسبت مامور کی طرف ہوتی ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۱۰ ص ٦٠١، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ١٤١٥ھ)

عربی میں "علی" کا لفظ فوقیت اور بلند کے لیے آتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: "فلان رکب علی الفرس" فلاں شخص گھوڑی پر سوار ہے، اور سواری سوار کے تابع ہوتی ہے، سوار جس طرف سواری کی باگیں موڑ دیتا ہے سواری اس طرف چل پڑتی ہے، سو اس آیت کا معنی ہے: آپ خلق کی عظمتوں پر فائق اور سوار ہیں، آپ جس طرف خلق کی باگوں کو موڑ دیتے ہیں وہی خلق عظیم ہو جاتا ہے۔

عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص کسی اچھے کام کو کرے وہ اچھا ہو جاتا ہے اور جو کسی عظیم کام کو کرے وہ عظیم ہو جاتا ہے اور یوں لوگ اپنے اچھے اور عظیم ہونے میں اچھائی اور عظمت کے تابع ہوتے ہیں لیکن آپ کا معاملہ اس طرح نہیں ہے، آپ اپنے عظیم ہونے میں خلق عظیم کے تابع نہیں ہیں بلکہ خلق عظیم اپنے عظیم ہونے میں آپ کے فعل کا تابع ہے، آپ سوار ہیں اور خلق عظیم سواری ہے، آپ کے جس فعل کو کر لیں وہی خلق عظیم ہے اور آپ جس فعل کو ترک کر دیں یا منع کر دیں وہ خلق خسیس ہے، دیکھئے! پہلے آپ نے نماز میں مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کیا تو وہ فعل عبادت ہوگیا اور جب آپ نے کعبہ کی طرف منہ کیا تو وہ فعل عبادت ہوگیا، جب آپ مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر

کے نماز پڑھ رہے تھے اس وقت اگر کوئی کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا تو اس کا وہ فعل عبادت نہ ہوتا اور اب اگر کوئی مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے تو اس کا یہ فعل عبادت نہ ہوگا، معلوم ہوا کہ فی نفسہ نہ مسجد اقصیٰ کی طرف منہ کرنے میں عظمت ہے نہ کعبہ کی طرف منہ کرنے میں عظمت ہے، عظمت تو آپ کے فعل میں ہے اور فعل کی اتباع اور اقتداء میں ہے، نیز دیکھئے کہ رمضان میں دن کو طعام نہ کھانا عبادت ہے اور عید کے دن طعام کو کھانا عبادت ہے، اگر کوئی رمضان میں دن کے وقت بلا عذر شرعی طعام کھالے تو گناہ ہے اور عید کے دن طعام نہ کھائے تو گناہ ہے، معلوم ہوا کہ فی نفسہ طعام ترک کرنے میں عظمت ہے نہ طعام کھانے میں عظمت ہے، عظمت تو آپ کے فعل میں ہے، اسی طرح نماز پڑھنا عبادت ہے مگر اسی وقت نماز پڑھنا عبادت ہے، جس وقت میں آپ نے نماز پڑھی ہے، اگر کوئی شخص ان اوقات میں نماز پڑھے، جن اوقات میں آپ نے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے تو اس کا نماز پڑھنا گناہ ہے مثلاً طلوع آفتاب یا استواء آفتاب کے وقت۔ اسی طرح حج کرنا بھی عبادت ہے لیکن اسی دن حج کرنا عبادت ہے جس دن آپ نے حج کیا ہے، اگر کوئی شخص اس سے ایک دن پہلے حج کرے تو اس کا حج نہیں ہوگا، خرید وفروخت کرنا اور روزی کمانا مستحسن ہے لیکن اسی جگہ اور اس وقت میں مستحسن ہے جس جگہ اور جس وقت میں آپ نے خرید وفروخت کی ہے، اگر کوئی اس جگہ یا اس وقت میں خرید وفروخت کرے، جس جگہ اور جس وقت میں آپ نے منع کیا ہے، مثلاً مسجد میں یا نماز کے وقت خرید وفروخت کرے تو گناہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ فی نفسہ نہ نماز میں عظمت ہے، نہ روزہ میں، نہ حج میں نہ اور کسی عبادت میں، عظمت صرف ان عبادات میں ہے جن کو آپ کے طریقہ اور آپ کے فعل کے موافق انجام دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یونہی تو نہیں فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (آل عمران: ۳)

آپ کہہ دیجئے اگر تم اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔

ہر عبادت میں اصل چیز آپ کی اتباع اور آپ کی اقتداء ہے کیونکہ فی نفسہ کسی عبادت میں عظمت نہیں ہے، اس میں عظمت تب ہوگی جب اس عبادت کو آپ کے طریقہ پر انجام دیا جائے گا، اسی لیے آپ نے فرمایا:

صلوا کما رایتمونی اصلی۔

اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۱، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۸۹، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۰۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۹۷۹)

پس واضح ہوگیا کہ اس آیت میں "علیٰ" ذکر کرنے میں یہ نکتہ ہے کہ جس طرح سوار، سواری پر سوار ہوتا ہے، اس طرح آپ خلق کے عظمتوں پر سوار ہیں اور جس طرح سوار کے تابع ہوتی ہے اس طرح خلق اپنے عظیم ہونے میں آپ کے تابع ہے، دوسرے لوگ نیک ہونے میں نیکی کے تابع ہوتے ہیں اور آپ اپنے نیک ہونے میں نیکی کے تابع نہیں ہیں، بلکہ نیکی، نیکی ہونے میں آپ کے فعل اور آپ کے خلق کے تابع ہے اور اسی معنیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہ فرما کر واضح کیا ہے: "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔" (القلم: ۴)

اللہ کی زمین کی نعمتیں

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾

﴿سورۃ الملک ۱۵﴾

''وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے نرم اور چلنے کے قابل بنا دیا، سوتم اس کے راستوں میں چلو اور اس کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف سب نے اٹھ کر جانا ہے کیا تم آسمان والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے، پھر اچانک وہ زمین لرزنے لگے کیا تم آسمان والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تم پر کنکریاں برسانے والی تیز ہوا بھیج دے، پس عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا تھا''۔ (الملک: ۱۷۔۱۵)

زمین کو نرم اور مسخر بنانے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی ہر کھلی ہوئی اور چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہے، اور اب اس طرح بتا رہا ہے کہ جب تم کو معلوم ہو گیا کہ میں تمہاری ہر ظاہر اور پوشیدہ بات کو جانتا ہوں تو اے کافرو! تم مجھ سے ڈرو اور وہ کام نہ کرو جن کی وجہ سے میں تم کو عذاب دوں، تم اس زمین کے راستوں میں چلتے ہو اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس زمین میں چلنے سے تمہیں نقصان نہیں ہوگا حالانکہ میں نے ہی تو اس زمین کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے اور اس میں تمہارے نفع کی چیزیں رکھی ہیں، اگر میں چاہوں تو تم کو اس زمین میں دھنسا دوں اور آسمان سے تم پر پتھر برسا دوں۔

اس آیت میں ''ذلول'' کا لفظ ہے، یہ ''ذلۃ'' سے بنا ہے، اس کا معنی ہے: اطاعت کرنا اور نرم ہونا، اور اس زمین کو نرم اور تابع بنانے کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(۱) اگر یہ زمین پتھریلی اور بہت سخت ہوتی تو اس پر چلنا بہت دشوار ہو جاتا۔

(۲) اگر یہ زمین نرم نہ ہوتی تو اس میں بنیادیں کھودنا اور اس پر عمارتیں بنانا بہت دشوار ہو جاتا۔

(۳) اگر یہ زمین سونے، چاندی، لوہے، پیتل یا کسی اور معدن کی بنی ہوتی تو گرمیوں میں تپ کر سخت گرم اور سردیوں میں سخت ٹھنڈی ہو جاتی اور اس میں کھیتی باڑی کرنا ممکن نہ ہوتا اور اس میں مردوں کو دفن کرنا بھی محال ہو جاتا۔

اور اس میں ''مناکب'' کا لفظ ہے یہ ''منکب'' کی جمع ہے، اس کا معنی ہے: کندھے، حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: زمین کے مناکب اس کے پہاڑ اور ٹیلے ہیں اور پہاڑوں کو مناکب اس لیے فرمایا ہے کہ انسان کے کندھے اس کے جسم میں بلندی پر ہوتے ہیں، اسی طرح پہاڑ بھی زمین سے بلندی پر ہوتے ہیں۔

اور فرمایا: تم اس کے رزق سے کھاؤ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین میں جو روزی پیدا کی ہے، اس سے کھاؤ۔

اور یاد رکھو کہ زمین میں تمہارا چلنا اور زمین سے روزی کھانا ایک وقت معین تک ہے، پھر تم نے لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے، اس سے مراد انسان کو کفر اور شرک سے ڈرانا ہے اور خلوت اور جلوت میں گناہوں سے بچنے کی تلقین کرنا ہے اور یہ بھی جان لو کہ اس زمین میں تمہارا آسانی سے چلنا پھرنا اور زمین کا رزق کھانا محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو یہ نعمت ان سے چھین لے گا۔

الملک: ۱۶۔ میں فرمایا: کیا تم آسمان والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے پھر اچانک وہ زمین لرزنے لگے

اللہ تعالیٰ پر آسمان والے کے اطلاق کی توجیہ:

اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے اور آسمان اللہ تعالیٰ کو تمام جانبوں سے محیط ہے تو پھر اللہ تعالیٰ آسمان کا مظروف ہوگا اور مظروف ظرف میں محدود ہوتا ہے اور اس سے مقدار میں کم ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ مقدار میں آسمان سے کم ہوگا اور آسمان عرش سے کم ہے تو لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ عرش سے بہت کم ہو اور یہ محال ہے، نیز اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ اللہ کی مقدار ہو اور یہ بھی محال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مقدار اور کیفیت سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کے آسمانوں میں ہونے پر دوسرا اشکال یہ ہے کہ جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے وہ اللہ کا مملوک ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ (الانعام: ۱۲)

آپ کہیے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ کس کی ملکیت ہے؟ آپ کہیے: اللہ کی

پس اگر اللہ تعالیٰ آسمانوں میں ہو تو لازم آئے گا کہ وہ خود اپنا مملوک ہو اور خود اپنا مالک ہو اور یہ بھی محال ہے، اس لیے الملک: ۱۶ میں جو فرمایا ہے: کیا تم آسمان والے سے بے خوف ہو گئے ہو، اس میں تاویل کرنا ضروری ہے اور اس کی مفسرین نے حسب ذیل تاویلات کی ہیں:

(۱) اس آیت کا معنی ہے: کیا تم آسمان کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہو؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ یہ ہے کہ کفار اور فساق پر عذاب آسمان کی طرف سے آتا ہے جس طرح اس کی رحمت اور نعمت کا نزول بھی آسمان کی جانب سے ہوتا ہے۔

(۲) اس کا معنی ہے: کیا تم اس ذات سے بے خوف ہو گئے ہو جس کی ملکیت، سلطنت اور قدرت آسمانوں میں ہے، ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت، اس کی ملکیت اور اس کی قدرت زمینوں میں بھی ہے اس کے باوجود آسمانوں کا ذکر فرمایا کیونکہ اعلیٰ پر قدرت ادنیٰ پر قدرت کو مستلزم ہوتی ہے۔

(۳) اس آیت کا معنی اسی طرح ہے: کیا تم عذاب نازل کرنے والے فرشتے جبرائیل سے بے خوف ہو گئے جو آسمانوں میں ہے؟

(٤) اور اگر آسمان والے سے اللہ عزوجل ہی کی ذات مراد ہو تو پھر اس کا محمل یہ ہے کہ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کسی سمت اور جہت کے ساتھ مخصوص اور مفید نہیں ہے، لیکن چونکہ آسمان کی سمت اور جہت کو باقی جہات پر فوقیت اور شرف حاصل ہے، اس لیے جب اللہ تعالیٰ کی طرف کسی جہت سے اشارہ کرنا ہو تو آسمان کی جہت سے اشارہ کیا جاتا ہے، اس لیے عرف میں آسمان والے سے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی کو مراد لیا جاتا ہے، احادیث میں بھی اللہ تعالیٰ پر آسمان والے کا اطلاق کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے، تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٤٩٤١، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ٤١، نشر السنہ، ملتان، سنن ترمذی رقم الحدیث: ١٩٢٤، مسند احمد ج ۲ ص ١٦٠)

حضرت عمر بن الحکم (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میری ایک باندی میری بکریوں کو چرایا کرتی تھی، ایک دن میں اس کے پاس گیا تو میری ایک بکری گم ہو چکی تھی، میں نے اس بکری کے متعلق اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کو بھیڑیا کھا گیا۔ مجھے اس پر بہت افسوس ہُوا، میں بھی آخر انسان ہوں، میں نے اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا، میرے ذمہ ایک غلام کو آزاد کرنا ہے، کیا میں اس باندی کو آزاد کر سکتا ہوں، تب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس باندی سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان میں، آپ نے پوچھا: میں کون ہوں؟ اُس نے کہا: آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ نے فرمایا: اس کو آزاد کر دو، مومنہ ہے۔

(موطأ امام مالک رقم الحدیث: ١٥٣٤، دار المعرفہ، بیروت، ١٤٢٠ھ، مسند احمد ج ٥ ص ٤٤٩ تا ٤٤٧)

اس حدیث کا ذکر درج ذیل کتب حدیث بھی ہے:

صحیح مسلم رقم الحدیث: ٥٣٧، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ٩٣٠، سنن نسائی رقم الحدیث: ١٢١٨، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ١١٤١۔

الملک: ١٧ میں فرمایا: کیا تم آسمان والے سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تم پر کنکریاں برسانے والی تیز ہوا بھیج دے، پس عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا تھا

کفار مکہ کو دنیاوی عذاب سے ڈرانا

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: اللہ تم پر ایسی کنکریاں برسا دے جیسی حضرت لوط (علیہ السلام) کی مجرم قوم پر برسائی تھیں، اس آیت میں "نذیر" کا لفظ ہے اور اس سے مراد "منذر" ہے، یعنی ڈرانے والا اور اس سے مراد سیدنا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں اور اس کا معنی یہ ہے کہ ہمارے نبی نے تمہیں ہمارا پیغام پہنچایا اور یہ کہا کہ اگر تم نے اس پیغام کو قبول نہیں کیا تو تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا، پس اگر تم اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو کر اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور اس کے نتیجہ میں تم پر آسمان سے کنکریاں برسنے کا عذاب آیا تو پھر تم کو ہمارے رسول کی وعید کے صدق کا علم ہو جائے گا اور ان کے ڈرانے پر یقین ہو جائے گا۔

کوثر کی وضاحت

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ①

''بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا کی ہے۔ سو آپ اپنے رب کی رضا کے لیے نماز پڑھتے رہیے اور قربانی کرتے رہیں۔ بیشک آپ کا دشمن ہی بے نسل ہے''۔ (الکوثر: ۳۔۱)

اس آیت میں ''انا'' اور ''اعطاء'' کے فوائد اور نکات

اس آیت کے شروع میں لفظ ''انا'' ہے اور یہ جمع کا لفظ ہے اور اس لفظ سے کبھی جمعیت مراد ہوتی ہے اور کبھی تعظیم مراد ہوتی ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ واحد ہے، اس لیے اس سے جمعیت مراد نہیں ہو سکتی، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو کوثر عطا فرمائی ہے، اس میں کئی افراد وسیلہ ہیں، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آپ کو اہل مکہ میں رسول بنا کر بھیجنے کی دعا کی:

(البقرہ: ۱۲۹) اے ہمارے رب! ان میں ان ہی میں سے ایک عظیم رسول بھیج۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دعا کی: اے میرے رب! مجھے امت احمد میں سے بنا دے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے آپ کی آمد کی بشارت دی:

(الصف: ٦) اور میں اپنے بعد ایک آنے والے رسول کی تم کو بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔

لفظ ''انا'' میں جمع کے لفظ کی دوسری وجہ تعظیم ہے یعنی آپ کو کوثر عطا کرنے والا تمام آسمانوں اور زمینوں کا خالق اور مالک ہے اور جب آپ کو عطا کرنے والا اس قدر عظیم ہے تو اس کا عطیہ بھی بہت عظیم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ماضی کے صیغہ سے فرمایا ہے: ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دی اور مستقبل کے صیغہ سے نہیں فرمایا کہ ہم آپ کو کوثر عطا کریں گے، یہ اس کی دلیل ہے کہ کوثر آپ کو ماضی میں حاصل ہو چکی ہے اور اس میں حسب ذیل فوائد ہیں:

(۱) جس کو ماضی میں بہت عظیم نعمت حاصل ہو چکی ہو، وہ اس سے بہت افضل ہے جس کو مستقبل میں وہ نعمت حاصل ہو، اسی لیے جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھا گیا: آپ کے لیے نبوت کب واجب ہوئی؟ تو آپ نے فرمایا: اس وقت جب حضرت آدم روح اور جسم کے درمیان تھے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۳٦۰۹)

(۲) گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا: ہم نے آپ کی ولادت سے پہلے ہی آپ کی سعادت کے اسباب مہیا کر دیئے تھے تو ہم آپ کی ولادت اور آپ کی عبادت کے بعد آپ کو کب فراموش کرنے والے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے پہلے آپ کو کوثر عطا کرنے کا ذکر کیا، اس کے بعد آپ کو نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا، اس سے معلوم ہوا کہ آپ

کو کوثر عطا کرنا محض اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل اور احسان ہے، آپ کی عبادت اور ریاضت کا معاوضہ نہیں ہے۔

(٤) نیز اس آیت میں فرمایا ہے: ہم نے کوثر آپ کو دی ہے، یوں نہیں فرمایا کہ ہم نے یہ کوثر نبی کو دی ہے یا رسول کو دی ہے کیونکہ اگر فرماتا: یہ کوثر نبی کو دی ہے تو یوں سمجھا جاتا کہ یہ کوثر نبوت کا مقتضیٰ ہے، سو جو بھی نبی ہوگا اس کو یہ کوثر مل گئی ہوگی اور اگر فرماتا: یہ کوثر رسول کو دی ہے تو یوں سمجھا جاتا کہ یہ کوثر رسالت کا تقاضا ہے، سو جو بھی رسول ہوگا اس کو یہ کوثر مل گئی ہوگی اور جب فرمایا: بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا کی ہے تو پتا چلا کہ یہ کوثر نہ نبوت کا تقاضا ہے نہ رسالت کا تقاضا ہے، یہ کوثر تو صرف آپ کی ذات کا تقاضا ہے۔

(٥) عربی میں "اعطاء" اور "ایتاء" دونوں کا معنی دینا اور نوازنا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں پر "اعطاء" کا لفظ فرمایا "ایتاء" کا لفظ نہیں فرمایا کیونکہ "اعطاء" کا متبادر معنی ہے: محض اپنے فضل سے دینا، نیز "اعطاء" کا معنی ہے کسی چیز کا مالک بنا دینا اور "ایتاء" سے یہ متبادر نہیں ہوتا، پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے آپ کو کوثر کا مالک بنا دیا ہے، آپ جس کو چاہیں اس کوثر میں سے دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں، اللہ تعالیٰ نے جب حضرت سلیمان کو ملک عظیم عطا کیا تو فرمایا:

(ص: ٣٩) یہ ہماری عطا ہے، اب آپ کسی پر احسان کر کے اس کو دے دیں یا روک کر رکھیں۔

اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوثر عطا کی تو آپ کو اس کا مالک بنا دیا، چاہے آپ کسی کو دیں یا نہ دیں۔

لفظ "کوثر" کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال

(١) حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: "الکوثر" جنت میں نہر ہے، اس کے دونوں کنارے سونے کے ہیں، اس میں موتی اور یاقوت جاری ہیں، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سفید ہے۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ٣٣٦١ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے)

(٢) کوثر سے مراد حوض ہے، حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے درمیان بیٹھے ہوئے تھے اچانک آپ کو اونگھ آگئی، آپ نے مسکراتے ہوئے سر بلند کیا اور فرمایا: ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ نے پڑھا: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ انا اعطینك الکوثر۔ فصل الربك وانحر۔ ان شانئك ھو الابتر۔" پھر آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ کوثر کیا چیز ہے؟ ہم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ نے فرمایا: یہ وہ نہر ہے جس کا میرے رب عزوجل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اس میں خیر کثیر ہے اور یہ وہ حوض ہے جس پر قیامت کے دن میری امت وارد ہوگی، اس کے برتن ستاروں کے عدد کے برابر ہیں، اس پر ان میں سے ایک بندہ وہاں سے نکالا جائے گا، میں کہوں گا: اے میرے رب! یہ میرا امتی ہے، پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا، آپ ازخود نہیں جانتے کہ اس نے آپ کے بعد دین میں کیا نیا کام نکالا تھا۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ٤٠٠)

اس حدیث سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو "ما کان وما یکون" کا علم نہیں تھا ورنہ آپ کو ازخود معلوم ہوتا کہ یہ شخص آپ کے دین اور آپ کی امت سے نکل چکا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت انس (رض) سے

روایت ہے کہ ہر پیر اور جمعرات کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔

(الوفا ص 810 مطبوعہ مصر 1369ھ)

سو جس شخص نے دین میں نیا کام نکالا اس کا عمل بھی آپ پر پیش کیا گیا تھا لہٰذا اس حدیث سے آپ کے علم کی نفی نہیں ہوتی، البتہ اس میں آپ کی توجہ کی نفی ہے۔

کوثر سے مراد حوض ہو یا جنت میں نہر، یہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیان کردہ تفسیر ہے، اس لیے یہ تفسیر تمام اقوال پر راجح اور فائق ہے۔

(۳) حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: کوثر سے مراد خیر کثیر ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر خیر کثیر آپ کو عطا کر دی اور اسلام، قرآن، نبوت اور دنیا اور آخرت میں تعریف اور تحسین اور ثناء جمیل خیرات کثیرہ ہیں اور جنت کی سب نعمتیں خیر کثیر ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث، ۴۹۶۶)

(٤) عکرمہ نے کہا: کوثر سے مراد نبوت اور کتاب ہے۔

(٥) حسن بصری نے کہا: کوثر سے مراد قرآن ہے۔

(٦) المغیرہ نے کہا: کوثر سے مراد اسلام ہے۔

(٧) الحسین بن الفضل نے کہا: کوثر سے مراد قرآن کو آسان کرنا اور احکام شرعیہ میں تخفیف ہے۔

(٨) ابو بکر بن عیاش نے کہا: کوثر سے مراد آپ کے اصحاب آپ کی امت اور آپ کے متبعین کی کثرت ہے۔

(۹) الماوردی نے کہا: کوثر سے مراد آپ کے ذکر کی بلندی ہے۔

(۱۰) "الکوثر" سے مراد آپ کے دل کا وہ نور ہے، جس نے آپ کو اللہ کے ماسوا سے منقطع کر دیا۔

(۱۱) کوثر سے مراد شفاعت ہے۔

(۱۲) الثعلبی نے کہا: کوثر سے مراد آپ کے معجزات ہیں، جن سے آپ کی امت کو ہدایت حاصل ہوئی۔

(۱۳) بلال بن یساف نے کہا: کوثر سے مراد "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے اور ایک قول ہے: کوثر سے مراد دین کی فقہ ہے اور ایک قول ہے: پانچ نمازیں ہیں۔

ان اقوال میں سے صحیح ترین قول اول اور ثانی ہے یعنی کوثر سے مراد جنت میں ایک نہر ہے یا حوض ہے، جو محشر میں قائم ہوگا کیونکہ وہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ثابت ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن جز۲۰ ص۱۹٤، دار الفکر، بیروت ۱٤۱٥ھ)

حوض کوثر کے متعلق ایمان افروز حدیث:

حضرت عقبہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہر نکلے تو آپ نے شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی، پھر آپ منبر پر گئے، پس فرمایا: میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا اور میں تمہارے حق میں گواہی دوں گا، اور بیشک اللہ کی قسم! میں اپنے حوض کو اب بھی ضرور دیکھ رہا ہوں اور بیشک مجھے روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں دے دی گئی ہیں اور بیشک اللہ کی قسم! مجھے تم

پر یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم (سب) مشرک ہو جاؤ گے لیکن مجھے تم سے یہ خطرہ ہے کہ تم دنیا میں رغبت کرو گے۔
(صحیح البخاری رقم الحدیث: 1344-6590 (سنن ترمذی رقم الحدیث:: ۳۲۲۳، مسند احمد ج ٤ ص ١٤٨)

الکوثر: ۲ میں فرمایا: سو آپ اپنے رب کی رضا کے لیے نماز پڑھتے رہیے اور قربانی کرتے رہیں۔

تکبیر تحریمہ کے بعد رفع یدین کے متعلق ضعیف روایات

اللہ تعالیٰ نے آپ کو، کوثر ایسی عظیم نعمت عطا کی ہے تو آپ اس کا شکر ادا کرنے کے لیے ہمیشہ نماز پڑھتے رہیں اور قربانی ادا کرتے رہیں، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بشارت ہے کہ وہ آپ کو اس قدر خوش حال کر دے گا کہ آپ قربانی کرتے رہیں گے۔

ایک قول یہ ہے کہ نماز سے مراد عید کی نماز ہے اور "وانحر" سے مراد عید الاضحیٰ کے دن قربانی کرنا ہے۔

مجاہد، طعاء اور عکرمہ سے روایت ہے کہ نماز سے مراد مزدلفہ میں صبح کی نماز پڑھنا اور اس کے بعد منیٰ میں قربانی کرنا ہے۔

ابو الاحوص سے روایت ہے کہ اونٹ کو نحر کرتے وقت آپ قبلہ کی طرف منہ کریں۔

امام ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردویہ اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ سورت نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر نازل ہوئی تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت جبرائیل سے فرمایا: یہ کونسا نحیرہ ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے تو حضرت جبرائیل نے کہا، یہ نحیرہ نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو یہ حکم دیتا ہے کہ جب آپ نماز کی تکبیر تحریمہ پڑھیں تو رفع یدین کریں اور جب رکوع کریں تو رفع یدین کریں اور جب رکوع سے سر اٹھائیں تو رفع یدین کریں کیونکہ یہی ہماری نماز ہے اور آسمانوں کے فرشتوں کی نماز ہے اور ہر چیز کی ایک زینت ہوتی ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے وقت رفع یدین ہے۔
(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۱۰ ص ۳٤٧٠، المستدرک ج ۲ ص ٥٣٨ ذہبی نے کہا، اس کی سند میں اسرائیل غیر معتمد ہے اور امام نسائی کے نزدیک متروک ہے۔)

حاکم نے "مستدرک" میں دارقطنی نے "الافراد" میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کیا ہے، اپنا دایاں ہاتھ بائیں کلائی پر رکھیں، پھر نماز میں اپنے ہاتھوں کو اپنے سینہ پر رکھیں۔

(المستدرک ج ۲ ص ٥٣٧ حافظ ذہبی نے اس سے سکوت کیا ہے۔)

حافظ جلال الدین سیوطی نے حضرت علی (رض) کی پہلی روایت کے متعلق کہا ہے: اس کو امام ابن ابی حاتم نے اور حاکم نے "مستدرک" میں سند ضعیف سے روایت کیا ہے اور ابن کثیر نی اس حدیث کے متعلق کہا: یہ شدید منکر ہے بلکہ امام جوزی نے اس کو موضوعات میں درج کیا ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دوسری حدیث کے متعلق حافظ جلال الدین سیوطی نے کہا: اس حدیث کو امام ابن ابی حاتم حاکم نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور زیادہ مشہور یہ ہے کہ "نحر" کا لفظ اونٹوں کو نحر کرنے میں استعمال ہوتا ہے، نہ کہ ان معانی میں اور قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ نماز کے بعد زکوۃ کا ذکر کیا جاتا ہے اور قربانی کرنا اور اونٹوں کو نحر کرنا زکوۃ کے معنی کے قریب ہے، بہ خلاف ان مذکورہ معانی کے علاوہ ازیں مکہ کے مشرکین بتوں کے آگے سجدہ کرتے تھے اور ان کے لیے اونٹوں کو نحر کرتے تھے تو زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس آیت کو اس پر محمول کیا جائے کہ آپ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اللہ کی رضا کی خاطر نماز پڑھیں اور اس کی رضا کے لیے قربانی کریں۔
(روح المعانی جز ۳۰ ص ٤٤٤، دار الفکر، بیروت، ١٤١٧ھ)

الکوثر: ۳ میں فرمایا: آپ کا دشمن ہی بے نسل ہے۔

"شانی" اور "ابتر" کے معنی

اس آیت میں "شانی" اور "ابتر" کے دو لفظ ہیں، علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

"شنا" کا معنی ہے: کسی شخص سے بغض کی بناء پر اس کو ناپسند کرنا، قرآن مجید میں ہے: شنان قوم" (المائدہ: ۸) کسی قوم کی دُشمنی اور اس سے بغض "شانئک" کا معنی ہے: آپ سے بغض رکھنے والا آپ کا دشمن۔

(المفردات ج۱ ص352)

"ابتر" کا لفظ "بتر" سے بنا ہے، اس کا معنی ہے: جس کی جڑ کٹی ہوئی ہو، پھر اس کا استعمال اس شخص کے لیے ہونے لگا، جس کے بعد اس کی نسل جاری نہ ہو، نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس کام سے پہلے اللہ کا ذکر نہ کیا جائے وہ "ابتر" ہے یعنی ناتمام اور نامکمل ہے (تلخیص الحبیر ج۳ ص76) قرآن مجید میں ہے: "ان شانئك هو الابتر۔" (الکوثر: ۳) یعنی جس کا ذکر اس کے بعد نہ چلے، اس کی وجہ یہ تھی کہ کفار کا زعم تھا کہ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ذکر منقطع ہو جائے گا، جب آپ کی عمر ختم ہو جائے گی کیونکہ آپ کی نسل منقطع ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا: جس کا ذکر منقطع ہوگا، وہ آپ کا دشمن ہے اور رہے آپ تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ورفعنا لك ذكرك۔ (الانشراح: ۴) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

کیونکہ آپ تمام مومنین کے بہ منزلہ باپ ہیں اور تمام مومنین حکماً آپ کی اولاد ہیں، اللہ عزوجل نے آپ کا ذکر بلند کیا ہے اور آپ کو خاتم الانبیاء بنایا ہے۔

(المفردات ج۱ ص۴۶)

الکوثر: ۳ کا شان نزول

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اس آیت کے شان نزول میں اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس (رض) نے کہا: جس شخص نے آپ کو ابتر کہا تھا، وہ العاص بن وائل السہمی تھا۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۲۹۵۵۳)

ابن زید نے کہا، وہ شخص یہ کہتا تھا کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جڑ کٹ گئی اور ان کی نسل آگے نہیں چلے گی۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۲۹۵۵۸)

شمر بن عطیہ بیان کرتے ہیں کہ عقبہ بن ابی معیط یہ کہتا تھا کہ (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نسل باقی نہیں رہے گی اور وہ ابتر ہیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۲۹۵۵۹)

حضرت ابن عباس (رض) بیان کرتے ہیں کہ جب کعب بن اشرف مدینہ آیا تو قریش اس کے پاس گئے اور کہا: ہم حرم کا انتظام اور حفاظت کرنے والے ہیں اور زمزم کے پانی پلانے والے ہیں اور تم اہل مدینہ کے سردار ہو، یہ بتاؤ کہ ہم بہتر ہیں یا یہ شخص جو اپنی قوم سے کٹ چکا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ وہ ہم سے افضل ہے؟ کعب بن اشرف نے کہا، بلکہ تم اس سے افضل ہو، اس وقت یہ آیت

نازل ہوئی۔

(جامع البیان رقم الحدیث:۲۹۵۶۲)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۹۱ھ لکھتے ہیں:

امام محمد بن سعد اور امام ابن عسا کرنے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سب سے بڑے بیٹے حضرت قاسم تھے، پھر حضرت زینب تھیں، پھر حضرت عبداللہ تھے، پھر حضرت ام کلثوم تھیں، پھر حضرت فاطمہ تھیں، پھر حضرت رقیہ تھیں، پس حضرت قاسم (رض) فوت ہو گئے اور وہ مکہ میں سب سے پہلے آپ کی اولاد میں سے فوت ہونے والے تھے، پھر حضرت عبداللہ (رض) فوت ہو گئے، اس وقت العاص بن وائل السہمی نے کہا، ان کی نسل منقطع ہو گئی اور یہ ابتر (جڑ کٹے) ہیں، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

"ان شانئك هو الابتر۔" (الکوثر:۳)۔

(الدر المنثور ج ۸ ص ۵۹۵ دار احیاء التراث العربی، بیروت) (الطبقات الکبریٰ ج ۱ ص 106، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ تاریخ دمشق الکبیر ج ۳ ص 69 دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ)

امام بیہقی نے" دلائل النبوۃ" میں محمد بن علی سے روایت کیا ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بیٹے حضرت قاسم (رض) اتنی عمر کو پہنچ گئے کہ وہ سواری پر سوار ہوسکیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا، اس وقت عاص بن وائل نے کہا: (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آج صبح ابتر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکوثر نازل فرمائی۔

(دلائل النبوۃ ج ۵ ص 289، الدر المنثور ج ۸ ص 595)

امام ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ ابو جہل نے آپ کو ابتر کہا تھا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۱۹۵۱۶، مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

شمر بن عطیہ نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط یہ کہتا تھا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اولاد باقی نہیں رہے گی۔ اور وہ جڑ کٹے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

"ان شانئك هو الابتر۔" (الکوثر:۳)

(تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث:۱۹۵۱۷ مکتبہ نزار مصطفی، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ جب آپ کے صاحبزادے حضرت قاسم (رض) فوت ہوئے تو العاص بن وائل، ابو جہل، عقبہ بن ابی معیط اور کعب بن اشرف تمام دشمنان مصطفیٰ نے آپ کو ابتر (مقطوع النسل) کہا، جب کسی شخص کا بیٹا فوت ہو جائے تو اس کے ہم وطن اور رشتہ دار اس کی تعزیت کرتے ہیں اور اس کو تسلی دیتے ہیں، یہ کیسے ہم وطن اور رشتہ دار تھے، جو ایسے رنج و غم کے موقع پر آپ کو تسلی دینے کے بجائے آپ کو طعنے دے رہے تھے اور آپ کو ابتر کہہ رہے تھے، اس وقت میں آپ کو صرف رب ذوالجلال نے تسلی دی اور فرمایا: بیشک ہم نے آپ کو کوثر عطا کی ہے۔ سو آپ اپنے رب کی رضا کے لیے نماز پڑھتے رہیے اور قربانی کرتے رہیں۔ بیشک آپ کا دشمن ہی بے نسل ہے۔ (الکوثر:۳۔۱)

اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے مدافعت فرمانا

کفار نے جب آپ کو طعنہ دیا کہ آپ ابتر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف سے بالواسطہ مدافعت کی اور فرمایا: بیشک آپ کا دشمن ہی ابتر (مقطوع النسل) ہے اور یہی محبین کا طریقہ ہے کہ جب ان کے محبوب کو کوئی طعنہ دے تو وہ اپنے محبوب کی طرف سے مدافعت کرتے ہیں اور یہاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اور اس کی قرآن مجید میں اور بھی کئی مثالیں ہیں، جب کفار نے آپ کی شان میں یہ بدگوئی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو نقل فرمایا:

(سباء: ۸۔۷) اور کفار نے کہا: آؤ ہم تمہیں ایسا شخص بتائیں، جو تمہیں یہ خبر دے رہا ہے کہ جب تم پورے پورے ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو پھر تمہاری ضرور نئی تخلیق کی جائے گی۔ اس نے یا تو اللہ پر جھوٹا بہتان لگایا ہے یا یہ دیوانہ ہے۔

جب کفار نے آپ کو جھوٹا اور دیوانہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے فوراً آپ کی مدافعت کی اور فرمایا:

(سبا: ۸) بلکہ (حقیقت یہ ہے) کہ جن لوگوں کا آخرت پر ایمان نہیں ہے، وہ عذاب میں اور دُور کی گمراہی میں ہیں۔

اسی طرح جب ولید بن مغیرہ نے آپ کو دیوانہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مدافعت میں فرمایا:

(القلم: ۲) آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں۔ اور القلم: ۱۳۔۸) میں ولید بن مغیرہ کی مذمت میں اس کے نو عیوب بیان فرمائے اور نواں عیب یہ بیان کیا کہ وہ بداصل ہے۔

اسی طرح منکرین نے آپ کے متعلق کہا:

لست مرسلاً (الرعد: ٤٣) آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدافعت میں فرمایا:

(یٰسین: ۳۔۱) یٰسین۔ قرآن کریم کی قسم۔ بیشک آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں۔

(الصفت: ۳٦) کیا ہم شاعر دیوانے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں۔

(الصفت: ۳۷) (نہیں نہیں) بلکہ وہ تو سچا دین لے کر آئے ہیں اور انھوں نے سب رسولوں کی تصدیق کی۔ پھر آپ کے دشمنوں کو وعید سنائی،

(الصفت: ۳۸) بیشک تم ضرور دردناک عذاب کو چکھنے والے ہو۔ اسی طرح کفار کے اس قول کو نقل فرمایا:

(الفرقان: ۷) اس رسول کو کیا ہوا کہ یہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے۔ تو اللہ نے ان کے رد میں فرمایا:

(الفرقان: ۲۰) ہم نے آپ سے پہلے جن رسولوں کو بھی بھیجا وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے۔

جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کوہ صفا پر چڑھ کر اپنی قوم کو توحید کا پیغام سنایا اور فرمایا: اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے گھوڑ سواروں کا ایک لشکر ہے، جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ سب نے کہا، کیوں نہیں! ہم نے آپ کو کبھی جھوٹا نہیں پایا، آپ نے فرمایا: تب میں تم کو یہ خبر دیتا ہوں کہ اگر تم اسی طرح اللہ کے ساتھ شرک کرتے رہے تو تم پر بڑا عذاب آئے گا، یہ سن کو ابولہب نے کہا: "تبا لک" تمہارے لیے ہلاکت ہو، کیا تم نے اس لیے ہم سب کو جمع کیا تھا؟ جب ابولہب نے آپ

سے کہا: "تبا لک" تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدافعت اور ابولہب کی مذمت میں پوری سورت نازل فرمادی:

(اللھب: ٥۔١) ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہوجائے۔ اسے اس کے مال اور اس کی کمائی نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ وہ عنقریب زبردست شعلوں والی آگ میں داخل ہوگا۔ اور اس کی بیوی (بھی) لکڑیوں کا گٹھا اٹھانے والی۔ اس کی گردن میں درخت کی چھال کی بٹی ہوئی رسی ہوگی۔

انبیاء سابقین کا خود اپنی مدافعت کرنا

پہلے نبیوں کی شان میں اگر کافر کوئی ناگفتنی بات کہتا تو وہ خود اپنی مدافعت کرتے تھے۔

حضرت نوح (علیہ السلام) کے متعلق ان کی ناگفتنی بات کو اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا:

(الاعراف: ٦٠) حضرت نوح کی قوم کے سرداروں نے کہا، بیشک ہم تم کو ضرور کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ تو حضرت نوح (علیہ السلام) نے خود اپنی مدافعت فرمائی۔

(الاعراف: ٦٠) حضرت نوح نے کہا: اے میری قوم! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے، لیکن میں رب العلمین کی طرف سے رسول ہوں۔

حضرت ھود (علیہ السلام) کی قوم نے ان کے متعلق بدگوئی کی، اللہ تعالیٰ نے اس کو نقل فرمایا:

(الاعراف: ٦٦) حضرت ھود کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: بیشک ہم تم کو بے وقوفی میں دیکھتے ہیں اور بیشک ہم تم کو ضرور جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔

تب حضرت ھود نے ازخود اپنی مدافعت فرمائی:

(الاعراف: ٦٧) حضرت ھود نے کہا، اے میری قوم! مجھ میں کوئی کم عقلی نہیں ہے لیکن میں رب العلمین کی طرف سے رسول ہوں۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مقام محبوبیت

یہ تو انبیاء سابقین تھے، لیکن جب محبوب رب العلمین کو مبعوث فرمایا اور کفار نے آپ کی شان میں بدگوئی کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ گوارا نہیں کیا کہ آپ خود اپنی مدافعت فرمائیں بلکہ جیسے ہی کسی نے آپ کی شان کے خلاف کوئی بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً اُن کا رد فرمایا۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے چند دن آپ پر وحی نازل نہیں فرمائی تو کافروں نے کہا، (سیدنا) محمد کو اس کے رب نے چھوڑ دیا اور اس سے بے زار ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے رد میں فوراً سورۃ الضحیٰ نازل ہوئی جس میں یہ آیات ہیں:

(الضحیٰ: ٣۔١) چاشت کے وقت کی قسم۔ اور رات کی قسم جب وہ پھیل جائے۔ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے نہ وہ آپ سے بے زار ہوا ہے۔

اسی طرح جب کافروں نے آپ کو ابتر کہا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدافعت میں پوری سورۃ کوثر نازل فرمادی۔

نمازوں سے غفلت کے بیان میں

فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۙ‏﴿۴﴾

﴿سورۃ الماعون آیت 4﴾

"سو ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے۔ جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں۔ جو ریا کاری کرتے ہیں۔ اور وہ استعمال کی معمولی چیز دینے سے منع کرتے ہیں"۔ (الماعون: ۷۔۴)

جن نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے:

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: اس سے مراد وہ نمازی ہیں جو نماز سے ثواب کی امید نہ رکھیں اور نماز نہ پڑھنے سے اُن کو عذاب کا ڈر نہ ہو اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز کو اس کا وقت گزرنے کے بعد پڑھیں، ابوالعالیہ نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو وقت پر نماز نہ پڑھیں اور اس کا رکوع اور سجود مکمل نہ کریں۔ قرآن مجید میں ہے:

(مریم: ۵۹) پھر (نیک لوگوں کے بعد) ایسے برے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے نماز ضائع کردی اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی، ان کو عنقریب دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔

(النساء: ۱۴۲) اور منافقین جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں، وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔

حضرت انس (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ منافق کی نماز ہے، وہ بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے حتیٰ کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوجاتا ہے تو وہ کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں مارتا ہے اور اس نماز میں اللہ کا بہت کم ذکر کرتا ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۲۲)

حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: منافق وہ ہے جو تنہائی میں نماز نہیں پڑھتا اور لوگوں کے سامنے نماز پڑھتا ہے۔

الماعون: ۵ میں فرمایا: جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں۔

سہو کی تحقیق

ایک چیز یہ نمازوں سے غفلت کرنا یعنی کبھی نماز پڑھ لی اور کبھی نہ پڑھی، یہ منافقوں کا شعار ہے اور ایک چیز ہے نمازوں میں غفلت کرنا یعنی کبھی نماز میں شیطان وسوسہ ڈالتا ہے یا انسان نماز میں کسی کام کے متعلق سوچنے لگتا ہے اور اس کا منصوبہ بنانے لگتا ہے کہ اس سے بہت کم مسلمان خالی ہوتے ہیں۔

علامہ ابوعبداللہ قرطبی لکھتے ہیں:

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو بھی نماز میں سہو ہو جاتا تھا چہ جائیکہ اور لوگوں کو، اسی وجہ سے فقہاء نے اپنی کتابوں میں سجود السہو کا باب قائم کیا ہے، قاضی ابن العربی نے کہا ہے: سہو سے سلامتی محال ہے، کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اور صحابہ کو اپنی نمازوں میں سہو ہوا ہے اور جس شخص کو نماز میں سہو نہیں ہوتا، یہ وہ شخص ہے جو نماز میں غور فکر کرتا ہے، نہ قرآت میں تدبر کرتا ہے اور اس کی فکر نماز کے ارکان اور رکعات کو گننے میں لگی رہتی ہے، یہ وہ شخص ہے جو چھلکے کھاتا ہے اور مغز چھوڑ دیتا ہے اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو جو نماز میں سہو ہوتا تھا تو آپ کی فکر اس سے بہت عظیم تھی، ہاں! کبھی نماز میں اس شخص کو سہو ہوتا ہے جو شیطان کے وسوسہ کو قبول کر لیتا ہے، شیطان اس سے کہتا ہے کہ فلاں چیز کو یاد کر، فلاں چیز کو یاد کر، جو چیز اس کو پہلے یاد نہیں آتی تھی، وہ اس کو نماز میں یاد آجاتی ہے، حتیٰ کہ وہ شخص بھول جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعت نماز پڑھی ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۲۰ ص ۸۹ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

ہمارے سہو میں اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سہو میں بہت فرق ہے، ہم دنیا کے خیال میں ڈوب جاتے ہیں اور نماز کی رکعات کی طرف ہماری توجہ نہیں رہتی اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حسن الوہیت کے جلووں میں منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور نماز کی رکعات کی تعداد سے آپ کی توجہ ہٹ جاتی ہے، ہمارا سہو نقص ہے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سہو کمال ہے۔

الماعون: ۶ میں فرمایا: جو ریا کاری کرتے ہیں۔

ریا کاری کی تعریف

یعنی وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ وہ اطاعت کرتے ہوئے نماز پڑھ رہے ہیں حالانکہ وہ تقیہ سے نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں، جیسے فاسق اس لیے نماز پڑھتا ہے کہ اس کو نمازی کہا جائے اور ریا کار عبادت سے دنیا طلب کرتا ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے اور وہ لوگوں سے تعریف اور تحسین کی توقع کرتا ہے، ریا کار کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ موٹے کپڑے پہنتا ہے تا کہ یہ ظاہر کرے کہ اس کو دنیا میں کوئی رغبت نہیں ہے اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی باتوں سے ریا کاری کرتا ہے، وہ اہل دنیا کی مذمت کرتا ہے اور نیکی اور عبادت کے ضائع ہونے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے اور چوتھا طریقہ یہ ہے کہ وہ لمبی لمبی نمازیں پڑھتا ہے اور لوگوں کو دکھا کر بہت خیرات اور صدقات دیتا ہے۔

فرائض کو دکھا کر ادا کیا جائے اور نوافل کو چھپا کر

جو اعمال صالحہ فرائض میں سے ہیں ان کو دکھا کر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ فرائض کا حق یہ ہے کہ ان کو دکھا کر ادا کیا جائے اور ان کی تشہیر کی جائے کیونکہ فرائض اسلام کی علامات ہیں اور دین کے شعائر ہیں اور فرائض کا تارک ملامت اور مذمت کا مستحق ہوتا ہے، پس فرائض کو دکھا کر ادا کیا جائے تا کہ اس پر ترک فرائض کی تہمت نہ لگے، اور نفلی عبادات کا حق یہ ہے کہ ان کو چھپا کر ادا کیا جائے کیونکہ نوافل کو ادا نہ کرنے پر انسان کو ملامت نہیں کی جاتی اور نہ اس پر کوئی تہمت لگتی ہے اور اگر کوئی شخص قصداً نفلی عبادات دکھا کر کرے تا کہ اس کی اقتداء کی جائے تو یہ اچھی بات ہے، ریاء اس وقت ہوتا ہے جب اس کا قصد یہ ہو کہ لوگ اس کی نفلی عبادات دیکھ کر اس کی تعریف اور تحسین کریں اور اس کی عزت اور احترام کریں۔

الماعون: ۷ میں فرمایا: اور وہ استعمال کی معمولی چیز دینے سے منع کرتے ہیں۔

"الماعون" کی تعریف میں بارہ اقوال

علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے: الماعون کی تفسیر میں بارہ اقوال ہیں:

(۱) ضحاک نے حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کیا ہے: اس سے مراد ان کے اموال کی زکوۃ ہے۔

(۲) ابن شہاب اور سعید بن المسیب نے کہا: اس سے مراد مال ہے۔

(۳) حضرت ابن مسعود (رض) نے کہا: اس سے مراد گھر میں استعمال ہونے والی کارآمد چیزیں ہیں جیسے کلہاڑی، دیگچی اور آگ وغیرہ۔

(٤) زجاج اور ابوعبید نے کہا: "الماعون" ہر وہ چیز ہے جس میں کوئی منفعت ہو جیسے کلہاڑی، ڈول اور بڑا پیالہ۔

(٥) حضرت ابن عباس (رض) سے ایک روایت ہے: جو چیز عاریۃً لی جائے۔

(٦) محمد بن کعب اور کلبی نے کہا: یہ وہ چیز ہے جس کا لوگ آپس میں لین دین کرتے ہوں۔

(۷) اس سے مراد پانی اور گھاس ہے۔

(۸) اس سے مراد صرف پانی ہے۔

(۹) حضرت عبداللہ بن عمر (رض) نے کہا: اس سے مراد کسی شخص کا حق ہے۔

(۱۰) طبری نے کہا: اس سے مراد کوئی بھی تھوڑی سی چیز ہے۔

(۱۱) اخفش نے کہا: اس سے مراد اطاعت اور فرمان برداری ہے۔

(۱۲) الماوردی نے کہا: اس سے مراد ایسا کام ہے جس میں کم مشقت ہو۔

منافق میں یہ تین اوصاف ہوتے ہیں: وہ نماز کو ترک کرتا ہے، ریاکاری کرتا ہے اور معمولی سی چیز دینے میں بھی بخل کرتا ہے اور مسلمان میں ان اوصاف کا پایا جانا بہت بعید ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۲۰ ص 190-191 دار الفکر، بیروت، ۱٤۱٥ھ)

زمانے سے مراد

وَالْعَصْرِ ۙ﴿۱﴾

"زمانہ کی قسم۔ بیشک ہر انسان ضرور نقصان میں ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے اور انھوں نے ایک دوسرے کو دین حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی"۔ (العصر: ۳-۱)

زمانہ کی قسم کھانے کی وجوہ

(۱) زمانہ بہت عجیب وغریب چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس میں خوشی اور غم کا، اور صحت اور بیماری کا خوش حالی اور تنگ دستی کا

ظہور ہوتا ہے، عقل حیران ہے کہ زمانہ کو موجود کہے یا معدوم کہے، معدوم اس لیے نہیں کہہ سکتی کہ زمانہ سال، مہینہ، ہفتہ، دن اور گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے اور زمانہ کم اور زیادہ ہوتا ہے اور جو چیز اس طرح ہو وہ معدوم نہیں ہو سکتی اور موجود اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ زمانہ یا ماضی ہے یا مستقبل، ماضی گزر چکا ہے وہ موجود نہیں ہے اور مستقبل ابھی آیا نہیں وہ بھی موجود نہیں ہے اور رہا حاضر تو وہ نا قابل تقسیم ہے۔

(۲) انسان ساری زندگی گناہ کرتا رہے اور عمر کے آخری لمحہ میں توبہ کر لے تو اس کو جنت مل جائے گی، جس میں وہ ابدالا باد تک رہے گا، تو انسان کی پوری زندگی کا وہی قیمتی لمحہ ہے اور اس سے پہلے کی زندگی کو انسان محض ضائع کرتا رہا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

(الفرقان: ۶۲) اور اسی نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا بنایا اس کے لیے جو نصیحت حاصل کرنے یا شکر ادا کرنے کا ارادہ کرتا ہو۔

(۳) لوگوں کی عادت ہے کہ ان پر جو مصائب آتے ہیں یا ان کو جو نقصان ہوتے ہیں وہ ان کو زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھا کر یہ ظاہر فرمایا کہ زمانہ تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس میں کوئی عیب نہیں ہے، عیب تو انسان میں ہے، وہ اپنے کرتوتوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے نقصان اٹھاتا ہے اور اس نقصان کی نسبت زمانہ کی طرف کر دیتا ہے۔

(٤) زمانہ کے گزرنے سے انسان کی عمر کم ہوتی رہتی ہے، اگر وہ اس زمانے میں نیک کام نہیں کرے گا تو اس کو سراسر نقصان ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھا کر فرمایا: بیشک ہر انسان ضرور نقصان میں ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے۔

"العصر" کی تفسیر میں اقوال

"العصر" کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال ہیں:

روایت ہے کہ "العصر" سے مراد دہر اور زمانہ ہے، ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہے: عصر کی قسم ہے، ابن کیسان نے کہا، اس سے مراد دن اور رات ہے، حسن بصری نے کہا: اس سے مراد زوال شمس سے لے کر غروب شمس تک کا وقت ہے، قتادہ نے کہا، اس سے مراد دن کی ساعات میں سے آخری ساعت ہے، مقاتل نے کہا، اس سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ وہ صلوۃ وسطیٰ ہے۔

(معالم التنزیل ج ۵ ص 302 دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1420ھ)

مقاتل نے جو کہا ہے کہ "والعصر" سے مراد عصر کی نماز ہے، اس کی مفسرین نے حسب ذیل وجوہ ذکر کی ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے عصر کی نماز کی قسم کھا کر اس پر تنبیہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عصر کی نماز میں بہت فضیلت ہے، اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد ہے: "حافظوا علی الصلوت والصلوۃ الوسطی" (البقرہ: 238) تمام نمازوں کی حفاظت کرو، خصوصاً درمیانی نماز کی۔

(۲) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بھی عصر کی نماز کی بہت فضیلت اور اہمیت بیان فرمائی ہے:

حضرت ابن عمر (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہوگئی گویا اس کے اہل اور اس کا مال ہلاک ہوگیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۵۲ صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۲۶ (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۴۱۴، سنن نسائی رقم الحدیث: ۵۱۱

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۶۸۵)

حضرت بریدہ نے ایک ابر آلود دن میں فرمایا: عصر کی نماز جلدی پڑھ لو، کیونکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے: جس نے عصر کی نماز کو ترک کر دیا اس کا عمل ضائع ہوگیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 553، مسند محمد ج ۵ ص 349-350)

حضرت جریر (رض) بیان کرتے ہیں کہ ہم نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ تھے، آپ نے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا : تم عنقریب اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے، جس طرح چاند کو دیکھ رہے ہو، تم کو اسے دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، اگر تم سے ہو سکے تو طلوع شمس اور غروب شمس سے پہلے کی نمازوں میں کوتاہی نہ کرو، یہ نمازیں تم سے قضا نہ ہو جائیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۵۴ صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۳۳، (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۴۷۲۹)

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تمہارے پاس رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے باری باری آتے ہیں اور وہ فجر کی نماز میں اور عصر کی نماز میں جمع ہوتے ہیں، پھر جو فرشتے تمہارے پاس رات میں تھے وہ اوپر جاتے ہیں ان سے ان کا رب سوال کرتا ہے حالانکہ وہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے، وہ فرماتا ہے: تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ کہتے ہیں: جب ہم نے ان کو چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس آئے تھے اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۵۵ صحیح مسلم رقم الحدیث: ۶۳۲،
(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۴۸۷-۴۸۶)

(۳) عصر کے وقت نماز پڑھنا نفس پر بہت بھاری ہوتا ہے کیونکہ اس وقت کاروباری لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں اور جو عبادت بھاری ہو، اس کو ادا کرنے کا بہت ثواب ہوتا ہے۔

(٤) عصر کی نماز کے بعد ان کی عبادت ختم ہو جاتی ہے، سو اس وقت نماز پڑھنا مرتے وقت توبہ کرنے کے مشابہ ہے۔

(٥) عصر کا وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت مقدس ہے، اس وقت جھوٹ بول کر سودا بیچنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت ناراضگی کا موجب ہے، حدیث میں ہے:

حضرت ابوہریرہ (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تین آدمیوں کی طرف قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ ان کے باطن کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: ایک وہ شخص جس کے پاس راستہ کا فالتو پانی ہو اور وہ اپنے پڑوسی کو دینے سے منع کرے، دوسرا وہ شخص جو کسی حاکم سے دنیاوی غرض کی خاطر بیعت کرے، اگر وہ اس کو دنیا میں سے کچھ دے تو وہ اس سے راضی ہو اور اگر وہ اس کو نہ دے تو اس سے ناراض ہو اور تیسرا وہ شخص ہے جو عصر کے بعد سودا

فروخت کرے اور کہے: اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، مجھے یہ چیز اتنے اتنے کی ملی ہے اور اس کی خریدار تصدیق کردے اور اس نے جھوٹی قسم کھائی ہو، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

(آل عمران: ۷۷) بیشک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت کے عوض بیچ دیتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی طرف نظر (رحمت) فرمائے گا اور نہ ان کے باطن کو صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

"والعصر" سے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا زمانہ مراد ہے:

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ کی قسم کھائی ہے اور اس پر دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: مسلمانوں اور یہود اور نصاریٰ کی مثال اس طرح ہے، جیسے ایک شخص نے کچھ لوگوں کو اجرت پر کام کے لیے رکھا اور ان سے کہا، رات تک کام کرنا، انھوں نے آدھے دن تک کام کیا، پھر کہا: ہمیں تمہاری اجرت کی ضرورت نہیں اور کام چھوڑ کر چلے گئے، پھر اس نے دوسرے آدمیوں کو لگایا اور ان سے کہا: تم بقیہ دن تک کام کرنا اور تم کو وہ اجر ملے گا، انھوں نے عصر کی نماز کے وقت تک کام کیا اور کہا، بس ہم اتنا ہی کام کرسکتے ہیں، پھر اس نے اور لوگوں کو بلایا اور انھوں نے بقیہ دن غروب آفتاب تک کام کیا حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا اور انھوں نے دونوں فریقوں کا اجر حاصل کرلیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۵۸، مسند حمد ج ۲ ص ۶ مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۵۶۵)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عصر وہ زمانہ ہے جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کی امت کے ساتھ مختص ہے لہٰذا "والعصر" کا معنی ہے: اس زمانہ کی قسم جس میں آپ ہیں، یہ آپ کے زمانہ کی قسم ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے شہر کی قسم کھائی: "انت حل بھذا البلد۔" (البلد: ۲) اس شہر کی قسم جس میں آپ مقیم ہیں اور آپ کی زندگی کی قسم کھائی: "لعمرك" (الحجر: ۷۲) پس گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ کے زمانہ کی قسم! آپ کے شہر کی قسم! آپ کی زندگی کی قسم! سوچیے اللہ تعالیٰ آپ کی نسبتوں کی قسم کھا رہا ہے اور آپ کی نسبتیں اللہ کے نزدیک اتنی مکرم ہیں تو خود آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس قدر مکرم ہوگی!

(تفسیر کبیر ج ۱۱ ص ۲۷۹ داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

العصر: ۲ میں فرمایا: بیشک ہر انسان ضرور نقصان میں ہے۔

تمام انسانوں کا خسارے میں مبتلا ہونا

اس آیت میں "الانسان" پر الف لام کے دو محمل ہیں: ایک یہ کہ یہ الف لام استغراق کے لیے ہے جیسا کہ حضرت علی (رض) نے اس کی تفسیر میں فرمایا: بیشک ابن آدم ہلاکت اور نقصان میں ہے۔ (جامع البیان جز ۳۰ ص 371) دوسرا محمل یہ ہے کہ یہ الف لام عہد کا ہے اور متھود کفار ہیں۔

امام ابواسحٰق احمد بن ابراہیم الثعلبی متوفی ۴۲۷ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابی بن کعب (رض) بیان کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے اس سورت کو پڑھا اور آپ سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ پر میرے باپ اور ماں فدا ہوں، اس آیت کی کیا تفسیر ہے؟ آپ نے فرمایا: "والعصر" سے مراد ہے دن کا آخری حصہ "ان الانسان لفی خسر" سے مراد ہے: ابو جہل بن ہشام "الا الذین امنوا" سے مراد ہے: ابوبکر صدیق اور "عملوا الصلحت" سے مراد ہے: عمر بن خطاب "وتواصوا بالحق" سے مراد ہے: عثمان بن عفان اور "عملوا الصلحت" سے مراد ہے: عمر بن خطاب "وتواصوا بالحق" سے مراد ہے: عثمان بن عفان "وتواصوا بالصبر" سے مراد ہے: علی بن ابی طالب۔

امام ثعلبی نے حضرت عبداللہ بن عباس (رض) سے بھی بعینہ یہی تفسیر نقل کی ہے۔

(الکشف والبیان ج ۱۰ ص 284، داراحیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۲۲ھ)

امام الحسن بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ نے لکھا ہے: اس آیت میں "الانسان" سے مراد کافر ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد مومنین کا استثناء فرمایا ہے، فرمایا ہے: بیشک انسان خسارہ میں ہے، اور خسارہ کا معنی ہے: انسان کا اصل مال ضائع ہو جائے یعنی انسان خود بھی ہلاک ہو جائے اور اس کی تمام عمر گناہوں میں ضائع ہو جائے۔

(معالم التنزیل ج ۵ ص 302 داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۰ھ)

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی متوفی ۵۹۷ھ فرماتے ہیں:

انسان خسارہ سے الگ نہیں ہوسکتا، کیونکہ خسارہ کا معنی ہے: اصل مال کا ضائع ہو جانا اور انسان کا اصل مال اس کی عمر ہے اور وہ بہت کم اپنی عمر کے ضائع ہونے سے بچ سکتا ہے کیونکہ انسان کے اوپر جو ساعت بھی گزر رہی ہیں، اس میں اگر وہ گناہوں میں مصروف ہے تو اس کے نقصان میں کوئی شک نہیں ہے اور اگر اس کی وہ ساعت مباح کاموں میں گزر رہی ہو، پھر بھی اس کا نقصان اس لحاظ سے ہے کہ اس کو ان کاموں پر ثواب نہیں ملا، اور اگر اس کی وہ ساعت اطاعت اور عبادت میں گزر رہی ہو تو جس کیفیت سے عبادت کر رہا ہے، اس سے عمدہ اور اعلیٰ کیفیت سے بھی عبادت کرنا ممکن ہے کیونکہ خشوع اور خضوع کے درجات غیر متناہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے جلال اور قہر کے مراتب بھی غیر متناہی ہیں تو انسان کو اللہ تعالیٰ کی جس قدر زیادہ معرفت ہوگی، اس کو اللہ تعالیٰ کا اتنا زیادہ خوف ہوگا اور جتنا زیادہ خوف ہوگا، وہ اتنی زیادہ تعظیم سے اللہ کی عبادت کرے گا اور اعلیٰ عبادت کو ترک کرنا اور ادنیٰ عبادت کو اختیار کرنا یہ بھی ایک قسم کا نقصان ہے، پس واضح ہو گیا کہ ہر انسان کسی نہ کسی قسم کے خسارے اور نقصان میں مبتلا ہے۔

اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے کہ ہر انسان اصل میں خسارے اور نقصان میں مبتلا ہے، کیونکہ انسان کی سعادت اس میں ہے کہ وہ آخرت سے محبت رکھے اور دنیا سے اعراض کرے اور وہ اسباب جو آخرت کے داعی اور محرک ہیں، وہ مستور اور غیر ظاہر ہیں اور وہ اسباب جو دنیا کی محبت کے داعی ہیں، وہ ظاہر ہیں، وہ انسان کے حواس خمسہ اور شہوت اور غضب ہیں، اس وجہ سے زیادہ لوگ دنیا کی محبت اور اس کو طلب کرنے میں مستغرق ہیں، اس لیے سب لوگ خسارے اور نقصان میں ہیں سوائے مومنین صالحین کے۔

(تفسیر کبیر ج ۱۱ ص ۲۸۰ داراحیاء التراث الربی بیروت ۱۴۱۵ھ)

العصر: ۳ میں فرمایا: سوا ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیئے اور انھوں نے ایک دوسرے کو دین حق

کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

اس آیت کا معنی ہے: سو ان لوگوں کے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی تصدیق کی اور اس کی اطاعت اور عبادت کا اقرار کیا اور نیک اعمال کئے یعنی فرائض اور واجبات کو ادا کیا اور سنن اور مستحباب پر کار بند رہے اور معاصی کا ارتکاب نہیں کیا اور گناہ کبیرہ اور صغیرہ سے مجتنب رہے اور دوسروں کو بھی کتاب اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا حکم دیتے رہے اور صبر کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

"وتواصوا بالحق" کی تفسیر میں تین قول ہیں:

یحییٰ بن سلام نے کہا: وہ دوسروں کو بھی توحید پر ایمان لانے کی تلقین کرتے رہے، قتادہ نے کہا: وہ قران کے احکام پر عمل کرنے کی نصیحت کرتے رہے، سدی نے کہا: وہ اللہ کی اطاعت اور عبادت کی تلقین کرتے رہے۔

"وتواصوا بالصبر" کی تفسیر میں بھی تین قول ہیں:

قتادہ نے کہا: وہ اللہ کی فرمان برداری کی نصیحت کرتے رہے، ہشام بن حسان نے کہا: وہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے فرائض پر عمل کرنے کی تایید کرتے رہے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ حرام کام کرنے کی خواہش پر صبر کرنے اور شہوت اور غضب کے تقاضوں پر صبر کرنے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی مشقت پر صبر کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

(النکت والعیون ج ٦ ص ٣٣٤، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

افعال میں حسن اور قبح عقلی ہے یا شرعی؟

اللہ تعالیٰ نے اس استثناء میں تین چیزیں ذکر فرمائی ہیں:

(١) اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کرنے میں جو انسان کی عمر اور جوانی خرچ ہوتی ہے، انسان اس پر ملال نہ کرے کیونکہ اللہ کی عبادت میں عمر کا تھوڑا سا حصہ اس کا دائمی اور ابدی جنت تک پہنچا دیتا ہے اور دوزخ کے دائمی عذاب سے بچالیتا ہے۔

(٢) ہر وہ شخص جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دے وہ اس کا خیر خواہ ہے اور وہ شخص جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی معصیت کی دعوت دے، وہ اس کا بدخواہ ہے۔

(٣) ماتریدیہ کہتے ہیں: اعمال میں فی نفسہ حسن یا قبح ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے حسین کاموں کا حکم دیا ہے اور قبیح کاموں سے منع فرمایا ہے، مثلاً نماز پڑھنا فی نفسہ حسین کام ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور زنا کرنا فی نفسہ قبیح کام ہے کیونکہ اس سے نسبت محفوظ نہیں رہتی، اس لیے اس سے منع فرمایا ہے، سو اللہ تعالیٰ نے نیک کاموں کا حکم دیا ہے اور برے کاموں سے روکا ہے اور اشاعرہ کہتے ہیں کہ فی نفسہ کسی کام میں حسن یا قبح نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جس کام کا حکم دیا ہے وہ حسین ہے اور جس سے منع کیا ہے وہ قبیح ہے، اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، اس لیے وہ حسین ہے اور زنا کرنے سے منع کیا ہے، اس لیے وہ قبیح ہے، اگر اللہ تعالیٰ نماز سے منع کرتا تو نماز پڑھنا قبیح ہوتا اور اگر زنا کرنے کا حکم دیتا تو زنا کرنا حسین کام ہوتا۔

انسان کا خود نیک ہونا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو بھی نیک بنائے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود نیک کام کرنے کے علاوہ یہ بھی حکم دیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی نیک بنائے، انھیں

دین حق پر عمل کرنے کی وصیت کرے اور مشکلات اور مصائب میں صبر کرنے کی وصیت کرے، جیسا کہ اس آیت میں ہے:

(التحریم:٦) اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

اسی طرح حدیث میں ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت لوگوں کا نگہبان ہے، پس ہر شخص سے اس کے ماتحت لوگوں کے متعلق سوال کیا جائے گا، ملک کا سربراہ اپنی رعایا کا نگہبان ہے، اس سے اس کی رعایا کے متعلق سوال ہوگا، گھر کا سربراہ اپنے گھر والوں کا محافظ ہے، اس سے ان کے متعلق سوال کیا جائے گا، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا، نوکر اپنے مالک کے مال کا نگہبان ہے، اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا، تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت لوگوں کا نگہبان ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ٢٥٥٤ صحیح مسلم رقم الحدیث: ١٨٢٩ سنن ترمذی رقم الحدیث: ١٧٠٥)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تمام لوگ خسارے میں ہیں، سوا ان کے جو چار چیزوں سے متصف ہوں: ایمان اعمال صالحہ، لوگوں کو اطاعت اور عبادت کی وصیت کرنا اور لوگوں کو صبر کی تلقین کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو نیکی کا حکم دے اور ان کو برائی سے روکے، جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے:

(آل عمران: ١١٠) تم بہترین امت ہو، ان سب امتوں سے جن کو لوگوں کے لیے ظاہر کیا گیا ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

مال جمع کرنے اور زیاراتِ قبور کے بیان میں

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿١﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۗ﴿٢﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿٣﴾

”تم کو زیادہ مال جمع کرنے کی حرص نے غافل کر دیا۔ حتیٰ کہ تم (مر کر) قبروں میں پہنچ گئے۔

یقیناً تم عنقریب جان لو گے۔ پھر یقیناً تم عنقریب جان لو گے“۔ (التکاثر: ٤۔١)

مال میں کثرت کی طلب اس وقت ممنوع ہے جب وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غفلت کی موجب ہو

مال اور اولاد کی کثرت پر فخر نے تم کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت سے غافل کر دیا حتیٰ کہ تم مر کر قبروں میں دفن ہو گئے۔“

الھا“ کا مصدر” الھاء“ ہے، اس کا معنی ہے، زیادہ ضروری چیز سے غافل ہونا، حضرت ابن عباس (رض) نے کہا: تم مال اور اولاد کی کثرت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل ہو گئے، قتادہ نے کہا: تم قبیلوں کی کثرت کی وجہ سے اللہ سے غافل ہو گئے، ضحاک نے کہا، تم کو معاش اور تجارت نے غافل کر دیا۔” الھا“ کا معنی ہے: مشغول کر دیا، مقاتل نے کہا: یہ آیت یہود کے متعلق نازل ہوئی ہے، وہ کہتے تھے: ہم بنو فلاں سے اکثر ہیں، (یہ قول مخدوش ہے کیونکہ یہود مدینہ میں تھے اور یہ سورت مکی ہے) ابن زید نے کہا: یہ آیت انصار کے ایک

گروہ کے متعلق نازل ہوئی ہے، یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور انصار مدینہ میں تھے) حضرت ابن عباس (رض) نے فرمایا: یہ آیت قریش کے دو قبیلوں کے متعلق نازل ہوئی ہے: بنو عبد مناف اور بنو سہم، وہ ایک دوسرے سے عداوت رکھتے تھے، وہ اپنی سیادت اور اپنے شرف سے ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے: ہماری اکثریت ہے اور ہمارے سردار زیادہ ہیں، قتادہ نے کہا، وہ کہتے تھے: ہم بنو فلاں سے اکثر ہیں اور ہر دن ان میں سے ایک نہ ایک مر کر کم ہو رہا تھا حتیٰ کہ وہ سب فوت ہو گئے۔

(الجامع لاکام القرآن جز20 ص 151، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

یہ آیت کسی خاص گروہ کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کو شامل ہے، جو مال و دولت کو زیادہ سے زیادہ جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اس فکر میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں۔

مطرف اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ "الھکم التکاثر۔" کی تلاوت فرما رہے تھے، آپ نے فرمایا: ابن آدم کہتا ہے: میرا مال میرا مال، اے ابن آدم! تیرا مال تو صرف وہی ہے جس کو تو نے کھا لیا اور جس کو فنا کر دیا، یا تو نے جس کو پہن لیا پھر اس کو بوسیدہ کر دیا، یا تو نے اس کا صدقہ کر کے اس کو ختم کر دیا۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: 2958 (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۳۴۲، ترمذی کی روایت میں یہ اضافہ ہے، اس کے سوا جو بھی مال ہے تم اس کو لوگوں کے لیے چھوڑ کر (دنیا سے) جانے والے ہو)

حضرت انس بن مالک (رض) نے بیان کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: اگر ابن آدم کے پاس سونے کی ایک وادی ہو تو وہ چاہے گا کہ اس کے پاس دو وادیاں ہوں اور اس کا منہ مٹی کے سوا ہرگز نہیں بھرے گا اور جو توبہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: 6439، صحیح مسلم رقم الحدیث: 1048 (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۳۳۷ سنن ترمذی میں یہ الفاظ ہیں: اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی کو طلب کرے گا)

اطاعت، عبادت اور حسن اخلاق میں کثرت کو طلب کرنا محمود اور مستحسن ہے۔

اس آیت میں کثرت طلب کرنے کی مذمت فرمائی ہے، لیکن مطلقاً کثرت کو طلب کرنا مذموم نہیں ہے، بلکہ اطاعات عبادات اور محاسن اخلاق میں کثرت کو طلب کرنا مطلوب ہے، اور مال میں کثرت اگر فسق و فجور کے لیے ہو تو مذموم ہے اور اگر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے لیے مطلوب ہو تو یہ مستحسن ہے، حدیث میں ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود (رض) بیان کرتے ہیں کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا مستحسن ہے، ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور وہ اس حق کے راستے میں خرچ کرے اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہو اور وہ اس علم کے مطابق فیصلہ کرے اور لوگوں کو تعلیم دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۳ صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۱۶ مسند احمد ج ۱ ص 385)

اسی طرح اولاد میں کثرت اگر صرف اپنی نسل بڑھانے کے لیے ہو تو یہ مستحسن نہیں ہے اور اگر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی امت میں اضافہ کے لیے مطلوب ہو تو یہ مستحسن ہے۔ حدیث میں ہے:

حضرت معقل بن یسار (رض) بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آیا اور کہنے لگا: مجھے ایک

ایسی عورت ملی ہے، جس کا خاندان بھی اچھا ہے اور وہ بہت خوبصورت بھی ہے اور اس کی اولاد نہیں ہوتی، کیا میں اس سے نکاح کرلوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں!، وہ پھر دوسری بار آیا، آپ نے پھر منع فرمایا، وہ پھر تیسری بار آیا تو آپ نے فرمایا: اس عورت سے شادی کرو، جو محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۰۵۰، سنن نسائی رقم الحدیث: ۳۲۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً تکاثر مذموم نہیں ہے بلکہ جو تکاثر مذموم ہے، وہ یہ ہے کہ فسق و فجور کے لیے مال و دولت میں کثرت کو طلب کیا جائے اور علم میں زیادتی اور اطاعت اور عبادت میں کثرت اور اخلاق حمیدہ میں اضافہ محمود اور مستحسن ہے، لہٰذا "التکاثر" میں الف لام استغراق کے لیے نہیں ہے، بلکہ دنیا اور اس کی لذتوں میں ایسی زیادتی کو طلب کرنا جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت سے مانع ہو اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کردے، ایسا تکاثر ممنوع اور مذموم ہے اور "التکاثر" میں الف لام عہد کا ہے اور متھود اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والا تکاثر ہے۔ امام رازی نے فرمایا ہے: سعادات میں "تفاخر" غیر مذموم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ اپنے رب کی نعمت بیان کیجیے (الضحیٰ: ۱۱) (تفسیر کبیر ج ۱۱ ص 270) لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جب بھی اپنے فضائل بیان فرمائے اس کے ساتھ فرمایا: مجھے اس پر فخر نہیں۔

التکاثر: ۲ میں فرمایا: حتیٰ کہ تم نے قبروں کی زیارت کرلی، اس سے مراد ہے: حتیٰ کہ تم قبروں میں پہنچ گئے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قبر کی زیارت کرنے والا تو کچھ دیر قبر کی زیارت کر کے واپس چلا جاتا ہے اور جو قبر میں دفن ہوتا ہے، وہ تو حشر تک قبر میں ہی رہتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ قبر میں دفن ہونے والا بھی بالآخر قبر سے نکل کر میدان حشر کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

زیارت قبور کا بیان

علامہ بدرالدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

زیارت قبور میں علماء کا اختلاف ہے، علامہ حازمی نے کہا ہے کہ تمام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مردوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنے کی اجازت ہے، علامہ ابن عبدالبر مالکی نے کہا ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے کا حکم عام ہے، جیسے پہلے قبروں کی زیارت سے ممانعت عام تھی، پھر جب یہ عام ممانعت منسوخ ہو گئی تو مردوں اور عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنا جائز ہو گیا، زیارت قبور کی اباحت اور جواز پر بہ کثرت احادیث مروی ہیں:

(۱) امام مسلم نے حضرت بریدہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب قبروں کی زیارت کیا کرو۔

(۲) امام ترمذی نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے، اس کے یہ الفاظ ہیں، میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کی ماں (رض) کی قبر کی اجازت دے دی گئی ہے، سو اب قبروں کی زیارت کیا کر، کیونکہ یہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

(۳) امام ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے تم کو

قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، اب قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ یہ دنیا میں آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

(٤) امام ابن ابی شیبہ نے حضرت انس (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قبروں کی زیارت کرنے سے منع فرمایا تھا، پھر فرمایا: قبروں کی زیارت کیا کرو اور کوئی بری بات نہ کہنا

(٥) امام ابو داؤد نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی والدہ کے استغفار کی اجازت طلب کی تھی، مجھے یہ اجازت نہیں دی (تاکہ استغفار کرنے سے کسی کو والدہ ماجدہ کے متعلق ارتکاب معصیت کا وہم نہ ہو کیونکہ جب غیر معصوم کے لیے استغفار کیا جائے تو اس سے اس کے ارتکاب معصیت کا شبہ ہوتا ہے) پھر میں نے ان کی زیارت کی اجازت طلب کی تو مجھے اجازت مل گئی، سو تم قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ یہ موت کی یاد دلاتی ہیں۔

(٦) امام ابن ماجہ نے حضرت عائشہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زیارت قبور کی اجازت دی ہے۔

(٧) امام طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت حیان انصاری (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یوم خیبر کو خطبہ دیا اور ان تین چیزوں کو حلال کر دیا، جن سے پہلے آپ نے منع فرمایا تھا، ان کے لیے زیارت قبور، قربانی کے گوشت اور برتنوں کی اجازت دے دی۔

(٨) امام حاکم نے حضرت ابوذر (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: قبر کی زیارت کرو، اس سے تم کو آخرت یاد آئے گی۔

(٩) امام احمد نے حضرت علی بن ابی طالب (رض) سے روایت کیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب تم قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ وہ تم کو آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

(١٠) امام احمد حضرت ابن عباس (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قبروں کے پاس سے گزرے تو ان کی طرف منہ کر کے فرمایا: السلام علیکم

(١١) امام احمد حضرت عمر (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ وہ قبرستان گئے اور اہل قبور کو سلام کیا اور کہا: میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو انھیں سلام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

(١٢) امام ابن عبدالبر سند صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اپنے اس مسلمان بھائی کی قبر کے اس سے گزرتا ہے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا اور اس کو سلام کرتا ہے تو وہ اس کو پہچان کر اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

(١٣) امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ (رض) سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اللہ لعنت فرماتا ہے۔ امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے، پھر کہا: بعض اہل علم کا یہ نظریہ ہے کہ یہ حدیث زیارت قبور کی رخصت دینے سے پہلے کی ہے اور جب نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زیارت قبور کی رخصت دی تو اس میں مرد اور عورتیں دونوں داخل ہو گئے۔

(حافظ بدرالدین محمود بن احمد متوفی ٨٥٥ھ عمدۃ القری ج ٨ ص 69-70 ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر 1348ھ)

فقہاء احناف کے نزدیک عورتوں کے لیے زیارت قبور کا حکم

علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

بعض علماء کا یہ نظریہ ہے کہ عورتوں کے لیے قبروں کی زیارت کرنا مکروہ ہے، کیونکہ ان میں صبر کم ہوتا ہے اور وہ بے صبری کا اظہار زیادہ کرتی ہیں اور امام ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہت زیادہ زیارت قبور کرنے والی عورتوں اور قبروں پر مسجد بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر لعنت فرمائی ہے، ایک قوم نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ زیارت قبور کی رخصت مردوں کے ساتھ، خاص ہے اور عورتوں کو شامل نہیں ہے۔

علامہ ابن عبد البر مالکی نے کہا:

ممکن ہے، یہ حدیث بھی زیارت قبور کی رخصت سے پہلے کی ہو، جو عورتیں بناؤ سنگھار کرتی ہیں، میرے نزدیک ان کا نہ جانا مستحب ہے اور جوان عورتوں کا قبروں پر جانا فتنہ سے خالی نہیں ہے اور عورتوں کے لیے اپنے گھر کی چار دیواری میں لازم رہنے سے اور کوئی چیز بہتر نہیں ہے۔

بہت سے علماء نے نماز پڑھنے کے لیے عورتوں کے مسجد میں جانے کو بھی مکروہ کہا ہے تو قبرستان میں جانا تو بہ طریق اولیٰ مکروہ ہوگا، عورتوں پر جمعہ کا پڑھنا جو فرض نہیں ہے تو میرے خیال میں اس کی یہی وجہ ہے کہ ان کو گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت ہے، جو لوگ عورتوں کے لیے زیارت قبور کے جواز کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی ملکیہ حضرت عائشہ (رض) سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک دن قبرستان سے آرہی تھیں، میں نے پوچھا، اے المومنین! آپ کہاں سے آرہی ہیں؟ آپ نے فرمایا میں اپنے بھائی عبدالرحمن بن ابی بکر (رض) کی قبر کی زیارت کر کے آرہی ہوں، میں نے عرض کیا کیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قبور کی زیارت سے منع نہیں فرمایا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پہلے حضور نے منع فرمایا تھا، بعد میں آپ نے زیارت قبور کا حکم فرمایا۔

بعض علماء نے بوڑھی اور جوان عورتوں میں فرق کیا ہے اور صرف زیارت اور مردوں سے اختلاط میں فرق کیا ہے علامہ قرطبی مالکی نے کہا: جوان عورتوں کا زیارت قبور کے لیے جانا حرام ہے اور رہیں بوڑھی عورتیں تو ان کا زیارت قبور کے لیے جانا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مردوں سے اختلاط نہ کریں، اور انشاء اللہ اس میں کسی کا اختلاط نہیں ہوگا نیز علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ جامع ترمذی کی روایت میں "زوارات" (بہت زیادہ زیارت کرنے والوں) پر لعنت ہے اور "زوارات" مبالغہ کا صیغہ ہے، اس کا معنی ہے: جو بہ کثرت زیارت قبور کے لیے جاتی ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی زیارت قبور کرنے والی عورتوں پر لعنت نہیں ہے اور نہ ان کو ممانعت ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کو بہ کثرت زیارت کرنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ ان پر لعنت نہیں ہے اور نہ ان کو ممانعت ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کو بہ کثرت زیارت کرنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ ان کے قبرستان میں زیادہ جانے سے خاوند کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور اس کی پوشیدہ زینوں کا اظہار ہوتا ہے اور عورتوں کا باہر نکلنا مشہور ہو جاتا ہے اور اس میں ان لوگوں کے ساتھ تشبہ ہوتا ہے جو قبروں کی تعظیم کی وجہ سے قبروں کے ساتھ ساتھ لازم رہتے ہیں، اور عورتوں کے قبروں پر جانے سے ان کے رونے،

چلانے اور واویلا کرنے کا بھی خدشہ ہے، اس کے علاوہ اور بھی خرابیاں اور عورتوں کے قبروں پر جانے سے ان کے رونے، چلانے اور واویلا کرنے کا بھی خدشہ ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی خرابیاں ہیں (مثلاً عورتوں کے زیادہ آنے جانے سے ان کے رونے، چلانے اور واویلا کرنے کا بھی خدشہ ہے، اس کے علاوہ اور بھی خرابیاں ہیں (مثلاً عورتوں کے زیادہ آنے جانے سے لوگ بھی فتنہ میں مبتلا ہوتے ہیں اور عورتوں کی عزت اور ناموس کو بھی خطرہ ہوتا ہے) اس اعتبار سے "زیارات" اور "زوارات" (کبھی کبھی زیارت کرنے والیوں اور بہت زیادہ زیارت کرنے والیوں) میں فرق کیا جا سکتا ہے۔

"توضیح" میں مذکور ہے کہ حضرت بریدہ کی حدیث میں زیارت قبور کی ممانعت کے منسوخ ہونے کی تصریح ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ شعبی اور نخعی کو اجازت کی احادیث نہیں پہنچیں، اور شارع (علیہ السلام) سال کی ابتداء میں شہداء کی قبروں پر جاتے تھے اور فرماتے تھے:

السلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی۔ تمہارے صبر کی وجہ سے تم پر سلام ہو اور دار آخرت کیا ہی اچھا ہے۔

اور حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان (رض) بھی اسی طرح کرتے تھے اور حضرت شارع (رضی اللہ عنہ) نے ایک ہزار اصحاب کے ساتھ فتح مکہ کے دن اپنی والدہ ماجدہ کی قبر کی زیارت کی، ابن ابی الدنیا نے اس روایت کو بیان کیا ہے اور امام ابن ابی شیبہ نے حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت انس (رض) سے زیارت قبور ل کی اجازت روایت کی ہے اور حضرت فاطمہ (رض) ہر جمعہ کو حضرت حمزہ (رض) کی قبر کی زیارت کرتی تھیں، اور حضرت ابن عمر (رض) اپنے والد کی قبر کی زیارت کرتے تھے، وہاں ٹھہرتے اور ان کے لیے دعا کرتے اور امام عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ (رض) ہر جمعہ کو حضرت حمزہ (رض) کی قبروں کی زیارت کرتی تھیں، اور حضرت ابن عمر (رض) اپنے والد کی قبر کی زیارت کرتے تھے، وہاں ٹھہرتے اور ان کے لیے دعا کرتے، اور امام عبدالرزاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عائشہ (رض) اپنے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر (رض) کی قبر کی زیارت کرتی تھیں اور ان کی قبر مکہ میں تھی۔

ابن ابی حبیب نے کہا ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے، وہاں بیٹھنے اور قبروں کے پاس سے گزرتے وقت اسلام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ افعال کئے ہیں، امام مالک سے زیادہ قبور کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا: نبی ﷺ نے پہلے اس سے منع کیا تھا پھر اس کی اجازت دے دی، سو اگر انسان ایسا کرے اور صاف نیک کملات کے تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں ہے، نیز "توضیح" میں مذکور ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رض) کی قبروں کی زیارت کے استحباب پر تمام امت کا اجماع ہے اور احضرت ابن عمر (رض) جب کسی سفر سے آتے تو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قبر مکرم پر آتے اور عرض کرتے:

"السلام علیك یا رسول اللہ، السلام علیك یا ابابکر، السلام علیك یا ابتاہ"

صرف ابتداء اسلام میں زیارت قبور سے منع کیا گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت بتوں کی عبادت اور قبروں پر سجدہ کرنے کا رواج قریب تھا اور لوگ نئے نئے اس عہد سے نکلے تھے اور جب لوگوں کے دلوں میں اسلام مستحکم اور قوی

ہوگیا اور قبروں کی عبادت کرنے اور ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا خطرہ نہیں رہا تو آپ نے قبروں کی زیارت کی ممانعت کو منسوخ کر دیا، کیونکہ اس سے آخرت کی یاد آتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی ہوتی ہے اور طاؤس سے منقول ہے کہ دفن کے بعد لوگ سات دن تک قبر سے جدا نہ ہونے کو مستحب قرار دیتے تھے کیونکہ مردوں سے قبروں میں سات دن حساب اور آزمائش ہوتی ہے۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کا قبروں کی زیارت کرنا مکروہ ہے، بلکہ اس زمانہ میں حرام ہے، خصوصاً شہر کی عورتوں کا جانا حرام ہے، کیونکہ وہ بطور فتنہ اور فساد نکلتی ہیں (یعنی بہت زیادہ خوشبو لگا کر اور میک اپ کر کے نکلتی ہیں اور راستہ میں آنے جانے والے مردان کو دیکھتے ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں) زیارت قبور کی اجازت تو صرف اس لیے دی گئی ہے کہ لوگ آخرت کو یاد کریں، ماضی کی بداعمالیوں پر غور کر کے ان سے بچیں اور توبہ کریں اور دنیا سے دل نہ لگائیں۔

(عمدۃ القاری ج ۸ ص 69-80 ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر 1348)

علامہ زین الدین ابن نجیم حنفی متوفی 970ھ لکھتے ہیں:

وقیل تحرم علی النساء والاصح ان الرخصۃ ثابتۃ لھما۔

(البحر الرائق ج ۲ ص 195 المطبعہ علمیہ، مصر، ۱۳۱۱ھ)

ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کا زیارت قبور کے لیے جانا حرام ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رخصت ثابت ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی حنفی متوفی 1252ھ لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ عورتوں کا قبروں کی زیارت کرنا حرام ہے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ عورتوں کے لیے بھی قبروں کی زیارت جائز ہے۔ (البحر الرائق) اور "شرح المنیۃ" میں لکھا ہے کہ یہ مکروہ ہے، علامہ خیر الدین رملی نے کہا ہے کہ اگر عورتیں غم کی تجدید مردے کی خوبیاں بیان کرنے اور رونے اور واویلا کرنے کے لیے جائیں تو یہ جائز نہیں ہے اور حدیث میں زوارات قبور پر جولعنت کی گئی ہے، وہ اسی پر محمول ہے اور اگر رونے اور واویلا کرنے کے بجائے اعتبار آخرت اور میت پر دعا کرنے کے لیے حرج نہیں ہے اور جوان عورتوں کے لیے جانا مکروہ ہے، جس طرح جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے عورتوں کے مسجدوں میں جانے کا معاملہ ہے اور یہ بہت اچھی توفیق ہے۔

(رد المحتار ج ۱ ص 843 مطبعہ عثمانیہ، استنبول، 1327ھ)

رفعت ذکرِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ۝٤ (سورۃ الشرح: آیت 4)

ورفعنالك ذكرك۔ (الانشراح: ۴)

اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذکر کی بلندی اپنے ذمہ رکھی مخلوق کو اس کا مکلف نہیں کیا کہ وہ آپ کا ذکر بلند کرے کیونکہ اگر ملوق آپ کا ذکر بلند کرتی تو مخلوق کی ایک حد ہے، وہ اپنی حدتک آپ کا ذکر بلند کرتی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذکر کو خود بلند کیا اور نہ اللہ تعالیٰ کی کوئی حد ہے اور نہ آپ کے ذکر کی بلندی کی کوئی حد ہوگی، اللہ عزوجل لامحدود ہے تو آپ کے ذکر کی بلندی بھی لامحدود ہوگی، نیز مخلوق کی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی ہے، اللہ تعالیٰ ازلی ابدی ہے، سو آپ کے ذکر کی بلندی بھی ازلی ابدی ہوگی، سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذکر کی بلندی کا اندازہ اس حدیث سے کریں:

حضرت عمر بن خطاب (رض) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: جب حضرت آدم (علیہ السلام) سے (اجتہادی) خطاء ہوگئی تو انھوں نے کہا: اے رب! میں تجھ سے بہ حق (سیدنا) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے، اللہ عزوجل نے فرمایا: اے آدم! تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کیسے جانا، حالانکہ ابھی میں نے ان کو پیدا نہیں کیا، حضرت آدم (علیہ السلام) نے کہا: کیونکہ اے رب! جب تو نے مجھے اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور نے مجھ میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی تو میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو عرش کے پایوں پر "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" لکھا ہوا تھا۔ الحدیث

(دلائل النبوۃ ج ۵ ص ۴۸۹ المعجم الصغیر ج ۲ ص 82-83 الفوائد ص ۳ و مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہ، دار الجیل، ریاض)

اس کائنات میں سب سے بلند عرش عظیم ہے اور عرش عظیم پر آپ کا نام لکھا ہوا ہے اور یہ آپ کے ذکر کی بلندی کی واضح مثال ہے۔

(٤) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

(البقرہ: ۲۵۳) یہ رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام فرمایا اور ان میں سے بعض کو درجات میں بلندی عطا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ کتنے درجات بلندی عطا فرمائی، کیونکہ عالم عدد میں کوئی ایسا عدد نہیں ہے، جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درجات کی تعیین کر سکے، سو آپ کے درجات غیر متناہی ہیں، امام بوصیری فرماتے ہیں:

فان فضل رسول اللہ لیس لہ حد فیعرب عنہ ناطق بفم

"رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فضل و کمال کی کوئی حد ہے ہی نہیں، جس کو کوئی بتانے والا بتا سکے"

اس آیت میں آپ کا نام نہیں لیا بلکہ فرمایا: ان میں سے بعض کو (غیر متناہی) درجات عطا فرمائے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ غیر متناہی درجات کی بلندی کے ساتھ سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ایسے منفرد اور مخصوص ہیں کہ آپ کے سوا ذہن اور کسی کی طرف متوجہ ہو

ہی نہیں ہوسکتا۔حدیث میں ہے۔

حضرت عمرو بن العاص (رض) بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تم موذن سے اذان سنوتو وہی کلمات کہو، جو اس نے کہے ہیں، پھر مجھ پر صلوۃ (درود) پڑھو، بیشک جو مجھ پر ایک صلوۃ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر دس صلوت نازل فرماتا ہے، پھر اللہ سے میرے لیے وسیلہ کا سوال کرو کیونکہ وسیلہ جنت میں ایک ایسا درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے کسی ایک بندے کو ملے گا اور مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہوں

(صحیح مسلم رقم الحدیث:٣٨٤،(سنن ترمذی رقم الحدیث:٥٨٣ سنن ترمذی رقم الحدیث،٣٦١٤،سنن نسائی رقم الحدیث:٦٧٨)

وسیلہ جنت کا عظیم ترین درجہ ہے، سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کے ساتھ منفرد اور مخصوص ہیں، اسی طرح غیر متناہی درجات کی بلندی کے ساتھ بھی آپ منفرد اور مخصوص ہیں۔

(٥) دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی جگہ سورج غروب ہو رہا ہے اور جہاں سورج غروب ہو رہا ہے، وہاں مغرب کی اذان ہو رہی ہے، اور جہاں اذن ہو رہی ہے، وہاں" اشھد ان لا الہ الا اللہ " کے ساتھ بلند آواز سے" اشھد ان محمدا رسول اللہ" پڑھا جا رہا ہے، سو دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی جگہ آپ کا نام بلند کیا جا رہا ہے اور یہ بھی آپ کے ذکر کی بلندی ہے۔

(٦) پہلے مسلمان سال میں ایک مرتبہ یوم میلاد کو آپ پر صلوۃ وسلام پڑھتے تھے، مخالفین نے اس کو بدعت کہا اور اس کی مخالفت کی تو اس کے رد عمل میں مسلمان سال میں متعدد بار محافل میلاد منعقد کرتے اور آپ پر صلوۃ وسلام پڑھتے مخالفین نے پھر اس کو منع کیا تو مسلمان ہر جمعہ کی نماز کے بعد آپ پر صلوۃ وسلام پڑھنے لگے، اور جب اس سے بھی منع کیا گیا تو مسلمان ہر نماز کے بعد پڑھنے لگے:" الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ" اور جب اس کی بھی مخالفت ہوئی تو مسلمان جمعہ اور مغرب کی اذان کے علاوہ ہر اذان کے بعد وقفہ کرکے پڑھنے لگے:" الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ" پھر جب اس کے خلاف آوازیں اٹھیں تو مسلمان اذان سے پہلے بھی وقفہ کرکے آپ پر صلوۃ وسلام پڑھنے لگے اور یوں یوماً فیوماً اللہ تعالیٰ آپ کے ذکر کو بڑھا رہا ہے اور بلند فرما رہا ہے۔

اسی لیے فرمایا:" ورفعنالك ذكرك۔"(الم نشرح:٤)